

# مَنَاهِلُ الْعِرْفَانِ

فِي

# عِلْمِ الْقُرْآنِ

جلد اول

مؤلف

شیخ محمد عبدالعظیم زرقانی رحمۃ اللہ علیہ متوفی ۱۹۴۸ء

مستترجمین

مولانا ڈاکٹر خالد محمود صاحب مولانا ابو محمد عبدالوہاب صاحب

استاذ جامعہ اشرفیہ لاہور فاضل جامعہ اشرفیہ لاہور

[www.KitaboSunnat.com](http://www.KitaboSunnat.com)



بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ  
قُلْ أَطِيعُوا اللَّهَ  
وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ

مجلس التحقیق الاسلامی رومہ

محدث لائبریری

کتاب و سنت کی روشنی میں لکھی جانے والی اردو اسلامی کتب کا سب سے بڑا مفت مرکز

## معزز قارئین توجہ فرمائیں

- کتاب و سنت ڈاٹ کام پر دستیاب تمام الیکٹرانک کتب... عام قاری کے مطالعے کیلئے ہیں۔
- مجلس التحقیق الاسلامی کے علمائے کرام کی باقاعدہ تصدیق و اجازت کے بعد (Upload) کی جاتی ہیں۔
- دعوتی مقاصد کیلئے ان کتب کو ڈاؤن لوڈ (Download) کرنے کی اجازت ہے۔

### تنبیہ

ان کتب کو تجارتی یا دیگر مادی مقاصد کیلئے استعمال کرنے کی ممانعت ہے  
کیونکہ یہ شرعی، اخلاقی اور قانونی جرم ہے۔

اسلامی تعلیمات پر مشتمل کتب متعلقہ ناشرین سے خرید کر تبلیغ دین کی  
کاوشوں میں بھرپور شرکت اختیار کریں

PDF کتب کی ڈاؤن لوڈنگ، آن لائن مطالعہ اور دیگر شکایات کے لیے  
درج ذیل ای میل ایڈریس پر رابطہ فرمائیں۔

✉ KitaboSunnat@gmail.com

🌐 library@mohaddis.com

مَنَاهِلُ الْعِرْفَانِ  
فِي  
عُلُومِ الْقُرْآنِ





# مَنَاهِلُ الْعِرْفَانِ

فِي

# عُلُومِ الْقُرْآنِ

جلد اول

علوم القرآن کے حاس موضوع پر تحریر کردہ بنیادی اور حوالہ جاتی کتاب جس میں طہیدین اور مُستشرقین کے شبہات کے تشفی بخش جوابات بھی دیئے گئے ہیں اہل علم کے لئے ایک بیش بہا کتاب پہلی بار اردو و پنجاب میں

مؤلف

شیخ محمد عبدالعظیم زتانی رحمہ اللہ علیہ متوفی ۱۹۴۸ء

مستترجمین

مولانا ڈاکٹر خالد محمود صاحب مولانا ابو محمد عبدالوہاب صاحب  
اُستاد جامعہ اشرفیہ لاہور فاضل جامعہ اشرفیہ لاہور

مکتبہ رحمانیہ (رجسٹرڈ)



افرا سنٹر عتق سنٹر، امڈو بازار، لاہور  
فون: 042-37224228-37355743

MAKTABA-E-RAHMANIYA

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

مکتبہ رحمانیہ کتب خانہ لاہور



مکتبہ رحمانیہ (رجز)

نام کتاب

مناہل العرفان

مؤلف

شیخ محمد عبدالعظیم زرقانی رحمہ اللہ علیہ

ناشر

مکتبہ رحمانیہ (رجز)

مطبع

خضر جاوید پرنٹرز لاہور



اِقرأ سنٹر۔ عَرَفَنی سٹریٹ۔ اَرْدُو بازار۔ لاہور

فون: 042-37224228-37355743

صروری وضاحت

ایک مسلمان جان بوجھ کر قرآن مجید، احادیث رسول ﷺ اور دیگر دینی کتابوں میں غلطی کرنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا بھول کر ہونے والی غلطیوں کی تصحیح و اصلاح کے لیے بھی ہمارے ادارہ میں مستقل شعبہ قائم ہے اور کسی بھی کتاب کی طباعت کے دوران اغلاط کی تصحیح پر سب سے زیادہ توجہ اور عرق ریزی کی جاتی ہے۔ تاہم چونکہ یہ سب کام انسانوں کے ہاتھوں ہوتا ہے اس لیے پھر بھی غلطی کے رہ جانے کا امکان ہے۔ لہذا قارئین کرام سے گزارش ہے کہ اگر ایسی کوئی غلطی نظر آئے تو ادارہ کو مطلع فرمادیں تاکہ آئندہ ایڈیشن میں اس کی اصلاح ہو سکے۔ نیکی کے اس کام میں آپ کا تعاون صدقہ جاریہ ہوگا۔ (ادارہ)

ہمارے ادارے کا نام بغیر ہماری تحریری اجازت بطور ملنے کا پتہ، ڈسٹری بیوٹر، ناشر یا تقسیم کنندگان وغیرہ میں نہ لکھا جائے۔ بصورت دیگر اس کی تمام تر ذمہ داری کتاب طبع کروانے والے پر ہوگی۔ ادارہ ہذا اس کا جواب دہ نہ ہوگا اور ایسا کرنے والے کے خلاف ادارہ قانونی کارروائی کا حق رکھتا ہے،

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

## فہرست مضامین

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۳۰	تا بعین ۱۰۰ کے نام	۱۱	علوم القرآن
۳۰	علوم القرآن کا باقاعدہ تدوینی دور	۱۱	”علم“ حکماء کے نزدیک
۳۳	اصطلاح ”علوم القرآن“ کا معرض ظہور	۱۱	”علم“ متکلمین کے نزدیک
۳۳	کتاب ”البرہان فی علوم القرآن“ کا مختصر تعارف	۱۱	”علم“ شریعت کے نزدیک
۳۶	علوم القرآن اور آخری صدی	۱۲	مادیت پرستوں کے نزدیک ”علم“
۳۹	نزول قرآن	۱۲	”علم“ مدونین کے نزدیک
۳۹	نزول قرآن کا معنی و مطلب	۱۳	”علم“ محدثین کے نزدیک
۴۱	قرآن کریم کا متعدد بار نازل ہونا	۱۳	قرآن
۴۵	آسمان دنیا پر نزول کی حکمت	۱۴	قرآن کی اصطلاح کے بارے میں
	حضرت جبرئیل کا قرآن کریم کو حاصل کرنا اور حضور اکرم	۱۵	قرآن، متکلمین کی نظر میں
۴۶	ﷺ کی طرف منتقل کرنا	۱۸	قرآن، علماء اصول، فقہاء اور علمائے عربیت کے نزدیک
۴۷	أَلْفًا ظُفْرًا نَزَّلَ فِيهِ	۲۰	کیا ”قرآن“ اسم علم ہے
۴۹	”کلام اللہ کی اقسام“	۲۰	کیا اسم علم، تعریف کو قبول کرتا ہے؟
۵۱	قرآن کریم کے تیسرے یعنی آخری نزول کا عرصہ مدت	۲۱	”قرآن“ کا کل اور بعض پر اطلاق کرنا
۵۲	قرآن کریم کا تیسرا یعنی آخری نزول یکبارگی نہیں ہے	۲۲	”علوم القرآن“ کا معنی اضافی کے اعتبار سے مفہوم
۵۳	قرآن کریم کے تنجی نزول میں اسرار و حکم	۲۲	قرآن، کتاب ہدایت و اعجاز
۵۶	تدریجی نزول کی دوسری حکمت	۲۳	قرآن کا سنائی علوم سے انتفاع کی ترغیب دیتا ہے
۵۶	① حفظ قرآن میں سہولت	۲۴	قرآن کا سائنسی اعجاز
۵۶	② لہجہ قرآن میں سہولت	۲۶	علوم قرآن، فنِ مدون کے اعتبار سے اور اس کا موضوع اور فائدہ
۵۶	③ عقائد باطلہ سے نفرت	۲۸	تاریخ علوم القرآن
۵۶	④ عقائد حُفَّہ سے محبت	۲۸	علوم القرآن کی تدوین سے پہلے کا دورہ
۵۷	⑤ مومنین کے دلوں کے لیے ثبات فراہم کرنا	۲۹	علوم قرآن کی تدوین کا تمہیدی دور
۵۸	تدریجی نزول کی تیسری حکمت	۳۰	صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے نام

- جہاد سے متعلق نازل ہونے والی ابتدائی اور آخری آیات ..... ۹۸
- شان نزول کی اہمیت اور اس کے فوائد ..... ۱۰۴
- اسباب نزول جاننے کا بنیادی قاعدہ ..... ۱۰۹
- اسباب نزول بیان کرنے کی مختلف تعبیرات اور انداز ..... ۱۱۰
- ایک ہی موضوع میں مختلف تعبیرات پائے جانے کی صورتیں ..... ۱۱۱
- آیت ایک اور اسباب نزول متعدد ..... ۱۱۲
- آیات متعدد اور سبب نزول واحد ..... ۱۱۷
- آیت کے الفاظ اور سبب نزول کا عموم و خصوص ..... ۱۱۹
- غیر مستقل ..... ۱۲۰
- مستقل ..... ۱۲۰
- مستقل جواب کی مزید دو صورتیں ..... ۱۲۱
- پہلی صورت یعنی سبب عام اور جواب خاص ..... ۱۲۱
- دوسری صورت یعنی سبب خاص اور جواب عام ..... ۱۲۲
- ثمرہ اختلاف ..... ۱۲۳
- قیاس استثنائی سے جمہور کی دلیل کا ثبوت ..... ۱۲۵
- مخالفین کے شبہات خسہ اور ان کا رد ..... ۱۲۷
- لفظ عام کے ساتھ سبب خاص کی ایک مثال ..... ۱۳۲
- قرآن مجید کا سات حروف پر نازل ہونا ..... ۱۳۶
- مقدمہ ..... ۱۳۶
- قرآن مجید کے سات حروف پر نازل ہونے کے دلائل ... ۱۳۷
- احادیث حروف سب سے مستنبط ہونے والے امور اور حکمتیں ..... ۱۳۵
- (پہلا امر یا پہلی حکمت) اُمت پر سہولت اور آسانی ..... ۱۳۶
- (دوسری حکمت) اُمت مسلمہ کو ایک لسان پر جمع کرنا ..... ۱۳۷
- (تیسری حکمت) احکام کی مزید وضاحت ..... ۱۳۷
- ۱ سائلین کے جوابات دینا ..... ۵۸
- ۲ واقعات کا مختلف اوقات میں رونما ہونا ..... ۵۹
- ۳ مسلمانوں کو ان کی اغلاط کی طرف متوجہ کرنا ..... ۶۰
- ۴ منافقین کے حال سے آگاہی ..... ۶۰
- تدریجی نزول کی چوتھی حکمت ..... ۶۱
- وحی اپنے معتقدین اور منکرین کے درمیان ..... ۶۳
- وحی کی حقیقت اس کی انواع و کیفیات ..... ۶۳
- وحی کی شرعاً اصطلاحی تعریف ..... ۶۳
- وحی کی اقسام ..... ۶۳
- نزول وحی کی کیفیات ..... ۶۳
- شرعی دلائل ..... ۶۵
- وحی، جدید علوم کے اعتبار سے ..... ۶۵
- پہلی دلیل ..... ۶۶
- دوسری دلیل ..... ۶۹
- تیسری دلیل ..... ۷۰
- چوتھی دلیل ..... ۷۰
- پانچویں دلیل ..... ۷۱
- چھٹی دلیل ..... ۷۲
- وحی عقل کے ذریعے سے ..... ۷۲
- شبہات کو دور کرنا ..... ۷۴
- ترتیب نزول کے اعتبار سے قرآن مجید کی پہلی اور آخری آیات ..... ۸۶
- مطلقاً سب سے پہلے نازل ہونے والی آیات ..... ۸۷
- مطلقاً سب سے آخر میں نازل ہونے والی آیات ..... ۹۲
- بعض احکام سے متعلق نازل ہونے والی ابتدائی اور انتہائی (آخری) آیات ..... ۹۷
- شراب سے متعلق نازل ہونے والی ابتدائی اور آخری آیات .. ۹۷



(چوتھی حکمت) دو مختلف احکام کو ایک ہی آیت میں  
 جمع کرنا ..... ۱۳۸  
 (پانچویں حکمت) دو مختلف حالتوں میں دو مختلف شرعی  
 احکام کو ایک ہی آیت میں جمع کرنا ..... ۱۳۹  
 (چھٹی حکمت) غیر مقصود و احتمال کو ذکر کرنا ..... ۱۳۹  
 (ساتویں حکمت) ابہام دور کرنا ..... ۱۵۰  
 (آٹھویں حکمت) گم راہ لوگوں کے گم راہ گن عقائد و  
 نظریات کا رد کرنا ..... ۱۵۰  
 (دوسرا امر) حروف یا قراءتیں سات کے عدد میں  
 محصور ہیں ..... ۱۵۱  
 (تیسرا امر) ساتوں کے ساتوں حروف یا قراءتیں  
 درست ہیں ..... ۱۵۲  
 (چوتھا امر) قراءات میں پایا جانے والا تنوع  
 میں جانب اللہ ہے ..... ۱۵۳  
 (پانچواں امر) قراءات سب سے روکنا جائز نہیں ..... ۱۵۴  
 (چھٹا امر) صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا قرآن کریم کے ساتھ  
 خلوص ..... ۱۵۴  
 (ساتواں امر) اختلاف قراءات کے مسئلے پر الجھنا  
 جائز نہیں ..... ۱۵۴  
 (آٹھواں امر) اختلاف قراءات کا تعلق الفاظ کے  
 ساتھ ہے نہ کہ معانی کے ساتھ ..... ۱۵۵  
 حروف سب سے پرزور قرآن کی لغوی تحقیق ..... ۱۵۵  
 ”وجوہ سببہ“ کا مفہوم، پسندیدہ قول کے مطابق ..... ۱۵۷  
 (پہلی قسم) اسماء میں مفرد، شنیہ، جمع اور تذکیر و تانیث  
 کے اعتبار سے اختلاف ..... ۱۵۷  
 (دوسری قسم) افعال میں ماضی، مضارع یا امر کے صیغوں  
 کے اعتبار سے اختلاف ..... ۱۵۷

(تیسری قسم) اعراب کے اعتبار سے اختلاف ..... ۱۵۷  
 (چوتھی قسم) الفاظ میں کمی، زیادتی کا اختلاف ..... ۱۵۸  
 (پانچویں قسم) تقدیم و تاخیر کا اختلاف ..... ۱۵۸  
 (چھٹی قسم) افعال کا ایسا اختلاف جس سے حروف بدل  
 جائیں ..... ۱۵۸  
 (ساتویں قسم) لہجوں کا اختلاف ..... ۱۵۸  
 امام ابو الفضل الرازی کے قول کو پسند کرنے کے وجوہات ..... ۱۵۸  
 ”وجوہ سببہ“ کے مفہوم سے متعلق دیگر اقوال ..... ۱۵۹  
 ① امام ابن قتیبہ رضی اللہ عنہما کا قول ..... ۱۶۰  
 ② امام محقق ابن جزری رضی اللہ عنہما کا قول ..... ۱۶۱  
 ③ تاجی ابو بکر الطیب باقلانی رضی اللہ عنہما کا قول ..... ۱۶۲  
 امام ابو الفضل الرازی رضی اللہ عنہما کے قول اور دیگر اقوال  
 کا جائزہ ..... ۱۶۲  
 امام ابو الفضل الرازی رضی اللہ عنہما کے قول پر وارد ہونے والے  
 اعتراضات اور ان کے جوابات ..... ۱۶۵  
 حروف سببہ کا مصلحت عثمانیہ میں موجود ہونا ..... ۱۶۸  
 (وجہ اول) اسماء میں مفرد، شنیہ، جمع کا اختلاف ..... ۱۶۹  
 (وجہ ثانی) تصریف افعال کا اختلاف ..... ۱۶۹  
 (وجہ ثالث) اعراب کے اعتبار سے اختلاف ..... ۱۷۰  
 (وجہ رابع) الفاظ میں کمی، زیادتی کا اختلاف ..... ۱۷۰  
 (وجہ خامس) تقدیم و تاخیر کا اختلاف ..... ۱۷۰  
 (وجہ ساڑس) افعال کا ایسا اختلاف جس سے حروف بدل  
 جائیں ..... ۱۷۱  
 (وجہ سابع) لہجوں کا اختلاف ..... ۱۷۱  
 حروف سببہ کی تعیین میں مزید اقوال ..... ۱۷۲  
 اصل موضوع پر وارد ہونے والے اعتراضات اور ان  
 کے جوابات ..... ۱۸۲

۲۳۹	مصاحف کی کتابت میں حضرت عثمان <small>رضی اللہ عنہ</small> کا طریق کار
۲۵۲	حضرت عثمان <small>رضی اللہ عنہ</small> کا مصاحف کو جلا دینا
	جمع قرآن کے بارے میں مختلف شبہات اور ان کے جوابات
۲۵۳	قرآن کریم کے خاص عوامل
۲۹۶	تحقیق و جستجو کے مظاہر
۳۱۲	صحابہ کرام <small>رضی اللہ عنہم</small> کے بارے میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے شہادت عالیہ
۳۱۵	رسول اللہ <small>صلی اللہ علیہ وسلم</small> کی اپنے صحابہ <small>رضی اللہ عنہم</small> کے بارے میں شہادت
۳۱۷	صحابہ <small>رضی اللہ عنہم</small> کے انتخاب میں اللہ تعالیٰ کی حکمت
۳۱۸	قرآن پاک کی آیات اور سورتوں کی ترتیب
۳۱۹	آیت کو پہچاننے کا طریقہ
۳۲۰	ایک حصہ پر آیت کا اطلاق
۳۲۳	ایک سے زائد حصہ پر آیت کا اطلاق
۳۲۳	قرآن پاک کی آیات کی تعداد
۳۲۳	اختلاف کا سبب
۳۲۳	آیات کو پہچاننے کے فوائد
۳۲۶	آیات قرآن کی ترتیب
۳۲۸	شبہہ اور اس کا ازالہ
۳۲۹	سورتوں کی ترتیب
۳۲۹	سورۃ کا معنی
۳۳۰	سورتیں بنانے کی حکمت
۳۳۱	سورتوں کی اقسام
۳۳۱	سورتوں کی ترتیب میں مذہب
	قرآن پاک کی کتابت، رسم، مصاحف اور ان کے متعلقات کے بیان میں

قرآن کریم کی کمی اور مدنی آیات یا سورتوں کے بیان

۱۹۱	میں
۱۹۱	① کمی اور مدنی کے اصطلاحی معانی
۱۹۳	② کمی اور مدنی آیات کی شناخت کے فوائد
۱۹۴	③ کمی اور مدنی آیات تک رسائی کا طریقہ
④	وہ قواعد و ضوابط جن کے ذریعے کمی مدنی کی شناخت کی جاسکتی ہے
۱۹۴	کمی سورتوں کو پہچاننے کے ضوابط
۱۹۵	مدنی سورتوں کو پہچاننے کے ضوابط
۱۹۶	⑤ کمی، مدنی اور مختلف فیہا سورتیں
۱۹۶	⑥ کمی اور مدنی سورتوں کی اقسام
④	ایسی وجوہ جو کمی اور مدنی دونوں کے ساتھ متعلق ہیں
۱۹۸	⑧ کمی اور مدنی میں فرق
۱۹۹	اس موضوع پر وارد ہونے والے شبہات اور ان کے جوابات
۲۰۱	جمع و تاریخ قرآن، شبہات ان کے جوابات، اور اس بارے وار دہونے والی روایات کے چند نمونے
۲۳۵	جمع قرآن بمعنی حفظ فی الصدور
۲۳۵	جمع قرآن بمعنی کتابت و رعبہ رسالت <small>صلی اللہ علیہ وسلم</small>
۲۴۰	عہد نبوی <small>صلی اللہ علیہ وسلم</small> میں قرآن یا مصاحف میں جمع کیوں نہ کیا گیا؟
۲۴۲	جمع قرآن، عہد صدیقی میں
۲۴۳	صدیق اکبر <small>رضی اللہ عنہ</small> کے حکم کا عملی اجرا
۲۴۳	کتابت صحف میں صدیق اکبر <small>رضی اللہ عنہ</small> کا طریق کار
۲۴۵	صحف کی خصوصیات
۲۴۶	جمع قرآن عہد عثمانی میں
۲۴۸	حضرت عثمان <small>رضی اللہ عنہ</small> کا اجتماعی فیصلہ پر عمل کروانا
۲۴۹	

۳۷۸.....	پہلے حفاظ مقررین کے طبقات	۳۳۹.....	کتابت
۳۷۹.....	قراءتوں کی تعداد	۳۴۰.....	اسلام میں کتابت کا مقام
۳۸۳.....	اس ضابطے کا منطوق و مفہوم	۳۴۱.....	نبی کریم ﷺ پڑھتے لکھتے تھے
۳۸۸.....	قرآن پاک کا تواتر	۳۴۲.....	قرآن پاک کی کتابت
۳۹۱.....	قراءت سبع میں آراء	۳۴۵.....	رسم مصحف
۳۹۵.....	قراءت عشر کے تواتر کی تحقیق	۳۴۵.....	قواعد رسم مصحف
۳۹۷.....	ہمزہ کی تخفیف	۳۴۷.....	رسم عثمانی کی خصوصیات و کمالات
۴۰۳.....	قراء	۳۵۰.....	کیا مصحف عثمانی کا رسم توفیقی ہے
۴۰۵.....	قراء سبعہ <small>رضی اللہ عنہم</small>	۳۵۲.....	رسم عثمانی کے التزام میں علماء کرام کے اقوال
۴۰۵.....	ابن عامر		قرآن کی کتابت اور اس کے رسم کے بارے میں پیدا
۴۰۵.....	ابن کثیر	۳۵۷.....	ہونے والے شبہات
۴۰۶.....	عاصم	۳۶۱.....	حضرت ابن عباس <small>رضی اللہ عنہما</small> کا عمومی دفاع
۴۰۸.....	کسائی	۳۶۵.....	ہمارے زمانے میں رسم عثمانی کے التزام پر شبہ
۴۰۹.....	ابو جعفر	۳۶۶.....	مصاحف کی تفصیل
۴۰۹.....	یعقوب	۳۶۶.....	مصاحف عثمانیہ میں حروف سبعہ
۴۱۰.....	خلف	۳۶۸.....	صحیفے اور مصاحف
۴۱۰.....	حسن بصری <small>رضی اللہ عنہ</small>	۳۶۹.....	مصاحف کی تعداد
۴۱۰.....	ابن محیصن	۳۷۰.....	اس وقت مصاحف عثمانیہ کہاں ہیں؟
۴۱۰.....	یحییٰ یزیدی	۳۷۱.....	تجوید و تحمیں کے دور میں مصاحف
۴۱۰.....	شہد ذوی	۳۷۱.....	اعجام
۴۱۱.....	دس کے علاوہ باقی قراءتوں کا حکم	۳۷۲.....	مصاحف کی تشکیل
۴۱۵.....	اس مقام پر پیدا ہونے والے شبہات کا ازالہ	۳۷۳.....	مصحف کے نقطوں اور اعراب کا حکم
۴۱۹.....	تفسیر، مفسرین اور ان کے تعلقات	۳۷۳.....	قرآن پاک کے پارے
۴۲۹.....	مفسرین صحابہ <small>رضی اللہ عنہم</small>	۳۷۴.....	مصحف کا احترام
۴۳۱.....	تفسیر ابن عباس <small>رضی اللہ عنہما</small>		قراءت، قراء اور ان پر ہونے والے شبہات کے
	تابعین <small>رضی اللہ عنہم</small> میں سے مفسرین کے طبقات اور ان کی	۳۷۶.....	بیان میں
۴۳۳.....	روایات پر نقد و جرح	۳۷۶.....	علم قراءت کا ارتقاء

- ① طبقہ اہل مکہ ..... ۴۳۳
- مجاہد ..... ۴۳۳
- ② طبقہ اہل مدینہ ..... ۴۳۴
- ③ طبقہ اہل عراق ..... ۴۳۴
- روایت بالمأثور کا ضعف اور اس کے اسباب ..... ۴۳۵
- تفسیر ماثور کی تدوین اور اس میں تالیف کی گئی کتابوں کی خصوصیات ..... ۴۳۹
- تفسیر ابوللیث سمرقندی ..... ۴۴۰
- الدر المنثور فی التفسیر بالمأثور ..... ۴۴۰
- تفسیر ابن کثیر ..... ۴۴۱
- تفسیر فقہی بن مخلد ..... ۴۴۱
- اسباب النزول للواحدی ..... ۴۴۱
- الناسخ والمنسوخ لابن جعفر الخاس ..... ۴۴۱
- قرن اول کے بعد مفسرین کی سندیں ..... ۴۴۱
- تفسیر محمود اور تفسیر مذموم ..... ۴۴۳
- مدح و ذم کا پیمانہ ..... ۴۴۳
- رائے کی طرف داری والی غلطی ..... ۴۴۴
- اسلام کی فراخ ولی اور اس کی تعلیمات کی آسانی ..... ۴۵۴
- لفظ ثالث ..... ۴۵۴
- توحید ..... ۴۵۴
- تفسیر بالرائے میں سے کوئی جائز اور کوئی ناجائز ہے ..... ۴۵۸
- وہ علوم جن کی مفسر کو ضرورت ہوتی ہے ..... ۴۵۹
- تفسیر بالرائے کے جواز میں اختلاف ..... ۴۶۲
- مانعین کے دلائل ..... ۴۶۲
- تفسیر بالرائے کو جائز قرار دینے والوں کے دلائل ..... ۴۶۵
- وجہ استدلال ..... ۴۶۵
- مفسرین بالرائے کا طریقہ کار ..... ۴۶۶
- احتمال کے وقت ترجیح کا قانون ..... ۴۶۷
- سنت کا قرآن کے لیے بیان ہونے کی وجہ ..... ۴۶۸
- ④ تفسیر بالرائے اور تفسیر بالمأثور میں تعارض اور ان میں ترجیح کے لیے قابل اتباع طریقہ ..... ۴۷۰
- تفسیر بالرائے کی اہم کتابیں ..... ۴۷۱
- فرق مختلفہ کی تفاسیر ..... ۴۷۳
- تفاسیر معتزلہ ..... ۴۷۳
- ”تنزیہ القرآن عن المطاعن“ ..... ۴۷۶
- تفاسیر باطنیہ ..... ۴۷۷
- شیعہ کی تفاسیر ..... ۴۷۸
- تفسیر اشاری ..... ۴۸۰
- تفسیر اشاری کو قبول کرنے کی شرائط ..... ۴۸۲
- تفسیر اشاری کی اہم ترین کتابیں ..... ۴۸۳
- مخلصانہ نصیحت ..... ۴۸۹
- حجۃ الاسلام امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کے کلمات ..... ۴۹۰
- اہل کلام کی تفاسیر ..... ۴۹۵
- علوم ادبیہ اور کونیہ وغیرہ کا تفسیر کے ساتھ امتزاج اور اس کا سبب و اثر ..... ۴۹۶
- اس امتزاج کے آثار ..... ۴۹۸
- آخری کلمات ..... ۵۰۲
- آخری بات ..... ۵۰۴





بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

بحث ①

## علوم القرآن

علوم القرآن، مرکبِ اضافی ہے۔ علوم مضاف ہے اور القرآن مضاف الیہ ہے۔ ہم اس باب میں علوم اور القرآن دونوں کے الگ الگ معانی بیان کریں گے۔ علوم جمع ہے جبکہ اس کا واحد علم ہے۔ لغت میں علم ایسے مصدر کو کہتے ہیں: جو فہم اور معرفت کے مترادف ہو۔ بلکہ جزم اور یقین کے بھی مترادف ہو۔ پھر یہ لفظ (علم) درج ذیل مختلف اصطلاحات میں استعمال ہونے لگا۔

”علم“ حکماء کے نزدیک؟ کسی چیز کی وہ صورت جو عقل میں حاصل ہوتی ہے علم کہلاتی ہے۔ یا حاصل ہونے والی صورت کو علم کہتے ہیں۔ یا انسان کا کسی چیز کے بارے میں انکشاف حاصل کر لینا علم کہلاتا ہے۔

”علم“ متکلمین کے نزدیک؟ متکلمین علم کی تعریف یوں کرتے ہیں کہ علم ایک ایسی صفت ہے کہ جس کے ساتھ وہ متصف ہو جائے اس پر معاملے کو واضح کر دیتی ہے۔ متکلمین میں سے بعض اس تعریف کی مراد بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ علم ایک صفت ہے جو اپنے محل کو ایسی تمیز یا ایسا امتیاز بخشتی ہے جس میں نقیض کا کوئی احتمال نہیں ہوتا۔ خواہ وہ تمیز حواس ہی کے واسطے سے کیوں نہ ہو جیسا کہ اشعریہ کی رائے ہے۔

”علم“ شریعت کے نزدیک؟ عام طور پر اللہ تعالیٰ اور اس کی نشانیوں کی معرفت کو علم کہتے ہیں۔ نیز اللہ تعالیٰ کے اپنے بندوں کے ساتھ اور دیگر مخلوق کے ساتھ افعال کی معرفت کو بھی علم کہتے ہیں۔

امام غزالی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ابتدا میں علم صرف اللہ تعالیٰ کی ذات کی معرفت، اس کی قدرت کی معرفت اور اس کی مخلوق اور اس کے مابین تعلق کی معرفت کو کہتے تھے۔ پھر بعد میں علم کے اطلاق میں تصریف ہوتی گئی یہاں تک بعد میں مسائل فقہیہ اور اس کے علاوہ دیگر علوم و مسائل میں مناظروں اور مباحثوں کو علم کہا جانے لگا۔ لیکن یاد رہے کہ قرآن وحدیث میں اور علماء سے متعلق جو فضائل وارد ہوئے ہیں، وہ علم کے ابتدائی اطلاق سے متعلق ہیں۔ (احیاء العلوم)

امام غزالی رضی اللہ عنہ کی علم کی بیان کردہ تعریف علم شرعی کے ساتھ خاص ہے۔ حالانکہ ہم اس مقام پر علم کی مطلقاً تعریف بیان کرنا چاہتے ہیں۔ امام غزالی رضی اللہ عنہ احیاء العلوم ہی میں فرماتے ہیں کہ حدیث میں یہ جو آیا ہے:

((طلب العلم فریضة علم کل مسلم و مسلمة))

”علم طلب کرنا ہر مسلمان مرد اور عورت پر فرض ہے۔“

تو اس حدیث میں علم سے کیا مراد ہے؟ پس امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: علماء کا اس میں بھی اختلاف ہے کہ یہاں علم سے کوئی سا علم مراد ہے۔ اس بحث میں علماء کی بیس (۲۰) جماعتیں بن جاتی ہیں۔ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں یہاں علم سے مراد وہ علم ہے جس کا تعلق ہمارے روزمرہ معاملات کے ساتھ ہوتا ہے اور ہم اس علم کے ذریعے اپنے ظاہری اعمال مثلاً عبادات اور اسلامی معاملات کو درست کرتے ہیں اور اپنے اسلامی عقائد یعنی باطنی اعمال و نظریات کو درست کرتے ہیں اور اپنے اخلاق کو سنوارتے ہیں۔ پس اس حدیث میں علم سے مراد وہ علم ہے جس کے ذریعے ہم اپنے معاملات اور لین دین اور عقائد کی اصلاح کر سکیں۔

**مادیت پرستوں کے نزدیک ”علم“** وہ لوگ جو مادیت پرست ہیں۔ ظاہر ہی کو سب کچھ مانتے ہیں۔ باطنیت مادیت پرست کہلاتے ہیں۔ ان کے نزدیک علم صرف اُن یقینی باتوں کو کہا جاتا ہے جو ہمیں محسوس ہوتی ہیں۔ یعنی جن چیزوں کو ہم ہاتھ لگا سکتے ہیں، دیکھ سکتے ہیں وغیرہ۔ پس ان کے نزدیک معلومات کو علم کہا جاتا ہے۔

مذکورہ بالا تمام تعریفات ذکر کرنے کا مقصد یہ ہے کہ ہمارے سامنے لفظ ”علم“ کا معنی واضح ہو جائے۔ وگرنہ زیادہ تعریفات اور ان کے درمیان پایا جانے والا اختلاف انسان کو شبہات کی طرف لے جاتا ہے۔ ذیل میں ہم وہ تعریف بیان کرنے لگے ہیں جو علم کا معنی سمجھنے میں ہمارے لیے معاون ثابت ہوگی۔ اور علم کی ایک اور اصطلاحی تعریف ہمیں معلوم ہو جائے گی۔

**”علم“ مدونین کے نزدیک** علوم القرآن ایک مدون فن ہے۔ اس لیے اس موقع پر علمائے تدوین کی بیان کردہ تعریف ذکر کرنا مناسب ہے۔

علمائے تدوین کہتے ہیں علم کا اطلاق اُن مسائل پر ہوتا ہے جن کو کسی ایک حیثیت یا جہت کے اعتبار سے محفوظ کیا گیا ہو۔ اکثر اوقات وہ مسائل مکمل طور پر نظر پاتی ہوتے ہیں اور بعض اوقات جزوی طور پر نظر پاتی ہوتے ہیں۔

میں کہتا ہوں کہ وہ مسائل بعض اوقات شخصی بھی ہوتے ہیں۔ جیسے روایت کے اعتبار سے علم حدیث کے مسائل۔ شخصی مسائل کی مثال میں نے علم حدیث سے دی ہے کیونکہ علم حدیث کے مسائل کی انتہا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس پر ہی ہوتی ہے۔ اس لیے علم حدیث کے مسائل ”مسائل شخصی“ ہوئے۔

علامہ سعد القاصد میں اور علامہ عبدالحکیم ”المطول“ میں لکھتے ہیں: جو علم مدون کیا گیا ہوتا ہے اُس کا اطلاق خاص قسم کے تصورات کی جماعت پر بھی ہوتا ہے۔ خاص قسم کے تصورات سے مراد وہ مفردات ہیں جن کو عقل کسی خاص اعتبار سے ایک دائرے میں تصور کرتی ہے۔

میں کہتا ہوں کہ اگر علمائے تدوین کی بیان کردہ تعریف علم کا خلاصہ نکالا جائے تو اُس کا خلاصہ کچھ یوں ہوگا: علمائے تدوین کی اصطلاح میں علم کا لفظ اُن معلومات پر بولا جاتا ہے جن کو کسی ایک جہت اور حیثیت کے اعتبار سے منضبط کیا ہو خواہ وہ معلومات ایک موضوع یا ایک غایت پر مبنی ہوں۔ یا وہ معلومات تصورات پر مبنی ہوں جیسا کہ ”علم البدیع“ یا وہ معلومات تصدیقات پر مبنی ہوں۔ پھر وہ تصدیقات بھی عام ہیں، خواہ اُن کا تعلق مکمل طور پر تفسیر یا سے ہو یا جزوی طور پر اور خواہ وہ تصدیقات کسی شخصیت سے متعلق ہوں جیسا کہ روایت کے اعتبار سے ”علم الحدیث“۔

”علم“ محدثین کے نزدیک علم اعلیٰ قاری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: علم مومن کے قلب میں ایک نور ہے جو فانوس نبوت کے چراغ سے مستفاد ہوتا ہے۔ یہ علم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال، افعال اور احوال کے

ادراک کا نام ہے۔ جس سے اللہ تعالیٰ کی ذات، صفات، افعال اور اس کے احکام کی ہدایت حاصل ہوتی ہے۔

”علم“ کے بارے میں مذکورہ تمام تعریفات سے علم اور علوم کا معنی اچھی طرح ذہن میں راسخ ہو گیا ہوگا۔ اس لیے اب ہم قرآن کے بارے میں بات شروع کرتے ہیں۔ کیونکہ ہمارا موضوع ”علوم القرآن“ ہے۔

## قرآن

لفظ قرآن عربی زبان کا لفظ ہے۔ یہ مصدر ہے اور قراءت کے مترادف ہے۔ قراءت کا معنی ہے ”پڑھنا“۔ یعنی لفظ قرآن کا لغوی معنی ہوا ”پڑھنا“۔ جیسا کہ قرآن مجید میں ہے:

﴿إِنَّا عَلَيْنَا جَمْعُهُ وَقُرْآنُهُ فَإِذَا قَرَأْنَاهُ فَاتَّبِعْ قُرْآنَهُ﴾ (سورة القیلة: ۱۷، ۱۸)

”اس کا جمع کرنا اور پڑھنا ہمارے ذمے ہے۔ سو جب ہم اسے پڑھا کریں تو آپ اس کو سنا کر اور پھر اسی طرح پڑھا کر۔“  
پھر لفظ قرآن معنی مصدری سے منتقل ہو کر ایسے کلام کا نام بن گیا جو کہ معجز ہے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل شدہ ہے یعنی قرآن مجید کا نام بن گیا۔ اب قرآن کا لفظ مصدر ہونے کے باوجود مفعول کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ اب قرآن کا ترجمہ ”پڑھنا“ نہیں کرتے بلکہ ”پڑھی جانے والی کتاب“ یا ”پڑھی گئی کتاب“ کرتے ہیں۔ اور مصدر کو مفعول کے معنی میں استعمال کرنا عربی زبان میں رائج ہے۔ اس طرح مصدر کو مفعول کے معنی میں استعمال کرنے کی اور بھی بہت سی مثالیں ہیں۔

لفظ قرآن کی جو تحقیق ہم نے بیان کی اس کے علاوہ علماء نے اور بھی بہت سی تحقیقات بیان کی ہیں مثلاً بعض محققین کا کہنا ہے کہ لفظ قرآن کا معنی جمع کرنا ہے۔ بعض کہتے ہیں یہ ”قرآن“ سے مشتق ہے۔ بعض کہتے ہیں ”قرنت الشئی بالشئی“ سے ہے یعنی ملنے ملانے وغیرہ کے معنی میں ہے۔ کیونکہ قرآن کی سورتیں اور آیات ایک دوسرے سے ملی ہوئی ہیں اس لیے اس کو قرآن کہتے ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ لفظ قرآن غیر مہوز ہے اور الف لام کے بغیر ہے۔ لیکن متفقین کے یہ تمام اقوال تکلف سے خالی نہیں ہیں اور ان تمام اقوال میں کوئی نہ کوئی اشکال ضرور وارد ہوتا ہے۔

میرے نزدیک بہترین قول یارائے یہ ہے کہ لفظ قرآن مہوز ہے۔ اور ہمزہ تخفیف کے لیے حذف کیا گیا ہے۔ پھر جب اس کو کلام الہی کا نام رکھ دیا گیا تو اس پر الف لام بھی داخل کر دیا گیا۔ یاد رہے یہ الف لام تعریف کے لیے نہیں ہے بلکہ اس کی اصل کی طرف اشارے کے لیے ہے۔

قرآن کا ایک نام ”فرتان“ بھی ہے۔ فرتان کی اصل بھی مصدر ہی ہے۔ جیسے قرآن مصدر ہے اور کلام الہی کا نام ہے، ایسے ہی فرتان بھی مصدر ہے اور کلام الہی کا نام ہے۔ فرتان فاعل کے معنی میں بھی ہے اور مفعول کے معنی میں بھی۔ اگر فرتان فاعل کے معنی ہو تو اس کا مطلب ہوگا حق اور باطل کے درمیان فرق کرنے والا۔ اور اگر یہ مفعول کے معنی میں ہو تو اس کا مطلب ہوگا کہ اس کلام کی

ہر ہر سورت اور ہر آیت جدا جدا اور واضح ہے۔ یعنی یہ کلام خلط ملط نہیں ہے بلکہ واضح اور جدا جدا آیات کا حامل ہے۔ مفعول کے معنی ہونے کی صورت میں اس کا ایک معنی یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس کلام کی آیات و سورتیں نزول کے اعتبار سے جدا جدا ہیں۔ فرقان کا لفظ خود قرآن مجید میں بھی مذکور ہے:

﴿تَبَارَكَ الَّذِي نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلَى عَبْدٍ لَّيَكُونَ لِلْعَالَمِينَ نَذِيرًا﴾ (الفرقان: ۱)

”وہ (خدائے عزوجل) بہت ہی بابرکت ہے جس نے اپنے بندے پر قرآن نازل فرمایا تاکہ اہل عالم کو ہدایت کرے۔“ کلام الہی کے یہ دونوں نام (القرآن اور الفرقان) باقی تمام اسماء میں سب سے زیادہ مشہور ہیں۔ بلکہ بعض مفسرین تو اس بات کے قائل ہیں کہ قرآن مجید کے باقی تمام اسماء میں یہ دونوں نام اصل اور مرجع کی حیثیت رکھتے ہیں۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے تمام اسماء معنی کے اعتبار سے اللہ تعالیٰ کی دو صفات یعنی جلال اور جمال کی طرف راجع ہوتے ہیں۔ قرآن کے دو ناموں کے علاوہ تین نام اور بھی ہیں جو مشہور ہیں۔ یعنی ① الکتاب ② الذکر ③ التنزیل۔

علمائے کرام نے قرآن مجید کے متعدد اسماء بتائے ہیں۔ صاحب البرہان نے قرآن مجید کے پچپن سے بھی زائد اسماء بتائے ہیں۔ اور صاحب التبیان کے مطابق بعض مفسرین نے تو تو سے سے بھی زائد نام قرآن مجید کے بتائے ہیں۔ لیکن ان تمام علماء نے قرآن مجید کے جو اتنے زیادہ اسماء بتائے ہیں وہ صرف اس وجہ سے ہیں کہ انھوں نے نام اور وصف کے اندر امتیاز نہیں رکھا۔ کسی بھی چیز کا ایک ذاتی نام ہوتا ہے اور ایک اس کا وصف ہوتا ہے جیسا کہ قرآن مجید میں ہے:

﴿إِنَّهُ لَقُرْآنٌ كَرِيمٌ﴾ (الواقف: ۷۷)

”کہ یہ بڑے رتبے کا قرآن ہے۔“

اس آیت میں لفظ کریم وصف کے طور پر مستعمل ہے جبکہ ”قرآن“ نام کے طور پر۔ اس کی ایک اور مثال:

﴿وَهَذَا إِذْ كَرَّمْنَاكُمْ أَتُونَا﴾ (الانبیاء: ۵۰)

”اور یہ مبارک نصیحت ہے جسے ہم نے نازل فرمایا ہے۔“

ہے۔ اس آیت میں لفظ مبارک وصف کے طور پر جبکہ ”ذکر“ نام کے طور پر مستعمل ہے۔ پس ”قرآن“ اور ”ذکر“ کلام اللہ کے نام ہیں جبکہ کریم اور مبارک وصف ہیں۔ قرآن مجید کے کون کون سے اسماء نام ہیں اور کون کون سے وصف۔ یہ ایک آسان مسئلہ ہے لیکن اچھا خاصا طویل ہے۔ اسی لیے محققین نے اس موضوع پر بہت سی کتب لکھی ہیں۔ لیکن جو بات ہم نے سمجھا دی ہے ان شاء اللہ وہی کافی و شافی ثابت ہوگی۔

## قرآن کی اصطلاح کے بارے میں

قرآن کلام اللہ ہے اور اللہ کا کلام انسان کے کلام کی طرح نہیں ہوتا۔ کیونکہ انسان حادث ہے تو اس کا کلام بھی حادث ہوا۔

”محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ“



## مسائل العرفان فی علوم القرآن: جلد ①

اللہ تعالیٰ قدیم ہیں تو ان کا کلام بھی قدیم ہوا۔ اللہ کے کلام سے کیا مراد ہے؟ کیا کلام کی مختلف اقسام ہیں؟ کیا زبان سے نکلنے والے الفاظ ہی کلام ہوتے ہیں یا دل و دماغ میں جو خیالات الفاظ کی شکل میں پائے جاتے ہیں وہ بھی کلام کہلاتے ہیں؟ ان تمام سوالوں کے جواب معلوم کرنے کے لیے درج ذیل بحث کو بھنا ضروری ہے۔

① **المعنی المصدری** • بعض اوقات انسان کے کلام سے معنی مصدری مراد لیا جاتا ہے۔ کلام کے معنی مصدری کا مطلب ہے: کسی بات کا تکلم و تلفظ کرنا۔

② **المعنی الحاصل بالمصدر** • بعض اوقات انسان کے کلام سے معنی حاصل بالمصدر مراد لیا جاتا ہے۔ معنی حاصل بالمصدر کا مطلب ہے: مُتَكَلِّمٌ بِهِ۔ یعنی وہ الفاظ جن سے گفتگو عمل میں آئی۔

مندرجہ ذیل بالا دونوں اقسام میں سے ہر ایک کی لفظی اور نفسی ہونے کے اعتبار دو قسمیں ہیں، جو کہ درج ذیل ہیں:

① **الكلام البشري اللفظي بالمعنى المصدری** • یعنی وہ بشری کلام جو لفظی ہو اور اس سے معنی مصدری مراد لیا جائے۔ اور وہ انسان کا اپنی زبان کو بلانا اور الفاظ کو ان کے خارج سے نکالنے کی کوشش کرنا ہے۔

② **الكلام البشري اللفظي بالمعنى الحاصل بالمصدر** • یعنی وہ بشری کلام جو لفظی ہو اور اس سے وہ معنی مراد لیا جائے جو مصدر سے حاصل ہوا ہے۔ اور وہ، وہ کلمات ہیں جن کو انسان تلفظ کر چکا ہو۔ اور وہ صوتِ حسی کی کیفیت میں موجود ہوں۔

③ **الكلام البشري النفسي بالمعنى المصدری** • یعنی وہ بشری کلام جو نفسی ہو اور اس سے معنی مصدری مراد لیا جائے۔ اور وہ انسان کا اپنے نفس (دل و دماغ) میں ان باتوں (کلمات) کا حاضر کرنا ہے، جن کا اثر انسان کے ظاہری جوارح یعنی زبان، کوہے، حلق یا زخروے وغیرہ کسی پر ظاہر نہیں ہوا ہوتا۔ پس کلام کی اس قسم میں متکلم اپنے ذہن میں کچھ کلمات کو تخیلاً ترتیب دیے ہوئے ہوتا ہے۔

④ **الكلام البشري النفسي بالمعنى الحاصل بالمصدر** • یعنی وہ بشری کلام جو نفسی ہو اور اس سے وہ معنی مراد لیا جائے جو مصدر سے حاصل ہوا ہے۔ اور وہ، وہ کلماتِ نفسیہ اور الفاظِ ذہنیہ ہیں جو ذہن اور نفس میں ترتیب دیے گئے ہوتے ہیں اور خارج میں نکلے ہوئے الفاظ ان کلماتِ نفسیہ اور الفاظِ ذہنیہ پر پورے پورے منطبق ہو رہے ہوتے ہیں۔

بالفہم دیگر کلام کی اس قسم سے ایسے مرتبہ کلمات مراد ہیں جو ذہن میں موجود ہوں اور خارج میں موجود مرتبہ کلمات ان پر پورے پورے منطبق ہو رہے ہوں۔

بشری کلامِ نفسی کی مثالیں قرآن و احادیث سے بھی ملتی ہیں۔ حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائی بنیامین کے بارے میں کہا تھا کہ بنیامین نے چوری کی ہے تو کوئی تعجب کی بات نہیں اس کا ایک بھائی اس سے پہلے بھی چوری کر چکا ہے۔ قرآن مجید میں ہے:

﴿فَاسْرَوْهَا يُوسُفُ فِي نَفْسِهِ وَكَمْ يَبْدُهَا لَهُمْ ۚ قَالَ أَنْتُمْ شَرٌّ مَكَانًا﴾ (یوسف: ۷۷)

”پس (اپنے بھائیوں کی بات سن کر) یوسف علیہ السلام نے ان پر ظاہر کیے بغیر چپکے سے (دل میں) کہا کہ: ”تم اس معاملے

میں کہیں زیادہ بُرے ہو۔“

حضرت یوسف علیہ السلام نے یہ کلام دل ہی دل میں کیا تھا زبان پر نہیں لائے تھے لیکن اللہ تعالیٰ نے اسے کلام شمار کیا ہے۔ اور یہ کلام نفسی کی بہت عمدہ مثال ہے۔

دوسری حدیث میں ہے جس کو طبرانی نے روایت کیا ہے۔

((عن امر سلمة انہا سمعت رسول اللہ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وقد ساله رجل فقال: انى لا حدث نفسي بالشيء ولو تكلمت به لا حبطت اجري. فقال عليه السلام لا يلقى ذلك الكلام الا مؤمن)).

”ایک شخص نے حضور اکرم ﷺ سے عرض کیا: (یا رسول اللہ ﷺ) میرے دل میں ایسی باتیں پیدا ہوتی ہیں کہ اگر میں اُن کو زبان پر لے آؤں تو میرا اجر ضائع ہو جائے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ((لا یلقى ذلك الكلام الا مؤمن)).“

”مومن کو ہی ایسے کلام کا القاء کیا جاتا ہے۔“

اب آپ غور کریں کہ نبی کریم ﷺ نے دل میں آنے والے خیالات کو کلام سے موسوم کیا، حالانکہ وہ ایسے ذہنی کلمات تھے کہ اس شخص نے اجر کے ضائع ہوجانے کے خدشے سے ان کے ساتھ کلام نہیں کیا۔ حضور ﷺ کی طرف سے اس طرح کے قلبی خیالات پر کلام کا اطلاق کرنا حقیقت پر محمول ہوگا، کیونکہ لفظ کا حقیقی معنی مراد لینا ہی اصل ہوتا ہے اور یہاں پر کوئی قرینہ صارفہ عن الحقیقتہ بھی موجود نہیں ہے۔

اسی طرح قرآن، کلام اللہ ہے، کبھی اس کے اطلاق سے کلام نفسی مراد ہوتا ہے اور کبھی اس کے اطلاق سے کلام لفظی مراد ہوتا ہے۔

صرف متکلمین اس پر کلام نفسی کا اطلاق کرتے ہیں، کیونکہ وہ ایک پہلو سے اللہ تعالیٰ کی صفات نفسیہ سے بحث کرتے ہیں اور دوسرے پہلو سے اس حقیقت کے معترف ہیں کہ قرآن، کلام اللہ ہے اور مخلوق نہیں ہے۔ اور جو اس پر کلام لفظی کا اطلاق کرتے ہیں وہ علمائے اصول، فقہاء اور علمائے عربیت ہیں۔ اگرچہ ان کے ساتھ متکلمین بھی ایک تیسرے اطلاق کے مطابق شریک ہیں۔ جس کی وضاحت بعد میں کی جائے گی۔

علمائے اصول، فقہاء اور علمائے عربیت نے قرآن پر کلام لفظی کا اطلاق اس لیے کیا ہے کہ ان کا اصل مقصد احکام پر استدلال کرنا ہے، اور استدلال، الفاظ سے ہی ہوا کرتا ہے، علماء عربیت کے ہاں امرِ اعجاز کا اہتمام ہوتا ہے۔ اس اعتبار سے ان کا مطمح نظر بھی الفاظ ہوتے ہیں۔

نیز متکلمین کے ہاں کتب منزلہ پر ایمان کے وجوب کو ثابت کرنا بھی ہوتا ہے، ان کتب میں قرآن حکیم بھی ہے، نیز قرآن کے عجزہ سے نبوت رسول ﷺ کا اثبات بھی ان کے پیش نظر ہوتا ہے، اور بدیہی سی بات ہے کہ ان تمام امور کا تعلق الفاظ سے ہے۔ بذاتیہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کہ متکلمین نے اس تیسرے اطلاق کے مطابق ان علمائے اصول کے قول کو اختیار کیا ہے۔

”محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ“

قرآن، متکلمین کی نظر میں جگہ کرتے ہیں۔  
متکلمین جب قرآن پر کلامِ نفسی کا اطلاق کرتے ہیں تو وہ اس میں دو امور کا لحاظ کرتے ہیں۔

① قرآن، ایک علم ہے، یعنی ایسا کلام ہے جو کلامِ الہی کے ماسوا ہر طرح کے کلام سے ممتاز حیثیت رکھتا ہے۔

② قرآن، کلامِ اللہ ہے اور کلامِ اللہ قدیم اور غیر مخلوق ہے۔ لہذا اس کا حوادث اور عوارض سے منزہ ہونا ضروری ہے۔ آپ کے علم میں ہے کہ کلامِ نفسی بشری کا اطلاق بھی دو چیزوں پر ہوتا ہے۔ ایک معنی مصدری پر دوسرا حاصل مصدر پر۔ اللہ کے کلامِ نفسی کا اطلاق بھی ان ہی دو معانی پر ہوتا ہے۔ ایک بشر کے لیے معنی مصدری کی نظیر پر، دوسرا بشر کے لیے حاصل مصدر کی نظیر پر۔

ہم نے ”نظیر پر“ اس لیے کہا کہ یہ بات طے شدہ ہے کہ اللہ کے کلامِ نفسی کا خلق اور اشاہِ خلق سے منزہ ہونا ضروری ہے۔ اس لیے انہوں نے معنی اؤل کے اعتبار کے ساتھ اس کی تعریف کی کہ وہ بشر کے معنی مصدری کے، مشابہ ہے، چنانچہ انہوں نے اس کی تعریف یوں کی کہ:

”قرآن ایسی صفت قدیمہ ہے جس کا تعلق کلماتِ حکمیہ سے ہے، سورتِ فاتحہ سے لیے کر سورتِ ناس کے آخر تک۔“ ۱

اور یہ ازلی کلمات ہیں جو لفظی، ذہنی اور روحانی حروف سے مبرا ہیں۔ اور یہ مترتب ہیں، متعاقب نہیں ہیں، جیسا کہ کوئی صورت آئینہ میں منعکس ہوئی ہے مترتب ہوتی ہے متعاقب نہیں ہوتی۔

ان حضرات نے اس کی تعریف میں جو یہ کہا کہ وہ کلمات ”حکمیہ“ ہوتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ کلمات، حقیقی الفاظ نہیں ہوتے جن کی صورت حروف اور اصوات کے ساتھ ہو۔ نیز انہوں نے اس کی تعریف میں ”ازلیہ“ کا ذکر اس لیے کیا ہے، تاکہ ان کلمات کے لیے قدیم ہونے کا معنی ثابت ہو جائے، اور اس کی تعریف میں جو یہ کہا کہ: ”وہ لفظی، ذہنی اور روحانی حروف سے مبرا ہوتے ہیں۔“ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کلمات کا مخلوق ہونا منہی ہو سکے۔ اسی طرح تعریف میں یہ کہا کہ: ”وہ متعاقب نہیں ہیں۔“ اس لیے کہ تعاقب، زمانہ کو مستلزم ہوتا ہے۔ اور زمانہ، حادث ہے۔ ان کلمات کے لیے ترتیب کو اس وجہ سے ثابت کیا کہ یہ بالکل بدیہی ہے کہ قرآن، حقیقت مرتبہ ہے، بلکہ اپنی کمالی ترتیب و تالیف کی بناء پر ممتاز درجہ کا حامل ہے۔

جب متکلمین کے نزدیک اس کا اطلاق اول معلوم ہو گیا تو قرآن حکیم کا ان کے ہاں اطلاقی ثانی کا سمجھنا آسان ہوگا۔ اور وہ یہ ہے کہ قرآن، ایسے کلماتِ حکمیہ، ازلیہ، مرتبہ کا نام ہے جن میں تعاقب نہ ہو اور حروفِ لفظیہ، ذہنیہ اور روحانیہ سے مبرا اور خالی ہو۔ یہ کلامِ اللہ کی ایسی تعریف ہے جو کلامِ بشری نفسی کے حاصل مصدر والے معنی کے بہت مشابہ ہے۔

یہ قرآن کے دو اطلاقات ہیں عند المتکلمین، جیسا کہ آپ کو معلوم ہوئے۔ اس کے علاوہ متکلمین کے نزدیک قرآن کا ایک تیسرا اطلاق بھی ہے، لیکن اس میں علماءِ اصول، فقہاء اور علماءِ عربیت بھی شریک ہیں۔ اور وہ تیسرا اطلاق یہ ہے:

”قرآن، نام ہے ان الفاظ کا جو سورۃ الفاتحہ سے سورۃ الناس کے آخر تک نبی کریم ﷺ پر نازل ہوئے۔“

جو ان خصوصیات کی بناء پر امتیازی شان رکھتا ہے جن کا ذکر ہم کچھ دیر بعد کریں گے۔

یہ تیسرا اطلاق دراصل ان ہی کلماتِ حکمیہ ازلیہ کے مظاہر اور صورتوں سے عبارت ہے جن کی طرف ہم نے ابھی اشارہ کر دیا ہے۔ علاوہ ازیں قرآن کا اطلاق چوتھے اطلاق کے اعتبار سے ان نقوش پر بھی ہوتا ہے جو مصحف کی دو جلدوں کے درمیان مرقوم ہیں

اس اعتبار سے کہ وہ نقوش، صفتِ قدیمہ، شبی کلمات اور نازل شدہ الفاظ پر دلالت کرتے ہیں۔ یہ اطلاق شرعی اور عام ہے۔ ہم اس کی مثال سے وضاحت کیے دیتے ہیں تاکہ بات واضح ہو جائے کیونکہ یہ ایسا موقع ہے جہاں انسان کی عقل بھٹک جاتی ہے اور قدم پھسل جاتے ہیں۔ ایک شاعر آدی ہے، جیسے شرف الدین بوسیری رحمۃ اللہ علیہ، اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ اپنے دل میں شاعری کی صلاحیت رکھتے تھے، انہیں اس بات کی مہارت تھی کہ جیسے چاہتے عمدہ قصیدے بنا لیتے۔ لیکن جب انہوں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شانِ مدح اپنے معروف قصیدہ ہمزئیہ میں بیان کی تو اس وقت ان کی شاعری کی حقیقت سب کے سامنے آئی کہ بلاشبہ انہوں نے اپنے دل و دماغ میں پہلے الفاظ، معانی اور اوزان کا چناؤ کر کے ایک نظم کو تیار کیا پھر اس سے ایک ایسا پر اتر قصیدہ سامنے آیا کہ جب حسی صوت میں اسے پڑھا تو پورا مفتی اور موزون شکل میں تھا۔ اس کے بعد انہوں نے اس قصیدہ کو اپنی زبان سے پڑھا۔ پھر پڑھنے کے بعد اس کو لکھا۔ چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شانِ مدح میں پڑھا جانے والا یہ قصیدہ ہمزئیہ ایسا ہے کہ ہم اس پر مذکورہ قرآن کے چاروں اطلاقات کا اطلاق کر سکتے ہیں۔ ہم اس قصیدہ ہمزئیہ کا اطلاق اس آدی کی قوتِ شاعری پر کر سکتے ہیں اس خاص نظم کے اعتبار سے جس (نظم) کی اس آدی نے اپنے ذہن میں الفاظ و نقوش سے پہلے صورت تیار کی، اور ہم اس کا اطلاق اس خاص نظم پر بھی کر سکتے ہیں جس کی اس نے اپنے ذہن میں صورت بنائی اس سے پہلے کہ وہ اس کے الفاظ و نقوش کی صورت کو ظاہر کرے۔

نیز ہم اس کا اطلاق اس نظم پر کر سکتے ہیں بعد اس کے کہ اس آدی نے اس نظم کے اصوات، الفاظ، نقوش اور حرف موزونہ بنا لیے۔

اسی طرح ہم اس نظم پر اس کا اطلاق کر سکتے ہیں جب کہ وہ نظم اپنی مرسوم صورت اور مکتوب نقوش میں متشکل ہو چکی ہو۔

**قرآن، علماء اصول، فقہاء اور علمائے عربیت کے نزدیک**

دقیق اور پرخطر ہے۔ لہذا آپ اس طویل بحث سے تنگ دل نہ ہوں۔ میں نے قرآن کے معنی و مفہوم کے بیان کا جو وعدہ کیا تھا اسے توجہ سے ملاحظہ کریں کہ قرآن کا اطلاق ان الفاظ پر ہوتا ہے جو سورۃ الفاتحہ سے لے کر سورۃ الناس کے آخر تک نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئے۔ جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ اس اطلاق کی نسبت، علماء اصول، فقہاء اور علماء عربیت کی طرف کی جاتی ہے، متکلمین حضرات بھی اس میں ان کے ہم نوا ہیں۔ لیکن فرق یہ ہے کہ جن لوگوں نے اس کا اطلاق مذکورہ تعریف (حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل شدہ الفاظ) پر کیا ہے، ان کا اس کی تعریف میں باہم اختلاف ہے۔ بعضوں نے اس کی تعریف میں اطناب اور طوالت سے کام لیا ہے کہ اس میں قرآن کریم کے تمام ممتاز اوصاف و خصائص کا بھی ذکر کیا ہے۔ اور بعضوں نے اس کی تعریف میں اختصار سے کام لیا ہے اور کچھ لوگوں نے اس میں اعتدال اور توسط سے کام لیا ہے۔ چنانچہ جن لوگوں نے اس کی تعریف میں طوالت سے کام لیا ہے، انہوں نے اس کی تعریف یوں کی ہے:

”قرآن وہ کلام معجز ہے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا، مصاحف میں لکھا گیا، تو اتر کے ساتھ نقل کیا گیا اور جس کی تلاوت امرِ تعبدی کے طور پر کی جاتی ہے۔“

آپ ملاحظہ کر رہے ہیں کہ یہ تعریف کتنی جامع ہے کہ اس میں قرآن کے اعجاز، حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر اس کے نزول، مصاحف میں

اس کا مکتوب ہونا، تو اتر کے ساتھ منقول ہونا اور تلاوت امرِ تعبدی ہونا سب کو شامل ہے۔ یہی وہ عظیم خصوصیات ہیں جن کی بناء پر قرآن کریم دیگر کتب سے ممتاز ہوتا ہے۔ اگرچہ ان کے علاوہ اور خصوصیات بھی ہیں جن کی وجہ سے قرآن پاک امتیازی شان رکھتا ہے۔ آپ پر یہ بات مخفی نہیں کہ مذکورہ تعریف میں صرف بعض اوصاف کا ذکر کر دینا کافی تھا، اس طرح بھی تعریف جامع و مانع ہو جاتی، لیکن چون کہ یہ مقام، مقامِ تعریف ہے اس لیے اس کے مناسب یہی تھا کہ تعریف میں طوالت سے کام لیا جائے، تاکہ اس کی مزید وضاحت کا مقصد حاصل ہو۔

اسی مقصد کی خاطر علماء نے اس کی تعریف میں خوب اضافہ کیا۔

جن لوگوں نے اس کی تعریف میں اختصار سے کام لیا، ان میں کچھ لوگ تو وہ ہیں جنہوں نے صرف ایک وصف یعنی قرآن کے اعجاز کے ذکر کرنے پر اکتفاء کیا۔ اور اس اکتفاء کے بارے میں ان کا نقطہ نظر یہ ہے کہ اعجاز، قرآن کا وصفِ ذاتی ہے۔ نیز یہ نبی کریم ﷺ کی صداقت کی بڑی نشانی ہے اور اس بات پر شاہدِ عدل ہے کہ قرآن اللہ کا کلام ہے۔

اور ان میں کچھ لوگ وہ ہیں جنہوں نے دو اوصاف پر اکتفاء کیا، یعنی قرآن کا نزول اور اعجاز۔ ان لوگوں کی دلیل یہ ہے کہ ان دو اوصاف کے علاوہ دیگر امور، قرآن کی صفاتِ لازمہ میں سے نہیں ہیں، جس کی دلیل یہ ہے کہ قرآن حکیم، عہدِ نبوت میں صرف ان ہی دو صفات کے ساتھ حقیقت میں ثابت ہوا ہے۔ اور ان میں کچھ لوگ وہ ہیں جنہوں نے مصاحف میں مکتوب ہونے اور تواتر کے ساتھ منقول ہونے کے دو اوصاف کے ذکر کرنے پر اکتفاء کیا، کیونکہ ان دونوں وصفوں سے اصل مقصد حاصل ہو جاتا ہے۔ اور وہ اصل مقصد، قرآن کا بیان اور ماسوا سے اس کو ممتاز کرنا ہے۔

جن لوگوں نے اس کی تعریف میں اعتماد اور توسط سے کام لیا، ان میں بھی کچھ لوگ وہ ہیں جنہوں نے صرف نزول الفاظ، مصاحف میں اس کی کتابت اور تواتر کے ساتھ اس کا نقل ہونا ذکر کیا ہے۔ اور اس کی توجیہ وہ یہ کرتے ہیں کہ اصل مقصد یہ ہے کہ جن لوگوں نے نبوت کا زمانہ نہیں پایا ان کو قرآن سے روشناس کرایا جائے چنانچہ ایسے لوگوں کے لیے مذکورہ تین اوصاف کافی ہوں گے۔ جبکہ قرآن کا اعجاز ایسے لوگوں کی نسبت سے بیان کرنا ضروری نہیں ہے اور وصفِ لازم بھی نہیں ہے، جب کہ یہ قرآن کی سورت سے کم ہو۔

ان میں کچھ لوگ وہ ہیں جنہوں نے تعریف میں صرف نزول الفاظ، نقل تواتر اور تلاوت کا امرِ تعبدی ہونا ذکر کیا ہے، جس کا سبب یہ ہے کہ علماء اصول کی غرض و مقصد کے یہی مناسب ہے۔ چنانچہ انہوں نے قرآن کی تعریف ان الفاظ کے ساتھ کی ہے:

”اللفظ المنزل علی النبی ﷺ المنقول عنہ بالتواتر، المتعبد بتلاوته۔“

”قرآن نام ہے ان الفاظ کا جو نبی کریم ﷺ پر نازل ہوئے۔ آپ ﷺ سے تواتر کے ساتھ نقل ہوئے اور جن کی تلاوت امرِ تعبدی کے طور پر کی جاتی ہے۔“

اس تعریف میں ”اللفظ“ بمنزلہ جنس کے ہے جو مفرد اور مرکب دونوں کو شامل ہے، اور اس میں کوئی شک نہیں کہ احکام پر استدلال جس طرح مرکبات سے ہوتا ہے اسی طرح مفردات سے بھی ہوتا ہے، جیسے عام، خاص، مطلق، مقید۔ اس تعریف کے الفاظ ”المنزل علی النبی صلی اللہ علیہ وسلم“ سے خارج ہو جاتے ہیں ایسے الفاظ جو بالکل نازل ہی نہیں ہوئے جیسے ہمارا کلام، اور

”محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ“

## منائل العسرفان فی علوم القرآن: جلد ①

حدیث نبوی ﷺ، نیز اس سے وہ الفاظ بھی تعریف سے خارج ہو جاتے ہیں جو غیر نبی ﷺ پر نازل ہوئے ہوں، جیسے تورات، انجیل، اسی طرح ”المنقول عنہ بالتواتر“ کی قید سے وہ تمام الفاظ بھی تعریف سے خارج ہو جائیں گے جو قرآن کے ماسوا ہیں، جیسے منسوخ التلاوة اور قراءات غیر متواترہ، خواہ وہ قراءات مشہورہ ہوں جیسے قراءت ابن مسعود رضی اللہ عنہ میں ﴿فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلَاثَةِ أَيَّامٍ﴾ (البقرہ: ۱۸۶) کے بعد ”متتابعات“ کے الفاظ آتے ہیں، یا وہ قراءات آحاد ہوں، جیسے ابن مسعود رضی اللہ عنہ ہی کی قراءت میں ﴿وَمَنْ كَانَ مَرِيضًا أَوْ عَلَى سَفَرٍ...﴾ (البقرہ: ۱۸۵) کے بعد ”متتابعات“ کے الفاظ ہیں۔ کیونکہ ان میں سے کوئی لفظ بھی ایسا نہیں جسے ہم ”قرآن“ کے ساتھ موسوم کریں یا اس کو قرآن کا حکم قرار دیں۔ مذکورہ تعریف میں ”المتعبد بتلاوته“ کی قید سے احادیث قدسیہ خارج ہو جائیں گی۔

ہم پہلے یہ بات ذکر کر چکے ہیں کہ قرآن کا اطلاق صفت قدیمہ پر ہوتا ہے، نیز اس کا کیا ”قرآن“ اسم علم ہے؟ اطلاق کلمات حکمیہ ازلیہ پر بھی ہوتا ہے۔

قرآن کے ان دو اطلاقات میں تعدد بالکل نہیں ہے، نہ حقیقت کے اعتبار سے اور نہ ہی مجاز کے لحاظ سے۔ بلکہ دونوں اس سے منشی ہیں۔ اس لیے کہ تعدد، حدث کی علامت ہے۔ لہذا یہ کیسے ممکن ہے کہ اس میں تعدد ہو، حالانکہ یہ دونوں اطلاقات قدیم ہیں۔ یہ امر یقینی ہے کہ ان دو اطلاقات کے لحاظ سے لفظ قرآن ایک اسم علم ہے۔ لیکن جب قرآن سے ”لفظ منزل“ مراد ہوگا تو اس صورت میں اختلاف ہوگا۔

البتہ درست رائے یہ ہے کہ یہ اسم علم ہے، اس کا مدلول وہ آیات منزلہ ہیں جو سورۃ الفاتحہ کی ابتداء سے لے کر سورۃ الناس کے آخر تک اپنی بلند خصوصیات کے ساتھ ممتاز درجہ رکھتی ہیں۔ ان الفاظ معینہ کے تشخص اور اسم علم ہونے میں تلفظ کرنے والوں کا اختلاف یا قراءت کرنے والوں کا تعدد کوئی قدغن نہیں لگاتا ہے۔ مثلاً محمود کا مکہ یا مدینہ میں ہونا اس کے اسم علم ہونے میں کوئی عیب نہیں لگاتا، اور اسی طرح اگر محمود (مثال کے طور پر) زمانہ طفولت سے زمانہ شیخوخت میں منقلب ہوتا ہے یا صحت سے مرض کی طرف یا زندگی سے موت کی جانب پلٹتا ہے تو اس سے اس کا اسم علم ہونا برقرار ہی رہے گا۔

بعض اہل علم نے قرآن کو علم جنس قرار دیا ہے، اس کا منشاء، قارئین اور کاتبین کے تعدد کی وجہ سے اس کے الفاظ منزلہ کا تعدد ہے۔ لیکن یہ قول بدو وجہ مردود ہے:

① علم جنس ایک نحوی ضرورت ہے جس کا تقاضا لفظی احکام کرتے ہیں، جیسے اس کی دوسرے اسم کی طرف اضافت کا ناجائز ہونا اور الف لام کا اس پر دخول ممنوع ہونا، حالانکہ اس مقام پر کوئی لفظی ضرورت موجود نہیں ہے۔

② علم جنس معنی کے اعتبار سے نکرہ ہوتا ہے، اور اس کے افراد حقیقتاً متعدد ہوتے ہیں نہ کہ اعتباراً۔ حالانکہ یہاں پر قابل لحاظ تعدد صرف اعتباری ہوتا ہے۔ حقیقی نہیں ہوتا۔ کیونکہ یہ بات قطعی ہے کہ ہم میں سے جو بھی اس قرآن کو پڑھتا ہے یا لکھتا ہے تو یہ بعینہ قرآن ہے، اس کا کوئی فرد نہیں ہے۔

اب ہمارے ذمہ یہ بات بتانا باقی ہے کہ اگر ”قرآن“ اسم علم ہے تو پھر کیا اسم علم، تعریف کو قبول کرتا ہے؟ یہ تعریف (معرفہ ہونا) کو کیسے قبول کرتا ہے؟ جبکہ تعریف تو صرف کلیات



کے مسائل العسرفان فی علوم القرآن: جلد ①

کی ہوتی ہے، جو اسمِ علم ہو وہ تو کلی نہیں ہوتا بلکہ جزئی ہوتا ہے جو ماہیت اور اس کی مشخصات سے مرکب ہوتی ہے۔ اور مشخصات کی معرفت صرف جو اس سے ہی ممکن ہوتی ہے، جیسے اشارہ سے اسمِ علم کو تعبیر کیا جاتا ہے؟

ہم اس کے تین جوابات دیتے ہیں:

① ہم یہ بات تسلیم نہیں کرتے کہ تعریف صرف کلیات کی ہوتی ہے۔ یہ بات کیوں کر ناجائز ہے کہ جزئیات کی ایسے امورِ کلیہ کے ساتھ تعریف کی جائے جن کا مجموعہ خارج میں صرف اسی شخص میں تحقق ہو؟ یہ جواب، تقریباً وہی ہے جو صاحبِ تلوح نے دیا ہے، اس لیے کہ صاحبِ تلوح لکھتے ہیں کہ:

”تحقیقی امر یہ ہے کہ ایک شخص کی ایسے امور کے ساتھ تعریف کرنا ممکن ہے کہ جس سے اس کا اپنے ماسوا سے وجود کے اعتبار سے امتیاز کا فائدہ حاصل ہو، نہ کہ ایسے امور سے کہ اس سے اس کا تشخص اور تعین معلوم ہوتا ہو اس طرح سے کہ عقل کے اعتبار سے اس کا کثیر افراد میں اشتراک ناممکن ہو، کیونکہ یہ امر صرف اشارہ کے ذریعہ ہی حاصل ہو سکتا ہے۔“

② ہم تسلیم کرتے ہیں کہ تعریف صرف کلیات کی ہوتی ہے، لیکن ان حضرات نے جو چیز ذکر کی ہے وہ اس کی حقیقی تعریف نہیں ہے بلکہ صرف ایک ضابطہ ہے جس سے دیگر امور سے امتیاز ہو جاتا ہے، کوئی مُعَرِّف نہیں ہے۔

③ مذکورہ تعریف اصل میں ان علماء اصول کی رائے کے مطابق کی گئی ہے جو تعریف میں جنس اور فصل کی شرط نہیں لگاتے، بلکہ ان کے نزدیک تعریف کے لیے بس جامع دماغ ہونا ضروری ہے۔ بنا بریں علماء اصول کی رائے میں ایک شخص کی تعریف کرنا درست قرار پائے گا، جبکہ منطق کی رائے اس کے خلاف ہے۔

”قرآن“ کا کل اور بعض پر اطلاق کرنا

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ قرآن کا اطلاق کل اور بعض دونوں پر کیا جاتا ہے، کیونکہ جو شخص پورا قرآن پڑھے اس کے بارے میں

بھی کہا جاتا ہے کہ اس نے قرآن پڑھا اور جو شخص قرآن کی ایک آیت تلاوت کرے اس کے بارے میں بھی یہ کہا جاتا ہے کہ اس نے قرآن پڑھا۔ لیکن اہل علم کا اس بارے میں کچھ اختلاف ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ لفظ قرآن ان دونوں کے حق میں حقیقت ہے، اس صورت میں یہ مشترک لفظی ہوگا، جبکہ بعض کا خیال ہے کہ لفظ قرآن ان دونوں کے حق میں حقیقت نہیں بلکہ مقدر ہے، اس صورت میں یہ مشترک معنوی ہوگا اور اس کا مدلول کلی ہوگا۔ نیز یہ بھی کہا گیا ہے کہ قرآن کا اطلاق ”کل“ پر حقیقت اور ”بعض“ پر مجاز ہے۔ جبکہ امر محقق یہ ہے کہ لفظ قرآن، مشترک لفظی ہے۔ جس کی دلیل یہ ہے کہ اس کے اطلاق سے متبادرتی الذہن کل اور بعض دونوں ہوتے ہیں۔ اور یہ چیز حقیقت کی علامت ہے۔ قرآن کے اسمِ علم ہونے کا قول، جیسا کہ ہم کچھ پہلے تحقیق کے ساتھ بیان کر چکے ہیں، یہ چیز اس کے مشترک معنوی مراد لینے سے مانع ہے۔ لہذا یہ بات متعین ہو گئی کہ یہ مشترک لفظی ہے۔ فقہائے کرام کے کلام سے بھی یہی بات معلوم ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر فقہاء نے لکھا ہے کہ:

”عربی شخص کے لیے قرآن کا پڑھنا حرام ہے۔“

اس سے ان کی مراد عام ہے خواہ سارا قرآن ہو یا اس کا کچھ حصہ، مطلقاً اس کے پڑھنے کی حرمت مراد ہوتی ہے۔

## مسائل العرفان فی علوم القرآن: جلد ①

”علوم القرآن“ کا معنی اضافی کے اعتبار سے مفہوم ہے۔ بارے میں علمائے کرام کی بحث و گفتگو کو ختم کر

چکے۔ اب ہم آپ کے سامنے یہ بات بتاتے ہیں کہ ”علوم القرآن“ کے الفاظ میں علوم کی القرآن کی طرف اضافت کرنا قرآن سے متعلق بہت سے معارف کی طرف اشارہ کرتا ہے، خواہ وہ تصورات ہوں یا تصدیقات، جیسا کہ آپ اس سے پہلے تدوین عام کے عرف میں لفظ علم کے مدلول کے بارے میں اس کے انتخاب کی وجہ جان چکے ہیں۔ ”علوم القرآن“ سے اس بات کی طرف اشارہ موجود ہے کہ کوئی ایک علم نہیں بلکہ متعدد علوم کا اس قرآن سے تعلق ہے، اس میں ہر وہ علم شامل ہوگا جو قرآن کا خادم اور اس کی طرف مستند ہو۔ چنانچہ اس میں علم تفسیر، علم قراءات، علم رسم عثمانی، علم اعجاز القرآن، علم اسباب نزول، علم نسخ و منسوخ، علم اعراب قرآن، علم غریب قرآن، اور اس کے علاوہ دین و لغت کے علوم شامل ہیں۔ یہ مختلف علوم ہیں امام سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے ان میں وسعت اختیار کرتے ہوئے علم ہیئت، ہندسہ اور طلب وغیرہ کو بھی شامل کر دیا ہے، اس کے بعد انہوں نے ابو بکر بن العربی سے قانون التاویل کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ: ”قرآن کے علوم ستر ہزار چار سو پچاس (۷۷۵۰) ہیں، اور پھر کلمات قرآن کی تعداد کو مزید چار میں ضرب دی جائے گی، کیونکہ ہر کلمہ کا ایک ظاہر ہے اور ایک باطن، اسی طرح ہر کلمہ کی ایک حد ہے اور ایک مطلع۔ یہ حساب صرف مفردات کے لحاظ سے ہے، اگر اس کے ساتھ مرکبات اور ان کے مابین روابط کا بھی اعتبار کر لیا جائے تو پھر ان کی تعداد اشارے سے باہر ہوگی، جس کا علم، اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو نہیں ہو سکتا۔“

میں چاہتا ہوں کہ آپ یہ بات معلوم کریں کہ سیوطی اور ابن العربی کا یہ کلام، تاویل و توسع کے اعتبار سے ایک بہت بڑی ضرب پر محمول ہے بایں طور کہ ”علوم“ سے وہ تمام معارف مراد لیے جائیں جن پر قرآن دلالت کرتا ہے، خواہ وہ علوم مدونہ ہوں یا بغیر مدونہ، نیز خواہ وہ دلالت صراحتہ ہو یا اشارۃ، قریبی ہو یا بعیدی، کیونکہ اگر اس سے ان کی مراد علوم مدونہ صریحہ ہوں تو یقیناً یہ امر ایسا ہے کہ اس کا حصول بغیر مشقت عظیمہ کے ممکن نہیں ہے۔

قرآن، کتاب ہدایت و اعجاز ہے۔ اس موضوع پر تحقیقی قول یہ ہے کہ قرآن کریم، کتاب ہدایت اور کتاب اعجاز ہے، ان دو عظیم مقاصد کی وجہ سے اس کا نزول بھی ہوا اور ان ہی دو مقاصد کے بارے میں یہ بحث کرتا ہے اور ان پر دلالت کرتا ہے۔ لہذا جو علم بھی قرآن سے اس کی قرآنیئت کے پہلو سے تعلق رکھتا ہو یا اس کی ہدایت یا اعجاز کے پہلو سے قرآن سے تعلق رکھتا ہو وہ علوم قرآن کا حصہ ہے۔ یہ بات علوم دینیہ و عربیہ کے بارے میں تو بالکل واضح ہے۔

البتہ وہ علوم کونیہ یا معارف و صنائع، اسی طرح اس عالم میں جو فنون و معارف نئی سامنے آ رہے ہیں جیسے علم ہندسہ و حساب، علم ہیئت و فلکیات، علم اقتصادیات و معاشرت، علم طبیعیات، کیمیا و اور علم نباتات و حیوانات وغیرہ۔ ان کو علوم قرآن سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس لیے کہ قرآن کا نزول اس لیے نہیں ہوا کہ اس سے مثلاً ہندسہ و حساب کے نظریات معلوم ہوں اور نہ ہی اس لیے ہوا کہ اس کے قوانین کی تائید و تاکید کی جائے۔ اسی طرح یہ علم ہندسہ و حساب بھی اس لیے وضع نہیں ہوا کہ اس سے قرآن کی آیات کی تشریح میں مدد ملی جائے یا قرآن کے اسرار و رموز کو کھولا جائے۔ یہی حال دیگر علوم کونیہ اور عالمی صنائع و معارف کا ہے... یہ الگ بات ہے کہ

## منائل العرفان فی علوم القرآن: جلد ①

قرآن نے مسلمانوں کو ان فنون و علوم کو سیکھنے بلکہ بوقت ضرورت ان میں مہارت حاصل کرنے کی دعوت دی ہے۔ ہمارا ماننا یہ ہے کہ ان کائناتی اور صنعتی علوم و فنون کا علوم قرآن سے اس طرح تعلق نہیں ہے کہ وہ ان علوم کا حصہ ہوں، جبکہ قرآن ان کے سیکھنے کی دعوت دیتا ہے۔ اس لیے کہ ان دونوں باتوں میں بہت بڑا فرق ہے یعنی ایک تو قرآن کا ان فنون و صنائع کے سیکھنے کی عمومی یا خصوصی طور پر ترغیب دینا اور دوسرا یہ کہ قرآن کا کسی علم کے مسائل اور احکام پر دلالت کرنا اور اس کی طرف راہنمائی کرنا۔ یا ایسا علم جو قرآن کے احکام و مسائل یا اس کے مفردات کا خادم و معاون ہو۔ (ان امور میں بہت فرق ہے) پہلی بات تو بالکل واضح ہے کہ اس کا علوم قرآن سے کوئی تعلق نہیں ہے، جبکہ دوسری بات اس کے برخلاف ہے، اور اسی بات کی طرف ہم آپ کی راہ نمائی کرنا چاہتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ آپ اس کے حصول کی طرف راغب ہوں۔

قرآن کائناتی علوم سے انتفاع کی ترغیب دیتا ہے ﴿﴾ علوم اور عالمی صنعتوں کی معرفت کی ترغیب دیتا ہے اور اس بات پر مسلمانوں کو آمادہ کرتا ہے کہ وہ کائنات میں موجود ہر چیز سے انتفاع کریں۔ اللہ سبحانہ و تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿قُلْ اَنْظُرُوا مَا ذَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ﴾ (ہوس: ۱۰۱)

”آپ فرمادیں کہ تم غور کرو کہ آسمانوں اور زمین میں کیا ہے۔“

نیز ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيعًا لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ﴾ (الباقیہ: ۱۳)

”اور اس نے تمہارے لیے آسمان و زمین کی تمام تر چیزیں مسخر کر دیں، بلاشبہ اس میں غور و فکر کرنے والی قوم کے لیے نشانیاں ہیں۔“

ہم مسلمان ان احکامات کے مخاطب ہیں، اس لیے ان کے لیے یہ امر مناسب نہیں کہ وہ ان عمومی منافع سے کسی طرح بھی راہ فرار اختیار کریں، اور یہ بھی نامناسب ہے کہ ان کائناتی علوم سے بے رغبتی اختیار کریں۔ اسی طرح یہ بات بھی مناسب نہیں کہ اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ عظیم توفیق کو بروئے کار لاتے ہوئے اپنے آپ کو ان فوائد و ثمرات سے محروم کریں جو اس کی زمین و آسمان کے خزانوں میں موجود ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے علماء نے اس بات کی صراحت کی ہے کہ ان علوم کو نہی اور صنعتی فنون کا سیکھنا اور ان میں مہارت حاصل کرنا فرض کفایہ ہے۔ جب تک فرد یا جماعت کی مصلحت اس سے وابستہ رہے اور اس کی ضرورت پیش آتی رہی اس کا سیکھنا فرض کفایہ ہے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ اس دنیا میں اسی کو بقاء اور حیات حاصل ہے جو ہتھیار بند ہو اور ہر دور کا اسلحہ اور ہتھیار عام ہوتا ہے اور اس زمانے کا اسلحہ خاص ہے جو علوم و فنون اور مختلف صنعتوں میں سبقت اور مہارت حاصل کرنے پر مبنی ہے، جو ہم میں طاقت ور ہوگا وہی خوش بخت ہوگا اور جو کمزور ہوگا وہی بد قسمت اور باعث ہلاکت ہوگا۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِنْ قُوَّةٍ﴾ (الانفال: ۶۰)

”اور ان کے لیے حسب استطاعت ہر طرح کی قوت تیار رکھو۔“

مسلم شریف میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت میں ارشاد نبوی ﷺ ہے:

”طاقتور مومن کمزور مومن سے بہت بہتر ہے، خیر ہر ایک میں ہے، اس چیز میں حرص کرو جو تجھے نفع دے اور اللہ سے مدد چاہو اور بے بس نہ بنو، اگر کوئی بات تجھے پیش آئے تو یوں نہ کہو کہ اگر میں یوں کر لیتا تو یوں ہو جاتا، بلکہ یوں کہو کہ: اللہ نے مقدر فرما دیا تھا اور جو وہ چاہتا ہے وہی کرتا ہے، کیونکہ اگر تو شیطان کے عمل کو کھول دے گا.....“<sup>①</sup>

**قرآن کا سائنسی اعجاز**

میری خواہش ہے کہ میں اس موضوع کو ختم کرنے سے پہلے ایک قابل قدر اور لائق توجہ امر کی طرف آپ کو متوجہ کروں! وہ یہ ہے کہ قرآن کریم جب مخلوق پر اپنا اعجاز اور ہدایت پیش کرتا ہے تو ان کی عقلوں پر حکمرانی کرتا نظر آتا ہے اور لوگوں کی آنکھیں اس کائناتِ ارض و سماء کی جانب کھولتا ہے کہ وہ اس بروج، حیوانات و نباتات، ظواہر و بوطن، سنن و عادات میں غور و فکر کریں، نیز قرآن اپنے اس پیش کش میں سب کو پوری طرح اسباب و وسائل فراہم کرتا ہے، بلکہ وہ اس انداز پیش کش میں ایک کھلا ہوا مجزہ ہے، اس لیے کہ اس کائنات کے متعلق گفتگو وہ ذات کر رہی ہوتی ہے جو اس کائنات کے اسرار سے بخوبی واقف ہے، جو اس کے دقائق سے پوری طرح باخبر اور اس کے علوم و معارف کا احاطہ کیے ہوئے ہے، ٹھیک ایسے لمحہ میں ایک ایسا امی شخص اس قرآن کو لاتا ہے جس کی نشوونما بھی امی اور ان پڑھ قوم میں ہوئی تھی۔ ان علوم سے اور ان کی جمع و تدون سے اس قوم کا کوئی سروکار نہیں اور نہ ہی ان علوم کے مباحث اور ان کے لکھنے لکھانے سے اس کا کوئی واسطہ اور تعلق تھا، بلکہ ان میں سے بعض علوم تو عہد نبوت اور نزولِ وحی کے کئی صدیوں بعد وجود میں آئے، ایسے حالات میں ایک امی شخص یعنی حضور اکرم ﷺ کے لیے کیسے ممکن تھا کہ وہ ایسی جامع علوم و معارف کتاب لے آئیں! اگر یہ کہا جائے کہ یہ قرآن اس ذاتِ حکیم و علیم کی جانب سے نہیں ہے؟! اللہ تعالیٰ اس سائنسی اعجاز کی تصدیق کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

﴿وَمَا كُنْتَ تَسْمَعُ مِنْ قَبْلِهِ مِنْ كِتَابٍ وَلَا تَخْطُبُهُ بَيْنَ يَدَيْكَ إِذَا الْأَرْتَابُ الْمُهْبَطُونَ ﴿۳۹﴾ بَلْ هُوَ آيَاتٌ بَيِّنَاتٌ فِي صُدُورِ الَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ ۚ وَمَا يَجْحَدُ بِآيَاتِنَا إِلَّا الظَّالِمُونَ ﴿۴۰﴾﴾ (المکثوب: ۳۹، ۴۰)

”اور تم اس سے پہلے کوئی کتاب نہیں پڑھتے تھے اور نہ اسے اپنے ہاتھ سے لکھ ہی سکتے تھے ایسا ہوتا تو اہل باطل ضرور شک کرتے۔ بلکہ یہ روشن آیتیں ہیں جن لوگوں کو علم دیا گیا ہے ان کے سینوں میں (محفوظ) ہیں۔ ہماری آیتوں سے وہی لوگ انکار کرتے ہیں جو بے انصاف ہیں۔“

ممکن ہے یہ بات حکمت و ودانائی کی ہو کہ ہم آپ کے سامنے قرآن کریم سے دو نمونے بطور مثال پیش کرتے ہیں:

**پہلا نمونہ** ﴿سورة النور میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿الَمْ تَرَ أَنَّ اللَّهَ يُرْسِ سَحَابًا ثُمَّ يُؤَلِّفُ بَيْنَهُ ثُمَّ يَجْعَلُهُ رُكَّامًا فَتَكَرَى الْأُودُقُ يُخْرُجُ مِنْ خَلِيلِهِ ۚ وَيُنَزِّلُ مِنَ السَّمَاءِ مِنْ جِبَالٍ فِيهَا مِنْ بَرَدٍ فَيُصِيبُ بِهِ مَنْ يَشَاءُ ۚ وَيَصْرِفُهُ عَنْ مَنْ يَشَاءُ ۚ يَكَادُ سَنَا بَرْقِهِ يُذْهِبُ بِالْأَبْصَارِ ﴿۲۴﴾﴾ (النور: ۲۴)

”کیا تم نے نہیں دیکھا کہ خدا ہی بادلوں کو چلاتا ہے پھر ان کو آپس میں ملا دیتا ہے اور ان کو تہ بہ تہ کر دیتا ہے پھر تم دیکھتے ہو کہ بادل میں سے مینہ نکل (کربس) رہا ہے اور آسمان میں جو (ادلوں کے) پہاڑ ہیں ان سے اولے نازل کرتا ہے تو جس پر چاہتا ہے اس کو برسا دیتا ہے اور جس سے چاہتا ہے ہٹا دیتا ہے اور بادل میں جو بجلی ہوتی ہے اس کی چمک آنکھوں کو (خیرہ کر کے بینائی کو) اُچکے لیے جاتی ہے۔“

مجھے سچ بتائیے کہ ان آیات کو پڑھتے ہوئے، آپ کے قلب و ذہن کو اس کی اثر انگیزی نے نہیں گھیرا؟ اس میں سبح، مطر اور برقی جیسے طبعی امور نے کیسے کیسے سائنسی نظریات کو وجود دیا ہے!

دوسرا نمونہ ﴿﴾ اللہ تعالیٰ، سورۃ القیامت میں انسان کے اعادے اور بعث الموت پر اپنی کمالی قدرت کو ثابت کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

﴿يَحْسَبُ الْإِنْسَانُ أَنْ نَبْعَثَ عِظَامَهُ ۗ تَبٰلٰغًا ۗ قٰلِیْ قٰدِرِیْنَ عَلٰی اَنْ نُّسَوِّیْ بِنٰنٰہٗ ۙ﴾ (القیامت: ۴، ۳)

”کیا انسان یہ خیال کرتا ہے کہ ہم اس کی (بکھری ہوئی) ہڈیاں اکٹھی نہیں کریں گے۔ ضرور کریں گے اور ہم اس بات پر قادر ہیں کہ اس کی پور پور درست کریں۔“

مجھے امید ہے کہ آپ اس مقام پر خصوصیت سے بنان (پورے) کے ذکر پر ذرا غور کریں گے اور پھر موجودہ دور کے نو پیدا شدہ علم یعنی علم تحقیق شخصیت کو بھی ملاحظہ کریں گے تو یہ بات ثابت ہوگی کہ انسانی جسم میں سب سے دقیق اور عجیب ترین چیز پوروں کی درستی ہے، یہاں تک کہ کسی انسان کے پورے دوسرے کے پورے سے بالکل مشابہ نہیں ہو سکتے۔ اب لوگوں کا حال یہ ہے کہ اپنے بہت سے معاملات میں انسان کے اسی پورے کو فیصلہ کا ذریعہ قرار دیتے ہیں۔ فتبارک اللہ احسن الخالقین۔

میں چاہوں گا کہ میں اس بات کو ذرا طول دوں، قرآن کے معجزات علمیہ کو بیان کرنے کے لیے ایک الگ میدان ہے۔ یہ چند باتیں تھیں اور ایک اچکتی ہوئی نظر تھی جس سے علوم القرآن کی مراد کو واضح کرنا مقصود تھا۔ امام سیوطی رضی اللہ عنہ نے الاقان میں اس پر بھر پور کلام کیا ہے اور ابن العربی رضی اللہ عنہ نے قانون التاویل میں اس بارے میں جو کچھ ذکر کیا ہے ہم اس سے معذرت کرتے ہیں۔

اللہ کی ذات ہی اپنی کتاب کے اسرار کا احاطہ کرنے والی ہے۔ یہ کائنات اور اس میں پیدا ہونے والے تمام علوم و فنون سب برابر اس قرآن کی تشریح و تفسیر کرتے رہیں گے اور اس قرآن کے اسرار و اعجاز کے بہت سے پہلوؤں کو بے نقاب کرتے رہیں گے۔ اس بات کی تصدیق اس زبان باری تعالیٰ سے ہوتی ہے:

﴿سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْأَفَاقِ وَفِي أَنْفُسِهِمْ حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ ۗ﴾ (نفلت: ۵۳)

”ہم عنقریب ان کو اطراف (عالم) میں بھی اور خود ان کی ذات میں بھی نشانیاں دکھائیں گے یہاں تک کہ ان پر ظاہر ہو جائے گا کہ (قرآن) حق ہے۔“

نیز فرمان باری تعالیٰ ہے:

﴿وَاللَّهُ غَالِبٌ عَلَىٰ أَمْرِهِ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ﴾ (یوسف: ۲۱)

”اور خدا اپنے کام پر غالب ہے اور لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔“

علوم قرآن، فن مدون کے اعتبار سے اور اس کا موضوع اور فائدہ **حج** بات معلوم ہو گئی کہ اس سے پہلے آپ کو یہ

”علوم القرآن“ کا لفظ اپنے معنی اضافی کے اعتبار سے تمام علوم دینیہ و عربیہ کو شامل ہے، اب ہم آپ کو اس بات کا فائدہ دیتے ہیں کہ یہ لفظ اس معنی اضافی سے منقول ہو کر بعد میں ایک مدون فن کے لیے بطور علم استعمال ہونے لگا۔ اور منقول ہونے کے بعد اس کا مدلول بن گیا ہے اور اب یہ علم ہے جو کہ منقول ہونے سے پہلے اس کا مدلول نہیں تھا بلکہ ایک مرکب اضافی تھا، جس کی وجہ ظاہر ہے کہ یہ فن، علوم دینیہ و عربیہ کے مجموعہ کا نام نہیں ہے بلکہ اس کے علاوہ ہے۔ اگرچہ ان علوم سے مستفاد ضرور ہے اور اس سے اخذ کردہ ہے۔ ہم اس کی تعریف یوں کر سکتے ہیں کہ یہ چند مباحث ہیں جو نزول و ترتیب، جمع و کتابت، قراءت و تفسیر و اعجاز، ناخ و منسوخ اور دفع شہبات وغیرہ کے اعتبار سے قرآن حکیم سے تعلق رکھتے ہیں۔

اور اس کا موضوع تعریف میں مذکور پہلوؤں کے پیش نظر قرآن کریم ہے۔

جبکہ معنی اضافی کے اعتبار سے علوم القرآن اس کے برخلاف ہے، کیونکہ اس کا موضوع ان علوم کے موضوعات کا مجموعہ ہے جو اس کے تحت داخل ہیں، ان میں سے ہر ایک کا موضوع قرآن کریم ہے ان پہلوؤں میں سے کسی ایک پہلو کے اعتبار سے۔ مثال کے طور پر علم قراءات کا موضوع قرآن کریم ہے اس کے لفظ اور ادا کے پہلو سے، علم تفسیر کا موضوع بھی قرآن کریم ہے اس کی تشریح اور مفہوم کے اعتبار سے۔ اسی طرح دیگر علوم قرآن کا حال سمجھ لیجیے۔

اس علم کا فائدہ قرآن کریم کی عام اور بلند ثقافت اور اس میں موجود قیمتی علوم و معارف سے آگاہی ہے، اس کے ذریعہ کتاب عزیز کی بہترین دفاع کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے، نیز اس علم سے قرآنی تفسیر میں غوطہ زنی کرنا آسان ہو جاتا ہے گویا یہ علم مفسرین کے لیے ایک کنجی کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس اعتبار سے اس کی مثال علوم حدیث کی بھی ہے اس کے لیے جو علم حدیث پڑھنا چاہتا ہو۔

امام سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب ”الالاتقان“ کے خطبہ میں اس بات کی تصریح کی ہے، چنانچہ وہ فرماتے ہیں کہ: ”میں زمانہ طالب علمی میں مشفقین علماء سے تعجب کیا کرتا تھا کہ انہوں نے علوم قرآن کی انواع پر کوئی کتاب مدون نہیں کی، جیسا کہ علم حدیث کی نسبت سے کتابیں لکھی ہیں۔“

پھر میں نے ”الہدایاں فی علوم القرآن“ کے مصنف رحمۃ اللہ علیہ کو بھی دیکھا کہ انہوں نے بھی اسی بات کی طرف اشارہ کیا ہے، انہوں نے اپنی کتاب کے شروع ہی میں یہ الفاظ لکھے ہیں:

”وهذا هو المقدمة الصغرى من مقدمته التفسیر“



یعنی یہ تفسیر کے دو مقدموں میں سے چھوٹا مقدمہ ہے۔

اس علم کا نام جمع کے ساتھ علوم القرآن رکھا گیا ہے، اس میں اس طرف اشارہ ہے کہ یہ علم، متنوع علوم کا حاصل اور خلاصہ ہے، اس اعتبار سے کہ اس کے تدوین شدہ مباحث پورے وثوق کے ساتھ علوم دینیہ اور علوم عربیہ سے تعلق رکھتے ہیں، حتیٰ کہ اس کی ہر بحث اس امر کے لائق ہے کہ اس کو ان علوم میں سے کسی علم کی لڑی میں پرودا یا جائے۔

چنانچہ اس کی ان علوم کی طرف نسبت ایسی ہے جیسے فرع کی اصول کی طرف یا دلیل کی اپنے مدلول کی طرف ہوتی ہے۔ گلاب و یاسمین کے بنے اس گلستان کی اس گلستان سے کس قدر مشابہت ہے جو نوع یہ نوع پھولوں اور خوشبوؤں سے لبریز ہو۔

والحمد لله رب العالمین



## تاریخ علوم القرآن

یہ بات تو بالکل واضح ہے کہ علوم القرآن کا فن بعد میں مدون ہوا۔ لیکن اس کی اساس حضور اکرم ﷺ کے مبارک دور میں بھی موجود تھی۔ اس باب میں علوم القرآن کی ابتداء سے لے کر موجودہ دور تک کے تمام مراحل کو بیان کیا جائے گا۔

یہ دور حضور اکرم ﷺ اور ان کے جانشین صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا ہے۔ علوم القرآن کی تدوین سے پہلے کا دورہ ہے۔ یہ حضرات اہل عرب تھے۔ عربی زبان میں مہارت تامہ رکھتے

تھے۔ قرآن اور علوم قرآن کو کما حقہ جانتے تھے۔ حتیٰ کہ علوم قرآن سے متعلق وہ کچھ جانتے تھے جو بعد کے علماء و حکما بھی نہیں جان سکے۔ لیکن ان حضرات کے دور میں اس علم کو ایک خاص انداز میں مدون نہیں کیا گیا تھا۔ بلکہ یہ حضرات خداداد صلاحیتوں کی بناء پر علوم قرآن کے تمام اسرار و رموز سے واقف تھے۔ اس لیے اس دور میں علوم القرآن کے فن کو مدون کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔

اس دور میں علوم القرآن کے مدون نہ کیے جانے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ حضور اکرم ﷺ صاحب وحی لوگوں میں موجود تھے۔ آپ ﷺ پر قرآن کا جو حصہ نازل ہوتا آپ ﷺ اودھ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو پڑھ کر سنا دیتے۔ بلکہ پڑھنے کے ساتھ ساتھ اپنے عمل سے ان آیات کی تشریح بھی فرمادیتے۔ آیات میں بیان کیے گئے اسرار کو اپنے فصیح و بلیغ اقوال و افعال سے واضح فرمادیتے۔ بلکہ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَأَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتَابَ الَّذِي كُرْتُنَبِّئِينَ لِتُنذِرَ الْبَشَرِ لِيَتَفَكَّرُونَ﴾ (النحل: ۴۴)

”اور ہم نے تم پر بھی یہ کتاب نازل کی ہے تاکہ جو (ارشادات) لوگوں پر نازل ہوئے ہیں وہ ان پر ظاہر کر دو تاکہ وہ غور کریں۔“ اُس دور میں علوم القرآن کو ایک فن کی شکل میں مدون نہ کرنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی زبان خالص عربی تھی۔ عرب کی تمام خصائص و فضائل جمع تھے۔ بہترین قوت حافظہ کے حامل تھے۔ تقدیر و بیان اور خطابت کے تمام اسالیب سے واقف تھے۔ وزن شعر اور وزن کلام کے تمام معامیر سے باخبر تھے۔ مختصر یہ کہ علوم القرآن کے تمام واجبات و لوازمات اور اسرار و رموز کے وہ فطرنا عالم تھے۔ ہم آج بھی اتنی استطاعت نہیں رکھتے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے علوم و فنون کا احاطہ کر سکیں۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم حضور اکرم ﷺ کی صحبت میں بیٹھنے کی وجہ سے ان علوم و معارف کے عالم بن چکے تھے کہ آج کے دور میں اگر ساری دنیا کے علماء و حکما کو جمع کر لیا جائے اور ان کے علوم و حکم کو اکٹھا کر لیا جائے تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے علوم کے برابر ہرگز نہیں ہو سکتے۔ اس لیے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے دور میں علوم القرآن کو مدون کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔

اُس دور میں علوم القرآن کے مدون نہ ہونے کی وجہ ایک یہ بھی تھی اُس دور میں کتابت کے آلات اتنی کثیر مقدار میں میسر نہیں تھے کہ انہیں تمام مواقع میں استعمال کیا جائے۔

نیز وہ اسلام کا ابتدائی دور تھا۔ اس وقت یہ اندیشہ بھی تھا کہ اگر قرآن مجید کے علاوہ کسی اور چیز کو بھی لکھا گیا تو کہیں وہ لکھا ہوا مواد قرآن مجید کے ساتھ خلط ملط نہ ہو جائے۔ اسی وجہ سے حضور اکرم ﷺ نے قرآن مجید کے علاوہ کچھ بھی لکھنے سے منع فرمایا تھا۔

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

(( لَا تَكْتُبُوا عِثِي وَمَنْ كَتَبَ عِثِي الْقُرْآنَ فَلْيَنْحَهُ وَحَدِّثُوا عِثِي فَلَا حَرَجَ وَمَنْ كَذَّبَ عَلَيَّ مُتَعَبًا فَلْيَتَّبِعُوا مَقْعَدًا مِنَ النَّارِ ))۔ (مسلم: ۳۰۰۴)

”میری کوئی بات مت لکھو۔ اور جس نے قرآن کے علاوہ کچھ اور لکھا ہو اُسے چاہیے کہ وہ اسے مٹا دے۔ میری احادیث کو (زبانی) بیان کرو اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ اور جس شخص نے مجھ پر جان بوجھ کر جھوٹ بولا اُس کو چاہیے کہ وہ جہنم میں اپنا ٹھکانہ بنا لے۔

پس یہ وجوہات تھیں جن کی بناء پر علوم القرآن کے فن پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے دور میں کچھ نہیں لکھا گیا حالانکہ وہ علوم القرآن کے ماہر تھے۔ اسی حال میں کئی سال گزر گئے۔ حتیٰ کہ حضور اکرم ﷺ کا دور مبارک اور حضرات شیخین ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کا دور مبارک بھی گزر گیا۔ لیکن علوم القرآن کو مدون نہیں کیا گیا۔

**علوم قرآن کی تدوین کا تمہیدی دور**

حضرات شیخین رضی اللہ عنہم کے بعد حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا دور شروع ہوا۔ آپ رضی اللہ عنہ کے دور میں اسلام کو بہت فتوحات حاصل ہوئیں۔ اسلام پھیلتا ہوا عرب سے عجم میں پہنچ گیا۔ وہ اقوام و امم بھی اسلام میں داخل ہوئیں جو عربی سے ناواقف تھیں۔ ہر قوم قرآن کریم کو اپنے انداز و تلفظ میں پڑھنے لگی۔ یہ خوف دامن گیر ہوا کہ اگر اس بڑھتے ہوئے اختلاف کو روکا نہ گیا تو آنے والے وقت میں ایک بہت بڑا فتنہ اور فساد پیدا ہو جائے گا۔ ہر قوم و قبیلہ کہے گا کہ قرآن پڑھنے کا صحیح طریقہ وہ ہے جس پر میں عمل پیرا ہوں۔ لہذا اب ضرورت اس امر کی تھی کہ تمام اقوام و قبائل کو ایک مصحف پر جمع کیا جائے تاکہ آپس میں اختلافات کو ختم کیا جاسکے۔ لہذا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے حکم دیا کہ قرآن مجید کو ایک مصحف میں جمع کیا جائے۔ وہ مصحف ”مصحف امام“ کی حیثیت رکھتا ہو۔ اور اسی مصحف امام کی نقول تیار کروا کر تمام عالم اسلام میں ارسال کروائی جائیں۔ اس دوران حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اس مصحف اور اس کی نقول کے علاوہ جتنے مصاحف رائج تھے ان سب کو کاغذ لے کر دیا تاکہ امت مسلمہ ایک مصحف پر جمع ہو جائے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا یہ کارنامہ امت محمدیہ رضی اللہ عنہا پر احسان عظیم ہے۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے اس مصحف امام کو مصحف عثمانی کہا جاتا ہے۔ اس مصحف میں الفاظ کے لکھنے کے انداز کو ”علم رسم القرآن“ یا ”علم الرسم العثماني“ کہا جاتا ہے۔

(امت کا اس پر اجماع ہے کہ قرآن کریم کو رسم عثمانی کے خلاف کسی اور طریقے سے لکھنا جائز نہیں، چنانچہ اس کے بعد مصاحف اسی طریقہ کے مطابق لکھے گئے اور صحابہ رضی اللہ عنہم و تابعین رضی اللہ عنہم نے مصاحف عثمانی کی نقول تیار کر کے قرآن کریم کی وسیع پیمانے پر اشاعت کی۔)

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے اس کارنامے سے ایک حد تک اختلافات ختم گئے۔ لیکن وقت گزرتا گیا حتیٰ کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا دور

آیا۔ اس دور میں ایک اور اندیشہ پیدا ہوا۔ اس اندیشے کا سبب یہ تھا کہ اس وقت تک کہ قرآن کریم کے نسخے چونکہ نقطوں اور زیر زبر پیش سے خالی تھے۔ اس لیے اہل علم کو قرآن کریم کی تلاوت میں دشواری ہوتی تھی۔ اور یہ خدشہ تھا کہ کہیں قرآن کریم کو غلط اعراب کے ساتھ نہ پڑھا جائے۔ اس لیے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوالاسود الدؤلی رضی اللہ عنہ کو حکم دیا کہ وہ ایسے قواعد و ضوابط وضع کریں جن کی بناء پر قرآن کریم کے اعراب متعین ہو جائیں اور پھر بعد میں اعراب قرآن میں کوئی اختلاف نہ کر سکے۔

اسی بناء پر یہ بھی کہا جاتا ہے کہ علم انھو کے واضح حضرت علی رضی اللہ عنہ ہیں۔ کیونکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ہی حضرت ابوالاسود الدؤلی رضی اللہ عنہ کو ان قواعد و ضوابط کی طرف متوجہ کیا تھا جو اب علم انھو کے نام سے جانے جاتے ہیں۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ پر خلافت راشدہ کا دور اختتام پذیر ہوتا ہے۔ اور ساتھ ہی بنو امیہ کا دور شروع ہوتا ہے۔ اور بنو امیہ کا دور وہ دور ہے جس میں بہت سے صحابہ رضی اللہ عنہم و تابعین رضی اللہ عنہم علوم القرآن کی نشر و اشاعت کی طرف متوجہ ہوئے۔ لیکن ان حضرات کا یہ متوجہ ہونا بالروایت اور بالتلقیں تھا نہ کہ بالکتابت اور بالتدوین۔ اگر ہم اس دور کو علوم قرآن کی تدوین کے لیے تمہیدی دور کہیں تو کچھ بے جا نہ ہوگا۔ علوم قرآن کی نشر و اشاعت میں بالروایت اور بالتلقیں حصہ لینے والوں میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعین رضی اللہ عنہم کے جو نام سر فہرست ہیں وہ یہ ہیں:

حضرت ابو بکر، حضرت عمر، حضرت عثمان، حضرت علی، حضرت عبد اللہ بن عباس، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے نام ﴿﴾ حضرت عبد اللہ بن مسعود، حضرت زید بن ثابت، حضرت ابو موسیٰ الاشعری، حضرت عبد اللہ بن زبیر رضوان اللہ علیہم اجمعین۔

حضرت مجاہد، حضرت عطاء، حضرت عکرمہ، حضرت قتادہ، حضرت حسن بصری، حضرت سعید بن جبیر، حضرت زید بن اسلم (بالمدينة) حضرت عبدالرحمن بن زید اور حضرت مالک بن انس رضی اللہ عنہم۔ آخری دو ناموں کے علاوہ یہ تمام تابعین ہیں۔ آخری دو تابعین ہیں۔ ان تمام حضرات نے علوم القرآن سے متعلق جو کچھ بیان فرمایا ہم ان میں سے بعض باتوں کو ”علم التفسیر“ بعض کو ”علم اسباب النزول“ بعض کو ”الناسخ والمنسوخ“ اور بعض کو ”علم غریب القرآن“ وغیرہ تعبیر کرتے ہیں۔ (ان سب کی تفصیل اپنے اپنے مقام پر آئے گی۔ ان شاء اللہ)

## علوم القرآن کا باقاعدہ تدوین دور

علوم القرآن کی تدوین کے تمہیدی دور کے بعد باقاعدہ تدوین کے دور کا آغاز ہوتا ہے۔ پس اس میں علوم القرآن کی مختلف انواع پر بہت سی کتب لکھی گئیں۔ لیکن علوم القرآن کی انواع میں سے ایک اہم نوع ”تفسیر“ کی طرف سب سے پہلے توجہ کی گئی، کیونکہ اس نوع کا تعلق قرآن کریم کی آیات سے براہ راست ہے۔

علم التفسیر پر سب سے پہلے قلم اٹھانے والے حضرات میں حضرت شعبہ بن الحجاج، حضرت سفیان بن عیینہ اور حضرت دجاج بن جراح رضی اللہ عنہم ہیں۔ ان حضرات نے اپنی تفاسیر میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعین رضی اللہ عنہم کے اقوال کو یکجا کیا تھا۔ یہ سب کے سب قرآن ثانی

کے علماء تھے۔

ان حضرات کے بعد علامہ ابن جریر الطبری (المتوفی ۳۱۰ھ) نے اس میدان میں قدم رکھا۔ اور قرآن کریم کی ایک ایسی تفسیر لکھی جو آج بھی ان تفاسیر میں سب سے بہتر ہے جو روایات و آثار کی مدد سے لکھی گئیں۔ آپ رحمۃ اللہ علیہ کی تفسیر کا نام ”جامع البیان فی تفسیر القرآن“ ہے۔ اس تفسیر کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں صحابہ رضی اللہ عنہم و تابعین رضی اللہ عنہم کے اقوال مع اسانید تحریر کیے گئے ہیں۔ بعض اقوال کو بعض پر ترجیح دی گئی ہے۔ قرآنی آیات سے بہت سے احکام مستنبط کیے گئے ہیں۔ وجوہ اعراب سے بھی بحث کی گئی ہے جس کی وجہ سے معانی کے فہم و ادراک میں مدد ملتی ہے۔ اس تفسیر میں تفسیر بالمعقول اور تفسیر بالماثور کے بھی نمونے ملتے ہیں۔ الغرض یہ تفسیر ایک شاہکار کی حیثیت رکھتی ہے۔

علم التفسیر کے علاوہ دیگر انواع علوم قرآن پر بھی بہت سے علماء نے کام کیا۔ اور ان انواع کے بیان میں مقدمے لکھے۔ پس علامہ علی بن المدینی جو کہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے شیخ ہیں اپنے مقدمے میں علوم القرآن کی ایک نوع ”اسباب النزول“ کو شرح و بسط کے ساتھ بیان فرماتے ہیں۔ اسی طرح علامہ ابو عبید القاسم بن سلام ”ناخ و منسوخ“ کے بارے میں تفصیل کے ساتھ اپنی تحریر میں لکھ چکے ہیں۔ یہ دونوں حضرات قرن ثالث کے علماء میں سے ہیں۔

امام ابو بکر جستانی رحمۃ اللہ علیہ جو کہ قرن رابع کے علماء میں سے ہیں، اپنے مقدمے میں ”غریب القرآن“ سے متعلق وضاحت کے ساتھ تحریر کرتے ہیں۔

امام علی بن سعید الحنفی جو کہ قرن خامس کے علماء جس سے ہیں، اپنی تصانیف میں ”اعراب القرآن“ کے بارے میں اصول و ضوابط بیان کرتے ہیں۔

قرن سادس کے ایک بہت پختہ عالم علامہ ابو القاسم عبدالرحمن المعروف بالسہلی، ”مبہمات القرآن“ کے علم میں سب سے پہلے قلم اٹھانے والے مصنف ہیں۔ ان کی کتاب کا نام بھی ”مبہمات القرآن“ ہے۔

”مجاز القرآن“ کے بارے میں اوّل تصنیف کرنے والے علامہ ابن عبدالسلام ہیں۔ جبکہ ”قراءات القرآن“ کے بارے میں لوگوں کو اپنی تحریر کے ذریعے آگاہ کرنے والے علامہ علم الدین السخاوی ہیں۔ اور یہ دونوں حضرات قرن سابع کے علماء میں سے ہیں۔ جیسے جیسے وقت گزرتا گیا علوم القرآن کی انواع پر کتب کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا۔ اور نئے نئے علوم دریافت ہوتے گئے۔ نئی نئی تالیفات وجود میں آتی گئیں خواہ ان تالیفات کا تعلق اقسام القرآن سے ہو یا امثال القرآن سے، حج القرآن سے ہو یا بدائع القرآن سے اور رسم القرآن سے ہو یا اسی طرح کی دیگر انواع سے۔

جب سے قرآن کریم نازل ہوا اس وقت سے لے کر آج تک قرآن کے علوم میں بے شمار کتب لکھی جا چکی ہیں اور لکھی جاتی رہیں گی۔ کیونکہ قرآن علم کا ایسا سمندر ہے جس کا کوئی کنارہ نہیں۔ اس کی گہرائی کا کوئی اندازہ نہیں۔ بلکہ قرآن کے معجزات میں سے ایک یہ بھی معجزہ ہے کہ یہ دنیا ختم ہو جائے گی لیکن علوم القرآن کی مباحث مکمل نہ ہوں گی۔

جب ہم احادیث کی طرف نظر کرتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ حدیث قرآن کے لیے ”شارح“ ہے، قرآن کے مبہمات کی شرح کرتی ہے۔ اس کے جملات کی تفصیل کرتی ہے۔ اس کے عام کی تخصیص کرتی ہے۔

﴿ وَمَا يَعْلَمُ تَأْوِيلَهُ إِلَّا اللَّهُ ﴾ ﴿ آل عمران: ۷ ﴾

”اور ہم نے تم پر یہ کتاب نازل کی ہے تاکہ جو (ارشادات) لوگوں پر نازل ہوئے ہیں وہ ان پر ظاہر کر دو تاکہ وہ غور کریں۔“  
 جیسے قرآن کے لیے علوم قرآن ہے ایسے ہی حدیث کے لیے علوم حدیث ہے۔ پس اگر آپ علوم قرآن اور علوم حدیث کو دیکھیں تو یہ معلوم ہوگا کہ یہ عظیم بحر ہے جس کی موجوں میں بلند تلامذہ ہیں۔ اور ان دو کے علاوہ تمام علوم و فنون ان کے خادم کا درجہ رکھتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود یوں محسوس ہوتا ہے کہ ہم نے قرآن و حدیث کے متعلق جو کچھ جانا، وہ بہت کم ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے:

﴿ وَمَا يَعْلَمُ تَأْوِيلَهُ إِلَّا اللَّهُ ﴾ ﴿ آل عمران: ۷ ﴾

”حالانکہ ان آیات کا ٹھیک ٹھیک مطلب اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔“

علوم قرآن کی وسعت کی بابت سب سے زیادہ تعجب اُس وقت ہوتا ہے جب ہم مؤلفین کی تالیفات کے انداز کو دیکھتے ہیں۔ کیونکہ علوم قرآن کے بارے میں جن علماء نے قلم اٹھایا وہ ایک ایک نوع کو بیان کرتے ہیں۔ اور اس ایک ہی نوع پر کئی کئی تالیفات لکھ ڈالتے ہیں۔ مثلاً اگر کوئی مؤلف ”غریب القرآن“ کو بیان کرنا چاہتا ہے تو مفردات القرآن کے ہر اس مفرد کو بیان کرتا ہے جس میں غرابت و ابہام پایا جاتا ہے۔ اسی طرح جب کوئی مؤلف ”مجاز القرآن“ کو بیان کرنا چاہتا ہے تو وہ ہر اس لفظ کو بیان کرتا ہے جو مجاز کا مقتضی ہو۔ الغرض قرآن کے علوم ایک درخت کی شاخوں کی طرح ہیں اور ہر شاخ اپنے اندر کئی اسرار و رموز چھپائے ہوئے ہے۔ ان اسرار و رموز کا احاطہ کسی انسان کے لیے ناممکن ہے۔

علمائے متقدمین نے علوم قرآن سے متعلق جو علوم جداگانہ طور پر بیان کیے تھے، اگر ان کو اب ایک فہرست کی طرح ایک کتاب میں بالتفصیل سبجا کیا جائے تو عمریں صرف ہو جائیں اور ہمتیں پست ہو جائیں۔

علوم قرآن کی انواع علمائے متقدمین کے نزدیک بھی مسلم تھیں اگرچہ ان کو الفاظ و کلمات کے دھاگے میں پرویا نہیں گیا تھا۔ یعنی علوم قرآن کی انواع علمائے ہمزین کے ذہن میں تھیں اگرچہ ان کے بارے میں تحریری طور پر کوئی مواد موجود نہیں تھا۔ ہماری اس بات کی دلیل حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک واقعہ ہے، جسے علامہ جلال الدین البلقینی نے اپنی کتاب میں بیان کیا ہے۔

سین میں علوی بغاوت پر آمادہ تھے۔ حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ پر یہ الزام لگایا گیا کہ آپ ان علویوں کی قیادت کر رہے ہیں۔ اسی الزام میں آپ کو زنجیروں میں جکڑ کر خلیفہ ہارون الرشید کے پاس بغداد لایا گیا۔ خلیفہ ہارون الرشید نے امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ سے پوچھا: آپ کتاب اللہ کے بارے میں کیا جانتے ہیں؟ کتاب اللہ سے سوالات کا آغاز کیا کیونکہ کتاب اللہ تمام کتابوں میں افضل ہے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: امیر المؤمنین! آپ مجھ سے اللہ کی کتابوں میں سے کس کتاب کے بارے میں پوچھ رہے ہیں؟ کیونکہ اللہ کی کتابیں تو بہت سی ہیں۔

ہارون الرشید نے کہا: بہت خوب! میں نے آپ سے اس کتاب کے بارے میں پوچھا ہے کہ جو میرے چچا زاد بھائی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل کی گئی ہے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: قرآن میں تو بہت سے علوم ہیں۔ آیا آپ محکم و متشابہ کے بارے میں پوچھتے ہیں یا تقدیم و تاخیر یا ناخ و مسنونہ کے بارے میں یا کسی اور مسئلہ کے بارے میں پوچھنا چاہتے ہیں۔ گویا کہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ



## ۱ منامل العرفان فی علوم القرآن: جلد ۱

کو یہ تمام علوم ازبر تھے۔ خلیفہ ہارون الرشید آپ سے سوال پوچھتا گیا اور امام شافعی رضی اللہ عنہما خلیفہ کے تمام سوالات کے جوابات دیتے گئے۔ اس معاملے کو دیکھ کر خلیفہ ہارون الرشید اور تمام حاضرین ہکا بکا رہ گئے۔

علوم القرآن کی تمام انواع کا امام شافعی رضی اللہ عنہما کو ازبر ہونا کوئی بعید بات نہیں ہے۔ کیونکہ امام شافعی رضی اللہ عنہما وہ عظیم شخصیت ہیں جنہوں نے بہت سی کتب ایسی لکھیں جن کی نظیر پہلے موجود نہیں تھی۔ وہ ان فنون کے واضح گردانے جاتے ہیں۔ جیسا کہ انہوں نے عراق میں کتاب ”الحجۃ“ لکھی جو کہ اُس زمانے کے باطل فرقوں کے لیے دلیل اور حجت کا درجہ رکھتی تھی۔ اور آپ نے مصر میں رہتے ہوئے بہت سی ایسی کتب لکھیں جو اس وقت کے باطل مذاہب کے لیے تلوار کی حیثیت رکھتی تھیں۔ آپ رضی اللہ عنہما نے اجتہاد اور استنباط کے لیے وہ اصول و ضوابط وضع کیے جو آپ سے پہلے کسی نے بیان نہیں کیے تھے۔ نیز آپ ہی اصول الفقہ پر سب سے پہلے تصنیف کرنے والے ہیں۔ جیسا کہ علامہ ابن خلدون اپنے مقدمہ میں لکھتے ہیں:

”کان اوّل من کتب فیہ۔ ای علم اصول الفقہ، الشافعی رحمہ اللہ، اصلی فیہ، رسالته المشہورۃ، تکلم

فیہا علی الاوامر والنواہی، والبیان، والخبیر، والنسخ، وحکم العلة المنصوصۃ من القیاس“

یعنی امام شافعی رضی اللہ عنہما وہ شخصیت ہیں جنہوں نے علم اصول فقہ پر سب سے پہلے کچھ لکھا۔ آپ نے اپنے ایک مشہور رسالے میں اوامر، نواہی، بیان، خبر، نسخ اور قیاس سے علت مخصوصہ کے حکم کے بارے میں وضاحت سے تحریر کیا ہے۔

علامہ الزکریٰ اپنی کتاب ”المحیط“ میں رقمطراز ہیں:

اصول الفقہ میں تصنیف کرنے والے سب سے پہلے شخص امام شافعی رضی اللہ عنہما ہیں۔ امام شافعی رضی اللہ عنہما نے اصول الفقہ میں متعدد کتب لکھیں مثلاً الرسائل، کتاب احکام القرآن، اختلاف الحدیث، ابطال الاستحسان، کتاب جماع العلم اور کتاب القیاس وغیرہ۔ کتاب القیاس میں امام شافعی رضی اللہ عنہما نے معتزلہ کے رد میں شرح و بسط کے ساتھ دلائل ذکر کیے ہیں۔

## اصطلاح ”علوم القرآن“ کا معرض ظہور

”علوم القرآن“ کی اصطلاح جامع اور وسیع مفہوم کی حیثیت سے سب سے پہلے کب ظاہر ہوئی؟ اس کی بابت مؤرخین کے نزدیک مشہور یہ ہے کہ یہ اصطلاح ساتویں صدی میں معرض ظہور میں آئی۔ اس سے قبل کسی نے اس اصطلاح یعنی ”علوم القرآن“ کا استعمال اپنی تصنیفات و تالیفات میں نہیں کیا تھا۔ لیکن میری رائے اس کے خلاف ہے۔ میری رائے کے مطابق ”علوم القرآن“ کی اصطلاح جامع اور وسیع مفہوم کی حیثیت سے سب سے پہلے پانچویں صدی میں معرض ظہور میں آئی۔ اس کی دلیل میرے پاس علامہ علی بن ابراہیم بن سعید جو کہ ”الحونٰی“ کے نام سے مشہور ہیں، کی تصنیف ”البرہان فی علوم القرآن“ ہے۔ علامہ علی بن ابراہیم کا انتقال ۴۳۰ ہجری میں ہوا۔ اس لیے وہ پانچویں صدی کے عالم ہوئے۔

یہ کتاب مجھے قاہرہ (مصر) کے دارالکتب میں کتاب ”البرہان فی علوم القرآن“ کا مختصر تعارف کے نام سے ملی۔ اس کی کل تیس جلدیں ہیں۔ لیکن اس وقت

صرف پندرہ جلدیں موجود ہیں۔ اور وہ بھی غیر مرتب ہیں۔ یعنی ہاتھ سے لکھے ہوئے نسخے کی شکل میں موجود ہیں۔

اس کتاب میں مصنف قرآن کریم کی آیات کو بالترتیب ذکر کرتے ہیں۔ پھر ہر ایک آیت پر علوم القرآن کی روشنی میں کلام فرماتے ہیں۔ ہر نوع کو بیان کرنے سے پہلے اس نوع کے ذکر کا اہتمام بھی فرماتے ہیں۔ سب سے پہلے ایک عنوان باندھتے ہیں "القول فی قولہ عزوجل"۔ اس عنوان کے تحت آیت کریمہ ذکر کرتے ہیں۔ پھر اس کے بعد "القول فی الاعراب" کے نام سے ایک عنوان باندھتے ہیں اور اس کے تحت نحوی اور لغوی اعتبار سے بحث کرتے ہیں۔ پھر اس کے بعد "القول فی المعنی والتفسیر" کا ایک عنوان قائم کرتے ہوئے اس آیت کریمہ کی تفسیر بالماثور اور تفسیر بالمعقول کرتے ہیں۔ پھر اس کے بعد "القول فی الوقف والتمام" کے نام سے ایک عنوان وضع کرتے ہیں اور اس کے تحت یہ وضاحت کرتے ہیں کہ یہاں وقف جائز ہے یا ناجائز۔ اور اگر کسی آیت کریمہ میں قراءت سے متعلق کچھ بتانا مقصود ہو تو "القول فی القراءۃ" کے نام سے ایک عنوان قائم کرتے ہیں۔

اگر کسی آیت سے شرعی احکام مستنبط ہو رہے ہو تو اس آیت کو ذکر کے اس کے تحت علیحدہ علیحدہ مباحث کو بالتفصیل بیان کرتے ہیں۔ مثلاً سورۃ البقرۃ کی آیت نمبر ۱۱۰ ہے:

﴿وَاقِيمُوا الصَّلٰوةَ وَآتُوا الزَّكٰوةَ وَمَا تَقْرَبُوا مِنْ لَكُمْ مِنْ حٰبِطٍ تَجِدُوْهُ عِنْدَ اللّٰهِ﴾ (البقرۃ: ۱۱۰)

"اور نماز ادا کرتے رہو اور زکوٰۃ دیتے رہو اور جو بھلائی اپنے لیے آگے بھیج رکھو گے اس کو اللہ کے ہاں پالو گے۔"

تو اب صاحب برحان اس آیت کے ضمن میں نماز کے اوقات بیان کریں گے، راجح قول کے دلائل ذکر کریں گے۔ زکوٰۃ کی مقدار اور اس کے نصاب کو بالتفصیل بیان کریں گے۔ اس آیت کا شان نزول ذکر کریں گے۔ ناخ اور مسنون کے حوالے سے اس آیت کے بارے میں بحث کریں گے۔ الغرض اس آیت کی مناسبت سے جتنی بھی مباحث ہوں گی ان کو قلم بند کریں گے۔

مختصر یہ کہ میں علامہ علی بن ابراہیم کی اس بے نظیر تصنیف کو پڑھ کر بہت محظوظ ہوا۔ خاص طور پر ان کے طرزِ تحریر نے مجھے بہت حیران کیا۔ کیونکہ وہ بڑی مہارت کے ساتھ ایک آیت کو علوم القرآن کی مختلف انواع کے آئینے میں دکھاتے ہوئے واضح کرتے ہیں۔ بے شک آپ کی یہ کتاب آپ کی انتھک محنت اور اخلاص کی عکاسی کرتی ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر عطا فرمائے کہ آپ نے اپنے بعد گراں قدر علمی سرمایہ اس کتاب کی شکل میں چھوڑا۔

**چھٹی صدی** پانچویں صدی کے بعد چھٹی صدی کا آغاز ہوتا ہے۔ اس صدی میں علامہ ابن جوزی رحمۃ اللہ علیہ جیسے عالم تبحر جنم لیتے ہیں۔ اور "علوم القرآن" کی اصطلاح جامع اور وسیع مفہوم کی حیثیت سے مزید نکھر کر سامنے آتی ہے۔ علامہ

ابن جوزی نے ۵۹۷ ہجری میں وصال فرمایا۔ آپ رحمۃ اللہ علیہ نے "علوم القرآن" پر دو کتابیں لکھیں۔ ① "فنون الافنان فی علوم القرآن" ② "المجتبیٰ فی علومہ تتعلق بالقرآن" ان دونوں کتابوں کے بھی قلمی نسخے قاہرہ (مصر) کے دارالکتب میں محفوظ ہیں۔

**ساتویں صدی** اب علوم القرآن کی اصطلاح کو معرضِ ظہور میں آئے تین صدیاں بیت چکی ہیں۔ ساتویں صدی میں علامہ علم الدین سخاوی متوفی ۶۴۱ ہجری نے ایک کتاب لکھی جس کا نام "جمال القراء" ہے۔ اسی صدی میں علوم القرآن کے فن میں ایک تحریر علامہ ابو شامہ التونی ۶۶۵ ہجری نے لکھی جس کا نام "المیرشد الوجیز فیما يتعلق بالقرآن العزیز" ہے۔ یہ دونوں کتابیں اپنے بعد میں آنے والی کتابوں سے قدرے مختصر اور آسان تھیں۔

**آٹھویں صدی** نے ایک کتاب تحریر کی۔ اس کتاب کا قلمی نسخہ تیموریہ خزانے سے ملا تھا جو کہ اب قاہرہ (مصر) کے دارالکتب میں موجود ہے۔ یہ کتاب دو جلدوں میں تھی۔

**نوٹ** اب اس کتاب کو پروفیسر محمد ابو الفضل ابراہیم نے شائع کیا اور اس کی تحقیق و تدقیق میں بڑی محنت سے کام لیا ہے۔

**نویں صدی** میں ”علوم القرآن“ پر بہت سی کتب لکھی گئیں۔ اس صدی میں ”علوم القرآن“ کا علم خوب پروان چڑھا۔ اس صدی میں علامہ محمد بن سلیمان الکافجی متوفی ۸۷۳ھ ہجری نے ایک کتاب لکھی۔ علامہ سیوطی اس کتاب کے بارے میں فرماتے ہیں: ”علامہ کافجی پر کوئی ایک اس معاملے میں سبقت نہیں لے گیا۔ آپ بڑھنڈ نے اس کتاب کو دو بابوں میں منقسم کیا ہے۔ پہلا باب تفسیر، تاویل، قرآن، سورت اور آیت کے معنی کے بیان میں ہے جبکہ دوسرا باب قرآن کی تفسیر بالرائے کی شرائط کے بیان میں ہے۔ اور ان دونوں بابوں سے ناواقفیت عالم اور معلم کے لیے ایک خامی ہے۔“

لیکن ان تعریفی کلمات کے بعد علامہ سیوطی بڑھنڈ کہتے ہیں: ”لیکن اس کتاب سے نہ ہی تو مجھے قلمی اطمینان حاصل ہوا اور نہ ہی مقصود کی طرف پہنچنے کا کوئی راستہ دکھائی دیا۔“ (علامہ کافجی کی اس کتاب کا نام علامہ سیوطی بڑھنڈ نے اپنی کتاب ”بغیة الوعاة“ میں ”التیسیر فی قواعد التفسیر“ بتایا ہے۔ علامہ سیوطی بڑھنڈ بغیة الوعاة میں لکھتے ہیں: ”میرے استاد علامہ کافجی کہتے تھے کہ علوم القرآن کو میں نے ایجاد کیا ہے مجھ سے پہلے یہ نیک کام کسی کے نصیب میں نہیں تھا۔“ علامہ سیوطی بڑھنڈ کہتے ہیں لیکن میرے استاد کا یہ خیال صواب نہ تھا۔ شاید ان کے علم میں نہ تھا کہ ان سے پہلے علامہ الزرکشی ”البرہان فی علوم القرآن“ اور جلال الدین بلقینی ”مواقع العلوم“ اس فن میں لکھ چکے ہیں۔)

نویں صدی میں ہی علامہ جلال الدین بلقینی نے ایک کتاب ”مواقع العلوم فی مواقع النجوم“ لکھی۔ اس کتاب کو علامہ نے کچھ فصلوں میں ترتیب دیا ہے:

**پہلی فصل** یہ فصل آیات قرآنیہ کے جائے نزول، اوقات نزول اور واقعات نزول کے بیان میں ہے۔ یہ بارہ انواع پر مشتمل ہے۔ ① مکی آیات ② مدنی آیات ③ سفری آیات ④ حضری آیات ⑤ لیلی آیات ⑥ نہاری آیات ⑦ صیفی آیات ⑧ شتائی آیات ⑨ فراشی آیات ⑩ شان نزول ⑪ سب سے پہلے نازل ہونے والی آیات ⑫ سب سے آخر میں نازل ہونے والی آیات۔

**دوسری فصل** یہ فصل آیات قرآنیہ کی اسناد کے بیان میں ہے۔ یہ فصل چھ انواع پر مشتمل ہے۔

① متواتر ② آحاد ③ شاذ ④ قراءات النبی ﷺ ⑤ الرواة ⑥ الحفظ

**تیسری فصل** یہ فصل قرآن مجید کے الفاظ و حروف کی ادائیگی کے بیان میں ہے۔ یہ فصل بھی چھ انواع پر مشتمل ہے۔

① وقف ② ابتداء ③ امالہ ④ مذ ⑤ تخفیف اُھمز ⑥ ادغام

**چوتھی فصل** یہ فصل قرآن مجید کے الفاظ کی اقسام کے بیان میں ہے۔ یہ فصل سات انواع پر مشتمل ہے۔

① غریب ② معرب ③ مجاز ④ مشترک ⑤ مترادف ⑥ استعارہ ⑦ تشبیہ

”محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ“

مناہل العرفان فی علوم القرآن: جلد ①

**پانچویں فصل** ❀ یہ فصل آیات قرآنیہ کے ان معانی کے بیان میں ہے جن کا تعلق احکام کے ساتھ ہے۔ یہ فصل چودہ انواع پر مشتمل ہے۔ وہ چودہ انواع یہ ہیں: ① العام الباقی علی غمومہ ② العام المخصوص ③ العام الذی اُریہ بہ الخصوص ④ ماخص فیہ الكتاب السنۃ ⑤ ماخصت فیہ السنۃ الكتاب ⑥ المعجل ⑦ المبین ⑧ المأول

⑨ المفہوم ⑩ المطلق ⑪ المقیم ⑫ الناسخ ⑬ المنسوخ ⑭ نوع من الناسخ والمنسوخ  
**چھٹی فصل** ❀ یہ فصل آیات قرآنیہ کے ان معانی کے بیان میں ہے جن کا تعلق الفاظ کے ساتھ ہے۔ یہ فصل پانچ انواع پر مشتمل ہے۔ وہ پانچ انواع یہ ہیں: ① الفصل ② الوصل ③ الایجاز ④ الاطناب ⑤ القصر

اگر تمام فصلوں کے تحت بیان کردہ انواع کو جمع کیا جائے تو پچاس انواع بنتی ہیں۔ اس طرح مصنف رحمۃ اللہ علیہ کی یہ کتاب کل ۵۰ انواع پر مشتمل ہونے کے باوجود بھی اسماء، کنیت، القاب اور سمبہات کی انواع سے عاری ہے۔ نیز ان تمام انواع کو حصر کے انداز میں بھی بیان نہیں کیا گیا۔

نویں صدی میں ہی علامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے ”علوم القرآن“ پر دو کتابیں لکھیں۔ جن میں سے ایک کا نام ”التحبیرو فی علوم التفسیر“ ہے۔ اس کتاب میں علامہ جلال الدین سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے اُن اقسام کو بھی بیان کیا ہے جنہیں علامہ جلال الدین سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے ”مواقع العلوم فی مواقع النجوم“ ذکر کیا تھا اور اس کے علاوہ بھی اقسام کو بیان کیا ہے۔ علامہ جلال الدین سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کتاب میں بہت سے فوائد بھی شامل کیے ہیں۔ الغرض اس کتاب میں علامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے ایسی ایک سو دو انواع بیان کی ہیں جن کا تعلق علوم القرآن سے ہے۔

علامہ جلال الدین سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے ”التحبیرو“ ۸۷۲ ہجری میں مکمل کی۔ اس کے بعد ایک اور کتاب لکھی جس کا نام ”الاتقان فی علوم القرآن“ ہے۔ یہ کتاب اس فن میں ہر اعتبار سے بہترین ہے۔ اس کتاب میں علامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے علوم القرآن سے متعلق اجمالی طور پر اسی (۸۰) انواع ذکر کی ہیں۔ پھر ہر نوع کی ضمنی انواع تفصیلاً ذکر کی ہیں۔ اس طرح کل انواع تین سو اسی بن جاتی ہے۔

علامہ جلال الدین سیوطی رحمۃ اللہ علیہ دسویں صدی کے آغاز میں یعنی ۹۱۱ ہجری کو اس دنیائے فانی سے رخصت ہوئے۔ لیکن علوم القرآن کے فن پر وہ کام کر گئے کہ ہم نے نہ ہی تو ان پہلے ان کے کام کے مقابل کسی تحریر یا تصنیف کو پایا اور نہ ہی ان کے بعد ان کے کام کے برابر کسی کی تحریر یا تصنیف کو پائیں گے۔ اللہ ان پر کروڑوں رحمتیں و برکتیں نازل فرمائے۔

## علوم القرآن اور آخری صدی

ہمارے دور میں بھی اس فن پر بہت سی کتب لکھی گئیں۔ ۱۳۳۵ ہجری میں علامہ مرحوم شیخ طاہر الجزاوی نے ایک جلیل القدر کتاب لکھی جس کا نام ہے ”التبیان فی علوم القرآن“۔ یہ کتاب کم و بیش ۳۰۰ صفحات پر مشتمل ہے۔

علامہ مرحوم شیخ محمود ابودقیقہ رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اس فن میں کچھ تحریری مواد تالیف کیا جو کلیتہً اصول الدین کے شعبہ تخصص الدعوة والارشاد کے طلبہ کے لیے بے حد مفید ثابت ہوا۔

علامہ الشیخ محمد علی سلامہ ریڈیو نے ایک کتاب ”منہج الفرقان فی علوم القرآن“ لکھی۔ یہ کتاب بھی الدعوة والارشاد کے طلبہ کے لیے بہت سود مند ثابت ہوئی۔

علوم القرآن کی مختلف مباحث میں بڑے بڑے علماء نے تالیفات اور تصنیفات کا کام کیا۔ مثلاً الشیخ محمد نجیب، الشیخ محمد حسنین العدوی اور الشیخ محمد خلف الحسینی۔ ان میں سے بعض حضرات نے قرآن کریم کے حروف سبعة پر نازل ہونے سے متعلق تالیفات کیں اور بعض نے دیگر مباحث کو واضح کرنے کے لیے قلم اٹھایا۔

ایک مشہور ادیب مرحوم سید مصطفیٰ صادق الرافعی ریڈیو نے ایک کتاب ”اعجاز القرآن“ لکھی۔ یہ کتاب بادشاہ فواد الاول نے اپنے ذاتی خرچے پر طبع کروائی اور نشر کروائی۔

اس فن کے خدمت کرنے والے بڑے بڑے علماء کا جب نام آتا ہے تو علامہ مرحوم شیخ عبدالعزیز جاویش کو بھی فراموش کرنا ناممکن ہے۔ انھوں نے علوم القرآن پر اپنی بہت سی تقاریر کو ضبط تحریر کروایا۔ ان کی تقاریر کا موضوع تھا: ”اثر القرآن فی تحویر العقل البشري وألقاها فی نادى دار العلوم“۔

اس فن جلیل کے خادین میں ایک نام مرحوم شیخ عبدالعزیز الحولہ کا ہے۔ انھوں نے ایک کتاب تصنیف کی، جس کا نام ”القرآن الکریم: وصفه، أثره، هدايته و اعجازه“ ہے۔

علامہ مرحوم شیخ طنطاوی جوہری ریڈیو نے ایک رسالہ لکھا جس کا نام ہے: ”القرآن والعلوم العصرية“ (آپ ریڈیو نے ایک کتاب اور بھی لکھی جس کا نام ہے: ”المجواهر فی تفسیر القرآن الکریم“)

الازہر یونیورسٹی کے سب بڑے اور پرانے پروفیسر شیخ مصطفیٰ المرائی نے قرآن کریم کے ترجمہ کرنے کے جواز کے حق میں ایک بہت شاندار رسالہ لکھا۔ اس رسالے کی بعد میں آنے والے بہت سے علماء نے تائید کی۔ لیکن ترکی کے شیخ الاسلام علامہ الشیخ مصطفیٰ صبری ریڈیو نے آپ کے اس رسالے کا تعاقب کیا اور اس کے رد میں ایک بہت مدلل و مدقّق کتاب لکھی جس کا نام ”مسألة ترجمة القرآن“ ہے۔ اس کتاب کی تائید کرنے والے بھی کچھ علماء موجود ہیں۔

ابھی حال ہی میں ایک اور کتاب نمودار ہو رہی ہے۔ اس کتاب کے انداز اسلوب نے مجھے بہت متاثر کیا ہے۔ اس کتاب کا انداز تعبیر بہت عمدہ ہے۔ اس میں بیان کردہ مباحث و فکر بہت اعلیٰ ہیں۔ اگر یہ کتاب مکمل ہو جائے تو یہ مجھے بہت محبوب ہوگی۔ اس کتاب کا نام ”النبأ العظيم عن القرآن الکریم“ ہے۔ اس کے مصنف میرے عزیز دوست علامہ الشیخ محمد عبداللہ دراز ہیں۔ اس وقت ان کو جامعہ الازہر نے فرانس بھیجا ہوا ہے۔ میں اللہ تعالیٰ سے دعا گو ہوں کہ اللہ میرے دوست کو خیر و عافیت کے ساتھ واپس لے آئے اور اسلام و مسلمین کو ان کے فیض سے فیض یاب فرمائے۔ (آمین)

فن علوم القرآن کے تدوینی ادوار کو اگر خلاصے اور مختصر انداز میں بیان کیا جائے تو کچھ یوں بیان کیا جائے گا کہ:

**خلاصہ** چوتھی صدی کے اواخر اور پانچویں صدی کے اوائل میں علامہ علی بن ابراہیم الحوفی نے ایک زرخیز مین علوم القرآن کا ایک بیج ڈالا۔ چھٹی اور ساتویں صدی میں علامہ حجر ابن الجوزی، علامہ علم الدین السواد اور علامہ ابوشامہ نے اس بیج کو زمین میں سینچا اور اس کی آبیاری کی۔ پھر آٹھویں صدی میں علامہ بدر الدین الزرکشی ریڈیو کی محنت سے وہ بیج ایک نوجوان پودے کی شکل اختیار کر

## منابیل العرفان فی علوم القرآن: جلد ①

گیا۔ پھر نویں صدی میں علامہ محمد بن سلیمان الکافعی اور علامہ جلال الدین البلقینی کی مخلصانہ خدمات کی بدولت وہ پودا ایک مضبوط تنا آدر درخت کی شکل اختیار کر گیا۔ پھر نویں صدی ہی کے اواخر اور دسویں صدی کے اوائل میں اس میدان میں ایک شہسوار نے قدم رکھا اور دو کتابیں ① التحبیر ② الاتقان فی علوم القرآن تصنیف کیں۔ ان کے اس پر خلوص کارنامے کی بدولت وہ تنا آدر درخت ایک پھل دار درخت میں تبدیل ہو گیا اور مختلف اقسام کے پھلوں کے جوڑے فراہم کرنے لگا۔ شہسوار سے میری مراد علامہ جلال الدین السیوطی رحمۃ اللہ علیہ ہیں۔ اللہ ان پر ہزاروں رحمتیں نازل فرمائے۔ علامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ کے بعد اس فن میں نشوونما کا سلسلہ تھم گیا اور تھمارا یہاں تک کہ ہمارا دور آ گیا۔

اب ہمارے دور میں اُمید کی کچھ کرنیں نظر آنا شروع ہوئی ہیں۔ اب ایسا لگتا ہے کہ اب اس درخت پر دوبارہ بہار آئے گی۔ ﴿الَاَ اِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِیْبٌ ۝۶۰﴾ (البقرہ: ۲۱۳)

**ایک شبے کا ازالہ** ﴿حج﴾ نظر یہ ہے کہ یہ علم یعنی علوم القرآن خود ساختہ علم ہے، جدید دور کی پیداوار ہے، دور قدیم میں یہ علم نہیں تھا بعد کے لوگوں نے اسے گھڑ لیا ہے۔

ان لوگوں کا یہ خیال محض باطل پر مبنی ہے۔ درحقیقت وہ اسلام اور قرآن کے درپے ہیں۔ یہ علم قرآن کے لیے حفاظت کا سبب ہے۔ جبکہ وہ لوگ قرآن کے اعدا ہیں۔ لہذا وہ پس پردہ اپنی دشمنی کی بنیاد پر یہ شبہ یا اشکال ظاہر کرتے ہیں۔ ہمیں اس وقت چاہیے کہ خوب دل و جان سے اس فن میں مہارت حاصل کریں۔ کسی حکیم کا قول ہے دشمن کو قتل کرنا ہو تو دشمن کے پاس موجود اسلحہ کے مانند اسلحہ تیار کرو اور اس پر حملہ کرو۔ اس وقت دشمن قرآن کے درپے ہے۔ اُسے مٹانا چاہتا ہے تو ہمیں چاہیے کہ ہم وہ علم حاصل کریں جو قرآن کی حفاظت کرنے والا ہے اور قرآن کی بقا کا سبب ہے۔ نیز یہ علم انتہائی آسان ہے۔ اس میں بے جا تفصیلات یا لمبی چوڑی ابحاث نہیں ہیں۔ بلکہ انتہائی مختصر اور پراثر انداز میں اس علم کی تعریفات و اقسام کو بیان کیا جاتا ہے۔





## نزول قرآن

یہ بحث ”علوم القرآن“ کی اہم بحث ہے۔ بلکہ اگر یوں کہا جائے کہ ”علوم القرآن“ کی تمام مباحث میں سب سے زیادہ اہم بحث یہ ہی ہے تو کچھ بے جا نہ ہوگا۔ کیونکہ یہ معلوم کرنا کہ قرآن کریم کب اور کیسے نازل ہوا، ایمان کی اساس ہے۔ کیونکہ قرآن کریم پر ایمان رکھنا اور اس کو کلام اللہ تسلیم کرنا ایمان کا بنیادی جزو ہے۔ نیز قرآن پر ایمان درحقیقت حضرت محمد ﷺ کی رسالت کی تصدیق کرنا ہے۔ اور یہ اقرار کرنا ہے کہ اسلام حق اور سچ مذہب ہے۔ لہذا نزول قرآن سے متعلق بحث آئندہ آنے والی تمام مباحث میں اصل اور جڑ کی حیثیت رکھتی ہے۔

پس ہم نزول قرآن کی بحث کو بہت اہتمام سے بیان کریں گے۔ اہتمام کا تقاضا یہ ہے ہم اس بحث کو کچھ حصوں میں تقسیم کر لیں تاکہ تمام باتیں واضح اور علیحدہ علیحدہ سمجھ میں آجائیں۔ لہذا ان شاء اللہ سب سے پہلے ہم ”معنی نزول القرآن“ کو بیان کریں گے اس کے بعد قرآن کریم کے متعدد نزول کے بارے میں بیان کریں گے۔ پھر ہر مرتبہ کے نزول پر دلائل پیش کریں گے۔ پھر ہر مرتبہ کے نزول کی کیفیت اور حکمت واضح کریں گے۔ پھر وحی الہیہ اور اس کے عقلی و علمی یا نقلی دلائل پیش کریں گے اور سب سے آخر میں اس موقع پر پیدا ہونے والے شبہات و اعتراضات کے سیر حاصل جوابات بیان کریں گے۔ (اللہ سے دعا گو ہوں کہ اللہ رب العزت ہماری مدد فرمائے) (آئین)

## ① نزول قرآن کا معنی و مطلب

نزول قرآن یعنی قرآن کریم کا نازل ہونا۔ نازل ہونے کا لغوی معنی کیا ہے؟ اس بارے میں درج ذیل بحث کا مطالعہ ضروری ہے۔

”نزول“ کا مادہ ”ن، ز، ل“ ہے۔ یہ مختلف ابواب سے استعمال ہوتا ہے۔ قرآن وحدیث میں اس کے مختلف الاستعمال ہونے کی بے شمار مثالیں موجود ہیں۔ مثلاً قرآن کریم میں ہے:

﴿وَبِالْحَقِّ أَنْزَلْنَاهُ وَبِالْحَقِّ نَزَّلْنَاهُ﴾ (الاسراء: ۱۰۵)

”اور ہم نے اس قرآن کو سچائی کے ساتھ نازل کیا ہے اور وہ سچائی کے ساتھ نازل ہوا۔“

ایک حدیث مشہور ہے:

((ان هذا القرآن أنزل على سبعة أحرف)).

”بے شک یہ قرآن ہے، اُسے سات حروف پر نازل کیا گیا ہے۔“

بعض اوقات لغت میں نزول سے ایک خاص مکان میں اترنا، طول کرنا یا اس خاص مکان کو اپنا ٹھکانہ بنانا مراد لیا جاتا ہے۔ جیسا کہ کہا جاتا ہے: ”نزل الامیر المدينه“ ترجمہ: امیر لشکر نے شہر کو اپنا ٹھکانہ بنایا۔ یا امیر لشکر شہر میں اُترا۔ بعض اوقات نزول متعدی معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ اور اس وقت اس کا معنی کسی دوسرے کو اتارنے یا ٹھہرانے کا ہوتا ہے۔ جیسے:

﴿رَبِّ أَنْزَلْنِيْ مُنْزَلًا مُّبْرَكًا وَ أَنْتَ خَيْرُ الْمُنْزِلِيْنَ ۝﴾ (ابوسنون: ۲۹)

”اے پروردگار ہم کو مبارک جگہ پر اتار پورا تو سب سے بہتر اتارنے والا ہے۔“

بعض اوقات ”نزول“ کا لفظ اترنے یا اتارنے کے علاوہ کسی اور ہی معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ یعنی بعض اوقات ”نزول“ کا لفظ کسی چیز کو بلند مقام سے پست یا اسفل مقام کی طرف اترنے یا گرنے کے لیے استعمال ہوتا ہے جیسے: ﴿نَزَلَ فَلَانٌ مِنَ الْجَبَلِ﴾ یعنی فلاں پہاڑ سے نیچے اُترا اور بعض اوقات اس معنی میں رہتے ہوئے متعدی معنی میں استعمال ہوتا ہے جیسے:

﴿وَ أَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً ۝﴾ (ط: ۵۳)

”اور آسمان سے پانی برسایا۔“

اترنا، اتارنا، ٹھہرنا، ٹھہرانا یا کسی بلند مقام سے اسفل مقام کی طرف منتقل ہونا یا منتقل کرنا، یہ تمام معانی قرآن کریم کے نزول کے لیے پیش کرنا مناسب نہیں ہیں۔ کیونکہ یہ تمام معانی مکانیت اور جسمیت کا تقاضا کرتے ہیں۔ جبکہ قرآن یعنی کلام اللہ کوئی جسم نہیں ہے کہ وہ کسی مکان کو چاہے کہ اُس میں اُترے یا کسی بلند مقام سے اسفل مقام کی طرف منتقل ہو۔ بلکہ قرآن کریم تو اللہ کا کلام ہے۔ اللہ تعالیٰ کی صفت ہے۔ اللہ تعالیٰ خود قدیم ہیں تو ان کی صفات بھی قدیم ہیں۔ اللہ تعالیٰ خود جسم و مکان وغیرہ سے منزہ و مبرہ ہیں تو ان کا کلام بھی مکان و جسم کی قید سے آزاد اور پاک ہے۔

اب رہا یہ سوال کہ پھر نزول قرآن کا معنی کیا لیا جائے۔ تو اس کا جواب یہ ہے اب ہمیں مجازی ضرورت پیش آئے گی۔ یعنی اب ہم اس کا معنی مجازی مراد لیں گے۔ اور انزال یا نزول کا مجازی معنی ہوگا ”اعلام“ یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے بواسطہ ملک رسول اکرم ﷺ کو الفاظ قرآن بتلانے کا نام نزول قرآن ہے۔ درحقیقت اس تعبیر میں قرآن کریم کی عظمت و شان بتلانا مقصود ہے کہ انسان کے پاس ایک بلند مقام کی چیز آگئی ہے، یا قرآن پر نزول کا اطلاق قرآن کے لانے والے ملک یعنی حضرت جبرائیل علیہ السلام کے اعتبار سے ہے کہ وہ بلند مقام سے زمین پر اُترا اور اس کا یہ نزول بالواسطہ قرآن کا بھی نزول ہے۔

اور اگر قرآن سے مراد وہ الفاظ لیے جائیں جو معجز ہیں (اور ہمیں دکھائی دیتے ہیں) تو اس وقت بھی انزال سے مراد اعلام ہی ہوگا۔ بس فرق صرف اتنا ہے کہ اگر انزال کے واسطے سے ہو تو اس سے مراد وہ انزال ہوگا جو نبی اکرم ﷺ کے قلب اطہر پر ہوا۔ اور اگر انزال اس کے واسطے سے ہو جو ان الفاظ پر دلالت کرتا ہے تو اس صورت میں لوح محفوظ اور بیت العزت کی طرف انزال مراد ہوگا۔

اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہ مجاز یا تجویز استعارہ تصریحیہ اصلہ کے قبیل سے ہو بایں طور پر کہ تشبیہ دی گئی ہو آقا کی اپنے بندے کی طرف بلندی سے سفلیت کی طرف کوئی خاص چیز نازل کرنے کے ساتھ اگر چہ اعلیٰ اور اسفل میں وجہ شہ حسنی ہونست کرتے ہوئے مشہ بہ کی طرف اور معنوی ہو مشہ بہ کی طرف نسبت کرتے ہوئے۔

اور اسے مخاطب تو تو جانتا ہے کہ نزول تابع ہے انزال کے۔ پس جب ان میں سے کسی ایک میں جاری ہوگا تو خود بخود ہی دوسرے میں جو کہ اس کی نظیر ہے میں جاری ہو جائے گا۔ اور اس طرح کی مثال تزیل اور تنزل میں کم پائی جاتی ہے۔ گویا کہ انزال کا مادہ استعمال کرنے سے اس عظیم کتاب یعنی قرآن کریم کے شرف کو واضح کرنا مطلوب تھا۔ اور اس مادہ کو استعمال کرنے سے اس طرف اشارہ کرنا بھی مقصود تھا کہ اس کتاب کا مالک یا صاحب بھی بہت اعلیٰ درجے پر فائز ہے۔ جیسا کہ فرمان باری تعالیٰ ہے سورۃ الزخرف میں

﴿وَالْكِتَابِ الْمُبِينِ ۝۱۰۱ اِنَّا جَعَلْنَاهُ قُرْءَانًا عَرَبِيًّا لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ ۝۱۰۲ وَرَاٰنَا فِيْ اَمْرِ الْكِتٰبِ لَدُنَّا لَعَلَّٰهُ حَكِيْمٌ ۝۱۰۳﴾ (الزخرف: ۳۲۲)

”قسم ہے اس واضح کتاب کی۔ ہم نے اس کو عربی زبان کا قرآن بنا دیا ہے کہ تم سمجھ لو۔ یقیناً یہ لوح محفوظ میں ہے اور ہمارے نزدیک بلند مرتبہ حکمت والی ہے۔“

اور انزال کو اعلام کے ساتھ تعبیر کرنا ہی اس مقام کے زیادہ مناسب، اقرب اور اوفق ہے۔ اس کی تین وجوہات ہیں:

- ① یہاں کلام کا تعلق دلالت و افہام والا تعلق ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ قرآن کلام ہے۔ پس قرآن کے نزال کو اعلام سے تاویل کرنا درحقیقت اس کو درست و معلوم متعلق سے مربوط اور منسوب کرنا ہے۔
- ② یہ ثابت کرنا مقصود ہے کہ قرآن ثابت و محفوظ ہے لوح میں، آسمان دنیا میں اور نبی کریم ﷺ کے قلب اطہر میں۔ اور دونوں عالم یعنی علوی اور سفلی عالم میں پائی جانے والی مخلوق کو بتانا مقصود ہے کہ نبی کریم ﷺ پر جو نازل ہوا وہ برحق اور سچ ہے۔
- ③ انزال کی تفسیر اعلام کے ذریعے کرنے کی ایک وجہ یہ بھی ہے تاکہ قرآن کریم کے مختلف تنزلات کو بیان کیا جاسکے۔

## ② قرآن کریم کا متعدد بار نازل ہونا

قرآن کریم کے متعدد بار نزول کو اصطلاح میں تنزلات کہا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کو تین تنزلات سے نوازر اس کے فضل و شرف میں مزید اضافہ کر دیا ہے۔ یعنی قرآن کریم کا نزول تین مرتبہ ہوا۔ اس کی تفصیل درج ذیل ہے۔

قرآن کریم کا نزول اول بار گاہ البیہ سے لوح محفوظ میں ہے۔ اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد مبارک ہے:

﴿بَلْ هُوَ قُرْءَانٌ مَّجِيْدٌ ۝۱۰۱ فِيْ كُوْبٍ مَّحْفُوْظٍ ۝۱۰۲﴾ (البروج: ۲۱-۲۲)

”یہ کتاب بزل و بطلان نہیں) بلکہ یہ قرآن عظیم الشان ہے۔ لوح محفوظ میں (لکھا ہوا)۔“

قرآن کریم لوح محفوظ میں کس طرح اور کب سے محفوظ ہے؟ اس بات کا علم اللہ کے سوا کسی کو نہیں یا اللہ تعالیٰ جس کو شیب پر مطلع فرمادیں۔ لیکن قرآن کریم کی اس آیت سے اتنا ضرور معلوم ہوتا ہے کہ لوح محفوظ میں قرآن کریم سارے کا سارا لکھا اور سچا

موجود ہے نہ کہ متفرق طور پر۔ کیونکہ آیت کے ظاہری الفاظ اسی کا تقاضا کر رہے ہیں۔ اب رہی یہ بات کہ پھر اللہ تعالیٰ نے حضور اکرم ﷺ پر تھوڑا تھوڑا کر کے قرآن مجید کیوں نازل کیا۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس میں بہت سی حکمتیں ہیں جن میں سے چند آئندہ آئیں گی۔ (ان شاء اللہ)

قرآن کریم اللہ تعالیٰ کے علم ازلی میں موجود تھا۔ لیکن پھر بھی اللہ تعالیٰ نے اسے سب سے پہلے لوح محفوظ میں نازل فرمایا۔ اس میں حکمت شاید یہ تھی کہ اللہ تعالیٰ قرآن کریم کی عظمت اور لوح محفوظ کی اہمیت لوگوں پر واضح کرنا چاہتے تھے۔ لوح محفوظ کے بارے میں آگاہ کرنا چاہتے تھے کہ لوح محفوظ وہ کتاب ہے جس میں ہر وہ امر لکھا جا چکا ہے جو ہو چکا ہے۔ اور ہر وہ امر بھی لکھا ہوا ہے جو آئندہ واقع ہونا ہے۔ تمام ایجادات و دریافتات اس میں مرقوم ہیں۔ گویا کہ لوح محفوظ شاہدِ ناطق ہے، اللہ کے بازعب مظاہر میں سے ایک مظہر ہے اور دلالت کرتی ہے اللہ تعالیٰ کی عظمت، اس کے علم، اس کے ارادے، اس کی حکمتوں اور اس کی وسیع سلطنت اور ہادی قدرت پر۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ جب ہم لوح محفوظ کا تصور ذہن میں لاتے ہیں تو ہمارے ایمان میں تقویت، قلب میں طمانیت پیدا ہوتی ہے۔ نیز دل میں یہ بات راسخ ہو جاتی ہے کہ جو کچھ ہوا اللہ کے ارادے اور حکم سے ہوا اور جو نہیں ہوا اس میں اللہ کا ارادہ یا حکم ہی نہیں تھا۔ اور جب یہ بات ہمارے دل و ذہن نشین ہو جاتی ہے تو بڑے سے بڑے حوادث ہمیں چھوٹے لگنے لگتے ہیں، سکون اور رضا ہمارے دل میں پیوست ہو جاتی ہے۔ اللہ کے فیصلے پر راضی رہنے کا ملکہ ہمیں نصیب ہو جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد مبارک ہے:

﴿مَا آصَابَ مِنْ مُصِيبَةٍ فِي الْأَرْضِ وَلَا فِي أَنْفُسِكُمْ إِلَّا فِي كِتَابٍ مِنْ قَبْلِ أَنْ نَبْرَأَهَا- إِنَّ ذَلِكَ عَلَى اللَّهِ يَسِيرٌ ۝ تَكْوِيلًا تَأْتُوا عَلَى مَا فَاتَكُمْ وَلَا تَفْرَحُوا بِمَا آتَاكُمْ ۗ وَاللَّهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُورٍ ۝﴾ (الہد: ۲۲-۲۳)

”کوئی مصیبت ملک پر اور خود تم پر نہیں پڑتی مگر پیشتر اس کے کہ ہم اس کو پیدا کریں ایک کتاب میں (لکھی ہوئی) ہے (اور) یہ (کام) اللہ کو آسان ہے تاکہ جو (مطلب) تم سے فوت ہو گیا ہے اس کا غم نہ لکھایا کرو اور جو تم کو اس نے دیا ہو اس پر اترایا نہ کرو اور اللہ کسی اترانے والے اور شخی بگھارنے والے کو دوست نہیں رکھتا۔“

یہ دونوں آیات لوح محفوظ اور اس میں جو کچھ مکتوب ہے اس پر ایمان لانے پر ترغیب دینے والی ہیں۔ نیز ان آیات سے یہ بھی مفہوم ہوتا ہے کہ خوشی، غمی، بسر و عصر، تنگی و فراخی، الغرض ہر طرح کے حالات انسان تو کیا دنیا کو بھی وجود دینے سے قبل اس لوح میں لکھے جا چکے تھے جو ہمارے مالک حقیقی اور خالق کائنات کے پاس محفوظ ہے۔ لوح سے مراد لوح محفوظ ہے۔ قرآن مجید میں ہے:

﴿وَكُلُّ صَغِيرٍ وَكَبِيرٍ مُنْتَظَرٌ ۝﴾ (القر: ۵۳)

”(یعنی) ہر چھوٹا اور بڑا کام لکھ دیا گیا ہے۔“

لوح محفوظ کی کیفیت و ماہیت جو کچھ بھی ہے اللہ ہی کو معلوم ہے۔ ہم اس کی کیفیت و ماہیت معلوم کرنے کے مکلف نہیں ہیں۔ بلکہ اس بات کو ماننے کے مکلف ہیں کہ یہ ”اُمُّ الْکِتَاب“ ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی حکومت و سلطنت کا مرکزی رجسٹر ہے جس میں سب کچھ لکھا جا چکا ہے۔ کائنات کی ہر چیز اس میں مرقوم ہے۔ انسانوں کے لیے احکام الہیہ بھی اس میں لکھے ہوئے ہیں۔ جو احکام الہیہ منسوخ ہو چکے وہ بھی اس میں تحریر ہیں اور جو ناسخ ظہرے وہ بھی اس میں مکتوب ہیں۔ قرآن مجید میں ہے:



﴿يَسْمَعُوا اللَّهَ مَا يَشَاءُ وَيُسْمِعُ ۗ وَعِنْدَنَا أُمُّ الْكِتَابِ ۝﴾ (الرعد: ۳۹)

”اللہ جس کو چاہتا ہے منادیتا ہے اور (جسکو چاہتا ہے) قائم رکھتا ہے۔ اور اسی کے پاس اصل کتاب ہے۔“

قرآن کریم کا پہلا نزول لوح محفوظ پر ہوا اور دوسرا نزول لوح محفوظ سے آسمان دنیا پر موجود ”بیت العزت“ پر ہوا۔ دوسرے نزول کو بخجئے کے لیے درج ذیل تین آیات کو پڑھیے۔

﴿إِنَّا أَنْزَلْنَاهُ فِي لَيْلَةِ الْمُبْرُكَةِ﴾ (الذخاں: ۳)

”ہم نے ایک مبارک رات میں قرآن مجید نازل فرمایا۔“

اس آیت سے ثابت ہوا کہ قرآن مجید یکبارگی ایک بابرکت رات میں نازل ہوا۔ اب رہا یہ سوال کہ وہ رات کون سے مہینے کی تھی۔ تو دوسری آیت پڑھیے:

﴿شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِي أُنزِلَ فِيهِ الْقُرْآنُ﴾ (البقرہ: ۱۸۵)

”رمضان کا مہینا وہ ہے جس میں قرآن نازل کیا گیا۔“

مہینا معلوم ہونے کے بعد اب یہ سوال باقی ہے کہ وہ رات کونسی تھی۔ تو اب تیسری آیت کو پڑھیے۔

﴿إِنَّا أَنْزَلْنَاهُ فِي لَيْلَةِ الْقَدْرِ ۝﴾ (القدر: ۱۰)

”بے شک ہم نے قرآن مجید لیلیۃ القدر میں نازل فرمایا۔“

ان تینوں آیات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ قرآن مجید جس ایک رات میں یکبارگی نازل ہوا، اُس رات کا وصف قرآن مجید میں ”مبارکۃ“ آیا ہے۔ وہ رات رمضان کی لیلیۃ القدر ہے۔ یہ ساری معلومات ادلیۃ قاطعہ سے ثابت ہوئیں۔ لیکن یہ حقیقت بھی اولہ قاطعہ سے ثابت ہے کہ قرآن مجید حضور اکرم ﷺ پر یکبارگی ایک رات میں نازل نہیں ہوا بلکہ تھوڑا تھوڑا کر کے کئی برسوں میں نازل ہوا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ مذکورہ بالا تینوں آیات میں جس نزول کا ذکر ہے وہ نزول حضور اکرم ﷺ پر ہونے والے نزول کے علاوہ کوئی اور نزول ہے۔ اور وہ نزول ہے بیت العزت پر نزول۔ وہ بیت العزت جو آسمان دنیا یعنی قریب آسمان پر واقع ہے۔ اس نزول پر درج ذیل روایات دال ہیں۔

- ① امام حاکم رحمہ اللہ نے سعید بن جبیر بن ابن عباس رضی اللہ عنہما کی سند سے نقل کیا۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: ”قرآن کریم کو لوح محفوظ سے آسمان دنیا پر واقع بیت العزت پر نازل کیا گیا۔ پھر حضرت جبرائیل علیہ السلام بیت العزت سے (وَقَدْ نَوَقْنَا) حضور اکرم ﷺ کے قلب اطہر پر لے کر آتے رہے۔“
- ② امام نسائی، امام حاکم اور امام البیہقی نے داؤد بن ابی ہند عن عکرمہ عن ابن عباس رضی اللہ عنہما کے طریق سے اپنی اپنی کتب میں روایت نقل کی ہے کہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں:



”قرآن مجید یکبارگی آسمان دنیا (بیت العزت) پر لیلیۃ القدر میں نازل کیا گیا۔ پھر (بیت العزت سے حضور اکرم ﷺ پر تقریباً) بیس سال میں (وقتاً فوقتاً) نازل ہوتا رہا۔ پھر آپ ﷺ نے یہ آیات پڑھیں:

﴿وَلَا يَأْتُونَكَ بِمَثَلٍ إِلَّا جِئْنَاكَ بِالْحَقِّ وَأَحْسَنَ تَفْسِيرًا﴾ (الفرقان: ۳۳)

”اور یہ لوگ تمہارے پاس جو (اعتراض کی) بات لاتے ہیں ہم تمہارے پاس اسکا معقول اور خوب شرح جواب بھیج دیتے ہیں۔“

﴿وَقُرْآنًا فَرَقْنَاهُ لِتَقْرَأَهُ عَلَى النَّاسِ عَلَى مُكْثٍ وَنَزَّلْنَاهُ تَنْزِيلًا﴾ (الاسراء: ۱۰۶)

”اور ہم نے قرآن کو جزو جزو کر کے نازل کیا ہے تاکہ تم لوگوں کو ٹھہر ٹھہر کر پڑھ کر سناؤ اور ہم نے اس کو آہستہ آہستہ اتارا ہے۔“ ①

② امام حاکم رحمہ اللہ امام بیہقی رحمہ اللہ وغیرہ منصور عن سعید بن جبیر عن ابی عباس رحمہ اللہ سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں:

”قرآن مجید آسمان دنیا پر یکبارگی نازل کیا گیا۔ آسمان دنیا سے وہ آسمان مراد ہے جو ستاروں کا مسکن ہے (یعنی سب سے پہلا آسمان) پھر اللہ تعالیٰ وہاں سے اپنے رسول ﷺ پر خاص مواقع میں تھوڑا تھوڑا کر نازل کرتے رہے۔“ ②

③ علامہ ابن مردودہ رحمہ اللہ اور امام بیہقی رحمہ اللہ نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے کہ ایک مرتبہ عطیہ بن اسود حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے پاس آئے اور کہنے لگے: مجھے یہ (درج ذیل) دونوں آیات سمجھنے میں وقت پیش آ رہی ہے۔

﴿شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِي أُنزِلَ فِيهِ الْقُرْآنُ﴾ (البقرہ: ۱۸۵)

”رمضان وہ مہینا ہے جس میں قرآن نازل کیا گیا۔“

﴿إِنَّا أَنْزَلْنَاهُ فِي لَيْلَةِ الْقَدْرِ﴾ (القدر: ۱)

”بے شک ہم نے قرآن مجید لیلیۃ القدر میں نازل فرمایا۔“

ان دونوں آیات سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کریم صرف رمضان المبارک کے مہینے میں نازل ہوا حالانکہ قرآن کریم تو شوال، ذی قعدہ، ذی الحجہ، محرم، صفر الغرض سال کے تمام مہینوں میں نازل ہوا کرتا تھا۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: قرآن مجید یکبارگی ماہ رمضان میں لیلیۃ القدر میں نازل ہوا۔ پھر وقتاً فوقتاً تھوڑا

تھوڑا کر کے سال کے بقیہ ایام و شہور میں نازل ہوتا رہا۔ ④

یعنی ان دونوں آیات میں قرآن کریم کے یکبارگی والے نزول کا ذکر ہے، جو کہ ماہ رمضان میں لیلیۃ القدر میں ہوا۔

یہ چاروں احادیث ”صحیح“ ہیں جیسا کہ علامہ سیوطی رحمہ اللہ نے بھی فرمایا ہے:

① رواہ النسائي في الكبرى: ۱۱۳۷۲

② رواه النسائي في الكبرى: ۱۱۶۷۹

③ رواه الطبراني في الكبير: ۱۲۰۹۵



أَسَانِيدُهَا كُلُّهَا صَحِيحَةٌ.

”ان کی سندیں سب کی سب صحیح ہیں۔“ ①

یہ چاروں روایات اگرچہ موقوف ہیں یعنی حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہیں مگر حکماً مرفوع ہیں۔ کیوں کہ آسمان دنیا پر قرآن کریم کا نازل ہونا عقل و فکر یا قیاس و اجتہاد سے معلوم نہیں ہو سکتا اور نہ ہی آسمان دنیا پر قرآن کریم کا نازل ہونا اسرائیلیات سے ماخوذ ہو سکتا ہے، کیونکہ اسرائیلیات والے یعنی اہل کتاب تو قرآن کریم کو مانتے ہی نہیں تو ان سے اس کا آسمان دنیا پر نزول کیونکر اور کس طرح ماخوذ قرار دیا جا سکتا ہے۔ لہذا یہ چاروں روایات موقوف ہونے کے باوجود مرفوع کے حکم میں ہوں گی۔ نیز ان سے استدلال اور احتیاج یعنی حجت پکڑنا بھی درست ہوگا۔

دوسرا قول یہ ہے قرآن کریم کا نزول آسمان دنیا پر بیس اور تیس یا پچیس قدر کی راتوں میں اس طرح ہوا کہ ہر ایک لیلیۃ القدر میں جس قدر حصہ ایک سال کے عرصہ میں اللہ تعالیٰ کو نازل کرنا مقصود ہوتا اتنا ایک دفعہ آسمان دنیا پر اتار دیا جاتا اور پھر وہاں سے وہی حصہ تھوڑا تھوڑا کر کے تمام سال کے اندر حضور اکرم ﷺ پر نازل ہوا کرتا۔

اور تیسرا قول یہ ہے کہ قرآن کریم کے نزول کی ابتداء لیلیۃ القدر میں ہوئی پھر اس کے بعد وہ تمام مختلف اوقات میں حضور اکرم ﷺ پر مُجْتَمِعًا نازل ہوتا رہا۔

یاد رہے تیسرے قول کا قائل یا حاصل ہو گیا کہ لیلیۃ القدر میں بیت العزت پر یکبارگی نزول قرآن کی نفی کرنے والا قرار پائے گا۔ (امام شعبی رضی اللہ عنہ بھی تیسرے قول کے قائل ہیں)

اس موقع پر چوتھا قول بھی ذکر کیا گیا ہے وہ یہ کہ قرآن کریم لوح محفوظ سے مکمل طور پر ایک ہی مرتبہ نازل ہوا مگر محافظ فرشتوں نے اُسے تفریق میں راتوں میں حضرت جبرئیل علیہ السلام کے حوالے کیا اور حضرت جبرئیل علیہ السلام نے اُس کو بیس سال کے عرصے میں تھوڑا تھوڑا کر کے حضور اکرم ﷺ پر نازل کیا۔

لیکن یہ آخری تینوں اقوال دلائل سے عاری ہیں۔ ان تینوں اقوال کو دلائل و براہین سے اس طرح مزین نہیں کیا جا سکتا جس طرح قول اول کو کیا گیا ہے۔

علامہ جلال الدین السیوطی رضی اللہ عنہ علامہ ابوشامہ رضی اللہ عنہ سے نقل کرتے ہیں۔

**آسمان دنیا پر نزول کی حکمت** ﴿﴾ اللہ نے لوح محفوظ سے آسمان دنیا پر قرآن کریم کو اس لیے نازل فرمایا تاکہ قرآن اور صاحب قرآن یعنی حضور اکرم ﷺ کی ولعوت شان اور بلند مرتبے کو اہل آسمان یعنی فرشتوں پر عیاں و واضح کر سکیں۔ نیز ساتوں آسمانوں پر بسنے والے فرشتوں کو یہ بات بتانا مقصود تھی کہ یہ اللہ تعالیٰ کی آخری کتاب ہے جو کہ بہترین امت کے لیے بہترین نبی یعنی خاتم المرسل حضور اقدس ﷺ پر نازل کی جا رہی ہے۔ اور یہ کتاب سابقہ کتب سماویہ سے منفرد حیثیت کی حامل ہے کیونکہ وہ کتابیں صرف ایک مرتبہ نازل ہوئیں جبکہ یہ کتاب دو مرتبہ نازل ہوئی ایک مرتبہ یکبارگی اور دوسری مرتبہ متفرقاً۔

بعض اہل علم کے نزدیک آسمان دنیا پر نازل کرنے میں ایک حکمت یہ تھی کہ اس سے حضور اکرم ﷺ کا شوق بڑھے کیونکہ جب کوئی چیز دور سے قریب آ جائے لیکن ابھی تک حاصل نہ ہوئی ہو تو اس کو پانے اور حاصل کرنے کا شوق مزید بڑھ جاتا ہے جیسا کہ ایک شاعر کہتا ہے:

واعظم ما یکون الشوق یوما اذا دنت الخیام من الخیام

”اور اس دن سے بڑھ کر شوق کی انتہا کس دن ہوگی جب خیمے خیموں کے قریب ہو جائیں گے۔“

میں تو کہتا ہوں کہ قرآن کریم تین مقامات پر نازل ہوا ایک مرتبہ لوح محفوظ پر، دوسری مرتبہ بیت العزت پر اور تیسری مرتبہ قلب محمد ﷺ پر۔ تو اس تعدد و نزول میں قرآن کریم سے شک و شبہ کی نفی کی تاکید ہے اور یہ اس پر یقین و اعتماد میں قوت و اضافے کا باعث ہے۔ اس لیے کہ جب کوئی بات متعدد جسموں میں لکھی گئی ہو اور اس کا کئی جگہ وجود ثابت ہو چکا ہو تو یہ اس سے شک و شبہ کی نفی کا زیادہ موثر ذریعہ ہوتا ہے، اس کے وجود کو تسلیم کرنے کا زیادہ قوی باعث ہوتا ہے اور اس پر ایمان و یقین کی قوت کے زیادہ قریب ہوتا ہے نسبتاً اس کے کہ وہ بات ایک ہی جسم میں لکھی گئی ہو۔

تیسرا نزول

یہ نزول تنزلات قرآن کی لڑی کا آخری موتی ہے۔ دراصل یہ قرآن کریم کے نزول کے مراحل کا آخری مرحلہ ہے۔ قرآن کریم کا تیسرا نزول وہ نزول ہے جس سے نور و ہدایت کی شعاعیں پورے عالم میں پھیل گئیں اسی نزول کی برکت سے خلق خدا کو ہدایت کا راستہ دکھائی دیا۔ اس نزول سے وہ نزول مراد ہے جس میں حضرت جبریل علیہ السلام قرآن کریم کو لے کر خاتم الرسل ﷺ کے قلب اطہر پر نازل ہوئے، جیسا کہ قرآن کریم میں ہے:

﴿نَزَّلَ بِهِ الرُّوحَ الْأَمِينُ ۗ عَلَى قَلْبِكَ لِتَكُونَ مِنَ الْمُنذِرِينَ ۚ بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُبِينٍ ۝﴾ (اشعرا، ۱۹۳-۱۹۴-۱۹۵)

”اس کو امانت دار فرشتہ لے کر اترے۔ (یعنی اس نے) تمہارے دل پر (القا) کیا ہے تاکہ (لوگوں کو) نصیحت کرتے رہو۔ (اور القا بھی) فصیح عربی زبان میں (کیا ہے)۔“

حضرت جبریل علیہ السلام کا قرآن کریم کو حاصل کرنا اور حضور اکرم ﷺ کی طرف منتقل کرنا

حضرت جبریل علیہ السلام نے قرآن کریم کو کیسے حاصل کیا اور پھر حضور اکرم ﷺ نے حضرت جبریل علیہ السلام سے قرآن کو کیسے حاصل کیا؟ اس سوال کا تعلق علم غیب سے ہے۔ کسی انسان کی یہ مجال نہیں کہ اس بارے میں اپنی کوئی رائے پیش کرے مگر یہ کہ حضور اکرم ﷺ کی طرف سے کوئی صحیح دلیل ہمیں اس باب میں مل جائے۔

اس کی بات ہمیں جتنے اقوال ملے ان کو جمع کر کے ہم تین نکات میں بیان کر رہے ہیں:

① امام طبری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

”شاید حضرت جبریل رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے قرآن کریم کو بطور معلق روحانی حاصل کرتے تھے یا پھر لوح محفوظ میں لکھے ہوئے قرآن کو زبانی یاد کر لیا کرتے تھے اور حضور اکرم ﷺ پر لے کر اتر کر تے تھے پھر حضور اکرم ﷺ اس کو یاد کر لیا

کرتے تھے۔“

علامہ طبری ریشیہ نے ”لعل“ یعنی شاید کا لفظ استعمال کیا ہے۔ اور آپ جانتے ہیں کہ عربی میں ”لعل“ یعنی شاید کا لفظ یقین کا فائدہ نہیں دیتا۔ لہذا ہم علامہ طبری ریشیہ کے قول سے دلیل نہیں پکڑ سکتے کیونکہ یہ قول مقصود تک ہماری راہ نمائی کر رہا۔

② علامہ ماوردی ریشیہ کہتے ہیں: ”قرآن کریم کو محافظ فرشتوں نے بفریق میں راتوں میں حضرت جبرئیل علیہ السلام کے حوالے کیا اور حضرت جبرئیل علیہ السلام نے بیس سال کے عرصے میں تھوڑا تھوڑا کر کے حضرت محمد ﷺ پر نازل کیا۔“

علامہ ماوردی ریشیہ کے قول کا مطلب یہ ہوا کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام نے محافظ فرشتوں سے قرآن کریم حاصل کیا لیکن ہم یہ نہیں جانتے کہ علامہ ماوردی ریشیہ کے پاس اس رائے یا قول پر کوئی دلیل بھی موجود ہے یا نہیں۔

③ امام بیہقی ریشیہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد: ﴿إِنَّا أَنْزَلْنَاهُ فِي لَيْلَةِ الْقَدْرِ﴾ (القدر: ۱) کا معنی بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

” (اللہ ہی بہتر جانتا ہے) ﴿إِنَّا أَنْزَلْنَاهُ فِي لَيْلَةِ الْقَدْرِ﴾ سے مراد ہے: (إِنَّا أَنْزَلْنَاهُ فِي لَيْلَةِ الْقَدْرِ) (اللہ ہی بہتر جانتا ہے) یعنی ہم نے قرآن فرشتے کو سنا یا اور اس کو بخوبی سمجھا دیا تو پھر فرشتے نے جو کچھ سنا تھا سب کو لے کر اُسے نازل کیا۔

امام بیہقی ریشیہ کے اس قول سے یہ مفہوم ہوتا ہے کہ فرشتے یعنی حضرت جبرئیل علیہ السلام نے الفاظ قرآن کریم کو اللہ جل شانہ سے سن کر حاصل کیا۔ اس مفہوم کی موید طبرانی کی حدیث ہے جو کہ حضرت نواس بن معان سے مرفوعاً منقول ہے۔

(إِذَا تَكَلَّمَ اللَّهُ بِالْوَجْهِ أَخَذَتِ السَّمَاءُ رَجْفَةً شَدِيدَةً قَبْلَ أَنْ يَخْرُجَ مِنْهَا نَسِيمٌ أَمْطَرَهُ اللَّهُ فِي لَيْلَةِ الْقَدْرِ) (إِذَا تَكَلَّمَ اللَّهُ بِالْوَجْهِ أَخَذَتِ السَّمَاءُ رَجْفَةً شَدِيدَةً قَبْلَ أَنْ يَخْرُجَ مِنْهَا نَسِيمٌ أَمْطَرَهُ اللَّهُ فِي لَيْلَةِ الْقَدْرِ) (اللہ جل شانہ نے جب اللہ تعالیٰ وحی کے ساتھ کلام کرتا ہے تو آسمان خوف الہی سے کانپ جاتا ہے اور جب آسمان کے فرشتے سنتے ہیں تو بے ہوش ہو کر سجدے میں گر جاتے ہیں۔ سب سے پہلے حضرت جبرئیل علیہ السلام سر اٹھاتے ہیں تو اللہ تعالیٰ وحی کے ساتھ اُن سے کلام فرماتے ہیں پھر حضرت جبرئیل علیہ السلام کو جہاں وحی پہنچانے کا حکم ہوتا ہے وہیں وحی پہنچا دیتے ہیں۔

(تیسرا قول راجح معلوم ہوتا ہے کیونکہ اس کی تائید میں حدیث موجود ہے) تینوں اقوال میں ایک بات تو قدر مشترک ہے وہ یہ کہ نزول کی کیفیت خواہ کچھ بھی ہو لیکن تنزیل کا مرجع تنہا اللہ وحدہ لا شریک لہ کی ذات اقدس ہے۔

حضرت جبرئیل علیہ السلام حضور اکرم ﷺ پر قرآن کریم کے الفاظ لے کر اترتے تھے۔ (یعنی حضرت جبرئیل علیہ السلام کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام مفہوم ومعانی اللہ تعالیٰ کے استعمال کرتے ہوں اور الفاظ اپنے استعمال کرتے ہوں بلکہ حضرت جبرئیل علیہ السلام الفاظ بھی اللہ تعالیٰ ہی لے کر حضور اکرم ﷺ پر نازل کرتے تھے) لہذا حضرت جبرئیل علیہ السلام سورۃ الفاتحہ سے لے کر سورۃ الناس تک کے تمام الفاظ بعینہ حضور اکرم ﷺ کے پاس لے کر اترے۔ یہ تنہا اللہ تعالیٰ کا کلام ہیں۔ ان میں نہ ہی تو حضرت جبرئیل علیہ السلام کا کوئی عمل دخل ہے اور نہ ہی حضور اکرم ﷺ کی طرف سے کوئی آمیزش ہے۔ اور نہ ہی قیامت تک اس کلام میں کوئی ملاوٹ کر سکے گا۔

## الْفَاظُ قُرْآنِ مُنَزَّلٌ هِيَ

اس کلام کو حضرت جبرئیل علیہ السلام نے پڑھا پھر حضور اکرم ﷺ نے پڑھا پھر بہت سی مخلوق نے پڑھا لیکن یہ کلام اصل کے اعتبار سے اللہ تعالیٰ کا کلام ہی رہے گا۔ جیسا کہ ہم دنیا میں دیکھتے ہیں کہ اگر کسی آدمی نے کوئی کلام لکھا پھر بعد میں اُس کو بہت سے

”محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ“

لوگوں نے پڑھا تو وہ کلام بعد والے لوگوں کا نہیں کہلائے گا بلکہ اس کلام کی نسبت اولاً لکھنے والے ہی کی طرف کی جائے گی۔ بالکل اسی طرح اولاً اور ابتداء قرآن کریم کے متکلم اللہ تعالیٰ ہیں بعد اس کلام کو حضرت جبریل علیہ السلام پڑھیں یا حضور اکرم ﷺ تلاوت فرمائیں یا باقی ساری مخلوق کسی بھی مکان یا زمان میں پڑھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اس کلام کے موجد اور خالق اللہ تعالیٰ ہیں اور اللہ تعالیٰ ہی رہیں گے۔

الفاظ قرآن، کلام کی وہ قسم ہے جس کو ہم کلام لفظی کہہ سکتے ہیں۔ ایک ہوتا ہے کلام نفسی اور ایک ہوتا ہے کلام لفظی۔ کلام نفسی اس کلام کو کہتے ہیں جو انسان اپنے ذہن میں مرتب کیے ہوئے ہوتا ہے۔ اور اگر انسان اس کلام نفسی کو الفاظ مرثبہ کی شکل میں زبان سے ادا کر دے تو وہ کلام لفظی کہلاتا ہے۔ کلام لفظی، کلام نفسی کو سمجھنے و سمجھانے کا ذریعہ ہوتا ہے۔

بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ قرآن کریم کا معنی اور مفہوم تو اللہ تعالیٰ کا ہے لیکن الفاظ حضرت جبریل علیہ السلام کے ہیں جو وہ آ کر حضور اکرم ﷺ پر پڑھتے تھے۔ یا حضرت جبریل علیہ السلام ان معانی کو اللہ تعالیٰ سے لے کر حضور اکرم ﷺ پر القاء کرتے تھے پھر حضور اکرم ﷺ ان معانی کو اہل عرب کی لغت کے مطابق الفاظ میں ڈھال دیتے تھے اور حضرت جبریل علیہ السلام کے سامنے بیان کر دیتے تھے۔ مندرجہ بالا دونوں قول باطل اور غلط ہیں۔ نیز قرآن و سنت اور اجماع سے متصادم ہیں۔ یہ دونوں اقوال عقل کے بھی خلاف ہیں کیونکہ اگر معانی و مضمون اللہ تعالیٰ کا ہو اور مرثبہ الفاظ حضرت جبریل علیہ السلام یا آنحضرت ﷺ کے ہوں تو وہ کلام اللہ تعالیٰ کا نہیں کہلائے گا بلکہ وہ جبریل علیہ السلام یا محمد ﷺ کا کلام کہلائے گا۔ حالانکہ قرآن و حدیث میں ہمیشہ قرآن کی نسبت اللہ تعالیٰ ہی کی طرف کی گئی ہے جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿حَتَّىٰ يَسْمَعَ كَلِمَةَ اللَّهِ﴾ (التوبہ: ۶)

”یہاں تک کہ وہ اللہ کا کلام سن لے۔“

اس کے علاوہ اور بھی بہت سے دلائل ہیں جن کو طوالت کے خوف سے ترک کیا جا رہا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ حضرت جبریل علیہ السلام کا کردار قرآن مجید سے متعلق اس کے سوا کچھ نہیں کہ آپ نے پوری امانت داری کے ساتھ قرآن کریم کے الفاظ حضور اکرم ﷺ تک پہنچائے، بلکہ اس کے پہنچانے کا حق ادا کر دیا۔ جب کہ قرآن مجید سے متعلق حضور اکرم ﷺ کا کردار یہ ہے کہ آپ ﷺ نے قرآن مجید کو اپنے سینے میں لفظ بہ لفظ محفوظ کیا، اس کو آگے امت تک پہنچایا، اس کی تفسیر بیان فرمائی، اس کی تطبیق اور تنفیذ کے لیے حتی الامکان کوشش کی۔ خلاصہ یہ کہ قرآن مجید میں نہ ہی تو حضرت جبریل علیہ السلام نے اپنے پاس سے کوئی کمی و زیادتی کی اور نہ ہی حضور اکرم ﷺ نے۔ ان دونوں شخصیات نے تو صرف قرآن کریم کو نقل کیا ہے۔ بس۔ قرآن کریم میں ہے:

﴿وَأَنزَلْنَاكَ لِتُلْقِيَ الْقُرْآنَ مِنَ لَدُنْ حَكِيمٍ عَلِيمٍ﴾ (اسمل: ۶)

”اور تم کو قرآن (خدا نے) حکیم و علیم کی طرف سے عطا کیا جاتا ہے۔“

﴿وَإِذَا كُفِّرْتُمْ بَآيَاتِهِ قَالَُوا لَوْلَا جِئْتِنَاهُمْ بِآيَاتٍ كَثِيرَةٍ مِّنْ سَمَوَاتٍ﴾ (الاعراف: ۲۰۳)

”اور جب تم ان کے پاس (کچھ دنوں تک) کوئی آیت نہیں لاتے تو کہتے ہیں کہ تم نے (اپنی طرف سے) کیوں نہیں بنا لی؟ کہہ دو کہ میں تو اسی حکم کی پیروی کرتا ہوں جو میرے پروردگار کی طرف سے میرے پاس آتا ہے۔“

① ﴿وَإِذَا تَشَلَّىٰ عَلَيْهِمْ أَيَاتُنَا يَنْتَبِهَاتُ قَالَ الَّذِينَ لَا يُرْجُونَ لِقَاءَنَا إِنَّا بُرْهَانَ غَيْرِ هَذَا أَوْ بَدَّلَهُ أَفَلَا مَأْيُكُونَ لِي أَنْ أُبَدِّلَهُ مِنْ تِلْقَائِي نَفْسِي ۚ إِنَّ آتِئْتِكُمُ الْإِلَهَ مَا يُوحَىٰ إِلَيَّ ۚ إِنِّي أَخَافُ أَنْ عَصَيْتُمْ رَبِّي عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيمٍ ﴿١٥﴾﴾ (ہنس: ۱۵)

”اور جب ان کو ہماری آیتیں پڑھ کر سنائی جاتی ہیں تو جن لوگوں کو ہم سے ملنے کی امید نہیں وہ کہتے ہیں کہ (یا تو) اس کے سوا کوئی اور قرآن (بنا) لاؤ یا اسکو بدل دو۔ کہہ دو کہ مجھ کو اختیار نہیں ہے کہ اسے اپنی طرف سے بدل دوں۔ میں تو اسی حکم کا تابع ہوں جو میری طرف آتا ہے۔ اگر میں اپنے پروردگار کی نافرمانی کروں تو مجھے بڑے (سخت) دن کے عذاب سے خوف آتا ہے۔“

② ﴿وَلَوْ تَفَوَّلْتُمْ عَلَيْنَا بَعْضُ الْأَقَاوِينِ لَإِخْتَدْنَا مِنْهُ بَالِئِينَ لَئِنَّ لَكُمْ لَلْعَذَابَ مِنْهُ الْوَتِينَ ۗ فَمَا مِنْكُمْ مِنْ أَحَدٍ عَنْهُ حَاجِزِينَ ﴿٣٥﴾﴾ (الحات: ۳۴-۳۵-۳۶-۳۷)

”اگر یہ پیغمبر ہماری نسبت کوئی بات جھوٹ بنا لاتے۔ تو ہم ان کا داہنا ہاتھ چکڑ لیتے۔ پھر ان کی رگ گردن کاٹ ڈالتے۔ پھر تم میں سے کوئی ہمیں اس سے روکنے والا نہ ہوتا۔“

## ”کلام اللہ کی اقسام“

علامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے امام جوینی رحمۃ اللہ علیہ نے نقل کیا ہے:

”كَلَامُ اللَّهِ الْمُنَزَّلُ وَقِسْمَانِ: قِسْمٌ: قَالَ اللَّهُ لِحَبْرِيِّلَ: قُلْ لِلَّيْلِ أَنْتَ...“

”اللہ تعالیٰ کی جانب سے نازل کردہ کلام کی دو قسمیں ہیں۔“

① پہلی قسم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت جبرئیل علیہ السلام سے فرمایا کہ اے جبرئیل! جس ہستی کی طرف تم میرا پیغام لے کر جاتے ہو اُن سے جا کر کہہ دیجیے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ یہ فرمایا ہے اور اس اس بات کا حکم دیا ہے۔ پس جبرئیل علیہ السلام اللہ تعالیٰ کی بات کو سمجھ گئے اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہو کر عرض کیا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو ایسے ایسے فرمایا ہے۔ اس وقت یہ لازمی نہیں کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام وہی عبارت استعمال کرتے ہوں جو اللہ تعالیٰ نے کی تھی۔ اس کی مثال یوں سمجھیے کہ ایک بادشاہ اپنے کسی معتمد بندے سے یوں کہتا ہے کہ فلاں سردار کو جا کر کہہ دو کہ بادشاہ تمہیں یوں کہہ رہا ہے کہ دل جمعی سے کام کرو اور قتال کے لیے لشکر تیار رکھو۔ پس وہ معتمد آدمی اُس فلاں سردار کے پاس جاتا ہے اور کہتا ہے کہ بادشاہ سلامت نے کہا ہے کہ میری خدمت اور کام میں سستی مت کرو اور جنگی لشکر کو اس کے حال پر مت چھوڑو بلکہ انہیں قتال و جنگ کے لیے ترغیب دیتے رہو اور لشکر کو لازمی کے لیے تیار کر لو۔ پس اب اس معتمد آدمی کو جھوٹا نہیں کہا جائے گا اور نہ ہی یہ کہا جائے گا کہ اُس کے تقصیر سے کام لیا۔

② دوسری قسم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت جبرئیل علیہ السلام سے فرمایا کہ اے جبرئیل! یہ کتاب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو جا کر پڑھ کر سنا دو۔ پس



## مناہل العرفان فی علوم القرآن: جلد ۱

حضرت جبرئیل علیہ السلام نے بغیر کسی تغیر و تبدیلی کے وہ کتاب (تحریر) حضور اقدس ﷺ کو آ کر پڑھ کر سنادی۔ اس وقت یہ لازم ہے کہ الفاظ بعینہ وہی ہوں جو اللہ تعالیٰ نے استعمال کیے تھے۔ اس کی مثال یوں ہے جیسے کوئی بادشاہ اپنے کسی معتمد آدمی سے کہے کہ یہ خط (تحریر) لو اور فلان شخص کے پاس جا کر پڑھ کر سنادو۔ پس اب وہ معتمد آدمی اس فلاں شخص کے پاس جا کر وہ خط (تحریر) پڑھ کر سنادیتا ہے۔ تو اس صورت میں وہ ایک کلمہ یا حرف کی بھی تبدیلی کرنے والا نہیں ہوگا۔“

علامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ امام جوینی رحمۃ اللہ علیہ کا یہ مضمون نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں:

”القرآن هو القسم الثاني والقسم الاول هو السنة كما ورد ان جبرئيل كان ينزل بالسنة كما ينزل بالقرآن.“

یعنی دوسری قسم سے مراد قرآن کریم ہے جبکہ پہلی قسم سے سنت مراد ہے۔ جیسا کہ امام دارمی رحمۃ اللہ علیہ، محمد بن نصیر رحمۃ اللہ علیہ، امام ابو داؤد رحمۃ اللہ علیہ، اور امام خطیب رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت حسان بن عطیہ سے روایت کیا ہے کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام سنت کو بھی قرآن ہی کی طرح لے کر اترا کرتے تھے۔ یہ ہی وجہ ہے کہ سنت کی روایت بالمعنی جائز ہے کیونکہ حضرت جبرئیل علیہ السلام قرآن کریم کو باللفظ ادا کیا تھا۔ اور راز اس میں یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے جو الفاظ قرآن کریم میں استعمال ہوتے ہیں وہ معجز ہیں مخلوق میں سے کسی ایک کو بھی یہ طاقت نہیں کہ وہ اس کے قائم مقام کوئی لفظ استعمال کر سکے۔ اور پھر اس میں یہ راز بھی ہے کہ امت محمدیہ کو آسانی دینے کے لیے اللہ تعالیٰ نے ان پر نازل کی گئی کتاب اور وحی کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا۔ ایک قسم وہ جس کو بعینہ انہی الفاظ کے ساتھ روایت کرتے ہیں جن میں وہ وحی کے ذریعہ اتری ہے اور دوسری قسم کی روایت بالمعنی کر سکتے ہیں ورنہ اگر تمام وحی منزل صرف بلفظ روایت کرنے ہی کی قسم میں داخل کر دی جاتی تو یہ بات امت پر گراں ہوتی۔ اور اگر تمام کلام الہی (دونوں اقسام) کو معنی کے لحاظ سے روایت کیے جانے کی قسم میں شامل کر دیتے تو اس کے تبدیل اور تحریف کیے جانے سے امن حاصل نہیں ہو سکتا تھا۔ فتاویٰ۔

میں کہتا ہوں کہ امام جوینی رحمۃ اللہ علیہ کا یہ کلام بہت نفیس و عمدہ ہے لیکن ہمارے پاس یا امام جوینی رحمۃ اللہ علیہ کے پاس ایسی کوئی دلیل نہیں جس کی بنیاد پر ہم یہ کہہ سکیں کہ غیر قرآن میں حضرت جبرئیل علیہ السلام الفاظ کے اعتبار سے کسی قسم کا تصرف کرتے تھے۔ امام جوینی رحمۃ اللہ علیہ نے اس بارے میں جو کچھ فرمایا وہ محض ان کا عقلی احتمال یا گمان ہے جو کہ اس باب میں ناکافی ہے۔ نیز امام جوینی رحمۃ اللہ علیہ نے کلام اللہ کی جو تقسیم کی ہے وہ بھی نامکمل ہے۔ آپ رحمۃ اللہ علیہ نے کلام اللہ کی دو قسمیں بیان کیں۔ ① کتاب اللہ یعنی قرآن ② سنت یعنی حدیث نبوی ﷺ۔ اور تیسری قسم یعنی حدیث قدسی کو بیان نہیں فرمایا۔ حدیث قدسی وہ حدیث ہوتی ہے جس کو حضور اقدس ﷺ نے کلام اللہ تعالیٰ سے حکایتاً نقل فرماتے ہیں یہ بھی کلام اللہ کی ایک قسم ہے۔ وہ الگ بات ہے کہ اس قسم کو قرآن کریم کی طرح ممتاز حیثیات حاصل نہیں ہوتیں۔ اور اس قسم یعنی حدیث قدسی کو قرآن کریم والی ممتاز حیثیات سے نہ نوازنے میں بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکمتیں ہیں۔ مثلاً امت محمدیہ رحمۃ اللہ علیہ پر تخفیف کرنا یا اس معنی کہ کتاب اللہ کی روایت بالمعنی جائز نہیں جبکہ حدیث قدسی میں روایت بالمعنی جائز ہے۔ کتاب اللہ کو حالت جنابت میں پڑھ، اٹھا اور چھو نہیں سکتے جبکہ حدیث قدسی کو حالت جنابت میں پڑھ بھی سکتے ہیں اور اٹھا بھی سکتے ہیں اور ہاتھ بھی لگا سکتے ہیں۔



ساری بحث کا خلاصہ کلام یہ ہے کہ قرآن کریم کے الفاظ بالاتفاق اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہیں۔ جب کہ مشہور خلاصہ کلام کے قول کے مطابق حدیث قدسی کے الفاظ بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی کیے گئے ہیں۔ لیکن حدیث نبوی ﷺ کے صرف معانی اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل کیے گئے ہیں۔ لہذا قرآن کریم کو جو خصائص مثلاً اعجاز، تعجب، وجوب الحافظہ وغیرہ حاصل ہیں وہ خصائص حدیث قدسی اور حدیث نبوی ﷺ کو حاصل نہیں ہیں۔ اس تقسیم میں حکمت یہ ہے کہ اگر قرآن کریم میں بھی روایت بالمعنی کو جائز قرار دے دیا جاتا تو قرآن کریم کا اعجاز باقی نہیں رہتا۔ اور اگر حدیث قدسی حدیث نبوی ﷺ میں روایت بالمعنی کو جائز نہ رکھا جائے تو امت پر مشقت ہوتی۔ لہذا اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام کو تین اقسام میں منقسم فرمایا تاکہ امت پر مشقت نہ ہو اور قرآن کریم کو بھی ممتاز حیثیت حاصل رہے۔

﴿إِنَّ اللَّهَ بِالنَّاسِ لَءَوْفٌ حَكِيمٌ﴾ (الحج: ۶۵)

”بے شک اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر رؤف ورحیم ہے۔“

## قرآن کریم کے تیسرے یعنی آخری نزول کا عرصہ مدت

قرآن کریم کے نازل ہونے کی ابتداء آنحضور ﷺ کی بعثت سے ہوئی جبکہ انتہا آپ ﷺ کے دنیا سے پردہ فرمانے سے کچھ عرصہ قبل ہوئی۔ قرآن کریم کے نزول کی ابتداء سے انتہا تک کے عرصے کی مدت میں سال، تیس سال یا پچیس سال ہے۔ ۲۰، ۲۳، یا ۲۵ یہ تین اقوال اس لیے ہیں کہ آپ ﷺ کے مکہ میں (بعثت کے بعد) رہنے کے زمانے میں اختلاف ہے۔ اگر یہ مان لیا جائے کہ حضور اقدس ﷺ بعثت کے بعد مکہ مکرمہ میں دس سال رہے تو قرآن کریم کے نزول کا مکمل زمانہ میں سال ہوگا اور اگر مان لیا جائے کہ حضور اکرم ﷺ تیرہ یا پندرہ سال رہے تو قرآن کریم کا زمانہ نزول بالترتیب ۲۳، یا ۲۵ سال ہوگا۔ اور وہی بات مدینہ منورہ میں قیام کی تو اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے یعنی حضور اکرم ﷺ مدینہ منورہ میں بالاتفاق دس سال رہے۔ امام سیوطی رضی اللہ عنہ نے ہی فرمایا ہے۔

لیکن تاریخ اسلامی کے بعض مورخین کا کہنا ہے کہ حضور اقدس ﷺ کی مکہ مکرمہ میں مدت قیام ۱۲ سال، پانچ ماہ اور تیرہ دن ہے۔ اور اس مدت کی ابتداء نبی اکرم ﷺ کی ولادت شریفہ کے اکتالیسویں سال سترہ رمضان المبارک سے ہوتی ہے اور انتہا آپ ﷺ کی ولادت شریفہ کے چودہویں سال کیم ربیع الاول پر ہوتی ہے۔ اور مدینہ منورہ میں ہجرت کے بعد آپ ﷺ کی مدت قیام ۹ سال، ۹ ماہ اور ۹ دن ہے۔ اس مدت کی ابتداء آپ ﷺ کی ولادت شریفہ کے چودہویں سال کیم ربیع الاول سے ہوتی ہے اور انتہا آپ ﷺ کی ولادت شریفہ کے تریسٹھویں سال ذی الحجہ پر ہوتی ہے۔ آپ ﷺ کی ولادت شریفہ کا تریسٹھواں سال درحقیقت ہجرت کا دسواں سال تھا۔

مندرجہ بالا تحقیق کے مطابق وحی کا عرصہ نزول تیس (۲۳) سال ٹھہرتا ہے۔ اور یہ تحقیق اس قول کے قریب قریب ہے جس میں آنحضور ﷺ کا بعثت کے بعد مکہ میں قیام تیرہ سال اور مدینہ میں دس سال ہے۔

لیکن اس تحقیق میں تین یکیاں ہیں:

- ① وحی کی ابتداء میں چھ ماہ تک حضور اکرم ﷺ کو جو روایے صادقہ دکھائی دیتے تھے، اس تحقیق کے مطابق ان چھ ماہ کو مدت وحی میں شمار نہیں کیا گیا۔
- ② اس تحقیق کے مطابق نزول وحی کی ابتداء سترہ رمضان کو ہوئی۔ سترہ رمضان کی رات اگرچہ بعض اقوال کے مطابق لیلیۃ القدر ہے لیکن مشہور اقوال کے مطابق سترہ رمضان کی رات لیلیۃ القدر نہیں ہے۔ لیلیۃ القدر تو رمضان کے آخری عشرے کی طاق راتوں میں ہے صبح اور مشہور قول کے مطابق۔
- ③ اس تحقیق کے مطابق قرآن کی نازل ہونے والی آخری وحی نو ذی الحجہ دس جبری کو نازل ہوئی۔ یعنی ﴿الْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ﴾ (المائدہ: ۳)۔ یہ آیات آخری ہیں۔ حالانکہ آپ آگے جا کر پڑھیں گے کہ قرآن کریم کی آخری آیات یہ نہیں ہیں۔

## قرآن کریم کا تیسرا یعنی آخری نزول یکبارگی نہیں ہے

- جیسا کہ ماقبل گزرا کہ قرآن کریم کا تیسرا یعنی آخری نزول جو کہ حضرت محمد ﷺ کے قلب اطہر پر ہوا یکبارگی نہیں تھا بلکہ تھوڑا تھوڑا کر کے موقع کی مناسبت سے ہوا تھا۔ اس جگہ اس بات پر دلائل پیش کیے جا رہے ہیں۔
- ① ﴿وَقُرْآنًا كَرُفًا لِنُقَرِّأَهُ عَلَى النَّاسِ عَلَى مَكَّةَ وَ نَزَّلْنَاهُ تَنْزِيلًا ۝﴾ (الاسراء: ۱۰۶)
  - ”اور ہم نے قرآن کو جزو جزو کر کے نازل کیا ہے تاکہ تم لوگوں کو ٹھہر ٹھہر کر پڑھ کر سناؤ اور ہم نے اس کو آہستہ آہستہ اتارا ہے۔“
  - ② ﴿وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ الْقُرْآنُ جُمْلَةً وَّاحِدَةً ۚ كَذَلِكَ لِنُثَبِّتَ بِهِ فُؤَادَكَ وَرَتَّلْنَاهُ تَرْتِيلًا ۝﴾ (الفرقان: ۳۲)
  - ”اور کافر کہتے ہیں کہ اس پر قرآن ایک ہی دفعہ کیوں نہیں اتارا گیا؟ اس طرح آہستہ آہستہ اس لیے اتارا گیا کہ اس سے تمہارے دل کو قائم رکھیں اور اسی واسطے ہم اسکو ٹھہر ٹھہر کر پڑھتے ہیں۔“
  - ③ ﴿وَلَا يَأْتُونَكَ بِمَثَلٍ إِلَّا جِئْنَاكَ بِالْحَقِّ وَ أَحْسَنَ تَفْسِيرًا ۝﴾ (الفرقان: ۳۳)
  - ”اور یہ لوگ تمہارے پاس جو (اعتراض کی) بات لاتے ہیں ہم تمہارے پاس اس کا معقول اور خوب شرح جواب بھیج دیتے ہیں۔“

روایت کیا گیا ہے کہ یہود اور مشرکین میں سے کفار حضور اکرم ﷺ کو طعنہ دیا کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ پر قرآن یکبارگی نازل کیوں نہیں فرمادیا۔ تو اس موقع پر اللہ تعالیٰ نے سورۃ الفرقان کی آیت نمبر ۳۲ اور ۳۳ (مندرجہ بالا آیات) نازل فرمائیں۔ یہ دونوں آیات ان کفار پر رد ہے۔ نیز ان آیات سے درج ذیل دو امور ثابت ہوتے ہیں:

- ① قرآن کریم حضور اکرم ﷺ پر یکبارگی نہیں بلکہ جمہا جمہا (تھوڑا تھوڑا کر کے) نازل ہوا ہے۔
- ② سابقہ کتب سماویہ یکبارگی نازل ہوئی تھیں جیسا کہ جمہور علماء کے نزدیک مشہور ہے حتیٰ کہ اس پر تو اجماع بھی منعقد ہو چکا ہے۔

سابقہ کتب سماویہ یکبارگی نازل ہوئی تھیں۔ اگر وہ کتب یکبارگی نازل نہ ہوئی ہوتیں تو اللہ تعالیٰ سورۃ الفرقان کی آیت نمبر

۳۲ میں کفار کے قول کا رد فرماتے اور واضح کر دیتے کہ سابقہ کتب ساویہ بھی قرآن کی طرح نمجا نمجا نازل ہوئی تھیں جیسا کہ سورۃ الفرقان ہی کی آیت نمبر ۷ میں کفار کا قول نقل کیا گیا ہے کہ انھوں نے کہا:

﴿مَالِ هَذَا الرَّسُولِ يَأْكُلُ الظَّكَاةَ وَيَشْتَبِي فِي الْأَسْوَاقِ﴾ (الفرقان: ۷)

”کیسا پیغمبر ہے کہ کھاتا ہے اور بازاروں میں چلتا پھرتا ہے۔“

تو اللہ تعالیٰ نے اپنی سنت کے مطابق ان کے قول کا جواب سورۃ الفرقان کی آیت نمبر ۲۰ میں دیا:

﴿وَمَا أَرْسَلْنَا قَبْلَكَ مِنَ الْمُرْسَلِينَ إِلَّا إِنَّهُمْ لَيَأْكُلُونَ الظَّكَاةَ وَيَشْتَبُونَ فِي الْأَسْوَاقِ﴾ (الفرقان: ۲۰)

”اور ہم نے تم سے پہلے جتنے پیغمبر بھیجے ہیں سب کھانا کھاتے تھے اور بازاروں میں چلتے پھرتے تھے۔“

خلاصہ کلام یہ کہ قرآن کریم کا نمجا نمجا اور سابقہ کتب ساویہ کا یکبارگی نازل ہونا سورۃ الفرقان کی آیت نمبر ۳۲ ہی سے

ثابت ہو رہا ہے۔

## قرآن کریم کے تنجیمی نزول میں اسرار و حکم

تنجیمی نزول سے قرآن کریم کا نمجا نمجا، درجہ بہ درجہ، تھوڑا تھوڑا کر کے نازل ہونا یا تدریجی نزول مراد ہے۔ قرآن کریم کے تنجیمی نزول میں متعدد اسرار اور کثیر حکمتیں ہیں، ان اسرار و حکم میں سے اجمالی طور پر چار سر یا چار حکمتیں ذیل میں بیان کی جارہی ہیں۔

**پہلی حکمت** تدریجی نزول میں سب سے پہلی حکمت حضور اقدس ﷺ کے قلب اطہر کو ثبات اور قوت بخشنا تھی۔ حضور اکرم ﷺ کے قلب اطہر کو تدریجی نزول سے تقویت اور ثبات کیسے ملتا تھا؟ اس کی پانچ وجوہات ہیں: جو کہ درج ذیل ہیں:

**پہلی وجہ** بارگاہ خداوندی سے نئے نئے پیغامات کا آنا اور فرشتہ وحی یعنی حضرت جبرئیل علیہ السلام کا ان پیغامات کو لے کر بار بار حضور اکرم ﷺ کے پاس تشریف لانا حضور اکرم ﷺ کے قلب اطہر میں سرور و لذت کی کیفیت پیدا کرتا تھا۔ اور یہ سرور و لذت آپ کے قلب اطہر کے لیے تقویت کا سبب تھا۔

**دوسری وجہ** تدریجی نزول میں فہم و حفظ کے اعتبار سے آسانی پائی جاتی ہے۔ کیونکہ جب آیات و احکام وقتاً فوقتاً نازل ہوں گے تو ان آیات و احکام کو یاد کرنا اور سمجھنا آسان ہوگا۔ اور حضور اکرم ﷺ بھی اس بات پر مطمئن رہیں گے کہ مجھے تمام احکام و حکمتیں یاد ہیں۔

**تیسری وجہ** ہر ضرورت کے وقت میں ضرورت کے مطابق کلام الہی کا نازل ہو جانا ایک معجزہ تھا۔ اور ہر بار کلام الہی ہوتا ایک نیا معجزہ ہوتا تھا۔ اور یہ معجزہ کفار کے لیے عجز ثابت کرتا تھا۔ جبکہ مسلمانوں کے لیے بالخصوص حضور اکرم ﷺ

”محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ“

کے لیے ثباتِ قلب و تقویت اور طمینان کا سبب ہوتا تھا۔

تدریجی نزول میں حق کی تائید اور باطل کی تردید کیے بعد دیگرے پائی جاتی تھی۔ جس سے اپنی کامیابی پر بار بار چوتھی وجہ ﴿﴾ لذت محسوس ہوتی تھی۔ جو کہ تقویتِ قلب کا سبب ہے۔

تیسری اور چوتھی وجہ بظاہر ملتی جلتی محسوس ہو رہی ہیں لیکن ان دونوں میں وہ فرق ہے جو کسی چیز اور اس کے اثر یا ملزوم اور اس کے لازم کے درمیان ہوتا ہے۔

پس معجزہ بذاتِ خود رسول اللہ ﷺ کے لیے ایک قوت کی حیثیت رکھتا تھا جو کہ آپ کی ذاتِ اقدس کے لیے مؤید اور قلب اطہر کے لیے مُثَبِّتِ ثابت ہوتا تھا۔ اور اس معجزہ کا اثر یا نتیجہ ایک علیحدہ طور پر حضور ﷺ کے قلبِ کریم کے لیے طمانیت تھا۔ پس یہ معاملہ اسلحہ کی مثال کی طرح ہے۔ جیسے کسی آدمی کے ہاتھ میں اسلحہ کا موجود ہونا بھی اس آدمی کو مطمئن رکھتا ہے اگرچہ وہ اس اسلحہ کو استعمال نہ کر رہا ہو اور اگر وہ اس اسلحہ کو استعمال کرتا ہے دشمن کو شکست دینے کے لیے تو وہ دو گنا طمانیت کا موجب ہوتا ہے۔

حضور اکرم ﷺ سے اللہ تعالیٰ کا وعدہ تھا کہ کفار و دشمنوں کی طرف سے جو شداہد آئیں گے میں ان کو پانچویں وجہ ﴿﴾ آپ ﷺ پر آسان کر دوں گا۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ کفار کی طرف سے شداہد مختلف اوقات میں رونما ہوتے رہتے تھے تو اللہ تعالیٰ بھی ان شداہد کو اہل و آسان کرنے کے لیے مختلف اوقات میں آیات نازل کرتے رہتے تھے جن کے ذریعہ آپ ﷺ کو تسلی دی جاتی تھی۔ اس تسلی دینے کے مختلف انداز ہوتے تھے مثلاً کبھی اللہ تعالیٰ سابقہ انبیاء مرسلین کے واقعات سنا کر تسلی دیتے تھے (یہ انداز قرآن مجید میں بکثرت پایا جاتا ہے) جیسا کہ سورۃ ہود آیت نمبر ۱۲۰ میں ہے:

﴿وَكَلَّا تَقْصُصْ عَلَيْكَ مِنْ أَنْبَاءِ الرُّسُلِ مَا نَنْبَيْتُ بِهِ فُؤَادَكَ ۗ﴾ (ہود: ۱۲۰)

”(اے محمد ﷺ) پیغمبروں کے وہ سب حالات جو ہم تم سے بیان کرتے ہیں ان سے ہم تمہارے دل کو قائم رکھتے ہیں۔“ اور کبھی تسلی کا انداز اس طرح ہوتا تھا کہ اللہ تعالیٰ حضور اکرم ﷺ کو وہ وعدے یاد دلاتے تھے جو اللہ تعالیٰ نے حضور اکرم ﷺ سے کیے تھے اور ان کی حفاظت کا حکم دیتے تھے جیسا کہ درج ذیل آیات میں ہے:

﴿وَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ فَإِنَّكَ بِأَعْيُنِنَا﴾ (الطور: ۳۸)

”اور تم اپنے پروردگار کے حکم کے انتظار میں صبر کیے رہو تم تو ہماری آنکھوں کے سامنے ہو۔“

﴿وَاللَّهُ يَعْصَمُكَ مِنَ النَّاسِ﴾ (المائدہ: ۶۷)

”اور خدا تم کو لوگوں سے بچائے رکھے گا۔“

اسی طرح کی آیات سورۃ الضحیٰ اور سورۃ الانشراح میں بھی ہیں جن میں وعدوں اور عطا یا کا بیان ہے۔ اور کبھی تسلی کا انداز اس طرح ہوتا کہ اللہ تعالیٰ اپنے حبیب ﷺ کو دشمنوں کی شکست کی خوش خبری سناتے تھے اور دشمن کو ڈراتے دھمکاتے تھے۔ جیسا کہ درج ذیل آیات میں ہے:

﴿سَيَهْزِمُ الْجَنْجُ وَيُؤْمِنُونَ الدُّبُورُ﴾ (القدر: ۲۵)

”عنقریب یہ جماعت نکلت کھائے گی اور یہ لوگ پیڑھے پھیر کر بھاگ جائیں گے۔“

﴿فَإِنْ أَعْرَضُوا فَقُلْ أَنْذَرْتُكُمْ ضِعْفَةَ فَتْنِكُمْ وَمَثَلَ ضِعْفَةِ عَادٍ وَتَمُودَ ۗ﴾ (نمل: ۱۳)

”پھر اگر یہ منہ پھیر لیں تو کہہ دو کہ میں تم کو ایسی چنگھاڑ (کے عذاب) سے آگاہ کرتا ہوں جیسے عاد اور ثمود پر چنگھاڑ (کا عذاب آیا تھا)۔“

﴿فَأَصْبِرْ ذَا صَبْرٍ كَمَا صَبَرُوا لَوْلَا الْعُزْرُورُ مِنَ الرَّسُولِ ۗ﴾ (الاحقاف: ۳۵)

”بس (اے محمد ﷺ) جس طرح اور عالی ہمت پیغمبر صبر کرتے رہے ہیں اسی طرح تم بھی صبر کرو۔“  
اور کبھی امر کی بجائے نبی کے انداز میں ان کفار کو راہ لوگوں کے لیے حسرت اور انفسوں کرنے سے منع کیا جاتا اور فرمایا جاتا:

﴿فَلَا تَذْهَبْ نَفْسُكَ عَلَيْهِمْ حَسْرَتٍ ۗ إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ بِمَا يَصْنَعُونَ ۗ﴾ (الفاطر: ۸)

”تو ان لوگوں پر انفسوں کر کے تمہارا دم نہ نکل جائے یہ جو کچھ کرتے ہیں خدا اس سے واقف ہے۔“

﴿وَاصْبِرْ وَمَا صَابِرُكَ إِلَّا بِاللَّهِ وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَلَا تَكُ فِي ضَلُوبٍ مِمَّا يَمْكُرُونَ ۗ﴾ (النمل: ۱۲)

”اور صبر ہی کرو اور تمہارا صبر بھی خدا ہی کی مدد سے ہے اور ان کے بارے میں غم نہ کرو اور جو یہ بداندیشی کرتے ہیں اس سے تنگ دل نہ ہونا۔“

﴿لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَفْسِكَ أَلَّا يَكُونُوا مُؤْمِنِينَ ۗ﴾ (الشمراء: ۳۰)

”(اے پیغمبر) (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) شاید تم اس (رج) سے کہ یہ لوگ ایمان نہیں لاتے اپنے تئیں ہلاک کر دو گے۔“

﴿وَإِنْ كَانَ كَبُرَ عَلَيْكَ إِعْرَاضُهُمْ فَإِنْ امْتَطَعْتَ أَنْ تَبْتَغِيَ نَفَقًا فِي الْأَرْضِ أَوْ سُبُلًا فِي السَّمَاءِ فَتَاتِيَهُمْ بِآيَةٍ ۗ وَكَوْشَاءَ اللَّهُ لَجَجَعُهُمْ عَلَى الْهُدَىٰ فَلَا تَكُونَنَّ مِنَ الْجَاهِلِينَ ۗ إِنَّمَا يَسْتَجِيبُ الَّذِينَ يَسْمَعُونَ ۗ وَالْبَوْنَىٰ يَبْعُهُمْ اللَّهُ لَنْ يُرْجَعُونَ ۗ﴾ (الانعام: ۳۶، ۳۵)

”اور اگر ان کی روگردانی تم پر شاق گزرتی ہے تو اگر طاقت ہو تو زمین میں کوئی سرنگ ڈھونڈھ نکالو یا آسمان میں سیرجی (غلاش کرو) پھر ان کے پاس کوئی مجزہ لاؤ۔ اور اگر خدا چاہتا تو سب کو ہدایت پر جمع کر دیتا۔ بس تم ہرگز نادانوں میں نہ ہونا۔ بات یہ ہے کہ (حق کو) قبول وہی کرتے ہیں جو سنتے بھی ہیں اور مردوں کو تو خدا (نیامت ہی کو) ٹھہرائے گا۔ پھر اسی کی طرف لوٹ کر جائیں گے۔“

تدریجی نزول کی مذکورہ پہلی حکمت اپنی پانچوں وجوہات کے ساتھ درج ذیل آیت میں سموی ہوئی ہے۔

﴿كَذَلِكَ ۙ لِنُثَبِّتَ بِهِ فُؤَادَكَ ۗ﴾ (الفرقان: ۳۲)

”اس طرح آہستہ آہستہ اس لیے اتارا گیا کہ اس سے تمہارے دل کو قائم رکھیں۔“





مطابق حج چھ ہجری میں فرض ہوا تھا۔ شاید علامہ الزرقانی نے اسی وجہ سے سن چھ ہجری فرمایا۔ مترجم)۔ اللہ تعالیٰ کی یہ ہی سنت باقی امور میں بھی جاری رہی ہے مثلاً جب منکرات کی باری آئی تو اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے کبار کے بارے میں زجر اور شدید تکبیر نازل فرمائی اس کے بعد نرمی کے انداز میں صفائے سے بھی منع فرمادیا۔

خلاصہ یہ کہ جو برائی اس وقت کے لوگوں میں ہو سکتی تھی ان برائیوں کو جزا سمیت اکھاڑنے کے لیے یہ ہی طریقہ کار گر تھا جو اللہ تعالیٰ نے اپنا یعنی تدریجی نزول۔ اور تدریجی نزول کے ضمن میں احکام کا تدریجی لزوم۔ ایک شراب ہی کی مثال کو دیکھے کہ اللہ تعالیٰ نے شراب کو کیسے تدریجاً حرام قرار دیا۔ پس اسی تدریجی طریقہ کار کے تحت اسلام اس خطہ عرب میں مکمل طور پر پھیل گیا۔ اور یہ یہ طریقہ سب سے زیادہ ہدایت پھیلانے والا اور کامیاب سیاست کے طور پر اہل عالم کے سامنے متعارف ہوا۔ نسبتاً ان متمدن اور مہذب اقوام کے جنہوں نے شراب کی ممانعت کے حوالے سے اپنی عوام کو بہت ہی بڑی طرح ناکام اور تہی دست بنا کر رکھ دیا اور امریکہ نے جو مشکلہ خیز فیصلہ کیا ہے وہ بھی اس سے کوئی کم درجے کا نہیں۔

کیا یہ اسلام کا اعجاز اور اعزاز نہیں ہے کہ اس نے کیسی سیاست رشیدہ کے ذریعے قبائل کو راہ راست دکھائی اور کئی گروہوں کو مہذب بنایا اور بہت سی جماعتوں کی تربیت کی؟ کیوں نہیں! بے شک اس اعجاز و اعزاز پر تو تاریخ بھی ایک گواہ ہے۔

⑤ مومنین کے دلوں کے لیے ثبات فراہم کرنا ﴿۵﴾ اُمّت محمدی علیٰ صاحبہا السلام والحقیت کی تربیت کا ایک اہم پہلو یہ بھی تھا کہ ان کے قلوب کو ثابت و مضبوط رکھا جائے۔ اُن کو کفار کی جانب سے پیش آنے والے مصائب و آلام پر صبر اور اجر کے ساتھ تسلی دے جائے۔ بایں طور پر کہ قرآن کریم نے رفتہ رفتہ گزشتہ امتوں کے واقعات سنائے۔ سابقہ انبیاء و مرسلین اور ان کے قہقہوں و مخالفین کے انجام بد اور انجام خیر کے قصے سنا کر ان کی حوصلہ افزائی فرمائی۔ اور بہت سی ایسی آیات نازل فرمائیں جن میں اپنے نیک بندوں کے ساتھ نصرت، اجر، تائید اور تمکین کے سچے وعدے کیے گئے تھے۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَعَدَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنكُمْ وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ ۚ وَ لِيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِينَهُمُ الَّذِي ارْتَضَىٰ لَهُمْ ۖ وَلَيُبَدِّلَنَّهُم مِّن بَعْدِ خَوْفِهِمْ أَمْنًا ۗ يُعْبُدُونَنِي ۚ لَا يُشْرِكُونَ بِي شَيْئًا ۚ وَمَن كَفَرَ بَعْدَ ذَلِكَ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْفٰسِقُونَ ﴿۵۵﴾﴾ (النور: ۵۵)

”جو لوگ تم میں سے ایمان لائے اور نیک کام کرتے رہے ان سے خدا کا وعدہ ہے کہ ان کو ملک کا حاکم بنا دے گا جیسا ان سے پہلے لوگوں کو حاکم بنایا تھا اور ان کے دین کو جسے اس نے ان کے لیے پسند کیا ہے مستحکم و پائیدار کرے گا اور خوف کے بعد ان کو امن بخشنے گا وہ میری عبادت کریں گے (اور) میرے ساتھ کسی اور کو شریک نہ بنائیں گے اور جو اس کے بعد کفر کرے تو ایسے لوگ بد کردار ہیں۔“

پس اللہ تعالیٰ نے جو وعدے فرمائے وہ بالکل سچ ثابت ہوئے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندے کی خوب مدد فرمائی اس کے لشکر کو عزتوں سے نوازا اور دشمنوں کے لشکروں کو تنہا شکست سے دو چار کیا، اور قرآن مجید میں یوں فرمایا:

﴿فَقَطِّعْ دَابِرَ الْقَوْمِ الَّذِينَ ظَلَمُوا وَالْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ﴾ (الانعام: ۴۵)

”غرض ظالم لوگوں کی جڑ کاٹ دی گئی۔ اور سب تعریف خدائے رب العالمین ہی کو (سزاوار ہے)۔“  
تدریجی نزول کی مذکورہ دوسری حکمت درج ذیل آیت میں سموی ہوئی ہے۔

﴿وَقَرَأْنَا قُرْآنَهُ لِنُقَرِّأَهُ عَلَى النَّاسِ عَلَى مُكَلِّثٍ﴾ (الاسراء: ۱۰۶)

”اور ہم نے قرآن کو جزو جزو کر کے نازل کیا ہے تاکہ تم لوگوں کو ٹھہر ٹھہر کر پڑھ کر سناؤ۔“

اور تدریجی نزول کے اسرار اور حکمتوں کے بیان کے باب میں مندرجہ بالا آیت کی تفسیر سورۃ الفرقان کی آیت نمبر ۳۲ سے ہوتی ہے۔ جو کہ مندرجہ ذیل ہے:

﴿وَرَتَّلْنَاهُ تَرْتِيلًا﴾ (الفرقان: ۳۲)

”اور اسی واسطے ہم اسکو ٹھہر ٹھہر کر پڑھتے ہیں۔“

﴿تَرْتِيلًا﴾ پرتوین تعظیم کے لیے ہے۔ اس میں اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ اس ترتیل کے تحت معانی و معارف کا بیش بہا خزانہ موجود ہے۔

تدریجی نزول کی تیسری حکمت پے در پے نئے نئے پیش آنے والے واقعات کا ان کے مناسب حال جواب دینا تھا۔ پس جب بھی کوئی نیا واقعہ یا حادثہ پیش آتا تو اس کی مناسبت میں قرآن نازل ہو جاتا۔ اور اللہ تعالیٰ اس واقعے سے متعلق احکام کو مفصل بیان فرما دیتے۔ اگر قرآن کو یکبارگی نازل کیا جاتا تو روز بروز رونما ہونے والے واقعات کا جواب اور اس سے متعلق مسائل کا حل کیسے بیان کیا جاسکتا تھا۔ لہذا اس حکمت کے بھی پیش نظر قرآن کریم کو تدریجاً نازل کیا گیا۔ اس حکمت کو درج ذیل چار امور میں بیان کیا جاسکتا ہے۔

① **سائلین کے جوابات دینا** ہوتے تھے اس لیے ان کے جواب میں آیات بھی وقتاً فوقتاً نازل ہوتی تھیں۔ اب ان سائلین کی دو قسمیں تھیں۔ ایک سائلین وہ تھے جن کے سوالوں سے حضور اکرم ﷺ کی طرف سائلین متوجہ ہوئے۔ اور وہ سائلین وقتاً فوقتاً متوجہ لوگوں کے سامنے ظاہر ہوتی تھی جیسے کچھ سائل آئے اور آ کر حضور اکرم ﷺ سے ”روح“ کے بارے میں پوچھا:

﴿وَيَسْأَلُونَكَ عَنِ الرُّوحِ قُلِ الرُّوحُ مِنْ أَمْرِ رَبِّي وَمَا أُوتِيتُمْ مِنَ الْعِلْمِ إِلَّا قَلِيلًا﴾ (الاسراء: ۸۵)

”اور تم سے روح کے بارے میں سوال کرتے ہیں۔ کہہ دو کہ وہ میرے پروردگار کی ایک شان ہے۔ اور تم لوگوں کو (بہت ہی) کم علم دیا گیا ہے۔“

(یہ پہلی قسم کے سائلین کے سوالات دشمنی اور عناد پر مبنی ہوتے تھے اور ان کا مقصد یہ تھا کہ اگر آپ ﷺ کی طرف سے جواب میں تاخیر ہو جائے یا بالکل ہی جواب نہ آئے تو ہم آپ ﷺ کی رسالت کو لوگوں کے سامنے مشکوک کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے ان دشمنوں کی طرف سے پوچھے جانے والے تمام سوالات کے ایسے جوابات نازل فرمائے کہ سوال

﴿مناہل العرفان فی علوم القرآن: جلد ۱﴾

پوچھنے والے لا جواب ہو گئے) پس کچھ لوگ آئے اور حضرت ذوالقرنین کے بارے میں سوال پوچھا: قرآن نے یہ واقعہ یوں نقل کیا:

﴿وَيَسْأَلُونَكَ عَنِ الْقَرْنَيْنِ ۚ قُلْ سَأَتْلُوا عَلَيْكُمْ مِنهٗ ذِكْرًا ۝۸۳﴾ (الکہف: ۸۳)

”اور تم سے ذوالقرنین کے بارے میں دریافت کرتے ہیں کہہ دو کہ میں اس کا کسی قدر حال تمہیں بڑھ کر سنا تا ہوں۔“

(سورۃ الکہف کے ان آیات میں یہ واقعہ بیان ہوا ہے۔ وہاں دیکھا جاسکتا ہے)

اور سائلین کی دوسری قسم وہ تھی جن کے سوال کا مقصد اللہ تعالیٰ کے حکم کی معرفت ہوتا تھا تاکہ وہ علی وجہ البصیرت اس حکم پر عمل کر سکیں۔ جیسا کہ کچھ طالبان حق نے سوال کیے تھے:

﴿وَيَسْأَلُونَكَ مَاذَا يُنفِقُونَ ۗ قُلِ الْعَفْوَ ۗ﴾ (البقرہ: ۲۱۹)

”اور یہ بھی تم سے پوچھتے ہیں کہ (خدا کی راہ میں) کون سا مال خرچ کریں کہہ دو کہ جو ضرورت سے زیادہ ہو۔“

﴿وَيَسْأَلُونَكَ عَنِ الْيَتَامَىٰ ۖ قُلْ إِصْلَاحٌ لَّهُمْ خَيْرٌ ۚ وَإِنْ تُخَالِطُوهُمْ فَارْحَمُوا كَلِمَةً ۗ﴾ (البقرہ: ۲۲۰)

”اور تم سے یتیموں کے بارے میں بھی دریافت کرتے ہیں کہہ دو کہ ان کی (حالت کی) اصلاح بہت اچھا کام ہے اور اگر تم ان سے مل جل کر رہنا (یعنی خرچ اکٹھا رکھنا) چاہو تو وہ تمہارے بھائی ہیں۔“

۲) واقعات کا مختلف اوقات میں رونما ہونا ﴿﴾ واقع نہیں ہو جاتے بلکہ مختلف اوقات میں مختلف واقعات

رونما ہوتے رہتے ہیں۔ پس قرآن کریم میں ان واقعات سے متعلق احکام بیان کرنے تھے اور اس کے لیے اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم تدریجاً نازل کیا۔ اور پھر ہر موقع پر پیش آنے والے واقعات سے متعلق تفصیلی احکام اپنی آخری کتاب یعنی قرآن میں بیان کر دیے۔ اس باب میں بھی بہت سی مثالیں ملتی ہیں۔ مثلاً ایک ایسا واقعہ جو دل کو ہلا دے اور دیکھنے کھڑے کر دے۔ میری مراد اس سے دشمنوں کی جانب سے ام المؤمنین سیدتنا حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا پر جھوٹا الزام لگائے جانے کا واقعہ ہے۔ اس موقع پر اللہ تعالیٰ نے سورۃ النور کی دس آیات ایک ساتھ نازل فرمائیں جن میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پر لگائی جانے والی تہمت کی تردید کی اور ساتویں آسمان سے ان کی پاک دامنی کی گواہی نازل فرمائی۔

اس کی ایک اور مثال سورۃ المجادلہ کی ابتدائی آیات ہیں:

﴿قَدْ سَمِعَ اللَّهُ قَوْلَ الَّتِي تُجَادِلُكَ فِي زَوْجِهَا وَتَشْتَكِي إِلَى اللَّهِ ۗ وَاللَّهُ يَسْمَعُ تَحَاوُرَكُمَا ۗ إِنَّ اللَّهَ سَمِيعٌ

بَصِيرٌ ۝۱﴾ (المجادلہ: ۱)

”(اے پیغمبر ﷺ) جو عورت تم سے اپنے شوہر کے بارے میں بحث وجدال کرتی اور اللہ سے شکایت (رنج و ملال) کرتی

تھی اللہ نے اس کی التجاس ن لی۔ اور اللہ تم دونوں کی گفتگو سن رہا تھا کچھ شک نہیں کہ اللہ سنا دیکھتا ہے“

اللہ تعالیٰ نے یہ آیات اس وقت نازل فرمائیں جب حضرت خولہ بنت ثعلبہ رضی اللہ عنہا نے حضور اکرم ﷺ کی خدمت اقدس میں

آ کر اپنے شوہر حضرت اوس بن الصامت رضی اللہ عنہ کی شکایت کی تھی۔ ان کے شوہر نے ان سے ظہار کر لیا تھا۔ انہوں نے آ کر حضور اکرم ﷺ

سے اپنا مسئلہ بیان کیا کہ میرے بچے بہت چھوٹے ہیں اگر میں ان کو اپنے شوہر کے پاس چھوڑتی ہوں تو یہ مرجائیں گے اور اگر اپنے پاس رکھتی ہوں تو یہ بھوکے رہیں گے۔ اب بتائیے کہ میں کیا کروں۔ تو اللہ تعالیٰ نے مندرجہ بالا آیات میں حضرت خولہ بنت ثعلبہ رضی اللہ عنہا کے مسئلے کا حل بیان فرمایا۔

۳) **مسلمانوں کو ان کی اغلاط کی طرف متوجہ کرنا**

ساری کی ساری یک نیت نہیں ہوتی تھیں بلکہ ان خطاؤں کا وقوع از زمان متفرقہ میں ہوتا تھا تو ظاہر بات ہے ان کی خطاؤں کی اصلاح بھی از زمان متفرقہ میں ہی ہوتی تھی، اس لیے اللہ تعالیٰ جب کسی مسلمان سے کوئی خطا ہوتی تو اسی وقت اس کی اصلاح کے لیے آیات قرآنی نازل فرماتے۔ جیسا کہ غزوہ اُحد میں مسلمانوں کی ایک جماعت سے اجتہادی غلطی ہوئی۔ انھیں ایک مقام پر کھڑا کیا گیا لیکن وہ وہاں سے ہٹ گئے جس کی وجہ سے بہت نقصان کا سامنا کرنا پڑا۔ تو اس موقع پر درج ذیل آیت اور اس کے بعد والی بہت سی آیات اسی غلطی پر آگاہ کرنے کے لیے نازل فرمائی گئیں۔

﴿وَلِذَٰلِكَ عَدُوٌّ مِّنْ أَهْلِكَ تَبَوَّأُوا الْمُؤْمِنِينَ مَقَاعِدَ لِلْقِتَالِ﴾ (آل عمران: ۱۲۱)

”اور (اس وقت کو یاد کرو) جب تم صبح کو اپنے گھر سے روانہ ہو کر ایمان والوں کو لڑائی کے لیے مورچوں پر (موقع بہ موقع) متعین کرنے لگے۔“

اس کی ایک اور مثال سورۃ التوبہ کی درج ذیل آیات میں ملتی ہے:

﴿وَيَوْمَ حُنَيْنٍ إِذْ أَعْجَبْتَكُمْ كُفِّرُكُمْ فَلَمْ تُغْنِ عَنْكُمْ شَيْئًا وَضَارَتْ عَلَيْكُمْ الْأَرْضُ بِمَا رَحَبَتْ ثُمَّ وَلَّيْتُمْ مُدْبِرِينَ﴾ ﴿ثُمَّ أَنْزَلَ اللَّهُ سَكِينَتًا عَلَى رَسُولِهِ وَعَلَى الْمُؤْمِنِينَ وَأَنْزَلَ حُمُودًا لَهُمْ لَتَرَوْهَا وَعَذَابَ الَّذِينَ كَفَرُوا وَذَٰلِكَ أَجْرُ الْكَافِرِينَ﴾ ﴿ثُمَّ يُتُوبُ اللَّهُ مِنْ بَعْدِ ذَٰلِكَ عَلَىٰ مَنْ يَشَاءُ وَاللَّهُ عَفُورٌ رَّحِيمٌ﴾ (التوبہ: ۲۵، ۲۶، ۲۷)

”اور (جنگ) حنین کے دن جبکہ تم کو اپنی (جماعت کی) کثرت پر غرہ تھا تو وہ تمہارے کچھ بھی کام نہ آئی۔ اور زمین باوجود (اتنی بڑی) فراخی کے تم پر تنگ ہو گئی۔ پھر تم پیٹھ پھیر کر پھر گئے۔ پھر خدا نے اپنے پیغمبر (ﷺ) پر اور مومنوں پر اپنی طرف سے تسکین نازل فرمائی اور (تمہاری مدد کو فرشتوں کے) لشکر جو تمہیں نظر نہیں آتے تھے (آسمان سے) اتارے اور کافروں کو عذاب دیا۔ اور کفر کرنے والوں کی یہی سزا ہے۔ پھر خدا اس کے بعد جس پر چاہے مہربانی سے توجہ فرمائے۔ اور خدا بخشنے والا مہربان ہے۔“

یہ آیات غزوہ حنین کے موقع پر نازل ہوئیں جب بعض نووارد مسلمانوں نے اپنی زیادہ تعداد تو بھلا جانا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے ان آیات میں یہ سبق دیا کہ کثرت یا قلت پر کامیابی یا ناکامی کا دار و مدار انہیں ہوتا بلکہ اصل چیز اللہ پر توکل اور اللہ کی طرف سے نصرت ہوتی ہے۔ پس ان آیات میں فوری طور پر نووارد مسلمانوں کو متنبہ فرمایا کہ وہ اپنی سوچ کو درست کریں اور توبہ کریں۔

۴) **منافقین کے حال سے آگاہی**

منافقین جو کہ اللہ کے دشمن ہیں، کے حال سے آگاہ کرنا، ان کے پردوں کو فاش کرنا مقصود تھا۔ تاکہ اللہ کے رسول ﷺ اور صحابہ اکرام رضی اللہ عنہم ان منافقین

کے اصلی چہرے سے واقف ہو جائیں اور آئندہ ان کے مکرو فریب اور شرور سے محفوظ رہیں جیسا کہ سورۃ البقرۃ میں فرمایا گیا:

﴿وَمِنَ النَّاسِ مَن يَقُولُ آمَنَّا بِاللَّهِ وَبِالْيَوْمِ الْآخِرِ وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِينَ ۝۸۰.....﴾ (البقرۃ: ۸۰-۲۰)

”اور بعض لوگ ایسے ہیں جو کہتے ہیں کہ ہم خدا پر اور روزِ آخرت پر ایمان رکھتے ہیں حالانکہ وہ ایمان نہیں رکھتے۔“

یہ کلمہ تیرہ آیات اللہ تعالیٰ نے نازل فرمایا جن میں منافقین کی نصیحت بیان ہوئی تاکہ ان کے بھیانک چہرے سے پردہ اٹھایا جاسکے جیسا کہ سورۃ التوبہ کی بہت سی آیات میں اللہ تعالیٰ نے منافقین کی منافقت کا پردہ فاش کیا ہے۔ اور قرآن کریم تو اسی طرح بہت سے حقائق سے پردہ اٹھاتا ہے۔

اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ تدریجی نزول کی تیسری حکمت اپنے چاروں مضامین کے ساتھ درج ذیل آیت سے ماخوذ مفہوم ہو رہی ہے۔

﴿وَلَا يَأْتُونَكَ بِمَثَلٍ إِلَّا جِئْنَاكَ بِالْحَقِّ وَأَحْسَنَ تَفْسِيرًا ۝۳۳﴾ (الفرقان: ۳۳)

”اور یہ لوگ تمہارے پاس جو (اعتراض کی) بات لاتے ہیں ہم تمہارے پاس اس کا معقول اور خوب شرح جواب بھیج دیتے ہیں۔“

**تدریجی نزول کی چوتھی حکمت** تدریجی نزول کی چوتھی حکمت مصدر قرآن کی طرف راہ نمائی کرنا تھی۔ یعنی اس

تدریجی نزول کی چوتھی حکمت کی طرف راہ نمائی کرنا تھی کہ یہ قرآن تنہا اللہ تعالیٰ کا کلام ہے اور یہ ممکن ہو

یہ نہیں سکتا کہ یہ کلام اللہ تعالیٰ کے سوا حضور اکرم ﷺ یا کسی اور مخلوق کا کلام ہو۔

اے مخاطب! تو قرآن مجید کو اول سے لے کر آخر تک پڑھ، تجھے وہ ایک ایسے مضبوط قلعے کی مانند محسوس ہوگا جس میں کوئی دراڑ نہ ہو۔ اس کا اسلوب قلعے کی مضبوط سیسہ پلائی ہوئی دیواروں کے مثل دکھائی دے گا۔ اس کی آیات میں اتصالِ کامل نظر آئے گا۔ تو اس کی سورتوں، آیتوں اور جملوں میں ایک بے مثال ربط پائے گا۔ قرآن مجید کی الف سے لے کر یاء تک اعجاز کا اجزاء یوں محسوس ہوگا جیسے رنگوں میں خون کا تسلسل ہوتا ہے۔ قرآن مجید گویا کہ چاندی کی اس ذلی کی مثل ہے جس کو پگھلا کر ڈھالا گیا ہو پھر اس ذلی کے اجزاء میں کسی قسم کی پھٹن یا کچی دکھائی نہ دیتی ہو۔ قرآن مجید گویا کہ روشن چمکدار ستاروں کا ایک حلقہ ہے یا پھر وہ نایاب موتیوں کی لڑی ہے یا پھر وہ ایک ایسا نایاب ہیرا ہے جس کی روشنی آنکھوں کو حیرہ کے دیتی ہے۔ قرآن مجید کے حروف و کلمات کو موتیوں کی طرح ایک لڑی میں پرویا گیا ہے۔ اس کے جملے و آیات کو ایک خاص مقصد کی خاطر لایا گیا ہے۔ اس کا آخر اس کے اول کی تائید کرتا ہے جبکہ اس کا اول اس کے آخر کا پیش خیمہ ہے۔

یہاں پر ایک سوال یہ بھی اٹھتا ہے کہ اگر یہ کلام غیر اللہ کا ہوتا تو اس کلام میں اعلیٰ درجے کا اعجاز، کلمات و جملوں میں بے مثال اتفاق و مطابقت اور آیات و سورتوں میں حیران کن ربط کیسے برقرار رہتا حالانکہ یہ کلام ایک ساتھ نازل نہیں ہوا۔ تھوڑا تھوڑا کر کے نازل ہونے والے ہر حصے میں اعجاز، تسلسل و ربط کا ایک جیسا معیار و اسلوب بار بار اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ یہ کلام کسی مخلوق کا نہیں یا اس کلام میں کسی مخلوق کا حصہ بھی نہیں۔ یہ کلام خالصتاً ایک ذات یعنی اللہ سبحانہ و تعالیٰ کا ہے جیسا کہ قرآن مجید میں ہے:

﴿وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللَّهِ لَوَجَدُوا فِيهِ اخْتِلَافًا كَثِيرًا﴾ (النساء: ۸۲)

”اگر یہ اللہ کے سوا کسی اور کا (کلام) ہوتا تو اس میں (بہت سا) اختلاف پاتے۔“

پس بشری طاقت کے لیے یہ کیسے اور کیوں کر ممکن ہو سکتا ہے کہ وہ اس قدر وسیع و بلیغ اور مجز کلام پیش کرے جو انسان کی طاقت سے باہر ہو۔ اس کتاب کا ہر جز اپنے دوسرے اجزاء کے ساتھ اعلیٰ درجے کی متابعت رکھتا ہے۔ حالانکہ اس کی نازل ہونے والی آیات کے اسباب مختلف ہیں، زمان اور مکان جدا جدا ہیں، اس کے نزول کا مکمل عرصہ قریباً تیس سال ہے۔ ان تیس سالوں میں زمانے نے مختلف موڑ کھائے، وقت نے کئی طرح گردش کی اور مکان بھی بدلتے رہے لیکن اس کتاب کا معیار اعجاز، اسلوب بیان اور تسلسل و ربط بین الآیات و السور ایک جیسا رہا، کسی بھی قسم کے تغیر زمان و مکان سے متاثر نہیں ہوا۔ حالانکہ یہ بات لازم ہے کہ جب زمانے اور دوامی میں اختلاف پایا جائے تو عادتاً تفکک اور اخلال آ ہی جاتا ہے۔ لیکن قرآن مجید کا نزول خرقی عادت ہوا۔ اسباب و دوامی کے مختلف اور متفرق ہونے کے باوجود قرآن کا معیار اعجاز اور ربط و غیرہ محکم رہا۔ ابتداء سے انتہاء تک یکسانیت برقرار رہی۔ یہ تمام باتیں کیا اس امر کی واضح دلیل نہیں کہ یہ کلام طاقت و قوت کے خالق، اسباب و مسببات کے مالک، مخلوق و کائنات کے مدبر، ارض و سماء کو قائم رکھنے والے، ممالکان اور مایکون کا علم رکھنے والے اور زمان و حوادث سے باخبر ذات کی طرف سے ہے اور اس میں اس کا کوئی مددگار و معاون نہیں ہے۔

غور کیجیے اس امر پر کہ جب قرآن مجید کی آیات و سور نازل ہوتی تھیں تو حضور اکرم ﷺ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے فرماتے تھے: (ضعو ہافی مکان کذا من سورۃ کذا)۔ (الترمذی: ۳۰۸۶)۔ ”یعنی اس آیت کو فلاں سورت میں لکھو۔“ آپ ﷺ سید الانبیاء ہونے کے باوجود بشریت کے حامل تھے اور صاحب بشریت یہ نہیں جانتا کہ آنے والے وقت میں کون سے حوادث ہونے والے ہیں کہ وہ اس کی مطابقت کر سکے۔ لیکن آنحضرت ﷺ کا آیات کے معاملے میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو یہ بتانا کہ اس آیت کو فلاں سورت میں رکھو اور فلاں سورت کو فلاں سورت کے بعد رکھو اس پر دلالت کرتا ہے کہ یہ کلام کسی بشر کا نہیں بلکہ علام الغیوب کی طرف سے ہے جو ماضی، حال و مستقبل تمام زمانوں سے باخبر ہے۔ تب ہی تو وہ اپنی حبیب کے ذریعے آنے والے حوادث سے متعلقہ احکام مرتب کروا دیتا تھا۔ وہ یہ جانتا تھا کہ آج جو آیات نازل ہوئی ہیں ان کا ربط اس سورت سے ہے اور جو آیات کل کو نازل ہوں گی ان کا ربط کسی اور سورت سے ہوگا اسی لیے وہ حضور اکرم ﷺ کے توسط سے ان آیات کو خاص ترتیب سے ضبط کروا دیتا تھا۔ اسی طرح تیس سال کا ایک طویل زمانہ حضور اکرم ﷺ پر گزرتا گیا اور کلام الہی مکمل ہوتا رہا اور آخر کار یہ کلام مکمل اور تمام ہو گیا۔ اور اس میں ادنیٰ سا بھی اختلاف یا تفاوت نہیں۔ بلکہ یہ کلام تو مخلوق کو اپنے انعام، وحدت اور تربط کی بدولت عاجز کر دینے والا ثابت ہوا:

﴿كِتَابٌ أُحْكِمَتْ آيَاتُهُ ثُمَّ فُصِّلَتْ مِنْ لَدُنْ حَكِيمٍ خَبِيرٍ﴾ (هود: ۱۰)

”وہ کتاب ہے جس کی آیتیں مستحکم ہیں اور حکیم و خبیر (اللہ تعالیٰ) کی طرف سے بہ تفصیل بیان کر دی گئی ہیں۔“

مندرجہ بالا تمام توضیحات سے یہ بات روز روشن کی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ قرآن مجید کی آیات میں جو مماثلت، اتفاق،

”محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ“



اتفاق اور اعجاز وغیرہ پایا جاتا ہے اس کے برابر بلکہ اس کے قریب قریب بھی کسی مخلوق کے کلام میں نہیں پایا جاتا خواہ وہ مخلوق بلاغت و فصاحت کے اعلیٰ درجوں پر ہی فائز کیوں نہ ہو۔

احادیث نبویہ ﷺ اعلیٰ درجہ کی فصاحت و بلاغت کی متحمل ہیں لیکن ان کے اندر بھی فصاحت و بلاغت اور اعجاز کا وہ معیار نہیں پایا جاتا جو معیار قرآن مجید میں پایا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کسی بشری طاقت اس بات کی قوت اور قدرت نہیں رکھتی کہ وہ تمام اقوال، افعال اور تقاریر نبوی ﷺ کو کسی ایک کتاب میں قرآن مجید کی طرح یکجا اور تسلسل کے ساتھ پیش کرے۔ کیونکہ احادیث نبویہ ﷺ بہر حال کلام بشری ہیں جب کہ قرآن مجید کلام الہی ہے۔

تمام احادیث نبویہ ﷺ کو ایک کتاب میں یکجا کرنے کے لیے نقصان و زیادت اور تصرف کا سہارا لیتا پڑے گا جب کہ قرآن مجید کو یکجا کرنے کے لیے کسی کی بیشی یا تصرف کا وہم بھی خیال میں نہیں گزرتا۔ یہی واضح فرق ہے کلام بشر اور کلام خالق بشر میں۔ قرآن مجید کا مختلف زمان و مکان میں نازل ہونے کے باوجود اپنے تسلسل و ترتیب کو برقرار رکھنا مخلوق کی اس طرف راہ نمائی کرتا ہے کہ مصدر قرآن صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کی ذات اقدس ہے کیونکہ آسمانوں و زمینوں کے سراسر اس سے وہ ہی باخبر و واقف ہے۔

﴿قُلْ أَنْزَلَهُ الَّذِي يَعْلَمُ السِّرَّ فِي السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ: إِنَّكَ كَانَ غَحُورًا رَاجِعًا﴾ (الفرقان: ۶)

”کہہ دو کہ اس نے اس کو اتارا ہے جو آسمانوں اور زمین کی پوشیدہ باتوں کو جانتا ہے بیشک وہ بخشنے والا مہربان ہے۔“

### ۳ وحی اپنے معتقدین اور منکرین کے درمیان

اس سے قبل نزول قرآن سے متعلق جو کچھ بیان کیا گیا اس کو وہ ہی شخص تسلیم و قبول کرتا ہے جو ایمان لانے والا ہے وحی پر، اس کے طریقوں پر، ملاً اعلیٰ یعنی فرشتوں پر، فرشتے کے ذریعے انبیاء علیہم السلام کے اللہ تعالیٰ کے بارے میں متعارف ہونے پر اور انبیاء علیہم السلام کے ذریعے انسانوں کے اللہ تعالیٰ کے بارے میں متعارف ہونے پر لیکن عقل کے غلام اس حقیقت کو تسلیم نہیں کرتے اور الحاد و مادیت پرستی میں مبتلا ہو چکے ہیں۔ ان میں بہت پڑھے لکھے لوگ بھی ان بلند حقائق کو ماننے کے لیے تیار نہیں اور ان کو سمجھنے کے لیے آمادہ نہیں۔ بلکہ ماننا اور سمجھنا تو درکنار وہ مشن کے راہ میں رکاوٹیں پیدا کرتے ہیں۔ طرح طرح کے شبہات جو محض ان کی عقل کی اختراع ہیں، پیش کرتے ہیں۔ ابتداء میں وہ شبہات محض عقلی خلل و وہم پر مبنی ہوتے ہیں لیکن بعد میں وہ انہی شبہات عقلیہ کو دلائل علمیہ سمجھ بیٹھتے ہیں۔ پھر خود بھی گم راہ ہوتے ہیں اور دوسرے کی گم راہی کا بھی سبب بنتے ہیں۔

لہذا اب ضروری ہے کہ ہم وحی کی حقیقت، انواع اور کیفیات کو بے غبار انداز میں بیان کریں تاکہ تمام شبہات دور ہو جائیں۔ پھر وحی کی حقیقت اور ضرورت وغیرہ پر علمی دلائل دیں۔ پھر وحی کے ثبوت اور وقوع پر عقلی دلائل پیش کریں۔ پھر اس بحث کے اختتام پر ان شبہات کو ان کے جوابات کے ساتھ بیان کریں گے جو وحی سے متعلق خلدین اور عقل پرستوں کی طرف سے وارد ہوتے ہیں۔

ذیل میں چار نکات بیان کیے جا رہے ہیں جن کو پڑھنے اور سمجھنے سے تمام شبہات رفع ہو جائیں۔ (ان شاء اللہ)

## ① وحی کی حقیقت اس کی انواع و کیفیات

”اللہ تعالیٰ کا اپنے بندوں میں سے کسی کو منتخب فرما کر ہدایت اور علم کی باتوں پر مطلع فرمانا۔ لیکن یہ مطلع کرنا مخفی اور سری طور پر ہوتا ہے۔ نیز بشریت کے لیے غیر معقود ہوتا ہے۔“

### وحی کی اقسام

وحی کی متعدد اقسام ہیں:

- ① پہلی قسم یہ ہے کہ رب اور بندے کے مابین مکالمہ پایا جائے جیسے حضرت موسیٰ عَلَيْهِ السَّلَام اور اللہ تعالیٰ کے درمیان (کوہ طور) پر ہوتا تھا۔
  - ② اللہ تعالیٰ اپنے منتخب بندے کے قلب میں کوئی الہام کر دیں ایسا الہام جس کو رد کرنا خارج از استطاعت ہو نیز اس میں خشک کی کوئی گنجائش نہ ہو۔
  - ③ تیسری قسم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندے کو سچے خواب دکھائیں ایسے سچے خواب جو اپنی صداقت میں صبح کے طلوع ہونے اور پھیلنے کی طرح ہوں۔
  - ④ چوتھی قسم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندے کے ساتھ حضرت جبرئیل عَلَيْهِ السَّلَام کے واسطے سے ہم کلام ہوں۔ وہ جبرئیل عَلَيْهِ السَّلَام جو کہ باعزت و شرف فرشتے ہیں، قوت و زور والے ہیں، عرش عظیم کے سکین ہیں، فرمانبردار ہیں، مزید یہ کہ امانت داری کے اعلیٰ درجے پر فائز ہیں۔ وحی کی یہ چوتھی قسم ہی تمام اقسام میں سب سے زیادہ مشہور ہے۔ قرآن کریم سارے کا سارا وحی کے اسی قبیل سے ہے۔ اور یہی اصطلاحی وحی ہے۔ جیسا کہ سورۃ الشعراء میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:
- ﴿ نَزَّلَ بِهِ الرُّوحَ الْأَمِينُ ۗ عَلَى قَلْبِكَ لِتَكُونَ مِنَ الْمُنذِرِينَ ۗ مَلْسًا وَعَرَبِيٌّ مُبِينٌ ۗ ﴾ (الشعراء: ۱۹۳-۱۹۵)
- ”اس کو امانتدار فرشتہ لیکر اترا ہے۔ (یعنی اس نے) تمہارے دل پر (القا) کیا ہے تاکہ (لوگوں کو) نصیحت کرتے رہو۔ (اور القا بھی) فصیح عربی زبان میں (کیا ہے)۔“

### نزول وحی کی کیفیات

- ① بعض اوقات حضرت جبرئیل عَلَيْهِ السَّلَام حضور اکرم صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ کے پاس اپنی حقیقی صورتِ ملکیت میں حاضر ہوتے تھے۔
- ② بعض اوقات کسی انسان کی شکل میں حاضر ہوتے جن کو حضور اکرم صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ کے آس پاس بیٹھنے والے بھی دیکھتے اور سنتے تھے۔
- ③ بعض اوقات اس طرح مخفی انداز میں حاضر ہوتے کہ کوئی انہیں دیکھ نہ سکتا تھا۔ لیکن ان کے اثرات واضح دکھائی دیتے تھے جیسا کہ حضور اکرم صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ کی طبیعت میں تغیر و تبدل کا ظاہر ہونا بایں صورت کہ آپ کو نیند کا غلبہ محسوس ہوتا، کبھی غشی اور بے ہوشی کے اثرات محسوس ہوتے لیکن وہ غشی یا بے ہوشی ہرگز نہ ہوتی تھی بلکہ وہ روحانی فرشتے سے ملاقات کے وقت استغراق کی کیفیت ہوتی

تھی اور بشری حالت سے انخلاع کی کیفیت ہوتی تھی جس کا اثر حضور اکرم ﷺ کے جسم اطہر پر عیاں ہوتا تھا۔ پھر اس کیفیت کے بعد حضور اکرم ﷺ اپنی طبیعت میں جو بھل پن محسوس کرتے تھے اور بعض اوقات تو سخت سردی کے موسم میں آپ ﷺ کی چاندی جس میں پر پسنے کے قطرات موتیوں کی طرح چمکتے ہوئے واضح نمودار ہو جاتے تھے۔

۴) بعض اوقات وحی کا نزول ایک گھنٹی کی آواز کے مشابہ ہوتا تھا جیسا کہ مسلسل کانوں میں گھنٹی کی آواز سنائی دے رہی ہو۔ یہ قسم وحی کے نزول کی تمام اقسام میں سب سے زیادہ سخت تھی۔

۵) بعض اوقات حاضرین مجلس نبوی کو حضور ﷺ کے چہرہ مبارک کے سامنے شہد کی کھپوں کی بھینھانے کی سی آواز سنائی دیتی تھی لیکن کوئی کلام یا حدیث سمجھ نہیں آتا تھا لیکن حضور اکرم ﷺ اس آواز کو علی وجہ الکمال سن لیتے تھے اور یاد بھی کر لیتے تھے اور یہ بھی سمجھ لیتے تھے کہ ان کو ان کے رب نے کیا پیغام بھیجا ہے۔ آپ ﷺ اس وحی کو اس طریق پر سمجھ لیتے تھے کہ اس میں کسی قسم کا شبہ یا خفا باقی نہیں رہتا تھا۔ جب شہد کی کھپوں کی سی آواز کا سلسلہ تھمتا تو جو کچھ اللہ تعالیٰ نے حضور اکرم ﷺ پر نازل کیا ہوتا تھا وہ آپ ﷺ کی یادداشت میں محفوظ ہو چکا ہوتا تھا جس کو آپ ﷺ کما حقہ بیان فرما سکتے تھے۔ اور یوں محسوس ہوتا گویا کہ وہ وحی آپ ﷺ کے قلب اطہر پر لکھ دی گئی ہے جس کو آپ ﷺ نے امت کے سامنے بغیر کسی کمی و بیشی کے بیان فرما دیا۔

جو کچھ ہم نے بیان کیا اس پر قرآن وحدیث سے درج ذیل دلائل ملاحظہ کیجیے۔

① ﴿وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ ۗ إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ﴾ (انجم: ۳-۴)

”اور نہ خواہش نفس سے منہ سے بات نکالتے ہیں۔ یہ (قرآن) تو حکم خدا ہے جو (ان کی طرف) بھیجا جاتا ہے۔“

۲) حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے: حضرت حارث بن ہشام رضی اللہ عنہ نے حضور اکرم ﷺ سے پوچھا: یا رسول اللہ ﷺ! آپ ﷺ پر وحی کے نزول کی کیفیت کیا ہوتی ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا:

”بعض اوقات میرے پاس وحی گھنٹی کی آواز کی طرح آتی تھی اور یہ کیفیت مجھ پر سب سے زیادہ سخت اور بھاری ہوتی تھی۔ مگر جب یہ آواز مجھ سے بند ہو جاتی تو میں نے اچھی طرح سمجھ کر یاد کر لیا ہوتا جو کچھ اس نے کہا ہوتا اور بعض اوقات فرشتہ میری سہولت کے لیے مرد کی شکل اختیار کر کے آتا اور مجھ سے بات کرتا تو جو کچھ وہ کہتا میں اُسے سمجھ کر یاد کر لیتا۔“

(اس حدیث کو امام بخاری رضی اللہ عنہ نے اپنی صحیح میں روایت کیا ہے) (صحیح البخاری: ۳۰۴۳)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں:

”میں نے ایک مرتبہ سخت سردی کے موسم میں دیکھا کہ حضور اکرم ﷺ پر وحی نازل ہو رہی تھی اور آپ ﷺ کی پیشانی مبارک پر پسیہ نمودار ہو رہا ہے۔“

② وحی، جدید علوم کے اعتبار سے

وحی کے اعداء و مکرین نہ ہی تو شریعت پر یقین رکھتے ہیں اور نہ ہی شریعت کے دلائل پر۔ وہ تو بس عقل ہی کو اپنا خدا ماننے

”محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ“

ہیں اور اسی بات پر ایمان لاتے ہیں جو ان کی عقل پر پوری اترے۔

پس وہ شک کو مقدم رکھنے والے ہیں اور اسی کو معنی خیز چیز سمجھتے ہیں۔ وہ صرف حیات کا اعتراف کرتے ہیں اور عقلیات ہی پر اعتقاد رکھتے ہیں۔ وہ مادیت کی جیل میں برے طریقے سے مقید ہو چکے ہیں۔ مادیت کے علاوہ تمام چیزوں کا انکار کرنے والے ہیں۔ شکوک و شبہات کی سرحدوں کو بھی پار کر چکے ہیں۔ امور الہیہ و نبوت کو اتنا ہلکا سمجھتے ہیں کہ زمانہ جاہلیت میں بڑے سے بڑا ظالم بھی اس کا ارتکاب نہ کر پاتا تھا۔ ہاں اگر ان کا اپنا بنیاد علم ان کے سابقہ علم کی مخالفت کرے تو وہ اس کی خندہ پیشانی کے ساتھ قبول کر لیتے ہیں۔ ان شاء اللہ آئندہ ہم وحی کے وجود پر جدید علوم و سائنس کے اعتبار سے دلائل پیش کریں گے۔ یہ دلائل عقل و مادیت پرستوں کے نزدیک امکان وحی کو قریب کرتے ہیں۔ اور امکان وحی کا ثبوت ہی ہمارا موضوع سخن اور بنیادی مقدمہ ہے۔

**پہلی دلیل** جدید علوم کے اعتبار سے امکان وحی کے ثبوت کے لیے سب سے پہلی دلیل ”مصنوعی طور پر نیند طاری کرنا“ یا ”تنویم مقناطیسی“ کا عمل ہے، جو اب ایک مسلمہ علمی حقیقت بن چکی ہے۔ جس کا انکشاف المانیہ کے ایک ڈاکٹر

میسمر (ولادت ۱۷۳۳ء وفات ۱۸۱۵ء) نے اٹھارویں صدی عیسوی میں کیا تھا۔ اس نے اور اس کے پیروکاروں نے پوری ایک صدی تک اس حقیقت کو ثابت کرنے اور سائنس دانوں کو اس کے اعتراف پر آمادہ کرنے کے لیے اپنی کوششیں جاری رکھیں حتیٰ کہ یہ اپنی کوششوں میں کامیاب ہو گئے اور سائنس دان ہزاروں لوگوں پر اس کا تجربہ کرنے کے بعد عملی طور پر اس کے قائل ہو گئے۔ اور انظہار طمانیت کرنے لگے۔ ڈاکٹر میسمر کے بے شمار تجربات سے چند اصول ثابت ہوئے ہیں جو کہ درج ذیل ہیں:

- ① ایک اکمل ترین انسان کے لیے عام عقل کے علاوہ ایک باطنی عقل بھی ہوتی ہے جو عام عقل سے بلند تر ہوتی ہے۔
- ② انسان گہری نیند میں سو جانے کے بعد بھی سن اور بول سکتا ہے، پوشیدہ باتیں بتا سکتا ہے اور آنے والے بعض حوادث کی خبر دے سکتا ہے۔ باوجود اس کے کہ عالم حس میں سے ادنیٰ سی علامت بھی اس موقع پر نہیں پائی جاتی۔
- ③ تنویم یعنی مصنوعی نیند کے طاری ہونے کے درجات میں تفاوت ہے۔ اور یہ تفاوت باطنی عقل میں تفاوت کی وجہ سے ہوتا ہے۔ جس میں باطنی عقل اعلیٰ درجے کی ہوگی اس پر مصنوعی نیند کا طاری ہونا بھی اعلیٰ درجے کا ہوگا۔
- ④ مصنوعی نیند کا طاری ہونا بعض اوقات اس درجے تک پہنچ جاتا ہے کہ اس اکمل ترین انسان کے جسم سے روح نکل جاتی ہے اور اس کے پہلو میں اس انداز میں کھڑی ہو جاتی ہے کہ نظر نہیں آتی۔ اس حالت کے دوران اگر روح اور جسد میں لطیف اور خفیف ساربط باقی نہ ہو تو جسد یا جسم ایک مردہ جسم کی طرح ہو جائے۔

- ⑤ روح جسم سے الگ ہو کر موجود رہتی ہے۔
- ⑥ روح اور جسم کے مابین ربط اور تعلق برقرار رہتا ہے۔
- ⑦ روح جسم سے مکمل طور پر جدا نہیں ہوتی۔
- ⑧ اس بندے کی روح اپنے سے سابقہ ارواح کے ساتھ ملاقات و بات چیت کرتی ہے حالانکہ یہ بات مادیت سے بالکل عاری ہے۔ اس بات کا تعلق مادیت سے بالکل نہیں ہے۔
- ⑨ اگر ہم ان تمام تحقیقات کو تسلیم بھی کر لیں تو ایسے دلائل کی ضرورت پیش آئے گی جو تجربات اور کثیر مشاہدات پر مبنی ہوں۔

لیکن مغربی ممالک میں اس نظریے کے بہت سے حمایتی موجود ہیں۔ جن کا تعلق تعلیمی شعبہ ہائے جات سے ہے مثلاً ڈاکٹرز، پروفیسرز اور سکولز، کالجز اور یونیورسٹیز وغیرہ کے سٹوڈنٹس۔ بلکہ مغربی ممالک میں تو باقاعدہ ایسے ہسپتال موجود ہیں جن میں مریضوں کا علاج ہی اس تحقیق و نظریے سے مدد لیتے ہوئے کیا جا رہا ہے۔

(اس مقناطیسی عملِ تنویم پر ماہر طبیعیات میسر نے فرانس میں رہتے ہوئے ۱۷۷۵ء میں بہت سے کامیاب تجربات کیے تھے لیکن وہ اپنے ہم عصروں کو مکمل طور پر مطمئن نہ کر سکا تھا، پھر ۱۸۳۲ء میں انگلینڈ میں ایک شخص جیمس بریڈ (James Braid) پیدا ہوا جس نے اس عملِ تخیر کو سائنٹفک بنیادوں پر ازسرنو ثابت کر کے اس کا نام عملِ تنویم یا ہپناٹزم (Hypnotism) تجویز کیا۔) ہم اس مقناطیسی عملِ تنویم کی تاریخ، تجربات اور فوائد کو تفصیل سے بیان کرتے لیکن یہ ہمارا موضوع نہیں ہے۔ لیکن پھر بھی ہم اس نظریے کو اجمالاً اس قدر بیان کیے دیتے ہیں تاکہ آپ کے سامنے یہ بات واضح ہو جائے کہ اللہ تعالیٰ آج کے دور میں بھی اپنی منہ بولتی نشانیاں اور علامات اُن ماہر طبیعیات و مادہ پرستوں کے ہاتھوں میں ظاہر کرتے رہتے ہیں جو مادیت کے علاوہ تمام چیزوں کے منکر ہیں اور حسیات ہی کو سب کچھ سمجھتے ہیں۔ پس اللہ تعالیٰ نے اس موقع پر ایسا ہی کیا کہ جو لوگ مادیت کے علاوہ کے منکر تھے، روحانیت کو کچھ نہیں سمجھتے تھے، اُن کی سوچ بھی اللہ کے فضل سے بدل گئی اور وہ روحانیت اور باطنیت کو تسلیم کرنے لگے بلکہ اس کے اثبات پر بیانات ضبط کروانے لگے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْأَفَاقِ وَفِي أَنفُسِهِمْ حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ﴾ (نمل: ۵۳)

”ہم عنقریب ان کو اطراف (عالم) میں بھی اور خود ان کی ذات میں بھی نشانیاں دکھائیں گے یہاں تک کہ ان پر ظاہر ہو جائے گا کہ (قرآن) حق ہے۔“

اب میں آپ کے سامنے مقناطیسی عملِ تنویم کا ایک ایسا تجربہ بیان کرتا ہوں جو کسی حد تک دجی کے طریقہ کار کے قریب ہے۔ اور یہ وہ تجربہ ہے جو میں نے (محمد عبدالعظیم الزرقانی نے) اپنی آنکھوں سے خود دیکھا اور اپنے کانوں سے خود سنا ہے۔ یہ تجربہ جمعیت شبان المسلمین کے زیر اہتمام ایک مجلس میں کیا گیا تھا جس میں تعلیم یافتہ لوگوں کی ایک بڑی تعداد بھی موجود تھی۔ یہ مجلس اس لیے منعقد کی گئی تھی تاکہ مقناطیسی عملِ تنویم (Hypnotism) کی اہمیت واضح کی جائے اور اس بات کا ممکن ہونا ثابت کیا جائے کہ اس فن کو کیسے زہر آلود ہتھیاری کا مانند استعمال کرتے ہوئے کسی بھولے بھالے انسان کے عقیدے اور ایمان کو خراب کیا جاسکتا ہے۔ جیسا کہ سن ۱۳۵۱ ہجری میں شبان المسلمین کے ایک نوجوان کو اس تجربے سے گزارا گیا۔ اور اس کی سوچ اور نظریے کو بدلنے کی کوشش کی گئی۔

پس جمعیت شبان المسلمین کے زیر اہتمام منعقد کی گئی مجلس کا حال یہ تھا کہ ایک پروفیسر لوگوں کے سامنے سٹیج پر نمودار ہوا وہ دراصل تنویم مقناطیسی کا ایک ماہر استاد تھا۔ پھر اسی سٹیج پر درمیانی درجے کی استعداد کا ایک نوجوان لایا گیا۔ تنویم مقناطیسی کے اُس ماہر استاد نے اس نوجوان کی آنکھوں میں گہری نگاہیں مرکوز کیں اور اپنا مخصوص عمل شروع کیا تو ایک لحظہ بھی نہیں گزرا تھا کہ ہم نے دیکھا کہ وہ نوجوان سوئے ہوئے شخص کی طرح خراٹے لے رہا ہے اس کا رنگ بدل گیا اور جسم بے حس ہو گیا۔ وہ مکمل طور پر اپنا احساس و ہوش کھو چکا تھا اور وہ سو چکا تھا۔ ہم میں سے ایک شخص اٹھا اور اس نوجوان کو سوئی چھبوی لیکن اس میں کوئی حرکت پیدا نہ ہوئی۔ پھر اس

نے متعدد بار سوئی چھوٹی لیکن اس نوجوان پر کوئی اثر ظاہر نہ ہوا۔ پھر ہم میں سے ایک اور شخص اٹھا پھر ایک اور اٹھا الغرض تین شخص ہم میں سے یکے بعد دیگرے اٹھے تینوں نے اسے سوئیاں چھوئیں لیکن اس نے کوئی حرکت نہ کی۔ اس وقت ہمیں یقین ہو گیا کہ وہ مصنوعی یا مقناطیسی نیند سوچکا ہے۔ اس حالت میں استاد نے اس پر تسلط حاصل کر لیا اور اس سے پوچھا کہ تیرا نام کیا ہے؟ اس نے اپنا حقیقی/اصلی نام بتایا۔ استاد نے کہا نہیں تمہارا نام یہ نہیں ہے بلکہ یہ ہے اور جھوٹ بولتے ہوئے اسے ایک دوسرا نام بتایا کہ اب یہ تمہارا نام ہے۔ اس کے بعد یہ نیا نام اس کے ذہن میں ڈالتا رہا اور پرانا نام اس کے ذہن سے مٹاتا رہا۔ تو ہم مقناطیسی کے ماہر استاد کا اس نوجوان کے ذہن سے پرانا نام مٹانا اور نیا کاذب نام ڈالنا، امر اور نہی کے صیغوں کے واسطے سے تھا۔ وہ مسلسل اس کے ذہن میں فرضی اور جھوٹ پر مبنی باتیں منتقل کرتا رہا یہاں تک کہ وہ نوجوان کے ذہن پر مکمل طور پر تسلط حاصل کر چکا تھا اور نوجوان مکمل طور پر اس کی بات کو مان چکا تھا۔

اس کے بعد استاد نے بھی اور ہم نے بھی اس نوجوان کو اس کے اصلی نام سے پکارا اور بار بار پکارا لیکن وہ نوجوان ہر مرتبہ غفلت میں رہا، بالکل متوجہ نہ ہوا اور ہمارے پکارنے کا کوئی جواب نہ دیا۔ اور جب ہم نے اُس کو اسے کے موضوع و فرضی نام سے پکارا تو وہ بلا تروڑ اور بلا تاخیر متوجہ ہو گیا اور ہمارے پکارنے کا جواب دیا۔

اس کے بعد اُستاد نے کہا کہ وہ اس نئے نام کو یاد رکھے اور بیدار ہونے کے بعد بھی نصف گھنٹے تک اسی نام کو یاد رکھے اور پھر استاد نے اسے بیدار کر دیا اس طرح وہ تجربہ بھی مکمل ہو گیا۔ لیکن ہمیں اس بات نے مزید حیران کر دیا کہ جب ہم نے اُس کے بیدار ہونے کے بعد اُسے اُس کے اصلی نام سے پکارا تو اس نے کوئی جواب نہ دیا لیکن جب اُسے جھوٹے نام سے پکارا تو وہ فوراً بول پڑا۔ وہ نوجوان مسلسل اسی حالت پر رہا یہاں تک مقررہ آدھا گھنٹا گزر گیا۔ اس کے بعد ہم نے اس نوجوان کو اس کے اول یعنی حقیقی نام سے پکارا تو فوراً متوجہ ہوگا۔ اب وہ اپنی پہلی یعنی اصلی حالت میں واپس آ چکا تھا۔ اور اپنے اصلی نام کو پہچاننے لگا تھا۔

اس تجربے سے اُستاد نے یہ ثابت کر دیا کہ مَؤم (ہپناٹس) یہ استطاعت رکھتا ہے کہ مَؤم یعنی معمولی یا پھاننازڈ کے ذہن سے جو چاہے منادے اور جو چاہے اُس کے ذہن میں اُتار دے۔ چاہے وہ انسان کا اپنا نام ہے یا کوئی مقدس چیز مثلاً عقائد دین وغیرہ۔ اس تجربے میں پھاننازم کے ماہر اُستاد نے نوجوان کے ذہن سے صرف نام کو محو کیا حالانکہ وہ چاہتا تو کچھ دین و اسلام کے عقائد کو بھی محو کر سکتا تھا۔ اس کی دو وجوہات ہیں۔

① ذہن سے دین کو مٹانا بہت برا فعل ہے اور گناہ کا کام ہے۔ اور اس کو نہ ہی تو خود استاد نے پسند کرنا تھا اور نہ ہی حاضرین میں کسی شخص نے یہ بات گوارا کر لی تھی۔

② انسان کا اپنا نام اس کے ذہن میں زیادہ راسخ ہوتا ہے نسبتاً اس کے دینی عقائد و نظریہ کے۔ تو استاد اس تجربے سے یہ ثابت کرنا چاہتا تھا کہ میں اُس چیز کو محو کر سکتا ہوں جو انسان کے ذہن میں اعلیٰ درجے میں بیوستہ ہو تو دین کو تو بطریق اولیٰ محو کر سکتا ہوں کیونکہ وہ تو نام کے مقابلے میں کم درجے میں بیوستہ و محفوظ ہوتا ہے۔ نیز دین کو محو کرنا زیادہ آسان و آہل ہے۔

اس تجربے کو میں نے خود دیکھا اور سنا تو عملی طور پر وہی کہ حقیقت میری عقل کے اور قریب ہو گئی۔ اور میں نے اس واقع کو وحی کے لیے ایک سائنسی دلیل بنایا۔ فرشتے کے ذریعے وحی کا ارتداد اصل نلک اور رسول کے درمیان اس اتصال اور ربط پر مبنی ہوتا





ہے جس میں فرشتہ رسول کے دل و دماغ پر اثر ڈالتا ہے اور رسول اس سے اثر قبول کرتا ہے اور یہ دونوں کے اندر تاثیر کی ایک مخصوص استعداد کی وجہ سے ظہور پذیر ہوتا ہے۔ فرشتے کے اندر القاء اور تاثیر کی قوت ہوتی ہے اس لیے کہ وہ خالص روحانی مخلوق ہے اور رسول کے اندر پیغام وصول کرنے کی قابلیت ہوتی ہے اس لیے کہ اس کی روحانیت صاف اور پاکیزہ ہوتی ہے۔ جب فرشتے کا رسول پر تسلط اور تعلق قائم ہو جاتا تھا تو وہ اپنی معتاد یعنی حالت سے نکل جاتے تھے، ان پر بدلی ہوئی حالت کے آثار ظاہر ہو جاتے تھے، وہ فرشتے سے وحی وصول کرنے اور دیکھنے میں پوری طرح مستغرق اور متوجہ ہو جاتے تھے اور جو کچھ انہوں نے فرشتے سے لیا ہوتا وہ ان کے دل پر نقش اور طبع ہو جاتا تھا یہاں تک کہ جب وہ اپنی اصلی حالت یعنی معتاد حالت پر واپس آتے تو جو کچھ انہوں نے سیکھا ہوتا اُسے اپنے صحیفہ قلب پر لکھا ہوا پاتا۔

اے باعزت مخاطب! کیا تو یہ گمان کر سکتا ہے کہ مخلوق تو اس کی استطاعت رکھتی ہے کہ وہ دوسری مخلوق کے نفس میں تنویم مقناطیسی کے عمل کے ذریعے اثر ڈال لیکن قوتوں اور صلاحیتوں کا خالق نعموذ باللہ استطاعت اور قدرت نہیں رکھتا کہ وہ اپنے بندوں میں سے کسی بندے کے دل میں وحی کے ذریعے کوئی پیغام اُتار سکے اور اسے متاثر کر سکے۔ ہرگز ایسا نہیں ہے۔ ہرگز ایسا نہیں ہے بلکہ اللہ جو چاہے کر سکتا ہے۔

(اس موقع پر کسی کے ذہن میں یہ شبہ نہ آئے کہ ہپنازم یا مقناطیسی عمل تنویم کے ذریعے کسی انسان کا متاثر ہو جانا کسی قسم کی کمزوری اور متاثر نہ ہونا کسی قسم کی قوت ارادی یا طاقت ہے۔ کیونکہ عام طور پر سنا گیا ہے کہ بعض لوگ اپنی تعریف کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ہمیں کوئی ہپناٹاز نہیں کر سکتا یا ہم ہپناٹاز نہیں ہو سکتے۔ ایسے لوگوں کو دراصل کسی ہپناٹسٹ سے واسطہ ہی نہیں پڑا ہوتا۔ یا پھر وہ لوگ خود تسلیم کرتے ہیں کہ ان کی خیالی قوت (تخیل) بہت کمزور ہے اور وہ کسی ایک چیز کا خیال نہیں کر سکتے۔ ان کی یکسوئی کی قوت حد درجہ کم ہے اور وہ کافی بے وقوف ہیں۔ یا پھر وہ اس حد تک پر آگندہ خیالات کے مالک ہیں کہ کسی ایک شے کا خیال نہیں کر سکتے اور یکسوئی کی قوت قریب اُلٹم ہے۔

یاد رکھیے ذہین لوگ جلد ہپناٹاز ہو جاتے ہیں کیوں کہ ان کے تخیل کی طاقت بھی طاقتور ہوتی ہے۔ کند ذہن لوگ کم ہی ہپناٹاز ہوتے ہیں جس کی وجہ یکسوئی کی قوت کی کمی ہے۔ وہ ہپناٹاز اگر ہو بھی جائیں تو عموماً ہپناٹاز کی نیند کے ابتدائی مدارج میں رہتے ہیں۔ اور رہی بات احمق کی تو احمق کو ہپناٹاز ہی نہیں کیا جا سکتا۔ مترجم)

**دوسری دلیل** جدید سائنسی علوم یہ طاقت رکھتے ہیں کہ وہ ایسی چیزیں ایجاد کریں جن کو ہم نے اس سے پہلے نہ ہی تو دیکھا تھا اور نہ ہی ہم ان کو جانتے تھے مثلاً ٹیلی فون، ڈائریس، مائیکروفون اور ریڈیو وغیرہ۔ ان تمام اشیاء کے ذریعے یہ ممکن ہو گیا ہے کہ ایک انسان کسی دوسرے انسان سے رابطہ کر لے خواہ وہ دنیا کے کسی کونے میں ہو اور رابطہ کر کے اُسے اپنی بات سمجھا دے اور اس کی بات سمجھ لے۔ تعجب ہے کہ ان مادی ایجادات کے بعد بھی ماہرہ پرستوں کی عقل میں یہ بات نہیں آتی کہ جب ایک عاجز انسان آلات کے ذریعے دوسرے انسان سے کلام کر سکتا ہے تو وہ اللہ جو ہر چیز پر قادر ہے کیا وہ وحی کے طور پر فرشتے کے ذریعے یا بدوین فرشتہ اپنے منتخب بندوں سے کلام نہیں کر سکتا؟ بے شک اللہ تعالیٰ تو پاک و بلند ہے ان تمام باتوں سے جو مادہ پرست اس کے بارے میں کہتے ہیں۔

تیسری دلیل؟ سائنس کی ترقی یہاں تک پہنچ چکی ہے کہ سائنس دان ایسی بے جان اشیاء جن میں سمجھ بوجھ کی صلاحیت

بالکل مفقود ہے، میں آواز، نغمے، گانے، باتیں حتیٰ کہ قرآن کی تلاوت تک محفوظ کر چکے ہیں۔ اور اس عمل کو اتنا آسان بنا چکے ہیں کہ عام آدمی بھی ان بے جان اشیاء میں مختلف آوازیں، وغیرہ ریکارڈ و محفوظ کر سکتا ہے بغیر کسی محنت و مشقت کے۔ اس کی بہت ساری مثالیں ہمارے پاس موجود ہیں جن کا انکار ناممکن ہے جیسا کہ فونوگراف۔

فونوگراف اور اس طرح کی دیگر تمام ایجادات ناممکن دکھائی دیتی تھیں لیکن سائنس نے اس کو ممکن کر دکھایا۔ تو وہ اللہ جو ہر شے پر قادر ہے کیا وہ اس پر قادر نہیں کہ وہ ایک فرشتے کے ذریعے یا فرشتے کے بغیر بھی ان نفوس میں اپنی باتوں (وحی) کو ریکارڈ کروا دے، جو نفوس سمجھنے بوجھنے کی اعلیٰ درجے پر صلاحیت رکھتے ہیں۔ کیا وہ یہ طاقت نہیں رکھتا کہ اپنے چنیدہ بندوں یعنی انبیاء علیہم السلام پر مخلوق کی ہدایت کے لیے کلام نازل فرمادے اور وہ کلام ان کے سینوں میں محفوظ کروادے۔ بالکل کیوں نہیں! ضرور وہ اس بات کی قدرت رکھتا ہے کہ وہ اپنے پیارے نبی حضرت محمد ﷺ پر فرشتے یا بغیر فرشتے کے اپنا کلام نازل فرمائے اور اسے ان کے سینے میں محفوظ فرمادے۔ اور پھر حضور اکرم ﷺ جب چاہیں بغیر کسی محنت و مشقت کے اس کلام کو امت کے سامنے بیان فرمادیں۔

(۱۸۹۳ء عیسوی میں مشہور امریکی موجد تھامس ایڈیسن نے فونوگراف ایجاد کیا۔ یہ آلہ آواز کو مکینیکل ریکارڈنگ اور اس کی کوائٹی بہتر بنانے کے کام آتا تھا۔ ایجاد سے کچھ عرصہ بعد ٹیلی فون کے موجد گراہم بیل نے فونوگراف میں متعدد تبدیلیاں کیں جس کے بعد اسے گراموفون کہا جانے لگا۔ گزشتہ سو سال میں موسیقی کے شعبے میں ہونے والی ترقی اسی آلے کی مرہون منت ہے۔ مترجم)

چوتھی دلیل؟ بے شک ہم نے مشاہدہ کیا ہے کہ دنیا میں بعض حیوانات عجیب و غریب کام کرتے ہیں جس سے ہمیں پتا چلتا ہے کہ ایسا کسی عام سوچ یا معمولی خصلت کی وجہ سے ممکن نہیں۔ اس بات سے ہمیں یقین ہوتا ہے یہ صرف عظیم سوچ کے ذریعہ ہی ہو سکتا ہے جو ان حیوانات کی ان عجیب و غریب کاموں، باریک بینیوں اور حیلہ سازی کی طرف راہنمائی کرتی ہے۔

اور جب یہ بات دنیا کے حیوانات کے بارے میں درست ہے تو انسانوں کے بارے میں تو بدرجہ اولیٰ زیادہ صحیح ہوگی جبکہ انسان کا تعلق اللہ تعالیٰ سے زیادہ جڑا ہوا ہے۔ اور اس سے معلومات کا حصول زیادہ بہتر طریقے سے ممکن ہے اور یہ وحی کے ذریعے ممکن ہے۔ اور اگر آپ کو ان حیوانات کی مثالوں کی ضرورت ہے جن کو اوپر سے الہام ہوتا ہے تو وہ چوٹی اور شہد کی مکھی ہے۔ اور یہ کئی طرح کے کام سرانجام دیتی ہیں اور انتہائی باریک انداز میں تنظیمی کام سرانجام دیتی ہیں۔ اور ایک جانور عجیب و غریب ہے جس کو "آکسیکلوپ" کا نام دیا گیا ہے۔ اس کے بارے میں فرانس کی سوربون یونیورسٹی کے استاد میلن اوراد فرماتے ہیں کہ آکسیکلوپ جانور اکیلے زندگی گزارتا ہے۔ اور انڈہ دیتے ہی مر جاتا ہے۔ اور اس کے بچوں کے عام طور پر پاؤں نہیں ہوتے اور نہ ہی وہ اپنے آپ کو کسی دشمن کے حملے سے بچانے کی طاقت رکھتے ہیں۔ اور نہ ہی وہ کھانے کے لیے کوئی غذا حاصل کر سکتے ہیں۔ اس کے باوجود ان کی زندگی ایک بند گھر کے اندر کئی سال تک پرسکون گزرتی ہے۔ جب ماں انڈہ دینے کا سوچتی ہے تو کڑی ایک ٹکڑے پر چڑھ جاتی ہے۔ اور ایک طویل سرنگ کھودتی ہے اور اس میں کھانے کا کچھ ذخیرہ لے جاتی ہے۔ جس کا چھوٹا سا ٹکڑا ایک سال کے لیے کافی ہوتا ہے۔ یہ ذخیرہ پھولوں کی کونپلوں اور بیٹھے پتوں پر مشتمل ہوتا ہے اور اس کو سرنگ کے اندر پھیلادیتی ہے۔ پھر اس کے اوپر ایک

انڈا دیتی ہے۔ پھر ککڑی کا براہ لاکر اس کو گوند متی ہے اور اس کے ذریعے انڈے پر چھت بناتی ہے۔ پھر کھانے کا ذخیرہ لاتی ہے اور اس انڈے کی چھت پر رکھتی ہے اور پھر انڈہ دیتی ہے اور یوں وہ تمام انڈے دینے کے بعد فارغ ہوتی ہے اور سب کچھ چھوڑ کر مر جاتی ہے۔ اس معمولی سی کزرد مخلوق جس نے عقل کو حیران کر دینے والے کام کیے اس کو کس ذات نے سکھایا؟ اور کس ذات نے اس کو بتایا کہ جب تو انڈے دے کر فارغ ہوگی تو مر جائے گی اور تیرے مرنے کے بعد تیرے بچے پیدا ہوں گے جن کو ایک سال تک کزوری اور بے بس حالت میں اس ذخیرہ کی ضرورت ہوگی؟ وہ کون ذات ہے جس نے اس کے دل میں یہ تمام قسم کی مہربانیاں عطا کیں جس کی وجہ سے اس نے انڈے دینے کے لیے تمام مشقتیں برداشت کیں؟

اس میں کوئی شک نہیں کہ تمام مخلوقات کے وجود کو قائم کرنے والی ذات کائنات کو غیر محسوس طریقے سے بتاتی ہے کہ کس طرح اس نے اپنے وجود کو قائم رکھنا ہے اور کس طرح اس کو درست رکھنا ہے۔ اور یہ بات گم راہ کن اور فضول ہے کہ کوئی تحقیق کزرد ترین حشرات کی طرف الہام ہونے کو ثابت کرے اور پھر انسانوں کے طرف الہام کی نفی کرے جبکہ انسان کو انفرادی اور اجتماعی زندگی میں الہام کی زیادہ ضرورت ہے۔

**پانچویں دلیل** عبقریہ۔ جس کی افلاطون نے تعریف یہ کی کہ یہ الہی حالت ہے جس کی بدولت انسان کو اعلیٰ قسم کے الہامات ملتے ہیں۔ جبکہ فلاسفہ کے نزدیک یہ ایک علوی قسم کی حالت ہے اس میں عقل کا کوئی عمل دخل نہیں ہے۔ اور فطری ماہرین کا کہنا ہے کہ یہ طبعی طور حاصل ہوتی ہے نہ تو یہ تحقیق سے حاصل ہوتی ہے اور نہ یہ غور و فکر سے۔ عبقریہ کی یہ مثالیں وحی کے موضوع پر پریشان اور گمراہ لوگوں کے لیے سیدھے راستے کی طرف روشنی کا منارہ ہیں۔

① کیمبرج یونیورسٹی میں علم النفس کے استاد میرس اپنی کتاب ”انسانی شخصیت“ میں لکھتے ہیں کہ مسٹر بیدلر کی ایک ایسی خوبی تھی کہ شاید وہ معجزہ کے ساتھ مل جائے۔ وہ یہ ہے کہ کئی البدیع ایسے ہندسوں کو آپس میں ضرب دے کر جواب دیتے تھے جن کا عدد سات یا آٹھ تک ہوتا تھا۔ اگر کسی نے پوچھا کہ وہ کون سے دو عدد ہو سکتے ہیں جن کو ایک دوسرے سے ضرب دیں تو جواب ۱۷۸۶۱ آئے تو فوراً جواب آتا ۳۳ کو ۵۳ کے ساتھ ضرب دیں تو یہ جواب آئے گا۔ اور وہ کہتے ہیں کہ ان کو نہیں پتا کہ یہ جواب کس طرح ان کو معلوم ہو جاتا ہے۔ ان کے نزدیک یہ جواب عمومی طبعی کیفیت کے ساتھ ہوتا ہے۔

② فرانسیسی بہت بڑے شاعر ”سولٹی برودوم“ سے منقول ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ ریاضی کے نظریے پر کوئی ایسی دلیل جو ایک سال ڈھونڈنے پر بھی نزل سکتی ہو لیکن بعض اوقات بغیر کسی غور و فکر کے وہ دلیل اچانک سے مجھے مل جاتی ہے۔

③ فرانسیسی شاعر المسیو (رینہ) کے بارے میں مذکور ہے کہ وہ اکثر شعر کا ایک جزو کہتے کہتے سو جاتے اور جب بیدار ہوتے تو شعر مکمل ہوتا۔

④ اسی طرح فرانسیسی شاعر موسیہ کہتے ہیں کہ میں صرف سنتا ہوں اور پھر مجھے جو حاصل ہوتا ہے لکھ دیتا ہوں۔ جیسے کوئی نامعلوم انسان میرے کان میں بتا رہا ہو۔

یہ مثالیں جو ہم نے ذکر کی ہیں ان سے بعض لوگوں کے اندر روحانی رابطوں کا ثبوت ملتا ہے۔ انسان علم و ہدایت کے ذریعے سے غیر فطری طریقے سے فائدہ اٹھاتا ہے اور اس کے ذریعے وحی کے بہت زیادہ قریب ہو جاتا ہے۔ بعض اوقات لوگ اس

کے بارے میں بہت زیادہ شک کرنے لگتے ہیں یہاں تک کہ الوہیت اور نبوت کو جھٹلا دیتے ہیں۔ اور دین و شریعت کا مذاق اڑاتے ہیں۔ جبکہ یہ انسان کی سوشل اور نظریاتی تبدیلی کے بڑے عوامل میں سے ایک ہے۔ بڑے حوادث ایسے ہیں جن کے ذریعے سے دنیا کی تاریخ کو تبدیل کر کے رکھ دیا گیا۔ اور انسان کی کرامت کو واضح طور پر غلط اس وقت قرار دیا جاتا ہے جب یہ تمام عوامل غلط فہمی اور جھوٹ پر مبنی ہوں۔

**چھٹی دلیل** نئے علوم سے ثابت ہوتا ہے کہ بعض لوگوں کے ساتھ روحانی معاملات ہوتے ہیں۔ جو خلاف عادت ہوتے ہیں اور علماء کو ان کے بارے میں کوئی علم نہیں ہوتا۔ اور بعض اوقات یہ لوگ جو خلاف عادت غیر معمولی باتیں بتاتے ہیں وہ خود غفلت کی حالت میں ہوتے ہیں۔ اور جو وہ بیان کرتے ہیں اس کو حسی طور پر ماننا ناممکن ہوتا ہے۔ اور ان کی باتوں کو پرکھا گیا اور اس کا مشاہدہ کرانے کے لیے دینا کے مشہور شعبہ باز اور جادو گروں کو بلا یا گیا تو انہوں نے کہا کہ اس میں کسی قسم کی کوئی جادو گری نہیں ہے، بلکہ یہ روحانی باتیں ہیں اس میں مہارت اور ہاتھ کی صفائی کا کوئی تعلق نہیں، یہ موجودہ دور کے جدید علوم کے حقائق میں سے ہے کہ بعض اوقات کچھ لوگوں پر غفلت کی حالت میں کبھی کبھار روحانی طور پر انکشافات ہوتے ہیں۔ تو پھر یہ کیسے بعید ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق کے سب سے بہترین لوگوں میں سے کسی کے اوپر وحی کے ذریعے علی انکشافات کرے؟ جبکہ یہ لوگ سمجھ بوجھ اور اخلاق کے لحاظ سے مکمل ہیں۔ پس آنکھوں کے سامنے صبح روشن ہو چکی ہے۔

## ۲) وحی عقل کے ذریعے سے

آپ نے جان لیا جو ہم نے علمی دلائل دیے کہ وحی ممکن ہے اور حقیقت میں واقع ہونے کے قریب ہے، اور اب ہم یہاں پر عقلی طور پر ثابت کریں گے کہ ایسا عملی طور پر ہوا ہے، جیسا کہ اس کے بارے میں سچے نبی محمد ﷺ نے خبر دی ہے اور جو کچھ سچے نبی محمد ﷺ نے خبر دی وہ حق ہے اور یہی چیز مطلوب ہے۔ بہر حال دلیل جس کے بارے میں محمد ﷺ نے خبر دی ہے وہ وحی کے بارے میں کتاب و سنت میں ذکر شدہ خبریں ہیں۔ بہر حال اس بات کے اوپر دلیل کے صادق اور معصوم ﷺ نے جو کچھ بتایا ہے وہ سچ اور حق ہے تو پس یہ سچائی اور عصمت کا تقاضا ہے۔ اور اس بات پر دلیل کہ محمد ﷺ سچے اور گناہوں سے پاک ہیں تو وہ عجزہ ہے جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ اپنے بندوں سے اپنے رسول کی تصدیق کے لیے فرما رہے ہیں:

”میرے بندے نے میری طرف سے جو کچھ پہنچایا وہ سچا ہے اور وہ میری طرف سے اس کی طرف وحی کی گئی ہے۔“

**عجزہ:** ایسی چیز ہے جس کی مثال پیش کرنا کسی انسان کے لیے انفرادی طور پر یا اجتماعی طور پر ناممکن ہو، یا وہ ایسا معاملہ ہے جو خلاف عادت ہو اور مشہور اسباب کی حدود سے باہر ہو اس کا ظہور اللہ تعالیٰ نبوت کا دعویٰ کرنے والے اپنے نبی پر دعوت و تبلیغ کے دوران اس کی سچائی کو ثابت کرنے کے لیے کرتے ہیں۔ پس جب کوئی انسان کھڑا ہو جائے اور یہ کہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کا بھیجا ہوا بندہ ہے اس کی مخلوق کی طرف اور اس کے بندوں کی طرف بھیجا گیا رسول ہے اور کہے کہ جس کا میں دعویٰ کرتا ہوں اس کی سچائی کی نشانی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جس نے مجھے رسول بنا کر بھیجا ہے وہ کسی عادت کو میری ہاتھ پر تبدیل کر دے اور اپنے عام طریقہ سے ہٹ کر

اس کے وجود میں کوئی امر ظاہر کرے۔ اور اللہ تعالیٰ یہ عجیب و غریب کام اس لیے دکھاتے ہیں تاکہ تم کو پتا چلے کہ تم اس معاملے میں کتنے باکمال ہو؟ اور کتنے قادر ہو؟ اور میں تمہیں چیلنج کرتا ہوں کہ گروہ کی شکل میں یا اکیلے اکیلے اس طرح کی کوئی مثال لا کر دکھاؤ۔ اور تمہارے سامنے کھلا آپشن ہے جسے تم مناسب سمجھتے ہو کرو۔ اور تمہارے پاس صاحبِ کمال لوگ موجود ہیں جیسے کہ تم دعوے کرتے ہو۔ اور پھر تم گروہ کی شکل میں ہو میں اکیلا ہوں اور یہ بات سچی بات کہی ہے اور واضح طور پر چیلنج ہے۔ اور ایسے وقت میں جب ہمارے عقائد، عادات اور اخلاق خراب ہو چکے ہیں اور ہمارے خوابوں نے اور ہماری طرح ہمارے آباؤ اجداد کے خوابوں نے ہمیں بے وقوف بنا دیا ہے۔ اور ہم زیادہ مریض ہیں اس کے بے بس ہونے پر اور مغلوب ہونے پر اور اس کے ساتھ فتح یاب ہونے پر اپنی کرامات کے دماغ میں اور اپنے پاس سب سے قیمتی چیز کی مدد کرنے پر۔

پھر زیادہ وقت نہ لگا کہ وہ کھڑا ہو گیا اور ہم بھی کھڑے ہو گئے اور وہ ایک بات پر جمع ہو گیا اور ہم بھی جمع ہو گئے اور جب ہم نے بہت دفعہ کوشش کے باوجود مقابلے کے باوجود ہم اس جیسی ایک چیز بھی نہ پیش کر سکے جو اس نے پیش کی۔ باوجود اس کے کہ وہ زیادہ عظمت والا ہے اور ہم ایک امت ہیں اور وہ اکیلا ہے جبکہ وہ ہماری سوچ کے مطابق سب سے آسان طریقوں سے ہم پر داخل ہوا اور ہمارے زمانے میں سب سے مشہور ترین فن ہے جبکہ اس نے ہم کو اس کے ساتھ مناظرے کے لیے کافی حد تک فرصت دے رکھی ہے اور ہم نے اپنے آپ سے ہر طرح کا انصاف کر لیا ہے۔

کیا مکمل عقل والا شخص سب سے بہترین انسان کے بارے میں شک کر سکتا ہے جو اپنی رسالت میں بھی سچا ہے کہ وہ اپنے نظریے کو ختم کرنے والا ہے؟ خاص طور پر جب ہم نے یہ سب کچھ بہت اچھے طریقے میں جان لیا کہ اس نے ہمارے اندر پیدا کرنا اور بچپن سے لے کر اپنی بعثت اور رسالت تک سچائی امانت اور عمدہ اخلاق کے ساتھ زندگی گزارا۔

اگر وہ اس طریقے سے معجزہ پیش کرے جس کو ہم نہیں جانتے تو ہم کہیں گے وہ تو ایسے فن میں ماہر ہو گیا ہے جس کا ہم کو علم نہیں ہے۔ یا اس نے کوئی ہنر سیکھ لیا ہے جس کی ہمیں خبر نہیں بہر حال جب وہ ہمارے پاس کسی ایسے طریقے سے دلیل پیش کرے جس کو ہم برتر و بالا سمجھتے ہیں تو اس کو سنتے بھی ہیں اور اس پر یقین بھی کرتے ہیں جب تک ہم انصاف پسند ہوں۔

ہم آپ کو ایک مثال پیش کرتے ہیں۔ موسیٰ علیہ السلام کڑی کی لاشی کا معجزہ لائے جس میں نہ تو روح تھی نہ حرکت اور نہ اس میں چمک تھی نہ وہ ترقی پھر انہوں نے اللہ تعالیٰ کے نام سے زمین پر ڈالا تو وہ چلتا ہوا سانپ تھا جبکہ جس قوم نے اس کا مشاہدہ کیا وہ جادو کے ماہر تھے اور اس کا توڑ کرنے والے تھے انہوں نے جادو کے میدان میں اچھا خاصہ وقت گزارا تھا۔ خاص طور پر وہ ایک گروہ کی صورت میں تھے اور موسیٰ علیہ السلام اکیلے۔ وہ جادوگری کے فن میں ماہر ترین جب کہ موسیٰ علیہ السلام نے جادو کا توڑ ایک دن بھی نہ سیکھا تھا۔ وہ اپنی تعداد اور تیاری کے بارے میں معترف تھے جبکہ موسیٰ علیہ السلام ان تمام ظاہری اسباب سے خالی ہاتھ تھے۔

کیا اس کے بعد شک کا شائبہ تک بھی ہو سکتا ہے کہ جب موسیٰ علیہ السلام نے اپنی لاشی کو پھینکا تو وہ ان جادوگروں کے سانپوں کو نکلنے لگا حق ثابت ہو گیا اور جو انہوں نے عمل کیا وہ باطل ہو گیا۔

”اور جادوگر سجدہ ریز ہو گئے۔ کہنے لگے ہم جہانوں کے رب پر ایمان لے آئے۔ موسیٰ اور ہارون علیہ السلام کے رب



حق واضح ہو گیا اسی لیے سب سے پہلے ایمان لانے والے وہی جادوگر خود تھے کیونکہ وہ جادو کو سمجھتے تھے اور اس کے نتائج سے آگاہ تھے اور انہوں نے سچائی کی آنکھوں سے اس معجزہ کو دیکھا جو جادوگری کی قسم میں سے نہیں تھا کہ جس کو پیش کرنے کے بعد کوئی انسان اس کا توڑ کر سکے اس کے نتائج محدود تھے ان کو عبور کرنا ممکن نہ تھا۔

جی ہاں جادوگروں کے سامنے حق واضح ہو جانے کے بعد اس کا اعتراف کرنے پر تاخیر کرنے کی ہمت نہ تھی حالانکہ ان کو فرعون نے قتل کرنے یا سولی پر چڑھانے کا کہہ رکھا تھا۔ گزشتہ دن فرعون کو اس کے بادشاہوں اور معبودوں نے کہا وہ بولے، ہم تجھ کو زیادہ نہ سمجھیں گے اس چیز سے جو پہنچی ہم کو صاف دلیل اور اس سے جس نے ہم کو پیدا کیا سو تو کر گزر جو تجھ کو کرنا ہے۔ اگر آپ چاہتے ہیں تو اس کے بعد والی آیات کو پڑھ کر دیکھ لیں۔ ﴿وَذَلِكْ جَزَاءُ مَنْ تَزَيَّنَّى﴾ (طہ: ۷۶) تک۔

یہی بات اللہ تعالیٰ کے بھیجے ہوئے ہر رسول کے بارے میں کہیں عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں بھی یہی کہیں جس نے اندھے کو بینا کرنا اور برص کی بیماری والے مریض کو صحت مند کرنا، مردوں کو زندہ کرنا، مٹی سے پرندوں کی طرز پر اللہ تعالیٰ کے حکم سے پیدا کرنا اس قوم کے سامنے جس نے طب کے میدان میں ہر طرح کی مہارت حاصل کر رکھی تھی۔

اور یہی بات بلکہ اس سے زیادہ بہتر بات خاتم النبیین محمد ﷺ کے بارے میں کہیں اور اس کے بارے میں جو وہ کھلے دلائل اور واضح معجزات لے کر آئے۔ آپ کو صرف قرآن مجید ہی ایسا عظیم ترین دلیل ہے۔ صرف تین قرآنی آیات دنیا کے منہ پر قطعی حجت ہیں قیامت تک۔ تمام عالم انسانیت اس کی فصاحت اور بیان، علوم اور معارف، غیب کی خبروں اور حق کے شواہد پر حیران ہیں۔

اس کے ساتھ اضافہ اور بھی کر لیا کہ جن لوگوں نے وحی کے اترتے وقت اس کے خطاب کا مشاہدہ کیا وہ لوگ فصاحت و بلاغت کے امام تھے، کلام کے ماہر اور کلام کے بہترین ہونے میں متنوع، نثر اور دیباچہ شعر اور اس کی بناوٹ میں ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر حصہ لینا اور اس معاطلے میں بہترین ہونے کی کرامت مرتب ہے وہ سونا جمع نہیں کرتے اور نہ القاب لگاتے ہیں یہاں تک کہ وہ اس میدان کی دوڑ کے فاتح نہ ہوں اور اپنی منزل تک نہ پہنچ جائیں۔ اور ہمارے لیے یہاں پر قلم کو کھلے طور پر چھوڑنا ممکن نہیں ہے تالیف کے کم ہونے اور وقت کی قلت کے ڈر سے اور آپ اعجاز قرآنی سے باخبر ہیں یہاں پر صرف چھوٹا سا اشارہ کافی ہے اگر آپ کو مزید ضرورت ہو تو اعجاز قرآنی پر جو کتابیں موجود ہیں ان کی طرف رجوع کریں۔

### ۳ شہادت کو دور کرنا

میں آپ کے سامنے اسی مناسبت سے پیش کیے جانے والے دس شہادت کا ازالہ کروں گا۔

پہلا شبہ علم کے آثار اور اس کے خوف و ہراس کے متعلق بھی ہوگا جو ہم دیکھتے اور سنتے ہیں۔

جواب آپ جانتے ہیں ہم نے ابھی معجزہ کی بحث میں ذکر کیا ہے جس سے پتا چلتا ہے کہ معجزہ کے درمیان اور دنیا میں علم کے عجائبات اور فن کی مہارت اور ایجاد کی مہارت کے درمیان بہت واضح فرق ہے۔ معجزہ کے لیے معرفت کے اسباب کی ضرورت نہیں ہوتی کہ ان کے وجود سے معجزہ یا اس جیسے عمل کا ظہور ہو جبکہ معجزہ کے برعکس ان ایجادات کے لیے معروف





اسباب موجود ہیں۔ اور ان کو جاننا ہر اس شخص کے لیے آسان ہے جو ان کو سیکھنے کی کوشش کرتا ہے۔  
**دوسرا شبہ** وہ کہتے ہیں کہ معجزہ جادوگری اور شعبدہ بازی کی طرح میں ہے۔ بس یہ صرف خیالی باتیں ہیں۔

**جواب** آپ پر واضح ہوگا جو ہم نے معجزہ کے بارے میں بیان کیا اور موسیٰ علیہ السلام کی لٹھی کی مثال پیش کی جس کا خلاصہ یہ ہے کہ معجزہ سے مراد حق کی حقیقت کا ایک نمونہ ہے جو نازل اسباب نظر آنے والا وسائل اور وزمرہ کی ضروریات سے بالاتر ہو کر ظاہر ہوتا ہے جبکہ جادو اور اسی طرح کی تمام چیزیں خمیہ نشین فنون ہیں جن کو ہر کوئی سیکھ سکتا ہے اور اس کے وسائل اور ذرائع تک ہر کوئی پہنچ سکتا ہے۔ اس لیے موسیٰ علیہ السلام پر سب سے پہلے جادو گر ہی ایمان لائے تھے کیونکہ وہ اس واضح فرق کو سمجھتے تھے۔  
**تیسرا شبہ** وہ کہتے ہیں جن علوم اور معارف کو تم معجزہ کہتے ہو جس کی ایک مثال قرآن مجید ہے یہ صرف ماہرین لوگوں کی خبریں اور ایسے ماہرین فن اور ان کی خبریں ہر اُمت میں مل سکتی ہیں۔

**جواب** بے شک باکمال اور ماہرین کی بتائی ہوئی باتوں اور خبروں اور افکار کے لیے وسائل اور عوامل درکار ہوتے ہیں پھر اس کی طرح کی عمومی مثالیں ہر اُمت اور نسل میں اور ہر علاقے اور ہر زمانے میں مل سکتی ہیں جبکہ معجزات کو عوامل اور اسباب کے ذریعے سے حاصل نہیں کیا جاسکتا اور نہ ہی اس کی ہم مثل کوئی مثال آپ کو عام طور پر مل سکتی ہے۔ الا یہ کہ ہم اپنی کائنات سے باہر نکلیں۔

**چوتھا شبہ** وہ کہتے ہیں کہ اگر اللہ تعالیٰ خلاف عادت اپنے رسولوں کے ہاتھ سے کام کرواتے ہیں جیسا کہ تم کہتے ہو تو یہ اس عمومی نظام سے خروج کا ذریعہ ہوگا جس کا تقاضا حکمت و مصلحت کرتی ہے۔

**جواب** بے شک معجزہ عمومی نظام کی حدود سے تجاوز کرتا ہے لیکن یہ اس عمومی نظام کی مدد سے تجاوز کرنا نہیں ہے جس کا تقاضا حکمت اور مصلحت ضروری ہے۔ حق اور اہل حق کے لیے کون سے حکمت کی ضرورت ہوگی؟ مخلوق کو ان کی کامیابی کے راستے کی طرف لے جانے والی مصلحت سے زیادہ بڑی کون سی مصلحت ہوگی؟ ان معجزات کی وساطت سے اپنے رب خالق کی مراد کو اپنے رسول کی تائید کے ساتھ سمجھتے ہیں اور ان کی تصدیق اور ان کی اتباع ان کے لیے واجب ہے؟

**پانچواں شبہ** وہ کہتے ہیں کہ اگر وحی ممکن ہوتی تو اللہ تعالیٰ عام انسانوں کی طرف وحی کرتے تھوڑی مقدار میں افراد کا تعین نہ کرتے جو اس کے مخلوق کے درمیان واسطہ کا ذریعہ بنتے۔

**جواب** عام انسان کے اندر اتنی استعداد ہی نہیں ہوتی کہ وہ اللہ تعالیٰ کی وحی کو حاصل کر سکے نہ براہ راست اور نہ ہی فرشتے کے ذریعے سے یہاں تک کہ اگر ان کے پاس کوئی فرشتہ آجائے تو وہ اس کو دیکھ بھی نہیں سکتے یہاں تک کہ وہ انسان کی شکل میں ظاہر نہ ہو۔ تو یہاں پر معاملہ گڑبڑ ہو جاتا ہے اور پھر اشکالات باقی رہیں گے۔ تو معاملہ یہاں پر آ کر ہی ختم ہوگا کہ اللہ تعالیٰ انسانوں میں سے کسی ایک خاص گروہ کو امتیازی حیثیت دے جو اللہ تعالیٰ سے وحی کو حاصل کرنے کی طاقت رکھتا ہو پھر اس امانت کو اپنے انسان بھائیوں کے سپرد کرے۔ اللہ تعالیٰ ان کے ہاتھوں سے ایسے سچے دلائل کا ظہور کرے کہ وہ ان کے بارے میں

تصدیق کریں اور اللہ تعالیٰ ان کو ایسی نشانوں کے ذریعے آراستہ کرے کہ لوگ مطمئن ہو جائیں کہ وہ اپنے رب کے رسول ہیں جو اس کے احکامات کی تنفیذ کے لیے آئے ہیں۔

پھر نوح انسانی میں سے کچھ افراد کو وحی کے لیے خاص کرنے میں امتحان اور آزمائش ہے جس کی بنیاد پر اللہ تعالیٰ نے یہ زندگی بنائی اور حلال کو حرام سے علیحدہ کیا۔

”اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے جسے چاہتا ہے خاص کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ اعظم فیصل والا ہے۔“ (البقرہ)

یہ شبہ ایسا ہے کہ اس کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے اس کی مثال سورۃ انفعام کی دو آیات کے اندر بیان کی ہے۔

”اور وہ کہتے ہیں کیوں نہیں اترا ان پر کوئی فرشتہ اور اگر ہم اتاریں فرشتہ تو طے ہو جاوے قصہ۔ پھر ان کو مہلت بھی نہ ملے گی۔ اور اگر ہم رسول بنا کر بھیجتے کسی فرشتہ کو تو وہ بھی آدمی ہی کی صورت میں ہوتا ہے اور ان کو اسی شبہ میں ڈالتے ہیں جس

میں اب پڑھ رہے ہیں۔“ (الانعام: ۸-۹)

وہ کہتے ہیں کہ معجزہ سے کیسے ثابت ہو سکتا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو رسول بنا کر بھیجا جب کہ ہم نے اللہ تعالیٰ کو نہ تو چھٹا شبہ دیکھا ہے اور نہ ہی سنا ہے۔

بے شک اللہ کے رسول کی تصدیق معجزہ کے ذریعے ایسے ہی ہے جیسے کائنات کے خالق ہونے کی تصدیق اللہ تعالیٰ کے بارے میں ہے جبکہ ہم نے اللہ تعالیٰ کو دیکھا اور سنا ہی نہیں ہے۔ اس پر ہم ان کو ایک مثال دیتے ہیں تاکہ ان

کو کوئی شبہ نہ رہے اور کوئی عذر نہ رہے۔ فرض کریں آپ ایک مجلس میں حاضر ہوئے ہیں اور اس میں کوئی فرشتہ موجود ہے اور فرشتے کی عادت ہے کہ وہ عام مجالس میں اپنا سرنگا نہیں کرتا جبکہ لوگ ایک جلیل القدر کے پاس جمع ہیں۔ اچانک ایک آدمی مجلس میں کھڑا ہو جاتا ہے جو اپنی صداقت، امانت، ادب و استقامت اور حسب و نسب میں معروف ہے۔ یہ شخص فرشتے اور عوام کے سامنے کھڑا ہو کر کہتا ہے

کہ اے لوگو! میرے معزز فرشتے نے مجھے یہ پیغام دیا ہے کہ آپ تک پہنچا دوں اور وہ یہ ہے کہ ایسا کرو اور ایسا نہ کرو، چھوڑ دو اور فرشتہ خاموش رہا اس نے اس آدمی کو جھٹلایا نہیں۔ پھر اس آدمی نے اپنے ماضی کے صاف شفاف ہونے اور فرشتے کے خاموش رہنے

پر اکتفا نہ کیا۔ بلکہ اپنی دعوت اور پیغام کی تائید میں اُس نے کہا کہ میرے سچا ہونے کی نشانی یہ ہے کہ معزز فرشتہ اپنی عادات کے خلاف عمل کرے گا جو کہ تم سب کے علم میں ہے اور وہ یہ ہے کہ فرشتہ اپنا سراسی مجلس میں بنگا کرے گا پھر وہ اپنا سرنگا کرتا ہے اور اپنا

تاج اتار دیتا ہے تو کیا اس فرشتے کا یہ عمل اس شخص کے اور اس کے پیغام کے سچا ہونے میں دلیل کے طور پر کافی ہوگا؟ پھر آپ کا کیا خیال ہے جب اس نے اپنی دلیل کو مضبوط کرنے کے لیے چیخ کیا اور کہا کہ میں تمہیں چیخ کرتا ہوں کہ فرشتہ آپ کو جواب دے جس

طرح مجھے جواب دیا پس وہ لوگ اس سے مطالبہ کرتے ہیں اور اس کو ملامت کرتے ہیں لیکن فرشتہ ان لوگوں کو کوئی جواب نہیں دیتا اور نہ ہی اپنی عادت کے خلاف ایک مرتبہ بھی کوئی کام کرتا ہے۔ تو کیا یہ روز روشن کی طرح واضح نہیں ہے کہ یہ مبلغ شخص اس فرشتے کا سچا

پیغام رساں ہے؟ تو پھر بھی اس کو جھٹلانے والا شخص دشمن اور غرور اور تکبر والا نہیں کہلائے گا؟ کوئی حیوان جو نہ سمجھے اور شعور نہ رکھے وہ اس انسان کی طرح ہو سکتا ہے جو سمجھتا بھی ہے اور شعور بھی رکھتا ہے۔

اور یہ مثال ان اللہ کے رسولوں جیسی ہے جن کی تائید اللہ تعالیٰ کے معجزات کرتے ہیں۔

”اور اللہ تعالیٰ کی مثال سب سے اعلیٰ ہے اور وہ غالب حکمت والا ہے۔“ (انجمن)

**سائواں شبہ** وہ کہتے ہیں کہ جس وحی کے قسطوں میں ہونے کا تم دعویٰ کرتے ہو وہ اس قرآن میں غیر مرتب اور غیر منظم ہے کسی ایک مقصد کے لیے کوئی فصل اور باب متعین نہیں کیا۔ جو کہ منظم کتاب کی ایک شان و عظمت ہوتی ہے۔ بلکہ اس کے مقاصد کو ٹکڑوں میں تقسیم کیا گیا ہے تالیف کی رعایت نہیں رکھی گئی تو ایسا کام اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی نہیں ہو سکتا۔ یہی شہ قرآن مجید کے ٹکڑوں میں نازل ہونے اور اس کی ترتیب پر بھی ہے۔

**جواب** قرآن مجید کی اس بنا پر مخالفت کرنا کہ یہ منظم تالیف شدہ کتابوں کی طرح نہیں ہے اس میں عیب کا ذریعہ نہیں ہو سکتی اور نہ ہی اس کے وحی ہونے اور وحی بھیجنے والے میں عیب بن سکتا ہے بلکہ یہ اس کے برعکس اس بات پر دلیل ہے کہ یہ انسان کی وضع کردہ نہیں ہے کہ لوگوں میں سے کوئی شخص کسی ایک گروہ کے لیے اپنی معلومات کے مطابق ایک فصل مقرر کر لیتا ہے اور کئی فصلوں کو جمع کر کے ایک باب تشکیل دے دیتا ہے بلکہ وحی اللہ تعالیٰ کی حکمت اور مصلحت کے تقاضے کے مطابق انوارات کا ایک مجموعہ ہے اور وہ حکمت و مصلحت قرآن کے ٹکڑوں کی صورت میں نازل ہونے کے راز میں پوشیدہ ہے۔

پھر اس کا سورتوں اور حصوں میں تقسیم ہونے اس کے پڑھنے والے کے لیے محذور ہونے کا ذریعہ ہے اور اس کے سننے والے کے لیے شوق کا باعث ہے۔ اور فائدہ اٹھانے والے کے لیے ہر مجلس اور درس میں کئی قسم کے فوائد مہیا کرتا ہے۔ اور یہ اللہ تعالیٰ کی حکمت کا تعلیم و ارشاد کے حوالے سے ایک عمدہ اسلوب ہے۔ خاص طور پر ایک ان پڑھ قوم کے لیے جس پر یہ نازل ہوا۔ قرآن کے ہر حصہ کی مثال پھلوں سے بھرے ہوئے باغ کی طرح ہے جس میں انسان داخل ہوتا ہے اور کئی قسم کے پھلوں سے فائدہ اٹھاتا ہے۔ اور کئی قسم کے کھانوں سے بھرے ہوئے دسترخوان کی طرح ہے جس پر ایک بھوکا انسان مختلف قسم کے کھانوں سے پیٹ بھرتا ہے۔

یہاں ایک نقطہ ہے میں چاہتا ہوں آپ سے پوشیدہ نہ رہے اللہ تعالیٰ کے قرآنی باغ کے جملوں، آیات اور سورتوں کے درمیان کمال کی مناسبت ہے اور مضبوط ربط ہے اور تالیف کا انداز بے مثال ہے یہ سب ایک معجزہ ہی ہو سکتا ہے خاص طور پر اس کا چھوٹے چھوٹے حصوں کی صورت میں کئی سالوں، مہینوں اور دنوں میں نازل ہونا۔ شیخ ولی الدین الملوی کہتے ہیں کہ ”اس شخص کا صرف وہم ہو سکتا ہے جو یہ کہتا ہے کہ مختلف واقعات پر قرآنی آیات مناسب مطلوب نہیں ہے اور مخاطب کا یہ کہنا کہ یہ واقعات کے مطابق تھوڑا تھوڑا کر کے نازل ہوا اور حکمت کے مطابق مرتب و منظم ہے۔ تو پس قرآن مجید اسی طرح مرتب ہے سورتوں کے لحاظ اور آیات کے لحاظ سے جس طرح لوح محفوظ میں ہے اور ایک ہی دفعہ بیت العزۃ کی طرف اتارا گیا۔ اس کے اسلوب کو بیان کرنا اور اس کی حیران کرنے والی تنظیم سازی کو بیان کرنا بہت مشکل ہے۔ اور مناسب یہ ہے کہ ہر آیت کے بارے میں دیکھا جائے کہ وہ گزشتہ آیت کو مکمل کرنے والی ہے یا مستقل طور پر ہے۔ اور جو مستقل طور پر ہے اس کی سابقہ آیت کے ساتھ کیا مناسبت ہے یہ ایک پوشیدہ علم ہے اسی طرح سورتوں کے بارے میں دیکھا جائے کہ سابقہ سورت کے ساتھ اس کا کیا تعلق ہے اور کس وجہ سے بعد میں لایا گیا ہے۔“

امام فخر الدین رازی سورۃ بقرۃ کی تفسیر میں فرماتے ہیں ”جس شخص نے سورتوں کی تنظیم میں باریک بینی پر اور اس کی ترتیب کے بے مثال ہونے پر غور و فکر کیا تو اس کو پتا چلے گا کہ جس طرح قرآن اپنے الفاظ اور اس کے معانی میں فصاحت و بلاغت کے اعتبار سے معجزہ ہے اسی طرح ترتیب اور آیات کے منظم و مرتب ہونے میں بھی معجزہ ہے۔ شاید جن لوگوں نے کہا کہ یہ اپنے اسلوب کے

اعتبار سے معجزہ ہے تو ان کی مراد یہ ہو مگر میرے خیال میں جمہور مفسرین ان باریک بینیوں اور خفیہ رازوں سے ناواقف ہیں اور اس بابت معاملہ دیا نہیں جیسا کہ کہا گیا ہے:

ستارہ آنکھوں کو چھوٹا دیکھائی دیتا ہے  
قصور اس کے دور ہونے کا ہے ستارہ چھوٹا نہیں

وہ کہتے ہیں محمد ﷺ متعصب تھے مزاج میں سختی تھی (العیاذ باللہ)۔ اور وہ ہسٹریا (Hysteria) کے مریض تھے (العیاذ باللہ) اور ان کے نزدیک وحی سے مراد اس حالت سے اعراض کرنا ہے جس میں وہ مبتلا تھے۔

یہ سن گھڑت بات ہے جو محمد ﷺ کے بارے میں ان کی جہالت پر دلالت کرتی ہے۔ صحیح تاریخ کی گواہی اور قطعی دلائل سے پتا چلتا ہے کہ محمد ﷺ بردبار، صبر و تحمل اور نرم طبیعت کے حامل تھے۔ بلکہ وہ عظیم صبر والے، وسیع بردبار

اور کھلے دل والے تھے یہاں تک کہ وہ لوگوں میں فراخ دلی اور اخلاق کی وجہ سے غالب تھے وہ بہادر انسان تھے جسم صحیح سلامت تھا یہاں تک کہ مشہور پہلوان رکانہ کو پچھاڑ دیا اپنی شجاعت کی وجہ سے۔ وہ میدان میں ثابت قدم رہتے یہاں تک کہ بہادر بھی میدان

سے بھاگ جاتے لوگ گھبرا جاتے اور وہ غالب آ جاتے۔ اور آپ ﷺ فرماتے ”میں نبی ہوں چھوٹا نہیں، عبدالمطلب کا بیٹا ہوں“ اور فرماتے لوگوں میری طرف آؤ اور اسی طرح کرتے رہتے یہاں تک کہ صورت حال سے نمٹ نہ لیتے اور معاملہ کو حل نہ کر لیتے اور

معرکہ جیت نہ لیتے اگر ہم اس موضوع میں مصروف ہو گئے تو بات بہت لمبی ہو جائے گی یہ سیرت اور محمد ﷺ کے شمائل کی کتابوں کا موضوع ہے اس کی طرف رجوع کر لیں۔ بہر حال ہسٹریا کا مرض جس کے بارے میں وہ کہتے تھے کہ آپ ﷺ کو لگا ہوا ہے تو یہ

جھوٹ ہے یہ پھینوں کا علاج مرض تھا جو کہ عورتوں کو زیادہ لگتا ہے اور اس کی نشانیوں میں سے نفرت کے مخالف ہونا، سانس لینے میں دشواری ہونا اور ہاضمہ میں خرابی ہونا اور بعض اوقات اس بیماری کی وجہ سے کوئی عضو شل ہو جاتا ہے۔ پھر تشنہ اور بے ہوشی اور پھر مریض

کی فضول حرکات اور ہاتھ پاؤں کا بغیر کسی مقصد کے ہلانا وغیرہ اور مریض کا ایک جگہ سے دوسری جگہ اچھلنا کودنا اور مریض کو ایسا لگتا ہے کہ کوئی پر چھائی سی ہے جو اس کو ڈرا دھمکا رہی ہے۔ اور کوئی اس کا دشمن ہے جو اس کے ساتھ لڑائی کرے گا یا اس کو ایسا محسوس ہوتا

ہے کہ کوئی اس کو آواز دے کر مخاطب کر رہا ہے جبکہ حقیقت میں ایسا کچھ بھی نہیں ہوتا۔ تو کیا یہ اس کے ساتھ موافقت رکھتا ہے جو حضور ﷺ کے بارے میں مشہور و معروف ہے کہ آپ ﷺ اخلاق میں ثابت قدم ہیں، عقل میں، خود کو قابو رکھنے میں، جسم کے

سلامت ہونے اور مضبوط جسامت والا ہونے میں۔

تو پھر یہ لا علاج مرض جس نے اطباء کو عاجز کر رکھا تھا اور محمد ﷺ کو جو کچھ میسر تھا اس سے ایک نمایاں امت کی بنیاد رکھی اور اس کی ہدایت کے ذریعے سے عمدہ تربیت کی اور اجتماعی اصول مرتب کیے اور اخلاقی قوانین کو واضح کیا اور ترقی پذیر ہونے کے

تواضع کو مرتب کیا۔ یہ سب کیسے ایک ساتھ ممکن ہو سکتا ہے؟

اس کے ساتھ آپ اس میں اضافہ کریں کہ یہ معجزہ ہی تھا کہ صرف ایک صدی کے اندر یہ امت ایسی بنا دی کہ یہ امت تمام امتوں کی سردار اور علم والی اور تلوار اور قلم کی حفاظت کرنے والی بن گئی۔ تو کیا خیالات کی دنیا میں رہنے والا مریض جو صرف اپنی قیادت

نہ کر سکتا ہو، کیا وہ بین الاقوامی سطح پر قیادت کیسے کر سکتا ہے اور اس میں کامیابی بھی ایسی ہو کہ عقل دنگ رہ جائے۔

کبھی آنکھیں سورج کی روشنی کو بیماری کی وجہ نہیں پہچانتی  
اور منہ پانی کا ذائقہ بیماری کی وجہ سے نہیں پہچانتا

نواں شبہ ۱: وہ کہتے ہیں تم وحی کی دلیل قرآن کے معجزہ ہونے کو سمجھتے ہو اور قرآن کے معجزہ ہونے کو اس میں بلاغت کو دلیل سمجھتے ہو اور قرآن کے معجزہ ہونے کو اس میں بلاغت کو دلیل سمجھتے ہو۔ پوچھو یہ حقائق نہ نظر آتے ہیں اور نہ ہی ہم ان کو تسلیم کرتے ہیں تو یوں ہم اس پر مبنی وحی کو بھی نہیں مانتے۔

جواب ۱: قرآن مجید کے معجزہ ہونے میں کئی پہلو ہیں فصاحت اور بلاغت کے علاوہ بھی جو اس کے معجزہ ہونے کی دلیل ہیں۔ اور جو شخص عربی علوم میں ماہر نہ بھی ہو اس کے لیے ان کو سمجھنا آسان ہے۔ مشہور اور اعلیٰ تعلیمات اس قرآن مجید میں شامل ہیں ان میں سے درج ذیل ہیں: عقائد و عبادات شہری اور جرائم کے متعلق اور جنگ کی بابت اور تجارت کے متعلق انفرادی حقوق اور اجتماعی حقوق اور بین الاقوامی قوانین کے متعلق احکامات وغیرہ۔ آپ کو قرآنی ہدایات کے درمیان اور زمین پر موجود دینی اور غیر دینی احکامات کے درمیان تھوڑا سا موازنہ کرنے سے ہی قرآن مجید کے معجزہ ہونے کا پتا چل جائے گا۔ خاص طور پر جب آپ دیکھیں گے کہ یہ احکامات اور خلاف عادت معلومات جو شخص لایا ہے وہ شخص پڑھنا لکھنا نہیں جانتا تھا۔ پرورش پائی اور زندگی گزارا جو ان ہوئے اور قوم کے سامنے اپنی زندگی مکمل کی۔ ایسی قوم جس کو نہ کتاب کا پتا تھا اور نہ ہی ایمان کے بارے میں کچھ علم تھا۔ اسی طرح غیب کی خبریں جن کے بارے میں قرآن مجید میں ذکر آتا ہے بے شمار ہیں۔ ہر مضمف کے لیے ان میں سے قرآن کا معجزہ ہونے کے بارے میں معلوم کرنا نہایت آسان ہے۔ اگر آپ چاہتے ہیں تو سورہ روم کا ابتدائی حصہ تلاوت کریں تاکہ آپ کو پتا چلے کہ قرآن نے کسی طرح غیبی معلومات کو چھپا کر رکھا ہوا ہے۔ جبکہ ظاہر حالات اور اسباب اس کی اجازت نہ دیتے تھے اور اس کی خبر اس وقت دی جب فارس والوں کو رومیوں کے خلاف زمین کے کچھ حصے پر فتح ملے گی اور وہاں ہی ہوا جیسا کہ آپ ﷺ نے پیشینگوئی کی تھی۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی ﷺ سے مخاطب ہوتے ہوئے یہودیوں کے ساتھ کسی لڑائی اور جھگڑے کے موقع پر ارشاد فرمایا:

”کہہ دینا اگر صرف تمہارے لیے اللہ تعالیٰ کے ہاں گھر ہے تو تم مرنے کی آرزو کرو اگر تم سچے ہو تو۔ اور وہ مرکز آرزو نہیں

کریں گے موت کی اپنے گناہوں کی وجہ سے جو آگے بھیج چکے اور اللہ تعالیٰ خوب جانتے ہیں گناہگاروں کو۔“

یہ قرآن مجید ہونے کے بارے میں ظاہر ترین دلائل میں سے ہے کہ وہ اپنے نبی ﷺ کے لیے کسی موقع پر دشمنوں کے مقابلے میں ایک ایسا طریقہ اپنائیں کہ وہ کسی چیلنج پر جرأت اور بہادری کا مظاہرہ کرتے ہوئے ان میں سے کسی ایک کو بھی موت کی تمنا کرنے کا کہے تاکہ محمد ﷺ کی دعوت کو باطل قرار دے سکیں لیکن وہ ایسے نہیں کر سکتے ان میں سے کوئی بھی موت کی تمنا نہیں کرتا بلکہ وہ ہمیشہ کے لیے اس سے اعراض کرنے والے ہیں۔ پھر قرآن نے اس کے بعد جو آیت بیان کی وہ اس سے بھی زیادہ مجید ہے۔

”بلکہ سب سے زیادہ دنیا کی زندگی کا حریص اے نبی، آپ ان ہی کو پائیں گے، یہ حرص زندگی میں مشرکوں سے بھی زیادہ ہیں ان میں سے تو ہر شخص ایک ایک ہزار سال کی عمر چاہتا ہے، گو یہ عمر دیا جانا بھی انہیں عذاب سے نہیں چھڑا سکتا، اللہ تعالیٰ

ان کے کاموں کو بخوبی دیکھ رہا ہے۔“ (البقرہ: ۹۶)

کیا یہ دلائل ہمیشہ سے قائم نہیں ہیں کہ محمد ﷺ کو وحی کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ کی مدد حاصل تھی۔ بے شک آپ کو قرآن

حکمت اور علم والے رب کی طرف سے پہنچتا تھا۔

بہر حال بلاغت کے اعتبار سے قرآن مجید کا معجزہ ہونا اس میں کسی قسم کی کوئی مذمت نہیں ہے کہ لوگ آج کل اسے کے بارے میں سمجھتے ہیں اور اس کا ذائقہ نہیں چکھتے۔ پس اس سے یہ مطلب نہیں نکلتا کہ قرآن مجید میں فصاحت و بلاغت کا ذکر نہیں ہے۔ بلکہ اس میں عربی زبان اور اس کے اسلوب سے ناواقفیت لوگوں کی جہالت کی وجہ سے ہے۔ اور لوگوں پر بعینت کا غلبہ ہونے کی وجہ سے انکا ذوق نہیں رہا۔ اور مشہور تو یہ بات ہے کہ کبھی شے کے بارے میں علم نہ ہونا اس کے وجود کی نفی کی دلیل نہیں بن سکتا۔ اس کی مثال ایسی ہے کہ اگر ہمیں کوئی اجنبی زبان کے بارے میں علم نہ ہو تو لازمی نہیں ہے کہ ہم اس بات کا انکار کریں گے کہ فلاں شخص زبان میں ماہر خصوصی ہے۔ بلکہ ہمیں یقین ہے کہ ایسی زبانیں موجود ہیں جن کو ہم نہیں جانتے ماسوائے اس کے جو ہم تک باوثوق ذرائع سے ان کے بارے میں بارے میں اور ان کی مہارت کے بارے میں بھی نہیں جانتے ماسوائے اس کے جو ہم تک باوثوق ذرائع سے ان کے بارے میں معلومات پہنچیں۔ اسی طرح قرآن مجید ہے اس کے بارے میں زمانے سے عربی لغت میں اہل فن اور متخصیصین نے بغور مشاہدہ کیا ہے اور تسلیم کیا ہے کہ یہ کتاب تمام کتیبوں پر فوقیت رکھتی ہے اور عربی زبان تمام زبانوں پر غالب ہے۔ اس میں فصاحت و بلاغت عروج کی بلندیوں پر ہوتی ہے۔ اور قرآن مجید ہم تک تو اتر سے منتقل ہوتا چلا آ رہا ہے اس میں شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہیں رہتی۔ کیا یہ تعصب اور دشمنی کی انتہا نہیں کہ عربی زبان میں فصاحت و بلاغت کو پرکھنے کا دروازہ ابھی تک کھلا ہے جو کوئی اس کے بارے میں مشاہدہ کرنا چاہتا ہے وہ کر سکتا ہے اور قرآن مجید میں فصاحت و بلاغت کے اعتبار سے معجزہ ہونے کو دیکھ سکتا ہے۔ وہ بھی وہی فیصلہ کرے گا جو فیصلہ ہزاروں لوگ ہر زمانے میں کر چکے ہیں۔

اور تجھے چاند نظر نہ آئے تو ان لوگوں کی بات مان لے جنہوں نے آنکھوں سے دیکھا قرآن کے معجزہ ہونے کا میدان اور ہے آپ کو اگر ضرورت ہو تو ڈھونڈ لیں۔

وہ کہتے ہیں کہ قرآن کا معجزہ ہونا اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ قرآن اللہ تعالیٰ کا کلام ہے بلکہ یہ محمد ﷺ کا اپنا کلام ہے جو اپنے رب کی طرف منسوب کر دیا ہے تاکہ اپنے رب سے اس نسبت سے مدد لے سکے۔ اور اس کا معجزہ ہونا اس طرح سے ہے کہ محمد ﷺ اکیلے فرد ہیں جنہوں نے اپنی قوم کو اس کے متعلق بتایا۔ اس لیے قرآن ایسے فرد کے پاس آیا جس کو اس کی قوم اکیلا ہی لائی۔ اس اعتبار سے اکیلے اس جیسی کتاب نہیں لاسکے۔

جو ابات ۱۔ ہم اس شبہ کے پانچ جواب دیں گے۔

۱۔ پہلا جواب ۱۔ جس شخص کو فصاحت و بلاغت کے ذوق کا تھوڑا سا بھی اندازہ ہو وہ قرآن اور حدیث نبوی کے اسلوب میں واضح فرق کر سکتا ہے جیسے خالق اور مخلوق کی طاقت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اسی طرح قرآن اور حدیث ہمارے سامنے ہیں۔ لوگوں کو واضح فرق کا پٹھانام دے رہے ہیں اگر ان کو فصاحت و بلاغت کے بارے میں کوئی شناسائی ہو تو۔

اگر اس شبہ کی کوئی اہمیت ہوتی تو اس کی آواز وہ عرب لوگ اٹھاتے جنہوں نے قرآن مجید اترتے دیکھا کیونکہ وہ محمد ﷺ کو بے بس اور خاموش کرنے کے زیادہ خواہش مند تھے لیکن انہوں نے ایسا نہیں کیا۔ بلکہ انہوں نے اس کے بارے میں کچھ نہ کہہ کر خود پر احسان کیا ہے۔ ان کو اس بات کا یقین تھا کہ کلام الہی کو کلام نبوی پر فوقیت اور برتری حاصل ہے یہ دونوں آپس میں خلط ملط نہیں



ہو سکتے۔ (اور اسی طرح جس نے ذائقہ چکھا سمجھ گیا جو محروم ہو گیا وہ انکاری ہو گیا۔)

اور کتنے لوگ صحیح بات میں عیب نکالنے والے

ان کو منہ کی بیماری سے دو چار ہونا پڑا

**دوسرا جواب** ❖ قرآن مجید لوگوں کے پاس خفیہ راستے سے نہیں آیا بلکہ کھلے دروازے سے آیا اور خالص عرب فصاحت و بلاغت والے راستے سے آیا ہے۔ ان کو چیلنج ہے کہ وہ کلام کی بناوٹ کے ماہر لوگ ہیں جنہوں نے ایسی مہارت حاصل کی کہ وہ کلام بنانے میں باکمال ہو گئے اور اپنی زندگیاں اس میں لگا دیں یہاں تک کہ وہ اپنے کلام کی وجہ سے فخر کرنے لگے اور فوقیت کا ذریعہ بنا لیا جو کہ اللہ تعالیٰ کے معجزات کی شان تھا۔

قرآن مجید لوگوں کے پاس تمام قسم کے مفاہیم کے ساتھ آیا تاکہ اللہ تعالیٰ کا پیغام واضح ہو اس میں کسی قسم کا کوئی ابہام

نہ رہے اور نہ شک و شبہ رہے۔

”تاکہ ان رسولوں کے آجانے کے بعد لوگوں کے پاس اللہ کے سامنے کوئی عذر باقی نہ رہے اور اللہ کا اقتدار بھی کامل

ہے، حکمت بھی کامل۔“ (النساء: ۱۶۵)

یہاں سے ہمیں پتا چلتا ہے اور تاریخ گواہ ہے کہ اگر قرآن مجید کا مصدر خود محمد ﷺ ہوتے جیسا کہ طہدین کی طرف سے کہا جاتا ہے تو فصاحت و بلاغت میں باکمال اہل عرب کے لیے زیادہ آسان تھا کہ وہ سمجھ لیتے کہ یہ کلام محمد ﷺ کا اپنا ہے۔ جبکہ ان کو تنقید پر ملکہ حاصل تھا اور فہم و فراست کی صلاحیت حاصل تھی تو ان کے لیے زیادہ آسان تھا کہ وہ آپ ﷺ کے قریب رہ کر دیکھتے اگر ایسا ممکن نہ تھا تو دور سے ہی جانچ لیتے۔ یہاں تک کہ قرآن مجید نے چیلنج کے میدان میں ان کو قرآن کی سب سے چھوٹی سورت کے برابر کوئی ایک سورت پیش کرنے کو کہا جو کہ صرف تین چھوٹی آیات پر مشتمل ہو۔ جبکہ قرآن مجید ایسی کئی ہزار آیات پر مشتمل ہے۔ اور آپ کو علم ہے کہ یہ لوگ ان کو اس مقابلہ میں ہرانہ سکے جبکہ وہ اس میدان کے شاہسوار تھے فصاحت و بلاغت کے امام تھے اگر معاملہ محمد ﷺ کا اپنے پاس سے قرآن مجید کے گھڑ لینے کا ہوتا جیسا کہ یہ لوگ سمجھتے ہیں تو ان کی زبانیں گنگ ہو گئیں اور سب لوگوں کی آوازیں اس کے بعد کیوں بند ہو گئیں۔

اور معلوم ہونا چاہیے کہ ہر زمانے میں فن میں ماہر و باکمال لوگ ایسے ہوتے ہیں جو اپنے زمانے میں کسی بڑے معاملے یا بڑی چیز کی نقل نہیں اتار سکتے تو کم از کم چھوٹے معاملے اور تھوڑی چیز کی نقل تو اتار سکتے ہیں۔

**تیسرا جواب** ❖ اگر قرآن مجید کا مصدر محمد ﷺ خود ہوتے تو یہ زیادہ فخر والی بات تھی کہ وہ اس کو اپنی طرف منسوب کرتے یوں زیادہ مناسب تھا کہ نبوت کے دعوے کی بجائے الوہیت کا دعویٰ کرتے اگر خدا ہوتے تو لوگوں کی نگاہ میں زیادہ معزز ہوتے نسبتاً اس بات کے کہ وہ نبی ہیں۔ تو مناسب تھا کہ ان کی قرآن مجید کی بابت چھوٹی نسبت کسی اور کی طرف منتقل ہوتی۔

”تو کیا حال ہے ان لوگوں کا کہ وہ کوئی بات نہیں سمجھتے۔“ (النساء: ۷۸)

**چوتھا جواب** ❖ یہ طہدین بھول گئے ہیں کہ وہ معزز ترین شخصیت کے بارے میں بات کہتے ہیں جس کی عظمت اور پاکیزگی کی تاریخ گواہ ہے۔ وہ بھول گئے ہیں کہ وہ سچے اور امانت دار القاب سے شہرت یافتہ شخصیت کے بارے میں محو گفتگو ہیں۔ آپ ﷺ جب

کسی قوم کے پاس سے گزرتے تھے تو لوگ آپ کی طرف انگلیوں سے اشارہ کرتے ہوتے کہتے تھے یہ سچا اور امانت دار شخص جا رہا ہے۔ پھر آپ ﷺ سے مشورے لیتے اور فیصلے کرواتے۔ عقل مند اور انصاف پسند آدمی ہمیشہ یہی کہتا یہ شخص لوگوں کے ساتھ جھوٹ بولنے سے منع کرتا ہے اور خود پرہیز کرتا ہے تو وہ اللہ تعالیٰ پر کیسے جھوٹ بول سکتا ہے۔

”اور لیکن منافق لوگ نہیں سمجھتے۔“ (النافقین: ۸۰)

**پانچواں جواب** ❁ یہ شبہ قرآن مجید کے علی مضامین، غیب کی خبروں، انسانی زندگی کے تمام پہلوؤں میں خلاف عادت راہنمائی چاہے انفرادی ہو یا اجتماعی ان تمام چیزوں سے غفلت کا نتیجہ ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ یہ قرآن مجید ایک امی شخص ایک امی قوم میں لے کر آئے جو جاہلیت کا تاریک ترین زمانہ تھا۔ اس کے ساتھ اس بات کو بھی شامل کر دیں کہ اس قرآن مجید میں نبی کریم ﷺ کی بعض اجتہادی فروگزاشتوں کو بیان کیا گیا ہے۔ اس کی وجہ سے کبھی اللہ تعالیٰ نری کا معاملہ فرماتے اور کبھی سختی کا پہلو نظر آتا ہے اور اگر یہ قرآن مجید آپ ﷺ اپنا کلام ہوتا تو آپ ﷺ کبھی بھی اس بات کی اجازت نہ دیتے کہ ان کے اپنے خلاف کسی بات کو قرآن میں لکھا جائے۔ لیکن ملحدین نے اپنے آپ کو بے وقوف سمجھا اور یہ سارے دلائل سامنے ہوتے ہوئے بھی ان کو یہی گمان تھا کہ محمد ﷺ نے اپنے رب کے خلاف قرآن مجید کو گھڑ لیا ہے۔ وہ جھوٹے ہیں اور گمراہ ہیں۔

”من گھڑت کلام نہیں ہے لیکن موافق ہے اس کلام کے جو اس سے پہلے ہے۔ بیان ہر چیز کا اور ہدایت اور رحمت ہے ان لوگوں کے لیے جو ایمان لاتے ہیں۔“ (یوسف: ۱۱۱)

**اس شبہ کا ضمیمہ** ❁ اس شبہ کے ساتھ ایک اور شبہ بھی ملتا جلتا ہے کہ بعض کم عقل لوگوں کا یہ کہنا ہے کہ قرآن مجید اور حدیث سے بلکہ یہ فرق اس وجہ سے ہے کہ محمد ﷺ کے کلام کی دو قسمیں ہیں۔

**پہلی قسم** ❁ ایسا کلام جس کا خصوصی اہتمام ہو اور توجہ کا محور ہو اور اس کو ترتیب دینے، جمع کرنے اور خوبصورت لکھنے کا خصوصی اہتمام کیا گیا وہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہے۔

**دوسری قسم** ❁ ایسا کلام جو محمد ﷺ کی زبان سے جاری ہو اور اس کے مفہوم و معنی کے لکھنے کا اہتمام نہ ہو۔

پھر اس شبہ کو عام کرنے کے لیے کہتے ہیں کہ یہ کوئی نئی بات نہیں ہے جو ہم پرانے اُدباء اور فصحاء کی تاریخ میں دیکھتے ہیں بلکہ ہمارا مشاہدہ ہے کہ ایک ادیب کے سوچ و بچار اور توجہ و اہتمام والے کلام کو بہت زیادہ مرتبت حاصل ہوتی ہے بنسبت اس کلام کے جو بغیر سوچے فی البدیہہ کہا گیا ہو یہاں تک کہ دو مختلف لکھنے والوں کو دونوں کے کلاموں کے درمیان مشرق و مغرب کے درمیان والا فرق محسوس ہوگا۔

**پہلا جواب** ❁ یہ ہے کہ یہ شبہ فاسد قیاس پر مبنی ہے اور وہ ہے تابناک زمانہ جس میں قرآن نازل ہوا اور عربی زبان محفوظ تھی۔ اس زمانے کے شعراء کو قیاس کرنا ایسے شعراء کے ساتھ جو ایسے زمانے میں پیدا ہوئے ہیں جب زبان غیر محفوظ اور بدل چکی ہے اور ان کی زبانیں خراب ہو چکی ہیں۔ دونوں طبقوں میں بہت بڑا فرق ہے۔ اور دونوں زمانوں میں کتنی دُوری ہے۔

اے ثریا ستارے کو سہیل کے ساتھ  
خدا کا نام لے کیا دونوں مل سکتے ہیں؟  
ثریا جب بلند ہوتا ہے تو ملک شام میں ہوتا ہے  
سہیل جب بلند ہوتا ہے تو وہ ملک یمن میں ہوتا ہے

فی البدیع اور بغیر توجہ سے کہے گئے کلام اور خاص اہتمام سے کہے گئے کلام میں اتنا زیادہ فرق اس وقت آیا جب اہل عرب کی زبان میں خرابی پیدا ہوئی، عجمی لوگ نے عرب لوگوں سے گھل مل گئے۔ جبکہ وہ خالص عرب لوگ جو سہیل سے گفتگو کرتے تھے ان کی فی البدیع اور سوچ و بچار کے بعد کبھی گئی گفتگو میں اتنا بڑا فرق نہیں ہوتا تھا۔

بلکہ خالص عربی زبان کا صرف ایک ہی طریقہ ہے اور وہ طریقہ صاف تھری فطرت سلیمہ پر مبنی ہے۔ اور کلام میں خوشنمائی کا پہلو اس وجہ سے نہیں تھا کہ دونوں اسلوب کے درمیان تذبذب کا عنصر ختم ہو سکے۔ بلکہ مختصر یہ کہ اس کی خوبصورتی کا تقاضا یہ ہے کہ وہ اپنے موضوع کے تمام پہلوؤں کا احاطہ اپنے مقصد سے دور جائے بغیر کرے۔ اور اپنے اسلوب سے باہر نہ نکلے بغیر جو کہ خود اس کی اپنی ذات سے نکلتا ہے اور اہل عرب کی طبیعت و عادت اس سے فیض حاصل کرتی ہو۔ یہ اسلوب جو اہل فن کو اپنے قول و فعل میں تنکا دیتا ہے۔ یہ تو بہت زیادہ مشقت کے بعد حاصل ہوتا ہے۔ بے شک فصیح عربی کو یہ مشقت بہت زیادہ ہوتی ہے جو اس کو خوبصورتی پیدا کرتے وقت برداشت کرنا پڑتی ہے۔ یہ اس لیے نہیں کہ اس کی کلام میں شان و شوکت اور خوبصورتی پیدا ہو بلکہ یہ اتنی مقدار میں اترتی تھی کہ وہ سمجھتا تھا کہ اس میں اترتا جا رہا ہے۔ اسی لیے عرب لوگ اپنی کلام میں جہاں کہیں تصنع اور بناوٹ کا پہلو نظر آتا اس کو مانا دیتے۔ وہ لوگ اس کو ایسی فصاحت سمجھتے ہیں جو مقصود سے غیر مقصود کی طرف لے جانے والی ہے۔

اور اس لیے نبی کریم ﷺ عرب لوگوں میں سب سے زیادہ اس قسم کے معاملہ اور تصنع سے دور تھے۔ یہاں تک کہ اس سے خود منع فرمایا اور اس کے ساتھ ہلاکت اور خسارہ کو منسلک کر دیا۔ مسلم اور ابو دؤد کی روایت پر غور و فکر کریں۔ جس سے میں نبی کریم ﷺ نے فرمایا ”ہلاک ہو گئے جھگڑا کرنے والے۔ اور کلام میں جھگڑا سے مواد ہے اس میں فصاحت اور بلاغت کے اعتبار سے غور و خویش کرنا۔ امام بخاری و مسلم نے روایت کی ہے کہ ہذیل قبیلہ کا ایک آدمی دیت کے معاملے میں جھگڑا کرنے کے لیے آیا اور کہا: اے اللہ کے رسول ﷺ ایسے شخص کی دیت کیسے ہو سکتی ہے۔ جس نے نہ بیا ہے نہ کھایا نہ بات کی ہے اور نہ کلمہ پڑھا اس جیسی بے شمار مثالیں ہیں۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا: یہ تمہارے کاہن بھائیوں میں سے ایک ہے۔ جو کافیر بند کلام کہتے ہیں۔ اور ایک روایت میں فرمایا: کافیر بند کلام جیسے اعراب کافیر بندوں میں سے ہیں اور ایک روایت میں فرمایا: جاہلیت کے اور زمانہ جاہلیت کے کاہن لوگوں کی طرح کافیر بند کلام کہنے والا ہے۔ پس آپ کو معلوم ہو چکا کہ اس قسم کی تصنع اور بناوٹ سے نبی کریم ﷺ نے منع فرمایا ہے اور اس تصنع اور بناوٹ والے شخص کو کاہن اور جاہلیت کے جہلاء میں شمار کیا ہے تو یہ انتہائی نامناسب بات ہے کہ آپ ﷺ وہی کام خود کریں جس کی مذمت بیان کریں۔ ہرگز نہیں ہرگز نہیں ایسا آپ ﷺ کبھی بھی نہیں کر سکتے۔ آپ کے سامنے سنت نبوی شریف موجود ہے۔ جہاں سے چاہیں پڑھ لیں آپ اس کو فطرت کے عین مطابق پائیں گے۔ اللہ تعالیٰ کی پناہ کہ آپ اس میں کسی قسم کا تکلف اور تصنع پائیں۔ اور قرآن مجید تو اس سے بھی اعلیٰ اور عمدہ اسلوب کا حامل ہے۔

”البدن تحقیق ہم نے قرآن کو ذکر کے لیے آسان بنا دیا پس کوئی ہے جو نصیحت پڑے۔“ (المس: ۱۷)

**دوسرا جواب** • بے شک یہ شبہ اپنی اساس کے ہی مخالف ہے جو کہ معروف ہے۔ وہ یہ کہ قرآن مجید کا کچھ حصہ اچانک بغیر انتظار اور غور فکر کے اور بغیر تدریج اور غلط ملط کیے اتارا گیا اور یہ بہت زیادہ دفعہ ہوا۔ اور اس کا کچھ حصہ ایسا ہے جو بہت انتظار کے بعد اتارا گیا اور ایسا بہت کم ہے اس سب کے باوجود اس کا اسلوب بہت ہی عمدہ ہے اور اس کی تنظیم و ترتیب، عاجز کر دینے والی ہے دونوں صورتوں میں۔ آپ اللہ تعالیٰ کے قول ﴿وَلَا تَقُولُوا لَنْ يَشَاءَ اِنَّا اِنَّ يَشَاءُ اللّٰهُ﴾ (الکہف: ۲۳-۲۴) کے سبب نزول میں ذرا غور و فکر کریں جب یہودیوں نے قریش کے لوگوں سے کہا کہ محمد ﷺ سے روح کے بارے میں سوال کریں تو انہوں نے آپ ﷺ سے سوال کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا تم میرے پاس کل آنا میں تمہیں بتاؤں گا۔ اور ان شاء اللہ نہیں کہا تو آپ ﷺ پر وحی کا نزول مؤخر کر دیا گیا یہاں تک کہ آپ ﷺ پر یہ دشوار گزارا تو اس کے جواب میں یہ آیات ان کے سوالات کے جوابات میں تقریباً چالیس دن کے بعد اتاری گئیں۔ آپ جب اس قرآن کو پڑھیں تو اس اسلوب اور قرآن کے دوسرے اسلوب جس میں فی الغور قرآن اتارا گیا ہو کوئی فرق نہیں کریں گے۔

اور یہی بات ہم حدیث کے بارے میں کہیں گے جو قرآن مجید کے بارے میں کہتے ہیں۔ پس حدیث میں کچھ حصہ ایسا ہے جو غور و فکر اور مشاورت اور بحث و جرح کے بعد بیان کی گئی جیسے کہ جنگ اور صلح کے مواقع کی احادیث ہیں۔ اور کچھ حصہ ایسی احادیث پر مشتمل ہے جو اچانک فی البدیہہ کہی گئی ہیں۔ جیسے کہ بہت زیادہ احادیث دین کے ظاہری امور کے بارے میں بیان کی گئی ہیں۔ اور کچھ حصہ ایسا ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے جبریل امین وحی لے کر حاضر ہوتے تھے جیسا کہ عمرہ کا احرام باندھتے ہوئے خوشبو لگانے والے کے بارے میں حدیث مبارک جس میں وہ شخص آیا اور نبی کریم ﷺ سے سوال کیا کہ عمرہ کے دوران خوشبو کا کیا حکم ہے تو آپ ﷺ خاموش ہو گئے یہاں تک کہ وحی نازل ہو گئی تو آپ ﷺ نے پوچھا سائل کہاں ہے جو عمرہ کے بارے میں سوال کر رہا تھا تو اس صحابی ﷺ کو بلایا گیا تو آپ ﷺ نے فرمایا:

”جو خوشبو تمہارے احرام کو لگی ہوئی ہے اس کو تین مرتبہ دھولو اور جبہ اُتار دو اور عمرہ کے اندر وہی کرو جو حج کے اندر کرتے ہو۔“

ہم اسی طرح کی مختلف کیفیات رسول ﷺ کی احادیث کے بارے میں جانتے ہیں۔ لیکن کیفیات کے مختلف ہونے کے باوجود اسلوب نبوی ﷺ میں اختلاف نہیں ہوتا بلکہ وہ ایک ہی اسلوب اور نمونہ ہے جو بشریت کا عمدہ ترین نمونہ ہے۔ پس آپ اس میں کبھی بھی کوئی خاص فرق ملاحظہ نہیں کریں گے پس اس اسلوب اور نمونہ میں جو آپ ﷺ نے فی البدیہہ اپنایا ہو اور اس اسلوب اور نمونہ میں جو آپ ﷺ نے رائے اور مشورہ کے بعد اپنایا ہو یا وہ اسلوب جو وحی کی صورت میں اپنایا گیا ہو کسی قسم کا کوئی فرق نہیں ہے۔ اور نہ ان احادیث میں کوئی فرق ہے جو آپ ﷺ نے اہتمام کے ساتھ قابل ذکر اقدامات اور قابل احترام جگہوں پر بیان فرمائیں۔

پس یہ دونوں ایک دوسرے سے ملتی جلتی قسمیں ہیں ان میں کوئی التباس نہیں ہے قرآن مجید پورے کا پورا ایک قسم ہے اور حدیث ایک قسم ہے۔ ان دونوں میں سے ہر ایک کا اثر اور بیان اور عالی مرتبہ ہونے میں ایک دوسرے سے ایک درجہ بلند ہے۔ ان

کے درمیان اس طرح فرق ہے جس طرح خالق اور مخلوق کے درمیان فرق ہے۔ اور اس طرح فرق سے جس طرح آقا اور غلام کے درمیان فرق۔ پس قرآن مجید خاص قسم کی بلاغت کے اعتبار سے اور بے مثال انداز بیان کی وجہ سے ممتاز ہے۔ قرآن مجید کسی ایک باب میں بھی کسی قسم کا کوئی التباس اپنے علاوہ کسی دوسرے کے ساتھ پیدا نہیں ہونے دیتا۔ اور قرآن مجید کسی کو یہ موقع نہیں دیتا کہ وہ اس کا مقابلہ کرے یا اس کی محفوظ حد بندی کے قریب منڈلائے بھی۔ بلکہ جس نے اس کے ساتھ جھگڑا کیا تو اس کے ساتھ جھگڑا کیا گیا اور جو اس کے مقابلے میں کھڑا ہوا اس کو مقصد پورا کیے بغیر ناکام کیا گیا۔ اور جس نے اس کے ساتھ جنگ کی اس کو ہزیمت کا سامنا ہوا بہر حال حدیث شریف اگرچہ فصاحت کے آسمان پر چھائی ہوئی ہے اور اسلوب عرب پر چھائی ہوئی ہے لیکن پھر بھی یہ عبودیت کی زمین پر ہے جو کہ معجزہ کے آسمان تک نہیں پہنچ سکتی۔ آپ ﷺ کے بعض خاص صحابہ رضی اللہ عنہم کے اسلوب میں مشابہت موجود ہے۔ اس کے اور عرب کے علم و معرفت کے درمیان بہت قریبی تعلق اور بہت تھوڑا ابہام ہے۔

برعکس قرآن مجید کے کہ اس میں ایسا نہیں ہے اس کی طرح کوئی چیز نہیں ہے جو اس طرح بیان کرے۔ کیونکہ وہ کلام ہی ایسا ہے جس کی کوئی مثال نہیں۔

”اور بادشاہوں کا کلام بھی کلاموں کا بادشاہ ہوتا ہے۔“

کلام الملوك ملوك الكلام



## ترتیب نزولی کے اعتبار سے قرآن مجید کی پہلی اور آخری آیات

اس باب میں اس بحث کو مفصلاً ذکر کیا جائے گا کہ قرآن مجید کی کون سی آیات سب سے پہلے نازل ہوئیں اور سب سے آخر میں نازل ہونے والی آیات کون سی ہیں۔ یاد رہے یہ بحث ایسی ہے کہ ہم اس میں اپنی عقل سے کوئی بات نہیں کہہ سکتے بلکہ یہ بحث اول تا آخر نقل و توقیف پر مبنی ہے۔ ہاں اتنا ضرور ہے کہ ہم دلائل میں راجح اور مرجوح کی وضاحت کر سکتے ہیں یا بعض روایات میں بظاہر پائے جانے والے تعارض میں جمع و تطبیق کر سکتے ہیں۔

قرآن مجید کی ترتیب نزولی کے اعتبار سے پہلی اور آخری آیات یا ناخ و منسوخ آیات کا جاننا بہت مفید علوم سے متعلق ہے۔ مثلاً اگر کسی ایک موضوع پر دو یا دو سے زائد آیات موجود ہوں تو جب تک آپ کو ان میں سے ناخ اور منسوخ کا علم نہیں ہوگا اس وقت تک آپ کسی حتمی فیصلے پر نہیں پہنچ سکتے۔ (اور ناخ و منسوخ کا علم ترتیب نزولی کے علم پر موقوف ہے کیونکہ ظاہر بات ہے کہ بعد میں نازل ہونے والی آیات ہی پہلے نازل شدہ آیات کے لیے ناخ بن سکتی ہیں۔)

تاریخ اسلامی سے واقفیت بھی بہت اہمیت کی حامل ہے۔ کیونکہ بہت سے مسائل صرف احکام کے مشروع ہونے کی تواریخ کے معلوم ہو جانے سے ہی حل ہو جاتے ہیں۔ نیز مقصود تک پہنچنے کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ اسلامی حکمت عملی کو جاننا جائے کہ لوگوں کے ساتھ کس موقع پر نرمی اور شفقت کا رویہ روا رکھنا چاہیے اور کس وقت ان میں سے رذائل کو ختم کرنے کے لیے سخت رویہ اختیار کرنا چاہیے۔ قرآن مجید کی نزولی اعتبار سے پہلی و آخری آیات کے بارے میں پڑھنے سے یہ بات بھی مزید واضح ہو جاتی ہے کہ قرآن اور اس میں بیان کردہ علوم کس قدر وسیع ہیں۔ ان علوم کے کنارے مشرق و مغرب کو بھی عبور کر رہے ہیں۔ اور یہ ہی احساسات اس وقت پیدا ہوتے ہیں جب ہم قرآن کریم کی کمی، مدنی، سفری یا حضری آیات کی مباحث پڑھتے ہیں۔ نیز یہ مباحث اس بات کی منہ بولتی شواہد ہیں کہ اللہ کا کلام تغیر و تبدل سے پاک ہے، تب ہی تو آج تک اس کی ایک ایک چیز مختلف زاویوں سے محفوظ ہے۔

﴿لَا تَبْدِيلَ لِكَلِمَاتِ اللَّهِ ۚ ذَٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ﴾ (یونس: ۶۳)

”خدا کی باتیں بدلتی نہیں۔ یہی تو بڑی کامیابی ہے۔“

ہم اس باب میں ہر ایک آیت کی ترتیب نزولی بیان نہیں کریں گے کہ فلاں آیت کس سے پہلے اور کس کے بعد نازل ہوئی۔ بلکہ ہم تو اس باب میں صرف یہ بیان کریں گے کہ علی الاطلاق سب سے پہلے اور سب سے آخر میں کون سی آیات نازل ہوئیں۔ اگر ایک ایک آیت کو تفصیلاً بیان کیا جائے تو اس میں بہت سادقت اور جدو جہد صرف ہوگی۔ بلکہ یہ تو ایک الگ تالیف بن جائے گی۔ نیز اس کو اس قدر تفصیل سے بیان کرنا ہمارا موضوع بھی نہیں ہے۔ ہم تو اس بحث یا باب میں آسانی کی خاطر صرف دو امور کو بیان کریں گے۔



مناب العرفان فی علوم القرآن: جلد ①

پہلا امر ۴ قرآن مجید کی علی الاطلاق یعنی مطلقاً سب سے پہلے اور سب سے آخر میں نازل ہونے والی آیات۔ اور یہی ہمارا ہم مقصد ہے۔

دوسرا امر ۵ بعض شرعی احکام میں نازل ہونے والی پہلی اور آخری آیات۔ یعنی اس باب میں دوسرا امر یہ بیان کیا گیا ہے کہ بعض شرعی احکام مثلاً شراب اور جہاد سے متعلق چند اداکُل و اواخر آیات کون سی ہیں۔ ان کو نمونہ کے طور پر بیان کیا ہے۔

### مطلقاً سب سے پہلے نازل ہونے والی آیات

اس بارے میں چار اقوال ہیں:

سورۃ العلق کی پہلی پانچ آیات سب سے پہلے نازل ہوئیں۔ وہ آیات یہ ہے۔

پہلا قول ﴿اقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ ۝ خَلَقَ الْإِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۝ اقْرَأْ وَرَبُّكَ الْأَكْرَمُ ۝ الَّذِي عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ۝ عَلَّمَ الْإِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ﴾ (علق: ۱-۵)

”پڑھیے اپنے رب کے نام سے جس نے پیدا کیا۔ پیدا کیا انسان کو جنہ ہوئے خون سے۔ پڑھیے اور آپ کا رب سب سے زیادہ عزت والا ہے۔ وہ رب جس نے قلم کے ذریعے علم سکھایا۔ انسان کو وہ کچھ سکھایا جو وہ نہیں جانتا تھا۔“

یہ قول تمام اقوال میں صحیح ترین ہے۔ اس کے دلائل ذیل میں مذکور ہیں۔

① دلیل ۴ امام بخاری رضی اللہ عنہما اور امام مسلم رضی اللہ عنہما روایت فرماتے ہیں۔ (یعنی یہ حدیث متفق علیہ ہے)

ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے فرماتی ہیں کہ آنحضرت ﷺ پر نزول وحی کی ابتدا تو سچے خوابوں سے ہوئی تھی آپ ﷺ رات میں جو خواب دیکھتے وہ ایسے پورا ہوتا جیسا صبح کی روشنی میں کوئی ریب و شک نہیں ہوتا۔ اس کے بعد آپ ﷺ کو خلوت میں عبادت کرنے کا شوق پیدا ہوا۔ اور آپ ﷺ نے غار حرا میں خلوت نشینی اختیار فرمائی اور کئی کئی دن اور رات وہاں مسلسل عبادت اور یاد الہی و ذکر و فکر میں مشغول رہتے، جب تک گھر آنے کو دل نہ چاہتا تو شہراہ لیے ہوئے وہاں رہتے۔ تو شہر ختم ہونے پر ہی الہیہ محترمہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے پاس تشریف لاتے اور کچھ تو شہراہ لے کر پھر وہاں جا کر خلوت گزین ہو جاتے۔ یہ ہی طریقہ جاری رہا یہاں تک کہ آپ ﷺ پر حق منکشف ہو گیا اور آپ ﷺ غار حرا ہی میں قیام فرماتے کہ اچانک حضرت جبریل علیہ السلام آپ ﷺ کے پاس حاضر ہوئے اور کہنے لگے کہ اے محمد ﷺ! پڑھیے! آپ ﷺ فرماتے ہیں کہ میں نے کہا کہ میں پڑھنا نہیں جانتا۔ آپ ﷺ فرماتے ہیں کہ فرشتے نے مجھے پکڑ کر اتنے زور سے بھیجا کہ میری طاقت جواب دے گئی؟ پھر مجھے چھوڑ کر کہا کہ پڑھیے! میں نے پھر وہی جواب دیا کہ میں پڑھا ہوا نہیں ہوں۔ حضرت جبریل علیہ السلام نے مجھ کو نہایت ہی زور سے بھیجا کہ مجھ کو سخت تکلیف محسوس ہوئی۔ پھر انھوں نے کہا کہ پڑھیے! میں نے کہا میں پڑھا ہوا نہیں ہوں۔ حضرت جبریل علیہ السلام نے مجھے تیسری مرتبہ پکڑ کر بھیجا اور چھوڑ دیا اور کہنے لگے کہ پڑھیے اپنے رب کے نام کی مدد سے جس نے پیدا کیا اور انسان کو خون کی پھسکی سے پیدا کیا۔ پڑھیے اور آپ کا رب بہت ہی مہربانیاں کرنے والا ہے۔ پس یہی آیات آپ ﷺ حضرت جبریل علیہ السلام سے سن کر اس حال میں غار حرا سے واپس ہوئے کہ آپ کا دل اس انوکھے واقعے سے کانپ رہا تھا۔ آپ ﷺ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے ہاں تشریف لائے اور

فرمایا کہ مجھے کبیل اڑھا دو، مجھے کبیل اڑھا دو۔ گھر والوں نے کبیل اڑھا دیا۔ جب آپ ﷺ کا ڈرجا تارہا تو آپ ﷺ نے اپنی زوجہ محترمہ حضرت خدیجہ بنتیہؓ کو تفصیل سے یہ واقعہ سنایا۔

یہ ایک طویل حدیث ہے جس میں سے ایک حصہ یہاں نقل کر دیا گیا ہے۔ بعض روایات کے مطابق حضرت جبرئیل علیہ السلام نے پوری پانچ آیات حضور اکرم ﷺ کو پڑھائی تھیں۔

حدیث میں ”فلق الصبح“ صبح کی روشنی سے مراد ہے ((الَّتَحْتُنْتُ)) سے عبادت مراد ہے۔ اصل میں تحت، ترک تحت، ترک تخت کہتے ہیں۔ (تخت کا مطلب ہے: معاصی سے نفرت و بعد) یہ صیغہ دلالت کرتا ہے غلوت نشینی اختیار کرنے پر اس کی نظیر نماز تہجد میں ملتی ہے۔ نیز تَأْتُكُمْ (خود کو گناہ گار سمجھنا) اور تَحْرُج (پرہیزگاری اختیار کرنا) بھی اس کی مثالیں ہیں۔ حدیث میں لفظ ”عَظْمِي“ آیا ہے۔ یہ عین کے فقرہ اور طاء کی تشدید کے ساتھ ہے اور طاء پر بھی فتح ہے۔ مطلب اس کا سختی کے ساتھ بھیجے اور دبانے کے ہیں۔ اتنی سختی کے سانس رکنے کے قریب ہو جائے۔ حدیث میں ”الجهد“ کا لفظ آیا ہے۔ اس کو جہم کے فقرہ اور ضمہ دونوں کے ساتھ پڑھ سکتے ہیں۔ فقرہ کی صورت میں مطلب ہوگا طاقت کے اندر اندر مشقت ڈالنا جبکہ ضمہ کی صورت میں معنی ہوگا کہ اتنی مشقت ڈالنا کہ آدمی کی طاقت سے باہر ہو جائے۔ ضمہ اور فتح والی دونوں ہی روایتیں درست ہیں۔

① دلیل • حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں:

أَوَّلُ سُورَةٍ نَزَلَتْ مِنَ الْقُرْآنِ ﴿إِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ﴾ (العلق:۱)

”قرآن مجید کی سب سے پہلے نازل ہونے والی سورہ اترآء ﴿إِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي﴾ ہے۔

امام حاکم رحمہ اللہ نے اپنی مستدرک الجامع اور امام بیہقی رحمہ اللہ نے اپنی کتاب دلائل الکبریٰ میں اس حدیث کو صحیح قرار دیا ہے۔

② دلیل • حضرت ابورجاء العطار دی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ ہمیں پڑھاتے تھے، ہم حلقوں کی شکل میں بیٹھے ہوتے تھے آپ ﷺ پر سفید رنگ کی دو چادریں ہوتی تھیں جب آپ ﷺ سورۃ العلق کی تلاوت کرتے تو فرماتے:

((هَذِهِ أَوَّلُ سُورَةٍ نَزَلَتْ عَلَى مُحَمَّدٍ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ)).

”یہ وہ سورت ہے جو حضور اکرم ﷺ پر سب سے پہلے نازل ہوئی تھی۔“

اس حدیث کو طبرانی رحمہ اللہ نے الکبیر میں نقل کیا ہے اور اس پر صحیح ہونے کا حکم لگایا ہے۔ نیز امام حاکم رحمہ اللہ، امام ابو نعیم رحمہ اللہ نے ”الحلیۃ“ میں اور امام فاکھی رحمہ اللہ نے ”اخبار مکہ“ میں اس حدیث کو صحیح قرار دیا ہے۔

③ دلیل • ان آیات کے بارے میں آثار سے بھی تائید ہوتی ہے اگرچہ بعض آثار میں الفاظ کی کچھ کمی زیادتی ملتی ہے جیسا کہ امام زہری رحمہ اللہ سے روایت ہے:

حضور اکرم ﷺ غار حرا میں عبادت میں مصروف تھے کہ اچانک ایک فرشتہ (حضرت جبرئیل علیہ السلام) تشریف لائے آپ ﷺ کے ہاتھ میں ریشم کے کپڑے کا ایک ٹکڑا تھا جس میں سورۃ العلق کی پہلی پانچ آیات یعنی:

﴿إِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ﴾ ... عَلَّمَ الْإِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ﴾

لکھی ہوئی تھیں۔

حدیث کے متن میں ”الکتبُط“ کا لفظ مذکور ہے۔ اس کے نون اور میم پر فتح ہے۔ معنی ہے کپڑا۔ اور ”الکتبُطیاج“ کا مطلب ہے ریشم۔

مطلقاً سب سے پہلے نازل ہونے والی آیت سورۃ المدثر کی پہلی آیت ہے یعنی:

﴿يَا أَيُّهَا الْمَدَّثِيُّ ﴿۱﴾﴾ (المدثر: ۱)

جو حضرات اس قول کے حامی ہیں وہ اس درج ذیل حدیث کو دلیل بناتے ہیں جس کو امام بخاری و امام مسلم رحمہما نے اپنی صحیح میں روایت کیا ہے:

حضرت ابوسلمہ بن عبدالرحمن بن عوف فرماتے ہیں: میں نے حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما سے پوچھا:

((أَتَى الْقُرْآنُ أَنْزَلَ قَبْلَ؟))

”قرآن مجید کا سب سے پہلے کون سا حصہ نازل ہوا؟“

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما نے فرمایا: ﴿يَا أَيُّهَا الْمَدَّثِيُّ ﴿۱﴾﴾ (المدثر: ۱)

میں نے حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما سے عرض کیا: ﴿يَا أَيُّهَا الْمَدَّثِيُّ ﴿۱﴾﴾ یا ﴿إِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ﴾؟

انہوں نے جواب دیا: ((أَحَدُكُمْ مَا حَدَّثَنَا بِهِ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ)) یعنی میں تمہارے سامنے وہ ہی حدیث بیان کر رہا ہوں جو میں نے حضور اکرم ﷺ سے سنی ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا تھا کہ میں غار حرا میں مقیم تھا جب میں نے اپنے قیام کی مدت پوری کی اور آتر کر میدان کے درمیان پہنچا تو میں نے (آواز سن کر) آگے پیچھے اور دائیں بائیں دیکھا۔ پھر جب میں نے اوپر دیکھا تو اچانک دیکھا کہ وہی تھا یعنی جبرئیل علیہ السلام۔ پس مجھ پر کچھی طاری ہو گئی۔ (ایک روایت میں ہے) میں نے دیکھا جبرئیل علیہ السلام آسمان وزمین کے درمیان ایک تخت پر بیٹھے ہوئے ہیں۔ یہ دیکھ کر مجھ پر (زعب کی وجہ سے) کچھی طاری ہو گئی۔ میں خدیجہ رضی اللہ عنہا کے پاس آیا اور انھیں کہا کہ مجھے کھیل اڑھا دو (انہوں نے مجھے کھیل اڑھا دیا) اُس وقت اللہ تعالیٰ نے یہ آیات یعنی ﴿يَا أَيُّهَا الْمَدَّثِيُّ ﴿۱﴾﴾ فَمَنْ قَانَ ﴿۲﴾﴾ (المدثر: ۲، ۱) نازل فرمائیں۔ ①

لیکن یہ روایت قرآن مجید کی مطلقاً سب سے پہلے نازل ہونے والی آیات کے لیے نص ثابت نہیں ہو سکتی کیونکہ اس میں یہ احتمال ہے کہ شاید یہ فترۃ الوحی کے بعد سب سے پہلے نازل ہونے والی آیات کے بارے میں ہو۔ اور یہ احتمال ہی زیادہ قوی محسوس ہوتا ہے کیونکہ حضرات شیخین (امام بخاری رضی اللہ عنہما و امام مسلم رضی اللہ عنہما) نے اس حدیث کے بعد اور بھی احادیث روایت کی ہیں مثلاً حضرت ابوسلمہ رضی اللہ عنہما نے حضرت جابر رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہیں جس میں الفاظ کچھ یوں ہیں:

”میں اسی دوران چلتا جا رہا تھا کہ آسمان سے اچانک میں نے ایک آواز سنی۔ میں نے آسمان کی طرف نگاہ اٹھا کر دیکھا تو وہی فرشتہ تھا جو میرے پاس غار حرا میں آیا تھا اب وہ زمین و آسمان کے درمیان میں ایک کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ (اُس کو دیکھ کر

① صحیح البخاری، صحیح مسلم، مسند امام احمد

زعب کی وجہ سے) میرا جسم بوجھ کی وجہ سے اتنا ثقیل ہو گیا کہ میں زمین پر گرنے لگا۔ پس میں اپنے گھروالوں کے پاس آیا اور کہا: مجھے کبل اوڑھا دو۔ مجھے کبل اوڑھا دو۔ (گھروالوں نے کبل اوڑھا دیا) پس اُس وقت اللہ نے یہ پانچ آیات:

﴿يَا أَيُّهَا الْمَدْيَنِيُّ قُمْ فَأَنْذِرْ لِرَبِّكَ فَاذْبُرْ ۖ وَرَبِّكَ فَكَذِبْ ۖ وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ ۖ وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ ۖ﴾ (المدثر: ۱-۵)

نازل فرمائیں۔

حضرت ابوسلمہ رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: ”الرُّجْزُ“ سے بت مراد ہیں۔

میں کہتا ہوں: مندرجہ بالا حدیث میں آنے والا لفظ ”جشٹُت“ بروزن ”قِرْحُتُ“ ہے۔ اور مطلب اس کا یہ ہے کہ میرا جسم بوجھ کی وجہ سے کھڑے ہونے سے قاصر ہو گیا۔ بوجھ کی وجہ اصل میں حضور اکرم ﷺ کا گھبرانا اور پریشان ہو جانا تھا۔

بظاہر یہ روایت دلالت کرتی ہے اس بات پر کہ حضرت جابر رضی اللہ عنہما نے اپنی روایت سے قرآن مجید کی مطلقاً پہلے نازل ہونے والی آیات پر استدلال کر رہے ہیں۔ اصل میں حضرت جابر رضی اللہ عنہما نے حضور اکرم ﷺ سے جو سنا وہ اس کو بیان کر رہے ہیں۔ اور حقیقت میں حضور اکرم ﷺ نے ایسا ہی فرمایا تھا لیکن یہ واقعہ فترۃ الوحی کے بعد کا ہے جیسا کہ اس حدیث میں بھی الفاظ موجود ہیں کہ: ”میں نے آسمان کی طرف نگاہ اٹھا کر دیکھا تو وہی فرشتہ تھا جو میرے پاس فارحرا میں آیا تھا۔“

حضرت جابر رضی اللہ عنہما حضور اکرم ﷺ سے خود سنی ہوئی بات پر ہی اکتفا فرما رہے ہو گیا کہ وہ اجتہاد کر رہے ہیں۔ مگر وہ دلائل جو ہم نے ”پہلے قول“ کے ضمن میں بیان کیے ہیں، نص ہیں اور نص کے مقابلے میں اجتہاد معتبر نہیں ہوتا۔ لہذا حضرت جابر رضی اللہ عنہما کا استدلال ساقط ہو جائے گا اور دوسرا قول یعنی سورۃ المدثر کی آیات مطلقاً سب سے پہلے نازل ہونے والی آیات ہیں، بھی باطل ہو جائے گا۔ اور پہلا قول ہی ثابت رہے گا۔

مطلقاً سب سے پہلے نازل ہونے والی آیات سورۃ الفاتحہ کی تمام آیات ہیں۔

**تیسرا قول** جو حضرات اس قول کے حق میں ہیں وہ اس مندرجہ ذیل حدیث سے استدلال کرتے ہیں جس کو امام بیہقی رضی اللہ عنہما نے ”الدلائل“ میں حضرت میسرہ عمر بن شرحبیل کی سند سے روایت کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہما سے فرمایا:

اے خدیجہ رضی اللہ عنہما! جب میں تنہائی میں ہوتا ہوں تو مجھے ایک آواز سنائی دیتی ہے۔ پس اللہ کی قسم میں اپنی جان کے بارے میں خطرے میں مبتلا ہوں کہ کہیں کچھ ہونہ جائے۔ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہما نے عرض کیا: اللہ کی پناہ! اللہ تعالیٰ آپ کو ہرگز ایسا کچھ (ناگوار معاملہ) نہیں فرمائیں گے۔ آپ ﷺ تو لوگوں کی امانتوں کو ٹھیک ٹھیک طریقے سے ادا کرتے ہیں، صلہ رحمی کرتے ہیں، سچی بات بولتے ہیں۔ (تھوڑی دیر بعد) حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہما حاضر ہوئے تو اُم المومنین حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہما نے ابو بکر رضی اللہ عنہما سے حضور اکرم ﷺ کی ساری بات کہی اور فرمایا: اے ابو بکر رضی اللہ عنہما آپ آنحضرت ﷺ کے ساتھ (میرے چچا زاد بھائی) ورقہ بن نوفل کے پاس چلے جائیں۔

حضور اکرم ﷺ اور حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہما ورقہ بن نوفل کے پاس گئے۔ حضور اکرم ﷺ نے ورقہ بن نوفل کو سارا قصہ تفصیل سے سنایا کہ:

”جب میں تنہا ہوتا ہوں تو مجھے کوئی ”یا محمد!“ ”یا محمد!“ کہہ کر پکارتا ہے۔ میں خوف کی وجہ سے اُس جگہ سے کہیں دور چلا جاتا ہوں۔“  
ورقہ بن نوفل نے کہا: اب آپ ایسا مت کرنا بلکہ وہیں کھڑے رہنا اور غور سے سننا کہ وہ کیا کہتا ہے۔ پھر مجھے آکر ساری بات بتانا۔

چنانچہ حضور اکرم ﷺ نے ایسا ہی کیا۔ جب آپ ﷺ تنہائی میں تھے تو آپ کو آواز آئی:  
یا محمد قُل:

﴿بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ اَلْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ ۝ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝ مٰلِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ ۝ اِنَّکَ عَبْدٌ  
وَ اِنَّکَ سَعْدِیْقٌ ۝ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ ۝ صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْهِمْ ۝ غَیْرِ الْمَغضُوْبِ عَلَیْهِمْ وَ لَا  
الصَّالِیْنِ ۝ اٰمِیْنُ﴾ (الفاتحہ: ۱-۷)

لیکن یہ حدیث سورۃ الفاتحہ کی آیات کے مطلقاً سب سے پہلے نازل ہونے پر دلالت کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتی۔ اس کی  
دو وجہیں ہیں۔

**پہلی وجہ**؟ میں یا وحی اور نبوت کے ابتدائی دور میں نازل ہوئی۔ بلکہ اس سے تو یہ مفہوم ہو رہا ہے کہ سورۃ الفاتحہ غارِ حرا  
کے ابتدائی دور میں نہیں بلکہ بعد والے دور میں نازل ہوئی۔ نیز آنحضرت ﷺ نے وہ غیبی آواز متعدد مرتبہ سنی ہے۔ لہذا اس حدیث  
کی بنیاد پر وثوق کے ساتھ نہیں کیا جاسکتا کہ سورۃ الفاتحہ مطلقاً نازل ہونے والی پہلی سورت یا آیات ہیں۔

**دوسری وجہ**؟ یہ حدیث ”حدیث مرسل“ ہے۔ اس کی سند میں ایک صحابی ساقط ہیں۔ لہذا یہ حدیث حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی  
حدیث (پہلے قول میں مذکور ہے) کے مقابلے میں پیش نہیں کی جاسکتی۔ کیونکہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث  
”حدیث مرفوع“ ہے، اس کی سند آنحضرت ﷺ تک متصل ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث قوی ہے جب کہ یہ قوی نہیں۔ لہذا  
مطلقاً سب سے پہلے نازل ہونے والی آیات کے باب میں تیسرا قول بھی باطل ہو جائے گا اور پہلا قول ہی ثابت رہے گا۔

**چوتھا قول**؟ مطلقاً سب سے پہلے نازل ہونے والی آیت ہے:  
﴿بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ﴾

اس قول کے قائلین مندرجہ ذیل روایت سے استدلال کرتے ہیں جسے امام الواحدی نے حضرات عکرمہ اور حسن رضی اللہ عنہما کی سند  
کے ساتھ نقل کیا ہے۔ یہ دونوں حضرات فرماتے ہیں:

”سب سے پہلے نازل ہونے والی آیت ﴿بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ﴾ ہے اور سب سے پہلے نازل ہونے والی سورت  
”سورۃ العلق“ ہے۔“

لیکن اس روایت سے استدلال بھی دو وجہ سے باطل ہے۔

**پہلی وجہ**؟ پہلی وجہ تو وہی جو تیسرا قول رد ہونے کی پہلی وجہ تھی کہ یہ حدیث مرسل ہے جبکہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث  
مرفوع ہے۔ پس یہ اس کے مقابلے میں نہیں آسکتی۔

﴿يَسْمِعُ اللَّهُ الرَّخْمَنُ الرَّحِيمُ﴾ ایک مستقل آیت کے طور پر نازل نہیں ہوئی بلکہ یہ سورۃ العلق تو کیا ہر سورۃ کی ابتداء میں اس کے ساتھ نازل ہوئی تھی۔ جو کہ اس بات کی علامت بھی ہوتی تھی کہ یہ سورۃ یہاں سے شروع ہو رہی ہے۔ پس اس لیے سورۃ العلق کی ابتداء میں اگر اس کا نازل ہونا مان بھی لیا جائے تو اس سے یہ بات ہرگز ثابت نہیں ہوتی کہ ﴿يَسْمِعُ اللَّهُ الرَّخْمَنُ الرَّحِيمُ﴾ مستقلاً اور مطلقاً نازل ہونے والی سب سے پہلی آیت ہے۔

## مطلقاً سب سے آخر میں نازل ہونے والی آیات

قرآن مجید کی علی الاطلاق سب سے آخر میں کون سی آیات نازل ہوئیں؟ اس بارے میں علمائے کرام کا اختلاف ہے۔ اس بارے میں آنحضرت ﷺ تک متصل کوئی مرفوع حدیث نہیں ملتی بلکہ تمام علمائے کرام آثار کی بنیاد پر آخری آیت کی تعیین کی کوشش کرتے ہیں اسی وجہ سے اس باب میں اشتباہ پیدا ہوا اور بہت سے مختلف اقوال وجود میں آئے۔ ذیل میں دس مختلف اقوال لکھے جا رہے ہیں۔

**پہلا قول** ﴿وَأَتَقُوا أَيَّامًا تُرْجَعُونَ فِيهِ إِلَى اللَّهِ ۖ تَتْلُو تُو فِي كُلِّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ﴾ (البقرۃ: ۲۸۱)  
”اور اس دن سے ڈرو جبکہ تم اللہ کے حضور میں لوٹ کر جاؤ گے اور ہر شخص اپنے اعمال کا پورا پورا بدلہ پائے گا اور کسی کا کچھ نقصان نہ ہوگا۔“

امام نسائی رضی اللہ عنہما حضرت عکرمہ بن ابی عباس کے طریق سے نقل کرتے ہیں کہ مندرجہ بالا آیت قرآن مجید کی نازل ہونے والی علی الاطلاق آخری آیت ہے۔

اسی طرح علامہ ابن ابی حاتم رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: پورے قرآن مجید میں سے سب سے آخر میں نازل ہونے والی آیت ﴿وَأَتَقُوا أَيَّامًا تُرْجَعُونَ فِيهِ إِلَى اللَّهِ ۖ...﴾ ہے۔ اس آیت کے نازل ہونے کے بعد حضور اکرم ﷺ صرف نورانی بقید حیات رہے جس کے بعد پیر کی رات کو جبکہ ماہ ربیع الاول کی دو راتیں گزر چکی تھیں آپ ﷺ کا وصال ہو گیا۔

**دوسرا قول** امام بخاری رضی اللہ عنہما نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے اور امام بیہقی رضی اللہ عنہ نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ قرآن مجید کی سب سے آخری آیت سورۃ البقرۃ کی آیت نمبر ۲۷۸ ہے یعنی:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَذَرُوا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبَا إِن كُنتُمْ مُّؤْمِنِينَ﴾ (البقرۃ: ۲۷۸)  
”مومنو! اللہ سے ڈرو اور اگر ایمان رکھتے ہو تو جتنا سود باقی رہ گیا ہے اس کو چھوڑ دو۔“

**تیسرا قول** ”آیۃ الدین“ ابن جریر حضرت سعید بن السیب سے روایت کرتے ہیں آیۃ الدین (مندرجہ ذیل آیت) عرش سے نازل ہونے والی آخری آیت ہے۔

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا تَدَايَنْتُمْ بِعَيْنٍ إِلَىٰ آجَلٍ مُّسَمًّى فَاكْتُبُوهُ ۚ... وَاللَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ﴾ (البقرۃ: ۲۸۲)





”مومنو! جب تم آپس میں کسی میعادِ عین کے لیے قرض کا معاملہ کرنے لگو تو اس کو کھل لیا کرو.... اور اللہ ہر چیز سے واقف ہے۔“

علامہ عبید بن ریحان ابن شہاب زہری رضی اللہ عنہ سے الفضائل میں نقل کرتے ہیں:

(آخر القرآن عهدًا بالعرش آية الربا وآية الدين).

”عرش سے سب آخر میں نازل ہونے والی آیات قرآنیہ ”آیت الربا“ اور ”آیت الدین“ ہیں۔“

تطبیق پہلے قول کے مطابق آخری آیت سورة البقرة کی آیت نمبر ۲۸۱ ہے جبکہ دوسرے قول کے مطابق سورة البقرة ہی کی آیت نمبر ۲۷۸ اور تیسرے قول کے مطابق آیت نمبر ۲۸۲ ہے۔ ان تینوں اقوال میں تطبیق ممکن ہے جیسا کہ

علامہ جلال الدین السیوطی رضی اللہ عنہ نے کہا کہ یہ تینوں آیات ایک ساتھ ہی نازل ہوئی تھیں جیسا کہ مصاحف میں ترتیب سے لکھی ہوئی ہیں۔  
تو جس راوی نے ان تینوں آیات میں سے جس کو آخری سمجھا اُس کا آخری ہونا بیان کر دیا۔

مختصر یہ کہ سورة البقرة کی آیت ۲۷۸ سے ۲۸۲ تک پانچ آیات آخر میں نازل ہوئی تھیں جو ربا اور دین سے متعلق ہیں۔  
درمیان میں ﴿وَ اتَّقُوا يَوْمًا تُرْجَعُونَ فِيهِ إِلَى اللَّهِ﴾ چونکہ آیات الربا کے اختتام اور آیت الدین کی ابتداء میں آئی ہے اس لیے اس کا ذکر الگ بھی کر دیا گیا۔

میں کہتا ہوں کہ تینوں آیات یا اقوال میں سے ﴿وَ اتَّقُوا يَوْمًا تُرْجَعُونَ فِيهِ إِلَى اللَّهِ﴾ ہی کو آخری آیت تسلیم کرنے پر دل مطمئن ہوتا ہے کیونکہ اس آیت میں وحی کے اختتام کی طرف اشارہ ہے یاں طور پر کہ اس میں قیامت کے دن کی تیاری کا حکم دیا جا رہا ہے۔ روز آخرت کی تیاری پر ابھارا جا رہا ہے۔ اُس روز کسی بھی قسم کی زیادتی و ظلم کے نہ ہونے کا پیغام دیا جا رہا ہے۔ لہذا یہ آیت ہی اختتامی آیت کہلانے کی زیادہ حقدار ہے کیونکہ اس سے متصل پہلے ربا اور دین سے متعلق احکام والی آیات نازل ہو چکی تھیں۔

نیز ابن ابی حاتم والی روایت اس معاملے میں نص ہے کیونکہ اس روایت میں وضاحت کے ساتھ مذکور ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ﴿وَ اتَّقُوا يَوْمًا تُرْجَعُونَ فِيهِ إِلَى اللَّهِ﴾ والی آیت کے نزول کے بعد صرف نوراتیں بقید حیات رہے۔ اس طرح کی کوئی بھی نص باقی دو آیات / اقوال کے ساتھ مؤید نہیں ہے۔

چوتھا قول ابن مردودہ، مجاہد سے اور مجاہد حضرت ام المومنین ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت کرتے ہیں کہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ قرآن مجید کی سب سے آخر میں نازل ہونے والی سورة آل عمران کی آیت نمبر ۱۹۵ ہے۔ یعنی:

﴿فَاسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ أَنِّي لَا أُضِيعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِنْكُمْ مِنْ ذَكَرٍ أَوْ نَافِلٍ﴾ (آل عمران: ۱۹۵)

”تو ان کے پروردگار نے ان کی دعا قبول کر لی (اور فرمایا) کہ میں کسی عمل کرنے والے کے عمل کو مردہو یا عورت ضائع نہیں کرتا۔“  
اگر اس روایت سے متعلق مکمل واقعہ پڑھ لیا جائے تو اس قول کو رد کرنا بہت آسان ہو جائے گا۔ مکمل واقعہ یہ ہے کہ ایک مرتبہ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں ہمیشہ مردوں کا ذکر کرتے ہیں۔ عورتوں کا ذکر نہیں کرتے تو اس موقع پر اللہ تعالیٰ نے ایک یہ آیت نازل فرمائی:

﴿وَلَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللَّهُ بِهِ بَعْضَكُمْ عَلَى بَعْضٍ﴾ (النساء: ۳۲)

”اور جس چیز میں اللہ نے تم میں سے بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے۔“  
پھر اس کے بعد درج ذیل آیت نازل فرمائی:

﴿إِنَّ الْمُسْلِمِينَ وَالْمُسْلِمَاتِ...﴾ الخ ﴿الاحزاب: ۲۵﴾

”(جو لوگ اللہ کے آگے سراطعت خم کرنے والے ہیں یعنی) مسلمان مرد اور مسلمان عورتیں... الخ۔“

پھر اس کے بعد یہی آیت یعنی ﴿فَأَسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ أَنِّي لَا أُضِيعُ...﴾ الخ سب سے آخر میں نازل فرمائی۔  
مکمل واقعہ پڑھنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے اس واقعہ میں، نازل ہونے والی مطلقاً آخری آیت کی نشاندہی نہیں کی بلکہ یہ وضاحت کی ہے کہ پہلے اللہ تعالیٰ صرف مردوں کے ذکر والی آیات نازل کرتے تھے لیکن حضور اکرم ﷺ سے درخواست کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے اوپر والی تین آیات نازل فرمائیں اور ﴿فَأَسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ﴾ والی آیت ان نازل کردہ تینوں آیات میں آخری آیت تھی۔ یا پھر پہلے خاص طور پر مردوں ہی کے بارے میں قرآن مجید کا نزول ہوتے رہنے کے بعد جس قدر دوسری آیتوں کا نزول ہوا ان میں سب سے آخری آیت یہی ہے۔  
لہذا یہ آیت مطلقاً آخری آیت نہ ہوئی بلکہ مقیداً آخری آیت ہوئی۔

قرآن مجید کی نازل ہونے والی آخری آیت یہ ہے:

﴿وَمَنْ يَقْتُلْ مُؤْمِنًا مُتَعَمِدًا فَقَدْ آذَىٰ جَهَنَّمَ خَلِيدًا فِيهَا وَغَضِبَ اللَّهُ عَلَيْهِ وَلَعَنَتْهُ وَأَعَدَّ لَهُ

عَذَابًا عَظِيمًا﴾ ﴿النساء: ۹۳﴾

”اور جو شخص مسلمان کو قصداً مار ڈالے گا تو اس کی سزا دوزخ ہے جس میں وہ ہمیشہ (جلتا) رہے گا اور اللہ اس پر غضبناک ہوگا اور اس پر لعنت کرے گا اور ایسے شخص کے لیے اس نے بڑا (سخت) عذاب تیار کر رکھا ہے۔“  
اس قول کے حمایتی استدلال کرتے ہیں اس روایت سے جس کو امام بخاری رضی اللہ عنہ اور امام ابو داؤد رضی اللہ عنہما وغیرہ حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کرتے ہیں۔ وہ یہ کہ حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا:  
”یہ آیت یعنی ﴿وَمَنْ يَقْتُلْ مُؤْمِنًا مُتَعَمِدًا...﴾ نازل ہونے والی آخری آیت ہے اور اس کو بعد میں کسی چیز نے نسخ نہیں کیا۔“<sup>①</sup>

لیکن یہ قول بھی باطل ہے کیونکہ اس روایت میں واضح الفاظ موجود ہیں کہ ”اس کو بعد میں کسی چیز نے نسخ نہیں کیا۔“ ان الفاظ سے اس بات کی طرف اشارہ ہو رہا ہے کہ یہ آیت جان بوجھ کر کسی مومن کو قتل کرنے کی سزا یا حکم کے بارے میں نازل ہونے والی آخری آیت ہے۔ پس یہ آیت بھی نازل ہونے والی مطلقاً آخری آیت نہ ہوئی بلکہ مقیداً آخری آیت ہوئی۔

قرآن مجید کی نازل ہونے والی آخری آیت یہ ہے:

﴿يَسْتَفْتُونَكَ وَاللَّهُ يُفْتِيكُمْ فِي الْكَلِمَةِ﴾ ﴿النساء: ۵۷﴾



” (اے پیغمبر) لوگ تم سے (کھالہ کے بارے میں) حکم دریافت کرتے ہیں۔ کہہ دو کہ اللہ کھالہ کے بارے میں یہ حکم دیتا ہے۔“

اس قول کے قائلین کا استدلال وہ روایت ہے جس کو امام بخاری ریضیہ و امام مسلم ریضیہ وغیرہ نے حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔ حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں۔

آخر آية نزلت ﴿يَسْتَفْتُونَكَ قُلِ اللَّهُ يُفْتِيكُمْ فِي الْكَلْبَةِ﴾ و آخر سورة نزلت ”براءة“ ①

” ﴿يَسْتَفْتُونَكَ قُلِ اللَّهُ...﴾ یہ آیت نازل ہونے والی آخری آیت ہے جبکہ آخر میں نازل ہونے والی سورت ”سورة البراءة“ ہے۔“ یہ قول بھی باطل ہے، کیونکہ اس میں آیت مذکورہ اور سورة مذکورہ کا مطلقاً نازل ہونے والی آخری آیت اور سورت نہیں بتایا جا رہا بلکہ یہ بتایا جا رہا ہے کہ یہ آیت میراث کے احکام سے متعلق نازل ہونے والی آخری آیت ہے اور یہ سورت قتال و جہاد کے احکام سے متعلق نازل ہونے والی آیت ہے۔

ساتواں قول ﴿﴾ سورة المائدة اور اس کی آیات نازل ہونے والی مطلقاً آخری آیات ہیں۔ اس قول کے قائل اُس روایت سے استدلال کرتے ہیں جسے امام ترمذی ریضیہ اور امام حاکم ریضیہ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے۔

لیکن اس قول کا بھی رد موجود ہے وہ یہ کہ اس روایت میں یہ بیان ہوا ہے کہ یہ سورت حلال و حرام کے احکام سے متعلق آخری سورت ہے کیونکہ اس سورت میں موجود آیات کو بعد میں کسی طرح منسوخ قرار نہیں دیا گیا تھا۔ پس یہ قول بھی دیگر سابقہ اقوال کی طرح ہی نکلا۔

سورة براءة یعنی سورة التوبة کی آخری دو آیات ﴿لَقَدْ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مِّنْ أَنْفُسِكُمْ﴾ (التوبہ: ۱۲۸) سے لے کر اختتام سورة التوبة، قرآن مجید کی نازل ہونے والی مطلقاً آخری آیات ہیں۔ جیسا کہ امام حاکم ریضیہ

اور ابن مردودہ ریضیہ نے حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔

اس قول کا نقض اس طور پر ممکن ہے کہ یوں کہا جائے کہ یہ آیات آخری تو ہیں لیکن مطلقاً نہیں بلکہ سورة التوبة کی آخری آیات ہیں۔ اس نقض کی تائید اس قول سے ہوتی ہے کہ سورة التوبة کی آخری دونوں آیات یعنی ﴿لَقَدْ جَاءَكُمْ رَسُولٌ﴾ سے لے کر آخر تک کی آیات ہیں بخلاف پوری سورت کے کیونکہ ان دونوں آیات میں جہاد کا حکم نہیں دیا گیا بلکہ دشمنوں کے معاملے کو اللہ تعالیٰ کی طرف سپرد کرنے کا حکم دیا گیا ہے جیسا کہ کئی آیات میں دیا جاتا ہے۔

سورة الکہف کی (درج ذیل) آخری آیت قرآن مجید کی نازل ہونے والی مطلقاً آخری آیت ہے:

﴿فَمَنْ كَانَ يَرْجُوا لِقَاءَ رَبِّهِ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهِ أَحَدًا﴾ (الکہف: ۱۱۰)

”جو شخص اپنے پروردگار سے ملنے کی امید رکھتا ہو اُسے چاہیے کہ عمل نیک کرے اور اپنے پروردگار کی عبادت میں کسی کو شریک نہ بنائے۔“

اس روایت کو علامہ ابن جریر ریضیہ نے حضرت معاذ بن سفیان رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے۔

علامہ ابن کثیر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ”مندرجہ بالا اثر میں اشکال ہے۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ حضرت کی اس سے مراد یہ ہو کہ سورۃ الکہف کی یہ آخری آیت وہ ہے جو کہ بعد میں نہ ہی تو منسوخ ہوئی اور نہ ہی اس میں کوئی تغیر آیا۔ بلکہ اس کا حکم ثابت اور محکم ہے۔ علامہ ابن کثیر کی وضاحت سے یہ بات مفہوم ہوتی ہے کہ سورۃ کہف کی آخری آیت بھی نازل ہونے والی آخری آیت نہیں ہے۔“

امام مسلم رضی اللہ عنہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کرتے ہیں کہ درج ذیل سورت قرآن مجید کی نازل ہونے والی مطلقاً آخری آیات ہیں:

﴿إِذَا جَاءَ نَصْرُ اللَّهِ وَالْفَتْحُ ۖ وَرَأَيْتَ النَّاسَ يَسْعَىٰ يَخْلُفُونَ فِي ذُرِّيَةِ اللَّهِ أَقْبَابًا ۗ فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ ۗ إِنَّهُ كَانَ تَوَّابًا﴾ (النصر: ۱-۳) ①

لیکن زیادہ مناسب یہ ہے کہ اس روایت کو محمول کیا جائے اس پر کہ سورۃ النصر وہ آخری سورت ہے جس میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا سے رخصت کی طرف اشارہ دیا گیا ہے۔ ہماری اس بات کی تائید اس حدیث سے ہوتی ہے جس کو امام احمد رضی اللہ عنہ نے مسند احمد میں روایت کیا ہے کہ جب سورۃ النصر نازل ہوئی تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

(لَفَعَيْتَ إِلَىٰ نَفْسِي)) ②

”مجھے (اس سورت میں) موت کی خبر سنائی گئی ہے۔“

اس سورت کے نازل ہونے کے وقت کبار صحابہ رضی اللہ عنہم نے بھی یہی سمجھا تھا کہ اب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس دنیا سے رخصت ہونے کا وقت قریب آ گیا ہے جیسا کہ منقول ہے کہ جب عمر رضی اللہ عنہ نے یہ سورت سنی تو رو پڑے اور فرمانے لگے: ”الکمال دلیل الزوال“ کہ کسی چیز کا مکمل ہو جانا اس کی انتہا اور تمام ہونے کی دلیل ہوتی ہے۔ نیز یہ بھی احتمال ہے کہ یہ سب سے آخر میں نازل ہونے والی سورت ہو جبکہ آخری آیات ان کے علاوہ اور ہوں جیسا کہ حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے:

(آخر سورة نزلت من القرآن جميعاً)) ﴿إِذَا جَاءَ نَصْرُ اللَّهِ وَالْفَتْحُ ۗ...﴾ ③

مندرجہ بالا دس اقوال وہ تھے جو مجھے روایات و آثار سے ملے۔ یہ تمام اقوال اور ان کی تو جیہات آپ کے سامنے ہیں۔ لیکن مجھے سب سے زیادہ اطمینان سب سے پہلے قول یعنی ﴿وَ اتَّقُوا يَوْمًا تُرْجَعُونَ...﴾ (البقرہ: ۲۸۱) والے پر ہی ہے کہ یہ ہی آیت نازل ہونے والی مطلقاً آخری آیت ہے اس کے علاوہ تمام اقوال نسبتاً یا مقیداً آخری ہونے کے ہیں۔ لیکن قاضی ابوبکر رضی اللہ عنہ اس معاملے میں مساوات کے قائل ہیں، وہ کسی بھی ایک قول کو راجح قرار نہیں دیتے۔ انھوں نے اس مسئلے میں جو مذہب اختیار کیا۔ اس کا خلاصہ یہ ہے:

① مسلم: ۱۳۶۲

② السنن: ۱۸۷۶ / ۳۳۳۳

③ رواہ النسائي في الكبرى: ۱۱۷۱۳

تمام اقوال برابر ہیں۔ کیونکہ ان اقوال میں سے کوئی قول ایسا نہیں جس کو حضور اقدس ﷺ تک مرفوع کے ذریعے تائید حاصل ہے۔ تمام قائلین اپنے اقوال میں اجتہاد وغالب ظن سے کام لے رہے ہیں۔ ان تمام اقوال میں احتمالات پائے جاتے ہیں۔ من جملہ احتمالات کے ایک احتمال یہ بھی ہے کہ روز وفاتِ راوی نے نبی کریم ﷺ سے وہی آیت سنی ہو جسے وہ آخری کہہ رہا ہے۔ یا جو آیات آپ ﷺ پر نازل ہوئیں انہیں آپ نے تلاوت فرمایا ہو اور راوی نے یہ سمجھا ہو کہ آپ ﷺ کی تلاوت شدہ آخری آیت ہی آخری آیت ہے جو نازل ہوئی۔

گویا کہ امام قاضی ابو بکر ریڈیہ ان تمام اقوال میں تطبیق کے قائل ہیں۔ یہ طریقہ سہل تو ہے لیکن اس میں یہ بات واضح نہیں ہو پاتی کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی آخری عظیم کتاب کا اختتام کس آیت پر کیا۔

## بعض احکام سے متعلق نازل ہونے والی ابتدائی اور انتہائی (آخری) آیات

اللہ تعالیٰ نے شریعت کے بعض احکام تدریجاً نازل کیے۔ آہستہ آہستہ لوگوں کو اس امر کا خوگر بنایا یا اس نہی سے روکا۔ ذیل میں شراب اور جہاد سے متعلق دو مثالیں تحریر کی جا رہی ہیں۔ ان مثالوں میں یہ واضح کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ جو حکمت و دانائی کا منبع ہیں، انہوں نے کیسے بندوں کو تدریجاً حکم یا نہی کا پورا کرنے والا بنایا۔ نیز اس امر یا نہی سے متعلق ابتدائی اور آخری آیات کو سنی ہیں۔

شراب سے متعلق نازل ہونے والی ابتدائی اور آخری آیات ﴿عسلامہ طیارسی ریڈیہ نے اپنی حضرت عبداللہ

بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے:

”شراب سے متعلق تین آیات نازل ہوئیں۔ سب سے پہلے:

﴿يَسْأَلُونَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْمِرِ ۚ قُلْ فِيهِمَا إِثْمٌ كَبِيرٌ وَمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَإِنَّهُمَا آتَاكُم بِمِن نَّكَهَمَا ۗ﴾ (البقرة: ۲۱۹)

”اے پیغمبر ﷺ! لوگ آپ سے شراب اور جوئے کا حکم دریافت کرتے ہیں۔ آپ کہہ دیجیے کہ ان میں گناہ بڑے ہیں

اور لوگوں کے لیے کچھ فائدے بھی ہیں۔ لیکن ان کے گناہ ان کے فائدوں سے کہیں زیادہ ہیں۔“

نازل ہوئی۔ اس موقع پر کسی نے کہا کہ شراب حرام ہو چکی ہے لیکن جو لوگ شراب کے خوگر تھے انہوں نے حضور اکرم ﷺ سے عرض کیا: یا رسول اللہ ﷺ! شراب میں جو نفع ہے ہمیں وہ نفع اٹھانے دیجیے۔ آپ ﷺ خاموش رہے (وہ لوگ اس کا نفع اٹھاتے رہے۔ یہ بات درست ہے کہ شراب میں تھوڑا سا نفع بھی ہے مثلاً اس کی تجارت سے مالی منفعت حاصل ہوتی ہے۔ شراب پینے سے چہرے کا رنگ سرخ ہو جاتا ہے۔ دیکھنے والا سمجھتا ہے کہ اس کی صحت اچھی ہو گئی ہے۔ شراب میں ایک قومی و اجتماعی فائدہ بھی ہے کہ شراب کے نشہ میں مخمور ہو کر آدمی فیاض اور جرأت و جلاوت کے جذبات سے سرشار ہو جاتا ہے۔ تاہم ان فوائد کے مقابلے میں شراب کی مضریت کا پہلو غالب ہے اور وہ یہ کہ شراب بذاتِ خود ایک مرض ہے۔ شراب کے نشے کی حالت میں انسان حرام و حلال، جائز و ناجائز، وغیرہ کی تمیز کھو بیٹھتا ہے۔ نماز روزے جیسی عظیم عبادات سے محروم ہو جاتا ہے۔ اس کے علاوہ اور بھی بہت سے نقصانات ہیں۔)

”محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ“

کچھ عرصے بعد شراب سے متعلق دوسری آیت:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَقْرُبُوا الصَّلَاةَ وَأَنْتُمْ سُكَرَىٰ حَتَّىٰ تَعْلَمُوا مَا تَقُولُونَ﴾ (النساء: ۴۳)

”اے ایمان والو! جب تم نشے کی حالت میں ہو تو جب تک ان الفاظ کو جو منہ سے کہو سمجھنے نہ لو، نماز کے پاس نہ جاؤ۔“  
نازل ہوئی۔ اس موقع پر بھی کسی نے کہا شراب حرام ہو چکی ہے لیکن جو لوگ شراب کے خوگر تھے، انہوں نے حضور اکرم ﷺ سے عرض کیا: ہم نماز کے قریبی اوقات میں شراب نہیں پئیں گے۔ آپ ﷺ خاموش رہے۔ (اوردہ لوگ نماز کے علاوہ اوقات میں شراب پیتے رہے)۔ کچھ عرصے بعد شراب کی حرمت سے متعلق آخری اور حتمی آیت:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْأَنْصَابُ وَالْأَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطَانِ فَاجْتَنِبُوهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ۝ إِنَّمَا يُرِيدُ الشَّيْطَانُ أَنْ يُوقِعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَاءَ فِي الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ وَيَصُدَّكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللَّهِ وَعَنِ الصَّلَاةِ فَهَلْ أَنْتُمْ مُنْتَهُونَ ۝﴾ (المائدہ: ۹۰-۹۱)

”اے ایمان والو! شراب اور جو اور بت اور پانے (تیر) یہ سب ناپاک کام اعمال شیطان سے ہیں سو ان سے بچتے رہنا تاکہ تم کامیاب ہو جاؤ۔ شیطان تو چاہتا ہے کہ شراب اور جوئے کے سبب تمہارے آپس میں دشمنی اور رنجش ڈلوادے اور تمہیں اللہ کی یاد سے اور نماز سے روک دے، تو کیا تم لوگ ان کاموں سے باز آؤ گے؟“  
نازل ہوئی۔ اب رسول اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”حُرِّمَتْ الْخَمْرُ“ یعنی شراب (مکمل طور پر) حرام ہو گئی ہے۔

② جہاد سے متعلق نازل ہونے والی ابتدائی اور آخری آیات ﴿﴾ ہیں: ① دفاعی جہاد: وہ جہاد

جس میں صرف دفاع مقصود ہو۔ یعنی اگر دشمن حملہ آور ہو جائے تو اس کو روکنے اور مار بھگانے کے لیے جو جہاد کیا جائے گا اس کو ”جہاد دفاعی“ کہتے ہیں۔ ② اقدامی جہاد: وہ جہاد جس میں دشمن کے حملہ آور ہونے سے قبل ہی ان کو دعوتِ قتال و جہاد دیتے ہوئے اقدام کیا جائے۔

صدر اسلام میں اقدامی تو کیا دفاعی جہاد بھی شروع نہ تھا۔ دفاعی جہاد کا بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکم نہ تھا بلکہ یہ حکم تھا کہ تم پر کوئی کتنا ہی ظلم و ستم کرے، تم صرف عفو و درگزر سے کام لینا جیسا کہ درج ذیل آیت:

﴿وَدَّ كَثِيرٌ مِّنْ أَهْلِ الْكِتَابِ لَوْ يَرُدُّونَكُمْ مِن بَعْدِ إِيمَانِكُمْ كُفَّارًا ۖ حَسَدًا مِّنْ عِنْدِ أَنفُسِهِمْ قَبْلَ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْحَقُّ ۖ فَاعْتَصُوا ۚ وَأَصْفَحُوا حَتَّىٰ يَأْتِيَ اللَّهُ بِأَمْرِهِ ۗ إِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ۝﴾ (البقرہ: ۱۰۹)

”بہت سے اہل کتاب اپنے دل کی طعن سے یہ چاہتے ہیں کہ ایمان لا چکنے کے بعد تم کو پھر کافر بنا دیں حالانکہ ان پر حق ظاہر ہو چکا ہے۔ تو تم معاف کرو، اور درگزر کرو۔ یہاں تک کہ اللہ اپنا دوسرا حکم بھیجے۔ بے شک اللہ ہر بات پر قادر ہے۔“

میں ہے۔ اس آیت میں صریح طور پر دفاعی جہاد سے بھی روکا گیا ہے۔ لیکن یہ نبی ہجرت کے دوسرے سال ہنٹالی گئی اور سن ۲ ہجری میں جہاد دفاعی کا حکم نازل ہوا۔ دیکھیے درج ذیل آیات:



﴿ اذِنَ لِلَّذِينَ يُقْتَلُونَ بِأَنَّهُمْ ظَلَمُوا ۖ وَإِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ نَصْرِهِمْ لَقَدِيرٌ ۗ ﴾ ﴿الَّذِينَ أُخْرِجُوا مِنْ دِيَارِهِمْ بِغَيْرِ حَقٍّ إِلَّا أَنْ يَقُولُوا رَبُّنَا اللَّهُ ۗ وَلَوْلَا دَفْعُ اللَّهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَفُتِنَتِ مَتَّ صَوَامِعُ وَبَيْعٌ وَصَلَوَاتُ وَ مَسَاجِدُ يُذَكَّرُ فِيهَا اسْمُ اللَّهِ كَثِيرًا ۗ وَ لَيَنْصُرَنَّ اللَّهُ مَنْ يَنْصُرُهُ ۗ إِنَّ اللَّهَ لَقَوِيٌّ عَزِيزٌ ۗ ﴾ ﴿الَّذِينَ إِنْ مَكَّنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ أَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ وَآمَرُوا بِالْمَعْرُوفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ ۗ وَبِئِنَّ عَابِدَةَ الْأُمُورِ ۗ﴾

(ع: ۳۹-۴۰-۴۱)

”جن مسلمانوں سے (خواہ مخواہ) لڑائی کی جاتی ہے ان کو اجازت ہے (کہ وہ بھی لڑیں) کیونکہ ان پر ظلم ہو رہا ہے اور اللہ (ان کی مدد کرے گا وہ) یقیناً ان کی مدد پر قادر ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں کہ اپنے گھروں سے ناحق نکال دیے گئے (انہوں نے کچھ تصور نہیں کیا) ہاں یہ کہتے ہیں کہ ہمارا پروردگار اللہ ہے اور اگر اللہ لوگوں کو ایک دوسرے سے نہ ہٹاتا رہتا تو (راہبوں کے) صومعہ اور (عیسائیوں کے) گرجے اور یہودیوں کے عبادت خانے اور مسلمانوں کی مسجدیں جن میں خدا کا بہت سا ذکر کیا جاتا ہے دیران ہو چکی ہوتیں اور جو شخص خدا کی مدد کرتا ہے خدا اس کی ضرور مدد کرتا ہے بیشک خدا توانا اور غالب ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر ہم ان کو ملک میں دسترس دیں تو نماز پڑھیں اور زکوٰۃ ادا کریں اور نیک کام کرنے کا حکم دیں اور بڑے کاموں سے منع کریں اور سب کاموں کا انجام اللہ ہی کے اختیار میں ہے۔“

اس آیت کے بعد مندرجہ ذیل آیات نازل ہوئیں۔ جن میں جہاد (دفاعی اور اقدامی) و قتال پر خوب ابھارا گیا۔ اور کسی قسم کی رعایت برتنے سے روکا گیا۔ ان آیات میں جہاد و قتال سے متعلق حتیٰ احکام موجود ہیں۔

① ﴿ وَ قَاتِلُوا الْمُشْرِكِينَ كَافَّةً ۚ كَمَا يُقَاتِلُونَكُمْ كَافَّةً ۗ ﴾ ﴿الترج: ۳۲﴾

”اور تم سب کے سب مشرکوں سے لڑو۔ جیسے وہ سب کے سب تم سے لڑتے ہیں۔“

② ﴿ اِنْفِرُوا خِفَافًا وَثِقَالًا وَجَاهِدُوا بِأَمْوَالِكُمْ وَأَنْفُسِكُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ ذَلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ إِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ ﴾ ﴿الترج: ۳۱﴾

”تم سب سب ہار یا گراں بار (یعنی مال و اسباب تھوڑا رکھتے ہو یا بہت، گھروں سے) نکل آؤ اور اللہ کے راستے میں مال اور جان سے لڑو۔ یہی تمہارے حق میں بہتر ہے بشرطیکہ سمجھو!“

③ ﴿ إِلَّا تَنْفِرُوا يُعَذِّبْكُمْ عَذَابًا أَلِيمًا وَ لَيَسْتَبْدِلَ قَوْمًا غَيْرَكُمْ وَ لَا تَنْصُرُوهُ شَيْئًا ۗ وَ اللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴾ ﴿الترج: ۳۹﴾

”اگر تم نہ نکلو گے تو اللہ تم کو بڑی تکلیف کا عذاب دے گا۔ اور تمہاری جگہ اور لوگ پیدا کر دے گا (جو اللہ کے پورے فرمانبردار ہو گئے) اور تم اسکو کچھ نقصان نہ پہنچا سکو گے۔ اور اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔“

سورۃ المائدہ کی آیت نمبر ۳:

﴿ الْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَ اَتَمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي وَ رَضِيْتُ لَكُمُ الْإِسْلَامَ دِينًا ﴾ ﴿الائمہ: ۳﴾

کو آخری آیت ماننے میں کیا حرج ہے؟ حالانکہ یہ آیت معنی و مفہوم کے اعتبار سے سب سے زیادہ واضح و صریح ہے نیز یہ آیت حجۃ الوداع کے موقع پر سن وں ہجری میں نازل ہوئی اور اس آیت میں اکمال دین اور اتمام فرائض و احکام کا کھلم کھلا اعلان کیا گیا ہے۔

**جواب** (ہم اس آیت کو آخری آیت کیسے مان لیں حالانکہ) اس آیت کے بعد قرآن مجید کا نزول دو ماہ سے بھی زائد عرصے تک ہوتا رہا۔ ہم ماقبل بھی بیان کر چکے ہیں کہ ﴿وَ اتَّقُوا يَوْمًا تُرْجَعُونَ فِيهِ إِلَى اللَّهِ﴾ (البقرة: ۲۸۱) ہی آخری آیت ہے کیونکہ اس آیت کے نزول کے بعد حضور اکرم ﷺ صرف نو (۹) راتیں بقید حیات رہے۔ پس یہ ہی بات ہمارے لیے سورۃ المائدہ کی آیت نمبر ۳ کو آخری آیت ماننے سے نافع ہے۔ اور رہی یہ بات کہ سورۃ المائدہ کی مذکورہ آیت میں اکمال دین اور اتمام نعمت کا ذکر ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس آیت میں اکمال دین کا اعلان اس معنی میں ہے کہ اس دن اکثر مسلمان ایک میدان میں جمع تھے، اسلام اپنی پوری شان و شوکت کے ساتھ اعدائے اسلام کی نظر میں نمایاں ہو چکا تھا اگرچہ کفار پر یہ منظر بہت بھاری تھا۔ اس روز (یوم عرفہ، دنِ جبری) شرک و مشرکین، کفر و کفار، نفاق اور منافقین کی جڑیں تک کٹ چکی تھیں، بلکہ حرام نجس مشرکین سے خالی اور پاک ہو چکا تھا۔ اور وجہ الوداع ہی نسب سے پہلا حج تھا جس میں مسلمانوں کے ساتھ مشرکین شریک نہ ہوئے تھے۔ (اس حج سے قبل مسلمان اور مشرک غلط ملط ہو کر حج کرتے تھے۔ مسلمان اسلام کے مطابق فرائض حج ادا کرتے تھے جبکہ مشرکین اپنے اعمال فاسدہ و باطلہ میں مصروف رہتے تھے)۔ علامہ ابن جریر رَضِيَ اللهُ عَنْهُ سورۃ المائدہ کی مذکورہ آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

”بہتر یہ ہے کہ اس آیت کی تاویل یوں کی جائے کہ اس آیت میں دین کا کامل ہونا بایں طور پر ہے کہ مسلمان کو بلکہ حرام میں مستقل مستقر و قرار نصیب ہوا جب کہ مشرکین سے مستقل طور پر بلا حرام کو پاک کر دیا گیا۔ یہاں تک کہ اس سال مسلمانوں نے اس حال میں حج ادا کیا کہ ان کے ساتھ مشرکین مخالط نہیں تھے۔“

علامہ ابن جریر رَضِيَ اللهُ عَنْهُ کی اس تاویل کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے جس کو حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے روایت کیا ہے: حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں:

”مسلمان اور مشرکین پہلے ایک ساتھ ہی حج ادا کیا کرتے تھے۔ جب سورۃ براءۃ نازل ہوئی اور اس میں مشرکین کو بیت اللہ میں آنے سے روک دیا گیا تو اس وقت مسلمانوں نے اس حال میں حج کیا کہ بیت اللہ میں ان کے ساتھ مشرکین شریک نہیں تھے۔ پس اُس وقت اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں پر اپنی نعمت مکمل و تمام فرمادی۔ یہی مطلب ہے ﴿وَ اتَّقُوا يَوْمًا تُرْجَعُونَ فِيهِ إِلَى اللَّهِ﴾ (البقرة: ۲۸۱) کا۔“

اللہ سے دعا ہے کہ اللہ ہم پر نعمت کو ایسے ہی مکمل و تمام رکھے۔ آمین۔

**نوٹ** ① آپ کو یاد ہوگا کہ ہم نے تیسرے باب میں بعنوان ”قرآن کریم کے تیسرے یعنی آخری نزول کا عرصہ مدت“ کے تحت ایک تحقیق اور اس تحقیق میں موجود تین مکیاں ذکر کی تھیں اور ہم نے ساتھ یہ بھی کہا تھا کہ آپ اس کی تفصیل آگے پڑھیں گے۔ سو اب تفصیل کے ساتھ آپ پڑھ چکے ہیں کہ قرآن مجید کی کون سی آیات آخری ہیں اور کون سی نہیں۔

② قرآن مجید کی نازل ہونے والی مطلقاً آخری آیت ﴿وَ اتَّقُوا يَوْمًا تُرْجَعُونَ فِيهِ إِلَى اللَّهِ﴾ (البقرة: ۲۸۱) ہی ہے۔ کیونکہ اس آیت کے نازل ہونے کے بعد حضور اکرم ﷺ صرف نو (۹) دن بقید حیات رہے جب کہ ﴿الْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ﴾ کے نازل ہونے کے بعد آپ ﷺ اکیاسی (۸۱) دن بقید حیات رہے۔ اس حساب سے بھی قرآن کریم کی نازل ہونے والی آخری آیت ﴿وَ اتَّقُوا يَوْمًا...﴾ ہی ہے۔

③ قرآن مجید کے نزول کی ابتداء اُس وقت ہوئی جب حضرت جبرئیل علیہ السلام غار حرا میں حضور اقدس ﷺ کے پاس سورۃ اعلق کی

(ابتدائی) آیات لے کر حاضر ہوئے۔ بعض مفسرین کہتے ہیں یہ واقعہ رمضان کی سترہ تاریخ کا ہے۔ کیونکہ غزوة بدر بھی سترہ رمضان کو ہوا تھا اور اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں خود فرمایا:

﴿إِنْ كُنْتُمْ أُمَّتُهُمْ بِاللَّهِ وَمَا أُنزِلْنَا عَلَىٰ عَبْدِنَا يَوْمَ الْفُرْقَانِ يَوْمَ التَّنْفِيهِ الْجَنَعِ ۗ وَاللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ۝﴾  
 ”اگر تم اللہ پر اور اس پر ایمان رکھتے ہو جو ہم نے نازل کیا اپنے (محمد ﷺ) پر یوم الفرقان (یعنی حق و باطل میں فرق کرنے کے دن) میں جس دن دونوں فوجوں میں مذہب بھٹر ہو گئی تھی۔“ (الانفال: ۳۱)

یوم الفرقان سے بالاتفاق غزوة بدر ہی مراد ہے۔ اور آیت میں بھی ”وما انزلنا“ میں واضح ذکر ہے کہ ہم نے یوم الفرقان کے دن قرآن نازل کیا۔

لیکن ہم کہتے ہیں کہ قرآن مجید سترہ رمضان کو یا غزوة بدر والے دن نازل ہونا شروع نہیں ہوا۔ بلکہ قرآن مجید تو لیلیۃ القدر میں نازل ہوا جیسا کہ سورۃ القدر میں ہے۔ لیلیۃ القدر رمضان کے آخری عشرے کے طاق راتوں میں ہوتی ہے۔ اور سترہ تاریخ تو آخری عشرے میں نہیں آتی۔ اور رہی یہ بات کہ پھر ﴿وَمَا أُنزِلْنَا عَلَىٰ عَبْدِنَا يَوْمَ الْفُرْقَانِ﴾ کا کیا مطلب ہوگا؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اکثر مفسرین کرام نے ”ما“ سے وہ نصرت، مدد اور ملائکہ کی جماعتیں مراد لی ہیں جو اللہ تعالیٰ نے میدان بدر میں غزوة بدر کے دن مسلمانوں کی مدد کے لیے نازل فرمائی تھیں۔ اور سورۃ الانفال کی پیش کردہ آیت نمبر ۳۱ کا سیاق و سباق بھی یہی بتا رہا ہے کہ یہاں ”ما“ سے قرآن مجید مراد نہیں بلکہ نصرت، مدد اور ملائکہ مراد ہیں۔ دیکھیے مکمل آیت:

﴿وَاعْلَمُوا أَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِنْ شَيْءٍ فَإِنَّ لِلَّهِ حُسْبَهُ وَلِلرَّسُولِ ۖ وَلِذِي الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسْكِينِ ۖ وَالْأَبْنِ السَّبِيلِ ۗ  
 إِنْ كُنْتُمْ أُمَّتُهُمْ بِاللَّهِ وَمَا أُنزِلْنَا عَلَىٰ عَبْدِنَا يَوْمَ الْفُرْقَانِ يَوْمَ التَّنْفِيهِ الْجَنَعِ ۗ وَاللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ۝﴾  
 اور جان رکھو کہ جو مال غنیمت تم کفار سے حاصل کرو اس میں سے پانچواں حصہ اللہ کا اور اس کے رسول کا اور اہل قربت کا اور محتاجوں کا اور مسافروں کا ہے۔ اگر تم اللہ پر اور اس پر ایمان رکھتے ہو جو ہم نے نازل کیا اپنے بندے (محمد ﷺ) پر یوم الفرقان میں جس دن دونوں فوجوں میں مذہب بھٹر ہو گئی تھی۔“ (الانفال: ۳۱)

آیت کی ابتداء میں مال غنیمت کی تقسیم کا ذکر کیا کہ مال غنیمت کے پانچ حصے کرو چار حصے خود رکھو اور ایک حصہ اللہ کے نام پر جدا کرو کیونکہ وہ ہی تو ہے جس نے تم پر آسمان سے مدد یعنی فرشتے نازل کیے اس دن جس دن دونوں فوجوں میں مذہب بھٹر ہو گئی تھی اور وہ دن ”فرقان“ کا دن تھا۔

② غزوة بدر کو یوم الفرقان کہا گیا کیونکہ یہ ہی تو وہ دن تھا جس دن مسلمانوں کی شان و شوکت دنیا والوں کے سامنے ظاہر ہوئی۔ کفر اور اسلام میں فرق کھل کر سب کے سامنے آ گیا۔ مسلمانوں کے پاس بظاہر کوئی خاص جنگی ہتھیار نہیں تھے اور نہ ہی وہ جنگ کے ارادے سے آئے تھے۔ لیکن پھر بھی اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو فتح عظیم اور کفار کو شکست فاش سے درکنار فرمایا۔



## اسباب نزول

قرآن کریم کی آیات کی دو قسمیں ہیں:

- ① وہ آیات جو کسی خاص واقعے یا سبب کی بنا پر نازل نہیں ہوئیں۔ بلکہ صرف انسانیت کی ہدایت کے لیے اللہ تعالیٰ نے انھیں نازل فرمایا۔ اس طرح کی آیات بہت زیادہ ہیں۔ ان کے بارے میں تفصیلاً بیان ہمارا موضوع نہیں۔
- ② وہ آیات جو کسی خاص واقعے یا سبب کی بنا پر نازل ہوئیں۔ ایسی آیات سے متعلق بیان کرنا ہمارا موضوع ہے۔ لیکن ہم اُن تمام آیات کو بیان نہیں کریں گے جو کسی خاص واقعے یا سبب کی بنا پر نازل ہوئیں۔ کیونکہ ان تمام آیات کو بیان کرنے کے لیے علمائے کرام نے بہت سی کتب تالیف کی ہیں جن میں صرف اس قسم ہی کی آیات کو بیان کیا ہے۔ جیسا کہ امام علی بن مدینی جو کہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے اُستاد ہیں، امام واحدی، علامہ جبری، علامہ ابن حجر اور علامہ جلال الدین سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے اس دوسری قسم کی آیات کو مفصلاً بیان کیا ہے۔ اس موضوع پر علامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ کی ایک کتاب جس کا نام ”لباب النقول فی اسباب النزول“ ہے، بہت اہمیت کی حامل ہے۔

ہم اس باب میں درج ذیل موضوع بیان کریں گے جو تمام آیات کے اسباب نزول کو سمجھنے میں مہم و معاون ہوں گے۔

- ① سبب نزول کا معنی ② اسباب نزول کی معرفت کے فوائد ③ اسباب نزول کی معرفت کا طریقہ ④ اسباب نزول سے متعلق تعبیرات ⑤ اُن آیات کا حکم جو خود واحد ہوں لیکن اُن کے اسباب متعدد ہوں ⑥ اُن آیات کا حکم جن کا سبب ایک ہوں لیکن وہ خود متعدد ہوں ⑦ لفظ شارع اور اس کے سبب کے مابین عموم و خصوص ⑧ لفظ کے عام اور سبب کے خاص ہونے کے اختلاف کی تحقیق ⑨ اس بارے میں جمہور کے دلائل ⑩ مخالفین کے شبہات اور ان کے جوابات ⑪ لفظ عام کے ساتھ سبب خاص کی مثال۔
- ① سبب نزول کا معنی: سبب نزول سے مراد وہ واقعہ، حادثہ، سوال یا حکم ہے جو کسی آیت یا چند آیات کے نزول کا باعث بنے۔ برابر ہے اُس واقعے کا تعلق خصوصت و لسانی جھگڑے سے ہو جیسا کہ قبیلہ اوس اور خزرج کی ایک جماعت کو آپس میں لڑانے کے لیے اللہ کے دشمنوں یعنی یہود نے گھٹیا کوشش کی یہاں تک کہ یہ نوبت آگئی کہ اوس اور خزرج کے بعض لوگ مسلمان ہونے کے باوجود آپس میں ”السلحہ السلاخ“ کی آوازیں بلند کرنے لگے۔ اس موقع پر اللہ تعالیٰ نے سورت آل عمران کی آیت نمبر ۱۰۰ اور اس سے پہلی اور بعد والی کچھ آیات نازل فرمائیں جن میں اہل کتاب کی اطاعت سے روکا گیا ہے اور آپس میں محبت و اتفاق کا درس دیا گیا ہے۔
- یا اُس واقعے کا تعلق کسی خطاء فاحش سے ہو جس کا ارتکاب کر لیا گیا ہو۔ جیسے ایک شخص نے نشے کی حالت میں نماز کی امامت کروائی اور اس نے سورۃ الفاتحہ کے بعد سورۃ الکافرون شروع کی۔ پھر ﴿لَا اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُونَ﴾ کے لفظ میں لگا حذف کر کے ﴿اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُونَ﴾ پڑھ دیا۔ تو اس موقع پر یہ آیت نازل ہوئی:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَقْرَبُوا الصَّلَاةَ وَأَنْتُمْ سُكَرَىٰ حَتَّىٰ تَعْلَمُوا مَا تَقُولُونَ﴾ (النساء: ۴۳)

یا اُس واقعے کا تعلق کسی تمنا و خواہش سے ہو جیسا کہ ”موافقات عمر بنینو“۔ موافقات عمر بنینو کے موضوع پر الگ سے متعدد کتب بھی لکھی جا چکی ہیں۔ موافقات عمر بنینو سے مراد وہ آیات ہیں جو حضرت عمر بنینو کی تمنا اور خواہش کے موافق نازل ہوئیں۔ جیسا کہ امام بخاری رضی اللہ عنہ نے نقل کیا ہے حضرت انس بنینو سے روایت ہے: حضرت عمر بنینو نے فرمایا: میرے رب نے تین معاملات میں میرے ساتھ موافقت کی ہے۔

- ① ایک مرتبہ میں نے حضور اکرم ﷺ سے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ! کاش ہم مقام ابراہیم پر بھی نماز پڑھتے۔ اللہ نے یہ آیت: ﴿وَاتَّخِذُوا مِن مَّقَامِ إِبْرَاهِيمَ مُصَلًّى﴾ (البقرہ: ۱۲۵) نازل فرمادی جو کہ میری تمنا کے عین مطابق تھی۔
- ② میں نے حضور اکرم ﷺ سے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ! آپ کے اہل خانہ کے سامنے ہر طرح کے لوگ چلے جاتے ہیں اس لیے میری خواہش ہے کہ آپ اُن کو پردے کا حکم دے دیں (اُس وقت تک پردے کا حکم نہیں تھا) تو اس موقع پر اللہ تعالیٰ نے آیت پردہ نازل فرمائی۔

③ رسول اللہ ﷺ کی تمام بیویاں آپ کی بابت غیرت رکھنے میں ایک سی ہو گئیں تو میں نے اُن سے کہا: ﴿عَلَيْهِ رَبَّنَا إِن كَانَ أَفْكَارًا وَسُلُوكًا إِذْ وَجَّاهُمْ فَأَبْغَضُوا إِلَيْكُمْ فَسَئِئًا مَا ظَنَرْنَا﴾ (البقرہ: ۱۲۵) یعنی اگر رسول اللہ ﷺ تم کو چھوڑ دیں گے تو امید ہے کہ اُن کا خدا نہیں تمہارے بدلے میں تم سے اچھی بیویاں دے دے گا۔ (حضرت عمر بنینو کے یہ الفاظ) سورۃ التحریم کی آیت نمبر ۵ کے الفاظ ہیں۔

یا اُس واقعے کا تعلق کسی سوال سے ہو جو حضور اکرم ﷺ سے پوچھا گیا ہو۔ خواہ اُس سوال کا تعلق زمانہ ماضی سے ہو جیسے: ﴿وَسَيَسْأَلُونَكَ عَنِ ذِي الْقُرْبَيْنِ...﴾ (الکہف: ۸۳) یا زمانہ حال و حاضر سے ہو جیسے: ﴿وَسَيَسْأَلُونَكَ عَنِ الزُّوْجِ الَّذِي مَلَكَ يَمِينُكُمْ قُلِ الْمَرْءُ الَّذِي يَمْلِكُ يَمِينُكُمْ قُلِ اللَّهُ غَفُورٌ رَحِيمٌ﴾ (النساء: ۳۴) یا زمانہ مستقبل سے ہو۔ جیسے: ﴿وَسَيَسْأَلُونَكَ عَنِ السَّاعَةِ أَيَّانَ مُرْسَاهَا﴾ (الانعام: ۲۲)

جس واقعے سے متعلق آیت یا آیات نازل ہوئی ہیں عام ہے کہ وہ آیت / آیات اُس واقعے کے فوراً بعد نازل ہو جائیں یا کسی حکمت کے تحت کچھ تاخیر ہو جائے جیسا کہ قریش نے آ کر حضور اقدس ﷺ سے روح، اصحاب کہف اور ذوالقرنین کے بارے میں پوچھا۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: ”غداً اخبروکم“ (میں تمہیں کل بتاؤں گا)۔ اس موقع پر آپ ﷺ نے ان شاء اللہ نہیں کہا۔ اس وجہ سے وحی کا سلسلہ مؤخر کر دیا گیا۔ ابن اسحاق کے مطابق پندرہ روز تک وحی نازل نہیں ہوئی۔ جبکہ تین اور پانچ روز کے احوال بھی ملتے ہیں۔ الفرض جتنے روز بھی وحی کا سلسلہ رکا رہا حضور اکرم ﷺ پر وہ عرصہ بہت شاق گزارا۔ پندرہ یا تین یا پانچ روز کے بعد اللہ تعالیٰ نے وحی کا سلسلہ دوبارہ سے شروع فرمادیا۔ اور قریش کے پوچھے گئے سوالات کے جوابات بھی ارشاد فرمادیے۔ پھر یہ دو آیات:

﴿وَلَا تَقُولُوا لِمَا كُنَّا يَسْأَلُ عَنَّا إِنِّي فَعَلْتُ ذَلِكَ غَضًا﴾ (الآلَاءُ) ﴿إِن يَشَاءَ اللَّهُ وَادُّرُكُ رَبِّكَ إِذَا نَسِيتَ وَقُلْ عَسَىٰ أَنْ

يَهْدِينِ رَبِّي لَا أَقْرَبُ مِنْ هَذَا رَشَدًا﴾ (الکہف: ۲۳-۲۲)

”اور کسی کام کی نسبت نہ کہنا کہ میں اسے کل کر دوں گا۔ مگر (ان شاء اللہ کہہ کر یعنی اگر) اللہ چاہے تو (کر دوں گا) اور جب اللہ کا نام لینا بھول جاؤ تو یاد آنے پر لے لو اور کہہ دو کہ امید ہے کہ میرا پروردگار مجھے اس سے بھی زیادہ ہدایت کی باتیں بتائے۔“



نازل فرمائیں:

شان نزول کی تعریف میں ”ایام وقوعہ“ کے الفاظ قید احترازی ہیں۔ ان الفاظ سے اُن آیات سے احتراز مقصود ہے جو ابتداءً بدون سبب نازل ہوئی ہوں، پھر بعد جب اس سے متعلق احوال ووقائع پیش آئے ہوں یا گزشتہ زمانے میں پیش آچکے ہوں جیسے سابقہ انبیاء علیہم السلام اور امتوں کے واقعات اور حالات ہیں۔ ”ایام وقوعہ“ کے الفاظ سے خاص وہی آیات، شان نزول کی تعریف میں باقی رہ گئیں جو اُن واقعات کے وقت اور ایام میں نازل ہوئیں، جن کی وجہ سے وہ آیات نازل ہوئی تھیں۔

(ف) ”ایام وقوعہ“ کے الفاظ سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ قرآن مجید کی ہر آیت کا شان نزول نہیں ہے۔ قرآن مجید کا بہت سا حصہ اللہ تعالیٰ نے از خود نازل فرمایا، کوئی خاص واقعہ یا کسی کا کوئی سوال وغیرہ اس کے نزول کا سبب نہیں بنا۔

بعض ایسے لوگ جو بصیرت علمی سے عاری ہیں وہ کہتے ہیں کہ شان نزول کی حیثیت تاریخ یا قائم مقام تاریخ سے کچھ زیادہ نہیں۔ لہذا

وہ شان نزول کے عظیم علم کی معرفت کو کسی شمار میں نہیں لاتے اور اس کے حصول کو بے سود سمجھتے ہیں۔ ذیل میں شان نزول یا اسباب نزول کی معرفت کے چند فوائد لکھے جاتے ہیں، جن سے اس علم کی اہمیت مزید واضح ہو جائے گی اور اُن بعض قائلین کا قول بھی غلط ثابت ہو جائے گا۔ (ان شاء اللہ)

① اسباب نزول جاننے کا سب سے پہلا فائدہ یہ ہے کہ اس سے یقینی طور پر احکام الہی کی حکمتیں معلوم ہوتی ہیں اور پتہ چلتا ہے کہ یہ حکم اللہ تعالیٰ نے کن حالات میں نازل فرمایا۔ جس کے نتیجے میں اہل ایمان کے ایمان میں اضافہ ہوتا ہے اور احکام الہی کو پورا کرنے اور قرآن مجید پر عمل کرنے کا شوق و ذوق پیدا ہوتا ہے۔ نیز ان احکام میں اسرار و رموز بندہ مومن کے سامنے واضح ہوتے چلے جاتے ہیں حتیٰ کہ کافر انسان بھی اگر منصف اور سلیم الطبع ہو تو شریعت اسلامی سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اللہ تعالیٰ نے کیسے بہترین انداز میں انسان کے بشری تقاضوں و ضروریات کا لحاظ رکھتے ہوئے اس پر احکام شریعت لازم کیے۔ ایک حرمت شراب ہی کی مثال کو دیکھیے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو حرام کرنے میں تھمنا نہ انداز اپناتے ہوئے یکبارگی اسے حرام قرار نہیں دیا بلکہ مصالح و حکمتوں کو مد نظر رکھتے ہوئے تدریجاً اس کو حرام قرار دیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پھر شراب کی طرف دوبارہ لوٹنا یا اس سے غفلت برتنے کا دوسرے تک صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے دلوں میں پیدا نہ ہوا۔

② اسباب نزول جاننے کا دوسرا فائدہ یہ ہے کہ اس سے آیت کا معنی و مفہوم سمجھنے میں اور اس میں پیدا ہونے والے اشکالات کو دور کرنے میں استعانت ملتی ہے۔ جیسا کہ امام واحدی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

((لا يمكن معرفة تفسير الآية دون الوقوف على قصتها وبيان نزولها)).

”آیت کے شان نزول اور اس سے متعلق واقعات کو جاننے بغیر آیت کی تفسیر سے آگاہ ہونا ناممکن ہے۔“

امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

((معرفة سبب النزول يعين على فهم الآية، فان العلم بالسبب يورث العلم بالسبب)).

”سبب نزول کا جاننا آیت کو سمجھنے میں معاون ہوتا ہے کیونکہ سبب کا جاننا ہی سبب کی معرفت کا فائدہ دیتا ہے۔“

”محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ“



بسا اوقات سبب کے بغیر آیت کا صحیح مفہوم ہی سمجھ میں نہیں آتا اور اگر سبب نزول سامنے نہ ہو تو انسان آیت کا بالکل غلط مطلب سمجھ سکتا ہے۔ یہ بات درج ذیل تین مثالوں سے واضح ہوگی۔

① سورۃ البقرۃ میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَاللَّهُ الْمَشْرِقِيُّ وَالْمَغْرِبِيُّ الْمَعْرُوبُ فَكَأَيِّنَّمَا لُتُوا فَأَنهَمَّ وَجْهَهُ اللَّهُ إِنَّ اللَّهَ وَاسِعٌ عَلِيمٌ ﴿۱۱۵﴾﴾ (البقرۃ: ۱۱۵)

”اور مشرق و مغرب سب اللہ ہی کی ہیں، لہذا جس طرف بھی تم رخ کرو گے، وہیں اللہ کا رخ ہے۔ بے شک اللہ بہت وسعت والا اور علم والا ہے۔“

اگر اس آیت کے الفاظ کو دیکھا جائے تو اس سے یہ ہی ثابت ہوتا ہے کہ نماز میں کسی خاص جہت کی طرف رخ کرنا ضروری نہیں۔ جس طرف دل چاہے رخ کر کے نماز پڑھ لو۔ چاہے سفر میں ہو یا حضر میں خانہ کعبہ کی طرف رخ کرنا ضروری نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ تو ہر سمت میں موجود ہے۔ لیکن جو نبی آیت کے شان نزول کو دیکھا جائے تو مذکورہ بالا مفہوم کا غلط ہونا بدیہی طور پر ثابت ہو جاتا ہے۔ اور یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ آیت خاص طور پر یا تو سفر میں (سواری کے اوپر) نفل نماز پڑھنے کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ یا پھر اُن لوگوں کے بارے میں نازل ہوئی ہے جو کسی ایسی جگہ پر ہوں جہاں قبلے کا علم کسی کو نہ ہو اور پھر سب اجتہاد یا تحری کر کے نماز پڑھ لیں اور ان کو بعد میں معلوم ہو کہ انہوں نے غلطی کی۔ پس آیت میں مسافر کے لیے تخفیف مراد ہے۔ جیسا کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے: وہ فرماتے ہیں: ”یہ آیت سفر کی حالت میں سواری پر نماز پڑھنے والے کے بارے میں نازل ہوئی کہ وہ کسی بھی سمت رخ کر کے نماز پڑھ لے۔“ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ: ”یہ آیت اس قوم یا جماعت کے بارے میں نازل ہوئی ہے جو رات کے وقت میں کسی جگہ ہوں اور انھیں قبلے کی سمت معلوم نہ ہو اور پھر وہ مختلف اطراف میں منہ کر کے نماز پڑھ لیں پھر صبح ہونے پر انھیں معلوم ہو کہ انھوں نے قبلے کی طرف رخ کر کے نماز میں نہیں پڑھی تھیں تو اُن کا عذر قبول کیا جائے گا۔“ اس آیت کے سبب نزول میں اور بھی اقوال ہیں لیکن جو ہم نے ذکر کر دیے ہیں وہ کافی ہیں۔

② سورۃ آل عمران میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِينَ يَفْرَحُونَ بِمَا آتَوْا وَيُجِبُونَ أَنَّ يُخَسِدُوا بِمَا كَمْ يَفْعَلُوا فَلَا تَحْسَبْنَهُمْ بِمَقَازِقٍ مِنَ الْعَذَابِ ۗ وَ لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴿۱۸۸﴾﴾ (آل عمران: ۱۸۸)

”جو لوگ اپنے کیے ہوئے کاموں سے خوش ہوتے ہیں اور وہ کام جو کرتے نہیں ان کے لیے چاہتے ہیں کہ ان کی تعریف کی جائے تو آپ ان کی نسبت یہ خیال نہ کرنا کہ وہ عذاب سے چھٹکارا پائیں گے۔ اور انھیں درد دینے والا عذاب ہوگا۔“

صحیح بخاری (حدیث ۳۵۶۸) کے مطابق: حضرت مروان بن حکم رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: میں اس آیت کے مفہوم کے بارے میں مسلسل اشکال کا شکار رہا اور سوچتا رہا کہ اس طرح تو ہم میں سے ہر ایک کو بڑا سخت درد ناک عذاب دیا جائے گا، کیونکہ ہم سب بھی اپنے کیے ہوئے کاموں پر خوش ہوتے ہیں اور بعض اوقات کسی ناکردہ کام پر اپنے آپ کو تعریف کا مستحق سمجھتے ہیں۔ لیکن میرا یہ اشکال یا غلط فہمی اُس وقت دور ہوئی جب حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے اس آیت کا شان نزول بیان کیا کہ یہ آیت اہل کتاب کے

”محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ“



بارے میں نازل ہوئی تھی۔ واقعہ یہ ہے کہ ایک مرتبہ حضور اکرم ﷺ نے یہود سے ایک بات پوچھی کہ کیا یہ تورات میں ہے۔ ان لوگوں نے چھپا لیا اور جو تورات میں تھا اس کے خلاف بیان کر دیا اور اپنے اس عمل بد پر خوش ہوتے ہوئے واپس آئے کہ ہم نے خوب دھوکا دیا۔ تو اس موقع پر یہ آیت نازل ہوئی جس میں اُن کے لیے وعید ہے۔ شان نزول سننے کے بعد حضرت مروان بن حکم رضی اللہ عنہ کی تشنگی سیرابی سے بدل گئی اور اشکال رفع ہو گیا۔ اور اللہ تعالیٰ کے کلام سے جو حقیقی مراد تھی وہ سمجھ آ گئی۔

⑤ سورة البقرة میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿إِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَائِرِ اللَّهِ فَمَنْ حَجَّ الْبَيْتَ أَوْ اعْتَمَرَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ أَنْ يَطَّوَّفَ بِهِمَا﴾ (البقرة: ۱۵۸)

”بے شک صفا اور مروہ کی پہاڑیاں اللہ کی نشانیوں میں سے ہیں۔ تو جو شخص خانہ کعبہ کا حج یا عمرہ کرے اس پر کچھ گناہ نہیں کہ دونوں کے درمیان چکر لگائے۔“

حضرت عروہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے جب اس آیت کو شان نزول کے بغیر سمجھنے کی کوشش کی تو اس اشکال کا شکار ہو گئے کہ صفا اور مروہ کے درمیان سعی کرنا صرف جائز ہے، کوئی فرض یا واجب نہیں۔ کیونکہ آیت میں ”جُنَاحَ“ کے لفظ سے یہ ہی مفہوم ہو رہا ہے۔ آپ رضی اللہ عنہ نے اپنے اشکال کا ذکر اپنی خالہ محترمہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے کیا۔ اُس وقت حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے آپ رضی اللہ عنہ کو سمجھایا کہ لفظ ”جُنَاحَ“ سے سعی کے فرض یا واجب ہونے کی نفی کرنا مراد نہیں بلکہ اس خیال کی نفی کرنا مراد ہے جو اُس وقت مسلمانوں کے ذہن میں پیدا ہو رہا تھا۔ زمانہ جاہلیت میں صفا اور مروہ دونوں پہاڑیوں پر دو بت نصب تھے۔ صفا پر جو بت نصب تھا اُسے ”اساف“ جبکہ مروہ پر نصب بت کو ”ناکہ“ کہتے تھے۔ اور مشرکین جب صفا و مروہ کے درمیان سعی کرتے تھے تو ان دونوں بتوں کو ہاتھ لگا لگا کرتے تھے۔ پھر جب اسلام غالب آ گیا، ہر طرف اسلام کا بول بالا ہو گیا اور تمام بت ریزہ ریزہ ہو گئے اور پھر جب سعی کا موقع آیا تو مسلمانوں کو یہ خیال آیا کہ کہیں ان بتوں کی وجہ سے سعی کرنا ناجائز نہ ہو گیا ہو، اُن کا یہ اشکال رفع کرنے کے لیے یہ آیت نازل ہوئی۔

⑥ اسبابِ نزول جاننے کا تیسرا فائدہ یہ ہے کہ اس سے بعض آیات میں بظاہر پائے جانے والے حصر کو دور کیا جاسکتا ہے۔ فرمان باری تعالیٰ ہے:

﴿قُلْ لَا أَجِدُ فِي مَا أُوحِيَ إِلَيَّ مُحَرَّمًا عَلَى طَاعِمٍ يَطْعَمُهُ إِلَّا أَنْ يَكُونَ مَيْتَةً أَوْ دَمًا مَسْفُوحًا أَوْ لَحْمَ خِنزِيرٍ فَإِنَّهُ رِجْسٌ أَوْ فِسْقًا أُهْلًا لِّغَيْرِ اللَّهِ بِهِ﴾ (الانعام: ۱۴۵)

”کہہ دیجیے کہ جو احکام مجھ پر نازل ہوئے ہیں، میں ان میں کوئی چیز، جسے کھانے والا کھائے، حرام نہیں پاتا۔ سوائے اُس کے کہ وہ مرا ہوا جانور ہو یا بہتا لہو یا سور کا گوشت کہ یہ سب ناپاک ہیں یا کوئی گناہ کی چیز ہو کہ اس پر اللہ کے سوا کسی اور کا نام لیا گیا ہو۔“

اس آیت کے ظاہر سے حصر کا وہم پیدا ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ تمام مطعومات حلال ہیں سوائے چار چیزوں (مردار، بہتا ہوا خون، خنزیر کا گوشت اور وہ جانور جس کو غیر اللہ کے نام پر ذبح کیا گیا ہو) کے۔ لیکن اس آیت میں یہ حصر مقصود نہیں۔ یہ محض ایک وہم ہے۔ اگر اس آیت کے سبب نزول کی طرف نظر کی جائے تو یہ وہم حصر رفع ہو جائے گا۔ جیسا کہ علامہ سبکی رضی اللہ عنہ اس آیت کی تفسیر اسبب نزول



میں امام محمد اور یس الشافعی رضی اللہ عنہما کی طرف سے ایک نہایت ہی عمدہ قول نقل کرتے ہیں۔ امام شافعی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

اللہ تعالیٰ نے یہ آیت اس وقت نازل فرمائی جب کفار نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ ضد اور عناد کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی حلال کردہ اشیا کو حرام قرار دیا۔ یعنی یہ آیت کفار کے مناقضہ اور تفضیح کی غرض سے نازل ہوئی (نہ کہ یہ بتانے کی غرض سے کہ کون کون سی اشیا حلال ہیں اور کون کون سی حرام)۔

گویا کہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ”حلال نہیں مگر جو تم نے حرام قرار دیا اور حرام نہیں مگر جو تم نے حلال ٹھہرایا۔“ اس کی مثال یوں سمجھیے کہ کوئی شخص آپ سے کہے: ”تم آج میٹھا نہ کھانا۔“ اور آپ ضد اور مخالفت کی غرض سے اس کے جواب میں کہیں: ”میں آج میٹھا ہی کھاؤں گا۔“ (تو اب اس کا مطلب یہ نہیں ہوگا کہ آپ آج کے دن میٹھا ہی کھاتے رہیں گے اور میٹھے کے علاوہ کوئی چیز نہیں کھائیں گے۔ بلکہ آپ کے اس جواب کا مقصد مد مقابل کی بات کو رد کرنا اور اس کے ساتھ مناقضہ کرنا ہے۔ بالکل اسی طرح اس آیت میں ان چار چیزوں کے ذکر سے یہ مقصود نہیں کہ بس یہ چار چیزیں ہی حرام ہیں۔ بلکہ ان کے علاوہ اور اشیا بھی حرام ہیں۔ لیکن ان چار چیزوں کو کفار نے حلال کر رکھا تھا اس لیے اللہ تعالیٰ نے صرف ان چار چیزوں کا ہی ذکر کیا۔) لہذا آپ کے جملے: ”میں آج میٹھا ہی کھاؤں گا“ کی حقیقت وحیثیت نفی یا اثبات والی نہیں بلکہ صرف اور صرف ضد اور مخالفت والی ہے۔ گویا اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ مطہومات میں سے وحی الہی کے مطابق کسی کھانے والے پر حرام نہیں ہے مگر جسے تم نے حلال ٹھہرایا یعنی مردار، خون، سور کا گوشت اور جس پر غیر اللہ کا نام لیا گیا ہو۔ یعنی اس آیت میں مذکورہ اشیا کے علاوہ کے حلال ہونے کو بیان کرنا مقصود نہیں ہے۔ کیونکہ یہاں ”تحریم“ کو ثابت کرنا مقصد ہے، نہ کہ حلت کو۔

امام شافعی رضی اللہ عنہ کی تائید میں امام الحرمین رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں:

(وهذا في غاية الحسن، ولو لاسبغ الشافعي رحمه الله الى ذلك لما كنا نستجيز مخالفة مالك رحمه الله في

حصر المحرمات فيما ذكرته الاية)). (الاتقان: ۱/۹۵)

”امام شافعی رضی اللہ عنہ کی یہ بات نہایت ہی حسین اور عمدہ ہے۔ اگر امام شافعی رضی اللہ عنہ اس بات کی طرف سبقت نہ لے جاتے، تو ہم محرمات کے اس حصر میں جو کہ (بظاہر) اس آیت میں موجود ہے، امام مالک رضی اللہ عنہ کی مخالفت کرنے کو جائز نہ سمجھتے۔“

**خلاصہ کلام (از مترجم):** ① اس آیت میں حصر ضروری پایا جاتا ہے نہ کہ حصر حقیقی۔

- ② امام مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: حرمت کا حکم، اس آیت میں مذکورہ اشیا نے اربعہ میں محصور ہے۔ اور رہی بات ان اشیا کی، جن کی ممانعت احادیث سے ثابت ہے، تو اس ممانعت سے کراہت مراد ہے (یعنی ممانعت تحریمی مراد نہیں ہے)۔ لیکن امام ابو حنیفہ، امام شافعی، امام احمد رضی اللہ عنہما اور اکثر فقہائے کرام کے نزدیک حکم تحریم ان چار چیزوں میں محصور و محدود نہیں۔ ③ اسباب نزول جاننے کا چوتھا فائدہ یہ ہے کہ سب کے ذریعے حکم کی تخصیص کو ظاہر کیا جاسکتا ہے۔ لیکن صرف اس شخص کے نزدیک جو یہ رائے رکھتا ہو کہ ”اعتبار سبب کی خصوصیت کا ہوتا ہے نہ کہ الفاظ کے عموم کا۔“ پس آیات ظہار، جو کہ سورۃ المجادلہ کے آغاز میں ہیں، ان آیات کا سبب یہ ہے کہ اوس بن صامت بن ہنفون نے اپنی زوجہ حضرت خولہ بنت حکیم بن ہنفون سے ظہار کر لیا تھا۔ پس اس

موقع پر حکم جو کہ ان آیات کو متضمن ہے، ان دونوں میں بیوی کے ساتھ خاص ہے۔ (خاص رائے والے شخص کے نزدیک، جیسا کہ ہم نے اوپر بھی اشارہ دیا ہے) اور اگر یہی مسئلہ ان دونوں میں بیوی (حضرت اوس بن زینبؓ اور حضرت خولہ بنت اخیوتہؓ) کے علاوہ کسی اور کے ساتھ پیش آجائے تو اس وقت کسی اور دلیل کا سہارا لیا جائے گا قیاس وغیرہ کرتے ہوئے۔ لہذا اس وقت ان آیات کا معنی سبب نزول کی معرفت کے بغیر معلوم نہیں ہو سکے گا۔ نیز یہ آیات سبب نزول کی معرفت کے بغیر (العیاذ باللہ) بے ربطی محسوس ہوں گی۔

**فائدہ** مندرجہ بالا فائدہ صرف اس شخص کے نزدیک حاصل ہوگا جو یہ رائے رکھتا ہو کہ اعتبار سبب کی خصوصیت کا ہوتا ہے نہ کہ الفاظ کے عموم کا۔ لیکن یہ رائے جمہور کی رائے کے خلاف ہے۔ جمہور کی رائے یہ ہے کہ اعتبار الفاظ کے عموم کا ہوتا ہے نہ کہ سبب کی خصوصیت کا۔ یاد رہے یہ اختلاف محض نظریاتی اختلاف ہے۔ عملاً اس سے کوئی خاص فرق نہیں پڑتا۔

۵) سبب نزول کا پانچواں فائدہ اس بات کی معرفت کا حصول ہے کہ سبب نزول آیت کے حکم سے خارج نہیں ہوتا بشرطیکہ آیت کے لیے کوئی شخص (خاص کرنے والا) پایا جائے۔ کیوں کہ اس پر اجماع ہے کہ سبب کا حکم قطعی طور پر باقی رہتا ہے۔ لہذا اس کے ماسوا پر تخصیص قاصر ہوگی۔ پس اگر سبب نزول موجود ہو تو تخصیص کی وجہ سے اُسے خارج سمجھنا جائز ہوگا۔ باوجود اس کے کہ اس کو قطعی طور خارج ماننا جائز نہیں ہے اجماع مذکور کی وجہ سے۔ اسی وجہ سے امام غزالیؒ نے "میں فرماتے ہیں: "اسی بنا پر اجتہاد کے ذریعے حکم تخصیص کی وجہ سے سبب کو خارج کرنے کے ممنوع ہونے کی طرف اشارہ ملتا ہے۔" لہذا نبی کریم ﷺ کے قول: "الولد للفرأش" میں سے مستقرشہ باندی کو خارج کر کے امام ابوحنیفہؒ نے خطا کی ہے۔ کیوں کہ خبر (حدیث) وارد ہوئی ہے "زعمہ کی باندی" کے بارے میں کہ جب "زعمہ" کے بیٹے "عمدہ" نے کہا کہ یہ (لڑکا) میرا بھائی اور میرے باپ کی باندی کا بیٹا ہے۔ اور میرے باپ کے بستر پر پیدا ہوا ہے۔ تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا: "أَلَوْلَئِ لِيْفَرَأِشَ وَيَلْعَاهِرُ الْحَجْرُ"۔ بچہ تو صاحب فراش کے لیے ہے اور زانی کے لیے سنگ ساری ہے۔" پس باندی کے لیے فراش ثابت ہو گیا۔ اور امام ابوحنیفہؒ نے تک یہ سبب نہیں پہنچا تھا اس لیے انھوں نے باندی کو عموم سے خارج مان لیا تھا۔

(سبب نزول جاننے کے پانچویں فائدہ کو یوں بھی بیان کیا جاسکتا ہے:

"اگر سبب نزول یا سبب ورود معلوم نہ ہو تو انسان اجتہاد کے ذریعے سے کسی آیت یا حدیث کے حکم میں پائی جانے والی تعیم میں تخصیص کر بیٹھتا ہے۔" مثلاً

((أَلَوْلَئِ لِيْفَرَأِشَ وَيَلْعَاهِرُ الْحَجْرُ)). (صحیح البخاری: ۲۵۳)

"بچہ تو صاحب فراش کے لیے اور زانی کے لیے سنگ ساری ہے۔"

اس حدیث میں بیان کردہ حکم عام ہے۔ یعنی کسی عورت کی کوئی تخصیص نہیں ہے۔ کوئی بھی عورت ہو، اگر اس کے ہاں بچہ

پیدا ہوتا ہے تو بچے کا سبب اسی مرد سے ثابت ہوگا جس کے فراش میں وہ عورت ہے۔ اور جو زانی ہوگا اس کو سنگ سار کیا جائے گا۔

لیکن بعض فقہاء نے اس حدیث کے پس منظر سے لاعلمی کی وجہ سے اور اجتہاد کے ذریعے سے اس حدیث کے حکم سے

سفرشہ باندی کو خارج کر کے تعیم میں تخصیص کر دی ہے۔ ان بعض فقہاء کا کہنا ہے کہ اگر صاحب فراش سفرشہ باندی سے پیدا

ہونے والے بیچ کے نسب کا انکار کر دے تو اس کا انکار قبول کر لیا جائے گا۔ اور مسفرشہ باندی کے علاوہ باقی جتنی بھی خواتین ہیں، ان میں صاحب فراس کا انکار معتبر نہ ہوگا الا یہ کہ لعان کا حکم لگایا جائے۔ (از مترجم)

② اسباب نزول جاننے کا چھٹا فائدہ یہ ہے کہ اس کی وجہ سے آیت کا ابہام مکمل طور پر دور ہو جاتا ہے اور علی وجہ الکلہا تعیین کا فائدہ حاصل ہوتا ہے۔ جیسا کہ مروان بن الحکم نے تہمت لگاتے ہوئے کہا کہ یہ آیت:

﴿وَالَّذِي قَالَ لِيَا وَيْلَيْ يَوْمَ أُتِيَ لَتَكْفًا﴾ (الاحقاف: ۱۷)

”اور جس شخص نے اپنے ماں باپ سے کہا کہ میں تم سے بیزار ہوں۔“

حضرت عبدالرحمن بن ابی بکر بنینہ کے بارے میں نازل ہوئی تھی۔ یعنی انھوں نے اپنے والدین سے یہ بات کہی تھی۔ تو اس موقع پر حضرت عائشہ بنینہ نے مروان بن الحکم کی بات کی تردید کرتے ہوئے فرمایا:

”اللہ کی قسم! اس آیت میں حضرت عبدالرحمن بن ابی بکر بنینہ مراد نہیں ہیں۔ اور اگر میں چاہوں تو نام لے کر بتا سکتی ہوں کہ اس آیت میں کون مراد ہے۔“

④ اسباب نزول جاننے کا ساتواں فائدہ یہ ہے کہ اس کی وجہ سے آیات کو زبانی یاد رکھنے اور سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ کیونکہ اسباب کا مسببات کے ساتھ اور احکام کا حوادث کے ساتھ بڑا گہرا ربط ہوتا ہے۔ نیز حوادث و واقعات کے ساتھ اشخاص، ازمناہ اور امکانہ بھی متعلق ہوتے ہیں۔ لہذا اسباب نزول کے علم سے آیت کا حقیقہ اپنے تمام لوازمات کے ساتھ صرف سمجھ ہی نہیں آتی بلکہ ذہن میں راسخ ہو جاتی ہے۔

## اسباب نزول جاننے کا بنیادی قاعدہ

کسی بھی آیت کا شان نزول جاننے کے لیے روایات صحیحہ کا ہونا ناگزیر ہے۔ احادیث صحیحہ کے بناہم کسی آیت کا شان نزول نہیں جان سکتے۔ حضرت عبداللہ بن عباس بنینہ کی سند سے امام واحدی رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

(( قَالَ اتَّقُوا الْحُدَيْبِيَّةَ عَيْبَىٰ إِلَّا مَا عَلِمْتُمْ فَمَنْ كَذَّبَ عَلَيَّ مُتَعَدِّدًا فَلَيْتَبَوُّهُ مَقْعَدًا مِنَ النَّارِ وَمَنْ قَالَ فِي الْقُرْآنِ بِرَأْيِهِ فَلَيْتَبَوُّهُ مَقْعَدًا مِنَ النَّارِ ))۔ (الترمذی: ۲۹۵۱)

”جب تک تمہیں یقین طور پر علم حاصل نہ ہو اس وقت تک میری جانب سے حدیث بیان کرنے سے بچو۔ کیونکہ جس نے جان بوجھ کر میری طرف کوئی جھوٹ بات منسوب کی، تو وہ اپنا ٹھکانا جہنم میں بنا لے۔“

قرآن کریم کے اسباب نزول کی بابت بجز ان لوگوں کی ہدایت اور سامی بیان کے جنہوں نے قرآن کو پیشم خود دیکھا اور اسباب نزول میں درک پیدا کیا اور اس علم کی تحقیق کی ہے، کوئی دوسری بات کہنا ہرگز جائز نہیں۔

لہذا اسباب نزول کے باب میں صرف وہ ہی روایت مقبول ہوگی، جو کسی صحابی سے مروی ہو۔ صحابی کے علاوہ کسی اور کی روایت کو وہ تقویت نہیں ملے گی۔ کیونکہ صحابی کے قول میں کسی قسم کے اجتہاد کی گنجائش نہیں ہوتی۔ قول صحابی کا حکم مرفوع الی النبی ﷺ

منائل العسرفان فی علوم القرآن: جلد ۱

کا حکم رکھتا ہے۔ کیونکہ صحابی وہ ہستی ہے جس نے بنفس نفیس حضور اکرم ﷺ کی صحبت کا شرف حاصل کیا۔ لہذا اس ہستی کے قول کو کسی غیر صحابی کے قول کی وجہ سے رد یا مرجوح قرار نہیں دیا جاسکتا۔

اور وہ اسباب نزول جو حدیث مرسل کے واسطے سے نقل کیے گئے ہوں، یعنی ان کی سند میں کوئی صحابی ساقط ہو اور بیان کرنے والا تابعی ہو، تو اس وقت اس قول کو قبول نہیں کیا جائے گا الا یہ کہ اس کی تائید میں کوئی اور حدیث مرسل موجود ہو اور اس کو روایت کرنے والے وہ ائمہ تفسیر ہوں جو براہ راست صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے اخذ کرتے ہیں۔ جیسے: مجاہد، عکرمہ، سعید بن جبیر رضی اللہ عنہم۔

## اسباب نزول بیان کرنے کی مختلف تعبیرات اور انداز

اسباب نزول بیان کرنے کے لیے مختلف الفاظ و تعبیرات اور انداز اپنائے گئے ہیں۔ مثلاً:

① بعض اوقات لفظ سب استعمال کرتے ہوئے یوں کہا جاتا ہے: سَبَبُ نَزْوِلِ الْآيَةِ كَذَا.... یعنی فلاں آیت کے نزول کا سبب یہ ہے.... سبب کا لفظ استعمال کرنے والا انداز، اس آیت کی سمیت بیان کرنے میں عبارت النص کا درجہ رکھتا ہے۔ جس میں کسی قسم کے احتمال کی گنجائش نہیں۔

② آیت کا شان نزول سمجھتے ہوئے کسی واقعے کو بیان کرنے سے پہلے لفظ سبب کی بجائے حرف ”فاء“ استعمال کیا جاتا ہے۔ اس انداز سے بھی عبارت النص کے درجے میں سمیت پر دلالت ہوتی ہے۔ جیسے حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی روایت ہے:

كَانَتْ الْيَهُودُ تَقُولُ: ((مَنْ آتَى أَمْرًا ذُرِّهًا، فِي قُبُلِهَا، جَاءَ الْوَلَدُ أَحْوَلُ))، فَأَنْزَلَ اللَّهُ:

﴿يَسْأَلُكُمْ حَرْثُكُمْ كَلِمَةً - فَأَتَوْا حَرْثَكُمْ أَنِّي سَبَبْتُمْ - وَقَدْ مَوَّلَ أَنْفُسَكُمْ - وَاتَّقُوا اللَّهَ وَاعْلَمُوا أَنَّكُمْ مُلْقَوَةٌ - وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِينَ﴾ (البقرة: ۲۳۳)

”یہود یہ کیا کرتے تھے کہ اگر کوئی آدمی اپنی بیوی کے ساتھ پیچھے کے راستے سے اگلے حصے میں دخول کرتا ہے، تو اس کے ہاں بھیگا بچہ پیدا ہوگا۔“

فانزل الله... پس اس موقع پر اللہ تعالیٰ نے آیت نازل فرمائی:

”تمہاری عورتیں تمہاری کھیتی ہیں۔ تو اپنی کھیتی میں جس طرح چاہو جاؤ۔ اور اپنے لیے نیک عمل آگے بھیجو۔ اور اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو اور جان رکھو کہ ایک دن تمہیں اس کے رو برو حاضر ہونا ہے اور اے پیغمبر ﷺ! ایمان والوں کو بشارت سنا دو۔“

اس روایت میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے حرف ”فاء“ استعمال کیا۔

③ لفظ سبب یا حرف فاء استعمال نہیں کیا جاتا، بلکہ سیاق و سباق ہی سے بہت واضح انداز میں یہ بات سمجھ آ رہی ہوتی ہے کہ اس آیت کے نزول کا سبب یہ ہے۔ اس کی مثال حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت ہے:

((عَنِ ابْنِ مَسْعُودٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ: كُنْتُ أَمْشِي مَعَ النَّبِيِّ ﷺ بِالْمَدِينَةِ، وَهُوَ يَتَوَكَّأُ عَلَى عَسِيبٍ، فَمَرَّ بِنَفَرٍ مِنَ الْيَهُودِ، فَقَالَ بَعْضُهُمْ: لَوْ سَأَلْتُمُوهُ فَقَالُوا: حَدَّثَنَا عَنِ الرُّوحِ، فَقَامَ سَاعَةً وَرَفَعَ رَأْسَهُ فَعَرَفْتِ أَنَّهُ



یوحی الیہ، حتی صعد الوحي، ثم قال:

﴿قُلِ الرُّوحُ مِنْ أَمْرِ رَبِّي وَمَا أُوتِيتُمْ مِنَ الْعِلْمِ إِلَّا قَلِيلًا﴾ (الاسراء: ۸۵)

اس روایت میں لفظ ”سبب“ استعمال ہوا نہ ہی حرف ”فاء“۔ لیکن سیاق و سباق سے واضح طور پر معلوم ہو گیا کہ آیت: ﴿قُلِ الرُّوحُ مِنْ أَمْرِ رَبِّي﴾ کا شان نزول کیا ہے۔

اس تعبیر یا انداز سے بھی عبارتہ النص کے درجے میں سببیت پر دلالت ہوتی ہے۔

② بعض اوقات لفظ ”سبب“ حرف ”فاء“ یا سیاق و سباق کے بجائے آیت سے متعلق روایت نقل کرتے ہوئے: ﴿تَوَلَّيْتُ هَذِهِ الْآيَةَ فِي كَذَا﴾ کی طرح کے الفاظ استعمال کیے جاتے ہیں۔ یاد رہے یہ انداز یا تعبیر سببیت بیان کرنے میں عبارتہ النص کا درجہ نہیں رکھتی۔ بلکہ اس میں اور احتمال بھی پایا جاتا ہے۔ مثلاً: ﴿تَوَلَّيْتُ هَذِهِ الْآيَةَ فِي كَذَا﴾ سے مقصود یہ ہو کہ فلاں مسئلہ یا معاملہ اس آیت کے حکم کے تحت داخل ہے۔

## ایک ہی موضوع میں مختلف تعبیرات پائے جانے کی صورتیں

(الف) اگر کسی ایک موضوع میں دو تعبیرات جمع ہو جائیں۔ ان میں سے ایک عبارتہ النص کا درجہ نہ رکھتی ہو، بلکہ محتمل ہو۔ تو عبارتہ النص کا درجہ رکھنے والی عبارت یا تعبیر و انداز کو ترجیح دی جائے گی۔ کیونکہ دلالت کے اعتبار سے محتمل سے نسبتاً نص کا درجہ قوی ہوتا ہے۔ مذکورہ اصول پر ذیل میں ایک مثال پیش کی جا رہی ہے، جس میں ایک ہی آیت کے شان نزول کے بارے میں دو روایات جمع ہو گئی ہیں۔

(پہلی تعبیر) صحیح مسلم میں حضرت جابر بن عبد اللہ سے مروی ہے:

كَاتَبَ الْيَهُودُ تَتْمُولُ: (مَنْ آتَى امْرَأَةً مِنْ دُبُرِهَا، فِي قُبُلِهَا، جَاءَ الْوَلَدُ أَحْوَلُ))، فَأَنْزَلَ اللَّهُ:

﴿يَسَّأْؤُكُمْ حَرْثُ لَكُمْ﴾ فَأَوَّلُوا حَرْثَكُمْ أَنِّي شِئْتُمْ رَوْقِينَ مَوْلَا لِنَفْسِكُمْ، وَاتَّقُوا اللَّهَ وَأَعْلَمُوا أَنَكُمْ مُلْقَوَةٌ وَ

يَسِّرُوا الْمُنْمِيزِينَ ﴿البقرة: ۲۳۳﴾

(دوسری تعبیر) صحیح بخاری میں حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے:

قَالَ: أَنْزَلَ اللَّهُ ﴿يَسَّأْؤُكُمْ حَرْثُ لَكُمْ﴾ فِي اثْنَيْنِ الْيَسَاءِ فِي أَذْهَابِهِنَّ.

یہ آیت: ﴿يَسَّأْؤُكُمْ حَرْثُ لَكُمْ﴾ عورتوں کے ساتھ پشت میں صحبت کرنے کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔

ان دونوں تعبیرات میں سے پہلی تعبیر کو ترجیح دی جائے گی کیونکہ وہ زیادہ مفصل اور صریح ہے۔ اور دوسری تعبیر کو حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کا استنباط قرار دیتے ہوئے کہا جائے گا کہ درحقیقت حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کا مطلب یہ نہیں ہے کہ پشت میں صحبت کرنا اس آیت کی رو سے جائز ہے۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ اس آیت سے عورتوں کے ساتھ لواطت کرنے کی حرمت ثابت ہوتی ہے۔ (کیونکہ اس میں عورت کو کھیتی یعنی اولاد کی پیدائش کا ذریعہ قرار دیا گیا ہے اور لواطت میں یہ ممکن نہیں۔)

(ب) اگر کسی ایک موضوع میں دو یا دو سے زیادہ تعبیرات جمع ہو جائیں۔ اور ان تمام تعبیرات میں سے کوئی ایک بھی نص کا درجہ نہ رکھتی ہو۔ مثلاً ایک مفسر نے ﴿تَوَلَّوْا هَذِهِ الْآيَةَ فِي كَذِّهَا﴾ کہا اور دوسرے مفسر نے ﴿تَوَلَّوْا فِي كَذِّهَا﴾ یا اس کے مثل کوئی بھی محتمل تعبیر استعمال کی، تو اس وقت یہ تمام تعبیرات آپس میں مساوی ہوں گی۔ اور وجہ ترجیح نہ پائے جانے کی وجہ سے کسی ایک تعبیر کو راجح قرار دیتے ہوئے اسے سبب نزول ماننا ممکن نہیں ہوگا۔ لہذا ان تمام تعبیرات میں سے کسی ایک کو بھی سبب نزول تسلیم نہیں کیا جائے گا۔

(ج) اگر کسی ایک موضوع میں دو یا دو سے زیادہ تعبیرات جمع ہو جائیں۔ اور وہ تمام تعبیرات نص کا درجہ رکھتی ہوں تو.... یہ ایک مفصل بحث ہے جس کو ہم درج ذیل عنوان کے تحت بیان کر رہے۔

## آیت ایک اور اسباب نزول متعدد

اگر موضوع یا آیت ایک ہو اور اس کے نزول سے متعلق دو روایات جمع ہو جائیں اور دونوں ہی نص کا درجہ رکھتی ہوں۔ یعنی صریح طور پر سبب بننے کی اہل ہوں، تو اس وقت چار صورتیں بنتی ہیں۔

- ① ان دونوں روایات میں سے کوئی ایک روایت سنداً صحیح ہوگی اور دوسری صحیح نہیں ہوگی۔
- ② دونوں ہی صحیح ہوں گی لیکن دونوں میں سے کسی ایک کو وجہ ترجیح کے سبب راجح اور دوسری کو مرجوح قرار دینا ممکن ہوگا۔
- ③ دونوں روایات صحیح ہوں لیکن وجہ ترجیح نہ پائے جانے کی وجہ سے کسی ایک کو راجح اور دوسری کو مرجوح قرار دینا ممکن نہیں ہوگا۔ لیکن دونوں روایات کو معاً تسلیم کرنا ممکن ہوگا۔
- ④ دونوں روایات صحیح ہوں، لیکن نہ ہی تو کوئی وجہ ترجیح پائی جائے اور نہ ہی دونوں کو معاً تسلیم کرنا ممکن ہو۔

مذکورہ بالا تمام صورتوں کو ذیل میں تفصیلاً بیان کیا جا رہا ہے۔

**پہلی صورت** ❁ اگر دونوں روایات میں سے صرف ایک روایت صحیح ہو تو صحیح روایت کو لے لیا جائے گا اور ضعیف یا موضوع وغیرہ کو ترک کر دیا جائے گا۔ مثلاً سورۃ الضحیٰ کی ابتدائی آیات:

﴿وَالضُّحَىٰ ۝۱ وَالْبَيْتِ إِذَا أَسْبَجَ ۝۲ مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ ۝۳ وَمَا قَلَىٰ ۝۴﴾ (الضحیٰ: ۱-۳)

”(اے پیارے نبی ﷺ!) قسم ہے چڑھتے دن کی روشنی کی، اور رات کی جب اس کا اندھیر بیٹھ جائے۔ کہ تمہارے پروردگار نے نہ تمہیں چھوڑا ہے اور نہ ناراض ہوا ہے۔“

اس آیت کے سبب نزول میں صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں حضرت جناب ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ ایک مرتبہ طبیعت ناساز ہونے کی بناء پر حضور اکرم ﷺ ایک یا دو راتیں نماز تہجد نہ پڑھ سکے۔ اس پر ایک کافر عورت نے یہ طعنہ دیا کہ معلوم ہوتا ہے کہ تمہارے (معاذ اللہ) شیطان نے تمہیں چھوڑ دیا ہے۔ اس موقع پر یہ آیات نازل ہوئیں۔

دوسری روایت جس کو طبرانیؒ اور ابن ابی شیبہؒ نے حفص بن میسرہ کی نانی خولہؓ سے نقل کیا ہے۔ حضرت خولہؓ حضور اکرم ﷺ کی خادمہ تھیں۔ حضرت خولہؓ فرماتی ہیں: ایک مرتبہ ایک کتے کا پلٹا حضور اکرم ﷺ کے گھر آ کر چار پائی

کے نیچے بیٹھ گیا اور وہیں اسے موت آگئی۔ اس واقعہ کے چاردن تک آپ ﷺ پر وحی نازل نہ ہوئی۔ آپ ﷺ نے مجھ سے پوچھا کہ اللہ کے رسول (ﷺ) کے گھر میں ایسی کیا بات ہوگئی ہے جو جبرئیل علیہ السلام میرے پاس نہیں آ رہے۔ میں نے دل میں سوچا کہ مجھے گھر کی اچھی طریقے سے جھاڑو وغیرہ لگانی چاہیے۔ سو جب میں نے چارپائی کے نیچے جھاڑو ماری تو ایک ہٹا نکل آیا۔ اس موقع پر یہ آیات نازل ہوئیں۔

مذکورہ دونوں روایات میں سے پہلی روایت کو صحیح ہونے کی وجہ سے ترجیح دی جائے گی۔ علامہ ابن حجر و بیہقی فرماتے ہیں: کتے کے پلے کی وجہ سے حضرت جبرئیل علیہ السلام کے تشریف نہ لانے کا واقعہ مشہور تو ہے لیکن اس کو واضحیٰ والی آیات کا سبب نزول تسلیم کرنا صحیح نہیں۔ کیونکہ اس کی سند میں راوی مجہول ہیں لہذا قابل اعتماد شان نزول وہی ہے جو صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں مروی ہے۔ دوسری صورت ۷۰ اگر دونوں روایات ہی صحیح ہوں لیکن کسی ایک کو وجہ ترجیح کے سبب راجح اور دوسری کو مرجوح قرار دینا ممکن ہو۔ تو ایسی صورت میں راجح کو لے لیا جائے گا اور مرجوح کو چھوڑ دیا جائے گا۔ وجہ ترجیح کچھ بھی ہو سکتی ہے۔ مثلاً ایک روایت کی سند دوسری سے نسبتاً زیادہ قوی ہے۔ یا ایک کا راوی اس واقعہ کے وقت خود موجود تھا جب کہ دوسری کا راوی خود موجود نہیں تھا۔ تو ایسی صورت میں اس روایت کو اختیار کیا جائے گا جس کے حق میں وجہ ترجیح موجود ہے۔ مثلاً

ایک روایت ہے جو صحیح بخاری میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: میں ایک مرتبہ مدینہ منورہ میں حضور اکرم ﷺ کے ساتھ جا رہا تھا اور آپ ﷺ (لاہن کے طور پر) کھجور کی ایک شاخ کا سہارا لے کر چل رہے تھے۔ اتنے میں آپ ﷺ کا گزر کچھ یہودیوں کے پاس سے ہوا تو انہوں نے آپس میں کہا کہ حضور اکرم ﷺ سے کچھ سوالات پوچھنے چاہئیں۔ چنانچہ انہوں نے آ کر آپ ﷺ سے عرض کیا: "ہمیں روح کے بارے میں بتائیے۔" اس پر آپ ﷺ رک گئے اور تھوڑی دیر بعد آپ ﷺ نے سراسر اقدس اٹھایا، میں سمجھ گیا کہ آپ ﷺ پر وحی نازل ہو رہی ہے پھر آپ ﷺ نے فرمایا:

﴿قُلِ الرُّوحُ مِنْ أَمْرِ رَبِّي...﴾ (الاسراء: ۸۵)

"کہہ دیجیے روح میرے پروردگار کے حکم سے (نبی) ہے...."

دوسری روایت وہ ہے جس کو امام ترمذی و بیہقی نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے کہ ایک مرتبہ قریش مکہ نے یہودیوں سے کہا کہ ہمیں کوئی ایسی بات بتاؤ جو ہم ان (حضور اکرم ﷺ) سے پوچھ سکیں۔ اس پر یہودیوں نے کہا کہ ان سے روح کے بارے میں سوال کرو۔ یہودیوں نے حضور اکرم ﷺ سے روح کے بارے میں پوچھا تو یہ آیات:

﴿وَيَسْأَلُونَكَ عَنِ الرُّوحِ - قُلِ الرُّوحُ مِنْ أَمْرِ رَبِّي وَمَا أُوتِيتُمْ مِنَ الْعِلْمِ إِلَّا قَلِيلًا﴾ (الاسراء: ۸۵)

"اور (اے پیغمبر ﷺ) یہ لوگ آپ سے روح کے بارے میں پوچھتے ہیں۔ (پس) آپ کہہ دیجیے کہ روح میرے پروردگار کے حکم سے (نبی) ہے اور تمہیں جو علم دیا گیا ہے، وہ بس تھوڑا ہی سا علم ہے۔"

دوسری روایت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ آیات مکہ مکرمہ میں نازل ہوئیں اور ان کے نزول کا سبب قریش کا سوال کرنا تھا۔ لیکن یاد رہے یہ پہلی روایت زیادہ صریح ہے اور وجہ سے راجح ہے۔

**پہلی وجہ** • پہلی روایت امام بخاری نے نقل کی ہے جب کہ دوسری روایت امام ترمذی نے اور یہ بات تو واضح ہے کہ امام بخاری رضی اللہ عنہ جو روایت نقل کرتے ہیں وہ باقی تمام محدثین کی نقل کردہ روایات سے زیادہ صحیح ہوتی ہے۔

**دوسری وجہ** • پہلی روایت کا راوی اس واقعے کے وقت خود موجود تھا اور وہ اپنی آنکھوں دیکھا واقعہ بیان کر رہا ہے جبکہ دوسری روایت میں ایسا نہیں۔ اور اس میں تو کوئی شک نہیں کہ مشاہدے میں جو قوت پائی جاتی ہے وہ غیر مشاہدے میں نہیں پائی جاتی۔

**تیسری صورت** • اگر دونوں روایات صحیح ہوں اور کوئی وجہ ترجیح بھی موجود نہ ہو لیکن ان دونوں کو معا تسلیم کرنا اور جمع کرنا ممکن ہو تو ایسی صورت میں ان دونوں روایات کو اس ایک آیت کا شان نزول مان لیا جائے گا۔

اور ایک آیت کے دو یا دو سے زیادہ شان نزول مان لینے میں کوئی مانع موجود نہیں ہے کیونکہ عین ممکن ہے کہ دو تین واقعات زمانے کے اعتبار سے قریب قریب واقع ہوئے ہوں اور ان سب واقعات کے جواب میں ایک مرتبہ ایک ہی آیت نازل ہوگی ہواور وہ تمام واقعات و حادثات کا جواب بن گی اور وہ تمام واقعات اس ایک آیت کے لیے شان نزول بن گئے ہوں۔ ہماری اس بات کی تائید علامہ ابن حجر عسقلانی رضی اللہ عنہ کے اس قول سے بھی ہوتی ہے:

((لا مانع من تعدد الاسباب)).

**مثال** • (پہلی روایت) امام بخاری رضی اللہ عنہ نے حضرت عکرمہ عن ابن عباس رضی اللہ عنہما کے طریق سے نقل کیا ہے کہ حضرت ہلال بن امیہ رضی اللہ عنہ نے نبی کریم ﷺ کے سامنے اپنی بیوی پر شریک بن سماء کے ساتھ تہمت لگائی تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ اس پر گواہ لاؤ ورنہ تمہاری پیٹھ پر حد لگائی جائے گی۔ انھوں نے کہا یا رسول اللہ ﷺ! کیا ہم میں سے کوئی شخص اگر اپنی بیوی پر کسی دوسرے کو دیکھے گا تو گواہ ڈھونڈنے دوڑے گا؟

اور ایک روایت کے مطابق حضرت ہلال بن امیہ رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: یا رسول اللہ ﷺ! قسم ہے اس ذات کی جس نے آپ کو حق کے ساتھ مبعوث کیا ہے۔ بے شک میں سچا ہوں اور ضرور بضرور اللہ تعالیٰ میری پیٹھ کو حد سے بری کرنے کے لیے کچھ نازل فرمائیں گے۔ پس اس وقت حضرت جبرئیل علیہ السلام تشریف لائے اور حضور اکرم ﷺ پر یہ آیات نازل ہوئیں۔

﴿وَالَّذِينَ يَرْمُونَ أَزْوَاجَهُمْ وَكُنَّ لَهُمْ شُهَدَاءُ إِلَّا أَنفُسُهُمْ...﴾ (النور: ۷، ۸، ۹)

(دوسری روایت) امام بخاری رضی اللہ عنہ اور امام مسلم رضی اللہ عنہما نے روایت کیا ہے۔ حضرت زہل بن سعد رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

حضرت عوبد بن جریج رضی اللہ عنہ بن حارث حضرت عاصم بن عدی رضی اللہ عنہ کے پاس آئے۔ عاصم بن عدی رضی اللہ عنہ قبیلہ عجلان کے سردار تھے۔ انہوں نے آپ سے کہا کہ آپ لوگوں کا ایسے شخص کے بارے میں کیا خیال ہے جو اپنی بیوی کے ساتھ کسی غیر مرد کو پالیتا ہے، کیا وہ اسے قتل کر دے؟ لیکن تم پھر اسے قصاص میں قتل کر دو گے! آخرا یہی صورت میں انسان کیا طریقہ اختیار کرے؟ رسول اللہ ﷺ سے اس کے متعلق مجھے پوچھ کر بتائیے۔ چنانچہ عاصم بن عدی رضی اللہ عنہ حضور اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ (صورت مذکورہ میں خاوند کیا کرے؟) آپ ﷺ نے ان مسائل (میں سوال و جواب) کو ناپسند فرمایا۔ جب عوبد بن جریج رضی اللہ عنہ نے عاصم بن عدی رضی اللہ عنہ سے پوچھا تو انھوں نے بتا دیا کہ رسول اللہ ﷺ نے ان مسائل کو ناپسند فرمایا ہے۔ حضرت عوبد بن جریج رضی اللہ عنہ نے کہا اللہ کی قسم میں آپ ﷺ سے خود یہ مسئلہ پوچھوں گا۔ چنانچہ وہ خود حضور اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا: یا رسول اللہ ﷺ

ایک شخص اپنی بیوی کے ساتھ ایک غیر مرد کو دیکھتا ہے کیا وہ اس کو قتل کر دے؟ لیکن پھر قصاص میں اس کو قتل کیا جائے گا۔ ایسی صورت میں اسے کیا کرنا چاہیے؟ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے تمہارے اور تمہاری بیوی کے بارے میں قرآن کی آیت اتاری ہے۔ پھر آپ ﷺ نے انہیں قرآن کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق لعان کا حکم دیا ہے۔ اور عویمر بنینفثو نے اپنی بیوی کے ساتھ لعان کیا۔

یہ دونوں روایات صحیح ہیں۔ اور ان کو ایک دوسرے پر ترجیح دینے کے لیے کوئی وجہ ترجیح بھی موجود نہیں ہے۔ لہذا ایسی صورت حال میں حکم یہ ہوگا کہ ان دونوں روایات ہی کو ان آیات کا شان نزول مان لیا جائے کیونکہ عین ممکن ہے کہ یہ دونوں واقعات (حضرت ہلال بنینفثو اور حضرت عویمر بنینفثو والے واقعات) قریب قریب زمانے میں پیش آئے ہوں اور باہم طور پر کہ پہلے یہ ہی سوال حضرت ہلال بنینفثو نے آنحضرت ﷺ سے پوچھا ہو پھر اس کے بعد حضرت عویمر بنینفثو نے بھی یہی سوال پوچھ لیا اور اللہ تعالیٰ نے ان دونوں کے جواب میں ایک ہی مرتبہ لعان والی آیات نازل فرمادیں۔

ان دونوں روایات پر ایک ساتھ عمل کرنا ممکن ہے کیونکہ ان میں کوئی تعارض نہیں پایا جا تا۔ لہذا یہ جائز نہیں ہوگا کہ ہم ایک روایت کو اختیار کر لیں اور دوسری کو چھوڑ دیں۔ کیونکہ ایسا کرنے سے ترجیح بلا مرجح لازم آئے گی۔ لہذا دونوں روایات کو معاً اختیار کرنا ضروری ہوگا۔

امام انطیلب رضی اللہ عنہ اور امام نووی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ”شاید یہ دونوں واقعات اتفاقیاً ایک ہی وقت میں پیش آئے ہوں۔“ اس موقع پر ایک اور امکان بھی ہے وہ یہ کہ آیات لعان حضرت ہلال بن امیہ بنینفثو کے پوچھنے پر نازل ہوئیں لیکن بعد میں حضرت عویمر بنینفثو نے سوال پوچھا تو حضور اکرم ﷺ نے ان آیات لعان کو سامنے رکھتے ہوئے فتویٰ دے دیا جو حضرت ہلال بنینفثو کے سوال کے جواب میں نازل ہوئی تھیں۔

علامہ ابن صباغ فرماتے ہیں: حضرت ہلال بن امیہ کے قصے کے معلوم ہوتا ہے کہ آیات لعان انہی کے سوال کے جواب میں نازل ہوئی تھیں۔ اب رہی یہ بات کہ حضور اکرم ﷺ نے حضرت عویمر بنینفثو سے یہ جو فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے تیرے اور تیری بیوی کے بارے میں قرآن کی آیت اتاری ہے۔ تو وہ اس لیے فرمایا کہ آیات قرآنیہ سے حاصل ہونے والا حکم تو ساری انسانیت کے لیے عام ہے، جس میں حضرت عویمر بنینفثو بھی شامل ہیں۔

**چوتھی صورت** ❁ کسی ایک آیت کے نزول کے بارے میں دو روایات موجود ہوں اور دونوں ہی صحت کے اعتبار سے مساوی ہوں۔ دونوں میں سے کسی ایک کے لیے وجہ ترجیح بھی موجود نہ ہو۔ لیکن دونوں روایات میں بیان کردہ واقعات میں زمانے کے اعتبار سے بہت زیادہ بعد پائے جانے کی وجہ سے دونوں پر معاً عمل کرنا ممکن نہ ہو تو ایسی صورت میں یہ حکم لگایا جائے گا کہ آیت تو ایک ہی ہے لیکن یہ واقعات اور اسباب کے متعدد ہونے کی وجہ سے متعدد اور کثرتاً بار اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل کر دی گئی۔ مثلاً ایک سبب پایا گیا تو اللہ تعالیٰ نے ایک آیت نازل فرمادی پھر کچھ عرصہ بعد دوبارہ وہی سبب پایا گیا تو اللہ تعالیٰ نے دوبارہ سے وہی آیت نازل فرمادی۔ اس حکم پر عمل کرنے سے دونوں یا متعدد روایات پر عمل ہو جائے گا۔ اور ایسا کرنے میں کوئی مانع بھی موجود نہیں ہے۔ جیسا کہ امام الزکشی رضی اللہ عنہ ”البرہان“ میں کہتے ہیں:

”بعض مرتبہ ایک آیت کسی معاملہ میں تقطیعاً نازل ہوتی ہے پھر اسی معاملے کے مثل کوئی اور واقعہ پیش آنے پر تہ کیرا نازل

کردی جاتی ہے تاکہ اُسے یاد رکھا جائے اور بھولانہ جائے۔“

خلاصہ یہ کہ ایک آیت کے نزول سے متعلق تمام احادیث یا روایات کو، آیت کا متعدد بار نازل ہونا تسلیم کر کے جمع کر لیا جائے گا۔ اس کی مثال درج ذیل ہے۔

**پہلی روایت** \* امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ اور امام بزار رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کے شہید ہونے کے بعد ان کی لاش کے پاس کھڑے ہوئے تھے اور حمزہ رضی اللہ عنہ کی لاش مثلاًہ کردی گئی تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لاش سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

”بے شک میں کفار میں سے ستر آدمیوں کو تمہارے عوض میں مثلاًہ بناؤں گا۔“

یہ کہنے کے بعد حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ابھی اسی جگہ کھڑے تھے کہ حضرت جبرائیل امین علیہ السلام سورۃ النحل کی آخری تین آیات:

﴿وَإِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوا بِيَسْئَلٍ مَّا عَوْقَبْتُمْ بِهِ...﴾ (نحل: ۱۲۶)

”اگر تم ان کو تکلیف دینی چاہو تو اتنی ہی دوجہتی تکلیف تم کو ان سے پہنچی ہے....“

لے کر نازل ہوئے۔

**دوسری روایت** \* امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ اور امام حاکم رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے نقل کرتے ہیں۔ حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نے فرمایا: غزوہ احد میں چونکہ (۶۳) انصاری اور حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ سمیت چھ (۶) مہاجرین شہید ہوئے تھے۔ ان سب کو مشرکین نے مثلاًہ بنا دیا تھا۔ انصار صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے جب ان شہداء کی حالت دیکھی تو کہنے لگے:

”اگر ہم بھی کفار پر کسی معرکہ میں فتح پائیں گے تو اس سے بدرجہا بڑھ کر برا سلوک ان کے مقتولین کے ساتھ کریں گے۔“

چنانچہ فتح مکہ کا دن آیا تو اللہ تعالیٰ نے آیات: ﴿وَإِنْ عَاقَبْتُمْ...﴾ نازل فرمائیں۔

پہلی روایت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ آیات غزوہ احد کے موقع پر نازل ہوئیں اور دوسری روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلی فتح مکہ کے دن نازل ہوئیں۔ حالانکہ غزوہ احد اور فتح مکہ میں کئی سالوں کا فرق و فاصلہ ہے۔ لہذا اب یہ کہنا بھی ممکن نہ ہوگا کہ پہلی ایک واقعہ پیش آیا اور پھر اس کے فوراً بعد ہی دوسرا واقعہ پیش آ گیا اور اللہ تعالیٰ نے دونوں واقعات کے جواب ایک ہی آیت نازل فرمادی۔ اس وقت ہمارے پاس اس کے سوا کوئی راستہ نہیں کہ ہم یہ تسلیم کر لیں کہ یہ آیت متعدد بار نازل ہوئی ہے، ایک مرتبہ غزوہ احد کے موقع پر اور ایک مرتبہ فتح مکہ کے موقع پر۔

بعض علماء کا کہنا ہے کہ یہ آیات دونیں بلکہ تین مرتبہ نازل ہوئیں۔ ایک مرتبہ تو ہجرت سے پہلے یہ پوری مکمل سورت مکہ مکرمہ میں نازل ہوئی کیونکہ یہ سورت مکی ہے۔ پھر اس سورت کی صرف یہ آخری آیات دوسری مرتبہ غزوہ احد کے موقع پر اور تیسری مرتبہ فتح مکہ کے دن نازل ہوئیں۔

اور بعض علماء کا کہنا ہے کہ آخری تین آیات کے علاوہ سورۃ النحل پوری کی پوری مکہ مکرمہ میں نازل ہو چکی تھی۔ لیکن اس کی آخری تین آیات ہجرت کے بعد نازل ہونے کی وجہ سے مدنی ہیں۔ پس ان کے نزدیک ان آیات کا نزول تین کے بجائے دو مرتبہ مانا جائے گا۔



(ف) مذکورہ قول سے ہمیں یہ بھی معلوم ہوا کہ یہ ممکن ہے کہ ایک سورت کی ہو لیکن اس کی کچھ آیات مدنی ہوں اور یہ بھی ممکن ہے کہ ایک سورت مدنی ہو لیکن اس کی کچھ آیات کی ہوں۔

**اعتراض** ① ایک آیت جب ایک مرتبہ نازل ہو چکی تھی اور وہ حضور اکرم ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو یاد بھی تھی تو پھر دوبارہ سے اسی آیت کو نازل کرنے کا کیا فائدہ؟ اور اگر اسی آیت کی طرف دوبارہ متوجہ کرنا تھا تو نازل کیے بغیر بھی تو متوجہ کیا جاسکتا تھا؟

**جواب** ① ایک ہی آیت کے تکرار نزول میں سب سے بڑی حکمت اللہ تعالیٰ کی طرف سے بندوں کو متنبہ کرنا ہے۔ نیز ان وصایا اور فوائد کی طرف متوجہ کرنا ہے جن کی ہمیں بہت زیادہ حاجت ہوتی ہے۔ سورۃ النحل کی ان آخری آیات ہی کو لے لیجیے۔ کہ ان آیات کے تکرار نزول میں درج ذیل حکمتیں اور مقاصد پوشیدہ ہیں: بندوں کو اس امر پر متنبہ کرنا کہ جب تمہارا کسی سے معاملہ ہو تو انصاف کو مد نظر ضرور رکھو کہیں جذبات یا انتقام کی بنا پر حد سے تجاوز نہ کر بیٹھنا۔ غصے کے دقت بھی اپنے اوپر قابو رکھنا۔ مخلوق سے قصاص لیتے ہوئے خالق کو ذہن میں رکھنا۔ صبر و استقامت پر عمل پیرا رہنا۔ اللہ تعالیٰ پر بھروسہ رکھنا۔ اللہ تعالیٰ کی مدد و نصرت کا یقین رکھنا۔ اور یہ تمام باتیں اس کے لیے ہیں جو اللہ سے ڈرتا ہے اور اپنے اعمال کو بہتر بنانے کی کوشش کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ بھی ہمیں ان لوگوں میں شمار کر لے۔ آمین۔

## آیات متعدد اور سبب نزول واحد

مذکورہ بالا صورتوں کے برعکس، بعض اوقات یہ بھی ہوتا ہے کہ متفرق، متعدد آیات کے نزول کا ایک ہی سبب بیان ہوتا ہے اور اس بات میں کوئی اشکال نہیں ہے اور ایسا کرنا لوگوں کی تذکیر و نصیحت کے لیے منافی نہیں ہے۔ بلکہ یہ طریقہ تو عظیم و نصیحت کے لیے زیادہ مبلغ اور اظہر فی البیان ہے۔

سبب ایک ہو اور نازل ہونے والی آیات متعدد ہوں، اس کی دو مثالیں ذیل میں مذکور ہیں۔

① **مثال** ① حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے:

رسول اللہ ﷺ ایک درخت کے سایے میں تشریف فرماتے۔ آپ ﷺ نے ہم سے فرمایا ابھی تمہارے پاس ایک آدمی آئے گا جو تمہاری طرف شیطان کی دو آنکھوں سے دیکھتا ہے۔ پس جب وہ تمہارے پاس آئے تو تم اس سے کلام مت کرنا۔ ابھی تھوڑی دیر ہی گزری تھی کہ ایک آدمی نمودار ہوا جس کی دونوں آنکھیں نیلی تھیں۔ آپ ﷺ نے اُسے اپنے پاس بلوایا اور فرمایا تو اور تیرے ساتھی مجھے برا کیوں کہتے ہیں؟ (اُس آدمی نے انکار کیا کہ ایسا نہیں) پس وہ آدمی چلا گیا اور اپنے ساتھیوں کو حضور اکرم ﷺ کے پاس لے کر آیا۔ وہ سب حضور اکرم ﷺ کے سامنے قسمیں کھانے لگے کہ ہم نے آپ کو برا نہیں کہا۔ وہ قسمیں کھاتے رہے یہاں تک آپ ﷺ نے ان سے درگزر فرمایا۔ پس اُس موقع پر درج ذیل آیات نازل ہوئیں:

﴿يَخْلِفُونَ بآلِهِ مَا قَالُوا ۗ وَ لَقَدْ قَالُوا كَلْبَةَ الْكَفْرِ وَ كَفَرُوا بَعْدَ إِسْلَامِهِمْ وَ هَتُّوْا بِمَا لَمْ يَنَالُوْا ۗ وَمَا

”محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ“

نَفْسُوآ إِلَّا أَنْ أَعْنَهُمُ اللَّهُ وَ رَسُوْلُهُ مِنْ فَضْلِهِ ۚ فَإِنْ يَتُوبُوا يَكْ خَيْرًا لَّهُمْ ۚ وَإِنْ يَتَوَكَّلُوا يُعَذِّبَهُمُ اللَّهُ عَذَابًا أَلِيمًا فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ ۚ وَمَا لَهُمْ فِي الْأَرْضِ مِنْ وَّلِيٍّ وَلَا نَصِيْبٍ ﴿٤٣﴾ (التوبة: ٤٣)

”یہ اللہ کی قسمیں کھاتے ہیں کہ انہوں نے تو کچھ نہیں کہا حالانکہ انہوں نے کفر کا کلمہ کہا ہے اور یہ اسلام لانے کے بعد کافر ہو گئے ہیں اور ایسی بات کا قصد کر چکے ہیں جس پر قدرت نہیں پاسکے۔ اور انہوں نے مسلمانوں میں عیب ہی کون سا دیکھا ہے سوائے اس کے کہ اللہ نے اپنے فضل سے اور اس کے پیغمبر ﷺ نے اپنی مہربانی سے ان کو دولت مند کر دیا ہے۔ سو اگر یہ لوگ توبہ کر لیں تو ان کے حق میں بہتر ہوگا اور اگر منہ پھیر لیں تو اللہ ان کو دنیا اور آخرت میں دکھ دینے والا عذاب دے گا اور زمین میں ان کا کوئی دوست اور مددگار نہ ہوگا۔“

اس واقعے کو ابن جریر الطبری، علامہ طبرانی اور ابن مردودہ رحمہم اللہ نے اپنی اپنی کتب میں نقل کیا ہے۔ اسی واقعے کو امام حاکم رحمہم اللہ اور امام احمد رحمہم اللہ نے بھی نقل کیا ہے لیکن وہ اس واقعے کو نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ اس موقع پر اللہ تعالیٰ نے درج ذیل آیات نازل فرمائیں:

﴿يَوْمَ يَبْعَثُهُمُ اللَّهُ جَمِيعًا فَيَحْلِفُونَ لَهُ كَمَا يَحْلِفُونَ لَكُمْ وَيَحْسَبُونَ أَنَّهُمْ عَلَىٰ شَيْءٍ ۗ أَلَا إِنَّهُمْ هُمُ الْكٰذِبُونَ ﴿١٩﴾ اسْتَحْوَذَ عَلَيْهِمُ الشَّيْطٰنُ فَاَنسٰهُمْ ذِكْرَ اللّٰهِ ۗ اُولٰٓئِكَ حِزْبُ الشَّيْطٰنِ ۗ اَلَا اِنَّ حِزْبَ الشَّيْطٰنِ هُمُ الْخٰسِرُونَ ﴿٢٠﴾﴾ (المجادلہ: ۱۹، ۲۰)

”جس دن اللہ ان سب کو جلا اٹھائے گا تو جس طرح تمہارے سامنے قسمیں کھاتے ہیں اسی طرح اس کے سامنے بھی قسمیں کھائیں گے اور خیال کریں گے کہ ایسا کرنے سے کام چل جائے گا۔ سو یہ ہی تو ہیں جھوٹے۔ شیطان نے ان کو قابو میں کر لیا ہے اور اللہ کی یاد ان کو بھلا دی ہے۔ یہ لوگ شیطان کا ٹولہ ہیں اور سن رکھو کہ شیطان کا ٹولہ ہی نقصان اٹھانے والا ہے۔“

**فائدہ** ۱۰ مثال میں واضح ہے کہ واقعہ یا شان نزول ایک ہی ہے جب کہ آیات متعدد ہیں۔

۲) **مثال** ۱۱ پہلی مثال میں سبب نزول ایک اور آیات دو، ہوں کا نمونہ پیش کیا گیا۔ اب دوسری مثال میں سبب نزول ایک اور آیات دو سے زیادہ، ہوں کا نمونہ پیش کیا جا رہا ہے۔ دیکھیے:

① امام ترمذی رحمہم اللہ اور امام حاکم رحمہم اللہ نے روایت کیا ہے: حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا:

”یا رسول اللہ ﷺ! میں نے ہجرت کے بارے میں اللہ تعالیٰ سے عورتوں کا بالکل بھی ذکر نہیں سنا۔“ پس اس وقت اللہ تعالیٰ نے یہ آیات نازل فرمائیں۔

﴿فَاسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ أَنِّي لَا أُضِيعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْكُمْ مِّمَّنْ ذَكَرَ أَوْ أُنْشِيَ ۖ بَعْضُكُمْ مِنْ بَعْضٍ فَالَّذِينَ هَاجَرُوا وَأُخْرِجُوا مِنْ دِيَارِهِمْ وَأُوذُوا فِي سَبِيلِي وَقَاتَلُوا وَقُتِلُوا أُولَٰئِكَ الَّذِينَ هُمْ سَيِّئَاتِهِمْ وَلَٰذِئذِ نَعْتَدُ لَهُمْ جَزَاءً تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ ۗ ثَوَابًا مِّمَّنْ عِنْدَ اللَّهِ ۗ وَاللَّهُ عِنْدَ كَ حَسُنَ النَّوَابِ ﴿١٩٥﴾﴾ (آل عمران: ۱۹۵)

”تو ان کے پروردگار نے ان کی دعا قبول کر لی (اور فرمایا) کہ میں کسی عمل کرنے والے کے عمل کو مرد ہو یا عورت ضائع

نہیں کرتا۔ تم ایک دوسرے کی جنس ہو تو جو لوگ میرے لیے وطن چھوڑ گئے اور اپنے گھروں سے نکالے گئے اور ستائے گئے اور لڑے اور قتل کیے گئے میں ان کے گناہ دور کر دوں گا اور ان کو بہشتوں میں داخل کر لوں گا جن کے نیچے نہریں بہ رہی ہیں۔ (یہ) اللہ کے ہاں سے بدلا ہے اور اللہ کے ہاں اچھا بدلہ ہے۔“

① امام حاکم ہی مستدرک میں اُم سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت کرتے ہیں: اُم المومنین حضرت اُم سلمہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: میں نے عرض کیا: یا رسول اللہ صلی اللہ علیک وسلم! آپ ﷺ مردوں کا تو ذکر فرماتے ہیں عورتوں کا ذکر نہیں فرماتے۔ تو اس موقع پر یہ آیات نازل ہوئیں:

﴿إِنَّ الْمُسْلِمِينَ وَالْمُسْلِمَاتِ وَالْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ وَالْقَانِتِينَ وَالْقَانِتَاتِ...﴾ (الاحزاب: ۳۵)

” (جو لوگ اللہ کے آگے سراطاعت ختم کرنے والے ہیں یعنی) مسلمان مرد اور مسلمان عورتیں اور مومن مرد اور مومن عورتیں اور فرمانبردار مرد اور فرمانبردار عورتیں.....“

اور یہ آیات نازل ہوئیں:

﴿إِنِّي لَا أَضِغُّ عَلَىٰ عَامِلٍ مِّنْكُمْ مَّنْ ذَكَرَ أَوْ أُذُنِي...﴾ (آل عمران: ۱۹۵)

” کہ میں کسی عمل کرنے والے کے عمل کو مرد ہو یا عورت ضائع نہیں کرتا.....“

② امام حاکم ہی اُم سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت کرتے ہیں: حضرت اُم المومنین اُم سلمہ رضی اللہ عنہا نے آنحضور ﷺ سے عرض کیا: ”مرد جہاد کرتے ہیں اور عورتیں جہاد نہیں کرتیں اور عورتوں کے لیے میراث میں سے بھی نصف حصہ ہے۔“ تو اس موقع پر اللہ تعالیٰ نے آیات نازل فرمائیں:

﴿وَلَا تَسْتَوُوا مَا فَضَّلَ اللَّهُ بِهِ بَعْضَكُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ...﴾ (النساء: ۳۲)

” اور جن چیزوں میں اللہ نے تم میں سے بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے ان کی تمنا نہ کرو۔ مرد جو کچھ کمائی کریں گے ان کو اس میں سے حصہ ملے گا اور عورتیں جو کچھ کمائی کریں گی ان کو اس میں سے حصہ ملے گا۔“

اور آیات نازل فرمائیں:

﴿إِنَّ الْمُسْلِمِينَ وَالْمُسْلِمَاتِ وَالْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ وَالْقَانِتِينَ وَالْقَانِتَاتِ...﴾ (الاحزاب: ۳۵)

” (جو لوگ اللہ کے آگے سراطاعت ختم کرنے والے ہیں یعنی) مسلمان مرد اور مسلمان عورتیں اور مومن مرد اور مومن عورتیں اور فرمانبردار مرد اور فرمانبردار عورتیں.....“

## آیت کے الفاظ اور سبب نزول کا عموم و خصوص

یہ بحث بہت اہم ہے کیوں کہ اس پر اخذ احکام کا دارومدار ہے اسی لیے علمائے اصولیین نے اس بحث کو مستقلاً ذکر کیا ہے۔

ہم یہاں پر اس بحث کا خلاصہ ذکر کریں گے۔

جان لیجیے! کسی سوال یا سبب کے جواب میں وارد ہونے والا لفظ دوم کا ہوگا۔

(۱) وہ لفظ مستقل ہوگا۔ یعنی پوچھے جانے والے سوال یا سبب کی جانب نظر کیے بغیر بھی مفید ہوگا۔

(۲) یا وہ لفظ غیر مستقل ہوگا۔ یعنی جب تک سبب یا سوال کی طرف نظر نہ کی جائے اُس وقت تک وہ لفظ مفید نہیں ہوگا۔

پس وہ جواب یا وہ لفظ جو غیر مستقل ہو اُس کا حکم یہ ہے کہ وہ اُصولیین کے نزدیک بالاتفاق اپنے عموم اور خصوص غیر مستقل میں برابر ہوگا۔

پس اگر کوئی سائل کہے: "هَلْ يَجُوزُ الْوُضُوءُ بِمَاءِ الْبَحْرِ؟" (کیا سمندر کے پانی سے وضو کرنا جائز ہے؟) تو اس کے جواب میں کہا جائے: "نَعَمْ" (ہاں) یا "يَجُوزُ" (جائز ہے)۔ اس وقت اس جواب کا معنی ہوگا کہ ہاں! ہر ایک کے لیے سمندر کے پانی سے وضو کرنا جائز ہے۔ یعنی یہ سائل کے ساتھ خاص نہ ہوگا بلکہ اس جواب میں ہر وہ شخص داخل ہوگا جو سمندر کے پانی سے وضو کرنا چاہے۔ اس لیے کہ اس سوال میں مطلقاً جواز کا استفہام ہے نہ کہ منکظم کی خصوصی حالت کا۔ پس اس لیے یہ جواب غیر مستقل ہوگا کیوں کہ جب تک اس جواب کے ساتھ سوال کو نہ جوڑا جائے اُس وقت تک یہ جواب مفید نہیں۔

اور اگر کوئی سائل کہے: "أَتَوْضَأُ بِمَاءِ الْبَحْرِ؟" (کیا میں سمندر کے پانی سے وضو کر سکتا ہوں؟) تو اس کے جواب میں کہا جائے: "يَجُوزُ لَكَ" (تیرے لیے جائز ہے) اس وقت اس جواب کا معنی ہوگا کہ سمندر کے پانی سے وضو کرنا صرف سائل کے لیے جائز ہے۔ کیوں کہ سوال خاص منکظم کے بارے میں تھا۔ یاد رہے یہ جواب بھی غیر مستقل ہی ہے کیوں کہ یہ جواب بھی بغیر سوال کے مفید نہیں ہوگا۔ نیز اس جواب سے غیر منکظم کے لیے کوئی حکم سمجھ میں نہیں آئے گا بلکہ کسی دوسری دلیل مثلاً قیاس یا حدیث رسول ﷺ کی ضرورت پیش آئے گی۔ حضور اکرم ﷺ کا ارشاد ہے: ((حُكْمِي عَلَى الْوَأْجِدِ حُكْمِي عَلَى الْجَمَاعَةِ))۔ اس ارشاد سے معلوم ہوتا ہے کہ جو حکم کسی ایک کے لیے ہوگا وہ ہی حکم پوری جماعت کے لیے ہوگا۔

پس یہ دونوں جواب ہی غیر مستقل ہیں کیوں کہ یہ بدون سوال مفید نہیں۔

(ف) علمائے اصول حدیث کے نزدیک اس حدیث: ((حُكْمِي عَلَى الْوَأْجِدِ حُكْمِي عَلَى الْجَمَاعَةِ)) کی کوئی اصل موجود نہیں ہے۔ جیسا کہ علامہ الحافظ العراقي نے وضاحت کی ہے۔ نیز امام مزی اور علامہ ذہبی سے بھی، جب اس حدیث کی بابت پوچھا گیا تو دونوں نے انکار کر دیا کہ یہ حدیث نہیں ہے۔<sup>①</sup>

پس وہ لفظ یا جواب جو مستقل ہو، وہ عام یا خاص ہونے میں بعض اوقات سبب کے مثل ہوگا۔ یعنی اگر سبب یا سوال عام ہے تو جواب بھی عام ہوگا اور اگر سبب یا سوال خاص ہے تو جواب بھی خاص ہوگا اور اس وقت اس کا حکم بھی سوال کے مساوی ہوگا۔ پس اگر لفظ عام ہے تو وہ حکم میں اپنے سبب عام کے تمام افراد کو شامل ہوگا اور اگر لفظ خاص ہے تو وہ حکم میں اپنے سبب خاص کے شخص معین کے ساتھ مقصور اور مختص ہوگا۔ یعنی اس میں کوئی اور شامل نہ ہوگا۔ مستقل جواب کی ان دونوں صورتوں میں علمائے اُصولیین کا اتفاق ہے۔ کیوں کہ سبب اور جواب (آیت) کے الفاظ میں برابری ہے۔ یا تو دونوں ہی عام ہیں یا دونوں ہی خاص ہیں۔

پہلی صورت یعنی سبب اور آیت دونوں عام ہوں:

اس صورت کی مثالیں سورہ آل عمران میں بکثرت ملتی ہیں جو غزوہ بدر اور غزوہ احد کے سلسلے میں نازل ہوئیں۔ مثلاً:

﴿وَلَا يَهْتَوُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَنْتُمْ الْأَعْلَوْنَ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ﴾ (آل عمران: ۱۳۹)

”اور سستی نہ کرو اور ٹنگین نہ ہو اور اگر تم کامل مومن ہو تو تم ہی غالب رہو گے۔“

یہ آیت بالعموم اہل احد کے متعلق نازل ہوئی ہے۔ اس کے الفاظ عام ہیں اور اپنے سبب عام کے تمام افراد کو شامل ہیں۔

دوسری صورت یعنی سبب اور آیت دونوں خاص ہوں:

سورہ البیل میں اللہ سبحانہ و تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَيَجَنَّبُهَا الْأَشْجَىٰ الَّذِي يَصْلَىٰ النَّكَارَ الْكُبْرَىٰ ۖ ثُمَّ لَا يَمُوتُ فِيهَا وَلَا يَخْيَىٰ ۚ قَدْ أَفْلَحَ مَنْ تَزَىٰ ۚ وَذَكَرَ

اسْمَهُ رَبِّهِ فَصَلَّىٰ ۚ بَلْ تُؤْتَوْنَ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا ۗ وَالْآخِرَةَ خَيْرٌ ۗ وَأَبْغَىٰ ۚ﴾ (البیل: ۱۱-۱۲)

”اور سب سے بڑے متقی کو جہنم سے بہت دور رکھا جائے گا۔ جو حصول پاکیزگی کے لیے اپنا مال راہِ الہی میں خرچ

کرتا ہے۔ اور اس پر کسی کا کوئی احسان نہیں جس کا بدلہ دیا جائے۔ اس کا مال خرچ کرنا صرف اپنے ربِّ اعلیٰ کی رضا جوئی

کے لیے ہے۔ اور وہ عنقریب راضی ہوگا۔“

تفسیر جلالین میں ہے: یہ آیات حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی شان میں اُس وقت نازل ہوئیں جب انھوں نے حضرت

بلال رضی اللہ عنہ کو خرید کر آزاد کیا تھا۔ حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو ایمان لانے کی وجہ سے سخت تکالیف دی جاتی تھیں۔ اُس موقع پر کفار نے

کہا: ضرور بلال نے پہلے ابو بکر پر کوئی احسان کیا ہوگا جس کا بدلہ اُتارنے کے لیے ابو بکر نے ان کو آزاد کر دیا ہے۔ پس اللہ تعالیٰ نے

ان کفار کے قول کے رد میں یہ آیات نازل فرمائیں کہ کوئی ایک بھی ایسا نہیں ہے جس کا ابو بکر پر کوئی دنیاوی احسان ہو جس کا بدلہ

دیا جاسکے۔ ان کا یہ عمل تو محض اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل کرنے کے لیے ہے۔

اس مثال (آیت) میں ”الْأَشْجَىٰ“ سے بلا شریک غیر ہے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ ہی مراد ہیں۔ اس تخصیص کی دلیل ”الْأَشْجَىٰ“

کا لفظ ہے۔ ”الْأَشْجَىٰ“ الف لام عہد کے ساتھ ہے جو کہ صرف ایک ہی شخص کے لیے استعمال ہو سکتا ہے اور احادیث سے ثابت ہے کہ

وہ شخص حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ ہیں۔ یعنی اس الف لام عہد کے معبود حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ ہی ہیں۔

مستقل جواب کی مزید دو صورتیں

ماقبل آپ جان چکے ہیں کہ جو جواب مستقل ہو وہ عام یا خاص ہونے میں

بھی آپ تفصیل سے پڑھ چکے۔ آآن آپ پڑھیں گے کہ وہ جواب جو مستقل ہو، بعض اوقات عام اور خاص ہونے میں اپنے سبب کی

مثل نہیں ہوتا۔ اس وقت بھی اس کی دو صورتیں بنتی ہیں۔

پہلی صورت یعنی سبب عام اور جواب خاص

سبب عام ہو اور جواب خاص ہو۔ یہ صورت محض عقلی اور فرضی ہے۔ نیز اس کی کوئی مثال قرآن مجید میں موجود نہیں

ہے۔ کیوں کہ اللہ تعالیٰ کی ذات عالی اس سے پاک ہے کہ وہ ایسا قاصر جواب جاری کرے جو اپنے سبب یا سوال کے تمام افراد کو ہی شامل نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ کا کلام تو ہمیشہ سے جامع اور مانع ہے۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ سوال یا سبب تو عام ہو اور اس کا جواب خاص ہو۔ قرآن کریم اپنی فصاحت و بلاغت کی وجہ سے ایسی مثالوں سے خالی اور برابے۔

اس صورت کی اگر فرضی مثال بنائی جائے تو یوں بن سکتی ہے کہ ایک سائل نے سوال پوچھا:

هَلْ يَجُوزُ لِحَيَاةِ الْمُسْلِمِينَ أَنْ يُدَافِعُوا عَنِ أَنْفُسِهِمْ وَيُقَاتِلُوا أَمِنْ قَاتِلِهِمْ؟

”کیا تمام مسلمانوں کے لیے یہ جائز ہے کہ وہ اپنا دفاع کریں اور جو مسلمانوں سے قتال کرے، مسلمان اُس سے قتال کریں؟“

تو جواب دینے والا اُس کو جواب دے:

لَكَ أَنْتَ أَنْ تُدَافِعَ عَنِ نَفْسِكَ وَتُقَاتِلَ مَنْ قَاتَلَكَ.

”تیرے لیے جائز ہے کہ تو صرف اپنی ذات کا دفاع کرے اور جو تجھ سے قتال کرے تو اُس سے قتال کرے۔“

اس مثال سے واضح ہے کہ سوال پوچھنے والے نے سوال عام پوچھا تھا اور جواب دینے والے نے جواب خاص دیا۔

لہذا سبب عام کے مقابلے میں جواب خاص لانا کسی انسان سے تو ممکن ہے، لیکن اللہ تعالیٰ کی ذات سے ممکن نہیں۔ اس لیے قرآن کریم میں اس صورت یعنی سبب عام اور جواب خاص کی مثال ملنا محال ہے۔

**دوسری صورت یعنی سبب خاص اور جواب عام** خاص ہو اور اس کی وجہ سے نازل ہونے والا لفظ یا جواب

عام ہو۔ یا یوں کہہ لیں کہ جواب اعم ہو سبب سے۔ یا یوں کہہ لیں کہ سبب اخص ہو جواب کے الفاظ سے۔ یہ صورت عقلی اعتبار سے بالکل جائز و درست ہے کیوں کہ اس میں کوئی مضائقہ یا کجی نہیں ہے، بلکہ خاص سبب کے مقابلے میں الفاظ کے عموم کے ساتھ جواب دینا تو غایت و مقصود کے زیادہ قریب کر دیتا ہے۔

اس موقع پر علما کا آپس میں اختلاف ہے۔ وہ یہ کہ جواب کا عام ہونا معتبر ہے یا سبب کا خاص ہونا۔ جمہور کہتے ہیں: ”الْعَبْرَةُ بِعُمُومِ اللَّفْظِ لَا بِمَحْضُوعِ السَّبَبِ“ یعنی ”خاص سبب کی بجائے لفظ کے عام مفہوم کو معتبر سمجھا جائے گا۔“ لہذا اس کا حکم شامل ہوگا جواب یا لفظ کے تمام افراد کو۔ (یعنی اگر کوئی آیت کسی خاص سبب کی وجہ سے نازل ہوئی لیکن اس کے الفاظ عام ہیں تو وہ اس سبب سمیت ان تمام افراد کو شامل ہے جو اس لفظ کے تحت آسکتے ہیں۔ کیوں کہ قرآن مجید پوری امت کے لیے ایک عام شریعت کے طور پر نازل ہوا ہے۔ لہذا اعتبار ”عموم لفظ“ کا کیا جائے گا، نہ کہ ”خصوص سبب“ کا۔) برابر ہے کہ وہ سبب کے افراد میں سے ہو یا نہ ہو۔ جب کہ غیر جمہور کا کہنا ہے کہ سبب کے خاص ہونے کا اعتبار کیا جائے گا۔

اس اختلاف کو اس مثال سے سمجھیے کہ جب حضرت ہلال بن امیہ اور ان کی اہلیہ کا معاملہ پیش آیا تو اللہ تعالیٰ نے درج ذیل آیات نازل فرمائیں:

﴿وَأَنْزَيْنَ يَوْمَئِذٍ آيَاتِنَا لَهُمْ شُهَدَاءَ إِيَّائِهِمْ لِمَنْ كَفَرَ بِنَا وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوْنَا الزَّكَاةَ وَكُنُوا عَلَيْهِمْ يُسْمِعِينَ ۖ لِيُخْبِرُوا كَمَا كُنْتُمْ تُفْعَلُونَ ۚ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ كَفَرُوا بِآيَاتِنَا وَكَلِمَاتِنَا ۚ وَالَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِالْآيَاتِ وَالْحُكْمِ ۚ أُولَٰئِكَ سَاءَ مَا يَحْكُمُونَ﴾ (النور: ۶)

”محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ“



”اور جو لوگ اپنی بیویوں پر بدکاری کی تہمت لگائیں اور خود ان کے سوا اور (کوئی) گواہ نہ ہوں تو ہر ایک کی شہادت یہ ہے کہ پہلے تو چار بار اللہ کی قسم کھائے کہ بے شک وہ سچا ہے۔“

ہم یہ دیکھ سکتے ہیں کہ سبب خاص ہے یعنی حضرت ہلال بن یساف بن امیہ کا اپنی بیوی پر تہمت لگانا۔ لیکن اس کے جواب میں لفظ عام کے ساتھ آیت نازل ہو رہی ہے۔ آیت میں لفظ عام ”الذین“ ہے، جو کہ اسم موصولہ ہے اور اسم موصولہ عموم کے صیغوں میں سے ہے۔ تحقیق اس آیت سے حکم ملامتہ بغیر کسی تخصیص کے ثابت ہوتا ہے۔ اور یہ حکم تمام ان قاضیوں کے افراد کو عموم کے ساتھ شامل ہے جنہوں نے اپنے علاوہ کسی اور کو گواہ نہ پایا ہو۔ برابر ہے کہ وہ ہلال بن یساف بن امیہ جو کہ صاحب سبب ہیں، ہوں، یا ان کے علاوہ کوئی اور ہو۔ اور ہمیں یہاں ہلال بن امیہ کے علاوہ کسی اور کی ذات پر یہ حکم لاگو کرنے کے لیے کسی بھی قسم کی دلیل یا قیاس کی ضرورت نہیں، کیوں کہ یہ آیت عموم کے ساتھ اس معاملے میں نص ہے۔ اور یہ بات طے شدہ ہے کہ نص کے ہوتے ہوئے کسی قیاس یا اجتہاد کی ضرورت نہیں ہوتی۔ پس یہ ہے جمہور کا مذہب۔

غیر جمہور کا مذہب ہے: ”إِنَّ الْعَيْنُ قَدْ يَمُضُ صِ السَّبَبِ“ یعنی سبب کے خاص ہونے کو معتبر سمجھا جائے گا۔ مطلب یہ ہوا کہ آیت کے الفاظ اسی حادثے کے ساتھ مقصور ہوں گے جس کی سبب سے وہ آیت نازل ہوئی ہیں۔ اور وہی بات اس حادثے کے مثل دیگر واقعات کی، تو ان کے حکم کو اس آیت کے ذریعے سے معلوم نہیں کیا جائے گا بلکہ ان کو معلوم کرنے کے ایک نئی دلیل کی ضرورت ہوگی۔ اور وہ نئی دلیل قیاس بھی ہو سکتی ہے یا پھر رسول اللہ ﷺ کا یہ قول: ”حُكْمِي عَلَى الْوَاحِدِ خُكْمِي عَلَى الْجَمَاعَةِ“۔ بھی ہو سکتی ہے۔ پس آیت قذف جو کہ حضرت ہلال بن یساف بن امیہ کے حادثے کے وجہ سے نازل ہوئی تھی وہ حضرت ہلال بن یساف کے ساتھ خاص ہوگی۔ اور اگر اس طرح کا واقعہ کسی اور کے ساتھ پیش آئے تو اس کا حکم آیت قذف سے معلوم کرنے کی بجائے اس آیت پر قیاس کرتے ہوئے معلوم کیا جائے گا یا پھر حدیث مذکورہ پر عمل کرتے ہوئے معلوم کیا جائے گا۔

اس موقع پر ایک بات قابل لحاظ ہے وہ یہ کہ مذکورہ اختلاف صرف اس صورت میں ہے کہ جب آیت کے الفاظ کی تخصیص پر کوئی قرینہ موجود نہ ہو۔ اگر کوئی قرینہ موجود ہو تو بالا جماع وہ حکم اس سبب کے ساتھ مقصور اور مخصوص ہوگا۔

جمہور اور غیر جمہور کے اسی اختلاف کی طرف علامہ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کی جانب سے بھی اشارہ ملتا ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

”اس باب میں علمائے تفسیر کے بہت سے اقوال ملتے ہیں۔ مثلاً: هَذِهِ الْأَيَةُ نَزَلَتْ فِي كَذَا... یعنی یہ آیت فلاں معاملے

میں نازل ہوئی، خاص طور پر اگر کوئی شخصیت بھی مذکور ہو۔ جیسا کہ:

① ((إِنَّ آيَةَ الظَّهَارِ نَزَلَتْ فِي امْرَأَةِ قَيْسِ بْنِ ثَابِتٍ)).

”بے شک آیت ظہار قیس بن ثابت کی بیوی کے معاملے میں نازل ہوئی۔“

② ((إِنَّ آيَةَ الْكَلَالَةِ نَزَلَتْ فِي جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللَّهِ)).

”بے شک آیت کلالہ جابر بن عبد اللہ کے معاملے میں نازل ہوئی۔“

③ ((إِنَّ آيَةَ قَوْلِهِ: ﴿وَ أَنْ أَحْكُمُ بَيْنَهُمْ﴾ بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ نَزَلَتْ فِي بَنِي قَرِيظَةَ وَالنَّضِيرِ)).

”بے شک اللہ تعالیٰ کا یہ قول یعنی یہ آیت: ﴿وَ أَنْ أَحْكُمُ بَيْنَهُمْ﴾ بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ نَزَلَتْ فِي بَنِي قَرِيظَةَ وَالنَّضِيرِ کے معاملے میں نازل ہوئی۔“

”محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ“



اسی طرح اور بھی بہت سی نظائر ہیں جن میں وہ کسی ایک شخص کی بجائے پوری قوم کا ذکر کرتے ہیں۔ جیسا کہ کہتے ہیں: "إِنَّهُ نَزَّلَ فِي قَوْمٍ مِّنَ الْمَشْرِيقَيْنِ جِنَّةً"۔ "أَوْ"۔ "فِي قَوْمٍ مِّنَ الْيَهُودِ وَالنَّصَارَى"۔ "أَوْ"۔ "فِي قَوْمٍ مِّنَ الْمُؤْمِنِينَ"۔  
 الغرض وہ کسی ایک شخص کا ذکر کریں یا کسی قوم کا، ان کا مقصد یہ ہرگز نہیں ہوتا کہ اس آیت کا حکم صرف اس شخص یا قوم کے ساتھ خاص ہے کوئی اور اس حکم میں داخل نہیں ہو سکتا۔ بلکہ ان کا مقصد تو یہ ہوتا ہے کہ اس آیت کا حکم اس خاص شخص یا قوم کی نوع کے ساتھ خاص ہے۔ پس وہ آیت جس کا کوئی سبب معین ہو، چاہے وہ آیت امر کی صورت میں ہو یا نبی کی، وہ شامل ہوگی اس خاص شخص کو بھی اور اس کے علاوہ ہر اس شخص کو بھی جو اس کے منزلہ میں ہو۔"

ثمرۂ اختلاف؟ اس اختلاف کا ثمرہ دو طرح سے ظاہر ہو سکتا ہے۔

- ① جمہور کے نزدیک آیت کا حکم اپنے سبب کے افراد کے علاوہ پر بھی ثابت ہوگا اور اس کا ثبوت اسی نازل ہونے والی نص سے استدلال کرتے ہوئے ہوگا۔ اور یہ نص اتفاقی طور پر قطعی امتن ہوگی۔ اور بسا اوقات قطعی الدلالت بھی ہو سکتی ہے۔ اور رہی بات غیر جمہور کی تو ان کے نزدیک سبب کے افراد کے علاوہ پر آیت کا حکم لگانے کے لیے آیت یا نص ہی سے دلیل نہیں پکڑی جائے گی بلکہ قیاس یا حدیث معروف کا سہارا لیا جائے گا۔ اور یہ دونوں غیر قطعی ہیں۔
  - ② جمہور کے نزدیک غیر سبب کے تمام افراد حکم میں شامل ہوں گے، جب تک کہ لفظ ان کو شامل رکھے۔ اور غیر جمہور کے نزدیک حکم ثابت نہیں ہوگا مگر ان افراد کے لیے جو قیاس کی شرائط پر پورا اتریں۔
- "الْعِبْرَةُ بِالْمَعْنَى" یعنی لفظ کے عموم کے معنی ہونے، اور سبب کے خصوص کے غیر معتبر ہونے پر علمائے جمہور کے تین دلائل ملاحظہ کیجئے۔

پہلی دلیل؟ شارع علیہ السلام کی زبان مبارک سے نکلنے والا لفظ بذات خود حجت اور دلیل ہے خواہ وہ سوال یا سبب کا لحاظ کرنے والا نہ ہو۔ لہذا اب سبب کی وجہ سے لفظ کو خاص ماننے کی کوئی وجہ باقی نہیں رہتی۔ نیز ہم کیسے اس چیز کو جو شریعت میں حجت نہیں ہے، تخصیص کی وجہ سے مضبوط (اور معتبر) مان لیں، اُس چیز کے مقابلے میں جو شریعت میں حجت ہے؟ (یعنی لفظ، جو کہ شریعت میں حجت ہے، کے مقابلے میں سوال یا سبب جو کہ شریعت میں حجت نہیں ہے، کو تخصیص کی وجہ سے معتبر یا مستحکم و مضبوط کیسے مان لیا جائے؟ کیوں کہ مستحکم و مضبوط تو اس کو ماننا چاہیے جو شریعت میں حجت ہو۔)

شارع علیہ السلام کی زبان مبارک سے نکلنے والا لفظ بذات خود حجت ہے، اس بات کی دلیل یہ ہے کہ بعض اوقات آپ علیہ السلام کسی حکمت کے مد نظر سوال کو نظر انداز فرماتے ہوئے سوال کے اسلوب سے ہٹ کر جواب ارشاد فرماتے تھے۔ جیسا کہ سورۃ البقرۃ، آیت ۲۱۵ میں ہے:

﴿يَسْأَلُونَكَ مَاذَا يُنْفِقُونَ قُلْ مَا أَنْفَقْتُ مِنْ خَيْرٍ فَلَوْلِ الْوَالِدِينَ وَالْأَقْرَبِينَ وَ السُّبُلَىٰ وَالْمَسْكِينِ وَ الْوَالِدِينَ﴾ (البقرۃ: ۲۱۵)

"(اے نبی ﷺ! وہ لوگ آپ سے پوچھتے ہیں کہ وہ کیا خرچ کریں؟ آپ کہہ دیجئے کہ جو مال بھی تم خرچ کرو، وہ والدین، قریبی رشتہ داروں، یتیموں، مسکینوں اور مسافروں کے لیے ہونا چاہیے۔"

بس آیت کے ظاہر سے معلوم ہو رہا ہے کہ نبی کریم ﷺ سے پوچھا گیا تھا کہ وہ کیا خرچ کریں۔ لیکن نبی کریم ﷺ کی جانب سے جواب آیا کہ وہ کہاں خرچ کریں۔ (یعنی نبی کریم ﷺ سے مصروف کی بابت پوچھا گیا تھا لیکن آنحضرت ﷺ نے مصارف بیان فرمائے۔) اور یہ انداز جواب کسی حکیم و داناکا ہی ہو سکتا ہے، کیوں کہ نفقہ و صدقہ کے مصارف کی معرفت زیادہ اہم ہے، ان دونوں (نفقہ و صدقہ) کے مصروف کی معرفت کی اہمیت سے۔ نیز انسانی فلاح و بہبود کے لیے یہ ضروری ہے کہ نفقہ و صدقہ ان کے حقیقی مستحقین تک پہنچے۔ اور یہ اسی صورت میں ممکن ہے، جب لوگوں کو مصارف کی اہمیت معلوم ہو۔ یہ وجہ تو وہ ہے جو واضح طور پر اس آیت سے معلوم ہوتی ہے۔ لیکن اس آیت میں ”مِنْ خَيْرٍ“ کے الفاظ سے بڑے خفیف اشارے کے ساتھ یہ بھی بتا دیا گیا کہ وہ کیا خرچ کریں۔ (اور واضح انداز میں مصارف بھی بیان کر دیے گئے) نہیں تو اس اجمالی (خفیف) اشارے سے سوال کی حاجت پوری نہ ہوتی۔

جمہور کی دلیل اول کو (قیاس منطقی کے ذریعے) منطقی دلیل کے پیرائے میں بھی ثابت کیا جا سکتا ہے۔ (جس کی تفصیل یہ ہے کہ قیاس منطقی کی دو اقسام ہیں۔ پہلی اقترانی اور دوسری استثنائی ہے۔ قیاس اقترانی وہ قیاس ہے جو دو ایسے قضیوں سے مل کر بنا ہو، جن کو ماننے سے تیسرے قضیے کو ماننا لازم ہو جائے۔ اور پہلے دونوں قضیوں کے درمیان میں کوئی حرف استثناء مثلاً: لیکن (لیکن)، بتلی (بلکہ) یا اِلَّا (مگر/سوائے) وغیرہ مذکور نہ ہو بلکہ لفظ ”وَ“ یعنی ”اور“ مذکور ہو۔ جیسے: ”ہر انسان حیوان ہے اور ہر حیوان جسم والا ہے۔“ نتیجہ: ”ہر انسان جسم والا ہے۔“ اس مثال میں ”ہر انسان حیوان ہے“ پہلا قضیہ جب کہ ”ہر حیوان جسم والا ہے“ دوسرا قضیہ ہے۔ اگر ان دونوں قضیوں کو تسلیم کر لیا جائے تو تیسرے قضیے یا نتیجے یعنی ”ہر انسان جسم والا ہے“ کو ماننا لازم ہو جاتا ہے۔ پس جمہور کی دلیل اول کو قیاس اقترانی کے آئینے میں یوں بیان کیا جائے گا:

”ہر وہ لفظ عام جو کسی سبب خاص پر وارد ہو اور ہر شریعت میں بذات خود حجت ہے اور ہر وہ لفظ عام جو ایسا ہو اس کا عموم معتبر ہوتا ہے۔ نتیجہ: ”ہر وہ لفظ عام جو کسی خاص سبب پر وارد ہو اس کا عموم معتبر ہوگا۔“ وَهَذَا هُوَ الْمَطْلُوبُ.

اسی طرح جمہور کی دلیل اول کو قیاس استثنائی سے بھی ثابت کیا جا سکتا ہے۔ (لیکن اس سے پہلے قیاس استثنائی کے بارے میں جان لینا چاہیے۔ قیاس استثنائی میں پہلے قضیے کو حرف شرط مثلاً ”ان“ کے ذریعے قضیہ شرطیہ بنایا جاتا ہے اور دوسرے قضیے کو ماننے کے لیے حرف استثناء مثلاً: لیکن (لیکن)، بتلی (بلکہ) یا اِلَّا (مگر/سوائے) وغیرہ کا اضافہ کیا جاتا ہے۔ جیسے: ”اگر سورج نکلا ہو ہے تو دن موجود ہے لیکن سورج نکلا ہوا نہیں ہے۔“ نتیجہ: ”دن موجود نہیں ہے۔“ اس مثال میں پہلے قضیے کا پہلا جز ”مقدم“ جب کہ دوسرا جز ”تالی“ کہلائے گا۔

”اگر سبب خاص پر وارد ہونے والے لفظ عام کا عموم معتبر نہ ہو تو شارع ﷺ کے الفاظ بذات خود حجت نہیں ہوں گے۔ لیکن

شارع ﷺ کے الفاظ بذات خود حجت ہیں۔“ لہذا ثابت ہوا کہ اس صورت میں تالی باطل ہے۔ اور یہ تالی جس مقدم کی طرف لے جاتی ہے وہی باطل ہے۔ پس جب مقدم اور تالی دونوں باطل ہیں تو ان کی نقیض خود بہ خود ثابت ہو جائے گی۔ اور وہ (نقیض) یہ ہے: ”انَّ اللَّفْظَ الْعَامَّ الْوَارِدَ عَلَى سَبَبٍ خَاصٍّ يُغْتَبَرُ بِغُضْمِهِ“ (ترجمہ: بے شک کسی سبب خاص پر وارد ہونے والے لفظ عام کا عموم ہی

معتبر ہوگا)۔ وَهَذَا هُوَ الْمَطْلُوبُ .

**دوسری دلیل** کے لیے ان ألفاظ کو وضع کیا گیا ہے، ان ألفاظ سے وہ ہی معنی مراد لیے جائیں۔ ("اطلاق کے وقت" کا مطلب ہے کہ جب ان معانی کو مراد لینے سے کوئی مانع (وجہ یا علت وغیرہ) موجود نہ ہو۔ اور یہاں عموم کا مفہوم مراد لینے سے روکنے والا کوئی مانع موجود نہیں۔ لہذا لفظ اپنے عموم پر باقی رہے گا۔ (یعنی عموم لفظ ہی معتبر ہوگا)۔ اور رہا وہ ہم جو مخالفین نے پیدا کیا، کہ سبب کا خاص ہونا، عموم مراد لینے سے روکنے والا ہے۔ تو یہ وہم دور ہو سکتا ہے، وہ اس طرح کہ محض سبب کا خاص ہونا لفظ عام کے مفہوم میں شامل غیر سبب کے افراد کے نکالنے کو لازم نہیں کرتا۔ لہذا سبب کا خاص ہونا کوئی ایسا قرینہ مانع نہیں، جس کی بدولت لفظ عام سے وہ معنی مراد نہ لیا جائے، جس کے لیے اُسے وضع کیا گیا تھا۔ اور وہ ہے "عموم" جو اپنے تمام افراد کو شامل ہے۔

جمہور کی دلیل ثانی کو قیاسِ اقرتانی سے بھی ثابت کیا جا سکتا ہے۔ وہ اس طرح کہ ہر وہ لفظ عام جو کسی سبب خاص پر وارد ہوا ہو اس سے اطلاق کے وقت عموم ہی مراد لیا جائے گا اور ہر وہ لفظ عام جو ایسا ہو وہ اپنے عموم پر باقی رہتا ہے۔ لہذا ہر وہ لفظ عام جو کسی خاص سبب پر وارد ہوا ہو، اپنے عموم پر باقی رہے گا۔ وَهَذَا هُوَ الْمَطْلُوبُ

اس دلیل کو قیاسِ اشتہائی سے بھی ثابت کیا جا سکتا ہے۔ وہ اس طرح کہ "اگر اطلاق کے وقت کسی خاص سبب پر وارد ہونے والا لفظ عام اپنے عموم پر باقی رہنے والا نہ ہو، تو یہ لازم آئے گا کہ لفظ، بغیر کسی قرینے کے، اپنے موضوع لہ کے علاوہ میں استعمال ہوا ہے۔ لیکن لفظ کا اپنے موضوع لہ کے علاوہ میں استعمال ہونا باطل ہے۔"

لہذا ثابت ہوا کہ اس صورت میں تالی باطل ہے۔ اور یہ تالی جس مقدم کی طرف لے جاتی ہے وہ بھی باطل ہے۔ پس جب مقدم اور تالی دونوں باطل ہیں تو ان کی نقیض خود بہ خود ثابت ہو جائے گی۔ اور وہ (نقیض) یہ ہے:

"إِنَّ اللَّفْظَ الْعَامَّ الْوَارِدَ عَلَى سَبَبٍ خَاصٍّ بَاقٍ عَلَى عُمُومِهِ عِنْدَ الْإِطْلَاقِ۔"

"بے شک اطلاق کے وقت، کسی سبب خاص پر وارد ہونے والا لفظ عام، اپنے عموم پر باقی رہتا ہے۔" وَذَلِكَ هُوَ الْمَطْلُوبُ .

**تیسری دلیل** صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور مجتہدین عظام رضی اللہ عنہم (جو کہ مختلف زمانوں اور علاقوں میں آباد تھے) نے تمام زمانوں اور علاقوں میں رہتے ہوئے اُن تمام حوادث و واقعات میں (جو ان کے ہاں رونما ہو رہے تھے) خاص اسباب پر وارد ہونے والے ألفاظ سے عموم ہی ثابت کیا اور اس کو ثابت کرنے کے لیے انھوں نے کسی اور دلیل یا قیاس وغیرہ کا سہارا نہیں لیا۔ اور اس امر کا انکار کیسے کیا جا سکتا ہے حالانکہ شریعت کے بہت سے اصول کسی خاص سبب پر وجود میں آئے تھے۔ پھر صحابہ و مجتہدین (غور و فکر کے بعد) اس نتیجے پر پہنچے کہ نازل ہونے والے ألفاظ سے عموم ہی مراد ہے، اگرچہ وہ کسی خاص واقعہ سے متعلق نازل ہوئے ہوں۔ پھر انھوں نے اسی عموم کو مدنظر رکھتے ہوئے بہت سے اصول تیار کیے۔ مثلاً انھوں نے آیت سرتہ سے چور کا ہاتھ کاٹنے پر استدلال کیا باوجودیکہ یہ سرتہ والی آیت ایک ڈھال یا حضرت صفوان بن امیہ رضی اللہ عنہ کی چادر چوری ہونے کے خاص واقعے (سبب) پر نازل ہوئی تھی۔ اور اسی طرح انھوں نے آیات ظہار سے استدلال کیا ہے کفارہ مذکورہ ہر اس شخص کے لیے جو اپنی بیوی سے ظہار کر بیٹھے، حالانکہ آیات ظہار مخصوص تھیں جیسا کہ ماقبل تفصیل سے گزر چکا ہے۔ اور اسی طرح آیات لعان کا معاملہ ہے کہ وہ خاص

ایک شخص سے متعلق نازل ہوئی تھیں جیسا کہ ما قبل گزر چکا۔ لیکن صحابہ و مجتہدین نے ان آیات سے حاصل ہونے والا حکم ہر اس شخص پر لگایا جس نے اپنی بیوی پر تقدف کیا ہو اور اس کے پاس گواہ موجود نہ ہوں۔

جمہور کی دلیل ثالث کو بھی قیاس اقرتانی سے ثابت کیا جاسکتا ہے۔ وہ اس طرح کہ کسی بھی خاص سبب پر وارد ہونے والے لفظ کے عموم کو صحابہ اور مجتہدین نے معتبر مانا ہے اور ہر وہ لفظ جس کو صحابہ و مجتہدین معتبر مانتے ہیں، وہ معتبر ہے۔ پس کسی بھی خاص سبب پر نازل ہونے والے لفظ کا عموم ہی معتبر ہوگا۔

اس دلیل کو قیاس استثنائی سے بھی ثابت کیا جاسکتا ہے۔ وہ اس طرح کہ ”اگر خاص سبب پر وارد (نازل) ہونے والے لفظ کا عموم معتبر نہ ہوتا تو صحابہ کرام اور مجتہدین اُس کو معتبر نہ مانتے۔ لیکن صحابہ کرام و مجتہدین نے خاص سبب پر نازل ہونے والے لفظ کے عموم کو معتبر مانا ہے۔“

لہذا ثابت ہوا کہ اس صورت میں تالی باطل ہے۔ اور یہ تالی جس مقدم کی طرف لے جاتی ہے وہ بھی باطل ہے۔ پس جب مقدم اور تالی دونوں باطل ہیں تو ان کی نفیض خود بہ خود ثابت ہو جائے گی۔ وَهُوَ الْمَطْلُوبُ۔

**نوٹ** آپ کے لیے مشکل نہیں کہ آپ ہمارے بیان کردہ قیاس اقرتانیوں میں مقدمات مغزنی اور کبریٰ کے حوالے سے (مزید) استدلال کریں کیوں کہ ہم اس سے قبل جمہور کے تینوں دلائل کو بغیر کسی منطقی اصطلاح کے، آسان و مالوف انداز میں تفصیل سے بیان کر چکے ہیں۔ اور اسی طرح آپ ہمارے بیان کردہ قیاس استثنائیوں میں ملازمات اور بطلان توالی کے حوالے سے بھی (مزید) استدلال کرنے پر قادر ہو گئے ہوں گے۔ فتأمل

## مخالفین کے شبہاتِ خمسہ اور ان کا ردّ

علمائے جمہور کے مخالفین کا کہنا ہے کہ لفظ کا عموم معتبر نہیں، بلکہ سبب کا خاص ہونا معتبر ہے۔ اور وہ اپنے اس قول کی تائید میں پانچ شبہات کا سہارا لیتے ہیں۔ ہم ابھی آپ کے سامنے ان پانچوں شبہات اور ان کا ردّ بیان کریں گے۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

**شبہ اولیٰ** اس بات پر اجماع منعقد ہو چکا ہے کہ اگر کوئی شخص موجود ہو تو سبب خاص پر وارد ہونے والے لفظ عام کے حکم سے، سبب کے تحت پائے جانے والے افراد میں سے، کسی فرد کو نکالنا جائز نہیں ہوگا۔ اور یہ اجماع اس امر کو مستلزم ہے کہ عام مقصور ہے گا سبب کے تحت پائے جانے والے افراد میں، اور کسی غیر کو شامل نہیں ہوگا۔ کیوں کہ شخص کے پائے جانے کے بعد بھی اگر اُسے سبب کے افراد میں مقصور نہ مانا جائے تو اس میں اور اس کے علاوہ میں کوئی فرق باقی نہیں رہ جاتا۔ پس اس اجماع کی وجہ سے، شخص کے موجود ہونے کی صورت میں، لفظ عام کو سبب کے افراد میں مقصور نہ ماننا ممنوع ہوا۔

**شبہ اولیٰ کا جواب** اجماع مذکور سے یہ مستلزم نہیں ہوتا کہ لفظ عام مقصور ہے، سبب خاص کے تحت پائے جانے والے افراد میں، جیسا کہ آپ نے کہا۔ بلکہ یہ اجماع تو محض حد بندی کا تقاضا کرتا ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ شخص کے پائے جانے کی صورت میں سبب کے افراد میں سے کسی فرد کو خارج نہیں کیا جاسکتا لیکن سبب کے افراد کے علاوہ افراد کو لفظ

عام کے حکم میں داخل ہونے سے، یہ اجماع مانع نہیں ہے، بشرطیکہ وہ لفظ عام ان افراد کو خود اپنے اندر شامل کرتا ہو۔ اور یہی شخص کے پائے جانے کی صورت میں لفظ عام اور اس کے علاوہ میں فرق برقرار رہنے والی بات تو ہمارے اس بیان کردہ مطلب کے مطابق فرق بھی بالکل برقرار ہے گا۔

اگر آپ چاہیں تو اس شبہ اور اس کے جواب کو قیاس استثنائی کے دھاگے میں پرو کر یوں بیان کر سکتے ہیں:

اگر سب کا خصوص معتبر نہ ہو تو شخص کے پائے جانے کی صورت میں بھی سب کے افراد کے اخراج کا، جائز ہونا لازم آئے گا۔ لیکن شخص کے موجود ہونے کی صورت میں سب کے افراد کا اخراج بوجہ اجماع ممنوع ہے۔ لہذا ثابت ہوا کہ اس صورت میں تالی باطل ہے۔ اور یہ تالی جس مقدم کی طرف لے جاتی ہے وہ بھی باطل ہے۔ پس جب مقدم اور تالی دونوں باطل ہیں تو ان کی نقیض خود بہ خود ثابت ہو جائے گی۔ اور وہ نقیض یہ ہے: "إِنَّ الْعِبْرَةَ بِمُخْصَوْنَ السَّبَبِ" ترجمہ: "بے شک سبب کا خصوص معتبر ہے۔" اور اس تلازم کی دلیل یہ ہے کہ عام کے تمام افراد مساوی ہیں۔ پس اگر ہم لفظ عام کے عموم کو لے لیں اور سبب کا خصوص کو نہ لیں تو سبب کے افراد اور سبب کے علاوہ کے افراد میں جو کہ لفظ عام کے تحت پائے جاتے ہیں، تساوت پایا جائے گا۔ پھر (بعد میں) کوئی شخص آئے گا جس کی بنا پر سبب کے افراد کو خارج کرنا جائز ہوگا۔

(شبہ کا جواب) اس ملازمے یا تلازم کی دلیل کے ابطال میں جواب دیا جائے گا:

عام کے افراد کا تساوی ہونا ممنوع ہے۔ اور ممنوع ہونے کی سند یہ ہے کہ اجماع منعقد ہو چکا ہے اس بات پر کہ سبب کے افراد اپنے غیر کے افراد سے ممتاز ہوں گے بایں طور پر کہ انہیں تخصیص کے ذریعے خارج نہیں کیا جاسکتا۔ پس اگر سبب کے افراد اور غیر سبب کے افراد و دخول کے اعتبار سے تساوی ہو جائیں تو پھر وہ تمام خروج کے اعتبار سے تساوی نہیں ہوں گے۔ اور اس وقت لفظ کے عموم کا معتبر ہونا ہی باقی رہے گا نہ کہ سبب کا خاص ہونا۔

**شبہ ثانیہ** اسباب نزول نقل کرنے والے رواۃ نے بہت اہتمام کے ساتھ اسباب نزول بیان کیے ہیں اور اس موضوع پر کما حقہ بحثیں بھی تدوین کی ہیں۔ اگر یہ نہ کہا جائے کہ لفظ عام اپنے سبب خاص کے افراد میں مقصور ہوتا ہے یعنی سبب کا خاص ہونا معتبر ہے نہ کہ لفظ کا عموم، تو پھر ان رواۃ کی محنت رائیگاں معلوم ہوتی ہے۔

**شبہ ثانیہ کا جواب** آپ کے پاس کوئی وجہ نہیں کہ آپ اسباب نزول کا فائدہ صرف لفظ عام کے اپنے سبب کے افراد میں مقصور ہونے کو قرار دیں۔ کیوں کہ اسباب نزول اور رواۃ کی طرف سے اسباب نزول کو نقل کرنے کے مختلف طریقوں کو جاننے کے متعدد فوائد ہیں، جن کو ہم نے اس باب (اسباب نزول) کے اوائل میں بیان کیا ہے۔ اور ہمارے بیان کردہ تمام فوائد اس ایک فائدہ نما کے علاوہ ہیں جسے آپ نے بیان کیا ہے۔ اگر آپ چاہیں تو وہاں رجوع کریں۔

اگر آپ چاہیں تو اس شبہ اور اس کے جواب کو بھی قیاس استثنائی کے دھاگے میں پرو کر یوں بیان کیا جاسکتا ہے:

اگر سبب کا خصوص معتبر نہ ہو تو رواۃ کبھی بھی اسباب نزول کو بیان و مدوّن کرنے کا اہتمام نہ کرتے۔ لیکن رواۃ نے ان کو بیان و مدوّن کرنے کا اہتمام کیا ہے۔ لہذا احس اور مشاہدے سے ثابت ہوا کہ تالی باطل ہے۔ اور بطلان تالی کی وجہ سے مقدم کی نقیض بھی ثابت ہوگئی اور وہ یہ کہ سبب کا خصوص معتبر ہے۔ اور اس تلازم کی دلیل یہ ہے کہ سبب کے خصوص کو معتبر مانے بغیر، رواۃ کے



اسباب نزول کو بیان کرنے اور اس کی طرف متوجہ ہونے کا کوئی فائدہ سمجھ میں ہی نہیں آتا۔

(شبہ کا جواب) اس ملازے یا تلازم کی دلیل کے ابطال میں جواب دیا جائے گا:

ہم اس دلیل تلازم کو نہیں مانتے اور ماننے بھی کیوں؟ کیوں کہ اسباب نزول کے بہت سے فوائد ہیں جنہیں ہم اس بحث کے آغاز میں بیان کر چکے ہیں پس وہاں رجوع کیجیے اگر آپ بھول چکے ہیں۔

**شبہ ثالثہ** لفظ عام کا واقعے کے وقوع اور سوال کی توجیہ کے بعد میں بیان ہونا ہی، اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ سبب کا خصوص ہے کہ شارع علیہ السلام کے نزدیک، اس لفظ عام (جو خاص اس واقعے سے متعلق نازل ہوا ہے) کے ذریعے سے حکم لگاتے وقت، تنہا سبب ہی ملحوظ تھا۔ وگرنہ وہ لفظ عام، سبب کے متصل بعد نازل ہو کر اس کے ساتھ جڑا ہوا اور مربوط نہ ہوتا بلکہ یا تو وہ اس سبب سے پہلے نازل ہو گیا ہوتا یا پھر بعد میں (کبھی) نازل ہو جاتا۔ (لیکن لفظ عام کے سبب کے فوراً بعد وارد ہونے سے یہ ہی ثابت ہوتا ہے کہ شارع علیہ السلام کے نزدیک واقعہ و سبب ہی ملحوظ و مخصوص تھا۔ نہ کہ لفظ کا عموم)

**شبہ ثالثہ کا جواب** لفظ عام کو سبب کے بعد تک مؤخر کرنے کی حکمت میں یہ بات کافی ہے کہ وہ لفظ عام اس واقعے کے لیے بیان بن جائے اور (اُن) واقعات کے لیے (بھی بیان جائے) جو اس خاص واقعے کے مشابہ ہوں اور لفظ عام کے تحت شامل ہوں۔ نیز واقعے کے فوراً بعد لفظ عام کے وارد ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ لفظ عام، تنہا اس واقعے کے لیے بیان بنے، جیسا کہ آپ نے کہا۔

اگر آپ چاہیں تو اس شبہ اور اس کے جواب کو بھی قیاس استثنائی کے دھاگے میں پر و کرویں بیان کیا جا سکتا ہے: اگر سبب کا خصوص معتبر نہ ہوتا تو (لفظ عام کے) بیان کو وقوع واقعہ اور توجیہ سوال تک مؤخر نہ کیا جاتا، لیکن لفظ عام کے بیان کو وقوع واقعہ اور توجیہ سوال تک مؤخر کیا گیا ہے۔ لہذا ثابت ہوا کہ تالی باطل ہے۔ اور بطلان تالی کی وجہ سے مقدم کی نقیض بھی ثابت ہو گئی اور وہ نقیض ہی تو مطلوب تھی۔ اور اس تلازم یا ملازے کی دلیل یہ ہے کہ شارع علیہ السلام کی جانب سے لفظ کو وقوع واقعہ اور توجیہ سوال کے مابعد تک مؤخر کرنے سے، اس کے سوا اور کوئی بات مفہوم نہیں ہوتی کہ یہ لفظ، خاص طور پر اسی سبب (یا واقعے) کا بیان ہے۔ اور یہ ہی معنی ہے سبب کے مخصوص کے معتبر ہونے کا۔

(شبہ کا جواب) اس ملازے یا تلازم کی دلیل کے ابطال میں جواب دیا جائے گا:

ہم اس دلیل ملازمہ کو تسلیم نہیں کرتے۔ یعنی ہم یہ نہیں مانتے کہ (لفظ عام کے) بیان کو وقوع واقعہ اور توجیہ سوال کے بعد تک مؤخر کرنے سے یہ بات مفہوم ہوتی ہے کہ ان دونوں (وقوع واقعہ اور توجیہ سوال) کے وجہ سے نازل ہونے والا لفظ عام تنہا (خاص طور پر) اسی سبب یا واقعے کا بیان ہے۔ اور ہم یہ تسلیم بھی کیسے کر لیں؟ کیوں کہ تاخیر سے تو یہ مفہوم ہوتا ہے کہ وہ لفظ عام، بیان کے طور پر نازل ہوا ہے، ان واقعے مع اس کے مشابہ اُن تمام واقعات کے لیے جو عام کے تحت داخل ہیں، اولہ سابقہ کی وجہ سے۔

**شبہ رابعہ** تمام فقہائے کرام اس مسئلے میں متفق ہیں کہ اگر ایک شخص نے کسی دوسرے شخص کو دوپہر کے کھانے کی دعوت دیتے ہوئے کہا: "تَعَدَّ عِنْدِي" ترجمہ: "دوپہر کا کھانا میرے پاس کھانا۔" لیکن اُس نے انکار کرتے ہوئے "عِنْدَكَ"



کا لفظ استعمال کیے بغیر کہا: "وَاللّٰهُ لَا اَتَعَدَّيْ" ترجمہ: "اللہ کی قسم میں دو پہر کا کھانا نہیں کھاؤں گا۔" پھر اس کے بعد اس نے اس دعوت دینے والے کے علاوہ کسی اور آدمی کے پاس دو پہر کا کھانا کھالیا۔ تو کھانا کھانے والا اپنی قسم میں حاث نہ ہوگا۔ اور یہ صرف اسی وجہ سے ہے کہ لفظ عام مخصوص ہوتا ہے اپنے سبب کے ساتھ اور وہ سبب ہے کلمہ: "تَعَدَّيْ"۔ (لفظ "عُنْدِي" ہی وہ سبب ہے) جس نے کھانا نہ کھانے کی قسم کو دائمی (الی لغدء) کی ذات کے ساتھ خاص کر دیا تھا۔ (اور اسی وجہ سے قسم کھانے والے کو دوبارہ لفظ "عُنْدَكَ" بولنے کی حاجت پیش نہ آئی کیوں کہ یہ بات بالکل واضح ہے کہ لفظ عام کا سبب خاص ہی معتبر ہوتا ہے۔ پس حالف نے اسی بات کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ایک مخصوص، معتبر چیز کو حذف کیا اور حاث بھی نہیں ہوا۔) پس گویا کہ حالف نے یوں کہا تھا: "لَا اَتَعَدَّيْ عُنْدَكَ وَحَدَّكَ" ترجمہ: "میں صرف تیرے پاس کھانا نہیں کھاؤں گا۔" (یعنی کسی اور کے پاس کھانا کھالوں گا۔) اسی وجہ سے وہ کسی اور کے پاس کھانا کھانے سے حاث نہیں ہوا۔

اس مثال میں فقہائے کرام کا فیصلہ اس امر پر مبنی نہیں ہے کہ ہر لفظ عام اپنے سبب کے ساتھ مخصوص شبہ رابعہ کا جواب ہوتا ہے، جیسا کہ آپ نے سمجھا، بلکہ وہ تو جہی ہے اس پر کہ یہ مثال اور اس کے مشابہ دیگر امثلہ مخصوص ہیں کسی قرینہ خارجہ کے ساتھ۔ اور وہ قرینہ خارجہ ہے: "عُرْف"۔ بایں طور پر کہ حالف صرف دائمی کے ساتھ کھانا نہ کھانے کا ارادہ رکھتا ہے۔ اس کی ایک اور مثال یہ ہے کہ آپ سے کوئی کہے: "كَلِمَةً فَلَا تَأْتِيْ وَاقِعَةً مَّعِيْنََةً" ترجمہ: "فلاں شخص سے اس معین واقعے کے بارے میں بات کرنا۔" اور آپ اس کو کہیں: "وَاللّٰهُ لَا اَكْلِمُهُ اَبَدًا" ترجمہ: "اللہ کی قسم! میں اس سے کبھی بھی بات نہیں کروں گا۔" پھر اس کے بعد آپ اس فلاں شخص سے اس معین واقعے کے علاوہ کسی اور واقعے سے متعلق بات کرتے ہیں تو آپ حاث نہیں ہوں گے (حالانکہ آپ قسم کھا چکے تھے کہ میں اس سے کلام نہیں کروں گا) کیوں کہ عُرْف کا تقاضا اور حکم یہ ہی کہ آپ نے کلام (بات) نہ کرنے کی جو قسم کھائی ہے وہ مطلقاً نہیں ہے بلکہ صرف اس معین واقعے کے ساتھ خاص ہے۔

اگر آپ چاہیں تو اس شبہ اور اس کے جواب کو کبھی قیاس استثنائی کے دھاگے میں پیر کر یوں بیان کیا جاسکتا ہے: اگر سبب کا مخصوص معتبر نہ ہوتا تو "تَعَدَّيْ" کے جواب میں "عُنْدَكَ" کے بغیر "وَاللّٰهُ لَا اَتَعَدَّيْ" بولنے والا، کسی اور کے پاس کھانا کھانے کی صورت میں بھی حاث ہو جاتا۔ لیکن وہ فقہائے کرام کی نص کی وجہ سے کسی اور کے پاس کھانا کھانے کی صورت میں حاث نہیں ہوا۔ لہذا ثابت ہوا کہ تالی باطل ہے۔ اور بطلان تالی کی بدولت مقدم بھی باطل ہوا۔ اور جب مقدم اور تالی دونوں باطل ٹھہرے تو ان کی نقیض ثابت ہوگئی اور وہ ہی مطلوب تھی۔ اور اس تلازم یا ملازے کی دلیل یہ ہے کہ "لَا اَتَعَدَّيْ" کے الفاظ مخاطب اور غیر مخاطب دونوں کے پاس کھانا کھانے کو شامل تھے، کیوں کہ یہاں معمول محذوف ہے اور معمول کے محذوف ہونے سے عموم ثابت ہوتا ہے (اسی لیے "لَا اَتَعَدَّيْ" کے الفاظ مخاطب اور غیر مخاطب دونوں کو شامل تھے)۔ اور تحقیق کلمہ یعنی "لَا اَتَعَدَّيْ" ایک سبب پر واقع ہوا ہے اور وہ سبب ہے مخاطب کا اس کو دعوت غداء دینا۔ پس اگر ہم اس لفظ کے عموم کو لے لیں اور سبب کے خصوص کو نظر انداز کر دیں تو یہ لازم آئے گا کہ وہ غیر دائمی کے پاس کھانا کھانے سے بھی حاث ہو جائے کیوں کہ وہ (غیر دائمی) بھی عام کے افراد میں سے ایک فرد ہے۔

(شبہ کا جواب) اس ملازے یا تلازم کی دلیل کے ابطال میں جواب دیا جائے گا:

## منہاں العسفران فی علوم القسآن: جلد ①

یہاں پر سب کی وجہ سے جو تخصیص معتبر ہے وہ نفس سب کی وجہ سے معتبر نہیں بلکہ ایک قرینہ خارجہ کی وجہ سے معتبر ہے اور وہ قرینہ خارجہ ہے ”عرف کا حکم۔“ بایں طور پر کہ حالف صرف داعی کے ساتھ کھانا نہ کھانے کا ارادہ رکھتا ہے۔ اور اس موقع پر ہماری بحث عرف سے متعلق نہیں۔ کیوں کہ قرینہ خارجہ کی وجہ سے تخصیص کرنا ایک علیحدہ چیز ہے جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے۔

**شبہ خامسہ** حکمت اور فصاحت و بلاغت کے قانون کے مطابق سوال اور جواب میں مطابقت پایا جانا واجب ہے اور یہاں مطابقت موجود نہیں۔ کیوں کہ مطابقت کے لیے ضروری ہے کہ لفظ اور اس کا سبب خاص متساوی ہوں اور ان دونوں کا متساوی ہونا ایک ہی صورت میں ممکن ہے، وہ یہ کہ ہم لفظ عام کو اس کے سبب خاص کی وجہ سے خاص مان لیں۔ خاص طور پر اس وقت جب وہ لفظ اللہ تعالیٰ جو کہ شارع و حکیم ہے، کے کلام میں واقع ہوا ہو۔ کیوں کہ بلاغت کے باب میں قرآن مجید کا اعجاز سب سے بلند ہے۔

**شبہ خامسہ کا جواب** عام کو اپنے عموم پر باقی رکھنے سے اس کی سبب خاص کے ساتھ مطابقت میں کوئی خلل واقع نہیں ہوتا۔ کیوں کہ یہ مطابقت جس طرح دونوں کو متساوی ماننے سے حاصل ہوتی ہے، اسی طرح لفظ کو اس کے سبب سے آغے مان لینے سے بھی حاصل ہو جاتی ہے۔ کیوں کہ لفظ اور سبب میں مطابقت سے مقصود یہ ہی ہے کہ لفظ سبب کے حکم کو بیان کرنے والا ہو اور مراد کو واضح کرنے سے قاصر نہ ہو۔ اور جب لفظ اپنے سبب کے مقابلے میں زیادہ آغے ہوگا تو مراد کو بطریق اولیٰ واضح کرنے والا ہوگا۔

اگر آپ چاہیں تو اس شبہ اور اس کے جواب کو بھی قیاس استثنائی کے دھاگے میں پرو کریں بیان کیا جاسکتا ہے: اگر سبب کا مخصوص معتبر نہ ہوتا تو لفظ کا اپنے سبب کے لیے غیر مطابق ہونا لازم آتا۔ (حالاں کہ ایسا نہیں ہے یعنی لفظ اپنے سبب کے مطابق ہے) لہذا تالی باطل ٹھہری اور مقدم کی نقیض ثابت ہوگئی۔ اور اس تلازم یا ملازم کی دلیل یہ ہے کہ یہاں پر کلام مفروض ہے سبب خاص اور لفظ عام میں۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ عام خاص کے ساتھ مطابقت نہیں رکھتا۔ اور یہ ہی عدم مطابقت تالی کے بطلان کی دلیل ہے کیوں کہ عدم مطابقت حکمت کے منافی ہے اور تو اہمیں بلاغت کے لیے نخل ہے۔

ملازمے کا جواب: ہم اس ملازمے اور دلیل یعنی عام مطابقت نہیں رکھتا خاص کے ساتھ، کو باطل قرار دیتے ہیں اور تسلیم نہیں کرتے۔ اور ہم اس کو تسلیم کر بھی کیسے لیں کیوں کہ لفظ کی سبب کے لیے عام و خاص ہونے کے اعتبار سے جو مطابقت متساوی ہونے کے وقت حاصل ہوتی ہے، اسی طرح اس وقت بھی حاصل ہو جاتی ہے جب لفظ اپنے سبب سے آغے ہو۔ کیوں کہ جواب سے مراد سبب اور اس کے حکم کو بیان کرنا ہوتا ہے اور یہ مراد لفظ اور سبب کے متساوی ہونے پر ہی موقوف نہیں بلکہ لفظ کے سبب سے نسبتاً آغے ہونے کی صورت میں بھی حاصل ہو جاتی ہے۔

**نوٹ** اس سارے بیان کے بعد آپ کے لیے ممکن ہو چکا ہے کہ آپ ہمارے بیان کردہ قیاس استثنائیوں کو قیاس اقرانیوں میں تبدیل کر لیں اور پھر جمہور کے دلائل کے ساتھ ہمارے لائحہ عمل کے مطابق قیاسی مقدمات پر سہولت و سہولت کے ساتھ استدلال کریں۔ پس آپ کے سامنے ایک وسیع میدان ہے اور (میرے لیے) بات کو طول دینے پر کوئی داعیہ موجود نہیں ہے۔

اور اسی طرح میں یہ بھی امید رکھتا ہوں کہ اس بحث کو پڑھنے والا اگر بعض مقامات پر مشقت کا شکار ہو اور اسے دلائل میں

استعمال ہونے والی فنی صنعتوں کو سمجھنے میں وقت محسوس ہو تو وہ مجھے معذور سمجھے کیوں کہ میں نے توسط یعنی درمیانی چال چلتے ہوئے دلائل بیان کیے ہیں (یعنی بہت زیادہ طوالت سے کام نہیں لیا)۔ کیوں کہ توسط ایک فیصلہ ہے جس کو کوئی رد نہیں کر سکتا اور صنعت کے لیے ایسا حکم ہے جس کی کوئی نقیض نہیں۔ اور میرے لیے یہ بھی لازم تھا کہ میں قاریوں کی تمام اقسام کو ذہن میں رکھتے ہوئے اس انداز میں بیان کروں کہ وہ ان کے لیے کافی ہو جائے۔ اسی وجہ سے آپ مجھے دیکھیں گے کہ میں کبھی ایک انداز میں بحث کرتا ہوں پھر اس انداز کو چھوڑ کر دوسرا انداز اپناتا ہوں۔ پس اللہ تعالیٰ ہی علیم ہے اور علم کے دروازے کھولنے والا ہے اور وہ ہی توفیق دینے والا اور مدد کرنے والا ہے۔

## لفظِ عام کے ساتھ سببِ خاص کی ایک مثال

علامہ جلال الدین السیوطی رحمۃ اللہ علیہ اپنی کتاب ”الاتقان“ اور علامہ ابن السکی اور علامہ مغلّی ”جمع الجوامع“ اور اس کی شرح میں فرماتے ہیں کہ قرآن مجید میں کچھ ایسی آیات بھی ہیں جن کا نزول خاص اسباب سے ہوا تھا مگر وہ نظم قرآن کی رعایت اور طرز بیان کی خوبی کی وجہ سے اپنے مناسب عام آیات کے ساتھ رکھ دی جاتی ہیں۔ اور پھر ذہن ان آیات سے فوری طور پر سببِ خاص کے علاوہ کی طرف ہی سبقت لے جاتا ہے۔ اور جب ان آیات عام کی تخصیص کے لیے کوئی مخصص پایا جائے تو تخصیص کے ذریعے ان کے خروج کو بعید سمجھتا ہے۔ گویا کہ وہ خاص بھی قطعی طور پر عام میں داخل ہے۔ اور گویا کہ مخصص کے پائے جانے کی صورت میں بھی اس کے عدم خروج پر اجماع منعقد ہو گیا ہے جیسا کہ اجماع منعقد ہو چکا تھا نازل ہونے والے لفظِ عام میں سے سببِ خاص کے عدم خروج پر۔ اس بات کی وضاحت ایک مثال سے ہو سکتی ہے، وہ یہ کہ سورۃ النساء میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ اٰوْتُوْا نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ يُؤْمِنُوْنَ بِالْحُبُوْبِ وَ الطَّٰغُوْتِ وَ يَقُوْلُوْنَ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا هٰؤُلَاءِ اٰهْدٰى مِّنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا سَبِيْلًا ۗ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ ۗ وَ مَنْ يَلْعَنِ اللّٰهُ فَلَئِن تَجَدَّلْ لَّهٗ نَصِيْرًا ۗ اَمْرٌ لَّهُمْ نَصِيْبٌ مِّنَ الْمَلِكِ فَاِذَا لَا يُوْتُوْنَ النَّاسَ نَقِيْرًا ۗ اَمْ يَحْسُدُوْنَ النَّاسَ عَلٰى مَا اٰتٰهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ۗ فَقَدْ اٰتَيْنَا آلَ اِبْرٰهِيْمَ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ وَ اٰتَيْنٰهُمْ مُّلْكًا عَظِيْمًا ۗ فَيَمْنَعُوْنَ مِّنْ اٰمَنَ بِهٖ وَ مِنْهُمْ مَّنْ صَدَّعَنۡهُ ۗ وَ كَفٰى بِجَهَنَّمَ سَعِيْرًا ۗ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِنَا سَوْفَ نُصَلِّيْهِمْ نَارًا ۗ كُلَّمَا نَضِجَتْ جُلُوْدُهُمْ بَدَّلْنٰهُمْ جُلُوْدًا غَيْرَهَا لِيَذُوْقُوا الْعَذَابَ ۗ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ۗ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَنُدْخِلُهُمْ جَنَّٰتٍ تَجْرٰى مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا اَبَدًا ۗ لَهُمْ فِيْهَا اَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ ۗ وَ نُدْخِلُهُمْ ظِلًّا ظَلِيْلًا ۗ اِنَّ اللّٰهَ يٰمُرُّكُمْ اَنْ تُوَدُّوا الْاٰمَنِيْنَ اِلَى اَهْلِهَا ۗ وَاِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ ۗ اِنَّ اللّٰهَ نَجِيْبًا يَعِظُكُمْ بِهٖ ۗ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ سَبِيْعًا نَّصِيْرًا ۗ ﴾ (النساء: ۵۱-۵۸)

”بھلا تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جن کو کتاب سے حصہ دیا گیا ہے کہ بتوں اور شیطان کو مانتے ہیں اور کفار کے بارے میں کہتے ہیں کہ یہ لوگ مومنوں کی نسبت سیدھے راستے پر ہیں۔ یہ ہی لوگ ہیں جن پر اللہ نے لعنت کی ہے۔ اور جس پر اللہ

## مسائل العسرفان فی علوم القسرفان: جلد ①

لعنت کرے تو تم اس کا کوئی مددگار نہ پاؤ گے۔ کیا ان کے پاس بادشاہی کا کچھ حصہ ہے اس صورت میں تو یہ لوگوں کو بدل برابر بھی نہ دیں گے۔ یا جو اللہ نے لوگوں کو اپنے فضل سے دے رکھا ہے اس کا حد کرتے ہیں تو ہم نے خاندان ابراہیم کو کتاب اور دانائی عنایت فرمائی تھی اور سلطنتِ عظیم بھی بخشی تھی۔ پھر لوگوں میں سے کسی نے تو اس کتاب کو مانا اور کوئی اس سے رُکا رہا، تو ان نہ ماننے والوں کے لیے دوزخ کی جلتی ہوئی آگ کافی ہے۔ جن لوگوں نے ہماری آیتوں سے گُفر کیا ان کو ہم عنقریب آگ میں داخل کریں گے۔ جب کبھی ان کی کھالیں گل جائیں گی تو ہم ان کو اور کھالیں بدل کر دیں گے تا کہ ہمیشہ عذاب کا مزہ چکھتے رہیں۔ بے شک اللہ غالب ہے حکمت والا ہے۔ اور جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے ان کو ہم بہشتوں میں داخل کریں گے جن کے نیچے نہریں بہ رہی ہیں، وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے۔ وہاں ان کے لیے پاک بیبیاں ہیں۔ اور ان کو ہم گھنے سائے میں داخل کریں گے۔ مسلمانوں! اللہ تم کو حکم دیتا ہے کہ امانت والوں کی امانتیں ان کے حوالے کر دیا کرو۔ اور جب لوگوں میں فیصلہ کرنے لگو تو انصاف سے فیصلہ کیا کرو۔ اللہ تمہیں بہت خوب نصیحت کرتا ہے۔ بے شک اللہ سنتا ہے دیکھتا ہے۔“

پس آپ نے دیکھا کہ یہ آیات یہودی خائوں اور ان کی خیانت کی دھجیاں بکھیر رہی ہیں، ان کے لیے رسوا گن و عیدوں کا وعدہ کر رہی ہیں اور انتہائی سخت انداز میں ان کو ملامت و لعن طعن کر رہی ہیں۔ نیز یہ آیات انتہائی واضح انداز میں اس خیانت سے متعلق نبی پر مبنی ہیں جو یہودیوں نے نبی کریم ﷺ اور مومنین کے ساتھ کی تھی کہ جب انھوں نے مشرکین کو مسلمانوں کے مقابلے میں ہدایت پر قرار دیا۔ اور اس میں کوئی حرج نہیں کہ ان آیات کو مستظمن مانا جائے یہودیوں کی اس خیانت کے ساتھ جو انھوں نے نبی کریم ﷺ اور ان کے اصحاب رضی اللہ عنہم کی حقیقی صفات کو بیان نہ کر کے کی تھی۔ بالخصوص یہ کہ جب انھوں نے نبی کریم ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ان صفات کو چھپایا جو ان کی کتاب تورات میں بیان ہوئی تھیں، جیسا کہ قرآن مجید میں سورۃ الاعراف میں ہے:

﴿يَجِدُ وَنَدًا مَكْتُوبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرَةِ وَالْإِنْجِيلِ...﴾ (الاعراف: ۱۵۴)

”ان کے اوصاف کو وہ اپنے ہاں تورات اور انجیل میں لکھا ہوا پاتے ہیں....“

اس آیت میں ضمیر نبی کریم ﷺ ہی کی طرف راجع ہے۔ اور اسی طرح سورۃ الفتح میں نبی کریم ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی توصیف بیان کرنے کے بعد فرمایا گیا:

﴿ذٰلِكَ مَثَلُهُمْ فِي التَّوْرَةِ ۗ وَمَثَلُهُمْ فِي الْاِنْجِيلِ ۙ كَزَرْعٍ اَخْرَجَ شَيْطٰنًا...﴾ (الفتح: ۲۹)

”ان کے یہ ہی اوصاف تورات میں ہیں اور یہ ہی اوصاف انجیل میں۔ وہ گویا ایک کھیتی ہیں جس نے پہلے زمین سے اپنی سوئی نکالی....!“

ترتیب وضعی کے اعتبار سے ان آیات کے بعد ﴿اِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّواْ الْاَمَانَاتِ اِلٰى اَهْلِهَا﴾ (النساء: ۵۸) والی آیت کا آنا، ایک بہترین تناسب، ربط بے مثال اور خوب صورت ہم آہنگی کی عکاسی کر رہا ہے۔ کیوں کہ بعد والی آیت سے عام امانت کی ادائیگی کا، جب کہ سابقہ آیات سے ایک خاص قسم کی امانت کی ادائیگی کا حکم ثابت ہو رہا ہے۔ اس طرح عام اور خاص کے مابین اس





سے مستحکم ربط کیا ہو سکتا ہے۔ پس یہ سبب خاص کی وجہ سے عام الفاظ میں نازل ہونے والے کلام کی ایک بہت عمدہ مثال ہے۔ پس جب عام خاص کے افراد کو مجموعی طور پر شامل ہے تو کسی شخص کے ذریعے اس کے افراد کو خارج کرنا درست نہ ہوگا۔ پس اسی طرح امانت خاصہ کو امانت عامہ کے دہانگے میں شاندار انداز میں پرویا جائے گا۔ اور اولاً خاص کا مدلول عام میں داخل ہوگا۔ یہاں تک کہ اگر کہا جائے کہ ”کسی شخص کی بنا پر اخراج سے کلام میں خوب صورتی باقی نہیں رہتی“ تو کچھ بعید نہیں ہے۔

اس موقع پر علامہ ابن السکسی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ ایک اوسط درجے کا رتبہ ہے جو سبب سے نیچے اور تجرد سے بالا ہے۔ یعنی اس کو (مطلقاً) سبب کے مرتبے میں نہیں رکھا جاسکتا۔ کیوں کہ پہلی آیت دوسری آیت میں سبب نہیں ہو سکتی۔ اور اس وجہ سے بھی کہ ان دونوں آیات میں صرف قرآن مجید کی وضعی ترتیب کے لحاظ سے مقارنت موجود ہے وگرنہ زمانہ نزول کے لحاظ سے دیکھا جائے تو ان میں مقارنت نہیں۔ بلکہ ان دونوں کے زمانہ نزول میں بہت فرق ہے۔ وہ اس طرح کے دوسری آیت (امانات والی آیت) پہلی آیت سے قریباً چھ سال بعد نازل ہوئی تھی۔ لیکن دوسری آیت کا چھ سال بعد نازل ہونا اس نظم کلام میں کوئی نقص نہیں ڈال سکتا۔ کیوں کہ وحدت یا قربت زمانہ کی شرط صرف سبب نزول میں لگائی گئی ہے نہ کہ مناسبت معانی میں۔ (مناسبت کا مقصود تو صرف اتنا ہی ہے کہ ایک آیت اپنے مناسب موقع میں جوڑ دی جائے ورنہ آیتوں کا نزول اپنے اسباب پر ہوتا تھا اور پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم انہیں ایسی جگہوں پر لکھنے کا حکم دیتے تھے جو انہیں اللہ تعالیٰ کی جانب سے بتائی جاتی تھیں۔)

علامہ تاج الدین عبدالوہاب بن علی السکسی جو کہ مشہور ہیں ”علامہ ابن السکسی“ کے نام سے، نے اپنی تالیف جمع الجوامع اور امام جلال الدین الحللی نے جمع الجوامع کی شرح میں جو کچھ لکھا ہے، ہم اس موقع پر ”تمتہ“ کے طور پر اُسے نقل کر رہے ہیں۔

”اور وہ سبب خاص جس پر لفظ عام وارد ہوا ہے، عام کے مدلول میں قطعی طور پر داخل ہوگا اور اجتہاد وغیرہ کے ذریعے، اس میں تخصیص جائز نہ ہوگی۔ ﴿وَيَقْرُبُ مِنْهَا﴾ اور جو اس سے قریب ہو یعنی صورت سبب سے قریب ہو یہاں تک کہ قطعی الدخول ہو یا ظنی الدخول، خاص ہے قرآن میں رسم کے اعتبار سے اس سے تالی یعنی مؤخر ہو۔ رسم سے مراد رسم القرآن ہے اور کسی آیت کو اس کی متعین جگہ پر لکھنے کے معنی میں ہے۔ اور اگر نزولی اعتبار سے تالی نہ ہو تو، عام ہے تالی اور متلو کے مابین نسبت کی وجہ سے۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿أَمْ تَرَىٰ إِلَىٰ الْآيَاتِ الْآيَاتِ أَوْ لَوْ أَنَّ صِيبًا مِّنَ الْكِتَابِ يُؤْمِنُونَ بِالْآيَاتِ وَاللَّطِيفُ...﴾ (النساء: ۵۱)

نیز اس بات کی تائید مفسرین کے اقوال سے بھی ہوتی ہے۔ جیسا کہ تفسیر بغوی اور تفسیر طبری میں ہے کہ اس آیت میں اشارہ ہے کعب بن اشرف اور اس کے مثل دیگر علمائے یہود کی طرف، کہ جس وقت وہ لوگ مکہ آئے اور انہوں نے جنگ بدر میں مقتول مشرکین کی لاشیں دیکھیں تو انہوں نے مشرکین مکہ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے لڑنے اور انتقام لینے پر ابھارا۔ مشرکین مکہ نے ان علمائے یہود سے کہا: مِّنْ أَهْدَىٰ سَبِيلًا، مُحَمَّدًا صَلَّىٰ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَأَخَصَابَهُ أَهْمُ نَحْنُ؟ کہ پہلے تم یہ بتاؤ کہ ہم دونوں میں سے سیدھے راستے پر کون ہے؟ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے ساتھی یا ہم لوگ؟ کعب بن اشرف اور اس کے ساتھیوں نے کہا: ”أَنْتُمْ“ تم لوگ سیدھے راستے اور حق پر ہو۔“ حالانکہ ان کو بخوبی معلوم تھا کہ ان کی آسانی کتابوں میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف موجود ہے اور وہ آپ پر پوری طرح منطبق بھی ہوتی ہیں اور مزید یہ کہ اللہ تعالیٰ نے ان سے اس بات کا قول و اقرار بھی لے لیا تھا کہ وہ پیغمبر آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کی نعت کو پوشیدہ نہ



منائل العسرفان فی علوم القسآن: جلد ① ۱۳۵

رکھیں گے۔ اس لیے یہ بات اُن کے ذمہ ایک واجب الادا امانت تھی جس کو حق دار تک پہنچانے میں انھوں نے بددیانتی کی اور بوجہ اس کے کہ نبی کریم ﷺ سے دل میں سخت جلتے تھے کفار کو یہ بتایا کہ تم ہی سیدھی راہ پر ہو، حالانکہ ان کا یہ کہنا بالکل غلط اور خلاف واقع تھا۔ اس لیے یہ آیت (مع اُس وعید کے، جس کا اثر ان لوگوں پر پڑتا ہے جنھوں نے نبی کریم ﷺ کی صفت اور مدح کو باوجود اپنی کتابوں میں موجود ہونے اور اُس کے بیان کرنے کے لیے مامور ہونے کے، بیان نہیں کیا اور اس طرح خیانت کے مرتکب ہوئے) اللہ تعالیٰ کے قول: ﴿إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تُؤَدُّوا الْأَمَانَاتِ إِلَىٰ أَهْلِهَا﴾ (النساء: ۵۸) سے مناسبت رکھتی ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ دوسری آیت تمام امانتوں کے لیے عام ہے اور پہلی آیت محض ایک خاص امانت سے تعلق رکھتی ہے جو نبی کریم ﷺ کی صفت ہے اور یہ بات پچھلے بیان شدہ طریقے کے اعتبار سے پیدا ہوئی ہے۔ اس کے علاوہ عام آیت خاص آیت سے قیہ تحریر میں بھی بعد میں آئی ہے اور اس کا نزول بھی خاص آیت کے نزول سے بعد میں ہوا ہے۔ یعنی عام آیت خاص آیت کے لیے رسم کے اعتبار سے تالی ہے اور نزول کے اعتبار سے (بھی) قریباً چھ سال مرانخی ہے کیوں کہ غزوة بدر کا عظیم واقعہ سن دو ہجری میں رمضان میں ہوا تھا جب کہ مکہ کی شاندار فتح سن آٹھ ہجری میں رمضان میں ہوئی تھی۔ اور جو ”وَيَقْرُبُ مِنْهَا“ کہا تھا وہ بھی اسی طرح ہے کیوں کہ عام اپنے سبب کی وجہ سے اپنے بدلول کے خلاف پروا رڈ نہیں ہوتا۔“

وَالْحَمْدُ لِلَّهِ أَوْلًا وَأَخْرًا



## قرآن مجید کا سات حروف پر نازل ہونا

### مقدمہ

قرآن مجید کے سات حروف پر نازل ہونے سے کیا مراد ہے؟ یہ بڑی نادر، معرکہ آرا اور طویل بحث ہے۔ لیکن اس بحث میں ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ طویل ہونے کے ساتھ ساتھ اکٹھا اور وحشت جیسی خرابیوں سے پاک ہے بلکہ یہ تو بہت ہی پُرکشش اور دلچسپی کی حامل ہے۔ اس بحث کے دلچسپ اور نادر ہونے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اس بحث میں ہمیں اللہ تعالیٰ کے رحمت اور اس کی اپنے بندوں پر شفقت اور محبت کے مظاہر کی مثالیں نظر آتی ہیں۔ اس بحث میں ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کو سات حروف پر نازل فرما کر صرف عرب کے قبائل ہی پر احسان نہیں کیا بلکہ پوری امت مسلمہ کے تمام قبائل و شعوب پر احسان عظیم کیا ہے۔ اور اسی کی بدولت تمام عرب و عجم قرآن کریم کو سہولت اور روانی کے ساتھ پڑھ سکتے ہیں باوجود اس کے کہ تمام لہجوں میں اختلاف پایا جاتا ہے۔

اس بحث میں آپ حروف سبعة سے متعلق بہت سے اقوال و افکار کا مطالعہ کریں گے۔ نیز یہ مشاہدہ کریں گے کہ اہل حق، حق کو واضح کرنے کے لیے کس قدر سرگرداں رہتے ہیں۔ انھوں نے حق کو حق اور باطل کو باطل ثابت کرنے کے لیے کس کس طریقے سے جدوجہد کیں اور قرآن کریم اور دینِ متین کی حفاظت کے لیے اپنی جان کی بازی لگا کر بھی دفاع کیا۔ یہ بات اس بحث میں شوق اور دلچسپی کو مزید بڑھا دیتی ہے۔

اس بحث کو پڑھتے وقت بہت احتیاط درکار ہے کیونکہ اس میں قیل و قال بہت زیادہ ہے، حتیٰ کہ بعض اوقات تو حقیقت تک رسائی ہی ممکن نہیں لگتی اور بعض اوقات بعض علمائے کرام کے اقوال پڑھ کر ان کے بارے میں دل میں بدگمانی پیدا ہونے کا خطرہ لاحق ہو جاتا ہے۔ اس لیے اس بحث کو مشکل بھی کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔

اس موضوع پر بڑے بڑے محققین نے ضرورت محسوس کرتے ہوئے قدیم اور جدید انداز میں تحریروں لکھیں مثلاً ساتویں صدی ہجری میں علامہ ابوشامہ نے اور چودھویں صدی ہجری میں علامہ الشیخ محمد بن حنیف نے۔

اس موضوع پر قلم اٹھانے یا کوئی موقف اختیار کرنے میں نزاکت بھی اعلیٰ درجے کی پائی جاتی ہے کیونکہ ذرا سی خطا اسلام کے دشمنوں کو قرآن مجید کے بارے میں طعن و تشنیع کا وہ موقع فراہم کر سکتی ہے، جس کی تلاش میں غیر مذہب کی منظم اور تربیت یافتہ جماعتیں عرصہ دراز سے گھات لگاتے بیٹھی ہیں۔ لیکن وہ اپنے ان ناپاک عزائم میں ہرگز کامیاب نہیں ہو سکتے۔

﴿وَهُمْ أَيْمَانُكَ يَنْتَوُونَ﴾ (البقرہ: ۷۴)



”انہوں نے اُس کام کا ارادہ کر لیا تھا جس میں وہ کامیاب نہیں ہو سکتے تھے۔“

ہم اللہ ہی سے مدد اور ہدایت کے طالب ہیں اور اُسی سے دُعا گوئیں کہ وہ ہمارے لیے اس دلچسپ موضوع میں دلچسپی اور شوق پیدا کر دے اور امرِ رشید مقرر فرما دے۔

قرآن مجید کے حروفِ سبعہ پر نازل ہونے والا باب ایک وسیع باب ہے۔ ان شاء اللہ ہم اس باب میں درج ذیل امور بیان کریں گے:

- ① قرآن مجید کے سات حروف پر نازل ہونے کے دلائل
- ② سات حروف والی احادیث پر امتیازی شواہد
- ③ حروف اور قرأت کے اختلاف پر معنی بہت سے فوائد
- ④ سات حروف پر قرآن مجید کے نازل ہونے کا مفہوم
- ⑤ پسندیدہ مذہب کے مطابق حروف اور قرأتوں میں پائے جانے والے اختلاف کی سات اقسام
- ⑥ پسندیدہ مذہب اور اس سے ملتے جلتے اقوال یا مذاہب کے درمیان نسبت
- ⑦ پسندیدہ مذہب کو اختیار کرنے کی وجوہات
- ⑧ اس پر وارد ہونے والے اعتراضات کے جوابات
- ⑨ مصاحف میں حروفِ سبعہ کا باقی رہنا
- ⑩ مصاحف میں حروفِ سبعہ کے باقی نہ رہنے والے اقوال اور ان کا رد
- ⑪ آخری اقوال کا اجمالی رد
- ⑫ اختتامیہ در علاجِ شبہات و اوردہ بر موضوع ہذا

## قرآن مجید کے سات حروف پر نازل ہونے کے دلائل

اس موضوع پر صرف ان ہی احادیث سے استدلال کیا جاسکتا ہے جو حضور اکرم ﷺ سے صحیح طرق سے مروی ہوں۔ اور ہمارے پاس ایسی احادیث بہت ہیں جن میں کسی قسم کا ضعف نہیں پایا جاتا، بلکہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی ایک بڑی جماعت اس حدیث کو روایت کرتی ہے جس سے حروفِ سبعہ پر نزولِ قرآن کا اثبات ہوتا ہے۔

صحابہ کی وہ بڑی جماعت جو اس حدیث کو روایت کرتی ہے ان میں سے چند کے نام یہ ہیں:

حضرت عمر رضی اللہ عنہ، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ، حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ، حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ، حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ، حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ، حضرت ابوجہم رضی اللہ عنہ، حضرت ابوسعید الخدري رضی اللہ عنہ، حضرت ابوطالب انصاری رضی اللہ عنہ، حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ، حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ، حضرت سرہ بن جندب رضی اللہ عنہ، حضرت سلمان بن صد رضی اللہ عنہ، حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ، حضرت عمرو بن ابوسلمہ

مناب العسرفان فی علوم القسآن: جلد ①

بنیہ، حضرت عمرو بن العاص بنیہ، حضرت معاذ بن جبل بنیہ، حضرت ہشام بن حکیم بنیہ، حضرت انس بن مالک بنیہ، حضرت حذیفہ بن یمان بنیہ، حضرت ابویوب انصاری بنیہ کی زوجہ حضرت ام ایوب بنیہ۔

یہ اکیس صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین ہیں جنہوں نے حروف سبعہ پر نزول قرآن والی حدیث کو روایت اور بیان

کیا ہے۔

امام الحافظ ابوعلی بنیہ اپنی کتاب "المسند الکبیر" میں ایک واقعہ روایت کرتے ہیں:

"ایک مرتبہ حضرت عثمان بن عفان بنیہ نے منبر پر کھڑے ہو کر لوگوں سے کہا: لوگو! کیا تم میں کوئی ایسا شخص موجود ہے جس

کو آنحضرت ﷺ کا یہ ارشاد یاد ہو:

((إِنَّ الْقُرْآنَ أَنْزِلَ عَلَى سَبْعَةِ أَحْرَفٍ كُلَّهَا شَافٍ كَافٍ))

"قرآن کریم سات حروف پر نازل کیا گیا ہے جن میں سے ہر ایک شافی اور کافی ہے۔"

اور ہاں میں خود بھی اس حدیث کو سننے کا گواہ ہوں۔

حضرت عثمان بنیہ کا یہ اعلان سن کر صحابہ کرام بنیہ کی ایک اتنی بڑی جماعت کھڑی ہو گئی جس کو شمار کرنا دشوار ہو گیا۔

جو حدیث اوپر نقل کی گئی ہے وہ معنی کے اعتبار سے متواتر ہے، چنانچہ مشہور محدث امام ابو عبید قاسم بن سلام بنیہ نے اس کے

تواتر کی تصریح بھی کی ہے۔ لیکن آپ کو معلوم ہے کہ متواتر حدیث وہ کہلاتی ہے جس کو ہر دور میں روایت کرنے والوں کی تعداد اتنی

زیادہ رہی ہو جن کا جھوٹ پر جمع و متفق ہونا محال ہو۔ ہمیں صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کے سنہری دور میں تو اس حدیث کو روایت کرنے

والوں کی اتنی ہی بڑی تعداد با آسانی مل جاتی ہے۔ لیکن بعد والے ادوار میں اتنی بڑی جماعت اس حدیث کو روایت کرنے والی نہیں

ہے۔ اسی لیے ہم نے یہ کہا کہ یہ حدیث معنی کے اعتبار سے متواتر ہے اگرچہ اعتبارات دیگر اس سے متواتر نہ ہو۔

اب ہم وہ احادیث پیش کرتے ہیں جن سے قرآن کریم کے حروف سبعہ پر نازل ہونے پر استدلال کیا جاتا ہے۔

① امام بخاری اور امام مسلم رحمہما اللہ نے درج ذیل حدیث اپنی اپنی کتب میں روایت کی ہیں۔

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمَا قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَآلِهِ وَسَلَّمَ:

((أَقْرَأُنِي جِبْرِيْلُ عَلَيْهِ السَّلَامُ عَلَى حَرْفٍ، فَرَجَعْتُهُ، فَلَمْ أَرَلْ أَسْتَوِيْدُهُ فَيَرِيْدُنِي حَتَّى انْتَهَى إِلَى سَبْعَةِ أَحْرَفٍ))

زاد مسلمہ: قال ابن شهاب: ((بَلَّغْنِي أَنَّ تِلْكَ السَّبْعَةَ الْأَحْرَفُ إِتْمَاهِي فِي الْأَمْرِ الَّذِي يَكُونُ وَاحِدًا،

لَا يَخْتَلِفُ فِي حَلَالٍ وَلَا حَرَامٍ))

حضرت عبداللہ بن عباس بنیہ سے روایت ہے فرماتے ہیں: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

"حضرت جبریل علیہ السلام نے مجھے (پہلے) ایک حرف پر پڑھایا، تو میں نے ان سے مراجعت کی اور مسلسل زیادتی طلب کی سو وہ

(قرآن کریم کے حروف میں) مجھے (یعنی میرے لیے) اضافہ کرتے رہے یہاں تک کہ وہ سات حروف تک پہنچ گئے۔"

امام مسلم نے ان الفاظ کا اضافہ نقل کیا ہے: ابن شهاب کہتے ہیں:

"مجھے یہ بات پہنچی ہے کہ سبعہ حروف وہ ہیں جو کسی معاملے میں ایک ہی حکم دیتے ہوں۔ جو حلال و حرام میں اختلاف نہیں کرتے۔"

① درج ذیل حدیث بھی امام بخاری اور امام مسلم رحمہما اللہ نے روایت کی ہے۔ صحیح بخاری کے الفاظ یہ ہیں:

((أَنَّ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ يَقُولُ: سَمِعْتُ هِشَامَ بْنَ حَكِيمٍ يَقْرَأُ سُورَةَ الْفُرْقَانِ فِي حَيَاةِ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، فَاسْتَمَعْتُ لِقِرَاءَتِهِ، فَإِذَا هُوَ يَقْرَأُهَا عَلَى حُرُوفٍ كَثِيرَةٍ لَمْ يَقْرَأُ نَبِيَهَا رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَذَلِكَ، فَكَيْفَ أُسَاوِرُهُ فِي الصَّلَاةِ، فَأَنْتَظِرُهُ حَتَّى سَلَّمَ، ثُمَّ لَبَّنُهُ بِرِدَائِهِ أَوْ بِرِدَائِي، فَقُلْتُ: مَنْ أَقْرَأَكَ هَذِهِ السُّورَةَ؟ قَالَ: أَقْرَأَ نَبِيَهَا رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، قُلْتُ لَهُ: كَذَبْتَ، فَوَاللَّهِ إِنْ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَقْرَأَنِي هَذِهِ السُّورَةَ الَّتِي سَمِعْتُكَ تَقْرَأُهَا، فَأَنْطَلَقْتُ أَقُودُهُ إِلَى رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقُلْتُ: يَا رَسُولَ اللَّهِ إِنِّي سَمِعْتُ هَذَا يَقْرَأُ بِسُورَةِ الْفُرْقَانِ عَلَى حُرُوفٍ لَمْ تُقْرَأُ نَبِيَهَا، وَأَنْتَ أَقْرَأْتَنِي سُورَةَ الْفُرْقَانِ، فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "أُرْسِلُهُ يَا عُمَرُ، أَقْرَأْ يَا هِشَامُ" فَقَرَأَ عَلَيْهِ الْقِرَاءَةَ الَّتِي سَمِعْتُهُ يَقْرَأُهَا، قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "هَكَذَا أُتْرِكْتُ" ثُمَّ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "اقْرَأْ يَا عُمَرُ" فَقَرَأْتُ، فَقَالَ: "هَكَذَا أُتْرِكْتُ" ثُمَّ قَالَ: "إِنَّ هَذَا الْقُرْآنَ أُتْرِكَ عَلَى سَبْعَةِ أَحْزَابٍ، فَاقْرَأُوا مَا تَيَسَّرَ مِنْهُ))." ①

”سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: میں نے عہد رسالت مآب ﷺ میں ہشام بن حکیم (رضی اللہ عنہ) کو سورۃ الفرقان کی تلاوت کرتے ہوئے سنا۔ وہ اُسے بہت سے حروف پر پڑھتے جا رہے تھے جو آپ ﷺ نے مجھے نہیں پڑھائے تھے۔ میں نے نماز میں ہی اُن کی خبر لیا چاہی۔ بمشکل صبر سے کام لیا یہاں تک کہ انھوں نے سلام پھیرا۔ پھر میں نے انھیں ان کی چادر یا اپنی چادر میں لپیٹا اور پوچھا: یہ سورت آپ کو کس نے پڑھائی جو میں نے ابھی آپ سے سنی ہے؟ انھوں نے کہا: رسول اللہ ﷺ نے۔ میں نے کہا آپ جھوٹ بولتے ہیں۔ اللہ کی قسم! رسول اللہ ﷺ نے مجھے بھی یہ سورت پڑھائی ہے لیکن اس طرح نہیں جس طرح میں نے آپ سے سنی۔ یہ کہتے ہوئے میں ان کو زبردستی بارگاہِ نبوی ﷺ میں لے گیا اور عرض کی: میں نے ان سے سورۃ الفرقان ایسے حروف میں پڑھتے ہوئے سنی ہے جو آپ ﷺ نے مجھے نہیں پڑھائی۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: عمر! انھیں چھوڑ دو۔ اور ہشام! سورۃ الفرقان پڑھو۔ ہشام نے سورت اسی قراءت پر پڑھی جو میں نے اُن سے سنی تھی۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: یہ سورت اسی طرح نازل ہوئی تھی۔ پھر آپ ﷺ نے مجھے فرمایا: عمر! (اب) تم پڑھو۔ میں نے اسی قراءت میں اُسے پڑھا جس میں آپ ﷺ نے مجھے پڑھائی تھی۔ آپ ﷺ نے فرمایا: یہ اسی طرح نازل ہوئی ہے۔ بے شک یہ قرآن سات حروف پر نازل ہوا ہے۔ جیسے آسانی ہو پڑھا لیا کرو۔ (متفق علیہ)

② ((عن ابن ابی کعب قال: كنت في المجد فدخل يصيل رجل يصيل فقرا قرأه انكرتها عليه ثم دخل آخر فقرا قرأه سوق قرأه صاحبه فلما قضينا الصلاة دخلنا جميعا على رسول الله صلى الله عليه وآله وسلم فقلت: ان هذا قرأه انكرتها عليه ودخل آخر فقرا سوى قرأه صاحبه. فامرهما رسول الله صلى الله عليه وآله وسلم فقرأه وآله وسلم فقرا فحس النبي صلى الله عليه وآله وسلم شأنها فسقط في نفسي من

التكذيب ولا اذا كنت في الجاهلية. فلما رأى رسول الله صلى الله عليه وآله وسلم ما قد عشنى ضرب في صدرى ففضت عرقاً وكانما انظر الى الله عز وجل فرقا فقال لى: يا أبى! ارسل الى ان اقرأ القرآن على حرف فرددت اليه ان هون على امتى فردالى الثانية اقرأه على حرفين فرددت اليه: ان هون على امتى فردالى الثالثة اقرأه على سبعة احرف ولك بكل ردة رددتها مسألة تسألنيها. فقلت: اللّهُمَّ اغفر لامتى اللّهُمَّ اغفر لامتى. واخرت الثالثة ليوم يرغب الى الخلق كلهم حتى ابراهيم)).<sup>①</sup>

”حضرت ابى بن كعب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: میں (ایک مرتبہ) مسجد میں تھا کہ ایک شخص مسجد میں آیا اور نماز پڑھنے لگا۔ اس نے ایسی قراءت کی جو میرے لیے اجنبی تھی، پھر اسی اثنا میں ایک اور شخص مسجد میں داخل ہوا اور اس نے ایک دوسری قراءت کی جو اس کے ساتھی کی قراءت کے علاوہ تھی۔ جب ہم نماز سے فارغ ہوئے تو ہم سب رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ میں نے عرض کیا کہ اس شخص نے ایسی قراءت پڑھی ہے جو (میں نے پہلے کبھی نہیں سنی تھی اس لیے) میرے لیے اجنبی ہے۔ اور پھر دوسرا آدمی داخل ہوا اور اُس نے پہلے آدمی کے علاوہ کوئی اور قراءت کی۔ رسول اللہ ﷺ نے ان دونوں کو پڑھنے کا حکم دیا۔ دونوں نے قراءت کی تو نبی اکرم ﷺ نے ان دونوں کی تحسین فرمائی۔ ابى بن كعب رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میرے دل میں ایک ایسی تکذیب کا خیال آ گیا کہ زمانہ جاہلیت میں کبھی نہ آیا تھا۔ جب رسول اللہ ﷺ نے میری اس کیفیت کو دیکھا جس نے مجھے ڈھانپ رکھا تھا تو آپ ﷺ نے میرے سینے پر ہاتھ مارا، میں (گھبرا گیا اور) پسینے پسینے ہو گیا اور خوف کے مارے (میری حالت یہ ہو گئی) گویا کہ میں اللہ تعالیٰ کو دیکھ رہا ہوں۔ آپ ﷺ نے مجھ سے فرمایا: اے ابى! مجھے پہلے یہ ہی حکم بھیجا گیا تھا کہ میں قرآن کی تلاوت ایک حرف پر ہی کروں۔ لیکن میں نے جواب میں عرض کیا کہ میری اُمت پر آسانی فرمادیجئے۔ چنانچہ مجھے دو حروف (قراءت) پر پڑھنے کی اجازت دی گئی۔ میں نے پھر جواباً عرض کیا: میری اُمت پر (مزید) آسانی فرمادیجئے۔ چنانچہ مجھے تیسری مرتبہ سات حروف (قراءتوں) پر پڑھنے کو کہا گیا۔ اور بارگاہِ الہیہ سے مجھے ارشاد ہوا: جتنی بارتوں نے اُمت پر سہولت کے لیے عرض کیا ہر مرتبہ کے عوض ایک سوال ہم سے کر لو (ایک دُعا مانگ لو جو مقبول ہوگی) چنانچہ میں نے کہا: اے اللہ! میری اُمت کی مغفرت فرمادیجئے۔ اے اللہ! میری اُمت کی مغفرت فرمادیجئے۔ (دو دُعائیں مانگ لیں) اور تیسری دُعا میں نے مؤخر کر دی اس دن کے لیے جس دن کہ ساری مخلوق میری طرف رغبت کرے گی حتیٰ کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام بھی۔“ (یعنی قیامت کے دن جب ساری انسانیت رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں سفارش کے لیے جائے گی اس دن میں تیسری دُعا مانگوں گا اور وہ بھی اُمت ہی کی بخشش و مغفرت سے متعلق ہوگی۔“

**فائدہ** حضرت ابى بن كعب رضی اللہ عنہ کے اس جملے:

((فَسَقَطَ فِي تَفْسِيهِ مِنَ التَّكْذِيبِ وَلَا إِذَا كُنْتُ فِي الْجَاهِلِيَّةِ)).

”میرے دل میں ایک ایسی تکذیب کا خیال آ گیا کہ زمانہ جاہلیت میں کبھی نہ آیا تھا۔“



کی تشریح امام طبری رحمۃ اللہ علیہ نے کچھ یوں کی ہے:

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب ان دونوں کی تعریف و تحسین فرمائی اور یہ فرمایا کہ یہ دونوں بھی صحیح پڑھ رہے تھے تو میرے دل میں شیطان نے ان دونوں کے صحیح ہونے والے قول کی تکذیب کا وسوسہ ڈالا تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم میرے چہرے سے اس وسوسے کو جان گئے اور تنبیہ کے طور پر میرے سینے پر زور سے ہاتھ مارا.....

امام طبری رحمۃ اللہ علیہ یہ بھی فرماتے ہیں کہ ان دونوں صاحبوں نے مسجد میں آنے کے بعد جس سورت کی تلاوت کی تھی وہ ایک ہی سورت ”سورۃ النحل“ تھی۔

حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کے دل میں وسوسہ پیدا ہونے کا اصل محرک یہ تھا کہ اللہ کی جانب سے اختلاف کیونکر اور کیسے پیدا ہو سکتا ہے۔ لہذا قرأت میں اختلاف نہیں ہونا چاہیے تھا کیونکہ یہ تو اللہ کا کلام ہے۔ لیکن یہ وسوسہ محض ایک شیطانی وسوسہ تھا، جو کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے تنبیہ کرنے سے فوراً دور ہو گیا اور بعد میں اس وسوسے کا نام و نشان بھی حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کے دل میں یا ان کے عمل میں باقی نہ رہا۔

یہ اللہ تعالیٰ کی رحمت ہے کہ وہ اپنے بندوں سے اس طرح کے وساوس پر مواخذہ نہیں فرماتا۔ ہاں! اگر کوئی شخص ان وساوس کو اپنے دل میں جگہ دیتا ہے ان پر چنگلی حاصل کرتا ہے تو پھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے سخت مواخذہ ہوتا ہے۔

علامہ قرطبی رحمۃ اللہ علیہ حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کے دل میں پیدا ہونے والے وسوسے کے بارے میں فرماتے ہیں کہ اس طرح کا وسوسہ پیدا ہونا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اندر پائے جانے والے ”صریح ایمان“ کی علامت ہے۔ کیوں کہ حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کا معاملہ تو درج ذیل حدیث کے قیبل سے ہے۔

”آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کچھ لوگوں نے حاضر ہو کر عرض کیا: یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہم اپنے دلوں میں ایسے وساوس (بڑے خیالات) پاتے ہیں جن کے بارے میں زبان سے کچھ بات کرنا ہمیں بہت بھاری لگتا ہے۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کیا تم ایسے وساوس پاتے رہے ہو؟ (یعنی ایسے وساوس تم پاتے ہو نہ؟ خود تو نہیں لاتے نہ؟) انھوں نے کہا: جی ہاں! (یعنی وہ وساوس ہم خود نہیں لاتے بلکہ وہ خود بخود آتے رہتے ہیں)۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ذلک صریح الایمان یعنی یہ تو کھلم کھلا ایمان (کی علامت) ہے۔“<sup>①</sup>

علامہ قرطبی رحمۃ اللہ علیہ اس انداز بیان سے یہ بات اور بھی واضح ہو گئی کہ اس وسوسے سے حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کی شان میں کوئی فرق نہیں پڑا نیز نہ ہی ان کے ایمان میں کسی قسم کی خلش پیدا ہو سکی کیونکہ صحیح عظیم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے فوراً اسی موقع پر ان کی اصلاح فرمادی جیسا کہ حدیث میں گزرا۔

کوئی بھی انسان اس کی استطاعت نہیں رکھتا کہ وہ اپنے دل میں وساوس کو بالکل یہ پیدا ہی نہ ہونے دے یا وہ اپنے بڑے خیالات کو دل میں آنے ہی نہ دے۔ بلکہ انسان تو صرف یہ طاقت رکھتا ہے کہ وہ ان خیالات سوا اور شیطانی وساوس کو علم و تعلیم اور شرعی احکام کے ذریعے دور کرنے کی کوشش کرتا رہے۔ نہ ہی تو ان وساوس و خیالات پر عمل کرے اور نہ ہی ان کا اظہار کسی کے سامنے کرے۔ بلکہ ہمارے لیے یہ ضروری ہے کہ ہم ان وساوس کو دور کرنے کا وہ علاج اختیار کریں جو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابی بن

## مسائل العرفان فی علوم القرآن: جلد ۱

کعب بن زینب کے لیے اختیار کیا تھا۔ اور وہ یہ تھا کہ آپ ﷺ نے اُن کے سینے پر زور سے ہاتھ مارا، جس سے ان کے ضمیر پر چوٹ لگی۔ لہذا ہمیں بھی چاہیے کہ ہم وسوسوں کے وقت اپنے ضمیر کو اس زور سے جھنجھوڑیں کہ ہمارے دل سے وہ وسوسہ جھڑ جائے۔ آپ ﷺ نے جو طریقہ علاج اختیار کیا تھا، آپ اُس میں سو فیصد کامیاب ہوئے تھے تب ہی تو حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نے کہا تھا میں پسینے پسینے ہو گیا اور مجھے یوں محسوس ہونے لگا گویا میں اللہ عزوجل کو دیکھ رہا ہوں۔ یعنی حضور اکرم ﷺ کی ضرب سے اُن کے دل کا آئینہ ایسا صاف ہوا کہ انھیں اللہ تعالیٰ کی ذات صاف محسوس دکھائی دینے لگی۔

ہم نے حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کے بارے میں جو کچھ بیان کیا وہ صرف خلاصہ ہے۔ اگر آپ اس بارے میں مزید تفصیلات چاہتے ہوں تو شیخ محمد عبداللہ دراز رضی اللہ عنہ کی ”کتاب الختار“ کا مطالعہ کیجیے۔ علامہ دراز رضی اللہ عنہ نے اس بارے میں بہت ہی عمدہ کلام کیا ہے۔ یاد رہے یہ مقام وہ ہے جس پر بعض حضرات کے قدم پھسل چکے ہیں۔

آخر میں، میں (عبدالعظیم الزرقانی) اتنی بات کا اضافہ کرتا چلوں کہ حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کا جو واقعہ ہم نے بیان کیا۔ وہ واقعہ اس وجہ سے روئنا ہوا تھا کہ وہ اس سے پہلے حروفِ سبعہ پر زور لیا تو قرآن سے ناواقف تھے۔ اس لیے انھیں اس معاملے میں معذور سمجھا جائے گا اور وہ کسی مستند دلیل کے متنی تھے۔ چنانچہ جو ہی حضور اکرم ﷺ سے حروفِ سبعہ کے بارے میں سنا تو تمام اشکالات دُور ہو گئے اور سمجھ گئے کہ اللہ تعالیٰ نے سات حروف پر پڑھنے کی اجازت اُمتِ محمدی علی صاحبہا السلام والحدیہ پر زری اور سہولت کی خاطر دی ہے۔ نیز حضور اکرم ﷺ کے کافی دشمنی کلام کو کُن کر قلمی طور پر مطمئن ہو گئے۔ آپ رضی اللہ عنہ کے مطمئن ہونے کا اندازہ اس بات سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے کہ جن حضرات نے اس علم یعنی حروفِ سبعہ والے علم کو اُمت تک پہنچایا اُن میں حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کا نمایاں کردار ہے۔

③ عن ابی بن کعب رضی اللہ عنہ ان النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کان عند اُضاة بنی غفار۔ قال:

فأتاہ جبریل رضی اللہ عنہ فقال: ان اللہ یأمرک ان تقرأ امتک القرآن علی حرف۔ فقال: ”أسأل اللہ معافاته ومغفرته وان امتی لا تطیق ذلك“۔ ثم أتاه فقال: ان اللہ یأمرک ان تقرأ امتک القرآن علی حرفین۔ فقال: ”أسأل اللہ معافاته ومغفرته وان امتی لا تطیق ذلك“۔ ثم جاءه الثالثة فقال: ان اللہ یأمرک ان تقرأ امتک القرآن ثلاثة احرف۔ فقال: ”أسأل اللہ معافاته ومغفرته وان امتی لا تطیق ذلك“۔ ثم جاءه الرابعة فقال: ان اللہ یأمرک ان تقرأ امتک القرآن سبعة احرف۔ فأیما حرف قرؤوا علیہ فقد اصابوا۔

”حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ نبی اکرم ﷺ بنو غفار کے تالاب کے پاس تشریف فرما تھے کہ اسی دوران حضرت جبریل رضی اللہ عنہم آپ ﷺ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوئے اور عرض کی: اللہ تعالیٰ نے آپ کو حکم فرمایا ہے کہ آپ کی امت قرآن مجید کو ایک حرف (قراءت) پر پڑھے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: میں اللہ تعالیٰ سے معافی اور مغفرت کا سوال کرتا ہوں۔ میری اُمت اس کی طاقت نہیں رکھتی۔ پھر حضرت جبریل رضی اللہ عنہم دوبارہ تشریف لائے اور عرض کیا: اللہ تعالیٰ نے آپ کو حکم فرمایا ہے کہ آپ اپنی اُمت کو دو حرفوں (قراءتوں) پر قرآن کریم پڑھائیے۔ آپ ﷺ نے فرمایا:



قرآن مجید سات حروف پر نازل کیا گیا ہے۔ پس تم (ان میں سے) جس طریقے سے بھی پڑھو گے ٹھیک ہے اور اس میں کوئی شک نہ کرو۔“  
حدیث کے آخری الفاظ: ”فلا تماروا“ ہیں۔ القاموس میں ہے:

”مارہ، ممرارہ، امراء، امتری فیہ اور تماری: ان تمام ألفاظ کا ترجمہ شک ہی کیا جاتا ہے۔ نیز المریۃ (کسرہ اور ضمہ کے ساتھ) اس کا معنی بھی شک اور جہل ہوتا ہے۔“

④ ((عن ابن مسعود قال اقرأنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سورۃ من آل حم فرحت الی المسجد فقلت لرجل: اقرأها فاذا هو یقرؤها حروفا ما اقرؤها. فقال: اقرأناہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم. فانطلقنا الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فأخبرناہ فتغیر وجہہ وقال: ”انما اهلك من قبلکم الاختلاف“ ثم أسر الی علی شیئا. فقال علی: ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یأمرکم ان یقرأ کل رجل منکم کما علم. قال: فانطلقنا وکل رجل یقرأ حروفا لا یقرؤها صاحبہ)).<sup>①</sup>

”حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ فرماتے ہیں: رسول اللہ ﷺ نے مجھے سورہ حم سجدہ پڑھائی۔ میں (پڑھنے کے بعد) مسجد کی طرف چل پڑا۔ وہاں میں نے ایک آدمی سے کہا کہ مجھے سورہ حم سجدہ سناؤ۔ جب اُس نے مجھے یہ سورت سنائی تو اُس کے وہ حروف (قرأت) نہ تھی جو حضور اکرم ﷺ نے مجھے پڑھائی تھی۔ اُس نے کہا: مجھے تو رسول اللہ ﷺ نے اسی طرح پڑھائی ہے۔ ہم (یہ مسئلہ لے کر) رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپ ﷺ کو ساری بات بتائی۔ (غمے کی وجہ سے) آپ ﷺ کے چہرہ مبارک کارنگ متغیر ہو گیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: (اختلاف و نزاع نہ کیا کرو) بے شک تم سے پہلی امتیں اختلاف ہی کی وجہ سے ہلاک ہوئیں۔ پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ کی اشارہ کیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: بے شک رسول اللہ ﷺ نے تمہیں حکم دیا ہے کہ تم سے ہر شخص اسی طرح پڑھے جس طرح اُسے سکھایا گیا ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ہم وہاں سے چل دیے اور (ہم میں سے) ہر آدمی اُن حروف کے ساتھ پڑھتا تھا جن کے ساتھ اُس کا ساتھی نہیں پڑھتا تھا۔

⑤ ((عن ابن مسعود رضی اللہ عنہ: انه سمع رجلا یقرأ آیۃ سمع النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قرأ خلفا. قال: فاخذت ببیدہ فانطلقت بہ الی النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فقال: ”کلا کما محسن فاقرأ)).

قال شعبة احد رواة هذا الحدیث: اکبر علمی ان النبی ﷺ قال: ((فان من كان قبلکم اختلفوا فاهلکوا)).<sup>②</sup>

”حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے ایک صاحب (حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ) کو ایک آیت پڑھتے سنا، وہی آیت انھوں سے رسول اللہ ﷺ نے اس کے خلاف سنی تھی۔ (اب مسعود رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ) پھر میں نے ان کا ہاتھ پکڑا اور انھیں نبی کریم ﷺ کی خدمت میں لایا۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: تم دونوں صحیح ہو۔ اس لیے اپنے اپنے طور پر پڑھو۔“

امام شعبہ جو کہ اس حدیث کے رواۃ میں سے ایک ہیں فرماتے ہیں: میرا غالب گمان یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ نے یہ بھی



فرمایا (اختلاف وزاع نہ کیا کرو) کیونکہ تم سے پہلی امتوں نے اختلاف کیا اور اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے انہیں ہلاک کر دیا۔ (اس حدیث کو امام بخاری رحمہ اللہ نے روایت کیا ہے۔)

③ عن زید بن ارقم رضی اللہ عنہ قال: جاء رجل الى رسول الله صلى الله عليه وآله وسلم فقال: أقرأتى ابن مسعود رضى الله عنه سورة اقرأ أيها زيد بن ثابت رضى الله عنه وأقرأ أيها ابى بن كعب رضى الله عنه فاختلف قرأتهم فبقراءة أياهم أخذ؟ فسكت رسول الله صلى الله عليه وآله وسلم وعلى رضى الله عنه ابى جنبه فقال على رضى الله عنه: ليقرأ كل انسان منكم كما علمه فإنه حسن جميل. ①

”حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ فرماتے ہیں: ایک آدمی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کرنے لگا: مجھے ایک سورت حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے پڑھائی۔ پھر وہی سورت حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ نے پڑھائی۔ پھر وہ ہی سورت حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نے پڑھائی۔ (لیکن) ان سب کی قراءت آپس میں مختلف ہیں۔ پس میں ان میں سے کس قراءت کو اختیار کروں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو خاموش رہے لیکن پہلو میں حضرت علی رضی اللہ عنہ بیٹھے تھے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: تم میں ہر انسان کو چاہیے کہ اُسے جس طرح پڑھایا گیا ہے، اُسی طرح پڑھے، اُس کے لیے وہ ہی بہتر اور اچھا ہے۔“ (اس حدیث کو امام طبری رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر میں نقل کیا ہے۔)

④ عن ابى هريرة رضى الله عنه انه قال: قال رسول الله صلى الله عليه وآله وسلم: ان هذا القرآن انزل على سبعة احرف، فاقراءوا ولا حرج ولكن لا تختصوا ذكرا رحمة بعدا، ولا ذكرا عذاب برحمة. ②

”حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ فرماتے ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بے شک قرآن مجید سات حروف پر نازل کیا گیا۔ پس تم ان تمام حروف پر پڑھو اس میں کوئی حرج نہیں۔ لیکن رحمت کے تذکرے کو تذکرہ عذاب کے ساتھ اور عذاب کے تذکرے کو تذکرہ رحمت کے ساتھ ملا کر ختم نہ کرو (یعنی ایسی جگہ وقف نہ کرو جہاں رحمت کا ذکر، عذاب کے ساتھ اور عذاب کا ذکر، رحمت کے ساتھ خلط ملط ہو جائے)۔“

## احادیث حروفِ سبعہ سے مستنبط ہونے والے امور اور حکمتیں

ما سبق میں بیان کی گئی احادیث پر غور کیا جائے تو بہت سے امور ثابت ہوتے ہیں اور بہت سی حکمتیں سمجھ میں آتی ہیں، جو کہ نور کے مناروں، روشنی کی مشعلوں اور اندھیروں میں چراغ کا کام دیتی ہیں۔ ذیل میں چند امور اور حکمتیں بیان کی جا رہی ہیں، ان کا بغور مطالعہ حروفِ سبعہ کے مفہوم و حقیقت کو مزید واضح کر دے گا اور اس دقیق موضوع میں رشد و ہدایت اور صواب و حق کا سبب بنے گا۔ ان شاء اللہ عزوجل

**نوٹ:** ذیل میں آٹھ حکمتیں اور آٹھ ہی ایسے امور تحریر کیے جا رہے ہیں جو حروفِ سبعہ والی بیان کردہ احادیث سے ماخوذ ہوتے ہیں۔

(پہلا امر یا پہلی حکمت) اُمت پر سہولت اور آسانی

احادیث کے مطالعے سے سب سے پہلی بات/ امر یہ ثابت ہوتا ہے کہ قرآن مجید کو سات حروف یا قراءتوں میں اس لیے نازل کیا گیا کہ اُمت پر خصوصاً عرب پر سہولت و آسانی ہو سکے۔ کیونکہ عرب کی زبان میں قرآن کریم نازل ہوا۔ عرب میں بہت سے قبائل تھے۔ ان تمام قبائل میں لب و لہجہ اور الفاظ و حروف کی ادائیگی و تلفظ میں بھی اختلاف پایا جاتا تھا۔ ایک ہی لفظ کو ایک قبیلہ کسی اور طرح سے پڑھتا اور دوسرا قبیلہ کسی اور طرح سے پڑھتا، باوجود اس کے، کہ وہ سب ایک زبان اور ایک ملک کے لوگ تھے۔ اگر قرآن مجید کو ایک ہی حرف یعنی قراءت میں نازل کیا جاتا تو ان لوگوں پر بہت مشکل ہوتا۔ اس کی مثال یوں سمجھ لیجئے کہ ہم میں سے یعنی قاہرہ میں رہنے والوں میں سے کوئی شخص ”لسیوط“ کے رہنے والوں کے تلفظ میں بات کرے تو ہمیں سمجھنے میں دقت پیش آئے گی۔ حالانکہ ”لسیوط“ اور ”القاہرہ“ دونوں مصر کے شہر ہیں۔ دونوں جگہ پر مصری زبان بولی جاتی ہے۔ لیکن پھر بھی ہمیں سمجھنے میں دشواری پیش آئے گی۔ پس یہی صورت حال نزول قرآن کے وقت تھی۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کو سات حروف یا قراءتوں میں نازل فرمایا۔ اور یہی حروف سب سے پر نزول قرآن کی پہلی اور بنیادی حکمت تھی۔

اب آپ پر ان احادیث کا مطلب بھی واضح ہو جائے گا جن میں حضور اکرم ﷺ بار بار حضرت جبرئیل علیہ السلام سے حروف کے بڑھانے کا مطالبہ کرتے رہے۔ دیکھیے اجزائے احادیث:

- ① فرددث الیہ ان ھون علی اُمتی
- ② اسأل اللہ معافاتہ و مغفرتہ وان امتی لاتطبق ذلک
- ③ یا جبرئیل انی اُرسلت الی اقدۃ ائمتیہ فیہم الرجل والمرأۃ والغلام والجارۃ والشیخ الفانی الذی لم یقرأ کتابا قظ امام محقق ابن جزری رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں:

”سات حروف پر قرآن مجید کو نازل فرمانے کے اسباب میں سے ہیں: اس اُمت پر تخفیف کرنا، قرآن پڑھنے میں آسانی پیدا کرنا، رحمت خداوندی کی وسعت کا ظہور اور اس بات کا اقرار کہ رسول اللہ ﷺ ساری مخلوق میں افضل اور اللہ تعالیٰ کے محبوب ہیں۔ کیا دیکھتے نہیں کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام نے آکر حضور اکرم سے عرض کیا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو حکم دیا ہے کہ آپ اپنی اُمت کو ایک حرف (قراءت) پر قرآن پڑھائیے۔ لیکن حضور اکرم ﷺ نے اللہ تعالیٰ کے سامنے معافی مانگتے ہوئے، عاجزی کا اظہار کرتے ہوئے اور مدد مانگتے ہوئے عرض کیا: میری اُمت اس کی (یعنی ایک ہی حرف پر قرآن پڑھنے) طاقت نہیں رکھتی۔ اور آپ مسلسل اللہ تعالیٰ سے حروف یعنی قراءتوں کی تعداد بڑھانے کی درخواست کرتے رہے یہاں تک کہ تعداد سات حروف پہنچ گئی۔“

گویا کہ قرآن مجید سات دروازوں میں سے سات حروف (قراءتوں) پر نازل ہوا، جب کہ سابقہ کتب سماویہ ایک دروازے سے ایک حرف (قراءت) پر نازل ہوئیں۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ سابقہ انبیائے کرام علیہم السلام خاص قوم اور خاص علاقے کی طرف مبعوث ہوتے تھے جب کہ ہمارے پیارے نبی حضرت محمد ﷺ تمام انسانیت کے لیے خواہ وہ گورے ہوں یا کالے، عربی ہوں یا عجمی، رحمت بنا کر بھیجے گئے ہیں۔ اور وہ عرب جن کی زبان میں قرآن کریم نازل ہوا ان کی لغات میں اور تلفظات میں بہت فرق پایا جاتا تھا۔ اور ان میں سے ہر ایک کے لیے ایک حرف یا لفظ کو ایک لغت سے دوسری لغت میں منتقل کرنا آسان کام



نہیں تھا۔ ان کے لیے یہ ممکن نہ تھا کہ اپنی بولی کے علاوہ دوسروں کی زبان بولیں۔ بلکہ بعض عربوں کی حالت تو یہ تھی کہ وہ پڑھانے اور سکھانے سے بھی دوسروں کی زبان نہیں سیکھ سکتے تھے، خاص طور پر بوڑھے مرد اور عورتیں اور وہ لوگ جو کتاب وغیرہ نہیں پڑھ سکتے تھے، جیسا کہ حضور اکرم ﷺ نے حدیث میں اشارہ بھی فرمایا ہے۔ پس اگر ان کو صرف ایک حرف، لغت یا قرأت پر مکلف کیا جاتا تو ان کو ایسی تکلیف میں مبتلا کرنا یا جاتا جس کی ان میں طاقت و استطاعت نہیں تھی۔ اور یہ بھی ممکن تھا کہ ان کی طاقت سے باہر ہونے کی وجہ سے ان میں ماپوسی پیدا ہو جاتی۔

**نوٹ:** اوپر جو کچھ بیان ہوا، وہ ان آٹھ اُمور میں سے پہلا اُمور ہے جو کہ دراصل آٹھوں حکمتوں میں سے پہلی حکمت کی تقریر ہے۔ ذیل میں بقیہ سات حکمتیں مذکور ہیں۔ اور ان حکمتوں کے بعد ان آٹھ اُمور میں سے بقیہ سات اُمور بیان کیے جائیں گے۔

**(دوسری حکمت) امت مسلمہ کو ایک لسان پر جمع کرنا** ﴿قرآن مجید بھی لسان قریش ہی میں نازل ہوا۔

قریش کے لوگ موسم حج اور عرب کے بازاروں میں نشیب و فراز سے آنے والے وفد و عرب کے الفاظ میں سے جن کو لُج و لطیف سمجھتے ان کا چناؤ کر لیتے تھے اور پھر مزید تنقیح و تہذیب کے بعد انھیں اپنی مسلمہ متفقہ نکسالی لغت کے دائرے میں شامل کر لیتے جس کی مقتدایت اور اہمیت و برتری سب عرب کے یہاں مسلم تھی۔ اسی سیاست رشیدہ کے موافق قرآن کریم سب احرف پر نازل ہوا۔ قرآن کریم نے قریشیوں کی سیاست کے اندازے سے کہیں اونچے معیار پر قبائل عرب کی لغات میں سے جو لغات چاہیں منتخب کر لیں۔ یہ ہی وہ نکتہ ہے جس کی بنا پر یہ کہنا یقیناً صواب و حق ہے کہ ”قرآن کریم لغت قریش پر نازل ہوا ہے“ کیونکہ اس نکتے کی روشنی میں کل عرب کی سب لغتیں قریشیوں کی ایک ہی لغت میں منٹخص و مجتمع ہو گئی تھیں۔ اور اتحاد الہی کے لیے اتحاد لسانی بھی ایک اہم کردار ادا کرتا ہے۔ خاص طور پر اس وقت میں جب کوئی قوم و ملت اپنے ابتدائی ادوار سے گزر رہی ہو۔

**(تیسری حکمت) احکام کی مزید وضاحت** ﴿قرآن مجید کو مختلف قراتوں کے ساتھ نازل کرنے کا ایک فائدہ یہ بھی ہوا کہ بعض احکام کی وضاحت ہو گئی۔ مثلاً:

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَإِنْ كَانَ جُلُؤُورُ كَلِمَةً أَوْ امْرَأًا وَوَلَهُ أَخٌ أَوْ أُخْتٌ فَلِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ﴾ (النساء: ۱۲)

”اور اگر ایسے مرد یا عورت کی میراث ہو جس کے نہ باپ ہوں نہ بیٹا مگر اس کے بھائی یا بہن ہوں تو ان میں سے ہر ایک کا چھٹا حصہ ہے۔“  
حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہما سے اس آیت کی قرأت اس طرح مروی ہے:

﴿وَ لَهُ أَخٌ أَوْ أُخْتٌ مِّنْ أُمَّرٍ فَلِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ﴾

اس قرأت میں ”مِّنْ أُمَّرٍ“ کے الفاظ کا اضافہ ہے جو کہ آیت میں بیان کردہ حکم کی مزید وضاحت کیے دیتا ہے کہ اس آیت میں بھائی یا بہن سے شتیق (سج) بھائی، بہن یا باپ شریک بھائی، بہن مراد نہیں ہے۔ بلکہ صرف اور صرف ماں شریک بھائی یا بہن مراد ہے۔ اور یہ وہ مسئلہ ہے جس پر سب کا اتفاق ہے۔

اس باب میں ایک اور مثال ملاحظہ کیجیے۔ اللہ سبحانہ و تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿فَكَفَّارَتُهُ إِطْعَامُ عَشْرَةِ مَسْكِينٍ مِنْ أَوْسَطِ مَا تُطْعَمُونَ أَهْلِيكُمْ أَوْ كِسْوَتُهُمْ أَوْ تَحْرِيرُ رَقَبَةٍ ۖ مُؤْمِنَةٌ﴾  
 ”(قسم توڑنے کا) کفارہ دس ناداروں کو اوسط درجے کا کھانا کھلانا ہے جو تم اپنے اہل و عیال کو کھلاتے ہو یا ان کو کپڑے دینا  
 یا ایک غلام آزاد کرنا۔“

ایک قراءت کے مطابق آیت بالا درج ذیل اضافے کے ساتھ آئی ہے۔ دیکھیے پوری آیت:

﴿فَكَفَّارَتُهُ إِطْعَامُ عَشْرَةِ مَسْكِينٍ مِنْ أَوْسَطِ مَا تُطْعَمُونَ أَهْلِيكُمْ أَوْ كِسْوَتُهُمْ أَوْ تَحْرِيرُ رَقَبَةٍ ۖ مُؤْمِنَةٌ﴾

اس قراءت میں لفظ ”مؤْمِنَةٌ“ کا اضافہ ہے۔ جس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ قسم کے کفارے میں جو غلام آزاد کیا

جائے گا، اُس کا مومن ہونا ضروری ہے۔ اور یہ قراءت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کی کفارہ یمن والے مسئلے میں مؤید ہے۔

پس ثابت ہوا کہ سب سے بعض اوقات احکام کی وضاحت کا فائدہ بھی حاصل ہوتا ہے۔

(چوتھی حکمت) دو مختلف احکام کو ایک ہی آیت میں جمع کرنا ﴿قرآن مجید کو مختلف آیتوں میں نازل کرنے کا ایک فائدہ یہ بھی

بھی ہوا کہ ایک ہی آیت سے دو احکام بیان کر دیے گئے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿فَاعْتَرِضُوا لِلنِّسَاءِ فِي الْمَحْضِ وَلَا تَقْرُبُوهُنَّ حَتَّىٰ يَظْهَرْنَ﴾ (البقرہ: ۲۲۲)

”سو ایام حیض میں عورتوں سے کنارہ کش رہو۔ اور جب تک وہ پاک نہ ہو جائیں ان سے مقاربت نہ کرو۔“

اس آیت میں لفظ ﴿يَظْهَرْنَ﴾ میں دو قراءتیں ہیں۔ ایک: تخفیف کے ساتھ یعنی ﴿يَظْهَرْنَ﴾ اور دوسری: تشدید کے

ساتھ یعنی ﴿يَظْهَرْنَ﴾۔

صیغے میں تشدید والی قراءت کی وجہ سے عورتوں کے حیض سے پاکی حاصل کرنے میں مبالغے کے وجوب کا فائدہ حاصل

ہو رہا ہے۔ کیونکہ ہنئی کی زیادتی معنی کی زیادتی پر دال ہوتی ہے۔ جب کہ تخفیف والی قراءت میں مبالغے کا فائدہ حاصل نہیں

ہو رہا۔ مختصر یہ کہ اس ایک آیت میں پائی جانے والی دو مختلف قراءتوں سے درج ذیل دو مختلف احکام ثابت ہوئے۔

پہلا حکم ﴿يَظْهَرْنَ﴾ بغیر تشدید والی قراءت کی صورت میں ثابت ہوتا ہے۔ کیونکہ اس قراءت کے مطابق مرد کا عورت کے قریب

جانے کے لیے عورت کا صرف پاک ہونا ضروری ہے، پاکی میں مبالغہ یعنی غسل کا پایا جانا ضروری نہیں۔ اور عورت

کا صرف پاک ہونا، حیض کے منقطع ہوجانے سے حاصل ہو جاتا ہے۔ لہذا اس قراءت کے مطابق اگر کسی عورت کا حیض (مدت مقررہ

کے بعد) زک چکا ہے تو اُس کا شوہر اُس سے وطی کر سکتا ہے، اگرچہ عورت نے ابھی غسل نہ کیا ہو۔ (یہ قراءت احناف اور ان کے ہم

خیال حضرات کے مذہب کی مؤید ہے۔)

دوسرا حکم ﴿يَظْهَرْنَ﴾ دوسرا حکم تشدید والی قراءت کی صورت میں ثابت ہوتا ہے۔ یعنی شوہر اپنی بیوی سے اُس وقت تک وطی نہیں کر سکتا

جب تک اُس کی بیوی طہارت میں خوب مبالغہ یعنی غسل نہیں کر لیتی۔ لہذا اس قراءت کے مطابق دونوں طہارتوں

”محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ“

منائل العسرفان فی علوم القرآن: جلد ۱

یعنی حیض کا منقطع ہونا اور غسل کرنا، کا پایا جانا ضروری ہے۔ تشدید والی قراءت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے ہم خیال حضرات کے مذہب کی موید ہے۔

## (پانچویں حکمت) دو مختلف حالتوں میں دو مختلف شرعی احکام کو ایک ہی آیت میں جمع کرنا

اختلاف قراءت یا تعدد قراءت کا ایک فائدہ یا حکمت یہ بھی ہے کہ دو مختلف حالتوں کے دو مختلف احکام کو ایک ہی آیت میں بیان کر دیا جاتا ہے۔ مثلاً وضو کرتے وقت اگر حالت یہ ہے کہ موزے نہیں پہنے ہوئے تو اس کے لیے پاؤں دھونے کا حکم ہے اور اگر حالت یہ ہو کہ موزے پہنے ہوئے ہوں تو اس کے لیے پاؤں دھونے کا نہیں بلکہ مسح کرنے کا حکم ہے۔ اب درج ذیل آیت ملاحظہ کیجیے کہ اختلاف قراءت کے سبب دو مختلف حالتوں کے دو مختلف احکام کو ایک ہی آیت میں کیسے یکجا کیا گیا ہے۔

﴿فَاغْسِلُوا وُجُوهَكُمْ وَ أَيْدِيَكُمْ إِلَى الْمَرَافِقِ وَ امْسَحُوا بِرُءُوسِكُمْ وَأَرْجُلَكُمْ إِلَى الْكَعْبَيْنِ﴾ (المائدہ: ۶)

”مومنو! جب تم نماز پڑھنے کا قصد کیا کرو (تو اپنے منہ اور کہنیوں تک ہاتھ دھولیا کرو اور سر کا مسح کر لیا کرو اور ٹخنوں تک پاؤں دھولیا کرو۔“

اس آیت میں موجود لفظ ”أَرْجُلَكُمْ“ کو ایک قراءت کے مطابق نصب یعنی ”أَرْجُلَكُمْ“ اور دوسری کے مطابق جر کے ساتھ یعنی ”أَرْجُلِكُمْ“ پڑھا گیا ہے۔ نصب کی صورت میں اس کا عطف ”وَجُوهَكُمْ“ پر ہوگا، جو کہ منصوب ہے اور دھونے کا حکم رکھتا ہے لہذا ”أَرْجُلَكُمْ“ پر بھی وہ ہی حکم لاگو ہوگا۔ جب کہ جر کی صورت میں اس کا عطف ”رُءُوسِكُمْ“ پر ہوگا، جو کہ مجرد ہے اور مسح کا حکم رکھتا ہے لہذا ”أَرْجُلِكُمْ“ بھی مسح ہوگا۔

نیز اس مسئلے کی وضاحت رسول اللہ ﷺ نے بھی فرمادی ہے کہ موزے پہننے والا مسح کرے گا جب کہ بغیر موزے والے پر پاؤں دھونا لازم ہوں گے۔

## (چھٹی حکمت) غیر مقصود و احتمال کو دور کرنا

بعض مرتبہ کسی آیت میں کوئی ایسا احتمال پیدا ہو رہا ہوتا ہے جو اللہ تعالیٰ کا مقصود نہیں ہوتا تو تعدد قراءت کی وجہ سے وہ احتمال بھی دور کرنے کا فائدہ حاصل کیا گیا۔ مثلاً نماز جمعہ کے بارے میں قرآن مجید میں ہے:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا نُودِيَ لِلصَّلَاةِ مِنْ يَوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا إِلَىٰ ذِكْرِ اللَّهِ﴾ (الجمعة: ۹)

”مومنو! جب جمعے کے دن نماز کے لیے اذان دی جائے تو اللہ کے ذکر کی طرف دوڑو۔“

اس آیت میں لفظ ”فَاسْعَوْا“ کا معنی ہے: ”دوڑو۔“ اس میں یہ احتمال ہے کہ شاید جمعہ کی نماز و خطبہ کے لیے مسجد کی طرف دوڑ کر جانے کا حکم دیا جا رہا، حالانکہ اللہ تعالیٰ کا یہ مقصد نہیں کہ میرے بندے مسجد کی طرف دوڑتے ہوئے آئیں۔ اس لیے احتمال کو اس دوسری قراءت میں دور کر دیا گیا، جس میں ”فَاسْعَوْا“ کے بجائے ”فَاقْضُوا إِلَىٰ ذِكْرِ اللَّهِ“ کے الفاظ ہیں۔ اور ”فَاقْضُوا“ کا مدلول دوڑنا نہیں ہوتا۔

﴿مَسَائِلُ الْعُرْفَانِ فِي عُلُومِ الْقُرْآنِ: جلد ۱﴾

(ساتویں حکمت) ابہام دور کرنا ﴿﴾ کا فائدہ بھی اختلافِ قراءت یا تعددِ قراءت سے حاصل ہوتا ہے۔ جیسے:

﴿وَتَكُونُ الْجِبَالُ كَالْعِهْنِ الْمَنْفُوشِ﴾ (القارۃ: ۵)

”اور پہاڑ ایسے ہو جائیں گے جیسے دکھی ہوئی رنگ برنگی اون۔“

”العِهْنُ“ کے معنی میں ابہام تھا اس کو دوسری قراءت ”كَالضُّوْفِ الْمَنْفُوشِ“ کے ذریعے دور کر دیا گیا کہ العِهْنُ سے

”الضُّوْفُ“ یعنی اون مراد ہے۔

(آٹھویں حکمت) گم راہ لوگوں کے گم راہ کن عقائد و نظریات کا رد کرنا ﴿﴾ بعض مرتبہ اختلاف

قراءت سے کسی گم راہ فرقے کے عقائدِ فاسدہ کو رد کرنے کا فائدہ حاصل ہوتا ہے۔ جیسا روایتِ باری تعالیٰ کا عقیدہ ہے۔ قرآن مجید میں ہے:

﴿وَإِذَا رَأَيْتَ نَعْمَ رَأَيْتَ نَعِيمًا وَ مَلِكًا كَبِيرًا﴾ (الاحقاف: ۲۰)

”اور جنت میں جہاں آنکھ اٹھاؤ گئے نعمتیں ہی نعمتیں اور عظیم الشان سلطنت دیکھو گے۔“

جولوگ روایتِ باری تعالیٰ کے قائل نہیں، اُن کے اس غلط عقیدے کو درج ذیل قراءت کے ذریعے رد فرمایا جس میں ”م“ زبر اور ”ل“ کسرہ کے ساتھ ہے:

﴿وَإِذَا رَأَيْتَ نَعْمَ رَأَيْتَ نَعِيمًا وَ مَلِكًا كَبِيرًا﴾

”اور جنت میں جہاں آنکھ اٹھاؤ گئے نعمتیں ہی نعمتیں اور عظیم الشان بادشاہ کو دیکھو گے۔“

اس قراءت میں ان لوگوں پر رد ہے جو روزِ آخرت میں روایتِ باری تعالیٰ کے منکر ہیں۔ یہاں ”ملک“ سے ذاتِ باری تعالیٰ

مراد ہے۔ کیونکہ اس روز صرف وہ ہی بادشاہ ہوگا اور اسی کی بادشاہت ہوگی:

﴿لَيَمُنَّ الْمَلِكُ الْيَوْمَ ۚ لِلَّهِ الْوَالِدُ الْقَهَّارُ﴾ (الاحقاف: ۱۶)

”کہا جائے گا) کس کی بادشاہی ہے آج؟ (جواب ایک ہی ہوگا کہ) اللہ کی جو اکیلا ہے بڑا زبردست ہے۔“

﴿﴾ (حرفِ سابعہ پر نزولِ قرآن کے باب میں اختلافِ قراءات سے تنوعِ قراءات مراد ہے۔ تنوعِ قراءات کا مطلب ہے ”قراءات میں پایا جانے والا تنوع۔“ دوسرے الفاظ میں یوں کہہ لیجیے: اس باب میں اختلاف کا لفظ ”تضاد“

(Contradiction) کے معنی میں نہیں ہے۔ بلکہ تنوع یعنی Variety کے معنی میں ہے۔ اختلاف کے لفظ کا تنوع کے معنی میں

استعمال ہونا قرآن مجید سے بھی ثابت ہے۔ دیکھیے:

﴿وَ اٰخْتِلَافُ اَلْسِنَتِكُمْ ۚ وَ اَلْوَالِدُكُمْ﴾ (الاحقاف: ۲۲)

”تمہاری بولیوں اور رنگوں کا اختلاف۔“

مناہل العسرفان فی علوم القرآن: جلد ۱) اختلاف کے معنی میں استعمال ہونا ہماری اردو زبان سے بھی ثابت ہے۔ شیخ محمد ابراہیم ذوق (۱۷۸۹ء، ۱۸۵۳ء) کا شعر دیکھیے:

گلبائے رنگا رنگ سے ہے زینتِ چمن

اے ذوق! اس جہاں کو ہے زیبِ اختلاف سے

تنوعِ قراءات، تعددِ آیات کی طرح ہے اور فنِ بلاغت کی اقسام میں ایک قسم ہے۔ اس کی ابتدا جمالِ ایجاز اور اس کی انتہا کمالِ اعجاز ہے۔

قرآن مجید کے کلام ہونے پر جو بے نقیض براہین وادلہ موجود ہیں، ان میں سے ایک براہن و دلیل ”تنوعِ قراءات“ ہے۔ نور یہ تنوعِ قراءات رسول اللہ ﷺ کی بھی صداقت کی دلیل ہے۔ کیونکہ اتنی کثرت کے ساتھ پایا جانے والا اختلاف لازمی طور پر اضطراب، تضاد اور تناقض وغیرہ جیسی کمبوجی کو پیدا کرتا ہے۔ لیکن آپ قرآن کریم کو ابتدا سے انتہا تک پڑھ لیجئے اس میں غور و فکر کر لیجئے، کسی ایک آیت حتیٰ کہ ایک لفظ میں بھی آپ کو کسی قسم کا اضطراب، تضاد یا تناقض دکھائی نہیں دے گا۔ بلکہ ہر ایک آیت دوسری آیت کی تصدیق و تائید کرتی اور شہادت دیتی ہوئی نظر آئے گی۔ سو یہ بات اس امر کی منہ بولتی دلیل ہے کہ یہ کلام اللہ کا کلام ہے، اس کا اسلوب اعلیٰ و بے نظیر ہے، ہدایت و تعلیم کی بلند یوں کے اعتبار سے اس کا ہدف اور معیار واحد و یکتا ہے۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ آج تک قرآن مجید میں کسی قسم کا کوئی تغیر و تبدل نہیں ہوسکا۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ قرآن مجید کی تمام قراءات من جانب اللہ ہیں۔ لہذا قرآن مجید کو جس قراءت میں بھی پڑھا جائے گا وہ

اللہ کا معجز کلام ہی کہلائے گا۔ اور اس وقت معجزات بھی متعدد ہوں گے قراءات اور حروف کے متعدد ہونے کی وجہ سے۔

**نوٹ:** حروفِ سبعہ والی احادیث سے ثابت ہونے والی انھوں حکمتیں (کھلم) اور آٹھ امور میں سے ایک امر اوپر بیان کر دیا گیا ہے۔ اب ذیل میں بقیہ سات امور بیان کیے جا رہے ہیں۔

(دوسرا امر) حروف یا قراءتیں سات کے عدد میں محصور ہیں، کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ

رسول اللہ ﷺ کی طرف سے حروف میں زیادتی کی درخواست کے بعد اللہ تعالیٰ کی طرف سے چھ حروف یا قراءتوں کا اضافہ کیا گیا تھا۔ یہ چھ قراءات اس ایک قراءت کے علاوہ تھیں، جو حضرت جبرئیل علیہ السلام نے آنحضرت ﷺ کو پہلی مرتبہ پڑھائی تھی۔ پھر درخواست کے بعد اس ایک قراءت کے ساتھ چھ اور ملا دی گئیں اور اس طرح کل سات قراءات بن گئیں۔ اور یہاں ”سات“ سے مراد وہ خاص عدد ہے، جو چھ اور آٹھ کے درمیان میں ہوتا ہے۔ اور جو لوگ کہتے ہیں کہ سات حروف میں ”سات“ سے کثرت مراد ہے جیسا کہ عرب میں رواج تھا کہ سات کا لفظ کثرت بتانے کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔ تو ان کا یہ کہنا غلط ہے، کیونکہ اس موقع پر سات کثرت کے لیے نہیں بلکہ مشہور و معروف عدد یعنی ”سات“ ہی کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ ذیل میں دو احادیث مذکور ہیں ان کو بغور پڑھنے سے یہ بات روز روشن کی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ سات حروف یا سات قراءات سے کثرت قراءات یا کثرت حروف مراد نہیں بلکہ سات حروف یا سات قراءات ہی مراد ہیں۔

”محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ“

۱) حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((اقرأنی جبریل علی حرف، فراجعتہ، فلم ازل استزیدہ ویزیدنی حتی بلغ سبعة احرف)).

”حضرت جبریل علیہ السلام نے مجھے (پہلے) ایک حرف پر پڑھایا، تو میں نے ان سے مراجعت کی اور مسلسل زیادتی طلب کی سو وہ (قرآن کریم کے حروف میں) مجھے (یعنی میرے لیے) اضافہ کرتے رہے یہاں تک کہ وہ سات حروف تک پہنچ گئے۔“

۲) اسی طرح حضرت ابوبکرؓ کی حدیث میں ہے: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

((فَنظَرْتُ إِلَى مِيكَائِيلَ فَمَسَكْتُ فَعَلَيْتُ أَنَّهُ قَدِ انْتَهَتْ الْعِدَّةُ)).

”میں نے میکائیل کی طرف دیکھا تو وہ خاموش تھے، میں سمجھ گیا کہ اب (حروف کو مزید بڑھائے جانے کی گنجائش یا) تعداد ختم ہو چکی ہے“

(مکمل واقعہ یہ ہے: جب حضور اکرم ﷺ نے حضرت جبرائیل علیہ السلام سے قرآن کریم کی قراءت میں اضافہ طلب کیا تھا تو حضرت میکائیل علیہ السلام بھی اس موقع پر موجود تھے۔ حضرت جبرائیل نے ایک حرف پر حضور اکرم ﷺ کو قرآن پڑھایا، تو حضرت میکائیل نے آپ سے عرض کیا: زیادتی کی درخواست کیجیے۔ آپ ﷺ نے زیادتی طلب کی، حضرت جبرائیل علیہ السلام نے ایک اور حرف کی زیادتی کر دی۔ پھر حضرت میکائیل علیہ السلام نے حضور اکرم ﷺ سے عرض کیا: زیادتی کی درخواست کیجیے۔ آپ ﷺ نے زیادتی طلب کی، حضرت جبرائیل علیہ السلام نے ایک اور حرف کی زیادتی کر دی۔... یہ سلسلہ جب سات حروف تک پہنچا اور حضور اکرم ﷺ نے حضرت میکائیل علیہ السلام کی طرف دیکھا تو اب آپ خاموش تھے۔ حضور اکرم ﷺ سکوت سے سمجھ گئے کہ اب مزید گنجائش نہیں رہی، وگرنہ حضرت میکائیل علیہ السلام اس مرتبہ بھی مجھے زیادتی کی درخواست کا کہتے۔)

(تیسرا امر) ساتوں کے ساتوں حروف یا قراءتیں درست ہیں۔ صواب و درست ہیں۔ اور

پڑھنے والا بھی ان میں جس مرضی حرف کو اختیار کرے اُس پر کوئی ملامت نہیں کی جاسکتی۔ ذیل میں چند ان احادیث کے اجزا ذکر کیے جا رہے ہیں جن سے یہ واضح ہو جائے گا کہ تمام قراءتیں درست ہیں۔

۱) فَأَيُّمَا قَرَأْتُمْ وَأَعْلَيْهِ فَقَدْ أَصَابُوا

۲) أَصَبْتُ

۳) كَلَّا كَمَا تُحْسِنُ

۴) فَأَيُّ ذَلِكَ قَرَأْتُمْ أَصَبْتُمْ

۵) حضور اکرم ﷺ کا حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہما کے سینے پر زور سے مارنا اور سمجھانا کہ ان حروف سب سے جس کو اختیار کیا جائے درست ہے۔

مندرجہ بالا تمام نکات اس پر شاہد ہیں کہ قراءت سب سے بعض کو صحیح اور بعض کو غلط کہنا یا ماننا جائز نہیں ہے۔

”محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ“



(چوتھا امر) قراءات میں پایا جانے والا تنوع من جانب اللہ ہے ﴿﴾ اختلاف یا تنوع پایا

جاتا ہے، وہ صرف اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے۔ اس میں کسی بشر کا کوئی عمل دخل نہیں۔ بلکہ مکمل قرآن کریم مع اختلافات قراءات منزل من اللہ ہے، جس کو صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے براہ راست رسول اللہ ﷺ سے اخذ کیا ہے۔ جیسا کہ احادیث سے ثابت ہوتا ہے کہ جب دو صحابہ قراءات کا اختلاف لے کر حضور اکرم ﷺ کے پاس حاضر ہوئے تو دونوں نے یہ ہی کہا: "أَقْرَأْنِي بِمَا رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَآلِهِ وَسَلَّمَ" یعنی مجھے آپ ﷺ نے یہ سورت یا آیت ایسے ہی پڑھائی تھی۔ اور حضور اکرم ﷺ نے ان کے جواب میں فرمایا: "هَكَذَا أَنْزَلْتُ" یعنی یہ اسی طرح نازل ہوئی ہے۔

بالفرض والحال اگر قرآن مجید میں کسی بشر نے اپنی مرضی سے قراءات کا اختلاف یا کسی بھی قسم کا کوئی تغیر پیدا کیا ہوتا، خواہ وہ تغیر الفاظ مرادفہ کا ہو یا غیر مرادفہ کا، بہر صورت قرآن مجید کا قرآن ہونا باطل ہو چکا ہوتا، کیونکہ قرآن تو نام ہی اُس کلام کا ہے جو صرف اللہ کا کلام ہو اس میں کسی فرشتے یا بشر کا عمل دخل نہ ہو۔ نیز قرآن مجید کا اعجاز بھی رخصت ہو چکا ہوتا۔ حالانکہ ایسا کچھ بھی نہیں، بلکہ قرآن مجید آج بھی کلام اللہ ہے اور اعجاز کی اعلیٰ درجے پر فائز ہے۔

﴿إِنَّا نَحْنُ نُزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ﴾ (الجز: ۹)

”بے شک یہ کتاب نصیحت ہمیں نے اتاری ہے اور یقیناً ہم ہی اس کے محافظ ہیں۔“

قرآن مجید میں تغیر و تبدیلی کے امکان کو بھی اللہ تعالیٰ نے حروں سمیت اکھاڑ کر پھینک دیا۔ جیسا کہ قرآن مجید میں ہے:

﴿وَإِذَا تَشَلَّى عَلَيْهِمْ آيَاتُنَا بَيِّنَاتٍ قَالَ الَّذِينَ لَا يَرْجُونَ لِقَاءَنَا أَكُنْتَ بِقُرْآنٍ غَيْرِ هَذَا أَوْ بَدِّلَهُ قُلْ مَا يَكُونُ لِي أَنْ أَدَّبِلَهُ مِنْ تَلْقَائِي نَفْسِي إِنْ أَنْتُمْ إِلَّا مَا يُوحَى إِلَيَّ إِنْ أَنْتُمْ إِلَّا عَصِيْبٌ رَبِّي عَذَابٌ يَوْمَ عَظِيمٍ ﴿۱۵﴾ قُلْ نُوَسِّئُ اللَّهُ مَا تَلَوْتُمْ عَلَيْهِمْ وَلَا أَذْرِكُمْ بِهِ ﴿۱۶﴾ فَقَدْ لَبِثْتُ فِيكُمْ عُمُرًا مِمَّنْ قَبْلِهِ أَفَلَا تَعْقِلُونَ ﴿۱۷﴾﴾ (یونس: ۱۵-۱۶)

”اور جب ان کو ہماری آیات پڑھ کر سنائی جاتی ہیں تو جن لوگوں کو ہم سے ملنے کی امید نہیں وہ کہتے ہیں کہ یا تو اس کے سوا کوئی اور قرآن بنا لیا یا اس کو بدل دو۔ (اے نبی ﷺ!) کہہ دیجیے: مجھ کو اختیار نہیں ہے کہ اسے اپنی طرف سے بدل دوں۔ میں تو اسی حکم کا تابع ہوں جو میری طرف آتا ہے۔ اگر میں اپنے پروردگار کی نافرمانی کروں تو مجھے بڑے سخت دن کے عذاب سے خوف آتا ہے۔ (اے نبی ﷺ!) یہ بھی کہہ دیجیے: اگر اللہ چاہتا تو نہ میں ہی یہ کتاب تم کو پڑھ کر سناتا اور نہ وہ ہی تمہیں اس سے واقف کرتا۔ پس میں اس سے پہلے تم میں ایک عمر رہا ہوں اور کبھی ایک جملہ بھی اس طرح کا نہیں کہا بھلا تم سمجھتے نہیں۔“

آنحضرت ﷺ افضل الخلائق ہیں۔ ان پر قرآن نازل ہوا۔ وہ اُمت تک قرآن پڑھنے کا واحد ذریعہ ہیں۔ لیکن وہ بھی قرآن کریم میں کسی تبدیلی و تغیر کے حق دار نہیں تو ان کے علاوہ کسی کی کیا مجال؟ کہ وہ قرآن کریم میں موجود الفاظ کو ان کے مترادف

یا غیر مترادف الفاظ کے ساتھ تبدیل کرے۔ (سُبْحَانَكَ هَذَا بُهْتَانٌ عَظِيمٌ)

(پانچواں امر) قراءاتِ سبعہ سے روکنا جائز نہیں؟  
آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے:

((فَلَا تُمَازُوا فِيهِ، فَإِنَّ الْمِرَاءَ فِيهِ كُفْرٌ))

”پس تم ان قراءات میں شک مت کرو۔ بے شک ان (کے حق ہونے) میں شک کرنا کفر ہے۔“

سابقہ وہ تمام احادیث، جن میں حضرات عمر، ابی بن کعب، عبداللہ بن مسعود، عمرو بن العاص رضی اللہ عنہم کا حضور اکرم ﷺ کے پاس جانے کا ذکر ہے، اس امر کی گواہی دیتی ہیں کہ قراءاتِ سبعہ میں کوئی حرج نہیں اور اگر کوئی قرآن کریم کو ان مختلف قراءات کے ساتھ پڑھتا ہے تو اس کو منع کرنا جائز نہیں۔ بلکہ ان سابقہ احادیث میں تو اس موقع پر حضور اکرم ﷺ کی طرف سے حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کے لیے تو بیخ بھی ثابت ہے۔

(چھٹا امر) صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا قرآن کریم کے ساتھ خلوص؟  
تمام صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم

کی زیادت و نقصان کو برداشت نہیں کرتے تھے اور قرآن کریم کے معاملے میں تو خصوصاً اس کا اہتمام کرتے تھے۔ قرآن کریم کے دفاع کے لیے ہمہ وقت تیار رہتے تھے۔ حتیٰ کہ اگر قرآن کریم کے الفاظ کی ادائیگی یا لہجے میں بھی کسی طرف سے کوئی فرق سُننے کو ملتا تو فوراً اس کی گرفت فرماتے تھے۔ مختصر یہ کہ وہ قرآن کریم کے حوالے سے کسی قسم کا سمجھوتہ کرنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ جیسا کہ سابقہ احادیث میں آپ نے دیکھا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت ہشام رضی اللہ عنہ کے ساتھ کیا معاملہ کیا، حالانکہ غلط حضرت ہشام رضی اللہ عنہ بھی نہیں تھے، لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کسی قسم کا سمجھوتہ نہیں کیا اور ان کا ہاتھ پکڑ کر انھیں حضور اکرم ﷺ کے دربار میں لے آئے اور جب تک حضور اکرم ﷺ نے یہ فیصلہ نہیں سنایا کہ ہشام بھی صحیح ہے، اُس وقت تک حضرت ہشام رضی اللہ عنہ کا پیچھا نہیں چھوڑا۔ اسی طرح کے اور بھی واقعات آپ نے پڑھے جن میں حضرت ابی بن کعب، حضرت عبداللہ بن مسعود اور حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہم وغیرہ حضرات کا ذکر ہے۔

(ساتواں امر) اختلافِ قراءات کے مسئلے پر الجھنا جائز نہیں؟  
ہمارے لیے جائز نہیں کہ ہم

کو لے کر آپس میں جنگ و جدال کا بازار گرم کریں۔ یا ایک دوسرے پر صحیح و غلط کا حکم جاری کریں۔ یا اس اختلاف کو آپس میں سببِ تعصب و عناد بنائیں۔ بلکہ یہ سوچیں کہ یہ قراءات کا اختلاف اللہ تعالیٰ کی رحمت و نعمت ہے۔ کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے اُمت پر آسانی و سہولت کی خاطر اس کی اجازت مرحمت فرمائی تھی۔ لہذا ہم آپس میں لڑائی جھگڑا کر کے اس سہولت کو صعوبت میں یا دُسر کو عُسر میں تبدیل مت کریں۔ حدیثِ رسول ﷺ ہے: ”فلا تماروا فیہ فان المراء فیہ کفر“

نیز حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کا واقعہ بھی مختصر ہے کہ اسی اختلاف اور دل میں ان قراءات سے متعلق وسوسہ لانے کی وجہ سے حضور اکرم ﷺ کے چہرہ مبارک کا رنگ متغیر ہوا اور آپ ﷺ نے حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کے سینے پر زور سے ہاتھ مارا۔ لہذا

”محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ“

کسی ایک قراءت کو صحیح سمجھتے ہوئے دوسری قراءت کے بارے میں شک کرنا ہمارے لیے جائز نہیں۔ تمام قراءت اللہ تعالیٰ کی طرف سے منزل ہیں۔

## (آٹھواں امر) اختلافات قراءت کا تعلق الفاظ کے ساتھ ہے نہ کہ معانی کے ساتھ

اختلافات قراءت اصل میں الفاظ کا اختلاف ہے۔ اور اس اختلاف سے معانی میں کوئی اختلاف وارد نہیں ہوتا۔ اس لیے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں جب بھی اختلاف ہوا تو آپ ﷺ نے ان میں سے ہر ایک کی قراءت کو سنا اور سب کی تصویب فرمائی۔ مثلاً حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا:

((اذا هو يقرأ وها على حروف كثيرة لم يقرئها رسول الله صلى الله عليه وآله وسلم)).

پھر حضور اکرم ﷺ نے ان دونوں کی قراءت سنی اور فرمایا: "هكذا انزلت"

اور آپ ﷺ کا یہ ارشاد: "ای ذلک قرأتم فقد اصبتم"

بھی اسی بات پر دلالت کرتا ہے کہ قراءت کا اختلاف محض الفاظ کا اختلاف تھا نہ کہ معانی کا۔

قراءت کا اختلاف محض الفاظ کا اختلاف تھا نہ کہ معانی کا۔ اس جملے کا یہ مطلب ہے کہ قراءت کے اختلاف سے معانی میں کوئی ایسا اختلاف پیدا نہیں ہوتا تھا، جس سے حکم ہی بدل جائے۔ مثلاً اگر کسی آیت کی ایک قراءت سے کسی چیز کی تحریم کا حکم ثابت ہو رہا ہو تو ایسا ہرگز نہیں کہ اسی آیت کی دوسری قراءت سے اُس چیز کی تحلیل ثابت ہو جائے۔ از مستخرج

## حروف سبعة پر نزول قرآن کی لغوی تحقیق

لفظ قرآن: اس بارے میں تفصیلی بحث پہلے باب میں گزر چکی ہے۔

لفظ انزال: اس بارے میں تحقیق تیسرے باب میں گزر چکی ہے۔

لفظ سب: اس کی تحقیق اسی باب میں بیان ہوئی ہے کہ سب سے مراد شہور عدد "سات" مراد ہے۔ وہ سات جو چھ اور آٹھ کے درمیان میں ہوتا ہے۔ یعنی سات سے کثرت مراد نہیں ہے۔ جیسا کہ بعض لوگوں کو وہم ہوا ہے اور انھوں نے سات سے کثرت مراد لی ہے۔ لفظ احراف: احراف جمع ہے حرف کی۔ اور حرف کا اطلاق کئی معانی پر ہوتا ہے۔ جیسا کہ علامہ مجد الدین محمد بن یعقوب الفیر دز آبادی رضی اللہ عنہ (متوفی: ۸۱۷ ہجری) نے اپنی کتاب "القاموس المحیط" میں حرف کے دس معانی لکھے ہیں:

① کسی چیز کا کنارہ ② کسی شے کی دھار، ③ کسی چیز کا پہلو ④ کسی چیز کی انتہا ⑤ پہاڑ کی انتہائی بلندی ⑥ حروف تجنی میں سے ایک حرف ⑦ کمزور اونٹنی ⑧ لاغر اونٹنی ⑨ بہت بڑی اونٹنی ⑩ پانی کا سیلاب ⑪ وادی بنو سلیم میں نصب وہ اونچے سیاہ پتھر جو راستے میں نشانی کے طور لگائے گئے تھے۔ ⑫ نخیوں کے نزدیک حرف اس کو کہتے ہیں جس کا معنی اسم یا فعل کے ملائے بغیر سمجھ میں نہ آئے ⑬ حرف کا لفظ قرآن مجید میں پہلا اور کنارے کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ دیکھیے سورۃ الحج آیت نمبر ۱۱:

"محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ"

﴿وَمِنَ اللَّائِيں مَن يَّعْبُدُ اللَّهَ عَلَى حَرْفٍ﴾ (الحج: ۱۱)

”اور لوگوں میں وہ شخص بھی ہے جو کنارے پر رہ کر اللہ کی عبادت کرتا ہے۔“ (توضیح القرآن۔ از مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہ العالی)

یعنی وہ لوگ قلبی اطمینان یا دلی خوشی اور بشارت کے ساتھ اللہ کی عبادت نہیں کرتے بلکہ شک و شبہ میں مبتلا رہتے ہیں۔ جب اپنے اعمال بدی وجہ سے کوئی تنگی آتی ہے تو اللہ اللہ کرنے لگتے ہیں اور جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی خوشی ملتی ہے تو خوشی دینے والے ہی کو یعنی اللہ تعالیٰ کو بھول بیٹھتے ہیں۔

سات حروف سے لغات عرب میں سے سات لغات مراد ہیں۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ایک ہی حرف میں ساتوں صورتیں پائی جائیں۔ بلکہ اس کا معنی یہ ہے کہ معمولی سے فرق کے ساتھ یہ ساتوں لغات پورے قرآن مجید میں متفرق طور پر پائی جاتی ہیں۔

”حرف“ کا تے زیادہ معانی پر اطلاق ہونا، اس بات کی دلیل ہے کہ ”حرف“ مشترک الفاظ کے قبیل سے ہے۔ اور مشترک الفاظ وہ ہوتے ہیں جن کے معانی میں سے کوئی ایک معنی قرینہ قیاس اور موقع کی مناسبت سے منتخب کیا جاسکتا ہو۔ اور اس وقت سب سے مناسب معنی ہے: ”وجہ“ یعنی صورت۔ جمع اس کی ”وجوہ“ آئے گی۔ اس کی تفصیل ہم آئندہ بیان کریں گے جو کہ اس تفصیل سے مختلف ہوگی جسے صاحب القاموس وغیرہ نے بیان کیا تھا کیونکہ انھوں نے قاموس کے اعتبار سے تفصیل بیان کی ہے۔

لفظ ”علی“: حضور اکرم ﷺ کے ارشاد: ”انزل القرآن علی سبعة احرف“ میں لفظ علی اس طرف مشیر ہے کہ یہ مسئلہ وسعت اور تیسیر کے ساتھ مشروط ہے۔ یعنی قرآن کریم کو قاری کے لیے وسعت (سہولت) کرتے ہوئے سات وجوہ میں نازل کیا گیا کہ وہ ان ساتوں میں سے جس کو چاہے پڑھے خواہ وہ اس کے ساتھی سے مختلف ہو۔ گو یا کہ آپ ﷺ کے ارشاد مبارک کا مطلب یہ ہوا: قرآن مجید کو حروف سب سے اس غرض اور شرط کے ساتھ اتارا گیا کہ اس سے اُمت پر سہولت اور وسعت ہوگی۔ حدیث کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ قرآن مجید کا ایک ایک لفظ اوجہ سب سے پڑھا جاسکتا ہے۔ ورنہ آپ ﷺ اپنے ارشاد میں لفظ ”علی“ استعمال نہ فرماتے، بلکہ یوں فرماتے: ان هذا القرآن انزل سبعة احرف۔ لہذا قرآن کریم کو حروف سب سے پڑھنا نازل کرنے کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ قرآن کریم کے ہر لفظ کو سات طریقوں سے پڑھا جاسکتا ہے۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ قرآن کریم اپنے دامن میں وسعت لیے اس شرط پر اُترا ہے کہ اختلاف کی صورتیں ان سات سے زائد نہ ہونے پائیں۔ خواہ ایک لفظ کی ادائیگی میں کتنا ہی تنوع پیدا ہو جائے یا خواہ ایک ہی کلمے کی قراءت یعنی اس کو پڑھنے کے مختلف طریقوں کی بھر مار ہو جائے۔ جیسے:

① ﴿مَلِكٍ يُؤْتِرُ الدِّينِ﴾ (الفاتحہ: ۳)

اس آیت کو پڑھنے کے طریقوں کی تعداد سات یا اس تک پہنچی ہوئی ہے۔

② ﴿وَعَبْدَ الظُّلْمِ﴾ (المائدہ: ۶۰)

آیت کے اس جز کو بائیس طریقوں سے پڑھا جاسکتا ہے۔

③ ﴿أَبِ﴾ (الاسراء: ۲۳، الانبیاء: ۶۷، الاحقاف: ۱۷)

ابو الحسن علی بن عیسیٰ الرمائی (۲۹۶ھ/۹۰۹ء تا ۳۸۴ھ/۹۹۳ء) جو کہ ماہر لغات ہیں، انھوں نے اس ایک لفظ یعنی ”أَبِ“

کے اندر سترستیس (۳۷) لغات بتائی ہیں۔

یہ اور اس طرح کی تمام مثالوں کے اندر پایا جانے والا تغیر اپنی کثرت کے باوجود جو سب سے باہر نہیں نکلتا۔

## ”وجوہ سببہ“ کا مفہوم، پسندیدہ قول کے مطابق

یہ سوال ابھی تک ہمارے اوپر باقی ہے کہ ”وجوہ سببہ“ سے ایسی کون سی وجوہ مراد ہیں کہ ایک کلمہ اپنے اندر پائی جانے والی کثیر قراءات اور تنوع کے باوجود جو سب سے باہر نہیں نکلتا۔

پس اس سوال کا جواب تلاش کرنے کے لیے ہمیں بہت سی قیل و قال اور جدال و اختلافات کا سامنا کرنا پڑا اور پھر آخر کار اللہ کی توفیق و ہدایت سے جو قول ہم نے اختیار کیا وہ امام ابو الفضل الرازی رضی اللہ عنہ کا ہے۔ دیکھیے:

امام ابو الفضل عبد الرحمان بن احمد بن الحسن الرازی رضی اللہ عنہ اپنی کتاب اللوائح الکلام میں فرماتے ہیں: قراءتوں میں جو اختلاف پائے جاتے ہیں وہ درج ذیل سات وجوہ (اقسام) میں منحصر ہیں:

### (پہلی قسم) اَسْمَاءٌ مِّمْفَرُوۡةٌ، تَشْبِیْہٌ، جَمْعٌ اَوْ تَذْکِیْرٌ وَ تَاْنِیْثٌ كَے اعتبار سے اختلاف

یعنی ایک قراءت میں ایک لفظ مفرد آیا ہو اور دوسری قراءت میں وہی لفظ تشبیہ یا جمع آگیا ہو۔ یا ایک قرأت میں ایک لفظ تذکیر کے ساتھ آیا ہو اور دوسری قراءت میں وہی لفظ تانیث کے ساتھ آگیا ہو۔

① مثال ﴿وَالَّذِينَ هُمْ لِأَمْتِنِهِمْ وَعَظْمِ هُمْ زَعُونَ﴾ (اٰیۃ منون: ۸) اور (الماعز: ۳۲)

ایک قراءت کے مطابق ”لَأَمْتِنِهِمْ“ جمع کے ساتھ ہے جب کہ دوسری قراءت میں اسے واحد کے ساتھ پڑھا گیا ہے۔

② مثال ﴿وَلَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ﴾ (البقرہ: ۳۸)

ایک قراءت کے مطابق ”لَا يُقْبَلُ“ تذکیر کے ساتھ ہے جب کہ دوسری قراءت میں تانیث کے ساتھ پڑھا گیا ہے: ”لَا تُقْبَلُ“۔

### (دوسری قسم) أَفْعَالٌ مِّمْفَرُوۡةٌ مَّاضِيَةٌ، مَضَارِعٌ أَوْ أَمْرٌ كَے صیغوں کے اعتبار سے اختلاف

③ مثال ﴿فَقَالُوا رَبَّنَا بَعْدَ بَيْنِ أَسْفَارِنَا﴾ (سبأ: ۱۹)

ایک قراءت میں ”رَبَّنَا“ منادی ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔ اور لفظ ”بَاعِدَ“ فعل امر کیونکہ یہ مقام دُعا ہے اور اس مقام کے لیے یہ ہی مناسب ہے۔ دوسری قراءت میں ”رَبَّنَا“ مبتدا ہونے کی وجہ سے مرفوع ہے۔ اور لفظ ”بَعَدَ“ فعل ماضی اور مضعف العین ہے۔ اور یہ پورا جملہ ”جملہ خبریہ“ ہے۔ دوسری قراءت کے مطابق آیت یوں ہے:

﴿فَقَالُوا رَبَّنَا بَعْدَ بَيْنِ أَسْفَارِنَا﴾

### (تیسری قسم) اعراب کے اعتبار سے اختلاف

④ مثال ﴿وَلَا يُضَادُّ كَاتِبٌ وَلَا شَهِيدٌ﴾

(البقرہ: ۲۸۲)

يُضَادُّ کے راء کو ایک قراءت میں فتحہ جب کہ دوسری میں ضمہ کے ساتھ پڑھا گیا ہے۔  
اگر ”آ“ نہی کے لیے ہوتو لائے نہی کے بعد فعل مجزوم ہوتا ہے۔  
اور اگر ”آ“ نہی کے لیے ہوتو لائے نہی کے بعد فعل مرفوع ہوتا ہے۔

② مثال ﴿ذُو الْعُرَشِ الْمَجِيدُ﴾ (البروج: ۱۵)

ایک قراءت میں ”الْمَجِيدُ“ کو مرفوع جب کہ دوسری میں مجرور پڑھا گیا ہے۔ ”ذُو“ کی صفت بننے کی صورت میں یہ مرفوع جب کہ ”الْعُرَشِ“ کی صفت بننے کی صورت میں مجرور پڑھا جائے گا۔

مثال ﴿وَمَا خَلَقَ الذَّكَرَ وَالْأُنثَى﴾ (الزلزال: ۳)  
اس آیت کو ایک قراءت میں ﴿وَمَا خَلَقَ الذَّكَرَ

وَالْأُنثَى﴾ پڑھا گیا ہے۔ جب کہ دوسری قراءت میں ﴿وَمَا خَلَقَ﴾ کے بغیر یعنی ﴿الذَّكَرَ وَالْأُنثَى﴾ پڑھا گیا ہے۔

مثال ﴿وَجَاءَتْ سَكْرَةُ الْمَوْتِ بِالْحَقِّ﴾ (ق: ۱۹)  
اس آیت کو دوسری قراءت کے مطابق ﴿وَجَاءَتْ سَكْرَةُ

الْحَقِّ بِالْمَوْتِ﴾ -

مثال ﴿وَأَنْظُرْ إِلَى الْعِظَامِ كَيْفَ نُنشِزُهَا﴾ (البرق: ۲۵)  
چھٹی قسم) ألفاظ کا ایسا اختلاف جس سے حروف بدل جائیں

دوسری قراءت میں ”نُنشِزُهَا“ میں ”راء“ کے بجائے ”راء“ پڑھی گئی ہے۔ یعنی ﴿وَأَنْظُرْ إِلَى الْعِظَامِ كَيْفَ نُنشِزُهَا﴾

② مثال ﴿وَوَطَّلِحْ مَنُضُودٌ﴾ (الواتق: ۲۹)

دوسری قراءت میں ﴿وَوَطَّلِحْ﴾ کو حاء کی بجائے عین کے ساتھ پڑھا گیا ہے۔ یعنی: ﴿وَوَطَّلِحْ مَنُضُودٌ﴾

جیسے تخفیف، تنغیم، امالہ، مد، نصر، اظہار اور ادغام وغیرہ۔

مثال ﴿هَذَا نَسْأَلُكَ حَدِيثُ مُوسَى﴾ (النار: ۱۵)  
ساتویں قسم) لہجوں کا اختلاف

① مثال ﴿بَيْتِ قَدِيرِينَ﴾ (القيامة: ۳)

دوسری قراءت میں ان تینوں ألفاظ یعنی ”أَبَى، مُوسَى، بَيْتِ“ کو اِمالہ کر کے پڑھا گیا ہے۔

امام ابو الفضل الرازی رحمہ اللہ کے قول کو پسند کرنے کے وجوہات

ہم نے امام ابو الفضل رازی رحمہ اللہ کے قول کو اختیار کیا، اس کی چار وجوہات ہیں۔

حرف سب سے پر نزول قرآن مجید کے دلائل میں ذکر کی گئی دس احادیث اور ان کے شش جتنی بھی احادیث ہیں، تمام پہلی وجہ سے اسی قول کی تائید ہوتی ہے۔



یہ قول اُن اُسور کے بھی مطابق ہے جو اُن دس احادیث سے ثابت ہوئے تھے، جنہیں حروفِ سبعہ پر قرآنِ مجید کے نزول کے اثبات پر پیش کیا گیا تھا۔

**تیسری وجہ** اس مذہب یا قول میں امام ابو الفضل الرازی رحمۃ اللہ علیہ نے جو استقرایان کیا ہے وہ سب سے زیادہ منضبط، مستحکم اور جامع و مانع ہے۔ کیونکہ اس میں کوئی بھی اختلاف چھوٹا ہوا نہیں۔ جب کہ دیگر اقوال یا مذہب میں جو استقرایان ہوا ہے۔ ان میں کچھ اختلافات مفقود ہیں۔ مثلاً کسی قول میں تقدیم و تاخیر کا اختلاف موجود نہیں، تو کسی میں بدلیت کا اختلاف مفقود ہے اور کوئی قول لہجات والے اختلاف سے عاری ہے۔ مختصر یہ کہ اس قول کے علاوہ تمام اقوال میں کوئی نہ کوئی نقص موجود ہے۔ لہذا اگر اُن دیگر اقوال کی پیروی کی جائے تو یہ لازم آئے گا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جو کہ جامع الکلام ہیں، اُن کے کلام سے ثابت ہونے والی حصر غیر صحیح ہے۔ اور یہ تو خطائے عظیمہ اور اٹم کبیرہ ہے۔

**چوتھی وجہ** اس قول کو اختیار کرنے والا اُن تمام ملامتوں، اعتراضات اور محذورات سے محفوظ رہتا ہے، جن سے دیگر اقوال کو اختیار کرنے والا محفوظ نہیں رہ سکتا۔

## ”وجوہ سبعہ“ کے مفہوم سے متعلق دیگر اقوال

قرآن مجید کے سات حروف میں نازل ہونے سے کیا مراد ہے؟ اس بارے میں اقوال کا شدید اختلاف ہے جیسا کہ پہلے بھی بتایا گیا۔ لیکن ہمارے نزدیک قرآن کریم کے ”سات حروف“ کی سب سے راجح تشریح اور بہترین تعبیر وہ ہے جو امام ابو الفضل الرازی رحمۃ اللہ علیہ کے قول سے مستنبط ہوتی ہے۔ یعنی:

حدیث میں ”حروف کے اختلاف“ سے مراد ”قراءتوں کا اختلاف“ اور سات حروف سے مراد ”اختلاف قراءت“ کی سات نوعیتیں ہیں۔

تبع و تحری کے بعد یہ بات واضح ہوتی ہے کہ سات حروف سبعہ سے متعلق دیگر اقوال میں تین اقوال ایسے ہیں جو اوپر بیان کردہ راجح ترین اور عمدہ تعبیر سے ملتے جلتے ہیں۔ اُن تین اقوال میں سے پہلا قول امام ابن قتیبہ رحمۃ اللہ علیہ (۲۳۳ھ/۸۲۸ء تا ۲۷۲ھ/۸۸۹ء)، دوسرا محقق ابن جزری رحمۃ اللہ علیہ (۵۱ھ/۷۵۰ء تا ۲۹۳ھ/۸۳۳ء) اور تیسرا قاضی ابوبکر المطیب باقلانی رحمۃ اللہ علیہ (متوفی: ۴۰۳ھ) کا ہے۔ ان تینوں حضرات کے اقوال اور امام ابو الفضل الرازی کے قول سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ یہ سب حضرات اس بات پر متفق ہیں کہ حدیث میں ”سات حروف“ سے مراد اختلاف قراءت کی سات نوعیتیں ہیں، لیکن پھر ان نوعیتوں کی تعیین میں ان حضرات کے اقوال میں تھوڑا تھوڑا فرق ہے۔ جس کی وجہ یہ ہے کہ ان میں سے ہر ایک نے قراءت کا استقرایان اپنے اپنے طور پر الگ الگ بیان کیا ہے۔ لیکن امام ابو الفضل الرازی رحمۃ اللہ علیہ کا استقرایان ”اہدی منہم سبیلًا واکثر تو فیقًا“ کا مصداق ہے۔ حتیٰ کہ علامہ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ جیسے محقق نے امام ابو الفضل الرازی رحمۃ اللہ علیہ کے قول کے بارے میں کہا:

((قلت وقد اخذ اخی: الرازی کلام ابن قتیبۃ ونقحہ)).

”میں کہتا ہوں کہ امام ابو الفضل رازی نے ابن قتیبہ کا قول اختیار کر کے اُسے اور کھار دیا۔“ (فتح الباری ص ۲۳، ج ۹)

محقق علمائے متاخرین میں سے بھی بعض نے امام ابو الفضل رازی رضی اللہ عنہ کے قول کو اختیار کیا ہے۔ مثلاً شیخ الخضری الدمیاطی اور علامہ شیخ محمد نجیح المصطفیٰ رحمہما اللہ۔ لیکن ان حضرات نے ان فردوقِ دقیقہ کو بیان نہیں کیا جن کو امام ابو الفضل الرازی رضی اللہ عنہ اور ان تینوں مشہد میں علماء نے بیان کیا تھا۔ لہذا اہم ضروری سمجھتے ہیں کہ ان تینوں اقوال کو بھی آپ کے پیش خدمت کیا جائے تاکہ امام رازی رضی اللہ عنہ کے مذہب یا قول کے مزید انوارات آپ پر عیاں ہو جائیں۔

① امام ابن قتیبہ رضی اللہ عنہ کا قول ﴿ حروف سبعہ سے وہ سات وجوہ مراد ہیں جن کی وجہ سے تغایر پیدا ہوتا ہے۔ وہ سات وجوہ درج ذیل ہیں۔﴾

① تغایر اعراب • یعنی اعراب کا تغیر یا تبدل۔ اس صورت میں نہ ہی معنی میں کوئی تغیر پیدا ہوتا ہے اور نہ ہی لفظ کی ہیئت میں۔

مثال • ﴿وَلَا يُضَادُّ كَاتِبٌ وَلَا شَهِيدٌ﴾ (البقرہ: ۲۸۲)

﴿يُضَادُّ﴾ کے راء کو ایک قراءت میں فتح جب کہ دوسری میں ضمہ کے ساتھ پڑھا گیا ہے۔

② تغایر نعل • یعنی نعل کا تغیر و تبدل۔

مثال • ﴿فَقَالُوا رَبَّنَا بَعْدَ بَيْنِ أَسْفَارِنَا﴾ (ہاء: ۱۹)

دوسری قراءت کے مطابق یہ آیت یوں ہے: ﴿فَقَالُوا رَبَّنَا بَعْدَ بَيْنِ أَسْفَارِنَا﴾

③ تغایر لفظ • یعنی الفاظ کا تغیر و تبدل۔

مثال • ﴿وَأَنْظُرْ إِلَى الْعِظَامِ كَيْفَ نُنشِزُهَا﴾ (البقرہ: ۲۵۹)

دوسری قراءت میں ”نُنشِزُهَا“ میں زاء کے بجائے ”راء“ پڑھی گئی ہے۔ یعنی: ﴿وَأَنْظُرْ إِلَى الْعِظَامِ كَيْفَ نُنشِزُهَا﴾

④ قریب الخارج حروف کا تغایر • یعنی وہ حروف جو قریب الخرج ہوں اُن کا تغیر و تبدل۔

مثال • ﴿وَكَلِجٍ مَّنْضُودٍ﴾ (الوقتہ: ۲۹)

دوسری قراءت میں ﴿وَكَلِجٍ﴾ کو حاء کی بجائے حاء کے قریب الخرج حرف یعنی عین کے ساتھ پڑھا گیا ہے۔ یعنی:

﴿وَكَلِجٍ مَّنْضُودٍ﴾

⑤ تغایر تقدیم و تاخیر • یعنی تقدیم و تاخیر میں تغیر و تبدل۔

مثال • ﴿وَجَاءَتْ سَكْرَةُ الْمَوْتِ بِالْحَقِّ﴾ (ق: ۱۹)

اس آیت کو دوسری قراءت کے مطابق ﴿وَجَاءَتْ سَكْرَةُ الْحَقِّ بِالْمَوْتِ﴾

⑥ تغایر زیادہ و نقصان • یعنی الفاظ کو کم کرنے یا بڑھا دینے کی صورت میں تغیر و تبدل۔

مثال • ﴿وَمَا خَلَقَ الذَّكَرَ وَالْأُنثَىٰ﴾ (البل: ۳)

اس آیت کو ایک قراءت میں ﴿وَمَا خَلَقَ الذَّكَرَ وَالْأُنثَىٰ﴾ پڑھا گیا ہے۔ جب کہ دوسری قراءت میں ﴿وَمَا خَلَقَ﴾

کہ بغیر یعنی ﴿الذَّكَرَ وَالْأُنثَىٰ﴾ پڑھا گیا ہے۔

۶) تغایر کلمہ • یعنی ایک کلمہ کو دوسرے کلمے کے ساتھ تبدیل کر دینا۔

مثال • ﴿كَالْعَيْنِ الْمُنْفُوشِ﴾ (القائد: ۵)

دوسری قراءت کے مطابق یہ آیت یوں ہے: ﴿وَكَالضُّوفِ الْمُنْفُوشِ﴾

۲) امام محقق ابن جزری رحمۃ اللہ علیہ کا قول کے بخوبی دیکھ لیا کہ ان سب کا اختلاف سات وجوہ کی حد سے آگے نہیں بڑھتا۔ اور وہ سات یہ ہیں:

① اختلاف حرکات بلا غیر معنی و ہیئت: یعنی حرکات میں ایسا اختلاف پایا جائے جس سے الفاظ کے معنی یا ہیئت میں کوئی تغیر واقع نہ ہو۔ جیسے لفظ "الْبُغْلُ" چاروں وجوہ ضم، فتح، کسرہ اور جزم کے ساتھ اور اسی طرح لفظ "يَحْسِبُ" دو وجوہ فتح اور کسرہ کے ساتھ پڑھا جاتا ہے۔

② اختلاف حرکات با غیر معنی و ہیئت: یعنی حرکات میں ایسا اختلاف پایا جائے جس سے الفاظ کا معنی بھی بدل جاتا ہو۔

مثال • ﴿فَتَلَقَىٰ آدَمَ مِنْ رَبِّهِ كَلِمَاتٍ﴾ (البقرة: ۳۷)

دوسری قراءت میں "آدَمَ" منصوب ہے۔ یعنی: ﴿فَتَلَقَىٰ آدَمَ مِنْ رَبِّهِ كَلِمَاتٍ﴾ اس صورت میں حرکات کے ساتھ ساتھ معنی میں بھی تبدیلی آتی ہے۔

③ پھر اختلاف کا انحصار یا تو حرفوں میں ہوگا مگر اس طرح کہ معنی بدل جائیں صورت نہ بدلے۔ جیسے: "تَنَلُو" اور "تَنَلُوا"

④ یا اس برعکس یعنی معنی نہ بدلیں اور صورت بدل جائے۔ جیسے: ① "بُضْطَةٌ" اور "بُسْطَةٌ" ② "الصِّرَاطُ" اور "الصِّرَاطُ -"

⑤ یا لفظ کی صورت اور معنی دونوں بدل جائیں۔ جیسے: "فَأَسْعَوْا" اور "فَأَسْعَوْا"

⑥ اختلاف تقدیم و تاخیر: یعنی تقدیم و تاخیر میں اختلاف ہو۔

مثال • ﴿يَقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَيَقْتُلُونَ وَيُقْتَلُونَ ۖ وَعَدَا عَلَيْهِمْ حَقًّا فِي التَّوْرَةِ﴾ (البقرة: ۱۹۱)

دوسری قراءت کے مطابق اس آیت میں تقدیم و تاخیر یوں پائی جاتی ہے کہ اس میں دوسرے یقتلون کو مقدم جب کہ پہلے

یقتلون کو مؤخر کر کے پڑھا جاتا ہے۔

⑦ اختلاف زیادت و نقصان: یعنی الفاظ کی بیشی میں اختلاف ہو۔ جیسے: "أَوْضَى" اور "وَوَضَى"

غرض کہ یہ سات صورتیں ہیں کہ اختلاف قراءت ان کے دائرے سے باہر نہیں جاتا۔

(ف: ابن الجزری" یا "الجزری" کے نام سے متعدد علمائے کرام گزرے ہیں۔ جیسا کہ فضیلۃ الشیخ عمر رضا کمال نے اپنی

کتاب "عجم اللہولین" (تراجم مصنی الکتب العربیہ) مطبوعہ: مؤسسة الرسالة، بیروت" میں اکیس (۲۱) کے قریب اس نام کے علمائے

کرام کے اسماؤ کتبیں لکھی ہیں۔ لیکن یہاں ابن الجزری سے مراد قراءت کے مشہور امام ہیں۔ جن کا پورا نام یہ ہے: شمس الدین

ابوالخیر محمد بن محمد بن محمد الجزری الشافعی)

۳) قاضی ابوبکر الطیب باقلانی رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے۔

میں نے قریہات میں اختلاف کی وجوہ تلاش کیں تو مجھے سات وجوہ اختلاف ملیں۔

① حرکات میں ایسا اختلاف جس سے معنی اور الفاظ کی صورت میں کوئی فرق نہ پڑے۔ جیسے: ﴿هُنَّ أَطْهَرُ لَكُمْ﴾ (صود: ۷۸) اس آیت میں لفظ ”أَطْهَرُ“ کے راء کو ایک قراءت میں مضموم کی بجائے ساکن پڑھا گیا ہے۔ یعنی ﴿هُنَّ أَطْهَرُ لَكُمْ﴾۔ ایسے ہی: ”يَصْنَعُ صَدْرِي“ اور ”يَصْنَعِي صَدْرِي“ ہے۔ یعنی حرف قاف کے ضم اور سکون دونوں کے ساتھ۔

② حرکات میں ایسا اختلاف جس سے معنی تو تبدیل ہو جائے لیکن الفاظ کی صورت میں کوئی فرق نہ پڑے۔ جیسے: ﴿رَبَّنَا بَعْدَ بَيْنِ أَسْفَارِنَا﴾ میں امر کے صیغے یعنی ”بَاعِدْ“ کو ”بَاعِدَا“ (بصیغہ ماضی) پڑھنا۔

③ حروف کا ایسا اختلاف جس سے الفاظ کی صورت تو برقرار ہے لیکن معنی تبدیل ہو جائے۔ جیسے: ﴿وَ أَنْظُرْ إِلَى الْعِظَامِ كَيْفَ نُنشِزُهَا﴾ (البقرہ: ۲۵۹) کو دوسری قراءت میں ”نُنشِزُهَا“ میں زاء کے بجائے ”راء“ پڑھا گیا ہے۔ یعنی: ﴿وَ أَنْظُرْ إِلَى الْعِظَامِ كَيْفَ نُنشِزُهَا﴾

④ ایسا اختلاف جس سے الفاظ کی صورت تو تبدیل ہو جائے لیکن معنی برقرار ہے۔ جیسے: ﴿كَالْعَيْنِ الْمُنْفُوشِ﴾ (القارۃ: ۵) اور ”وَ كَالصُّوفِ الْمُنْفُوشِ“

⑤ ایسا اختلاف جس سے الفاظ کی صورت اور معنی دونوں میں فرق پڑ جائے۔ جیسے: ﴿وَ طَلَجَ مَنصُودًا﴾ (الواتعہ: ۲۹) اور ﴿وَ طَلَعَ مَنصُودًا﴾

⑥ ایسا اختلاف جس میں کلمات میں تقدیم و تاخیر پائی جائے۔ جیسے: ﴿وَ جَاءَتْ سَكْرَةُ الْمَوْتِ بِالْحَقِّ﴾ (ق: ۱۹) اور ﴿وَ جَاءَتْ سَكْرَةُ الْحَقِّ بِالْمَوْتِ﴾

⑦ اختلاف زیادت و نقصان: یعنی ایک قراءت میں الفاظ کم ہوں جب کہ دوسری میں زیادہ۔

مثال ﴿لَا تَسْعُ وَ تَسْعُونَ نَعَجَةً﴾ (ص: ۲۳)

دوسری قراءت اس آیت کو اس طرح پڑھا گیا ہے:

﴿لَا تَسْعُ وَ تَسْعُونَ نَعَجَةً أُنْثَى﴾ (ص: ۲۳) یعنی لفظ ”أُنْثَى“ کے اضافے کے ساتھ۔

## امام ابو الفضل الرازی رحمۃ اللہ علیہ کے قول اور دیگر اقوال کا جائزہ

بعض محققین نے بھرپور کوشش کی کہ وہ وجوہ سبب کے باب میں کسی طرح امام ابو الفضل رازی رحمۃ اللہ علیہ کے قول اور اس کے مشابہ دیگر اقوال یا (کم از کم) علمائے ثلاثہ یعنی امام ابن قتیبہ، امام حقیق ابن جزری اور قاضی ابوبکر الطیب باقلانی رحمۃ اللہ علیہ کے اقوال کو ایک ہی قول ثابت کر دیں اور یہ باور کرا دیں کہ ان تمام اقوال میں جو اختلاف ہے وہ حقیقی اختلاف نہیں ہے بلکہ محض لفظی اختلاف

”محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ“

مناہل العرفان فی علوم القرآن: جلد ۱

ہے۔ لیکن ان کا یہ فعل ہماری رائے میں تکلف بعید ہے۔ کیوں کہ ہم نے امام رازی رضی اللہ عنہ کی بیان کردہ سات وجوہ میں سے ایک وجہ کامل ایسی پائی ہے، جس کی علمائے خلاشہ نے نیت تک نہیں کی۔ دوسری بات یہ کہ امام رازی رضی اللہ عنہ نے ان ساتوں وجوہ کو جو علمائے خلاشہ نے ذکر کی تھیں، بہت جامع و دقیق انداز میں اپنی صرف چھ وجوہ میں سمویا ہے۔ اور ساتویں ایک ایسی وجہ بیان کی جس میں وہ منفرد ہیں۔ وہ وجہ ہے: اختلافات لہجات۔ جیسا کہ فتح، امالہ، ترقیق اور تفخیم وغیرہ۔

امام رازی اور علمائے خلاشہ کے اقوال کا جائزہ لیتے ہوئے ہم نے دیکھا کہ علمائے خلاشہ میں سے کسی ایک نے بھی اس نوع (اختلافات لہجات) کو ذکر نہیں کیا بلکہ ہمیں تو یہ محسوس ہوا کہ انھوں نے قصد اور اداۃ اس نوع کو ہلکا یا معمولی سمجھتے ہوئے ترک کیا ہے۔ جیسا کہ امام قتیبہ فرماتے ہیں:

”اور رہی بات اختلاف اطہار و ادغام اور روم و ایشام اور تخفیف و تسہیل وغیرہ کی، تو وہ ایسا اختلاف نہیں جس سے لفظ یا معنی میں کوئی فرق پیدا ہو اور اسے ایک نئی قسم (وجہ) قرار دیا جائے۔ کیوں کہ اطہار و ادغام وغیرہ ایسی صفات ہیں جن سے صرف آداۃ لگی میں فرق رونما ہوتا ہے۔ حقیقت میں لفظ تو ایک ہی رہتا ہے۔“

امام ابن قتیبہ نے اس ساتویں قسم کو ترک کرنے کی وجہ یہ بیان کی کہ اختلاف لہجات سے صرف آداۃ لگی میں فرق رونما ہوتا ہے، لفظ تو ایک ہی رہتا یعنی الفاظ تو ایک سے دو نہیں ہو جاتے۔ لیکن میری رائے میں لفظ کا ایک سے دو ہونا یا نانا ہونا مسئلہ نہیں بلکہ مسئلہ وہ امر ہے جو لہجات کے اختلاف سے واقع ہوتا ہے اور اس کی وجہ سے فعلاً قراءات میں اختلاف پیدا ہوتا ہے۔ اور ممکن ہے یہ ہی وہ اختلاف ہو جو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے درمیان نزاع کا سبب بنا تھا (اور وہ تصنیف کے لیے حضور اکرم ﷺ کے پاس گئے تھے)۔ اور یہ ہی اختلاف ہرزمان و مکان میں قراء کے مابین محل نزاع بن سکتا ہے جب کہ وہ ان حروف سبعہ کی تعداد نہ جانتے ہوں جن میں قرآن کریم نازل ہوا ہے۔ لہذا اختلاف لہجات بھی حروف سبعہ میں داخل ہے کیوں کہ جس طرح قرآن کریم کے حروف، کلمات، حرکات اور ترتیب میں تغیر و تبدل حرام ہے اسی طرح قرآن کریم کے الفاظ کی صورت، ان کی آداۃ لگی کے طریقے اور لہجات کی کیفیت میں (متعین طریقوں سے ہٹ کر) تبدیلی کرنا حرام ہے اور تحریف قرآن میں شامل ہے۔

اور دوسری بات یہ کہ اگر اختلاف لہجات کو اقسام سبعہ سے خارج کیا جائے تو نزول القرآن علی سبعة احرف کا ایک اہم مقصد و حکمت یعنی امت پر سہولت، حاصل نہیں ہوتا۔ لہذا اوّلیٰ یہ ہی ہے کہ اس قسم کو اقسام سبعہ میں شمار کیا جائے نیز تخفیف و تسہیل کے لیے زیادہ مناسب بھی یہ ہی ہے۔ کیوں کہ انسان کے لیے بعض اوقات یہ تو آسان ہوتا ہے کہ وہ اپنی لغت کے علاوہ کسی اور لغت کے کلمات کا تلفظ تلفظ کر لے لیکن یہ ہرگز آسان نہیں ہوتا کہ وہ ان کلمات کو اپنے لہجہ اور آداۃ لگی کے طریقے سے ہٹ کر تلفظ کرے۔ اور ترقیق و تفخیم، ہمزہ و تسہیل، اطہار و ادغام اور فتح و امالہ وغیرہ یہ ہی وہ امور اور کیفیات ہیں جن کی رعایت رکھنے سے تلفظ کرنے میں پیدا ہونے والی دشواریوں سے بچا جاسکتا ہے۔

عرب کے مختلف قبائل تھے اور ان کے بولنے کا لہجہ مختلف تھا۔ پھر اسی طرح پورے عالم میں پائے جانے والوں مسلمانوں کا بھی بولنے کا لہجہ مختلف ہے اس لیے اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کو سات حروف کے ساتھ نازل فرمایا تاکہ امت پر قرآن مجید پڑھنے میں کوئی وقت نہ ہو۔ الغرض امت پر سہولت اس وقت تک متحقق نہیں ہو سکتی جب تک اختلاف لہجات کو ملحوظ نہ رکھا جائے۔ حتیٰ

کہ بعض علماء نے وجوہ سبعہ ہی کو اس ایک وجہ (اختلاف لہجات) میں منحصر قرار دیا ہے، جیسا کہ آئندہ بیان ہوگا۔ خود امام ابن قتیبہ اپنی کتاب ”مشکل القرآن“ میں لکھتے ہیں۔

یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آسانی ہی ہے کہ اس نے اپنے نبی ﷺ کو حکم دیا کہ ہر امت (امت سے مراد قبیلہ ہے) کو ان کی لغت اور جوان میں رواج ہے، اس کے مطابق قرآن پڑھائیے۔ جیسا کہ ھذلی (بہدیل) ”عُثِّي حَيْثُ“ پڑھتے ہیں۔ مردان کی ”عُثِّي حَيْثُ“ ہوتی ہے۔ وہ اس کو اسی طرح تلفظ کرتے اور استعمال میں لاتے ہیں۔ (یعنی نطق میں ہاء کا عین سے انقلاب کرتے ہیں۔) اور اسدی یعنی بنو اسد ”يُعَلِّمُونَ، يَنْعَلِمُ، يَسْوَدُ وَجُوًّا، اَلَمْ اَعْهَدْ“ پڑھتے ہیں۔ یعنی علامات مضارع کو تمام جگہ کسرہ دیتے ہیں۔ اور تسی (بنو تميم) ہمزہ پڑھتے ہیں اور قرشی (اہل قریش) ہمزہ نہیں پڑھتے۔ اور بعض قبائل ”قَبِيلٌ لَهُمْ، وَغَيْضُ الْمَاءِ“ کو کسرہ کے ساتھ ضمہ کا اِشام کر کے پڑھتے ہیں۔ اور ”بِضَاعُ عَثَا ذَاتِ الْيَمِينِ“ کو ضمہ کے ساتھ کسرہ کا اِشام کر کے پڑھتے ہیں۔ اور ”مَالِكٌ لَا تَأْمَنُ“ کو ادغام کے ساتھ ضمہ کا اِشام کر کے پڑھتے ہیں۔

ابن قتیبہ مزید کہتے ہیں: ”اگر ہر فریق ارادہ کرتا کہ وہ اپنے اس لب و لہجے اور لغت کو چھوڑ دے جس کا وہ بچپن، جوانی، اور ادھیر عمر سے عادی ہے تو یہ بات ان کے لیے بہت زیادہ گراں ہوتی۔ اور ان کے لیے یہ کام ممکن نہ ہوتا مگر ریاضت شاقہ، تذلّیل لسان اور مخالفت عادت کے بعد۔ چنانچہ باری عزاسمہ نے اپنے فضل و احسان سے ان پر یہ نرمی اور سہولت فرمادی کہ وہ لغات کو اختیار کرنے میں وسعت سے کام لیں اور حرکات میں تصرف کر سکیں۔ جیسا کہ دین پر عمل کرنے کے لیے بھی ان پر آسانیاں کی گئیں تھیں۔“

آپ نے دیکھا کہ علامہ ابن قتیبہ نے مذکورہ بالا کلمات میں کتنی صراحت کے ساتھ اختلاف لہجات اور ادائیگی کے طریقے کو معتبر قرار دیا ہے۔

اور اسی طرح ہم علامہ ابن جزری کو بھی اختلاف لہجات کا اعتراف کرتے ہوئے پاتے ہیں۔ آپ فرماتے ہیں:

”ایک قبیلہ پڑھتا ہے: ”عَلَيْهِمْ، وَفِيهِمْ“ یعنی ہاء کے ضمہ کے ساتھ۔ اور دوسرا قبیلہ پڑھتا ہے: ”عَلَيْهِمْ، وَمِنْهُمْ“ یعنی صلہ کے ساتھ۔ ایک قبیلہ پڑھتا ہے: ”قَدْ اَفْلَحَ، وَقُلْ اَوْحَى، وَاِذَا خَلَوْا اِلَى شَيْءٍ طَيِّبٍ“ یعنی نقل حرکت کے ساتھ۔ اور دوسرا قبیلہ ”مُونِسِي، وَعَيْنِسِي“ کو ابالہ کے ساتھ پڑھتا ہے اور اس کے علاوہ تملطيف کے ساتھ پڑھتے ہیں۔ ایک قبیلہ ”حَبِيْبٌ اَبْصِيْرًا“ میں راء کو ترقیق کے ساتھ اور دوسرا قبیلہ ”الضَّلَاةُ وَالظَّلَاةُ“ کو تغنیم کے ساتھ پڑھتے ہیں۔ اور اس کے علاوہ اور بہت سی مثالیں ہیں۔“

لیکن انتہائی عجیب بات ہے کہ یہ دونوں جلیل القدر امام ایک طرف تو بہت صراحت کے ساتھ اختلاف لہجات اور ادائے طُرُق کی اہمیت کا اعتراف کرتے ہیں اور دوسری طرف وجوہ سبعہ کے موتیوں کو دھاگے میں پروتے وقت اس قیمتی موتی کو چھوڑ دیتے ہیں۔ (والعصبة لله وحده)

پس سب سے زیادہ محقق اور مدقق قول وہ ہی ہے جس کو امام ابو الفضل الرازی رضی اللہ عنہ نے اختیار کیا ہے۔ اور شاید اسی وجہ سے علامہ ابن حجر العسقلانی رضی اللہ عنہ نے کہا تھا: ”ابو الفضل الرازی نے ابن قتیبہ کے قول کو اختیار کر کے اُسے اور نکھار دیا۔“ آپ ابو الفضل اور ابن قتیبہ کے اقوال کے مابین بہت سے واضح فرق جان چکے ہیں۔ اس لیے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ابن حجر ابو الفضل اور ابن قتیبہ کے قول کے متحد ہونے کے قائل تھے۔ کیوں کہ الرازی کا قول علمائے ثلاثہ کے اقوال سے مللغا اعم ہے۔



امام ابو الفضل الرازی رضی اللہ عنہ کے قول پر وارد ہونے والے اعتراضات اور ان کے جوابات

ذیل میں چند اعتراضات اور ان کے جوابات بیان ہوں گے۔ یہ وہ اعتراضات ہیں جو ابو الفضل الرازی کے مذہب (قول) اور اس کے قریب ترین مذاہب (اقوال) یعنی ابن قتیہ، ابن جزری اور ابن طیب کے اقوال پر وارد ہوتے ہیں۔

**پہلا اعتراض** ۱۔ قائلین نے اختلاف قرأت کی جو سات نوعیتیں بیان کی ہیں، ان کا آپس میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ نیز ان میں سے کسی ایک نے بھی یقینی طور پر یہ نہیں کہا (کہ وہ سات نوعیتیں یہ ہیں بلکہ) وہ تتبع اور استقراء کے ذریعے ثابت کرتے ہیں جس کے نتیجے میں وہ اوجہ سب سے باہر نہیں نکل پاتے۔ اور ان کے اس طرز عمل سے یقین کے ساتھ کیوں کر باور کر لیا جائے کہ حضور اکرم ﷺ کی مراد یہی وہ وجوہ سب سے ہیں جن کی وجہ سے قرأت میں اختلاف رونما ہوتا ہے۔

**پہلے اعتراض کا جواب** ۲۔ پہلی بات یہ کہ جو مذہب ہم نے اختیار کیا ہے، ہم اس میں بیان کردہ اوجہ سب سے اختلاف سے متعلق ایک نہیں، بلکہ متعدد دلائل رکھتے ہیں۔ تیسری بات یہ کہ ہم یہ تسلیم ہی نہیں کرتے کہ تتبع اور استقراء دلیل بننے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ کیوں کہ استقرائے تام ان دلائل میں سے ایک ہے، جس کو منطق قدیم اور جدید دونوں میں مانا گیا ہے۔ بشرطیکہ وہ اپنی تینوں شرائط کو پورا کرنے والا ہو۔ وہ تین شرائط یہ ہیں۔ پہلی شرط: قضیہ استقرائیہ مضمون ہو حکم حقیقی کو۔ دوسری شرط: وہ کلیہ حقیقیہ ہو۔ یعنی اس کا موضوع ایسا کلی حقیقی ہو جو اپنے تمام افراد پر صادق آتا ہو، خواہ وہ افراد ماضی میں گزر چکے ہوں یا ابھی موجود ہوں یا مستقبل میں ان کا پایا جانا ممکن ہو۔ تیسری شرط: اس قضیہ استقرائیہ تک وصول تجربہ اور ملاحظہ کے ذریعے ہوا ہو۔

اور اس میں کوئی شک نہیں کہ امام ابو الفضل الرازی کی بیان کردہ وجوہ سب سے استقراء اپنی تینوں شرائط کے ساتھ متحقق ہوا ہے۔ کیوں کہ انھوں نے تمام ممکنہ وجوہ اختلاف کو ملحوظ رکھا ہے جس کے نتیجے میں انھوں نے ان سات کے علاوہ کوئی اور قسم نہ پائی۔ پھر اس کے بعد حکم حقیقی کے طور پر جو استقرائے تام صادر ہوا، وہ یہ تھا کہ حدیث مبارکہ میں مذکورہ اوجہ سب سے کچھ مراد نہیں سوائے ان سات وجوہ کے جنہیں امام ابو الفضل الرازی نے بیان کیا۔ اس استقرائے تام کو حکم سالب کلیہ کے طور پر ثابت ہوا ہے، کما تری۔

**دوسرا اعتراض** ۳۔ ابو الفضل الرازی، ابن قتیہ، ابن جریر اور ابن الطیب ان چاروں ائمہ نے تتبع اور استقراء کے جو طریقے اختیار کیے ہیں، ان طریقوں میں یہ ائمہ ایک دوسرے کے مخالف ہیں۔ اور ان کا ایک دوسرے کے ساتھ مخالف ہونا اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ ممکن ہے کہ وجوہ سب سے علاوہ بھی کوئی وجہ پائی جاتی ہو۔

**دوسرے اعتراض کا جواب** ۴۔ ائمہ کرام کے استقراء اور تتبع کے طریقوں میں محض اختلاف اس بات کو لازم نہیں ثابت کرتا ہے کہ ان ائمہ کرام میں سے بعض کا استقراء تام ہے اور بعض کا ناقص۔ اور یہ تو ہم پہلے ہی ثابت کر چکے ہیں کہ امام الرازی کا استقراء اپنی تمام شرائط پر پورا اترنے کی وجہ سے تام ہے۔ اور اس میں بھی کوئی مضائقہ نہیں کہ کوئی انسان استقراء کا وہ راستہ اختیار

منائل العسرفان فی علوم القسآن: جلد ۱

کرے جو اس کے مخالفین میں سے کسی نے نہ کیا ہو۔ کیوں کہ ہر انسان کو حق حاصل ہے کہ وہ استقراء کے لیے جس راستے کو اصوب اور اقرب سمجھتا ہو اسے اختیار کرے، بشرطیکہ کے وہ اپنی شرائط کو تسلیم ہو۔

**تیسرا اعتراض** آپ جانتے ہیں کہ حروف سبجہ کی رخصت کا مقصد اُمت پر سہولت تھا۔ اور اُس وقت کے اکثر لوگ کتابت اور رسم الخط کی باریکیوں سے ناواقف تھے۔ ہاں! حروف و خارج سے متعلق ضرور جانتے ہیں۔ تو ایسی صورت حال میں رخصت ظاہر نہ ہوئی فعل کو مبنی للمعلوم یا مبنی للمجہول پڑھنے میں، یا ایک حرکت کو دوسری حرکت کے ساتھ یا ایک حرف کو دوسرے حرف کے ساتھ بدلنے میں، یا تقدیم و تاخیر وغیرہ میں۔ کیوں کہ ان میں سے کسی ایک کے ساتھ بھی پڑھنا مشقت کو لازم نہیں کرتا۔ حالانکہ نبی کریم ﷺ نے اُمت کو مشقت سے بچانے کے لیے ہی دُعا مانگی تھی اور فرمایا تھا: "إِنَّ الْأُمَّةَ لَا تُطِيبُنِي ذَلِك" اور اُمت کے لیے آسانی طلب فرمائی تھی ایک حرف کو دوسرے حرف کے ساتھ بدلنے میں یا فعل ماضی کو فعل امر کے ساتھ بدلنے میں یا مبنی للمعلوم کو مبنی للمجہول کے ساتھ تبدیل کرنے، وغیرہ میں۔

**تیسرے اعتراض کا جواب** ہم آپ کی یہ بات تسلیم ہی نہیں کرتے کہ افعال کو مبنی یا مجہول پڑھنے، یا ایک حرکت کی ایک حرف کی جگہ دوسری حرکت یا دوسرا حرف پڑھنے، یا تقدیم و تاخیر کرنے میں رخصت دی گئی تھی۔ اور دوسری بات یہ کہ "رخصت" غیر ظاہر نہیں، بلکہ بالکل ظاہر ہے اُس کے علاوہ میں جو آپ سمجھے، یعنی کلمات و حروف کی حرکات و ترتیب وغیرہ کو ان کی حالت پر باقی رکھتے ہوئے "اختلاف لہجات" میں۔ اور ہم بارہا مشاہدہ و محسوس کرتے ہیں کہ بعض لوگوں کے لیے بعض حروف کو مخصوص صفات کے ساتھ پڑھنا یا تو آسان ہوتا یا مشکل ہوتا ہے۔ پس بعض لوگوں کے لیے تقسیم میں سہولت ہوتی ہے نہ کہ ترتیب میں۔ اور بعضوں کے لیے فتح میں آسانی ہوتی ہے نہ کہ اِمالہ میں۔ اور بعض لوگ اظہار کرتے ہوئے سہولت سے پڑھ لیتے ہیں اور ادغام کرتے وقت مشکل کا شکار ہو جاتے ہیں۔ الغرض بعض لوگوں پر ایک صفت آسان اور بعضوں پر اس کا عکس آسان ہوتا ہے۔ پس یہ رخصت اس وقت کیسے پائی جاسکتی ہے جب حروف یا کلمات یا حرکات و ترتیب ہی کو بدل دیا گیا ہو۔

(غلاصہ کلام: معترض یہ سمجھ رہا تھا کہ رخصت ابدال یا تقدیم و تاخیر وغیرہ کے حق میں دی گئی تھی۔ اسی وجہ سے اُس نے کہہ دیا تھا کہ "رخصت ظاہر نہیں ہے۔" جواب میں یہ بات واضح کر دی گئی کہ معترض کی تقسیم میں کمی تھی کیوں کہ اگر اختلاف لہجات کے حق میں رخصت مانی جائے تو وہ ظاہر ہوگی وگرنہ نہیں۔)

**چوتھا اعتراض** کلمہ واحدہ میں قراءات مذکورہ میں سے وجوہ اختلاف کا پایا جانا متصور ہی نہیں ہے جانیکہ اس میں تیسرے و تیسریہ تغیر ہو۔ اور اگر آپ کی مراد کلمہ واحدہ میں اختلاف نہیں بلکہ متفرقا پورے قرآن مجید میں اختلاف مراد ہے جیسا کہ اُن کے نزدیک ہے جو سبجہ حروف سے لغات سبجہ مراد لیتے ہیں، تو اُس وقت نہ ہی تو رخصت کا کوئی سبب باقی رہتا تھا اور نہ ہی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے درمیان اختلاف پیدا ہونا چاہیے تھا۔

**چوتھے اعتراض کا جواب** آپ کا یہ اعتراض درحقیقت امام ابو الفضل الرازی کے قول اور اس کے مشابہ دیگر اقوال کی حقیقت سے بنیادی ناواقفیت کی بنا پر ہے۔ کیوں کہ ان کے مذاہب میں یہ ہرگز بیان نہیں ہوا کہ کلمہ واحدہ میں ساتوں وجوہ پائی جائیں گی بلکہ ان کے مذاہب میں یہ بیان ہوا ہے کہ قراءات میں تمام اختلافات ان

مناب العرفان فی علوم القرآن: جلد ۱

سات وجوہ کی طرف لوٹتے ہیں۔ یعنی قراءت میں اختلاف کی نوعیت زیادہ سے زیادہ ان سات اقسام پر مشتمل ہو سکتی ہے۔ اور ربی آپ کی یہ بات کہ ان سات نوعیتوں کا اختلاف پورے قرآن مجید میں ممتزجا پھیلا ہوا ہوتا تو زحمت تحقق نہیں ہوتی۔ تو آپ کی یہ بات بھی درست نہیں۔ کیوں کہ زحمت تو تحقق ہی اس صورت میں ہوتی ہے جو ہم نے بیان کی۔ اور زحمت کو کیا ہوا کہ وہ باقی نہ رہے! حالانکہ یہ ساتوں وجوہ شامل ہیں قراءت متواترہ، صحیحہ، ضعیفہ اور شاذہ میں موجود اختلاف، کوشی کہ لہجات کے اختلاف کو بھی۔ اور اگر کلمے کی لغات کو بھی اس میں شامل کر لیا جائے تو پھر بعض اوقات اس کلمے کو پڑھنے کے انداز کی تعداد سستیس تک بھی پہنچ جاتی ہے۔ جیسا کہ ما قبل گزر چکا ہے کہ علامہ الرمائی کلمہ ”اُتی“ میں سستیس لغات بیان کرتے ہیں۔

**پانچواں اعتراض** بے شک حروف سبجی زحمت ثابت ہے (لیکن حروف سبجہ کو جن سات وجوہ اختلاف میں آپ نے منحصر کیا ہے، اُن سے متعلق) اور اصول کتابت و رسم الخط کی باریکیوں سے متعلق اُس وقت کے عام عرب ناواقف تھے۔ (لہذا ایسی صورت حال میں ان وجوہ اختلاف کو جن کو وہ جانتے ہی نہ تھے ”حروف سبجہ“ قرار دینا مشکل و عجیب معلوم ہوتا ہے)۔

**پانچویں اعتراض کا جواب** پہلا جواب: بلکن ہے، یہ انحصار اتفاقاً واقع ہو گیا ہوا اور بعد میں استقرار کے ذریعے اس پر اطلاع ہو گئی ہو۔ دوسرا جواب: یہ بات یقینی ہے کہ یہ انحصار استقرار کے تام ہی کے ذریعے معلوم ہوا ہے۔ اور استقرار کے تام دلائل قاطعہ میں سے ایک ہے جیسا کہ سابقہ اعتراض کے جواب میں بیان ہوا ہے۔ اور ربی آپ کی یہ بات کہ زحمت تو واقع ہو گئی لیکن اس وقت کے اکثر عرب (ان اصطلاحات سے) اُتی تھے۔ تو یاد رکھیے اُن کا ان اصطلاحات یا انحصار کی تفصیلات سے اُتی ہونا حروف سبجہ کے تحت متعین کردہ قراءت کی سات نوعیتوں کی صحت کو نقصان نہیں پہنچاتا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ ان اصطلاحات کو اُن عنوانات کے ساتھ نہیں جانتے تھے جن کو بعد کے زمانے میں ہم نے بیان کیا۔ لیکن وہ فیوض نبوی ﷺ کی برکت سے ان عنوانات کے تحت پائے جانے والے تمام مفاہیم کو ہم سے نسبتاً بخوبی جانتے اور ادا کرتے تھے۔ وہ خوب جانتے تھے کہ کون سا لفظ کس انداز میں صحیح، فصیح اور بلیغ ادا کیا جاتا ہے۔ اس کی ایک نظیر صرف ٹوکھی فنی اصطلاحات اور تقسیمات (تو ان میں وغیرہ) بھی ہیں کہ وہ اُس زمانے میں اس طرح رائج نہ تھیں جس طرح اب ہمارے زمانے میں رائج ہیں۔ لیکن یہ فنی اصطلاحات جن مفاہیم سے عبارت ہیں وہ مفاہیم تو اس دور میں بھی موجود تھے۔ پس اسی طرح اس دور میں حروف سبجہ کی تشریح متعین کرنے کی حاجت مانتہ پیش نہ آئی (تو اس میں تعجب کی کیا بات ہے؟ اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس دور میں اگر آنحضرت ﷺ سات وجوہ اختلاف کی تفصیل بیان فرمادیتے تو شاید عوام الناس کی سمجھ سے بالاتر ہوتی۔ اس لیے حضور اکرم ﷺ نے صرف اتنا وضع فرمایا کہ یہ وجوہ اختلاف کُل سات میں منحصر ہیں۔ بعد میں جب یہ اصطلاحات رائج ہو گئیں تو علماء نے استقرار کے تام کے ذریعے ان وجوہ اختلاف کو اصطلاحی الفاظ کا جامہ پہنایا)۔

## حروفِ سبعہ کا مصحفِ عثمانیہ میں موجود ہونا

(حروفِ سبعہ کے معنی کی تعیین کے بعد) ہم آپ کو ایک اور نقطے کے جانب لیے چلتے ہیں کہ ”وہ حروفِ سبعہ جن پر قرآن کریم نازل ہوا تھا وہ (آج بھی) مصحفِ عثمانیہ میں موجود ہیں یا نہیں؟“ چنانچہ فقہاء، قراء اور متکلمین کی جماعتوں کا مذہب ہے کہ (اب بھی) مصحفِ عثمانیہ ان تمام حروفِ سبعہ پر مشتمل ہیں جن پر قرآن کریم نازل ہوا تھا۔ اس کی بنیاد اس بات (دو باتوں) پر ہے (پہلی یہ) کہ اُمت کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ ان سات حروف میں سے کسی حرف کو نقل کرنا ترک کر دیں جن پر قرآن کریم نازل ہوا اور (دوسری یہ کہ) صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اجماعی طور پر یہ عثمانی مصحف ان صحیفوں سے نقل کیے تھے جو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ (اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ) نے لکھے تھے۔ اور ان کے سامنا جتنے صحیفے تھے ان کو چھوڑنے پر متفق ہو گئے تھے۔ (ان دونوں باتوں کا) معنی یہ ہوا کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ (اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ) کے پاس جو صحیفے تھے، وہ حروفِ سبعہ پر مشتمل تھے پھر ان صحیفوں کو حروفِ سبعہ سمیت بعینہ مصحفِ عثمانیہ میں منتقل کر دیا گیا۔ اور سلف و خلف کے علماء کی اکثریت کا بھی یہ قول ہے کہ یہ عثمانی مصحف ان حروفِ سبعہ پر مشتمل ہیں جو ان کے رسم الخط میں سما گئے۔ اور حضور اکرم ﷺ نے حضرت جبرئیل علیہ السلام سے قرآن کریم کا جو آخری دور کیا تھا، اُس کے تمام حروف ان مصحف میں جمع ہیں۔ (یعنی ان میں سے کوئی ایک حرف بھی ان مصحف میں نہیں چھوٹا۔)

علامہ ابن جریر الطبری اور ان کے تابعین کا اس بابت کہنا ہے کہ مصحفِ عثمانیہ حروفِ سبعہ میں سے صرف ایک حرف پر مشتمل ہیں۔ ان کی اس رائے کی بنیاد یہ ہے کہ ان کے نزدیک حروفِ سبعہ سے مراد قبائلِ عرب کی سات لغات ہیں۔ اسی بنا پر یہ کہتے ہیں کہ صدر اسلام یعنی رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں اور حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کے دورِ خلافت میں اور حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت کی ابتدا میں تو قرآن کریم میں ان سات حروف کا التزام کیا جاتا تھا۔ لیکن بعد میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اُمت کو ایک کلمہ پر جمع کرنے کی غرض سے سات حروف کی بجائے صرف ایک حرف پر اکتفا کرنے کا فیصلہ کیا۔ پس حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی قیادت میں صرف ایک حرف (لغتِ قریش) کو باقی رکھا گیا اور اس کے علاوہ باقی چھ حروف کو چھوڑ دیا گیا۔ پھر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اسی ایک حرف کے ساتھ چند مصحف مرتب کروائے جس کی وجہ سے اُمت ایک حرف پر متحد و متفق ہو گئی۔ علامہ ابن جریر طبری کے اس مذہب اور اس میں موجود باتوں کا بیان ذیل میں تفصیلاً آ رہا ہے۔

مصحفِ عثمانیہ مشتمل ہیں مکمل حروفِ سبعہ پر یا ان میں سے بعض پر؟ اس بات کا سمجھنا دو امور پر موقوف ہے۔

پہلا امر: حروفِ سبعہ کی مراد متعین کرنا۔

دوسرا امر: رجوع کرنا اُس کی طرف جوئی الواقع اور فس الامر میں ان مصحف میں لکھا ہوا ہے یا مانا دیا گیا ہے۔

پہلے امر سے متعلق ہم ماسبق میں تفصیلاً بیان کر چکے ہیں کہ حروفِ سبعہ کی مراد وہ سات وجہ ہیں جن کی طرف قراءات پیدا ہونے والا اختلاف لوٹتا ہے۔ برابر ہے کہ وہ قراءات صحیح ہوں، یا شاذ ہوں یا منکر ہوں۔ الغرض وہ تمام کے تمام اختلاف قراءات ان ہی سات صورتوں (وجہ) میں منحصر ہوں گے جن کو امام ابوالفضل الرازی رضی اللہ عنہ نے استقرائے تام کے بعد ذکر کیا ہے۔

”محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ“

اور دوسرے امر کے پیش نظر جب ہم ان حروفِ سبعہ کی طرف دیکھتے ہیں جوئی الواقع اور نفس الامر میں مصحفِ عثمانیہ میں مخطوط ہیں تو ہمیں ایسی حقیقت حاصل ہوتی ہے جس کی کوئی نقیض نہیں اور اس باب میں ایسا فصلِ خطاب میرا ہے جس کے بعد مزید کسی کلام کی ضرورت نہیں رہتی۔ اور وہ حقیقت اور فصلِ خطاب یہ ہے کہ مصحفِ عثمانیہ پورے سات حروف پر مشتمل ہیں۔ لیکن بایں معنی کہ ان مصاحف میں سے ہر ایک ان تمام حروف یا ان میں سے ان بعض حروف پر مشتمل ہے جو اس کے رسم الخط کے موافق ہیں، بایں طور کہ مصحفِ عثمانیہ مجموعی طور پر ان میں سے کسی حرف سے بالکل خالی نہیں ہیں۔

اب ہم اپنے مختار مذہب (امام ابوالفضل الرازی کے مذہب) کے مطابق ان وجوہِ سبعہ کی مثالیں بیان کرتے ہیں جن کو مصاحفِ عثمانیہ کا رسم الخط اپنے اندر سمونے ہوئے ہے۔

(وجہِ اول) اَسْمَاءٌ مِّنْ مَّفْرُودٍ، تَشْبِيهِ، جَمْعُ كَاخْتِلَافٍ ﴿مِثَالٌ﴾: ﴿وَالَّذِينَ هُمْ لِأَمْتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ زَعُونَ﴾ (المؤمنون: ۸) اور (العارج: ۳۲)

ایک قراءت کے مطابق "يَا مَنَاكَا يَهْمُ" جمع کے ساتھ ہے جب کہ دوسری قراءت میں اسے واحد کے ساتھ پڑھا گیا ہے۔ یعنی ﴿يَا مَنَاكَتِهِمْ﴾۔

مصاحفِ عثمانیہ میں رسمِ عثمانی کے مطابق اسے ایسے: "لامنتهم" یعنی حروفِ مفردہ کے رسم الخط کے ساتھ لکھا گیا اور (ساتھ ہی "ن" کے اوپر) ایک چھوٹا سا الف بھی ڈال دیا گیا ہے جو اس کے جمع ہونے کی طرف اشارہ کرتا ہے اور نقطوں اور اعراب سے خالی ہے۔

(وجہِ ثانی) تَصْرِيْفِ اَفْعَالٍ كَاخْتِلَافٍ ﴿مِثَالٌ﴾: ﴿يَعْلَمُونَ عَلَىٰ أَنْفُسِهِمْ لَّهُمْ﴾ (الاعراف: ۱۳۸)

اس آیت میں موجود فعل میں "کاف" کو کسرہ اور ضمہ (یعنی بابِ ضرب اور نصر) دونوں کے ساتھ پڑھا گیا ہے۔ پس رسمِ عثمانی ان دونوں قراءتوں کو اپنے اندر سمولیتا ہے۔ چون کہ اس وقت مصحفِ عثمانی نقطوں اور اعراب سے خالی تھے، اس لیے لکھنے میں فعل کی ہیئت بھی ایک ہی رہی اور دو مختلف قراءتوں کی صورت میں کوئی فرق بھی ظاہر نہیں ہوا۔

(از مترجم: دورِ عثمانی میں مصاحف کی جو نقلیں تیار کر کے مختلف بلادِ اسلامیہ کو بھیجی گئیں تھیں، وہ ایسے رسم الخط پر مشتمل تھیں جو ساتوں حروف کا قتل ہو سکے۔ اور شاید اسی مقصد کے پیش نظر ان مصاحف کو نقطوں اور حرکات سے خالی رکھا گیا تاکہ ان حروف کی تمام متواتر قراءت جو عرضہ اخیرہ کے وقت باقی رکھی گئی تھیں اور ان کی تلاوت منسوخ نہیں ہوئی تھی ان میں سما جائیں۔

یہ مصاحف ایک زمانہ تک بلادِ اسلامیہ میں رائج رہے، لیکن جب اسلامی فتوحات کا دائرہ وسیع ہو گیا، بے شمار عجمی ممالک اسلام کے زیر سایہ آگئے اور عربی اور عجمی زبانوں کا باہم اختلاط بڑھا تو عربی زبان میں لحن عام ہو گیا۔ اور یہ خدشہ پیدا ہوا کہ کہیں فصیح عربی زبان عجمی اثرات سے ناپید نہ ہو جائے۔ مزید یہ کہ عجمی لوگوں کے لیے قرآن کریم کو بغیر نقطوں اور حرکات کے پڑھنا کافی دشوار تھا۔ چنانچہ اسلامی حکومت کے سامنے یہ خطرہ پیدا ہوا کہ کہیں یہ صورت حال کتاب اللہ میں لحن اور لفظی تحریف پر منتج نہ ہو۔ لہذا انہوں نے اس صورت حال کے ممکن نتائج و اثرات سے نمٹنے کے لیے یہ فیصلہ کیا کہ اس میں نقطے اور حرکات ظاہر کی جائیں تاکہ تمام لوگ آسانی سے اس کی تلاوت کر سکیں۔)

**مثال:** ﴿وَلَا يُضَادُّ كَاتِبٌ وَلَا شَهِيدٌ﴾ (البقرہ: ۲۸۲)  
**(وجہ ثالث)** اعراب کے اعتبار سے اختلاف ﴿وَلَا يُضَادُّ﴾ کے راء کو فتح اور ضمہ دونوں کے ساتھ پڑھا گیا

ہے یوں کہ رسم عثمانی دونوں کا احتمال رکھتا ہے، جیسا کہ وجہ سابق میں بہت واضح انداز میں بیان ہوا ہے۔

**مثال:** ﴿وَأَعَدَّ لَهُمْ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ﴾ (التوبہ: ۱۰۰)  
**(وجہ رابع)** الفاظ میں کمی، زیادتی کا اختلاف ﴿تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ﴾ ہے جب کہ دوسری قراءت میں ﴿تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ﴾ ہے۔ اور یہ

دونوں قراءت متواتر ہیں۔

قراءت کی اس وجہ (صورت) میں الفاظ کی کمی و زیادتی پائی جاتی ہے۔ اور قراءت کی اس وجہ (صورت) کو بعض مصاحف عثمانیہ کا رسم الخط اپنے اندر سموتا ہے (اور بعض کا نہیں)۔ یعنی قراءت کے اس اختلاف کو ایک ہی مصحف عثمانی اپنے اندر سمو لیتا یہ ناممکن تھا۔ اس لیے دو علیحدہ علیحدہ مصاحف عثمانیہ میں اس اختلاف کو سمو یا گیا۔ اس بحث سے ہمیں یہ بات بھی معلوم ہوگی کہ حروف سببہ میں سے کچھ حروف ایسے بھی ہیں جن پر مجموعی طور پر تمام یا چند مصاحف عثمانیہ مل کر مشتمل تھے۔ یعنی ہر مصحف ان تمام حروف پر مشتمل نہیں تھا۔ مصاحف عثمانیہ کی تعداد کیا ہے؟ اس بارے میں دو قول ہیں۔ پہلا: حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے پانچ نسخے تیار کروائے تھے۔ یہ ہی قول زیادہ مشہور ہے۔ اور دوسرا قول یہ ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے کل سات نسخے تیار کروائے تھے۔ ایک نسخہ مدینہ منورہ میں رکھا تھا جب کہ بقیہ مکہ، شام، یمن، بحرین، بصرہ اور کوفہ میں ایک ایک کر بھیج دیا گیا۔ یہ قول ابن ابی داؤد سے ابو حاتم جستانی نے نقل کیا ہے۔ (فتح الباری ۹/ ۲۳، ۲۴) پس لفظ ”سببہ“ کی زیادتی والی قراءت مصحف کی میں موجود ہے اور بدون ”سببہ“ والی قراءت ان مصاحف عثمانیہ میں موجود ہے جو مصحف کی کے علاوہ ہیں۔

اس اختلاف کی ایک اور مثال: ﴿وَكَانَ وِرَاءَهُمْ قَلْبُكَ يَأْخُذُ كُلَّ سَفِيحَةٍ غَضَبًا﴾ (الکہف: ۷۹)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اس کو ”يَأْخُذُ كُلَّ سَفِيحَةٍ غَضَبًا“ پڑھا ہے یعنی لفظ ”صَالِحَةٍ“ کے اضافے کے ساتھ۔ لیکن یہ قراءت عرضہ اخیرہ میں مسنوخ قرار دے دی گئی تھی۔ اس لیے اس قراءت کو کسی بھی مصحف عثمانی میں شامل نہیں کیا گیا۔ عرضہ اخیرہ سے قرآن مجید کا وہ دور مراد ہے جو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی حیات طیبہ کے آخری ایام میں حضرت جبرئیل رضی اللہ عنہ سے ساتھ کیا تھا۔

**مثال:** ﴿فَيَقْتُلُونَ وَيُقْتَلُونَ ۖ وَعَدَّ عَلَيْهِمْ حَقًّا﴾ (التوبہ: ۱۱۱)  
**(وجہ خامس)** تقدیم و تاخیر کا اختلاف ﴿فَيَقْتُلُونَ وَيُقْتَلُونَ﴾ اس صورت میں تقدیم و تاخیر کا اختلاف ہے۔ یہ صورت اپنی ماقبل

صورت کے مثل ہے۔ یعنی تقدیم و تاخیر والی کچھ قراءتیں ایسی ہیں جن کو مصاحف عثمانی نے اپنے وسیع النظر رسم الخط کی بنا پر اپنے اندر سمو لیا ہے اور کچھ ایسی ہیں جن کو نہیں سمو یا بوجہ ان قراءت کے مسنوخ ہونے کے۔ مذکورہ بالا مثال میں دو قراءتیں ہیں۔ پہلی قراءت میں پہلے ﴿فَيَقْتُلُونَ﴾ کو معروف ﴿فَيَقْتُلُونَ﴾ اور دوسرے کو مجہول ﴿فَيُقْتَلُونَ﴾ پڑھا گیا ہے اور دوسری قراءت میں اس کے برعکس پڑھا گیا ہے۔ اور یہ دونوں قراءتیں متواتر ہیں۔ اس لیے رسم عثمانی نے ان دونوں قراءتوں کو جمع کر لیا (کیوں کہ اس وقت اعراب نہیں لگے ہوئے تھے اس لیے دونوں قراءتیں با آسانی جمع ہو گئیں)۔ اور تمام مصاحف عثمانیہ میں اس کا خلاف نہیں ملے گا۔



مسائل العسرفان فی علوم القسمرآن: جلد ① ﴿وَجَاءَتْ سَكْرَةُ الْمَوْتِ بِالْحَقِّ﴾ (ق: ۱۹)

یہ مثال ان دو قراءتوں کی ہے جن کو مصاحف عثمانیہ نے شامل نہیں کیا۔ ان میں سے ایک کے متواتر نہ ہونے کی وجہ سے۔ ایک قراءت کے مطابق ﴿وَجَاءَتْ سَكْرَةُ الْمَوْتِ بِالْحَقِّ﴾ پڑھا گیا ہے جو کہ متواتر ہے۔ اس لیے تمام مصاحف عثمانیہ اس قراءت پر مشتمل ہیں۔ اور دوسری قراءت کے مطابق ﴿وَجَاءَتْ سَكْرَةُ الْحَقِّ بِالْمَوْتِ﴾ پڑھا گیا۔ یہ قراءت اگرچہ حضرات ابوبکر الصدیق، طلحہ بن مصرف اور زین العابدین رضی اللہ عنہم سے منقول ہے لیکن متواتر نہیں ہے کیوں کہ عرضہ اخیرہ میں اسے منسوخ قرار دے دیا گیا تھا۔ نیز مصاحف عثمانیہ میں موجود قراءات پر تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا اجماع ہے اس لیے کسی کے لیے جائز نہیں کہ وہ پہلی قراءت ﴿وَجَاءَتْ سَكْرَةُ الْمَوْتِ بِالْحَقِّ﴾ کی مخالفت کرے۔

اس موقع پر ایک اور مثال دیکھیے: ﴿إِذَا جَاءَ نَصْرُ اللَّهِ وَالْفَتْحُ﴾ (الفتح: ۱) دوسری قراءت میں اس آیت کو إِذَا جَاءَ فَتَحَ اللَّهُ وَالنَّصْرُ پڑھا گیا ہے۔ پہلی قراءت مصاحف عثمانیہ میں موجود ہے اور دوسری نہیں، بوجہ منسوخ ہونے کے۔ کیوں کہ اس کو بھی عرضہ اخیرہ میں منسوخ کر دیا گیا تھا۔

(وجہ سادس) ألفاظ کا ایسا اختلاف جس سے حروف بدل جائیں ﴿یہ وجہ (صورت) بھی ایسی ہے۔ یعنی ان میں سے

بعض کو مصاحف نے شامل کیا ہے اور بعض کو نہیں۔

پہلی مثال: ﴿إِنْ جَاءَكَ مِنْ بَنِي قَيْنَانَ﴾ (الجرات: ۶)

ایک قراءت میں ﴿فَقَتَبَتُونَا﴾ کی جگہ ﴿فَقَتَبَتُونَا﴾ پڑھا گیا ہے۔ یہ مثال ان دو قراءتوں کی ہے جنہیں تمام مصاحف عثمانیہ نے (اپنے رسم الخط کی وسعت کی بنا پر) اپنے اندر سوا یا شامل کیا ہے۔ کیوں کہ یہ دونوں قراءات متواتر ہیں۔ اس لیے ان دونوں میں سے کسی ایک کو چھوڑنا ناممکن اور دونوں کو جمع کرنا ممکن تھا اس لیے دونوں کو جمع کر دیا گیا۔

(اعتراض: ان دونوں کو جمع کرنا کیوں کر ممکن تھا جب کہ ﴿فَقَتَبَتُونَا﴾ اور ﴿فَقَتَبَتُونَا﴾ میں واضح تفاوت ہے؟ پہلی قراءت میں کلمہ کا تیسرا، چوتھا اور پانچواں حرف بالترتیب باء، یاء اور نون ہے جب کہ دوسری قراءت میں بالترتیب ثاء، باء اور تاء ہے۔

جواب: شاید آپ کو یاد نہیں کہ مصاحف عثمانیہ غیر منقوڑ اور غیر مشکوول تھے۔ نقطے اور اعراب تو بہت بعد میں لگائے گئے۔ لہذا نقطوں کے نہ ہونے کی وجہ سے مذکورہ بالا دونوں قراءتوں کو ایک ہی مصحف میں جمع کرنا ممکن ٹھہرا۔ (از مترجم)

یہ دونوں "إِذَا نُودِيَ لِلصَّلَاةِ مِنْ يَثْرِبَ الْجُمُعَةِ فَامضُوا إِلَىٰ ذِكْرِ اللَّهِ" وَتَكُونُ الْجِبَالُ كَالْعُزُوفِ الْمُنْفُوشِ " مثالیں بھی عرضہ اخیرہ میں منسوخ ہو جانے کی وجہ سے کسی بھی مصحف عثمانی شامل نہیں کی گئیں۔

یہ اختلاف کی وہ وجہ (صورت) ہے جس کو بہت احسن اور اکمل درجے میں تمام مصاحف عثمانیہ اپنے اندر سولیتے ہیں۔ کیوں کہ یہ محض اعراب (اور تلفظ) کا اختلاف ہے۔ اس میں کلمے کا جو ہر تبدیل نہیں ہوتا۔ آپ اس اختلاف کی کثیر مثالیں مصاحف عثمانیہ میں پائیں گے۔ مثلاً:

﴿هَلْ أَتَاكَ حَدِيثُ مُوسَىٰ﴾ (الاعزات: ۱۵)

پس یہ آیت رسم عثمانی میں اس طرح لکھی گئی کہ فصل میں تاء کے بعد یاء لے آئے اور لفظ موسیٰ کے الف کو یا سے بدل دیا۔ (اس طرح لکھنے سے آیت کی شکل و صورت میں تو کوئی تبدیلی نہیں آئی کیوں کہ اُس دقت) رسم عثمانی بغیر اعراب اور نقطوں کے (لکھا جاتا تھا)۔ (لیکن متعدد قراءات کا پڑھنا ممکن ہو گیا۔)

## حروفِ سبعہ کی تعیین میں مزید اقوال

اس عنوان کے تحت حروفِ سبعہ کے معنی کی تعیین سے متعلق معرضِ عام کے طور پر مزید اقوال اور ان کے نقائص بیان کیے جائیں گے۔ ہم اس موقع پر ضروری سمجھتے ہیں کہ اپنے قولِ مختار کے علاوہ دیگر اقوال اور ان میں موجود کمزوریاں بھی آپ کے سامنے بیان کریں تاکہ ہمارے مذہبِ مختار یعنی امام ابو الفضل عبدالرحمان بن احمد بن الحسن الرازی رحمۃ اللہ علیہ کے قول کو اختیار کرنے کے راستے میں آپ کے لیے کوئی رکاوٹ باقی نہ رہے۔

جن احادیث میں ”سَبْعَةُ أَحْرُفٍ“ کے الفاظ ہیں وہ تمام احادیث مشکل ہیں۔ کیوں کہ لفظ ”أَحْرُفٍ“ کے معنی پہلا قول ہے مقصود تک پہنچنے کا کوئی سبیل نہیں۔ شبہ کی اصل وجہ ہے لفظ ”أَحْرُفٍ“ جو کہ جمع ہے ”حرف“ کی۔ اور لفظ ”حرف“ مشترک لفظی ہے کئی معانی کے مابین۔ اور مشترک لفظی وہ ہے جس کے تحت معانی میں سے کسی ایک کو متعین نہ کیا جاسکتا ہو۔

اس قول کے جواب میں کہا جائے گا کہ ہم آپ کی یہ بات تسلیم نہیں کرتے کہ مشترک لفظی کے معنی کو مطلقاً متعین نہیں کیا جاسکتا۔ کیوں کہ اگر اس کے معنی مقصود پر کوئی قرینہ موجود ہو تو اس کے معنی مقصود کو بالکل متعین کیا جاسکتا ہے۔ مثلاً قائل کہتا ہے: ”نَظَرْتُ بِالْعَيْنِ الْمُبَجَّرَةَ“ یا کہتا ہے: ”شَرِبْتُ مِنْ عَيْنٍ رُبَيْدَةَ“ ان دونوں مثالوں میں لفظ ”عین“ استعمال ہوا ہے جو مشترک لفظی ہے۔ لیکن اس کا مدلول متعین ہے کہ پہلی مثال میں اس سے مراد ”آنکھ“ ہے اور دوسری مثال میں ”نہر“ ہے۔ کیوں کہ یہاں قرینہ موجود ہے جو اس کے معنی کو متعین کر رہا ہے۔ اور وہ قرینہ پہلی مثال میں لفظ ”نَظَرْتُ“ اور دوسری مثال میں لفظ ”شَرِبْتُ“ ہے۔ لہذا حدیث شریفہ میں مذکورہ لفظ ”أَحْرُفٍ“ اور ”حرف“ کے لیے بھی سابقہ روایات کے سیاق سے معنی مقصود متعین اور معلوم ہو جاتا ہے اور وہ ہے ”الوجه“ اور ”الوجه“۔ پس ”حرف“ سے مراد وہ وجوہ ہیں، جن کی طرف قراءات سے متعلق تمام اختلافات لوٹتے ہیں۔ واضح رہے اختلاف سے مراد الفاظ کا اختلاف ہے، معانی کا نہیں۔ اور احرف سے مراد وجوہ مذکورہ ہی ہیں، اس امر پر دلیل عقلی بھی قائم ہو چکی ہے اور وہ ہے ”استقرائے تام“۔ استقرائے تام سے متعلق ہم پہلے تفصیلاً بیان کر چکے ہیں، پس اُسے ذہن میں رکھیے اور بھولے مت۔ نیز آٹھویں امر کو بھی یاد رکھیے کیوں کہ یاد رکھنا ایمان والوں کو نفع دیتا ہے۔

دوسرا قول ہے قاضی عیاض اور ان کے متعین کہتے ہیں: ”حدیث شریفہ میں لفظ ”سبعہ“ یعنی سات سے حقیقی عدد معروف مراد نہیں ہے۔ بلکہ لفظ ”سبعہ“ کا یا کوں میں کثرت کے لیے کنایہ کے طور پر بولا جاتا ہے۔ جیسا کہ دہائیوں میں کثرت سے کنایہ کے طور پر لفظ ”سبعین“ اور سینکڑوں میں لفظ ”سبعین“ استعمال ہوتا ہے۔ اس قول یا سوال کا جواب ”دوسرے امر“ میں بیان کیا جا چکا ہے۔ وہاں رجوع کیا جائے۔

تیسرا اور چوتھا قول ﴿﴾ ”حروف سبعہ سے قراءات سبعہ مراد ہیں۔“

اگر اس قول سے مراد یہ ہے کہ قرآن کریم کے کلمات میں سے ہر کلمے کو سات قراءات کے ساتھ پڑھا جاسکتا ہے۔ تو یہ ممکن ہی نہیں، کیوں کہ قرآن کریم کے بہت ہی کم ایسے کلمات ہیں جن کو ساتوں وجوہات پر پڑھا جاسکتا ہو۔ اور اگر اس قول سے مراد غایت و انتہا ہے۔ یعنی ایک کلمے میں زیادہ سے زیادہ سات وجوہات پائی جاسکتی ہیں، جیسا کہ علامہ سبکی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے۔ (اس طرح یہ چوتھا قول بن جاتا ہے۔) تو یہ بھی غیر مسلم ہے۔ کیوں کہ قرآن کریم میں متعدد کلمات ایسے بھی ہیں جن میں سات سے کئی زیادہ قراءات پڑھی جاتی ہیں۔ مثلاً ① ”عَبَدَ الظَّالِمَاتُ“ اس میں بائیس قراءات ہیں۔ ② ”أَفِ“ اس میں سونتیس قراءات ہیں۔

اور اگر اس قول سے مراد یہ لیا جائے کہ قراءات کے جتنے بھی اختلافات ہیں وہ سات وجوہ (اقسام یا نوعیتوں) سے باہر نہیں ہیں۔ تو پھر صاحب قول پر لازم ہوگا کہ وہ ان سات وجوہ کو بیان کرے۔ پس اگر وہ، وہ ہی سات وجوہ بیان کرتا ہے جو ہم نے (قول مختار میں) بیان کی ہیں تو اس کا قول ہمارے قول میں متداخل ہوگا اور اسے علیحدہ سے مستقل قول قرار نہیں دیا جائے گا۔

**فائدہ** ﴿﴾ بعض اکابر علماء نے تیسرے، چوتھے قول اور اس کے مشابہ اُتوال کو ہمارے قول مختار کے ساتھ متحد قرار دیا ہے۔ لیکن آپ بائبل جان چکے ہیں (کہ ہمارے قول مختار میں بیان کردہ وجوہات وہ ہیں جن پر مطلع ہونے میں امام ابو الفضل الرازی منفر د ہیں۔)

پانچواں قول ابن تقیہ، چھٹا ابن جزری اور ساتواں ابن الطیب کا ہے۔ تحقیق یہ پانچواں، چھٹا اور ساتواں قول ﴿﴾ تینوں اُتوال اور ان میں موجود نقائص (مثلاً یہ اُتوال تمام قراءات متواترہ کو شامل نہیں ہیں وغیرہ) ہم بائبل تفصیل سے بیان کر چکے ہیں۔ اگرچہ یہ تینوں اُتوال قول مختار کے قریب ترین ہیں۔ لیکن پھر بھی ان کو علیحدہ مستقل اُتوال قرار دیا جائے گا۔

آٹھواں قول ﴿﴾ ”حرف سبعہ سے وہ وجوہ مراد ہیں جو مٹی ہیں تلاوت قرآن کی کیفیت یعنی ادغام و اظہار، تغیم و رقیق، امالہ و اشباع، مد و قصر، تشدید و تخفیف اور تلبین پر“

اس قول کے جواب میں کہا جائے گا کہ یہ کیفیات تو سات سے متجاوز ہیں حالانکہ حدیث میں سات کا لفظ ہے۔ پھر اس کے جواب میں قائل کہے گا کہ حدیث میں لفظ ”سات“ وہ معروف عدد مراد نہیں ہے جو چھ اور آٹھ کے درمیان ہے۔ بلکہ اس سے کثرت مراد ہے۔ تو پھر ہم اس کے جواب میں کہیں گے کہ آپ نے تلاوت قرآن کی کیفیت کی جتنی بھی وجوہ (ادغام و اظہار وغیرہ) بیان کی ہیں وہ دراصل ایک ہی نوع سے متعلق ہیں اور اس نوع کا نام ہے ”اختلاف لہجات“۔ پس آٹھواں قول بھی مردود ہوگا کیوں کہ اس میں باقی انواع مثلاً اَلْفَاظ و حُرُوف کا ابدال، تقدیم و تاخیر، نقص و زیادت وغیرہ شامل نہیں ہیں۔

نواں قول ﴿﴾ ”حروف سبعہ سے کسی کلمہ واحدہ کی وہ مختلف صورتیں مراد ہیں جن میں اُس کلمے کو پڑھا گیا ہو اور معنی میں کوئی تبدیلی رونما نہ ہوئی ہو۔“ اور اگر آپ چاہیں تو اس قول کو یوں بیان کریں۔ ”حروف سبعہ سے قبائل عرب کی وہ سات مشہور لغات مراد ہیں جو کسی ایک کلمہ میں پائی جائیں اور اس کلمے کے معنی میں کوئی تبدیلی واقع نہ ہو۔“ جیسے: هَلَكَةً، اَقْبَلَ، تَعَالَ، عَجَلَ، اسرع، قصدی، نحوی یہ سات مختلف اَلْفَاظ ہیں لیکن ان سب کا معنی و مفہوم ایک ہی ہے اور وہ ہے ”طلب اقبال“ یعنی سَی،

متوجہ کرنا یا بلانا۔

یہ قول جمہور اہل فقہ و حدیث مثلاً سفیان، ابن وہب، ابن جریر الطبری اور الطحاوی کی طرف منسوب ہے۔ یہ حضرات دلیل کے طور پر یہ حدیث پیش کرتے ہیں:

((عَنْ أَبِي بَكْرَةَ، " أَنَّ جَبْرِئِيلَ عَلَيْهِ السَّلَامُ قَالَ: يَا مُحَمَّدُ اقْرَأْ الْقُرْآنَ عَلَى حَرْفٍ، قَالَ مِيكَائِيلُ عَلَيْهِ السَّلَامُ: اسْتَوْدَعَهُ، فَاسْتَوْدَعَهُ، قَالَ: فَاقْرَأْ عَلَى حُرُوفِهِنَّ، قَالَ مِيكَائِيلُ: اسْتَوْدَعَهُ، فَاسْتَوْدَعَهُ حَتَّى بَلَغَ سَبْعَةَ أَحْرَفٍ، قَالَ: كُلُّ شَيْءٍ كَافٍ مَا لَمْ تَخْجَمْ آيَةَ عَذَابٍ بِرُحْمَةٍ، أَوْ آيَةَ رَحْمَةٍ بِعَذَابٍ نَحْوَ قَوْلِكَ تَعَالَى وَأَقْبِلْ، وَهَلَمْ وَ أَهْمَبْ، وَأَسْرِعْ وَأَعْجِلْ)). (مسند احمد: 20514)

”حضرت ابو بکرہ سے روایت ہے جبرئیل نے عرض کیا: اے محمد ﷺ قرآن کو ایک حرف پر پڑھیے۔ حضرت میکائیل علیہ السلام نے عرض کیا: (رسول اللہ ﷺ!) اس پر اضافہ کروائیے۔ لہذا ایک حرف پر اضافہ کر دیا گیا۔ پھر حضرت جبرئیل نے عرض کیا: دو حرفوں پر پڑھیے۔ حضرت میکائیل نے پھر اضافے کے لیے کہا۔ اس پر سات حروف تک اضافہ کر دیا گیا۔ پھر حضرت جبرئیل نے فرمایا: یہ سارے حروف ثنائی و کثافی ہیں لیکن عذاب کی آیت کو رحمت والی آیت سے اور رحمت والی آیت کو عذاب کی آیت کے ساتھ ختم نہ کیجیے۔ جیسے: تعال، اقبل، هلم، اذهب، اسرع اور اعجل۔“

**فائدہ** بعض روایات میں اعجل کی بجائے عجل کا لفظ ہے۔

حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہما کی حدیث میں ہے کہ وہ ”كَلَّمَا أَصْأَاءَ لَهُمْ مَشَوْا فِيهِ“ کو ”كَلَّمَا أَصْأَاءَ لَهُمْ مَرَوْا فِيهِ“ اور ”كَلَّمَا أَصْأَاءَ لَهُمْ سَعَوْا فِيهِ“ بھی پڑھتے ہیں۔ اور حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما ”لَيْلِيْنِ ائْمَنُوا اَنْظُرُوا نَا“ میں ”اَنْظُرُوا نَا“ کی بجائے ”اَمْهَلُوا نَا“ یا ”اَخْرُوا نَا“ پڑھتے تھے۔

اس قول کے رد ہونے کی وجوہات درج ذیل ہیں۔

① اس حدیث کے مضمون میں حصر نہیں ہے کہ اس سے اس قول پر استدلال کیا جاسکے، بلکہ جیسا کہ ابن عبدالبر ریسی نے فرمایا ہے: ”اس حدیث میں ان حروف کی (جن پر قرآن نازل ہوا ہے) تمثیل بیان کی گئی ہے کہ ان سے مراد ایسے مضامین ہیں جن کے الفاظ اگرچہ مختلف ہوں لیکن ان کے معنی و مفہوم میں اختلاف نہیں ہے یعنی وہ متضاد معانی اور متعارض وجود پر دلالت نہیں کرتے۔“ اور حصر مراد وہ بھی کیسے سکتا ہے؟ کیوں کہ اس میں جو مثالیں بیان ہوئی ہیں وہ تو انواع اختلاف میں سے صرف ایک نوع کے بعض حصے کی طرف راجع ہیں اور وہ بعض نوع ہے ”کلمات کا ابدال۔“ یعنی ایک کلمہ کی جگہ دوسرا کلمہ پڑھنا۔ نیز ان مثالوں سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ضروری نہیں کہ دونوں کلمے ایک دوسرے کے مترادف ہوں۔ جب کہ مذہب مذکور میں یہ شرط ہے کہ جن دو لفظوں کو آپس میں بدلنا جا رہا ہے وہ ایک دوسرے کے مترادف ہوں۔ یعنی معنی و مفہوم واحد ہو۔ اسی وجہ سے ہم نے کہا تھا کہ یہ تو ایک نوع کے بھی بعض کی طرف راجع ہے، نوع کامل تو درکنار۔ تو جو قول کسی ایک نوع کامل کو شامل نہ ہو رہا ہو وہ ان باقی انواع کو اپنے اندر کیسے شامل کر سکے گا جو کہ آج بھی قراءت متواترہ میں موجود ہیں اور آپ کے پاس موجود مصاحف میں لکھی ہوئی ہیں، جیسا کہ ہم نے مذہب مختار میں بیان کیا ہے۔ لہذا اس قول میں تو سابقہ اقوال سے بھی زیادہ شدید اور قریب تصور پایا جا رہا ہے کیوں کہ ان میں سے بعض

قول تو ایسے بھی تھے جو کسی ایک نوع کامل کو شامل تھے اور بعض ایک سے زائد انواع کاملہ کو شامل تھے۔

② اس قول کے قائلین حلیل القدر لوگ ہیں، لیکن انھوں نے اس قول کو ترویج دے کر اپنے آپ کو ایک ننگ لٹھائی میں بند کر لیا اور ایسے دشوار معاملے میں الجھا دیا جس میں عظیم خطرہ ہے۔ کیوں کہ انھوں نے کہا ہے:

((إن الباقی الآن حرفٌ واحدٌ من السبعة التي نزل عليها القرآن. أمّا السبعة الأخری فقد ذهبت ولم يعد لها وجود البتة)).

”جن سات حروف پر قرآن کریم نازل ہوا تھا، اب ان میں سے صرف ایک حرف باقی ہے۔ اور بقیہ چھ حروف ختم ہو چکے اور اب ان کا کوئی وجود نہیں۔“

یہ قول اختیار کرتے وقت قائلین کے ذہن سے یہ بات نکل گئی یا وہ تصدأ بھول گئے کہ آج بھی قرآن مجید میں وہ تمام وجوہ (حروف سبعہ) موجود ہیں (جیسا کہ پہلے تھیں۔) اس کے بعد قائلین نے بھرپور کوشش کی کہ وہ کسی طرح ان چھ حروف سے متعلق، جن کے بارے میں وہ ضائع ہونے کا کہہ چکے ہیں، یہ ثابت کر دیں کہ وہ منسوخ یا مرفوع ہو گئے ہیں، لیکن وہ ایسا کچھ بھی ثابت کرنے سے عاجز رہے۔ پھر اس عجز نے انھیں ایک اور خطرناک مقام پر لاکھڑا کیا۔ وہ یہ کہ انھوں نے یہ دعویٰ کیا کہ ایک حرف کو باقی رکھنے اور بقیہ چھ کو ترک کرنے پر تمام امت مسلمہ کا اجماع منعقد ہو چکا تھا۔ لیکن وہ قائلین اس اجماع کی دلیل کہاں سے لاتے؟ لہذا اس اجماع کو ثابت کرتے کرتے وہ ایک اور کھائی میں جا گرے۔ یعنی یہ کہہ بیٹھے کہ حضرت عثمان بنیض نے جو مصاحف لکھوائے تھے، ان تمام مصاحف میں سے حروف ستہ کو ختم کر دیا گیا تھا اور صرف ایک ہی حرف باقی رکھا گیا تھا اور یہ سب کچھ پوری امت مسلمہ کے اجماع سے ہوا تھا۔

لیکن ہم ماقبل تفصیل اور مثالوں کے ساتھ ثابت کر چکے ہیں کہ آج بھی مصاحف عثمانیہ میں ساتوں حروف میں سے ایک ایک حرف باقی وجود ہے۔

قائلین اس قول کو اختیار کرنے اور خطرناک گھائیوں میں اترنے کا سبب بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اصل میں حضرت عثمان بنیض کے دور مبارک میں امت کے درمیان قراءت قرآن میں اختلاف ہونے لگا اور وہ اختلاف اس حد تک بڑھ گیا کہ وہ ایک دوسرے کو کافر کہنے لگے۔ اس موقع پر فتنے کا اندیشہ پیدا ہو گیا۔ لہذا تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اپنے خلیفہ حکیم حضرت عثمان بنیض کی قیادت میں اس مشکل کو ختم کرنے اور فتنے کو دبانے کا یہ حل نکالا کہ لوگوں کو ایک حرف پر جمع کر دیا جائے اور اسی ایک حرف کے مطابق مصاحف لکھوائے جائیں۔ اور اس کے علاوہ بقیہ حروف اور مصاحف منسوخ کو لٹا نظر انداز و متروک کر دیا جائے۔

یقیناً مذکورہ بالا استدلال کمزور اور احتجاج باطل ہے۔ اور یہی بات اختلاف کی تو مختلف حروف والا اختلاف و نزاع تو نبی کریم ﷺ کے عہد مبارک میں بھی ہوا تھا۔ لیکن نبی کریم ﷺ نے ان حروف کو برقرار رکھا اور اس مشکل کا یہ مثال حل یہ نکالا کہ لوگوں کو سمجھایا کہ وجوہ قراءت کا یہ اختلاف تمہارے لیے بلکہ (قیامت تک آنے والی) پوری امت مسلمہ کے لیے رحمت باری تعالیٰ ہے۔ اس کی مزید صراحت اس سے بھی ہوتی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے اللہ تعالیٰ سے حروف کی تعداد بڑھانے کی عافرنائی کی میری امت ایک ہی حرف پر پڑھنے کی طاقت نہیں رکھتی۔ (لہذا تعداد بڑھادی جائے۔ اس طرح وہ تعداد سات تک پہنچ گئی)۔

اور آپ تو جانتے ہیں کہ امت محمدیہ (علیٰ صاحبہا السلام واطحیہ) قیامت تک باقی رہے گی۔ اور اس چیز کی طاقت قیامت تک نہیں رکھے گی، جس کے بارے میں اس کے رسولِ معصومِ رحیم صلوات اللہ وسلامہ علیہ نے اعتراف فرمایا تھا۔ اور ہم اب اپنے زمانے میں بھی دیکھتے ہیں کہ مسلمانوں کے علاقوں میں ہی بہت سی زبانیں ایسی ہیں جو دوسرے علاقے میں رہنے والے مسلمان نہیں بول سکتے۔ لہذا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جو خیر القرون میں تھے وہ اس رحمتِ باری تعالیٰ کے اس دروازے کو کیسے بند کر سکتے تھے جس کو اللہ تعالیٰ نے امت محمدیہ (علیٰ صاحبہا السلام واطحیہ) پر کھولا تھا۔

پس قائلین نے اس قول کو اختیار کر کے ایک ایسا رخہ ڈال دیا جس کو دہر کرنا ممکن نہیں اور ایک ایسا شگاف پیدا کر دیا جس کو بھرنا ناممکن ہے۔ اور یہ ممکن ہو بھی کیسے سکتا ہے کیوں کہ ایسا ہو ہی نہیں سکتا کہ رسول اللہ ﷺ کے صحابہ رضی اللہ عنہم ان چھ حروف کو ضائع کرنے پر راضی ہو جائیں جن پر قرآن کریم نازل ہوا تھا۔ باوجود اس کے کہ ان حروف کا رخ یا رخ بھی ثابت نہیں بلکہ رسول اللہ ﷺ نے قول اور فعل دونوں کے ذریعے ان حروف کو برقرار رکھا ہے۔ لہذا کسی ایک کے بھی لیے جائز نہیں کہ وہ ان سات حروف میں سے کسی ایک حرف سے کسی کو نسیج کرے۔ کیوں کہ نبی کریم ﷺ نے دونوں اختلاف کرنے والوں کو فرمایا تھا: ”هَكَذَا أَنْزَلْتُ“۔ نیز حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کے سینے پر مارا بھی تھا جب انھوں نے قراءت کے اس اختلاف سے اشکال ظاہر کیا تھا۔ (یہ واقعہ ما قبل تفصیل سے گزر چکا ہے)۔

خلاصہ کلام یہ کہ ہم صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو اس سے بے داغ سمجھتے ہیں کہ وہ ان حروف کو ختم کرنے سے متعلق صرف سوچ و بچار کریں چہ جائیکہ وہ ان کو ضائع کرنے کا حکم دیں۔ اور اللہ کی پناہ! حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے بارے میں تو سوچا بھی نہیں جاسکتا کہ انھوں نے حروفِ سبجہ میں سے کسی حرف کو ساقط کرنے کا اقدام کیا ہو۔

اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی طرف اس معاملے کو کیسے منسوب کیا جاسکتا ہے، جب کہ یہ تو معروف و مشہور ہے کہ حضرت ابو بکر الصدیق رضی اللہ عنہ کے عہد میں جو مصاحف جمع کیے گئے تھے، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ان ہی مصاحف کی نقلیں تیار کروائیں تھیں۔ اور حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے دور میں جمع قرآن سے قبل بھی حروفِ سبجہ والا اختلاف پایا جاتا تھا۔ اس سے ثابت یہ ہوا کہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے دور میں جو مصاحف تھے، ان میں بھی تمام حروفِ سبجہ شامل تھے۔ کیا اس وقت یہ ضرورت پیش نہیں آئی تھی کہ چھ حروف کو چھوڑ کر کسی ایک حرف پر اکتفاء کر لیا جائے۔ لیکن اس موقع پر تو اتنا بھی ثابت نہیں ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عہد صدیقی میں منع ہونے والے مصاحف میں، چھ حروف تو درکنار کسی ایک حرف کو بھی ترک کیا ہو۔ اور اگر ایسا ہوا ہوتا تو ہم تک یہ بات (ترکِ حرف یا ترکِ حروف والی بات) تو اتر کے ساتھ پہنچتی کیوں کہ اس وقت تو اتر کے ساتھ پہنچنے کے بہت سے دواعی موجود تھے۔

اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ ایسا کر بھی کیسے سکتے تھے، جب کہ وہ جانتے تھے کہ رسول اللہ ﷺ نے اس قسم کے اختلاف کا اپنے زمانے میں یہ حل نکالا تھا، کہ لوگوں کو ان ساتوں حروف کے باقی رہنے اور قرآن کے ان حروف پر نازل ہونے سے متعلق سمجھایا تھا۔ اور ان حروف میں سے کسی ایک حرف پر پڑھنے یا تمام حروف پر پڑھنے سے منع نہیں فرمایا تھا۔ (یعنی اجازتِ عام تھی کہ جو چاہے ان ساتوں حروف میں سے پڑھے۔ کیوں کہ قرآن کریم کو سات حروف پر نازل کرنے کا مقصد تھا ہی امت پر آسانی کرنا۔ اگر اس میں بھی شرائط و قیود لگادی جاتیں کہ فلاں حرف پر پڑھو اور فلاں پر نہ پڑھو، تو یہ سہولتِ مشقت سے بدل جاتی۔)

پس حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے کیسے حروفِ ستہ کو ترک کر دیا اور کیسے امت نے ان سے اس امر پر موافقت کر لی اور کیسے اجماع



تاتم ہو گیا؟ اور اجماع کے معتقد ہونے کے بعد حروف سب کے تعیین میں علماء کا اختلاف کیسے ہو گیا؟ یعنی جب عہد عثمانی میں ایک حرف کو باقی رکھنے اور بقیہ حروف سہ کرنے پر امت کا اجماع ہو گیا تھا تو پھر علماء کے درمیان حروف سب کے معنی کی تعیین و تحدید سے متعلق اختلاف کیوں کر ہوا اور کیوں علماء کے اس سے متعلق اقوال کی تعداد چالیس تک پہنچی۔ حالانکہ اجماع مسلمانوں کے نزدیک حجت ہے۔ پس یہ وہ سوالات ہیں جو یقین کے چہرے سے شک کی ظلمتوں کو دور کر دیتے ہیں۔

اور اگر ہم فرض کر لیں کہ ایام خلافت عثمان بنی ہاشم میں پیدا ہونے والے نزاع کا فیصلہ حضرت عثمان بنی ہاشم نے لوگوں کو ایک حرف پر جمع کرنے اور بقیہ چھ حروف کو ترک کرنے سے کیا تھا، تو پھر یہاں ایک اور سوال پیدا ہوتا ہے، وہ یہ کہ حضرت عثمان بنی ہاشم نے ان چھ حروف کو بطور تاریخ ہی باقی کیوں نہ رکھا۔ کیوں کہ ضرورت تو صرف لوگوں کے مابین اختلاف دور کرنے کی تھی۔ اور ان چھ حروف کو تاریخ ہی سے ختم کر دینا یہ تو ضرورت سے اگلا درجہ ہے۔ حالانکہ قاعدہ ہے: "اَلْحَرْفُ وَرَوَّعَةٌ تُفَعَّدُ بِقَدَرِهَا"۔ نیز یہ حروف سہ نہ ہی تو تلاوت کے اعتبار سے منسوخ تھے اور نہ ہی حکم کے اعتبار سے۔ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی تو یہ عادت رہی ہے کہ انھوں نے ان آیات کی بھی تاریخ میں محفوظ رکھا ہے جن کی تلاوت اور حکم دونوں منسوخ ہو گئے تھے۔ نیز قراءات شاذہ کی حفاظت بھی فرمائی۔ پھر وہ ہم تک پہنچیں اور لکھی گئیں جس سے انھیں آج اور آج کے بعد تک کے لیے خلود ملا۔ بلکہ صحابہ رضی اللہ عنہم نے تو ہم تک احادیث منسوخہ بھی پہنچائیں۔ اور علماء نے احادیث موضوعہ کو بھی نقل کیا۔ اور ان سے ثابت اور ساقط ہونے والے احکام بھی بیان کیے۔ (تو یہ کیسے ممکن ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے ان حروف سہ کو جو قائلین کے بقول حضرت عثمان بنی ہاشم نے اپنے صحیفوں سے نکال دیے تھے، بالکل ہی بھلا دیا ہو اور ہم تک نہ پہنچایا ہو۔)

پس ہر وہ شخص جو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی دین کے ساتھ وابستگی، بنیادگی، قرآن کی حیت میں دفاع اور اس کی حفاظت پر حریص ہونے سے واقف ہوگا، وہ اس بات کو ناممکن سمجھے گا کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے قرآن مجید کو ایک حرف پر باقی رکھا ہو اور بقیہ چھ حروف کو ترک کر دیا ہو حالانکہ ان ساتوں حروف پر قرآن مجید نازل ہوا تھا۔ ماقبل بیان کردہ (سات حروف پر قرآن مجید کے نازل ہونے کے دلائل میں سے ساتویں دلیل اور) دس امور میں سے چھٹے امر (اور ساتویں امر) کا ایک بار پھر سے مطالعہ کریں تو یہ بات اور بھی واضح ہو جائے گی کہ حضرت عمر بنی ہاشم، حضرت ہشام، حضرت ابی بن کعب اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہم اور ان کے دونوں ساتھیوں کے ساتھ حروف سب پر تلاوت سے متعلق کیا واقعہ پیش آیا تھا۔ ان حضرات نے کیسے اس قراءت کو فوراً انکار کیا تھا جو انھوں رسول اللہ ﷺ سے نہ نہیں سنی تھی۔ پھر اس معاملے کو وہ حضرات کیسے رسول اللہ ﷺ کے پاس لے گئے تھے اور آپ ﷺ نے ان کی مشکل کو حل فرماتے ہوئے دونوں کو مصیب و محن قرار دیا تھا۔ اور بتایا تھا کہ "هَكَذَا اَنْوَلْتُ"۔ اور بے شک قرآن مجید سات حروف پر نازل کیا گیا ہے اور جو ان میں سے کسی ایک حرف کا بھی انکار کرے گا وہ سب کے انکار کے مترادف ہوگا۔ تاکہ صحابہ رضی اللہ عنہم کے درمیان آئندہ اس معاملے میں اختلاف نہ ہو۔ آپ ﷺ کا یہ فیصلہ ایسا ہے کہ اب اس کے بعد کسی خطیب کی تقریر کی کوئی ضرورت نہیں رہ جاتی۔ جیسا کہ عرب کی ضرب المثل ہے: "قَطَعَتْ جَهَنَّمَ قَوْلَ كَيْلِ خَطِيبٍ"

(از مترجم: عرب میں ایک واقعہ مشہور ہے کہ ایک بہت سمجھ دار عورت تھی۔ جس کا نام جہنمہ بنت حنفیہ تھا۔ ایک مرتبہ دو قبیلوں میں سے ایک نے دوسرے کے آدمی کو قتل کر دیا تو لوگ دونوں میں دیت کے ذریعے صلح کرانے کے لیے جمع ہوئے۔ لیکن جہیزہ نے اپنی



فراست سے جان لیا کہ مقتول کے درثناء میں سے کوئی وارث قاتل سے مل گیا ہے اور دیت پر صلح کے لیے لوگوں کو آمادہ کر کے لے آیا ہے۔ تو اس وقت اس نے صرف ایک جملے میں ساری صورت حال کو بیان کرتے ہوئے کہا: "إِنَّ الْقَاتِلَ قَدْ ظَفِرَ بِهِ بَعْضُ أَوْلِيَاءِ الْمُقْتُولِ" (یعنی مقتول کے کسی وارث نے قاتل کا کام تمام کر دیا۔) اس کے اس حیران و فیصلہ کن جملے کی شان میں کہا گیا: "قَطَعَتْ جَهَنَّمَ قَوْلَ كُلِّ حَاطِطٍ" یعنی جہیزہ نے ایسی بات کہہ دی کہ اب کسی خطیب کی تقریر کی ضرورت نہ رہی۔ اہل عرب یہ ضرب المثل ایسے شخص کے بارے میں بولتے ہیں جو لوگوں کے کسی معاملے کو اچانک کسی بات سے ختم اور صل کر دے۔

⑤ اس قول کے قائلین کا یہ بھی کہنا ہے کہ آج قراءات کے جتنے بھی اختلاف ہیں، وہ سب کے سب ایک ہی حرف کی طرف لوٹتے ہیں۔ نیز قراءات حاضرہ میں اختلافات کی بنیادی وجوہات میں سے ایک ہی کلمے میں معنی واحد کے ساتھ الفاظ مترادف کا پایا جانا اور مختلف قبائل کی لغات ہیں۔ جیسا کہ علامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب الاقان کی سینتیسویں نوع میں (مختلف قبائل کی لغات سے متعلق) بیان کیا ہے۔ ہم اس سے متعلق اسی بحث میں کسی اور مقام پر بیان کریں گے۔

اور ہمارے پاس ساتوں حروف کے بقاء پر دلیل مادی بھی موجود ہے۔ اور وہ ہے تیسیر و تخفیف کا باقی رہنا اور نسبت مسلمہ پر ادائگی میں سہولت کا باقی رہنا اور یہ حکمت حروف سببہ میں ہی ممکن ہے۔ پس اُس وقت سے اب تک ہمارا یہ ہی مشاہدہ ہے کہ مختلف قراءات ایک آسان راستہ ہے تمام مسلمانوں کے لیے خواہ وہ عرب ہوں یا غیر عرب۔ اور تمام تقریبات اللہ کے لیے ہیں اس کے فضل اور اس کی رحمت کے دوام پر اور اس تخفیف و تیسیر کے باقی رکھنے پر۔ اور اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے ان علما کے کام کی جنہوں نے اس مسئلے میں اجتہاد کیا اگرچہ خطا پر رہے اور مقصود تک نہ پہنچ سکے۔ اور مجتہد کے لیے دوا جردوں میں سے ایک اجرتو ہوتا ہی ہے خواہ وہ غلطی پر ہو۔ ہم اللہ ہی سے دعا کرتے ہیں توفیق و سداد کی لائین۔

دَسَوَالِ قَوْلِ ﴿﴾  
 عرب کے دائرہ سے باہر نہیں نکلتا۔ وہ سات لغات یہ ہیں: لغت قریش، لغت ہذیل، لغت ثقیف، لغت ہوازن، لغت کنانہ، لغت نجیم اور لغت یمن۔ یہ ساتوں لغات، عرب کی فصیح ترین لغات ہیں۔

قال بعضهم: یہ قول تمام اقوال میں اصح اور درستی کے قریب ترین ہے۔ یہ ہی وہ قول ہے جس پر اکثر علماء کا اعتماد ہے۔ امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کو صحیح قرار دیا ہے۔ علامہ ابہری رحمۃ اللہ علیہ نے اسے ہی اختیار کیا ہے۔ اور صاحب قاموس نے بھی اسی پر اٹھارہا کیا ہے۔

ابو عبید کہتے ہیں: اس قول میں میرا نہیں کہ ہر کلمہ سات لغات پر پڑھا جائے گا۔ بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ ساتوں لغات متفرق طور پر قرآن مجید میں پائی جاتی ہیں (یعنی قرآن کریم مجموعی طور پر اپنے کلمات میں عربوں کی فصیح ترین سات لغات کے دائرے سے نہیں نکلتا)۔ پس بعض الفاظ لغت قریش پر پڑھے جائیں گے اور بعض لغت ہذیل، لغت ہوازن اور لغت یمن وغیرہ پر پڑھے جائیں گے۔ لہذا بعض لغات کو بعض لغات پر فضیلت حاصل ہوگی کیوں کہ قرآن کریم کا زیادہ حصہ ان پر مشتمل ہوگا۔

فائدہ: ان سات قبائل کی تعیین میں اور آراء بھی بیان کی گئی ہیں۔

(مثلاً: امام ابو حاتم جستانی نے ان قبائل کے نام یہ بیان کیے ہیں: ۱۔ قریش، ۲۔ ہذیل، ۳۔ تیم الرباب، ۴۔ ازد، ۵۔ ربیعہ، ۶۔ ہوازن، ۷۔ سعد بن بکر۔ حافظ ابن عبدالبر نے درج ذیل سات کے نام شمار کروائے ہیں: ۱۔ ہذیل، ۲۔ کنانہ، ۳۔ قیس، ۴۔ ضبہ،

۵۔ تیم الرباب، ۶۔ اسد ابن خزیمہ، ۷۔ قریش۔ بحوالہ: فتح البخاری جلد ۹ صفحہ ۲۲۔ از مترجم)  
دسویں قول کو دو وجوہات کی بنا پر رد کیا جاسکتا ہے۔

دسویں قول کو رد کرنے کی پہلی وجہ • قول میں بیان کردہ سات قبائل کی لغات کے علاوہ اور بھی بہت سے قبائل کے الفاظ قرآن کریم میں موجود ہیں۔

- ① ﴿وَأَنْتُمْ سَيْدُونَ﴾ (النجم: ۶۱) لفظ ﴿سَيْدُونَ﴾ قبیلے کا ہے۔
  - ② ﴿إِنِّي أَرْسِي أَعْصَرَ حَمْرًا﴾ (یوسف: ۳۶) لفظ ﴿حَمْرًا﴾ اہل عمان کی لغت میں سے ہے۔ کیوں کہ وہ عنب کو خر کہتے ہیں۔ اور ان کا عنب کو خر کہنا حقیقتاً ہے مجاز انہیں۔
  - ③ ﴿أَنْتُمْ عُونَ بَعْلًا﴾ (الصفات: ۱۲۵) ﴿بَعْلًا﴾ یعنی ”رباً“ یہ لفظ قبیلہ ”ازدشنوۃ“ کی لغت کا ہے۔ (ازدشنوۃ کو ازدشنوۃ بھی کہا جاتا ہے۔ نصر بن ازد کی طرف منسوب ہے۔)
  - ④ ﴿لَا يَلْبِئْكُمْ مِنْ أَعْمَالِكُمْ شَيْئًا﴾ (الجزات: ۱۳) لفظ ﴿لَا يَلْبِئْكُمْ﴾ قبیلہ بنوعس کی لغت میں سے ہے اور معنی ہے ”لا ینقصکم“۔
  - ⑤ ﴿فَبَاءٌ وَبَعْضٌ عَلَى غَضِبٍ﴾ (البقرہ: ۹۰) لفظ ﴿فَبَاءٌ﴾ قبیلہ جرہم کی لغت میں سے ہے اور ”استوجبوا“ کے معنی میں ہے۔
  - ⑥ ﴿فَلَا رَفَثٌ﴾ (البقرہ: ۱۹۷) لفظ ﴿رَفَثٌ﴾ قبیلہ مذحج کی لغت میں سے ہے اور ”جماع“ کے معنی میں ہے۔
  - ⑦ ﴿فِيهِ ثَسْبِيُونٌ﴾ (انہل: ۱۰) لفظ ﴿ثَسْبِيُونٌ﴾ قبیلہ شعم کی لغت میں سے ہے اور ”تَرْعُونَ“ کے معنی میں ہے۔
- اس کے علاوہ اور بھی بہت سی مثالیں ہیں۔ اگر ان کا مطالعہ کرنا ہو تو علامہ جلال الدین رشیدی السیوطی کی کتاب ”الاتقان“ کی سینتیسویں نوع سے رجوع کریں۔

اس موقع پر آپ کے لیے علامہ ابو بکر الواسطی رشیدی کا وہ قول کافی ہوگا، جو انھوں نے قراءات عشرہ کے موضوع پر اپنی تالیف میں نقل کیا ہے۔ فرماتے ہیں: بے شک قرآن مجید میں چالیس لغات عربیہ موجود ہیں۔ اور وہ یہ ہیں:

۱۔ قریش	۱۱۔ ازدشنوۃ	۲۱۔ آنمار	۳۱۔ عامر بن صعصعہ
۲۔ ہذیل	۱۲۔ کندہ	۲۲۔ غسان	۳۲۔ اوس
۳۔ کنانہ	۱۳۔ تیمم	۲۳۔ مذحج	۳۳۔ مزینہ
۴۔ شعم	۱۴۔ حمیر	۲۴۔ خزاعہ	۳۴۔ ثقیف
۵۔ خزرج	۱۵۔ مذین	۲۵۔ غطفان	۳۵۔ جذام
۶۔ اشعر	۱۶۔ نغم	۲۶۔ سبا	۳۶۔ بکئی
۷۔ نمیر	۱۷۔ سعد العسیرۃ	۲۷۔ عثمان	۳۷۔ عذرہ
۸۔ قیس عیلان	۱۸۔ خضر موت	۲۸۔ بنو ضیفہ	۳۸۔ ہوازن
۹۔ جرہم	۱۹۔ سدوس	۲۹۔ ثعلب	۳۹۔ نمر
۱۰۔ یمن	۲۰۔ عمالقہ	۳۰۔ طئی	۴۰۔ یمامہ

اس بات سے آپ کی توجہ ہرگز نہ ہٹنے پائے کہ لغت قریشی جملہ لغات عرب کی قائمہ و محافظ تھی، دوسری لغات کے جن الفاظ میں اہل قریش مٹھاس پاتے اور ان کے ذوق میں وہ الفاظ لطیف و فصیح ہوتے اولاً قریش انھیں اخذ کرتے اور پھر ان کی اقتداء میں باقی سب لوگ بھی انھیں اپنے استعمال میں لانے لگتے تھے، اس اعتبار سے لغت قریشی میں ان سب لغات کا تشخص موجود ہے اور اس بناء پر یہ کہنا درست ہے کہ "لسان قریشی ہی عمومی لسان عربی ہے اور اسی میں قرآن نازل ہوا ہے۔" جیسا کہ ما قبل گزر چکا۔ پس اسے یاد رکھیے۔ اور اللہ ہی کا کام ہے ہم سب کو ہدایت دینا۔

دوسریں قول کو رد کرنے کی دوسری وجہ: ابو سعید رضی اللہ عنہ نے اس قول کی جو توجیہ بیان کی ہے وہ اس کا تقاضا کرتی ہے کہ قرآن کریم کے بعض الفاظ لغت قریشی سے ہوں اور بعض لغت ہذیل سے اور اسی طرح مختلف لغات سے بعض بعض الفاظ ہوں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ایک شخص کے لیے قرآن کریم کے اس لفظ کو پڑھنا تو ممکن ہوگا جو اس کی اپنی لغت سے ہے اور جو لفظ لغت غیر سے ہے اسے پڑھنا اُس کے لیے ناممکن یا مشکل ہوگا۔ حالاں کہ قرآن کریم کو سات حروف پر نازل کرنے کی حکمت اُمت کے لیے تیسیر و سہولت تھی، جو اس صورت میں فوت ہوگئی۔ لہذا اس قول کے باطل ہونے کی ایک وجہ تو یہ ہوئی۔ اور دوسری وجہ یہ کہ اس توجیہ کو تسلیم کرنے سے ان روایات سابقہ کی مخالفت لازم آتی ہے جن میں بیان ہوا ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا قراءت کے حوالے سے آپس میں اختلاف ہوا ہے۔ کیوں کہ وہ روایات تقاضا کرتی ہیں کہ جس لفظ میں اختلاف ہوا تھا وہ ایک ہی لفظ تھا۔ جیسا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت ہشام رضی اللہ عنہ کا اختلاف ہوا تھا سورۃ الفرقان میں اور حضرت عبد اللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا اپنے ساتھی سے سورۃ حم سجدہ میں۔ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں مختلفین کو درست قرار دیا تھا حالاں کہ دونوں قریشی تھے۔

**گیارہواں قول** "حروف سب سے، عرب کے ایک خاص قبیلے، جس کا نام "مضر" ہے، کی سات لغات مراد ہیں۔ اور وہ قرآن کریم میں متفرق طور پر موجود ہیں۔ اور مضر کے سات قبائل یہ ہیں: قریش، کنانہ، اسد، ہذیل، تمیم، ضبہ، قیس" یہ قول بھی اسی دلیل سے رد ہو جاتا ہے جس سے ہم نے سابقہ قول کو رد کیا تھا۔ بلکہ اس قول کا بطلان تو اور بھی زیادہ آسان ہے، کیوں کہ یہ سابقہ قول کی نسبت زیادہ خاص ہے اور سابقہ قول کو ہم نے خاص اور محدود ہونے کی وجہ سے ہی باطل قرار دیا تھا۔ اور دوسری وجہ یہ کہ مضر کے بعض قبائل شواذ ہیں۔ اور قرآن کریم جو کہ اللہ کی کتاب ہے، ان شواذ سے مبرا اور منزہ ہے۔ شواذ کی مثالیں ذیل میں موجود ہیں۔

① قبیلہ قیس والے مؤنث کی ضمیر مخاطب "ک" کو "شین" سے بدلتے ہیں۔ ان کے اس لہجے کا نام "کَشْكَشَةُ قَيْسٍ" ہے۔ اس لہجے کے مطابق، وہ اللہ تعالیٰ کے قول: ﴿قَدْ جَعَلْنَا لَكَ سَرِيًّا﴾ (حریم: ۲۳) کو ﴿قَدْ جَعَلْنَا لَكَ سَرِيًّا سَرِيًّا﴾ پڑھیں گے۔

② قبیلہ تمیم والے "سین" کو "تاء" سے بدلتے ہیں۔ ان کے اس لہجے کا نام "مَمْتَمَةُ تَمِيمٍ" ہے۔ اس لہجے کے مطابق، وہ "الناس" کو "النات" پڑھیں گے۔

(ان مثالوں کے بعد یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ) قرآن کریم نے اس طرح کی لغات کو محفوظ نہیں کیا۔

"محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ"

## بارہویں قول سے چالیسویں قول تک

”حروف سب سے مراد قرآنی آیات کی سات اقسام ہیں۔ پھر اس قول کے قائلین میں ان سات اقسام کی تعین و تحدید اور اسلوب تعبیر میں اختلاف ہونے کی وجہ سے، ان کی آراء کی تعداد چالیس اقوال تک پہنچ گئی ہے، جو کہ درج ذیل ہے۔ پس ان میں سے بعض کہتے ہیں:

- ⑫ وہ سات اقسام یہ ہیں: امر، نہی، حلال، حرام، حکم، تشابہ، أمثال۔
  - ⑬ وہ سات اقسام یہ ہیں: وعدہ، وعید، حلال، حرام، مواعظ، أمثال، احتجاج۔
  - ⑭ وہ سات اقسام یہ ہیں: حکم، تشابہ، ناسخ، منسوخ، خصوص، عموم، قصص۔
  - ⑮ ان میں سے بعض کا کہنا ہے کہ قرآن مجید کے الفاظ ان سات اقسام سے خالی نہیں (۱) لفظ عام ہو اور اس سے عام ہی مراد لیا گیا ہو۔ (۲) لفظ خاص ہو اور اس سے خاص ہی مراد لیا گیا ہو۔ (۳) لفظ عام ہو اور اس سے خاص مراد لیا گیا ہو۔ (۴) لفظ خاص ہو اور اس سے عام مراد لیا گیا ہو۔ (۵) وہ لفظ جو اپنے شان نزول ہی کے سبب اپنی تاویل سے مستثنیٰ ہو گیا ہو۔ (۶) ایسا لفظ جس کا معنی علماء ہی سمجھتے ہو (۷) ایسا لفظ جس کی مراد علمائے راشدین کے علاوہ کسی اور کو معلوم نہیں ہوتی۔
  - ⑯ ایک قول کے مطابق: اظہار، ربوبیت، اثبات و وحدانیت، تعظیم الوہیہ، خدا کی عبادت گزاری کرنا، شرک کی باتوں سے بچنا، ثواب کی جانب رغبت دلانا اور عذاب و سزا سے ڈرانا۔
  - ⑰ ایک قول کے مطابق وہ اصناف و انواع یہ ہیں: مطلق، مقید، عام، خاص، نص، مؤذل، ناسخ و منسوخ، استثناء اور اس کی اقسام
  - ⑱ ایک قول کے مطابق حروف سب سے یہ انواع و اصناف مراد ہیں: حذف، صلہ، تقدیم، تاخیر، استعارہ، تکرار، کنایہ، حقیقت، مجاز و مجمل، مفسر اور ظاہر و غیب
- ان اقوال کے علاوہ اور بھی اقوال ہیں جو ای طرز پر (مختصراً) یا سابقہ طرز پر (تفصیلاً) بیان ہوئے ہیں۔ اور ان کی تعداد چالیس تک پہنچ جاتی ہے۔

## اقوال اخیرہ کا اجمالی رد

- آخر میں مذکورہ (یعنی بارہویں سے چالیسویں قول تک) تمام اقوال مردود ہیں۔ ان کا اجمالی بیان ذیل میں درج ہے۔
- ① حروف سب سے متعلق احادیث، ان اقوال اخیرہ پر منطبق نہیں ہوتیں۔ کیوں کہ یہ اصناف (مثلاً امر و نہی، وعدہ و وعید، عام و خاص، حلال و حرام وغیرہ) جو ان اقوال میں بیان ہوئی ہیں ان کا قراءت کے اختلاف سے کوئی تعلق نہیں۔ جب کہ احادیث میں جس اختلاف کا ذکر ہے اس کا تعلق قراءت، نطق و تلفظ کے ساتھ ہے نہ کہ ان اصناف و انواع کے ساتھ جو ان آراء میں بیان

- ہوئی ہیں۔ اگر آپ مزید تفصیل چاہتے ہیں تو ما قبل بیان کردہ دس امور میں سے آٹھوں امر پڑھ لیجیے۔
- ① ان اقوال کی کوئی صحیح سند موجود نہیں ہے کہ جس کے ذریعے حروف سب سے حصہ بردالات ہو سکے۔ اور ہم ایسی رائے کو قبول ہی نہیں کرتے جو غیر مدلل ہو اور اس کی تائید کوئی حجت بھی موجود نہ ہو۔
- ② حروف سب سے قرآن کریم کو نازل فرمانے میں رحیم و کریم شارع علیہ السلام کی طرف سے وسعت مقصود تھی۔ لیکن ان اقوال اخیرہ میں مذکورہ اصناف و انواع میں ایسی کوئی وسعت نہیں پائی جاتی۔
- ③ جب ہم ان اقوال اخیرہ میں سے بعض آراء کو دیکھتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ وہ سات سے زیادہ اصناف و انواع پر مشتمل ہیں۔ اب ان اصناف و انواع کا سات سے زیادہ ہونا یا تو گنتی میں غلطی واقع ہونے کی وجہ سے ہوا ہے یا پھر ان آراء کو اختیار کرنے والے صاحبان اس سوچ و نظریہ سے متاثر ہیں کہ سات کے عدد سے حقیقی عدد سات مراد نہیں ہے بلکہ یہ کنایہ ہے کثرت سے۔ اور آپ پہلے جان چکے ہیں کہ لفظ سب سے حقیقی عدد "سات" مراد نہ لینا بھی خطا ہے۔ اگر آپ چاہیں تو دس امور میں دوسرے امر کی طرف رجوع کر سکتے ہیں۔

⑤ ان اقوال اخیرہ کے تحت مذکورہ آراء و اصناف میں سے اکثر ایک دوسرے میں متداخل ہیں اور ایک دوسرے کے بہت زیادہ مشابہ ہیں۔ اسی وجہ سے ان میں سے بہت سے اقوال کو علیحدہ علیحدہ مستقل قول شمار کرنا قریب المجال ہے۔

علامہ جلال الدین السيوطي ريشيہ اپنی کتاب الاتقان میں علامہ الشرف المرسي ريشيہ سے نقل کرتے ہیں۔ علامہ مرسي ريشيہ نے فرمایا:

"ان (اقوال اخیرہ کے تحت مذکورہ) وجوہ میں سے اکثر متداخل ہیں اور نہ ان کا مستند ہونا معلوم ہوتا ہے۔ اور نہ ہی پتہ لگتا ہے کہ وہ کس سے منقول ہیں۔ نہ مجھے اس بات کا علم ہو سکا کہ ان لوگوں میں سے ہر ایک نے حروف سب سے اپنے بیان کیے ہوئے معنوں کے ساتھ کیوں خاص کیا؟ کیوں کہ وہ سب معانی قرآن میں موجود ہیں۔ اور میری سمجھ میں نہیں آتا کہ پھر تخصیص کے کیا معنی ہوں گے؟ اور اس کے علاوہ میں ان کے حقیقی معنوں کو سمجھنے سے بھی قاصر رہا ہوں۔ اور میں ان میں سے اکثر باتوں کو حضرت عمر رضی اللہ عنہما اور حضرت ہشام بن حکیم رضی اللہ عنہما کی اس روایت سے خلاف پاتا ہوں جو صحیح میں موجود ہے۔ کیوں کہ ان دونوں صاحبوں نے قرآن کی تفسیر اور احکام میں ہرگز اختلاف نہیں کیا ہے بلکہ ان کا اختلاف محض حروف کی قراءت میں منحصر ہے۔ اور لطف یہ ہے کہ بہت سے عام لوگوں نے اس روایت: "قرآن کا نزول سات حروف پر ہوا ہے" سے، یہ گمان کیا ہے کہ اس سے سات قراءتیں مراد ہیں۔ حالانکہ یہ ایک بہت بڑا اور نادانی کا خیال ہے۔"

## اصل موضوع پر وارد ہونے والے اعتراضات اور ان کے جوابات

(اب سے پہلے تک کسی خاص قول یا مذہب پر واردہ اعتراضات اور ان کے جوابات بیان کیے جا رہے تھے۔ لیکن اب نفس موضوع یا اصل موضوع یعنی "حروف سب سے پر نزول قرآن" پر وارد ہونے والے چار شبہات اور ان کے جوابات بیان کیے جائیں گے۔ از مترجم)



﴿سُئِلَ الْعِيسَىٰ فِي عُلُومِ الْقُرْآنِ جِلْدٌ ①﴾

اسلام کے دشمن مسلمانوں سے تعداد میں زیادہ ہیں اور وہ (اسلام و مسلمین کو اذیت و نقصان پہنچانے کے لیے) ہر وقت چوکنے اور بیدار مغمز رہتے ہیں۔ جب کہ مسلمان جہالت کی بناء پر (مذہبی امور میں اعتراض کر کے) اپنے ہی پیارے مذہب اسلام اور آئینت مسلمہ کو اذیت پہنچاتے ہیں۔ اور یہ اذیت اُس اذیت سے کہیں زیادہ ہوتی ہے جو غیروں (دشمنوں) کی طرف سے پہنچتی ہے۔ کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے:

لَا يَنْبُلُغُ الْأَعْدَاءُ مِنْ جَاهِلٍ مَا يَنْبُلُغُ الْجَاهِلُ مِنَ نَفْسِهِ

تحقیق ہم اپنوں اور اذیتوں کی طرف سے تو ہمت اور شہامت سنتے رہتے ہیں۔ پس ایسے حالات میں لازم ہے کہ ہمارے پاس جو علم کے انوار اور دلائل و حجوتوں کے انبار ہیں، وہ آپ کے سامنے پیش کریں تاکہ شہامت و تہمتوں کا اندھیرا چھٹ جائے۔

﴿وَاللَّهُ يَقُولُ الْحَقَّ وَهُوَ يَهْدِي السَّبِيلَ ②﴾ (الاحزاب: ۴)

”اور اللہ تعالیٰ ہی حق بات فرماتا ہے اور وہ ہی سیدھا راستہ دکھاتا ہے۔“

پہلا شبہ ﴿سُئِلَ عَنْ حُرُوفِ الْقُرْآنِ كَرِيمٍ كَمَا نَزَلَ مِنْ عِنْدِ اللَّهِ لَوْ جَدُّ وَافِيهِ اخْتِلَافًا كَثِيرًا ③﴾ (النساء: ۸۲)

خود قرآن کریم اپنے اندر اختلاف، پائے جانے کی نفی کرتے ہوئے کہتا ہے:

﴿أَفَلَا يَتَنَبَّهُونَ الْقُرْآنَ - وَ لَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللَّهِ لَوَجَدُوا فِيهِ اخْتِلَافًا كَثِيرًا ④﴾ (النساء: ۸۲)

”کیا غور نہیں کرتے قرآن میں، اگر یہ (کلام) اللہ کے سوا کسی اور کا ہوتا تو ضرور پاتے اس میں بہت زیادہ اختلاف۔“

پس یہ ایک تناقض ہے اور ہمیں نہیں معلوم ان دونوں (قرآن وحدیث) میں سے کون صادق ہے؟“

پہلے شبہ کا جواب ﴿اس شبہ کو رفع و دفع کرنے کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ ان احادیث سے جو اختلاف ثابت ہوتا ہے وہ اس اختلاف کے علاوہ ہے جس کی نفی قرآن کریم نے کی ہے۔ لہذا قرآن اور حدیث دونوں ہی صادق ہیں۔﴾

صاق ہیں۔

یعنی احادیث شریفہ سے جو اختلاف ثابت ہوتا ہے اس کا تعلق ایک محدود دائرے میں رہتے ہوئے قرآن کریم کے الفاظ کو بولنے اور ان کی ادائیگی کے طریقوں کے ساتھ ہے، جو کہ سات حروف سے تجاوز نہیں کرتے۔ اور ان سات حروف کے لیے بھی شرط ہے کہ وہ نبی کریم ﷺ سے حاصل کردہ ہوں۔ لہذا احادیث سے ثابت ہونے والا اختلاف تویح کے معنی میں ہوا۔ اور یہی بات قرآن کریم کی، تو قرآن کریم اپنے الفاظ کے تلفظ اور ادائیگی میں تویح کے موجود ہوتے ہوئے، اپنے معانی اور تعلیمات میں تناقض اور تدافع کی نفی کرتا ہے۔ (کیوں کہ تناقض و تدافع کی نفی اور چیز ہے جب کہ تلفظ و ادائیگی میں اختلاف کی نفی اور چیز ہے۔)

یعنی قرآن مجید کا سات حروف پر نازل ہونا قرآن کریم کے معانی، اس کی تعلیمات اور مقاصد میں کسی بھی قسم کے تناقض، تخالذ (باہمی بے ربطی)، تضاد یا تدافع (باہمی مزاحمت) کو لازم نہیں کرتا۔ بلکہ قرآن کریم تو قراءات کے مختلف طرق اور متعدد انواع ادا کے باوجود ایک مسلسل اور ایسی زنجیر کی شکل کتاب ہے جس کی کڑیاں آپس میں جڑی ہوئی ہوں۔ اس کی تمام سورتیں اور آیات محکم ہیں۔ اس کی ابتداء انتہاء کے ساتھ اور انتہاء ابتداء کے ساتھ ٹٹی ہوئی ہے۔ (یعنی وہ یکجا اور یک جان کلام ہے اس کے معانی و مفہام)

”محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ“

اور تعلیمات میں کسی قسم کا اختلاف نہیں۔

ہم اس موقع پر محقق ابن الجری (ابوالخیر شمس الدین محمد بن محمد بن علی بن یوسف الجزری۔ پیدائش: ۲۶ نومبر ۱۳۵۰ عیسوی۔ وفات: ۲۰ دسمبر ۱۳۲۹ عیسوی) کا معمولی سے تصرف کے بعد، ایک بہت ہی عمدہ کلام (ان کی کتاب ”النشر فی القراءات العشر“ سے) نقل کرتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں:

”ہم نے قراءات کے اختلاف میں غور و فکر کیا تو ہم نے اس کو تین حال صورتوں سے خالی نہیں پایا۔“

یا تو اختلاف صرف لفظ میں ہوگا یعنی معنی میں نہیں ہوگا (یہ پہلی صورت ہے)۔ یا لفظ اور معنی دونوں میں ہوگا۔ اگر لفظ اور معنی دونوں میں ہو تو پھر دو حال سے خالی نہیں۔ دونوں اختلافوں کوئی واحد میں جمع کرنے کا جواز موجود ہوگا (یہ دوسری صورت ہے)۔ یا جواز موجود نہیں ہوگا لیکن وہ دونوں متفق ہو گئے ہوں، کسی اور ایسی وجہ سے جو تضاد کا تقاضا نہ کرتی ہو (یہ تیسری صورت ہے)۔ تینوں احوال صورتوں کی مثالیں ذیل میں ملاحظہ کیجئے۔

① پہلی صورت کی مثالیں • تمام ایسی قراءتیں جن میں محض الفاظ کا اختلاف ہے۔ ان کی مثالیں یہ ہیں: الضراط، علیہم، یؤدک، القدس، بحسب وغیرہ۔

② دوسری صورت کی مثالیں • پہلی مثال: سورة الفاتحہ میں ہے ﴿مَلِكٌ يَوْمَ الدِّينِ﴾ اس آیت میں لفظ ”ملك“ میں دو قراءتیں ہیں۔ پہلی قراءت ”مَلِكٌ“ بمعنی ”مالک اور دوسری قراءت ”مَلِكٌ“ بمعنی ”بادشاہ ہے۔ (لفظ اور معنی دونوں میں اختلاف پایا جا رہا ہے لیکن ان کے اجتماع کا جواز بھی موجود ہے، وہ یہ کہ) دونوں قراءتوں میں مراد ایک ہی ذات ہے یعنی اللہ تعالیٰ۔ کیوں کہ اللہ تعالیٰ ہی روز جزا کا مالک بھی ہے اور بادشاہ بھی۔

دوسری مثال: ﴿وَ أَنْظِرْ إِلَى الْعِظَاہِ كَيْفَ تُنْشِئُهَا﴾ (البقرہ: ۲۵۹)

”اور (اب اپنے گدھے کی) ہڈیوں کو دیکھو کہ ہم کس طرح انھیں اٹھاتے ہیں۔“

پہلی قراءت ”زاء“ کے ساتھ یعنی ﴿نُنْشِئُهَا﴾ بمعنی ”ہم ان کو اٹھائیں گے“ اور دوسری قراءت ”راء“ یعنی ﴿نُنْشِئُهَا﴾ بمعنی ”ہم زندہ کریں گے۔“ خواہ ”زاء“ ہو یا ”راء“ مراد ہڈیاں ہی ہیں یعنی اللہ تعالیٰ ہی ان ہڈیوں کو اٹھاتے ہیں اور زندہ کرتے ہیں۔ یعنی ان میں سے بعض کو بعض کے ساتھ ملاتے ہیں۔ یہاں تک کہ وہ (جان دار) مکمل ہو جاتا ہے۔ پس (دونوں قراءتوں میں لفظ اور معنی دونوں کا اختلاف پایا جا رہا ہے لیکن ان کے اجتماع کا جواز بھی موجود ہے، وہ یہ کہ) دونوں میں اللہ تعالیٰ کو ضامن ٹھہرایا جا رہا ہے۔

③ تیسری صورت کی مثالیں • پہلی مثال: ﴿و ظَلَمُوا أَنفُسَهُمْ قَدْ كَتَبُوا﴾ (یوسف: ۱۱)

”اور کافر لوگ یہ سمجھنے لگے کہ انھیں جھوٹی دھمکیاں دی گئی تھیں۔“

ایک قراءت میں تخفیف کے ساتھ یعنی ﴿كُذِّبُوا﴾ بمعنی للمفعول اور ایک قراءت میں تشدید کے ساتھ یعنی ﴿كُذِّبُوا﴾ تشدید کی صورت میں معنی ہوگا: ”رسولوں نے یقین کر لیا کہ ان کی قوم نے انھیں جھٹلایا ہے۔“ اور تخفیف کی صورت میں معنی ہوگا: ”قوم کو یہ وہم ہوا کہ رسولوں نے (معاذ اللہ) ان کے ساتھ جھوٹ بولا تھا۔ یعنی اُن کو عذاب کے آنے سے متعلق جو پیشین گوئی کے طور پر خبریں دی تھیں وہ جھوٹی تھیں (العیاذ باللہ)۔“ پس پہلی قراءت (تشدید والی صورت) میں ”ظن“ یقین کے معنی میں ہوگا اور تینوں ضمائر رسولوں کی

مناہل العرفان فی علوم القرآن: جلد ۱ ﴿وَإِنْ كَانَ مَكْرَهُمْ لِلتَّرْوُلِ مِنْهُ الْجِبَالُ﴾ (ابراہیم: ۴۶)

طرف راجع ہوں گی۔ اور دوسری قراءت: (تخفیف والی صورت) میں "ظن" شک اور توہم کے معنی میں ہوگا اور تینوں ضمائر مُؤَسِّلُ، إِلَیْہُمْ یعنی تو م کی طرف راجع ہوں گی۔

دوسری مثال: ﴿وَإِنْ كَانَ مَكْرَهُمْ لِلتَّرْوُلِ مِنْهُ الْجِبَالُ﴾ (ابراہیم: ۴۶)

"چاہے ان کی چالیں ایسی کیوں نہ ہوں جن سے پہاڑ بھی اپنی جگہ سے ہل جائیں۔"

"التَّرْوُلُ" میں ایک قراءت پہلے لام کے فتح اور دوسرے کے رفع کے ساتھ ہے، یعنی: "التَّرْوُلُ"۔ اس قراءت کے مطابق "وَإِنْ كَانَ مَكْرَهُمْ" میں "ان" مخفف من التقلید ہوگا، یعنی:

((وَإِنْ كَانَ مَكْرَهُمْ كَامِلُ الشَّدَّةِ تَقْتُلُ بِسَبَبِهِ الْجِبَالُ الرَّاسِيَاتُ مِنْ مَوَاضِعِهَا))،

"ان کا کمر شدت میں ایسا کال ہے کہ اس کی وجہ سے زمین میں جمے ہوئے پہاڑ بھی اپنی جگہ سے اکھڑ جائیں۔"

اور دوسری قراءت میں پہلے لام کے کسرہ اور دوسرے کے فتح کے ساتھ ہے۔ اس قراءت کے مطابق "ان" نافیہ ہوگا، یعنی:

((مَا كَانَ مَكْرَهُمْ وَإِنْ تَعَاظَمَ وَتَفَاخَرُوا لِيُرْوُلُوا مِنْهُ أَمْرٌ مَحْتَمِلٌ لِلتَّرْوُلِ وَدِينُ الْإِسْلَامِ))،

"اگر چہ ان کا کمر بہت بڑا اور سنگین تھا (لیکن) ایسا نہیں تھا کہ اس سے حضرت محمد ﷺ کا معاملہ دین اسلام ختم و زائل ہو جاتا۔"

پہلی قراءت میں جبال سے پہاڑ حقیقتاً مراد ہوں گے جب کہ دوسری قراءت میں مجازاً۔"

محقق ابن جزری رحمۃ اللہ علیہ نے یہ بھی فرمایا:

((فليس في شيء من القرآن تنافٍ ولا تضادٌ ولا تناقضٌ. وكلُّ ما صحَّ عن النبي ﷺ من ذلك، فقد وجب

وقبوله، ولم يسع أحدًا من الامة ردّه، ولزم الایمان به، وانه كلّه منزل من عند الله، اذ كلُّ قراءۃ منها مع

الأخرى بمنزلة الآية مع الآية، يجب الایمان بها كلها، واتباع ما تضمنته علماء و عملاً، ولا يجوز ترك موجب

إحداها لاجل الأخرى ظناً أن هذا تعارض))،

"قرآن کریم میں تھوڑا سا بھی تعارض، تضاد یا تناقض نہیں ہے۔ اور اس (قراءت کے باب) میں نبی اکرم ﷺ سے جو کچھ

ثابت ہے وہ بالکل صحیح ہے۔ لہذا اس (حروف سبعہ) کو قبول کرنا اور اس پر ایمان لانا واجب و لازم ہے۔ اور اُمت میں

سے کسی کے لیے گنجائش نہیں کہ وہ اس (حروف سبعہ) کا انکار کرے۔ اور بے شک تمام (حروف) اللہ تعالیٰ کی جانب

سے نازل کردہ ہیں۔ لہذا ایک قراءت کی مثال دوسری قراءت کے ساتھ ایسے ہے جیسے ایک آیت کے ساتھ دوسری

آیت۔ پس ان تمام (قراءتوں) پر ایمان لازم ہوگا۔ اور ان سے ثابت ہونے والے احکام کا علمنا اور عملاً اتباع بھی لازم

ہوگا۔ اور دونوں قراءتوں میں سے کسی ایک کے موجب کو بھی، یہ سوچتے ہوئے کہ، یہ تعارض ہے، چھوڑنا جائز نہ ہوگا۔"

حضرت عبدالرحمن بن سعور رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اسی طرف اشارہ فرمایا ہے۔ فرماتے ہیں:

((لَا تَخْتَلِفُوا فِي الْقُرْآنِ وَلَا تَتَنَازَعُوا فِيهِ، فَإِنَّهُ لَا يَخْتَلِفُ وَلَا يَتَنَاسَطُ، أَلَا تَرَوْنَ أَنَّ شَرِيْعَةَ الْإِسْلَامِ فِيهِ

وَاحِدَةٌ، حُدُودُهَا وَقِيْرَاطُهَا وَأَمْرُ اللَّهِ فِيهَا وَاحِدٌ، لَوْ كَانَ مِنَ الْمُخْتَلِفِينَ حَرْفٌ يَأْمُرُ بِشَيْءٍ يَنْهَى عَنْهُ الْآخَرُ، كَانَ

ذَلِكَ الْإِخْتِلَافَ، وَلَكِنَّهُ جَامِعٌ ذَلِكَ كُلُّهُ، وَمَنْ قَرَأَ عَلَى قِرَاءَةٍ فَلَا يَدْعُهَا رَغْبَةً عَنْهَا، فَإِنَّهُ مَنْ كَفَرَ بِحَرْفٍ

مِنَهُ كَفَّرَ بِهِ كَلِمَةً))۔

”قرآن کریم میں اختلاف و جھگڑا نہ کرو کیوں کہ اس (کی آیات) میں کوئی تعارض یا تاقط (ایک دوسرے کو باہمی ساقط کرنا) نہیں۔ کیا تم نہیں دیکھتے کہ شریعتِ اسلام ایک ہے۔ اس کی مقررہ حدود اور قراءات اور اللہ تعالیٰ کے احکام ایک ہیں۔ اگر دو (مختلف) حرف ہوتے (یعنی حکم کے اعتبار سے دو مختلف حرف ہوتے) اور یہ تو ہم مائل پڑھ چکے ہیں کہ قراءات کا جتنا بھی اختلاف ہے، وہ لفظی ہے، معنوی نہیں۔) تو ایک حرف کسی کام کو کرنے کا حکم دیتا اور دوسرا حرف اسی کام سے منع کرتا۔ (پھر اس طرح) یہ اختلاف شمار ہوتا۔ لیکن یہ قرآن تمام قراءتوں کو جامع ہے۔ پس جو شخص ایک حرف پڑھے، وہ اس کو ترک کر کے دوسرے کی طرف نہ جائے یعنی کسی وجہ (حرف) کا انکار نہ کرے کیوں کہ جس نے (سات حرف میں سے کسی) ایک حرف کا انکار کیا، گویا اُس نے تمام (حرف) کا انکار کیا۔“

**دوسرا شبہ** ﴿﴾ قراءات میں اس اختلاف کی وجہ سے قرآن کریم میں شک و ریب پیدا ہوتا ہے، خاص طور پر جب ہم ان روایات کا اختیار دیا گیا ہے۔ جیسا کہ حضرت ابوبکرؓ کی حدیث میں ہے:

((كلها شاف كاف ما لم تختتم آية عذاب برحمة أو آية رحمة بعذاب نحو قولك: تعال وأقبل وهلم

واذهب وأسرع وعجل))۔

”یہ سارے حروف ثانی و کالی ہیں لیکن عذاب کی آیت کو رحمت والی آیت سے اور رحمت والی آیت کو عذاب کی آیت کے ساتھ ختم نہ کیجیے۔ جیسے: تعال، اقبل، هلم، اذهب، اسرع اور عجل۔“

مندرجہ بالا حدیث مسند احمد کی روایت ہے اور اس کی اسناد بھی جید ہے۔ اور اسی کے مثل حضرت ابی بن کعبؓ کی حدیث ہے۔ اور ان سب سے بڑھ کر وہ روایت ہے جو ”فضائل ابی عبید“ میں ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے ایک آدمی کو پڑھایا:

﴿إِنَّ شَجَرَةَ الرَّقُومِ ۖ طَعَامُ الْأَيْتِيمِ ۖ﴾ (الذخاں: ۳۳-۳۴)

اُس آدمی نے ”طَعَامُ الْأَيْتِيمِ“ کی بجائے ”طَعَامُ الْيَتِيمِ“ پڑھا۔ حضرت نے اُسے دوبارہ پڑھایا۔ لیکن اس کی زبان پر یہ الفاظ جاری نہ ہو سکے۔ حضرت نے اُسے فرمایا: کیا تو ”طَعَامُ الْفَاجِرِ“ پڑھ سکتا ہے۔ اُس نے کہا: ہاں۔ حضرت نے فرمایا: ٹھیک ہے تو ”طَعَامُ الْفَاجِرِ“ ہی پڑھ لے۔

**دوسرے شبہ کا جواب** ﴿﴾ قراءات (حرف) کا اختلاف قرآن مجید میں کسی قسم کا شک و ریب پیدا نہیں کرتا کیوں کہ تمام حرف منزل من اللہ ہیں۔ اور رہی بات اُن روایات کی جن پر اس شبہ کی بنیاد ہے۔

تو ہم یہ تسلیم نہیں کرتے کہ ان روایات سے یہ مفہوم ثابت ہو رہا ہو کہ کوئی بھی شخص اپنی مرضی سے مترادف الفاظ یا معنی میں تضاد نہ پائے جانے والے الفاظ کے ساتھ تبدیلی کر سکتا ہے۔ بلکہ اس طرح کی تمام روایات سے تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو وسعت دی تھی، خاص طور پر وحی کے ابتدائی دور میں، کہ وہ قرآن مجید کو مترادف الفاظ کے ساتھ پڑھ لیا کریں لیکن وہ تمام مترادف، جو منزل من اللہ تھے۔ انھیں بھی اللہ تعالیٰ نے حضرت جبرئیلؑ کے واسطے سے قلب محمدؐ پر اتارا تھا۔ اور رسول اللہ

﴿مناہل العسرافان فی علوم القرآن: جلد ۱﴾  
 ﷺ نے وہ الفاظ خاص طور پر پڑھ کر سنائے تھے اور صحابہ کرم رضی اللہ عنہم نے آپ ﷺ سے سن لیے تھے۔ پھر بعد اللہ تعالیٰ نے جن الفاظ کو چاہا منسوخ فرمادیا اور جس کو چاہا باقی رکھ لیا۔ منسوخ کرنے یا باقی رکھنے میں جو حکمتیں تھیں ان کا بیان ان شاء اللہ نسخ کے بیان میں آئے گا۔

ان تمام حروف کے منزل من اللہ ہونے کی (پہلی واضح) دلیل حضور اکرم ﷺ کا پختلین سے یہ فرمانا: "هَكَذَا أَنْزَلْتُ" ہے۔ اور (دوسری دلیل) پختلین میں سے ہر ایک کا اپنے ساتھی سے یہ کہنا: "اقْرَأْنِيهَا رَسُولُ اللَّهِ ﷺ" ہے۔ اور (تیسری دلیل) جب رسول اللہ ﷺ سے کافروں کی طرف سے قرآن مجید میں تبدیلی کا مطالبہ کیا گیا تو اللہ تعالیٰ نے جواباً فرمایا:

﴿قُلْ مَا يَكُونُ لِي أَنْ أُبَيِّنَ لَكُمْ مِنْ تِلْكَ آيَاتِي نَفْسِي ۚ إِنَّ آيَاتِي إِلَّا مَا يُؤْمَرُ إِلَيَّ ۚ إِنِّي أَخَافُ أَنْ عَصَيْتُ رَبِّي عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيمٍ﴾ (نہس: ۱۵)

"(اے نبی ﷺ!) ان سے کہہ دیجیے کہ مجھے یہ حق نہیں پہنچتا کہ میں اس میں اپنی طرف سے کوئی تبدیلی کروں۔ میں تو کسی اور چیز کی نہیں، صرف اُس کی وحی کی پیروی کرتا ہوں جو مجھ پر نازل کی جاتی ہے۔ اگر کبھی میں اپنے رب کی نافرمانی کر بیٹھوں تو مجھے ایک زبردست دن کے عذاب کا خوف ہے۔"

اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے کلام کے بعد کسی اور کلام کی ضرورت نہیں رہتی۔ اور اسی طرح اُمت کا اجماع ہے کہ قرآن کریم کے لفظ میں کسی بشر کا کوئی عمل دخل نہیں ہے، نہ ہی تو اسلوب کے پہلو سے اور نہ ہی اس کے الفاظ اور ان کی ادائیگی کے قوانین کے پہلو سے۔ پس جو شخص اس اجماع سے باہر نکلے گا اور اہل ایمان کے راستے سے ہٹ کر چلے گا تو اللہ تعالیٰ اُسے ان ہی کے حوالے کر دے گا جن کی طرف وہ جانا چاہتا ہے اور پھر اس کا ٹھکانہ جہنم ہوگا جو کہ بہت ہی بُرا ٹھکانہ ہے۔

ہم نے اس آیت (قل ما یكون لی) میں دیکھا کہ قرآن میں تبدیلی و تحاوی کے حوالے سے کتنے سخت الفاظ میں وعید اور عذاب سے ڈرایا گیا ہے۔ تو حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کو کیا ہوا اور وہ کیسے کسی شخص کو اپنی مرضی سے اس کی اجازت دے سکتے ہیں کہ وہ ایک لفظ کی بجائے دوسرا لفظ پڑھ لے۔ اگر آپ چاہیں تو مزید وضاحت کے لیے ماقبل بیان کردہ دس اُمور میں سے چوتھا اور ساتواں اُمردوبارہ پڑھ لیجیے۔

اور ہی بات اس روایت کی جس میں حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے ﴿إِنْ شِئْتُمْ الرَّزْقُور﴾ ﴿طَعَامُهُ الْإِنْتِجُور﴾ (الذخاں: ۳۳-۳۴) میں "الایحہ" کی بجائے "الفاجر" پڑھنے کی اجازت دی تھی۔ تو وہ روایت اس پر دلالت کرتی ہے کہ حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ سے دو روایتیں سنی ہوں گی۔ اور جن انھوں نے دیکھا کہ اس شخص کے لیے ایک قراءت کے ساتھ پڑھنا مشکل ہو رہا ہے تو آپ رضی اللہ عنہ نے اُسے دوسری روایت کے مطابق "الفاجر" پڑھا دیا۔ کیوں کہ دونوں ہی منزل من اللہ تھیں۔

اور اسی طرح حضرت ابوبکرہ رضی اللہ عنہ والی حدیث ہے کہ وہ بھی اس پر دلالت نہیں کرتی کہ جس مرضی لفظ کو چاہو مترادف لفظ یا غیر متضاد معنی والے لفظ کے ساتھ تبدیل کر لو، جیسا کہ معترض کو وہم ہوا ہے۔ بلکہ یہ حدیث اور اس جیسی تمام احادیث "باب الامثال" میں سے ہیں، جن میں رسول اللہ ﷺ نے ان حروف کی مثالیں دی ہیں جن پر قرآن کریم نازل ہوا ہے۔ تاکہ یہ بات واضح

منائل العرفان فی علوم القرآن: جلد ①

ہو جائے کہ یہ حروف اپنے اختلاف کے باوجود ایک ہی مفہوم رکھتے ہیں۔ ان میں کوئی تناقض یا تضاد نہیں ہے اور نہ ہی کسی ایک میں ایسا معنی ہے جو دوسرے کے معنی کی نفی کرے۔ جیسا کہ رحمت، جو کہ عذاب کے خلاف اور اس کی ضد ہے۔ اس وجہ سے یہ تمام احادیث اس بات کو مزید پختہ کر دیتی ہیں کہ تمام حروف منزل من اللہ ہی ہیں۔

﴿وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللَّهِ لَوَجَدُوا فِيهِ اخْتِلَافًا كَثِيرًا﴾ (النساء: ۸۲)

اس موقع پر ایک اور دلیل ہے جسے صاحب التبیان نے اسی طرح کے مقام پر ذکر کیا ہے۔ فرماتے ہیں:

”نبی کریم ﷺ نے حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہما کو ایک دعا سکھائی جس میں ایک جملہ تھا: ”وَنَبِيَّتِكَ الَّذِي أَوْسَلْت“ جب حضرت براء رضی اللہ عنہ نے یہ دعا حضور اکرم ﷺ کو سنائی تو اس میں یوں پڑھا ”وَرَسُولِكَ الَّذِي أَوْسَلْت“ تو نبی کریم ﷺ نے ان سے موافقت نہ فرمائی اور فرمایا: ”لَا. وَنَبِيَّتِكَ الَّذِي أَوْسَلْت“ یعنی ”وَرَسُولِكَ“ نہ پڑھو بلکہ ”وَنَبِيَّتِكَ“ ہی پڑھو۔ پس آپ ﷺ نے لفظ نبی کی جگہ لفظ رسول پڑھنے سے منع فرمایا حالانکہ دونوں لفظ درست (اور حق) ہیں۔ کیوں کہ رسول اللہ ﷺ ایک ہی وقت میں رسول بھی ہیں اور نبی بھی۔“

پھر اس کے بعد صاحب التبیان فرماتے ہیں: ”پس (اتنے واضح دلائل و شواہد کے باوجود) جاہل اور غافل لوگوں نے یہ

کیسے کہہ دیا کہ:

((إِنَّهُ عَلَيْهِ الصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ كَانَ مِجْزُؤَانٌ يُوضَعُ فِي الْقُرْآنِ الْكَرِيمِ مَكَانَ عَزِيْزٍ حَكِيْمٍ، عَفُوْرٍ رَّحِيْمٍ، أَوْ سَمِيْعٍ عَلِيْمٍ. وَهُوَ يَمْتَنَعُ مِنْ ذَلِكَ فِي دُعَاءِ لَيْسَ قُرْآنًا، وَاللَّهُ يَقُولُ مُخْبِرًا عَنِ نَبِيِّهِ ﷺ: ﴿مَا يَكُوْنُ لِي أَنْ أُوْبِدَ لَهُ مِنْ تَلْقَائِيْ نَفْسِيْ﴾ (پس: ۱۵) وَلَا تَبْدِيْلَ أَكْتُمُونَ وَضِعَ كَلِمَةً مَكَانَ أُخْرَى)).

”حضور اکرم ﷺ نے قرآن کریم میں ”عَزِيْزٍ حَكِيْمٍ“ کی جگہ ”عَفُوْرٍ رَّحِيْمٍ“ یا ”سَمِيْعٍ عَلِيْمٍ“ پڑھنے کی اجازت دے رکھی تھی۔ حالانکہ وہ (ﷺ) تو دعاء، جو کہ قرآن نہیں ہے، میں بھی لفظ تبدیل کرنے سے منع فرما رہے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ نے بھی اپنے نبی ﷺ کی طرف سے خبر دیتے ہوئے فرمایا: مجھے یہ حق نہیں پہنچتا کہ میں اس میں اپنی طرف سے کوئی تبدیلی کروں۔ (پس: ۱۵) اور ایک کلمے کی جگہ دوسرے کلمے کو رکھنے سے بڑی تبدیلی کوئی نہیں۔“

یہ بات تو طے ہے کہ قرآن کریم ایک لغت یعنی لغت قریش پر نازل ہوا۔ اور اگر حروف سبعہ پر نزول قرآن کو تیسرا شبہ تسلیم کیا جائے تو اس طے شدہ بات کی نفی ہوتی ہے۔ نیز حروف سبعہ پر نزول قرآن کو تسلیم کرنا اس وحدت و یکجہتی کو بھی زائل کرتا ہے جو ایک زبان پر قرآن کریم نازل فرمانے کے سبب لازم آتی تھی۔

تیسرے شبہ کا جواب: حروف سبعہ پر نزول قرآن کو تسلیم کرنے سے، نہ ہی تو کوئی منافات لازم آتی ہے اور نہ ہی وحدت و یکجہتی زائل ہوتی ہے۔ کیوں کہ وہ وجوہ (حروف) سبعہ جن کے موافق قرآن کریم نازل ہوا ہے یہ سب لغت قریش ہی کے اندر واقع ہیں۔ جس کا پس منظر یہ ہے کہ قبل از نزول وحی و قرآن، قریش عرب کی تمام لغات کی چھان بین کرتے تھے اور بازار ہائے عرب، ہوا سم عرب، تاریخی واقعات عرب نیز جرم و عمرہ کے مواقع پر جائزہ لیا کرتے تھے اور ہر قبیلے کی لغات میں سے جو الفاظ انھیں چاشنی دار لگتے انہیں اخذ کر لیا کرتے اور پھر مزید تہذیب و تنقیح کے بعد ان کا اپنی زبان



میں استعمال شروع کر دیا کرتے تھے۔ اس طرح لغت قریش، قبائل عرب کی جملہ لغات میں سے پسندیدہ و منتخب الفاظ کا مرکز و اجتماعی نقطہ قرار پائی۔

پھر حکیم و عظیم (اللہ تعالیٰ) کی حکمت نے چاہا کہ اہل عرب پر قرآن کریم کے آفتاب کو قریش کے اُفق سے طلوع کرے اور جس آسمان پر شمس قرآن کا منظر خوشگوار دکھائی دے، وہ آسمان قریش ہی ہو۔ الغرض اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کے لیے قریش ہی کی لغت کو اختیار کیا، کیونکہ اسی لغت نے ان کو تمام عرب کی سرداری بخشی تھی۔ اور اہل عرب نے قریش کی جانب اپنے چہروں کو متوجہ کیا ہوا تھا۔ پس اللہ تعالیٰ اُن سے اسی لسانِ عام سے مخاطب ہوا۔ تاکہ عرب کے متفرق قبائل کو یکجا کیا جاسکے اور بکھرے ہوئے موتیوں کو ایک دھاگے میں پرو دیا جاسکے۔ پس اس طرح وہ حکمتِ رشیدہ پوری ہوئی، جس نے ان کو لغت کے راستے سے اعجازِ بیانی کے درجے پر فائز کیا اور وہ لغت خود بھی فصیح اللغات کے درجے پر پہنچی۔ اور ایسی زبانِ عطا کی جس کے سامنے عرب کی تمام زبانیں مطیع ہو گئیں اور اس میں شامل ہو کر اس کا حصہ بن گئیں۔

اگر اللہ تعالیٰ لغت قریش کے علاوہ کسی اور لغت میں قرآن کریم نازل فرماتے تو یہ عرب میں عصیت اور انتشار کو جنم دیتا۔ اور ہر قبیلہ اپنی لغت کو قبائل دیگر کی لغات پر ترجیح دیتا اور اسی کو بہتر گردانتا، جس کے نتیجے میں کبھی بھی عرب ایک لغت پر مجتمع نہ ہو پاتے۔ بلکہ لغت قریش کے علاوہ پر نازل ہونے سے منکرین کا شبہ اور افتراء مزید زور پکڑ جاتا کہ یہ قرآن سحر و کلماتِ وغیرہ ہے۔ نیز اس بات کو مد نظر رکھتے ہوئے بھی لغت قریش میں قرآن کریم کو نازل فرمایا کہ اگر قرآن کریم اُن کے اپنے دروازے کی بجائے کسی اور کے دروازے سے داخل ہوتا تو وہ اس قرآن کے ذریعے فیصلے کرنے کی استطاعت نہ رکھتے اور نہ ہی اُن دقیق امتیازات کا ادراک حاصل کر پاتے جو قرآن کریم اور احادیثِ نبویہ کے مابین پائے جاتے ہیں۔ جن کو وہ اعجاز کے طور پر محسوس کرتے تھے جیسا کہ انھوں نے اس آیت کے نزول کے وقت محسوس کیا:

﴿إِنَّ رَبِّي لَطِيفٌ لِّمَا يَشَاءُ ۗ إِنَّهُ هُوَ الْعَلِيمُ الْحَكِيمُ﴾ (یوسف: ۱۰۰)

چوتھا شبہ: جن حروفِ سبعہ پر قرآن کریم نازل ہوا، اُن سے مراد وہ سات قراءات ہیں جو قرآن کے نزول کے نزدیک مشہور و معروف سات اماموں سے منقول ہیں۔

چوتھے شبہ کا جواب: یہ وہ شبہ ہے جو اکثر عوام الناس کی طرف سے پیش کیا جاتا ہے۔ دراصل یہ شبہ اُن لوگوں کو پیدا ہوتا ہے جنھوں نے قرآن اور حدیث کے علوم سے کچھ تموز اساحتہ بھی حاصل نہیں کیا ہوتا۔ پس حروفِ سبعہ کا وہ معنی جو یہ معترضین سمجھتے، دو دو جوہات کی برابری درست نہیں۔

پہلی وجہ: وہ حروفِ سبعہ جن پر قرآن کریم نازل ہوا، اُن سات قراءتوں سے جو کہ سات اماموں (قراء) کی طرف منسوب ہیں، عوامِ مطلق کے طور پر اعم ہیں۔ اور یہ مشہور قراءاتِ سبعہ خصوصاً مطلق کے طور پر حروفِ سبعہ (جن پر قرآن نازل ہوا) سے اخص ہیں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے جن دو وجوہِ سبعہ پر اپنی کتاب کو نازل فرمایا، وہ وجوہِ شامل ہیں ہر اُس وجہ کو جس کو نبی کریم ﷺ نے پڑھا اور اپنے صحابہ رضی اللہ عنہم کو پڑھایا، اور ان قراءاتِ سبعہ کو بھی شامل ہیں جو منسوب ہیں قراءت کے سات اماموں کی طرف۔ اور اسی طرح یہ وجوہ سات سے اوپر (یعنی) دس تک اور دس کے مابعد قراءات کو بھی شامل ہیں۔ نیز یہ وجوہ تو قرآن کریم



کے اُس حصے کو بھی شامل ہیں جو منسوخ ہو گیا اور ان تمام قراء میں سے کسی ایک تک بھی نہیں پہنچا۔ اسی وجہ سے مذہب مختار میں یہ بات پہلے ہی واضح کر دی گئی تھی کہ سب قراءتوں کو یعنی صحیح کو بھی اور منکر کو بھی اور شاذ کو بھی شامل ہیں۔ جیسا کہ ماقبل بھی بیان ہوا ہے۔

جس وقت حضور اکرم ﷺ نے حروف سبعہ پر نزول قرآن والی حدیث اِرشاد فرمائی تھی، اُس وقت نہ ہی دوسری وجہ تھی تو ان سات اماموں کی تخلیق ہوئی تھی اور نہ ہی ان کا کوئی وجود تھا۔ اور یہ بات (عقلاً بھی) محال ہے کہ نبی

کریم ﷺ اپنے اور اپنے صحابہ رضی اللہ عنہم پر یہ فرض کر دیں کہ قرآن کو ان حروف سبعہ کے ساتھ، اُس وقت تک نہ پڑھا جائے جب تک کہ وہ سات امام پیدا نہ ہو جائیں اور یہ معلوم نہ ہو جائے کہ اُن میں سے کس نے کون سی قراءت کو اختیار کیا ہے۔ باوجودیکہ حضور اکرم ﷺ کے دور مبارک اور ان سات اماموں کے دور میں متعدد صدیوں کا فاصلہ ہے۔ نیز وہ سات امام ہوں یا ان کے علاوہ کوئی اور ہو، الغرض

جو بھی ہو وہ قراءت کو نبی کریم ﷺ سے، یا تو صحابہ رضی اللہ عنہم کے واسطے سے اخذ کرے گا یا پھر صحابہ رضی اللہ عنہم سے اخذ کرنے والوں سے اخذ کرے گا۔ (پس اس طرح تو ”دور“ لازم آتا ہے کہ صحابہ کرام اُن سات اماموں کی قراءت کے مطابق تلاوت قرآن کریں اور وہ سات امام صحابہ یا تابعین سے سیکھ کر قراءت کی سات اقسام بیان کریں۔) پس یہ شبہ بھی باطل ہوا، کیوں کہ یہ دور باطل کو مستلزم ہے۔

اور یہ شبہ یا قول اس امر کو بھی مستلزم ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا قول: ”إِنَّ هَذَا الْقُرْآنَ أَنْزَلَ عَلَى سَبْعَةِ أَحْرَفٍ“ اُس وقت تک غیر نافذ العمل اور غاری عن الفاعلہ ہو، جب تک اُن سات معروف قراء کی ولادت نہ ہو جائے اور ان سے قراءت کا علم اخذ نہ کر لیا جائے۔ اور یہ شبہ اس واسطے بھی باطل ہے کہ اس کو تسلیم کرنے سے اُس قراءت کی تکذیب لازم آتی ہے جو نبی کریم ﷺ، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعین رضی اللہ عنہم سے مروی ہے، کیوں کہ (انھوں نے یہ قراءت) ان سات مشہور قراء کی ولادت سے پہلے بیان کر دی تھیں۔

محقق ابن جزری رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ”اگر (یہ) حدیث سات مشہور (قراء) کی قراءتوں یا ان کے علاوہ کسی اور سات قراء (پر محمول ہو اور ان) کی طرف پھرے کہ جو تابعین رضی اللہ عنہم کے بعد پیدا ہوئے، تو یہ بات اس طرف پہنچاتی ہے کہ یہ حدیث ان سات قراء کے پیدا ہونے تک فائدے سے خالی ہو کہ (پھر ان کی پیدائش کے بعد) ان سے قراءت کو لیا جائے۔ اور اس (نامعقول) بات کی طرف بھی پہنچاتی ہے کہ کسی صحابی کو جائز نہ ہو کہ وہ (قرآن) پڑھے مگر اسی قراءت کے ساتھ کہ (جس کے بارے میں یہ) معلوم ہے کہ یہ سات قراء جب پیدا ہوں گے اور تعلیم حاصل کریں گے تو اس قراءت کو اختیار کریں گے۔ کیا یہ بات باطل نہیں؟ کیوں کہ قراءت کے حاصل کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ اس کو کسی ثقہ امام سے لفظ بہ لفظ، امام در امام حاصل کیا جائے، یہاں تک کہ (سند کا سلسلہ) نبی کریم ﷺ تک پہنچ جائے۔“

تمت بالخیر



## قرآن کریم کی مکی اور مدنی آیات یا سورتوں کے بیان میں

اس باب میں ہماری غرض تفصیل و دلائل کے ساتھ یہ بیان کرنا نہیں ہوگی کہ کون سی آیات دوسریں مکی ہیں اور کون سی مدنی۔ کیوں کہ یہ ایک مستقل موضوع ہے اور اس موضوع پر علیحدہ مستقل تالیفات موجود ہیں۔ بلکہ ایک بہت بڑی جماعت نے اس موضوع پر تالیفات کی ہیں جیسا کہ امام مکی اور علامہ العزالدربنی رحمہما اللہ تعالیٰ وغیرہ کی تالیفات۔

ہم تو اس باب میں (یہ نو چیزیں بیان کرنا) کافی سمجھتے ہیں: (۱) مکی اور مدنی کے اصطلاحی معانی و مقابیم، (۲) مکی اور مدنی سورتوں کی شناخت کے قواعد، (۳) مکی اور مدنی آیات تک رسائی کا طریقہ، (۴) ان ضوابط کا بیان جن کی مدد سے مکی یا مدنی کو پہچانا جاسکے، (۵) مکی یا مدنی یا ان میں مختلف فیہ سورتوں کے نام و تعداد، (۶) مکی اور مدنی سورتوں کی انواع، (۷) ایسی وجوہ جو مکی اور مدنی دونوں قسم کی سورتوں یا آیتوں سے متعلق ہیں، (۸) مکی اور مدنی سورتوں یا آیتوں کے درمیان فروق، (۹) بعض طعنہ زنیوں کی طرف سے وارد ہونے والے اعتراضات اور ان کے جوابات۔

مکی اور مدنی سورتوں کے بارے میں علمائے کرام کے ہاں تین ① مکی اور مدنی کے اصطلاحی معانی

① پہلی اصطلاح مکی آیات وہ ہیں جو مکہ مکرمہ میں نازل ہوئیں اگرچہ ہجرت کے بعد ہی ہوئی ہوں۔ اور مدنی وہ ہیں جو مدینہ میں نازل ہوئیں۔ مکہ میں شہر مکہ کے وہ نواحی علاقے بھی داخل ہیں جن میں نبی کریم ﷺ نے تھوڑی دیر کے لیے قیام فرمایا تھا مثلاً منیٰ، عرفات اور حدیبیہ۔ اور اسی طرح مدینہ میں اس کے نواحی علاقے مثلاً میدان بدر اور احد وغیرہ بھی داخل ہیں۔ آپ دیکھ سکتے ہیں کہ اس تقسیم میں مکان نزول کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ لیکن اصطلاح کی اس قسم پر یہ اعتراض ہو سکتا ہے کہ یہ ضابطہ اور حاضر نہیں ہے کیوں کہ یہ ان آیات کو شامل نہیں جو مکہ، مدینہ اور ان کے نواحی علاقوں کے علاوہ میں نازل ہوئیں۔ جیسا کہ سورۃ التوبہ میں اللہ سبحانہ و تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿لَوْ كَانَ عَرَضًا قَرِيبًا وَسَفَرًا قَاصِدًا لَاتَّبَعُوكَ﴾ (التوبہ: ۳۲)

کیوں کہ یہ آیت تبوک میں نازل ہوئی تھی۔ اور سورۃ الزخرف میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَسُئِلَ مَنْ أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رُسُلِنَا...﴾ (الزخرف: ۳۵)

کیوں کہ یہ آیت معراج کی رات بیت المقدس میں نازل ہوئی تھی۔ اس طرح ثابت ہوا کہ اس تقسیم میں عدم ضبط پایا گیا اور اس میں کوئی شک نہیں کہ کسی تقسیم میں عدم ضبط ایک ایسا عیب ہے جو تقسیم کے مقصود اوّل میں خلل انداز ہوتا ہے۔ اور کسی بھی تقسیم کا مقصود اوّل ہوتا ہے ضبط اور حصر۔

## منائل العرفان فی علوم القرآن: جلد ۱

① دوسری اصطلاح ● کئی آیات وہ ہیں جن میں اہل مکہ سے خطاب کیا گیا ہو اور مدنی وہ ہیں جن میں اہل مدینہ سے خطاب کیا گیا ہو۔ ”یا“ وہ آیات جن کی ابتدا میں ”یا ایہا الناس“ کے الفاظ ہیں وہ مکئی ہیں اور جن کی ابتدا میں ”یا ایہا الذین امنوا“ ہے وہ مدنی ہیں۔ کیوں کہ اہل مکہ پر غرغلاب تھا اس لیے انھیں ”یا ایہا الناس“ سے مخاطب کیا، اگرچہ کفار کے علاوہ لوگ بھی ان داخل تھے۔ اور اہل مدینہ پر ایمان کا غلبہ تھا اس لیے انھیں ”یا ایہا الذین امنوا“ سے مخاطب کیا، اگرچہ اہل ایمان کے علاوہ لوگ بھی ان میں داخل تھے۔ اور بعض علماء نے ”یا ایہا الناس“ کے ساتھ ”یا بنی آدم“ کے الفاظ بھی ذکر کیے ہیں۔ جیسا کہ علامہ ابو عبید کتاب فضائل القرآن میں میمون بن مهران سے نقل کرتے ہیں کہ جن آیات میں ”یا ایہا الناس“ یا ”یا بنی آدم“ کے الفاظ ہیں وہ مکئی ہیں اور جن میں ”یا ایہا الذین امنوا“ کے الفاظ ہیں وہ مدنی ہیں۔

اس تقسیم میں مخاطبین کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ لیکن اس پر دو اعتراض وارد ہوتے ہیں۔ پہلا یہ کہ یہ تقسیم ضابطہ اور حاضر نہیں ہے۔ کیوں کہ قرآن کریم میں ایسی آیات بھی ہیں جن میں نہ ہی تو ”یا ایہا الذین امنوا“ ہے اور نہ ہی ”یا ایہا الناس“ یا ”یا بنی آدم“ جیسا کہ سورۃ الاحزاب میں ہے:

﴿يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ اتَّقِ اللَّهَ وَلَا تُطِعِ الْكَافِرِينَ وَالْمُنَافِقِينَ... الخ﴾ (الاحزاب: ۱)

اسی طرح سورۃ المنافقون میں ہے:

﴿وَإِذَا جَاءَكَ الْمُنَافِقُونَ قَالُوا لَنْ نَبْرَهُنَّ إِنَّكَ لَسَمُوعٌ لَّهُمْ... الخ﴾ (المنافقون: ۱)

اور دوسرا اعتراض یہ ہے کہ یہ تقسیم مذکورہ دونوں صیغوں کے تمام موارد میں غیر مطلق ہے۔ کیوں کہ بعض مدنی آیات ایسی بھی ہیں جن میں ”یا ایہا الناس“ کا صیغہ ہے۔ اور بعض مکئی آیات بھی ایسی ہیں جن میں ”یا ایہا الذین امنوا“ کے الفاظ ہیں۔ اس کی پہلی مثال سورۃ النساء میں ہے:

﴿يَا أَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّكُمُ... الخ﴾ (النساء: ۱)

یہ آیت مدنی ہے۔ اسی طرح سورۃ البقرہ مدنی ہے لیکن اس کی آیت نمبر ۲۱ میں ہے یا ایہا الناس کے الفاظ ہیں۔ دیکھیے:

﴿يَا أَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوا رَبَّكُمُ﴾ (البقرہ: ۲۱)

اور دوسری مثال سورۃ الحج کی ہے کہ یہ مکئی سورت ہے اور اس کی آخری سے پہلی آیت ہے:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا ارْكَعُوا وَاسْجُدُوا... الخ﴾ (الحج: ۷۷)

اس اصطلاح کے بارے میں بعض مفسرین کا کہنا ہے کہ اگر اس اصطلاح یا قول کو کلی الاطلاق لیا جائے یعنی یوں کہا جائے کہ ہر وہ سورت یا آیت جس میں یا ایہا الناس کے الفاظ ہوں وہ مکئی ہوگی تو اس میں نظر ہے۔ کیوں کہ سورۃ البقرہ مدنی ہے لیکن اس میں ﴿يَا أَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوا رَبَّكُمُ﴾ ہے۔

اسی طرح اور بھی مثالیں ہیں جن میں سے کچھ جو ماقبل بیان ہوئی ہیں۔ لیکن اگر یہ کہا جائے کہ زیادہ تر ایسا ہی ہوتا ہے تو یہ صحیح بات ہے۔ لیکن میں علامہ عبد العظیم الزرقانی (رحمۃ اللہ علیہ) کہتا ہوں کہ کسی بات کا اپنی ذات کے اعتبار سے صحیح ہونا تقسیم کے صحیح ہونے کو لازم

## مناہل العرفان فی علوم القرآن: جلد ①

نہیں کرتا، کیوں کہ تقسیم کا تقاضا یہ ہے کہ وہ ضابطہ اور حاصر ہو۔ اور اگر کوئی تقسیم اپنے افراد کو جمع کرنے والی تو ہو لیکن غالبیتِ مراد کی قید سے مستفید ہو تو ایسی صورت میں ضبط اور حصر متحقق نہ ہونے کی وجہ سے معیوب رہتی ہے۔ جیسا کہ کہا جاتا ہے: "المراد لا یدفع الا یراد۔" ③

**تیسری اصطلاح** • یہ ایک مشہور اصطلاح ہے۔ کئی آیات وہ ہیں جو نبی کریم ﷺ کی مدینہ منورہ کی طرف ہجرت سے پہلے نازل ہوئیں، خواہ وہ مکہ میں نازل ہوئی ہوں یا مکہ کے علاوہ کسی اور جگہ یا شہر میں۔ جب کہ مدنی وہ ہیں جو ہجرتِ نبوی کے بعد نازل ہوئی ہوں خواہ مکہ میں ہوئی ہوں۔

آپ دیکھ سکتے ہیں کہ اس اصطلاح میں زمانہ نزول کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ اور یہ تقسیم بالکل صحیح و سلیم ہے۔ کیوں کہ یہ ضابطہ و حاصر بھی ہے اور نظرِ دہمی۔ اور اس میں سابقہ اختلافات میں سے کوئی اختلاف یا اعتراض بھی وارد نہیں ہوتا۔ اسی وجہ سے علمائے کرام نے اس پر اعتماد کیا ہے اور یہ تقسیم ان کے مابین مقبول و مشہور ہے۔ اسی تقسیم کی بنا پر آیت: ﴿هُوَ الَّذِي أَنزَلَ لَكُمُ الذِّكْرَ وَلَئِن لَّمْ يَكُن لَّكُم رَحْمَةٌ لِّنَزَلِ عَلَيْكُمُ بَعْثَاتٌ مِّنَ السَّمَاءِ مَوَاطِنًا﴾ (المائدہ: ۳۰) کو مدنی کہنا درست ہے حالانکہ یہ ججہ الوداع کے موقع پر جمعے کے دن میدانِ عرفات (جو مکہ کے نواح میں ہے) میں نازل ہوئی تھی۔ اور اسی طرح آیت: ﴿وَإِن لِّلَّهِ يَاسْرٌ لِّمَنْ يُرِيدُ أَن يُنزِلَ الذِّكْرَ عَلَىٰ مَن يَشَاءُ﴾ (النساء: ۵۸) ہے۔ کیوں کہ یہ مدنی آیت ہے حالانکہ یہ مکہ مکرمہ میں بالکل جو فوج کعبہ میں فتح مکہ والے سال میں نازل ہوئی تھی۔ اور اسی طرح وہ آیات جو حضور اکرم ﷺ کے اَسْفَار میں نازل ہوئیں وہ بھی اس اصطلاح سے خارج نہیں جیسا کہ سورۃ الانفال کی ابتدائی آیات میدانِ بدر میں نازل ہوئیں لیکن وہ کئی نہیں بلکہ مدنی ہیں (حالانکہ بدر مکہ مکرمہ کے قریب ہے، ان کو کئی ہونا چاہیے تھا۔ لیکن) اس مشہور اصطلاح کے مطابق یہ مدنی آیات ہیں۔

② **مکی اور مدنی آیات کی شناخت کے فوائد**

مکی اور مدنی آیات کو جاننے کے فوائد میں سے ایک فائدہ ناخ اور منسوخ کی تیز ہے جب کہ دو یا دو سے زیادہ آیات کسی ایک موضوع میں وارد ہو جائیں۔ اور ان آیات میں سے کسی ایک آیت پر حکم منحصر ہو۔ پھر اس دوران یہ معلوم ہو جائے کہ ان مختلف آیات میں سے کون سی مکی ہے اور کون سی مدنی تو ہم مدنی کے مقتضی پر فیصلہ کر دیں گے کیوں کہ مدنی مکی سے مؤخر ہے اس لیے مدنی ناخ ہوئی مکی کے لیے۔

کئی اور مدنی کی معرفت کا ایک فائدہ شریعت کی تاریخ اور تدریج کی عمومی معرفت بھی ہے۔ اس حکمت یا فائدے کی تفصیل مکی اور مدنی آیات کے فردق والی بحث میں آئے گی۔

کئی اور مدنی کی معرفت کا ایک فائدہ قرآن کریم اور اس کے ہم تک تغیر اور تخریف سے سالم پہنچنے کے عمل پر ایمان و یقین میں پختگی ہے۔ نیز اس سے اس بات پر بھی دلالت ہوتی ہے کہ اس وقت کے مسلمانوں نے کس قدر اہتمام کے ساتھ ہم تک قرآن کو پونچھیا کہ یہاں تک وضاحت کر دی کہ کون سی آیات ہجرت سے پہلے نازل ہوئیں اور کون سی بعد میں، کون سی حضر میں نازل ہوئیں اور کون سی سفر میں، کون سی دن میں نازل ہوئیں اور کون سی رات میں، کون سی سرویوں میں نازل ہوئیں اور کون سی گرمیوں میں، کون سی زمین پر نازل ہوئیں اور کون سی آسمان پر۔ وغیرہ۔

③ مکی اور مدنی آیات تک رسائی کا طریقہ ۱؎ مکی اور مدنی آیات تک رسائی کا طریقہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ صحابہ رضی اللہ عنہم اور تابعین رضی اللہ عنہم سے اس باب میں

کچھ مروی ہو۔ کیوں کہ نبی کریم ﷺ سے مکی یا مدنی سے متعلق کوئی بیان ثابت نہیں ہے۔ کیوں کہ نبی کریم ﷺ کے زمانے میں مسلمانوں کو اس کے بیان کی کوئی حاجت نہیں تھی۔ اور حاجت ہوتی بھی کیوں؟ کیوں کہ وہ لوگ وحی اور اس کے نزول، مکان، زمان اور اسباب وغیرہ کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔ جیسا کہ محاورہ مشہور ہے: "وَلَيْسَ بَعْدَ الْعَيْنَانِ بَيَانٌ"۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

((وَاللَّهُ الَّذِي لَا إِلَهَ غَيْرُهُ، مَا تَرَكْتُ سُورَةً مِنْ كِتَابِ اللَّهِ إِلَّا وَأَنَا أَعْلَمُ أَيْنَ تَرَكْتُ؟ وَلَا تَرَكْتُ آيَةً مِنْ كِتَابِ اللَّهِ

وَأَنَا أَعْلَمُ فِيهَا تَرَكْتُ؟ وَلَا أَعْلَمُ أَنْ أَحَدًا أَعْلَمُ وَيَتَّبِعُ بِكِتَابِ اللَّهِ تَبْلُغُهُ الْإِبِلُ لَرَكِبَتْ إِلَيْهِ)) ②

قسم ہے اللہ کی جس کے سوا کوئی معبود نہیں! کہ کتاب اللہ کی جو سورت بھی نازل ہوئی ہے اس کے متعلق میں جانتا ہوں کہ کہاں نازل ہوئی اور کتاب اللہ کی جو آیت بھی نازل ہوئی اس کے متعلق میں جانتا ہوں کہ کس بارے میں نازل ہوئی۔ اور اگر مجھے خبر ہو جائے کہ کوئی شخص مجھ سے زیادہ کتاب اللہ کا جاننے والا ہے اور اونٹ ہی اس کے پاس مجھے پہنچا سکتے ہیں (یعنی اس کا گھر بہت دُور ہے) تب بھی میں سز کر کے اس کے پاس جا کر اس سے علم کو حاصل کر دوں گا۔

ایوب (راوی) کہتے ہیں: ایک شخص نے حضرت عمرؓ (علمیہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما) سے قرآن کریم کی ایک آیت کے متعلق پوچھا۔ آپ نے جواب دیا: ((تَرَكْتُ فِي سَفْحِ ذٰلِكَ الْجَبَلِ "وَأَشَارَ إِلَى سَلْعٍ))۔

"یہ آیت اس پہاڑ کے دامن میں اُتری ہے۔" (اور پہاڑ سلع کی طرف اشارہ کیا)

حضور اکرم ﷺ سے مکی یا مدنی کے حوالے سے کوئی بیان ثابت نہ ہونے کی جو توجیہ میں نے بیان کی ہے وہ بہتر ہے اس سے جو تقاضی ابو بکر نے الانتصار میں بیان کی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ سے اس باب میں کوئی قول وارد نہیں ہے۔ کیوں کہ نہ ہی تو آپ ﷺ نے اس کا حکم دیا تھا اور نہ ہی اللہ تعالیٰ نے اس کو اُمت پر فرض کیا تھا۔ اگرچہ بعض اہل علم کے نزدیک ناسخ و منسوخ کی تاریخ کو جاننا واجب ہے تاکہ اس سے متعلق حکم کی معرفت حاصل ہو جائے، لیکن یہ معرفت رسول اللہ ﷺ کی جانب سے کسی نص کے بغیر ہی ہوگی۔

④ وہ قواعد و ضوابط جن کے ذریعے مکی مدنی کی شناخت کی جاسکتی ہے ۱؎ جیسا کہ آپ

کہ مکی و مدنی آیات کی معرفت محض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعین رضی اللہ عنہم سے سماعت پر مبنی ہے۔ تاہم ہم یہاں علامات اور ضوابط بیان کریں گے جن کے ذریعے مکی اور مدنی کو پہچاننا ممکن ہو جائے گا۔



## منائل العسرفان فی علوم القرآن: جلد ۱

مکی سورتوں کو پہچاننے کے ضوابط

۱) ہر وہ سورت جس میں لفظ ”کَلَّا“ ہو وہ مکی ہے۔ اور یہ لفظ قرآن کریم میں تینتیس مرتبہ مذکور ہے۔ اور وہ بھی نصفِ اخیر کی پندرہ سورتوں میں۔ علامہ مدنی کہتے ہیں:

وَمَا تَزَلَّتْ كَلَّا بَدِئَتْ فَاعْلَمْنَ  
 وَلَمْ تَأْتِ فِي الْقُرْآنِ فِي نِصْفِهِ الْأَعْلَى  
 ”جان لو کہ (لفظ) کَلَّا یشرب (مدینہ) میں نازل نہیں ہوا۔ اور قرآن کے پہلے نصف حصے میں یہ لفظ ہرگز نہیں آیا۔“

علامہ عثمانی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: قرآن کریم کا نصفِ اخیر مکہ میں آٹرا، جہاں کہ اکثر لوگ سرکش اور مغرور تھے اس لیے اس حصے میں یہ کلمہ انھیں تاکیداً دھمکانے اور ملامت کرنے کے طور پر کہی بار آیا ہے۔ بخلاف نصفِ اول کے کہ اُس میں یہ کلمہ پانچ نہیں جاسکتا کیوں کہ اس میں کتنا حصہ یہودیوں کے بارے میں نازل ہوا۔ اس میں ان کی ذلت و ضعف کی وجہ سے ایسے پُر زور اور مومکد الفاظ لانے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔

۲) ہر وہ سورت جس میں آیتِ سجدہ ہے وہ مکی ہے۔

۳) ہر وہ سورت جس کی ابتداء میں حروفِ مقطعات ہوں، وہ مکی ہے سوائے سورۃ البقرۃ اور سورۃ آل عمران کے، کہ یہ دونوں بالا جماع مدنی ہیں۔ جب کہ سورۃ الرعد میں اختلاف ہے۔

۴) ہر وہ سورت جس میں انبیائے کرام علیہم السلام اور سابقہ امتوں کے واقعات ہوں وہ مکی ہے، سوائے سورۃ البقرۃ کے۔

۵) ہر وہ سورت جس میں حضرت آدم علیہ السلام اور اہل بیت کا واقعہ ہو وہ مکی ہے سوائے سورۃ البقرۃ کے۔

۶) ہر وہ سورت جس میں ”يَا أَيُّهَا النَّاسُ“ ہو اور ”يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا“ نہ ہو وہ مکی ہے۔ سوائے سورۃ الحج کے کہ اس پر اعتراض وارد ہوتا ہے جیسا کہ ماقبل بھی گزرا۔

۷) ہر وہ سورت جو مفصل سورتوں میں سے ہو وہ مکی ہے۔ طبرانی میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

((تَوَلَّى الْمُفْضَلُ بِنِكَتَةٍ، فَكَتَبْنَا نَقْرُؤًا وَلَا يَنْزِلُ عَذْوَةً)).

”مفصل کا نزول مکہ میں ہوا، سوہم مکی سال تک اسی کی قراءت کرتے رہے اس عرصے میں اس کے سوا قرآن کا کوئی حصہ نازل نہیں ہوا۔“

لیکن اس پر یہ اعتراض ہو سکتا ہے کہ مفصل میں سے بعض سورتیں مدنی ہیں کیوں کہ وہ بالاتفاق ہجرت کے بعد نازل ہوئی تھیں، جیسا کہ سورۃ النصر، بلکہ یہ سورت تو ہجرت کے بعد سب سے آخر میں نازل ہونے والی سورتوں میں سے ایک ہے۔ بلکہ بعض مفسرین نے تو یہاں تک کہا ہے کہ یہ سورت قرآن مجید کی نازل ہونے والی سب سے آخری سورت ہے، (جیسا کہ ماقبل بحث گزر چکی ہے کہ سب سے پہلی اور آخری وحی کون سی تھی۔) پس بہتر یہ ہی ہے کہ مفصل سورتوں سے متعلق حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے قول کو بنا بر کثرت پر محمول کیا جائے نہ کہ بنا بر جمع پر۔

لفظ ”مُفْضَلٌ“ ”بروزن“ ”مُعْظَمٌ“ ہے۔ صحیح قول کے مطابق مفصل سورتوں سے قرآن مجید کی سورۃ الحجرات سے آخر تک تمام سورتیں مراد ہیں۔ ان سورتوں کو مفصل کہنے کی ایک وجہ یہ ہے کہ ان میں سے ہر وہ سورتوں کے درمیان بسملہ سے فصل لایا گیا ہے۔

۴۵ مسائل العسرفان فی علوم القرآن: جلد ①

پس اسی فصل کی کثرت کی وجہ سے انہیں مفصل کہا گیا۔ اور دوسری وجہ تسمیہ یہ ہے کہ ان سورتوں میں سے بہت کم آیات یا سورتیں منسوخ ہیں۔ پس یہ قول قول فصل ہے جس میں کوئی نسخ یا نقص نہیں۔

مدنی سورتوں کو پہچاننے کے ضوابط ① ہر وہ سورت جس میں حدود و فرائض بیان ہوئے ہوں، وہ مدنی ہے۔  
② ہر وہ سورت جس میں اذن جہاد یا جہادی احکام کا بیان موجود ہو، وہ مدنی ہے۔

③ ہر وہ سورت جس میں منافقین کا ذکر ہو، وہ مدنی ہے، سوائے سورۃ العنکبوت کے۔ کیوں کہ تحقیق یہ ہی کہ سورۃ العنکبوت کی پہلی گیارہ آیات مدنی ہیں اور باقی پوری سورت مکی ہے۔ کیوں کہ پہلی گیارہ آیات میں ذکر منافقین ہے۔

④ مکی، مدنی اور مختلف فیہا سورتیں علامہ جلال الدین السیوطی رضی اللہ عنہ نے بالاتقان میں مکی اور مدنی سورتوں کے اوفق و بہتر قول علامہ ابوالحسن انصاری کا ہے جو انھوں نے اپنی کتاب ”الناسخ و المنسوخ“ میں ذکر کیا ہے۔ آپ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ((المدنی باتفاق عشر و ن سورۃ، و المختلف فیہ اثنتا عشر سورۃ، و ما عدا ذلك مکی باتفاق))۔

مدنی سورتیں بالاتفاق بیس (۲۰) ہیں۔ اور مختلف فیہ سورتیں بارہ ہیں۔ اور ان کے علاوہ تمام سورتیں بالاتفاق مکی ہیں۔ پھر اس قول کے بعد علامہ ابوالحسن انصاری نے سورتوں سے متعلق بڑے رفیق اور جامع اشعار بھی پیش کرتے ہیں۔  
میں مدنی سورتوں سے یہ سورتیں مراد ہیں: سورۃ البقرۃ، آل عمران، النساء، المائدۃ، الانفال، التوبۃ، النور، الاحزاب، محمد، الفتح، الحجرات، الحديد، المجادلۃ، الحشر، الممتحنہ، الجمعہ، المنفقین، الطلاق، التحريم، النصر بارہ مختلف فیہ سورتوں سے یہ سورتیں مراد ہیں: سورۃ الفاتحہ، الرعد، الرحمن، الصف، التغابن، التطفیف، القدر، البینۃ، الزلزال، الاخلاص، الفلق، الناس۔

مکی سورتوں سے بالاتفاق وہ سورتیں ہیں جو مدنی اور مختلف فیہ کے علاوہ ہیں۔ اور وہ بیاسی (۸۲) ہیں۔ علامہ ابوالحسن اپنے منظوم کلام میں مکی سورتوں سے متعلق فرماتے ہیں:

ومأسوی ذاک مکی تنزلہ فلاتکن من خلاف الناس فی حصر

فلیس کل خلاف جاء معتبرا الا خلاف له حظ من النظر

ان (مدنی اور مختلف فیہ) کے علاوہ تمام قرآن کا نزول مکہ میں ہوا۔ پس تو لوگوں کے اختلاف کی وجہ سے کسی شک میں مبتلا نہ ہو۔ کیوں کہ ہر اختلاف معتبر نہیں ہوتا سوائے اس اختلاف کے جو قابل توجہ ہو۔ اہل علم کے نزدیک یہ اشعار ضرب المثل کی طرح مشہور ہیں۔

⑤ مکی اور مدنی سورتوں کی اقسام بعض سورتیں ایسی ہیں جو مکمل طور پر مکی ہیں اور بعض مکمل طور پر مدنی۔ اور بعض سورتیں ہیں، جن میں سے چند آیات کے علاوہ باقی تمام آیات مکی اور بعض میں چند مکی آیات کے علاوہ باقی تمام سورت مدنی ہے۔ پس اس طرح مصلح چار اقسام بن گئیں۔

”محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ“

پہلی قسم کی مثال، سورۃ المدثر ہے کہ اس کی تمام آیات کی ہیں۔ اور دوسری قسم کی مثال سورۃ آل عمران ہے کہ اس کی تمام آیات مدنی ہیں۔ اور تیسری قسم کی مثال سورۃ الاعراف ہے کہ یہ اس ایک آیت: ﴿وَسْتَأْذِنُ عَنْ الْقَرْيَةِ الَّتِي كَانَتْ حَاضِرَةً الْبَيْتِ﴾ (الاعراف: ۱۶۳) کے علاوہ تمام کی تمام کی ہے۔ قتادہ رضی اللہ عنہما کہتے ہیں: مذکورہ آیت سے ﴿وَإِذْ أَخَذَ رَبُّكَ مِنْ بَنِي آدَمَ﴾ (الاعراف: ۱۷۲) تک آیات مدنی ہیں۔ اور چوتھی قسم کی مثال سورۃ الحج ہے کہ چار آیات کے علاوہ تمام کی تمام کی ہیں۔ وہ چار آیات ﴿وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَسُولٍ وَلَا نَبِيٍّ إِلَّا إِذَا تَشَاءَنِي﴾ سے لے کر ﴿عَذَابٌ يَوْمَ عَقَابِمْ﴾ (الحج: ۵۲-۵۵) ہیں۔

یاد رکھیے کہ کسی بھی سورت کا اصل وصف کی یاد دہانی ہونا ہی ہے۔ اور یہی بات مختلف فیہ سورتوں کی تو وہ ان ہی دو صفوں کی تابع ہیں یعنی ان سورتوں میں اکثر تعداد والی آیات کا حکم پوری سورت پر لگایا جائے گا یا جو آیات ابتدا میں ہوں گی، انہی کی نسبت سے پوری سورت کو کنی یاد دہانی قرار دیا جائے گا۔ مثلاً اگر کسی سورت کی ابتدائی آیات کہ میں نازل ہوئیں تو اس کو کنی سورت لکھ دیا گیا، پھر بعد میں اللہ نے جہاں چاہا اس سورت کی تفسیر آیات کو نازل فرمایا۔ لہذا کنی اور مدنی کی اصطلاح مشہور میں اگر یہ کہا جائے تو شاید زیادہ مناسب ہوگا کہ جس سورت کا ابتدائی حصہ ہجرت سے قبل نازل ہوا اس کو کنی لکھ دیا گیا اور جس کا ابتدائی حصہ ہجرت کے بعد نازل ہوا اُسے مدنی لکھ دیا گیا اور اگر اس سورت میں مستثنیٰ آیات بھی تھیں تو اس کے عنوان میں ان کا بھی ذکر دیا گیا۔ جیسا کہ آپ اکثر مصاحف میں لکھا ہوا دیکھتے ہیں۔

تحقیق علما نے علم نزول قرآن کے باب میں انتہک محنتیں کی ہیں۔ یہاں تک کہ امام ابوالقاسم انیسابوری رضی اللہ عنہ نے اپنی کتاب "التبیین" میں لکھا ہے:

"علم قرآن میں سب سے اشرف علم نزول قرآن، اُس کی جہات اور مکہ مدینہ میں نازل ہونے والی سورتوں کی ترتیب کا علم ہے اور اس بات کا جاننا ہے کہ کون سی سورت مکہ میں نازل ہوئی، مگر اس کا حکم مدنی ہے اور کون سی مدینہ میں نازل ہوئی لیکن اس کا حکم کنی ہے۔ اور یہ کہ مکہ میں اہل مدینہ سے متعلق کیا حکم نازل ہوا اور مدینہ میں اہل مکہ کے بارے میں کیا بات اُتری۔ نیز ان کے بارے میں جاننا جو نزولاً کنی ہیں لیکن مدنی کے مشابہ ہیں یا نزولاً مدنی ہوتے ہوئے کنی کے مشابہ ہیں۔ جحف، بیت المقدس، طائف اور مدینہ میں نازل ہونے والی سورتوں کا علم رکھنا اور اس بات سے واقف ہونا کہ کون سی سورت رات کے وقت میں نازل ہوئی اور کون سی دن کے وقت۔ یا کون سی سورت کو حضرت جبرائیل علیہ السلام فرشتوں کی جماعت کے ساتھ لے کر آئے یا کون سورت کا نزول تنہا جبرائیل علیہ السلام کے واسطے سے ہوا۔ پھر کنی سورتوں میں مدنی آیتوں کا علم رکھنا اور مدنی سورتوں میں کنی آیات سے واقف ہونا اور اس بات کو جاننا کہ مکہ سے مدینہ میں قرآن کا کتنا حصہ لایا گیا اور مدینہ سے مکہ میں کتنا حصہ لایا گیا۔ اور قرآن کا کتنا حصہ مدینہ سے ملک حبش لے جایا گیا۔ اور کون سی آیت، جمل اُتری اور کس آیت کا نزول اُس کی تفسیر کے ساتھ ہوا اور کون سورتوں میں اس بات کا اختلاف ہے کہ بعض اشخاص انہیں کنی بتاتے ہیں اور بعض اُن کو مدنی کہتے ہیں۔ غرض یہ کہ یہ پچھیں و جنہیں ایسی ہیں کہ جو شخص ان کو بخوبی نہ جانتا ہو اور ان میں باہم امتیاز نہ کر سکے تو اُس کے لیے ہرگز جائز نہ ہوگا کہ وہ کتاب اللہ سے متعلق کچھ کلام کر سکے۔ یہ نقل کرنے کے بعد علامہ جلال الدین ایسیوطی رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: "میں نے ان سب وجوہ کو نہایت تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے اور ان میں سے بعض باتوں کی مستقل ایک نوع قرار دی ہے اور چند باتوں کو دیگر انواع کے ضمن میں ذکر کیا ہے۔" اللہ پاک ان تمام پاک نفوس کو بہترین جزاء عطا

فرمائے جنھوں نے جملہ علوم قرآن کے لیے جدوجہد کی۔

۷ ایسی وجوہ جو مکی اور مدنی دونوں کے ساتھ متعلق ہیں؟ بحث میں اس طرف بھی توجہ دلائی ہے

کہ مکی اور مدنی کی متعدد وجوہ یا صورتیں ہیں۔ ان میں سے ایک صورت اُن آیات کی ہے جن کو سمجھنا ممکن نہیں ہوتا یہاں تک کہ ان سے متعلق واقعے کا علم نہ ہو۔ اور ایک صورت یہ کہ بعض مکی سورتیں ایسی ہیں جن میں بعض آیات مدنی تزییل کے مشابہ ہیں۔ جیسا کہ سورۃ النجم میں آیت نمبر ۳۲ ہے۔ یعنی: ﴿الَّذِينَ يَجْتَنِبُونَ كَبِيرَ الْإِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ إِلَّا اللَّعَمَةَ﴾ (النجم: ۳۲) علامہ السیوطی رحمۃ اللہ علیہ اس آیت کی توجیہ میں فرماتے ہیں:

((فان الفواحش كل ذنب في حد، والكبائر كل ذنب عاقبة النار، واللعم مابين الحدین من الذنوب ولم یکن بمکة حدولا نحوها)).

”فواحش ایسے گناہوں کو کہتے ہیں جن میں حد (دنیاوی سزا) ہو اور کبائر ان گناہوں کا نام ہے جن کا انجام جہنم کی آگ ہو۔ اور ”لعم“ وہ خطائیں ہوتی ہیں جو دونوں مذکورہ اقسام ذنوب کے تین تین ہوں۔ اور مکہ (مکی دور) میں حد یا اس کے قریب قریب کسی سزا کا وجود نہ تھا۔“

لیکن اس پر دو طرح سے نظر (اعتراض) ہے۔

① علامہ السیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے فواحش کی جو تفسیر کی ہے وہ غیر متفق علیہ ہے۔ کیوں کہ بعض مفسرین نے فواحش کی تفسیر مطلقاً کبائر سے کی ہے اور بعض مفسرین نے فواحش کی تفسیر ان کبائر سے کی ہے جن پر صرف آخرت میں سزائے اور دنیا میں کوئی حد وغیرہ جاری نہ ہو۔ اور علامہ السیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے خود بھی سورۃ الانعام میں فواحش کی تفسیر کبائر ہی سے کی ہے۔

② بعض مفسرین نے سورۃ النجم جو کہ مکی ہے، کی اس آیت کو مستثنیٰ قرار دیا ہے۔ حالانکہ اس کا مدنی ہونا صراحت سے ثابت ہے۔

ان متعدد صورتوں میں سے ایک صورت یہ بھی ہے کہ مدنی سورتوں میں مکی تزییل کے مشابہ آیت یا آیات موجود ہوتی ہیں۔

جیسے سورۃ العادیات کی آیت ﴿وَالْعَادِيَاتِ ضَبْحًا﴾ اور سورۃ الانفال جو کہ مدنی ہے، کی آیت ﴿وَإِذْ قَالُوا اللَّهُمَّ إِن كَانَ هَذَا هُوَ الْحَقُّ مِنْ عِنْدِكَ﴾ (انفال: ۳۲) سورۃ العادیات اور سورۃ الانفال دونوں مدنی ہیں لیکن ان میں مذکورہ بالا دونوں آیات مکی تزییل یا آیات کے مشابہ ہیں۔

لیکن علامہ جلال الدین السیوطی رحمۃ اللہ علیہ کی اس توضیح میں بھی نظر ہے کیوں کہ سورۃ العادیات کا مکی سورت ہونا مشہور و معروف

ہے۔ اور سورۃ الانفال کی مذکورہ آیت کے مکی ہونے پر نص موجود ہے۔ جیسا کہ خود علامہ السیوطی رحمۃ اللہ علیہ مقابل سے نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ سورۃ الانفال المدنیہ کی یہ آیت مستثنیٰ ہے، بلکہ بعض نے تو یہ صراحت کے ساتھ بیان کیا ہے کہ یہ آیت اور اس سے پہلی دو آیات اور بعد والی چار آیات، اس طرح کُل سات آیات ہوئیں، یہ ساتوں آیات مکی ہیں اور سورۃ الانفال جو کہ مدنی سورت ہے، میں سے مستثنیٰ ہیں۔ اور مجملہ ان صورتوں میں سے ایک صورت اُن آیات یا سورتوں کی ہے جو مکہ سے مدینہ لائی گئیں جیسا کہ سورۃ یوسف، سورۃ الاخلاص اور سورۃ الاعلیٰ۔ اور جو مدینہ سے مکہ لائی گئیں جیسا کہ سورۃ البقرۃ المدنیہ میں آیۃ الربا اور سورۃ التوبہ المدنیہ کی ابتدائی آیات۔ اور جو

## منابیل العسرفان فی علوم القرآن: جلد ۱

ملک جیشہ لائی گئیں جیسا کہ سورۃ مریم۔ تحقیق صحت سے ثابت ہے کہ حضرت جعفر بن ابی طالبؓ نے شاہ جیش نجاشی کے سامنے سورۃ مریم کی آیات کی تلاوت فرمائی تھی۔ اور جو ملک روم لائی گئیں جیسا کہ سورۃ آل عمران میں اللہ سبحانہ و تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿قُلْ يَا هَلْهُ الْكَلْبُ تَعَالَوْا إِلَىٰ كَلِمَةٍ سَوَاءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ﴾ (آل عمران: ۶۳)

اور یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ مکی اور مدنی کی اصطلاح مشہور قرآن کریم کے اُن تمام حصوں کو شامل ہے جو نازل ہوئے خواہ مکہ اور مدینہ میں یا ان کے علاوہ کسی اور مقام مثلاً جحفہ، طائف، بیت المقدس، حدیبیہ، منی، عرفات، عسفان، تبوک، بدر، احد، حرا اور حراء الاسد وغیرہ میں۔ اب اگر ہم یہاں اُن تمام مقامات اور وہاں نازل ہونے والی آیات کو بیان کریں تو حد طوالت سے بھی پار کر جائیں گے۔ اس لیے ہم صرف اسی پر اکتفا کرتے ہیں جو ہم بیان کر چکے کیوں کہ ضرب المثل مشہور ہے: "الذئبُ تَكْفِيهِوَ الْإِشَارَةُ" یعنی عقل مند کے لیے اشارہ ہی کافی ہے۔

① مکی اور مدنی میں فروق؟ آپ مکی اور مدنی سو رو آیات میں چند ایسے فرق بھی پائیں گے جو ان کے علاوہ ہوں ہوں گے، کیوں کہ ان سب کا تعلق امور معنویہ و بلاغت کے ساتھ ہے۔ پھر ان فروق میں بعض ایسے ہیں جو ان شہادت کا جواب ہیں جو اعدائے اسلام کی جانب سے قرآن کریم پر کیے جاتے ہیں۔ اسی وجہ سے ہم ایک مستقل عنوان کے ساتھ ان فروق کو بیان کر رہے ہیں، تاکہ وارد ہونے والے اعتراضات کو وجود میں آنے سے قبل ہی توڑ دیا جائے جیسا کہ کہا جاتا ہے: قَبْلُ الْوَعْدِ الْوَعْدُ الشَّهْمُ۔ ہم اس موقع پر قسم مکی کے اُن خواص کو بیان کریں گے جو بکثرت ان میں پائے جاتے ہیں۔

① مکی سو رو آیات کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ ان میں شُرک اور بت پرستی کی مذمت بکثرت پائی جاتی ہے۔ نیز ان میں اہل مکہ کی طرف سے شُرک و بت پرستی پر اصرار کرتے ہوئے وارد ہونے والے شہادت کے ایسے طبعی جوابات موجود ہیں جو ان پر ہر دروازے سے اُن کی پھوکی دلیلوں کو توڑتے ہوئے داخل ہوئے اور ان کو حسی دلائل کے ساتھ محاکم کرنے کی دعوت دی اور ان کے سامنے بلاغت کی اعلیٰ مثالیں قائم کیں۔ حتیٰ کہ ان کو یہ باور کروایا کہ تمہارے معبودان باطلہ استے کم زور و عاجز ہیں کہ وہ سارے مل کر بھی ایک انتہائی ادنیٰ جانور مثلاً مکھی بھی نہیں بنا سکتے، بلکہ اتنی بھی طاقت نہیں رکھتے کہ مکھی کی شرارت سے بچ سکیں۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿يَا أَيُّهَا النَّاسُ صُِرْبٌ مِّثْلُ مَا سَبَّحُوا لَهُ ۗ إِنَّ الَّذِينَ تَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ لَنْ يَخْلُقُوا ذُبَابًا وَ لَوْ اجْتَمَعُوا لَهُ ۗ وَإِنْ يَسْلُبْهُمُ الذُّبَابُ شَيْئًا لَا يَسْتَنْقِذُوهُ مِنْهُ ۗ ضَعُفَ الظَّالِمِينَ وَ اتَّطَلَبُوا ۗ﴾ (الحج: ۱۷)

"اے لوگو! ایک مثال بیان کی جاتی ہے اسے غور سے سنو! کہ جن کو تم اللہ کے سوا پکارتے ہو وہ ایک مکھی بھی نہیں بنا سکتے۔ اگرچہ اس کے لیے سب اکٹھے ہو جائیں اور اگر ان کے مکھی کوئی چیز چھین لے جائے تو اسے اس سے چھڑا نہیں سکتے۔ طالب اور مطلوب (یعنی عابد و معبود) دونوں گئے گزرے ہیں۔"

اور جب اہل مکہ کا عناد حد سے بڑھا اور انھوں نے اپنے آباؤ اجداد سے دلیل پکڑنا شروع کی تو قرآن کریم نے واضح کیا کہ

انھوں نے کرمت انسان کو اتنی پستیوں میں گرادیا کہ اُسے پتھروں اور بتوں کے سامنے ذلت کے ساتھ جھکا دیا۔ اور پھر ان کے اور اُن کے آباء و اجداد جنھوں نے آفاقی عالم اور خود اپنی ذات میں اللہ کی نشانیوں کو نہیں پہچانا تھا، کے اُطلام کو احقانہ حرکت قرار دیا اور پھر قرآن کریم اہل مکہ کی اپنے آباء و اجداد کی اس اٹھنی تقلید کی قباحت بیان کرتے ہوئے یوں گویا ہوا:

﴿وَلَوْ كَانَ آبَاؤَهُمْ لَا يَعْقِلُونَ شَيْئًا وَلَا يَهْتَدُونَ﴾ (البقرہ: ۱۷۰)

”بھلا اگر چنانچہ کے باپ دادا نہ کچھ سمجھتے ہوں اور نہ سیدھے راستے پر ہوں تب بھی وہ انہی کی تقلید کیے جائیں گے۔“

اور اسی طرح قرآن کریم ان کے دیگر عقائدِ ضالہ جن کی وجہ سے وہ بت پرستی اختیار کرنے پر اور اللہ تعالیٰ کی وحدانیت، انبیائے کرام علیہم السلام کی نبوت، آخرت میں اٹھائے جانے، حساب و کتاب اور جزا و سزا کے منکر ہونے پر آمادہ ہوئے، کے بطلان پر مناقشہ و مباحثہ کرتا ہے۔

② قرآن کریم کے کئی حصے کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ اس نے اہل مکہ کی، اُن شواہد حق، جو ان کی اپنی ذات میں تھے اور رُشد و ہدایت کی وہ علامات جو کائنات میں پھیلی ہوئی تھیں، سے متعلق آنکھیں کھول دیں۔ ان کے سامنے استدلال اور اسلوبِ کلام کی نئی نئی انواع بیان کیں۔ ان کو گزرے ہوئے اور موجودہ واقعات سے متعلق فیصلے سنائے۔ ان تمام کے علاوہ ان کی راہ نمائی کی ایسی قیادت کی طرف جو راہِ راست اور حکمت سے بھرپور تھی اور وہ قیادت اللہ تعالیٰ کی الوہیت پر بویست میں توحید، موت کے بعد دوبارہ اٹھائے جانے اور حساب و کتاب اور جزا و سزا اور اس کی باریکیوں یا سختیوں کے اعتراف کی طرف لے جانے والی تھی۔ نیز وہی اور ہر وہ چیز جو وحی سے ثابت ہے خواہ اس کا تعلق الٰہیات و نبوات کے ساتھ ہو یا عقائد میں سمعیات کے ساتھ ہو انھیں قرآن کریم کا کئی حصہ دین اور ضروریات دین سے متعلق ہر امر کو تسلیم کرنے کی دعوت دیتا ہے۔

③ قرآن کریم کے کئی حصے کی تیسری خصوصیت یہ ہے کہ اس میں اہل مکہ کی بہت سی عاداتِ قبیحہ بیان ہوئی ہیں۔ مثلاً قتل و غارت، ناحق خون بہانا، بیچوں کو زندہ درگور کرنا، ایک دوسرے کی عزت و ناموس کی پامالی کو اپنے لیے مباح سمجھنا، قبیہوں کا ناحق مال کھانا۔ اس طرح اُن کو ان تمام عاداتِ قبیحہ میں پائی جانے والی برائیوں اور خرابیوں سے آگاہی حاصل ہوئی اور کلامِ الہی نے مسلسل کوشش جاری رکھی جس کی نتیجے میں وہ ان تمام رذائل سے پاک ہو گئے اور انھیں ان سے دُور رہنے میں نجات حاصل ہوئی۔

④ چوتھی خاصیت یہ ہے کہ اس میں اہل مکہ کے لیے اصولی و اخلاقی اور اجتماعی زندگی سے متعلق حقوق اس طرح خوب صورت انداز میں واضح کیے گئے ہیں، کہ کفر، فسوق، عصیان، جہالت پر مبنی تمام کام، طبیعت میں سرکشی، دل کی سختی اور زبان کی کڑواہٹ کو ان کے لیے ناپسند ظہر ایسا گیا ہے۔ جب کہ ایمان، اطاعت، لُطم و ضبط، علم، محبت، شفقت و نرم دلی، اخلاص، ایک دوسرے کا احترام، والدین کے ساتھ نیکی، پڑوسی کا کرام، دل کی طہارت اور زبان کی سچائی و صفائی جیسے اخلاقی حمیدہ کو پسندیدہ قرار دیا ہے۔

⑤ اس حصے کی پانچویں خاصیت یہ ہے کہ اس میں سابقہ امم اور انبیائے کرام علیہم السلام کے ایسے واقعات بیان ہوئے ہیں، جن میں نفع بخش عبرتیں اور دل پر اثر کرنے والی نصیحتیں موجود ہیں۔ ان واقعات سے اہل کفر و ظغیان کو ہلاک کرنے اور اہل ایمان کے ساتھ نصرت و احسان والی سنتِ الہیہ بھی ثابت ہوتی ہے۔ اگرچہ ان امم سابقہ کو گزرے بہت طویل زمانہ گزر چکا ہے لیکن حق کی نصرت اور ایمان کی تائید سے متعلق اللہ تعالیٰ کی ہمیشہ سے یہی سنت رہی ہے۔



## در منال العسرفان فی علوم القرآن: جلد ①

① کسی جھکی چھٹی خاصیت یہ ہے کہ اس میں اہل مکہ کو ایجاز کے ساتھ مخاطب کیا گیا ہے۔ یہاں تک تمام سورتوں میں سب سے چھوٹی سورتیں کی ہی ہیں۔ کیوں کہ اہل مکہ فصیح اور اہل زبان تھے۔ ان کو صنعت کلام اور ہمت بیان پر عبور تھا۔ پس مناسب حال یہ ہی تھا کہ ان سے ایجاز اور اقلال کے ساتھ کلام کیا جائے نہ کہ اسباب و اطباب کے ساتھ۔

جیسا کہ بلند حکمت کا قانون بھی یہ ہے کہ افراد کی تربیت میں تدویر اور ارتقاء کا طریقہ اپنایا جائے کہ اہم کو ہم پر مقدم رکھا جائے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ عقائد، اخلاق اور عادات اہم ہیں عبادات کی اقسام اور معاملات کے دقیق پہلوؤں سے۔ کیوں کہ پہلے آنے والی چیز بعد میں آنے والی چیز کے لیے اصول کی طرح ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے قسم کی میں عقائد، اخلاق و عادات وغیرہ کی درستی کی طرف خصوصی توجہ دلائی گئی ہے۔

قسم کی کے خواص کے بعد اب ہم قسم مدنی کے خواص بیان کریں گے جو بیشتر ان میں پائے جاتے ہیں۔

① مدنی حصے میں شریعت کے دقیق پہلو، احکام کی تفصیل، اجتماعی، انفرادی، جنگی، حکومتی، شخصی حقوق، عبادات اور معاملات کی تمام اقسام کے قوانین کی انواع بیان ہوئی ہیں۔ اگر آپ چاہیں تو سورۃ البقرۃ، سورۃ النساء، سورۃ المائدہ، سورۃ الانفال، سورۃ التوبہ، سورۃ الحج اور سورۃ الحجرات وغیرہ کا مطالعہ کر سکتے ہیں۔

② مدنی سورتوں آیات میں اہل کتاب یعنی یہود و نصاریٰ کو اسلام کی طرف مدعو کیا گیا ہے۔ ان کے عقائد باطلہ کا محاسبہ اور رد کیا گیا ہے۔ حق اور اہل حق کے خلاف ان کی سرگرمیوں کو بیان کیا گیا ہے۔ اللہ کی کتب میں ان کی طرف سے تحریفات سے متعلق آگاہ کیا گیا ہے۔ عقل اور تاریخ کی روشنی میں ان کے باطل پر ہونے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ اگر آپ چاہیں تو سورۃ البقرۃ، سورۃ آل عمران، سورۃ المائدہ اور سورۃ الحج وغیرہ کا مطالعہ کر سکتے ہیں۔

③ قسم مدنی کے خواص میں سے تیسری خاصیت یہ ہے کہ اس کی سورتوں آیات میں اطباب اور تطویل سے کام لیا گیا ہے۔ کیوں کہ اہل مدینہ فصاحت و بلاغت اور ذکاوت و اہمیت میں اہل مکہ کی طرح نہیں تھے۔ لہذا اہل مدینہ کی حالت کو دیکھتے ہوئے کلام میں کسی قدر اطباب اور طوالت برتی گئی، کیوں کہ علم بلاغت کی اصل روح ہی یہ ہے کہ کلام اپنے مخاطب اور ماحول کے تقاضوں کے مطابق ہو۔ اور غیر اذکیاء سے کلام کا جو اسلوب اپنایا جائے وہ اس اسلوب کے علاوہ ہو جو اذکیاء کے ساتھ روا رکھا گیا تھا۔ (دونوں قسموں میں مختلف انداز بیان اپنانے کی ایک وجہ یہ بھی ہے اللہ تعالیٰ تمام لوگوں کے احوال کو بخوبی جانتے ہیں) جیسا کہ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کی صفت بیان ہوئی ہے: ﴿وَلَا يُنَبِّئُكَ مِثْلُ خَبِيرٍ﴾ (ناظر: ۱۳) ترجمہ: اور جس ذات کو تمام باتوں کی مکمل خبر ہے، اُس کے برابر تمہیں کوئی اور صحیح بات نہیں بتائے گا۔

## اس موضوع پر وارد ہونے والے شبہات اور ان کے جوابات

ہم نے پہلے ہی کہا اور اب کہتے ہیں کہ اسلام کے دشمن کثیر تعداد میں ہیں اور وہ سب گمراہ لگائے بیٹھے ہیں کہ کسی طرح انہیں موقع ملے اور وہ تیر برسرا کر اسلام کا راستہ بند کریں۔ لیکن ہمارا فریضہ یہ ہے کہ ہم ان کے ان اوجھے جھکنڈوں کا سدباب کریں اور اس

اہم معاملے میں اسلام کے دفاع کے لیے کربستہ ہو جائیں۔ اور یہ تب ہی ممکن ہوگا جب ہم تمام ہتھیاروں سے لیس ہوں۔ اور ابتداء ہی میں ان شبہات سے آگاہی فراہم کریں جن کی وجہ سے مصر اور مصر کے علاوہ دیگر شہروں (الغرض ہر جگہ) میں ذہنی آلودگی کی آگ بھڑک رہی ہے۔ یہاں تک کہ ہمارا پڑھا لکھا جوان طبقہ ان شبہات اور لغو اعتراضات پر مبنی بیانات اور کتابوں کو ادبی بیانات اور کتابیں تصور کرتا ہے۔ مصر پر ایک ایسا وقت بھی گزرا ہے جب ہر طرف ان شبہات کا میدان کارزار گرم تھا۔ پس ہم اسی طرح کے چند (چھ) شبہات (اور پھر ان کے جوابات) آپ کے سامنے بیان کریں گے۔ آپ ان شبہات اور ان کے جوابات کو خوب سمجھیے اور اچھی طرح انھیں یاد رکھیے۔ بے شک نیک کام کرنے کی طاقت اور بڑائی سے بچنے کی قوت اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے ہے۔ کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے:

أنا لا ألوہ المستبد... إذا تعنت أو تعدى

فسبيلہ أن يستبد... دو شأننا أن نستعدا

”جب کوئی ظالم اور حد سے تجاوز کرتا ہے تو میں اسے ملامت نہیں کرتا کیوں کہ اس کا تو کام ہی سرکشی کرنا ہے لیکن اس وقت

ہمارا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ ہم (اس کے مظالم کا جواب دینے کے لیے) تیار ہو جاتے ہیں۔“

پہلا شبہ ۱ میں ایک کا دوسرے کا ساتھ کوئی ربط نہیں ہوتا۔ اسی وجہ سے ہمیں یہ ماننا پڑتا ہے کہ یہ کتاب مختلف حالات اور مختلف ماحول سے متاثر ہوتی رہی ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن کریم کی قسم کسی میں پست درجے کی خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ جب کہ قسم مدنی میں ثقافت و تہذیب جیسی علامات ہو پیدا ہیں۔ پھر دیکھتے ہیں کہ قسم کی تشدد، شدت، ظلم، غصہ، سباب، دھمکی اور ڈراوے جیسی صفات میں منفرد ہے۔ جیسے: ﴿تَبَّتْ يَدَا أَبِي لَهَبٍ وَتَبَّ ۝﴾ (الب: ۱۰) اور ﴿وَ الْعَصِيُّ ۝ إِنَّ الْإِنْسَانَ لِرَبِّهِ لَكَنُفٍ خُسْرٍ ۝﴾ (العصر: ۲۰) اور ﴿فَصَبَّ عَلَيْهِمْ رَبُّكَ سَوْطَ عَذَابٍ ۝ إِنَّ رَبَّكَ لَيَاْتِرُصَادَ ۝﴾ (الفرج: ۱۳، ۱۴)

پہلے شبہ ۲ یہ شبہ چار شکوک و شبہات پر مشتمل ہے، اور اگر آپ چاہیں تو کہہ سکتے ہیں کہ یہ شبہ تین ایسے جھوٹے مقدمات پر مشتمل ہے۔ جواز خود ایسے نتیجے کی طرف لے جاتے ہیں یا ان کا قائل جان بوجھ کر ایسے

نتیجے کی طرف لے جانا چاہتا ہے جو خود بھی جھوٹ اور غلط ہے۔ وہ تینوں مقدمات یہ ہیں:

① قسم کی سختی اور شدت میں منفرد ہے۔

② اس میں سباب اور دھمکیاں ہیں۔

③ اس میں پست درجے کی خصوصیات پائی جاتی ہیں۔

ان تینوں مقدمات کا نتیجہ یا ان مقدمات کے قائل کا ہدف یہ ہے کہ قرآن کی آیات میں انکاف و انتشار ہے۔ اس کے حلقاات غیر متصل ہیں۔ یہ لوگوں کے مزاجوں اور ماحول سے متاثر ہے۔

اور ان کا مقصد یقیناً وہ ہی مشہور بات ہے کہ قرآن پاک اللہ کا کلام نہیں ہے اور نہ ہی کوئی معجزہ ہے، بلکہ یہ محمد ﷺ کا کلام ہے، جو سب سے پہلے مکہ کے لوگوں سے متاثر ہو کر وجود میں آیا، پس اس وقت یہ کلام سخت تھا اور ان معارف عالیہ سے عاری تھا جو بعد میں مدینہ میں رہتے ہوئے اہل کتاب سے سیکھ لیے گئے تھے۔

پس یہ تمام باتیں وہ ہیں جو گم راہ لکن لوگوں کی جانب سے ہمیں تنقید کا نشانہ بنانے کے لیے کہی جاتی ہیں۔ اور یہ تمام باتیں ان کی حق سے عداوت، اسلام سے دشمنی اور قرآن پر بے جا تنقید کو ظاہر کرتی ہیں۔ نیز یہ تمام باتیں ہر قسم کے حسرت و تاویل سے خالی اور بدترین مفروضوں سے پر ہیں۔

ہم آپ کے سامنے اس شبہ کی بنیاد بھی بیان کریں اور اس کا بطلان بھی تاکہ آپ اس اور اس کے مثل جھوٹے اور گھٹیا شبہات کے بطلان کی گہرائیوں سے بھی واقف ہو جائیں۔

**فائدہ** ۱۰ اس شبہ کی چار بنیادیں ہیں یا یوں کہہ لیں کہ اس شبہ کے چار اجزا ہیں:

① قسم کی شدت و غیظ میں منفرد ہے۔

② قسم کی میں سبب ہے۔

③ قسم کی میں پست درجے کی خصوصیات پائی جاتی ہیں۔

④ قرآن کریم ماحول سے متاثر ہے۔

یعنی کی آیات اور مدنی آیات، مکہ اور مدینہ کے ماحول سے متاثر ہوئی ہیں۔ کیوں کہ دونوں شہروں کا ماحول و معاشرت علیحدہ علیحدہ تھی اسی لیے دونوں آیات کی دونوں قسموں کا اسلوب بھی جدا جدا ہے۔

① پس ان کا یہ کہنا کہ قسم کی شدت و غیظ میں منفرد ہے، منقوض ہے۔ کیوں کہ قسم مدنی میں بھی شدت و غیظ نظر آتا ہے۔ لہذا ان کا قسم کی کے بارے میں انفرادیت کا دعویٰ کرنا باطل ٹھہرا۔ دیکھیے سورۃ البقرۃ جو کہ مدنی ہے۔

﴿فَإِنْ لَّمْ تَفْعَلُوا وَ لَنْ تَفْعَلُوا فَأْتُوا النَّارَ الَّتِي وُقُودُهَا النَّاسُ وَ الْجِبَالُ ۗ أَعَدَّتْ لِلْكَافِرِينَ ۝﴾ (البقرۃ: ۲۴)

”پھر اگر ایسا نہ کر سکو اور ہرگز ایسا نہیں کر سکو گے تو اس آگ سے ڈرو جس کا ایندھن آدمی اور پتھر ہوں گے، جو کافروں کے لیے تیار کی گئی ہے۔“

﴿الَّذِينَ يَأْكُلُونَ الرِّبَا لَا يَقْوَمُونَ إِلَّا كَمَا يَقُومُ الَّذِي يَتَخَبَّطُهُ الشَّيْطَانُ مِنَ الْمَسِّ ۗ ... الخ﴾ (البقرۃ: ۲۵)

”جو لوگ سود کھاتے ہیں وہ قبروں سے اس طرح حواس باختہ اٹھیں گے جیسے کسی کو جن نے لپٹ کر دیوانہ بنا دیا ہو۔“

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَ ذَرُوا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبَا إِن كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ ۝ فَإِنْ لَّمْ تَفْعَلُوا فَأْذَنُوا بِحَرْبٍ

مِنَ اللَّهِ وَ رَسُولِهِ ۝﴾ (البقرۃ: ۲۷۸، ۲۷۹)

”اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اگر ایمان رکھتے ہو تو جتنا سود باقی رہ گیا ہے اس کو چھوڑ دو۔ پھر اگر ایسا نہ کرو گے تو تم اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے اعلان جنگ سن لو۔“

دیکھیے سورۃ آل عمران، یہ بھی مدنی ہے:

﴿إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا لَنْ نُغْفِرَ عَنْهُمْ أَمْوَالَهُمْ وَ لَا أَوْلَادَهُمْ مِنَ اللَّهِ شَيْئًا ۚ وَأُولَئِكَ هُمُ وُقُودُ النَّارِ ۝ كَذَّابِ  
إِل فِرْعَوْنُ ۚ وَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۚ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا ۚ فَآخَذَهُمُ اللَّهُ بِذُنُوبِهِمْ ۚ وَ اللَّهُ شَدِيدُ الْعِقَابِ ۝ قُلْ

لَّذِينَ كَفَرُوا سَخُطُونَ وَ تُخَشَرُونَ اِلَىٰ جَهَنَّمَ ۗ وَ يَسْأَلُ الْيَهُودُ ﴿١٠﴾ (آل عمران: ۱۰-۱۲)

”جو لوگ کافر ہوئے اس دن نہ تو ان کا مال ہی اللہ کے عذاب سے ان کی بچا سکے گا اور نہ ان کی اولاد ہی کچھ کام آئے گی اور یہ لوگ آتشِ جہنم کا ایندھن ہوں گے۔ ان کا حال بھی فرعونوں اور ان سے پہلے لوگوں کا سا ہوگا جنہوں نے ہماری آیات کی تکذیب کی تھی تو اللہ نے ان کو ان کے گناہوں کے سبب عذاب میں پکڑ لیا تھا اور اللہ سخت عذاب کرنے والا ہے۔ اے پیغمبر (ﷺ)! کافروں سے کہہ دیجیے کہ تم دنیا میں بھی عن قریب مغلوب ہو جاؤ گے اور آخرت میں جہنم کی طرف اکٹھے کیے جاؤ گے اور وہ بڑی جگہ ہے۔“

پس ثابت ہوا کہ قرآن کریم کی دونوں قسموں میں شدت و سختی شامل ہے۔ کیوں کہ فرد اور جماعت کی اصلاحی تربیت اور قوموں و ریاستوں کی سیاسی حکمتِ عملیوں کا تقاضا یہ ہی ہے کہ ان کی راہ نمائی کے لیے جو قانون بنائے جائیں ان میں ترغیب و ترہیب، وعدہ و نہید اور سختی اور نرمی کا خوب صورت امتزاج ہونا چاہیے۔

مزید یہ کہ ان کا یہ دعویٰ کہ صرف کئی ہی تشدد ہے اس سے قسم دہنی کے حوالے سے یہ دعویٰ مفہوم ہوتا کہ وہ نرمی اور درگزر میں انفرادیت رکھتا ہے جب کہ قسم کئی نرمی اور درگزر سے خالی ہے۔ حالانکہ یہ مفہوم باطل ہے۔ اس مفہوم کے باطل ہونے کی دلیل یہ ہے کہ سؤرہ یکہ میں بہت سی ایسی آیات کریمہ ہیں جن سے چشمے پھوٹ رہے ہیں نرمی اور درگزر کے قطرے برس رہے ہیں سماحت و عنو کے، بلکہ وہ آیات تو منادی کر رہی ہیں کہ برائی کا بدلہ اچھائی سے لو۔ دیکھیے سورۃ فصلت جو کہ یکہ ہے:

﴿وَمَنْ أَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَا إِلَى اللَّهِ وَ عَمِلَ صَالِحًا وَقَالَ اِنِّى مِنَ الْمُسْلِمِينَ ﴿٣٥﴾ وَلَا تَسْتَوِي الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ ۗ اِذْ قُلْنَا يَا اِنِّى هِىَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِى بَيْنَكَ وَ بَيْنَهُ عَدَاوَةٌ كَاَنَّهُ وَلِىٌّ حَمِيمٌ ﴿٣٦﴾ وَ مَا يُلْقِيهَا اِلَّا الَّذِىْنَ صَبَرُوْا ۗ وَ مَا يُلْقِيهَا اِلَّا ذُو حِزِّ عَظِيْمٍ ﴿٣٧﴾﴾ (فصلت: ۳۳-۳۵)

”اور اس شخص سے بڑھ کر بات کا اچھا کون ہو سکتا ہے جو اللہ کی طرف بلائے اور عمل نیک کرے اور کہے کہ مسلمان ہوں۔ اور بھلائی اور برائی برابر نہیں ہو سکتی۔ تو سخت کلامی کا ایسے طریق سے جواب دو، جو بہت اچھا ہو۔ ایسا کرنے سے تم دیکھو گے کہ جس میں اور تم میں دشمنی تھی اور تمہارا گرم جوش دوست ہے۔ اور یہ بات ان ہی لوگوں کو نصیب ہوتی ہے جو برداشت کرنے والے ہیں۔ اور ان ہی کو حاصل ہوتی ہے جو بڑے صاحبِ نصیب ہیں۔“

اسی طرح سورۃ الشوریٰ، جو یکہ ہے، میں اللہ سبحانہ و تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿فَمَا اُوْتِيْتُمْ مِنْ شَيْءٍ فَمَتَّاعٌ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۗ وَ مَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ وَ اَبْغَىٰ لِّلَّذِىْنَ اٰمَنُوْا ۗ عَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ ﴿٥٠﴾ وَ الَّذِىْنَ يَجْتَنِبُوْنَ كِبْرَ الْاَلْفِى ۗ وَ الْفَوَاحِشِ ۗ وَ اِذَا مَا غَضِبُوْا هُمْ يَغْفِرُوْنَ ﴿٥١﴾ وَ الَّذِىْنَ اسْتَجَابُوْا لِرَبِّهِمْ ۗ وَ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ ۗ وَ اَمْرُهُمْ شُورٰى بَيْنَهُمْ ۗ وَ مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ﴿٥٢﴾ وَ الَّذِىْنَ اِذَا اَصَابَهُمُ الْبَغْيُ هُمْ يَنْتَصِرُوْنَ ﴿٥٣﴾ وَ جَزَاؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا ۗ فَمَنْ عَفَا ۗ وَ اَصْلَحَ ۗ فَاعْرِهٗ عَلَى اللّٰهِ ۗ اِنَّهٗ لَا يَحِبُّ الظَّالِمِيْنَ ﴿٥٤﴾ وَ لَمَنْ اَنْتَصَرَ بَعْدَ ظُلْمِہٖ ۗ فَاُولٰٓئِكَ مَا عَلَيْهِمْ مِنْ سَبِيْلٍ ﴿٥٥﴾ اِنَّمَا السَّبِيْلُ عَلَى الَّذِىْنَ يَظْلِمُوْنَ النَّاسَ ۗ وَ يَبْغُوْنَ فِى الْاَرْضِ ۗ بِغَيْرِ الْحَقِّ ۗ

أُولَئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ⑥ وَ لَمَن صَبَرَ وَ غَفَرَ إِنَّ ذَٰلِكَ لَمِنَ الْأَمْرِ ⑦ ﴿ (الشوری: ۳۶-۳۷)

”جو مال و متاع تمہیں دیا گیا ہے وہ دنیا کی زندگی کا ناپائیدار فائدہ ہے اور جو کچھ اللہ کے ہاں ہے وہ بہتر اور باقی رہنے والا ہے یہ ان لوگوں کے لیے ہے جو ایمان لائے اور اپنے پروردگار پر بھروسہ رکھتے ہیں۔ اور جو بڑے بڑے گناہوں اور بے حیائی کے کاموں سے پرہیز کرتے ہیں اور جب غصہ آتا ہے تو معاف کر دیتے ہیں۔ اور جو اپنے پروردگار کا فرمان قبول کرتے ہیں اور نماز پڑھتے ہیں۔ اور اپنے کام آپس کے مشورے سے کرتے ہیں۔ اور جو مال ہم نے ان کو عطا کیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔ اور جو ایسے ہیں کہ جب ان پر ظلم و زیادتی ہو تو مناسب طریقے سے بدلہ بھی لیتے ہیں۔ اور برائی کا بدلہ تو اسی طرح کی برائی ہے۔ مگر جو زر کر کے اور معاملے کو درست کر دے تو اس کا بدلہ اللہ کے ذمے ہے۔ اس میں شک نہیں کہ وہ ظلم کرنے والوں کو پسند نہیں فرماتا۔ اور جس پر ظلم ہوا مگر وہ اس کے بعد انتقام لے لے تو ایسے لوگوں پر کچھ الزام نہیں۔ الزام تو ان لوگوں پر ہے جو لوگوں پر ظلم کرتے ہیں اور ننگ میں ناحق فساد پھیلاتے ہیں۔ یہ ہی لوگ ہیں جن کو تکلیف دینے والا عذاب ہوگا۔ اور جو صبر کرنے اور قصور معاف کر دے تو یہ بڑی ہمت کے کام ہیں۔

اور اسی طرح اور بھی مثالیں ہیں جو تمام کی سورتوں سے لی گئی ہیں۔ جیسے

﴿ وَ لَقَدْ آتَيْنَاكَ سَبْعًا مِنَ الْمَثَانِي وَالْقُرْآنَ الْعَظِيمَ ⑥ لَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ إِلَىٰ مَا مَتَّعْنَا بِهِ أَزْوَاجًا قَبْلَهُمْ وَ لَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَ اخْفِضْ جَنَاحَكَ لِلْمُؤْمِنِينَ ⑦ ﴾ (الحجر: ۸۷-۸۸)

”اور ہم نے تم کو سات آیتیں جو نماز میں ذہرا کر پڑھی جاتی ہیں یعنی سورۃ الفاتحہ اور عظمت والا کلام عطا فرمایا ہے۔ ہم نے کفار کی کئی جماعتوں کو جن کو فوائد دنیوی سے سزا ہے تم ان کی طرف رغبت سے آنکھ اٹھا کر نہ دیکھنا اور نہ ان کے حال پر رنج و غم کرنا اور مومنوں کے ساتھ تواضع سے پیش آنا۔“

﴿ قُلْ يُبَغَىٰ دَىٰ الدِّينِ أَسْرَفُوا عَلَىٰ أَنفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوا مِن رَّحْمَةِ اللَّهِ إِنَّ اللَّهَ يَغْفِرُ الذُّنُوبَ جَمِيعًا إِنَّهُ هُوَ الْغَفُورُ الرَّحِيمُ ⑥ ﴾ (الزمر: ۵۷)

”اے پیغمبر ﷺ! میری طرف سے لوگوں کو کہہ دیجیے کہ اے میرے بندو! جنہوں نے اپنی جانوں پر زیادتی کی ہے اللہ کی رحمت سے ناامید نہ ہونا۔ اللہ سب گناہوں کو بخش دیتا ہے۔ بے شک وہ ہی تو ہے بڑا بخشنے والا بڑا مہربان۔“

① اور جہاں تک ان کے اس دعوے کی بات ہے کہ قسم کسی میں سبب ہے۔ اور وہ سبب کا وہ ہی معنی مراد لیتے ہیں جو ان کے نزدیک مشہور و معروف ہے یعنی ڈھٹائی، فحش کلامی اور ادب و لیاقت کی حدود سے خارج ہو کر بات کرنا۔ تو تحقیق وہ یہ دعویٰ کر کے اس آیت کا مصادیق قرار پائے ہیں:

﴿ كَبُرَتْ كَلِمَةً تَخْرُجُ مِنْ أَفْوَاهِهِمْ ۚ إِنَّ يَقُولُونَ ۖ إِنَّ كَذِبًا ⑥ ﴾ (الکہف: ۵)

”یہ بڑی سخت بات ہے جو ان کے منہ سے نکلتی ہے۔ اور کچھ شک نہیں کہ یہ جو کچھ کہتے ہیں محض جھوٹ ہے۔“

ہم ان معترضین کو چیلنج کرتے ہیں کہ پورے قرآن میں سے خواہ وہ کی حصہ ہو یا مدنی، صرف ایک مثال ایسی پیش کریں جس



میں گھٹیا یا بُش لفظ استعمال ہوا ہو۔ کیا یہ بات قابل فہم ہے کہ قرآن، جو کہ لوگوں کو آداب کے اصول سکھانے آیا تھا، وہ خود آداب کے دائرے سے خارج اور سبب کی طرف مائل ہے؟ اور اگر (العیاذ باللہ) ایسا ہے تو پھر اس نے اپنے تعین یعنی اہل ایمان کو اپنے مشرک دشمنوں کے حق میں سبب کو حرام قرار کیوں دیا؟ دیکھیے سورۃ الانعام کی یہ آیت:

﴿وَلَا تَسْبُوا الَّذِينَ يَدْعُونَ مِن دُونِ اللَّهِ فَيَسْبُوا اللَّهَ عَدُوًّا بِغَيْرِ عِلْمٍ...﴾ (الانعام: ۱۰۸)

”اور جن لوگوں کو یہ مشرک اللہ کے سوا پکارتے ہیں ان کو بزانہ کہنا یہ بھی کہیں اللہ کو بے ادبی سے بے سمجھے بزانہ کہہ بیٹھیں۔“  
ہاں، صرف قسم کی ہی نہیں بلکہ پورے قرآن مجید میں، واضح جج و براہین کو نظر انداز کرنے والے آنکھوں سے اندھے اور کانوں سے بہرے طلحہ زن اپنی احمقانہ سوچ سے جس کو نامناسب کہہ رہے ہیں وہ تکلم و لہجے میں کسی قدر سختی کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں۔ لیکن پورا قرآن مجید اپنے اس انداز میں کہیں بھی نہ تو آداب کے دائرے سے باہر نکلا، نہ ہی حق و سچائی کے راستے سے منحرف ہوا اور نہ ہی سبیلِ حکمت سے ہٹا۔ بلکہ اس نے تو حکمت کا مقتضا پورا کیا ہے، وہ یہ کہ ان کے ساتھ شدت اختیار کیا جائے کیوں کہ وہ اسی کے سخت ہے، ان کے لیے اسی شدت میں مصلحت ہے، یہ ہی ان کے حق میں رحمت اور خیر ہے تاکہ وہ باطل سے باز آجائیں، متوجہ ہو جائیں حق و رشد کی آواز کی جانب اور چل پڑیں دلیل و حجت کی راہ پر۔ ایسے ہی موقع پر شاعر کہتا ہے:

فقسا لیز دجروا ومن نیک حازما  
فلیقس آحیانا علی من یرحم

”اُس شخص نے سختی استعمال کی تاکہ نصیحت حاصل ہو اور جو شخص بھی سمجھ دار ہے اس کو چاہیے کہ کبھی کبھی سختی کیا کرے اس شخص کے ساتھ جس کے ساتھ وہ شفقت کرتا ہے۔ (یعنی ایسی سختی شفقت ہی میں شام کی جانے گی۔ اگرچہ اس کا احساس شفقت میں شمار کرنے کا نہیں ہوتا۔ لیکن وہ سختی جو اصلاح و ترقی کے لیے کی جائے، شفقت ہی کا ایک جزو ہوتی ہے۔)

میں اس پر مزید اضافہ کر کے کہتا ہوں کہ یہ سختی والا لہجہ صرف سورتوں میں ہی نہیں پایا جاتا بلکہ یہ تو آپ کو مدنی سورتوں میں بھی نظر آئے گا وہ الگ بات ہے کہ سورتوں میں یہ سختی نسبتاً مدنی سورتوں کے زیادہ ہے کیوں کہ اہل مکہ دشمنی دے مروی میں بہت زیادہ شدید تھے، عناد اور آباء پرستی کی تمام حدیں عبور کر چکے تھے اور نقصان پہنچانے کا کوئی ایسا دروازہ نہ تھا جس کو انھوں نے رسول اللہ ﷺ اور ان کے ساتھیوں پر کھولنے کی کوشش نہ کی ہو۔ حتیٰ کہ ان کو رات کے وقت اپنے شہر اور اپنے خاندان کو چھوڑنے پر مجبور کیا اور پھر اسی پر اکتفا نہ کیا بلکہ وہ جہاں ہجرت کر گئے، وہاں بھی تکالیف پہنچانے کے درپے رہے۔

مدنی سورتوں میں لہجے کی سختی پر درج ذیل آیات شاہد ہیں۔

① سورۃ البقرۃ میں مشرکین سے متعلق وارد ہوا ہے:

﴿إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا سَوَاءٌ عَلَيْهِمْ ءَأَنذَرْتَهُمْ أَمْ لَمْ تُنذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ ٥٠ حَتَّمَ اللَّهُ عَلَى قُلُوبِهِمْ وَعَلَى سَمْعِهِمْ ٥١ وَعَلَى أَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ ٥٢ وَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ ٥٣﴾ (البقرۃ: ۵۰، ۵۱، ۵۲)

سورۃ البقرۃ میں منافقین سے متعلق ارشاد ہوتا ہے:

﴿وَمِنَ النَّاسِ مَن يَقُولُ آمَنَّا بِاللَّهِ وَ بِالْيَوْمِ الْآخِرِ وَ مَا هُمْ بِمُؤْمِنِينَ ٥٤﴾ (البقرۃ: ۵۴)



## مسائل العرفان فی علوم القرآن: جلد ①

اس آیت سے گلی تیرہ آیات تک تمام میں تو بیخ و تعین بھری ہوئی ہے، ان حشرات (سانپ اور بچھو وغیرہ) کے لیے جو انسانی شکل میں تھے اور اپنا ہر معاشرے میں پھیلا رہے تھے اور اسلامی ماحول میں دو دھاری لکڑی یعنی نفاق اور حنک کے ساتھ نسا و پنا کر رہے تھے۔ اور اسی طرح آپ مدنی سورتوں میں بھی یہود سے متعلق بہت سی ایسی آیات دیکھیں گے جو ان پر تنقید کرتی ہیں، ان کے جرائم کو عیاں کرتی ہیں، ان کے اور ان کے آباء کی جنایات کو بے نقاب کرنے کے لیے حملہ آور ہوتی ہیں۔ جیسا کہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ کا قول ہے:

⑤ ﴿صُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذَّلِيلَةُ أَمَّا مَا تَقْفُوا إِلَّا بِالْحَبِيلِ مِنَ اللَّهِ وَ حَبِيلِ مِنَ النَّاسِ وَ بَاءُؤُ بِغَضَبٍ مِنَ اللَّهِ وَ صُرِبَتْ عَلَيْهِمُ النَّسِئَةُ ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ كَانُوا يَكْفُرُونَ بِآيَاتِ اللَّهِ وَ يَقْتُلُونَ الْأَنْبِيَاءَ بِغَيْرِ حَقٍّ ذَٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَ كَانُوا يَعْتَدُونَ ﴿١١٣﴾ (آل عمران: ۱۱۳)

⑥ ﴿بِئْسَمَا اشْتَرَوْا بِهِ أَنْفُسَهُمْ أَن يَكْفُرُوا بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ بَغْيًا أَنْ يَنْزِلَ اللَّهُ مِنْ فَضْلِهِ عَلَىٰ مَنْ يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ ۗ قَبْلَ ذَٰلِكَ وَعَصَىٰ عَلَىٰ غَضَبٍ ۗ وَ لِلْكَافِرِينَ عَذَابٌ مُّهِينٌ ﴿٩٠﴾ (البقرہ: ۹۰)

اور نساوری سے متعلق ارشاد ہوتا ہے:

⑦ ﴿إِذْ قَالَ اللَّهُ لِعِيسَىٰ إِنِّي مُتَوَفِّيكَ وَ رَافِعُكَ إِلَيَّ وَ مَطَهِّرُكَ مِنَ الَّذِينَ كَفَرُوا وَ جَاعِلُ الَّذِينَ اتَّبَعُوكَ فَوْقَ الَّذِينَ كَفَرُوا إِلَىٰ يَوْمِ الْقِيَامَةِ ۗ ثُمَّ إِلَىٰ مَرْجِعِكُمْ فَأَخَذَكُمْ بَيْنَهُمْ فِيمَا كُنْتُمْ فِيهِ تَخْتَلِفُونَ ﴿٥٦﴾ فَأَمَّا الَّذِينَ كَفَرُوا فَأَعَادَ إِلَيْهِمْ عَذَابًا شَدِيدًا فِي الدُّنْيَا وَ الْآخِرَةِ ۗ وَ مَا لَهُمْ مِنْ نَاصِرِينَ ﴿٥٥﴾ (آل عمران: ۵۵-۵۶)

⑧ ﴿إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا بَعْدَ آيَاتِنَا لَهُمْ نُجُودًا كُفْرًا لَنْ نُقْبَلُ تَوْبَتَهُمْ ۗ وَ أُولَٰئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ ﴿٩٠﴾ (آل عمران: ۹۰)

اور یہی بات ان سورتوں و آیات کی جن پر انھوں سے سبب کا شبہ ظاہر کیا ہے۔ وہ آیات ہرگز ولات نہیں کرتیں اس شبہ پر جو انھوں نے سمجھا اور جس کی وجہ سے وہ قرآن کریم کو بدنام کرنا چاہتے ہیں۔ مثلاً سورۃ لہب، یہ سورت الہلب اور اس کی بیوی کے لیے غایت درجے کے انذار پر مشتمل ہے اور اس کے الفاظ اس اذیت کے جواب میں نازل کیے گئے ہیں جو وہ رسول اللہ ﷺ اور ان کے ساتھیوں کو پہنچاتے تھے۔ جیسا کہ اس سورت کا شان نزول بھی اسی پر دلالت کرتا ہے، جس کی تخریج امام احمد، شعبین اور امام ترمذی نے کی ہے اور وہ منقول ہے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے۔ فرماتے ہیں کہ جب آیت: ﴿وَ أَنْذِرْ عَشِيرَتَكَ الْأَقْرَبِينَ ﴿٦١﴾﴾ (اشعرا: ۲۱۳) نازل ہوئی تو آپ ﷺ کو وہ صفا پر تشریف لے گئے اور سنا دی فرمائی: "اے بنو نصر! اے بنو عدی!" (یہ قریش کے مختلف خاندانوں کے نام ہیں)۔ یہاں تک کہ تمام قریش جمع ہو گئے۔ پس جو شخص بھی کوہ صفا پر آ سکتا تھا یا اور جو نہیں آ سکتا تھا اس نے اپنی طرف سے کوئی نائب مقرر کر دیا تاکہ وہ دیکھے کہ کیا معاملہ ہے۔ پس الہلب اور دیگر قریش بھی آئے۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: اگر میں تمہیں یہ کہوں کہ اس داوی (یا پہاڑ) کے پیچھے سے ایک لشکر تم حملہ کرنے والا ہے۔ تو کیا تم میری تصدیق کر دو گے؟ ان سب نے ایک زبان ہو کر کہا کہ ہم نے آپ کو ہمیشہ سچا ہی پایا ہے (یعنی ہم آپ کی تصدیق کریں گے)۔ آپ ﷺ نے فرمایا: پس میں تمہیں اس سخت عذاب سے ڈرانے والا ہوں جو تمہارے سامنے ہے۔ اس موقع پر الہلب نے کہا: رَبَّنَا لَكَ الْكِبْرَاءُ فَجْعَلْنَا؟ (ہلاکت ہو تیرے لیے۔ کیا تو نے اس لیے ہمیں یہاں جمع کیا تھا؟) (نمود با اللہ)۔ پس اس موقع پر یہ آیت نازل ہوئی۔

ابن حاتم اور ابن جریر نے تخریج کی ہے: ابن زید سے مروی ہے کہ ابولہب کی بیوی کا نئے دارجھاڑیاں چن کر لاتی تھی اور رات کے وقت رسول اللہ ﷺ کے راستے میں پھیلا دیتی تھی۔ اور مجاہد سے مروی ہے کہ ابولہب کی بیوی حضور اکرم ﷺ سے متعلق چغل خوری (اور نامناسب باتیں) کیا کرتی تھی۔

پس یہ تمام اسباب اسی امر کا تقاضا کرتے ہیں کہ ایک سورت ابولہب کے مقابلے میں نازل ہوتی، جس میں اس کی ہلاکت و بربادی کی دھمکی ہوتی اور یہ وضاحت ہوتی کہ اس کا مال اور اولاد اس کے کچھ کام نہیں آئے گی۔ وہ اور اس کی بیوی خسارے میں رہیں گے۔ اور ان کا ٹھکانا جہنم ہوگا جو کہ بہت ہی بڑی جگہ ہے۔

اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اس وعید شدید میں ابولہب اور اس کی طرح کے لوگوں کے لیے سخت ڈانٹ ہے اور ان لوگوں کے لیے تسلی اور حوصلہ افزائی کا عنصر ہے جن کو ان کی طرف سے اذیتیں پہنچی تھیں۔ لہذا اس موقع پر ڈانٹ اور سختی پر مبنی کلام ہی عدالت الہیہ اور حکمت ربانیہ کے زیادہ لائق و انسب تھا۔

موضع الندی فی موضع السیف بالعللا

مضمر کو وضع السیف فی موضع الندی

(سختی کی جگہ نرمی کرنا اسی طرح نقصان وہ ہے جیسے نرمی کی جگہ میں سختی کرنا)

اور وہی بات سورۃ العصر کی۔ تو سورۃ العصر میں نہ ہی تو کوئی سبب ہے اور نہ ہی اس کے مشابہ کچھ اور۔ ہاں اتنا ضرور ہے کہ اس سورت نے انسانوں کی دو قسمیں بیان کی ہیں۔ ایک قسم وہ جو نسران میں ڈوب چکی ہے اور دوسری وہ جو اس نسران سے نجات پا کر کامیاب ہو چکی ہے۔ یعنی وہ کامیاب لوگ جن میں سعادت کے عناصر اربعہ پائے جاتے ہیں۔ دیکھیے:

﴿وَالْعَصْرِ ۝۱ إِنَّ الْإِنْسَانَ لِرَبِّهِمْ لَكَفُورٌ حَسْبُ ۝۲ إِلَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ وَكُوا صَوَابًا بِالْحَقِّ ۝۳ وَكُوا صَوَابًا بِالنُّصُورِ ۝۴﴾

”عصر کی قسم۔ کہ انسان نقصان میں ہے۔ مگر وہ لوگ جو ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے اور آپس میں حق بات کی تلقین اور صبر کی تاکید کرتے رہے۔“ (العصر: ۱-۳)

پس آپ نے اس سورت میں کہیں سبب یا نامناسب بات کی پر چھائی بھی دیکھی ہے؟ لیکن معترضین تو م کو شرم نہیں آتی۔ اور وہی بات سورۃ انکاخر کی۔ تو اس سورت میں مبلغ انداز میں اشارہ ہے اس طرف کے مخاطبین کو دنیا کی مشغولیت نے دین سے غافل کر رکھا ہے اور مال و دولت نے مال و دولت کے پیدا کرنے والے سے دور کر رکھا ہے۔ یہاں تک کہ اسی حال میں ان کی عمریں ختم ہو جاتی ہیں۔ اور کل کو یعنی روز قیامت ان سے ان نعمتوں کے بارے میں پوچھا جائے گا۔ اور ان کا اس ناشکر کی وجہ سے انجام عذاب تجم ہوگا۔

اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد: ﴿فَصَبَّ عَلَيْهِمْ رَبُّكَ سَوْطًا عَذَابٍ ۝۱﴾ (الحجر: ۱۳) اصل میں حکایت ہے ان واقعات کی جو سابقہ اُم شموود عباد کے ساتھ اس وقت پیش آئے، جب انھوں نے بلاد میں خوب سرکشی اور فساد پھا کر دیا تھا۔ اور قرآن مجید میں ان واقعات کو ذکر کرنے میں حکمت یہ ہے کہ یہ قصص و اخبار کفار کے لیے عبرت و ازواج ثابت ہو جائیں اور وہ اپنے اسلاف کی طرح ان نافرمانیوں میں نہ پڑ جائیں۔ کیوں کہ اللہ کی سنت تو تمام امتوں کے لیے ایک ہی ہے اور اس کا میزان عدل بھی ہر قوم و قبیل کے لیے ایک ہی



ہے، تمام دشمنوں کی زبانوں کے لیے لگام ہے اور ہر منکبہ اور حاسد کو سزا دینے اور جلانے کا سبب ہے۔ وہ حقیقت یہ ہے کہ کئی سو برسوں کی آیات مکمل طور پر قتال، جہاد اور لڑائی کے احکام سے خالی ہیں، جیسا کہ وہ آیات اپنی طوالت و کثرت کے باوجود ان اہل مکہ کے ساتھ قتال و مقابلہ کے واقعات سے خالی ہیں۔ حالانکہ اہل مکہ نے مسلمانوں کے ساتھ وہ کچھ کیا تھا کہ ان کے مثل کرنے والوں کے و کثرت ساتھ مقابلہ کیا جاتا ہے۔ لیکن اس سب کے باوجود کئی دور میں مسلمانوں کی طرف سے نہ ہی تو کمپروایوں کی جھنجھرائی دیتی ہے، نہ ہی اسلحہ کی گونج کانوں میں پڑتی ہے اور نہ دشمنوں پر دھاوا بولنے کی منادی سننے کو ملتی ہے۔ بلکہ سنائی دیتا ہے تو صبر کا حکم، کانوں میں گونج پڑتی ہے تو عفو و درگزر کی اور اگر کوئی منادی سننے کو ملتی ہے تو احسان مندی، قدر دانی اور خیر سگالی کی۔ اگرچہ اہل مکہ ان کو اذیت دینے میں تمام حدیں پار کر چکے تھے، ان کے ساتھ بے مروتی و بدگمانی کی تمام پیمانے توڑ چکے تھے، ان کو سب و شتم اور قتل و غارت کی خطرناک گھائیوں میں اتار چکے تھے، ان پر بائیکاٹ اور قطع تعلقی کی بجلیاں گرا چکے تھے اور ان پر طرح طرح کے مظالم اور ملامتوں کے پہاڑ توڑ چکے تھے۔

⑤ (پہلے شبہ کے چار اجزا ہیں جیسا کہ قابل گزرا۔ ان میں سے تیسرا جزویہ ہے) اور ہر معاشرے میں گمان کی قسم کئی پست درجے کی خصوصیات، علوم و امثال پر مبنی ہے۔ تو ان کا یہ گمان بھی مردود ہے اور وہ اس گمان کو جس دروازے سے بھی داخل کرنا چاہیں گے اُسے مسدود پائیں گے اور وہ اس کی جو توجیہ بھی بیان کرنا چاہیں کہ اس کا رد انہیں مل جائے گا۔ کیوں کہ اگر وہ اپنے توہم کے مطابق، اس سے، یہ مراد لیتے ہیں کہ قسم کئی اپنی سختی، شدت اور سبب میں منفرد ہے تو آپ اس سے متعلق پہلے جان چکے ہیں کہ ان کا یہ توہم محض کذب، افتراء اور جہالت پر مبنی ہے۔ کیوں کہ قرآن کریم میں جو آیا ہے وہ ترغیب و ترہیب کے قبیل سے ہے اور وہ صرف قسم کئی ہی میں نہیں بلکہ کئی و مدنی دونوں میں یکساں ہے۔

اور اگر وہ پست درجے کی خصوصیات سے کئی آیات کے مختصر ہونے یا شرعی احکام کی تفصیلات سے خالی ہونے کی طرف اشارہ کرنا چاہتے ہیں تو اس سے پست خصوصیات پر دلالت نہیں ہوتی۔ بلکہ کئی آیات کے مختصر ہونے اور احکام شریعت کی تفصیلات سے خالی ہونے کی تو ایک اور وجہ ہے، جس کو آئندہ آنے والے شبہات میں بیان کیا جائے گا۔

اور اگر ان کی مراد یہ ہے کہ اہل مکہ فصاحت و بلاغت، بیان و ذکاوت، زبان و فطانت میں پست درجے کی خصوصیات کا شکار تھے تو معترضین کی یہ مراد ان کی اپنی تباہی و ذلت کے لیے کافی ہے۔ کیوں کہ تاریخ اس پر شاہد ہے کہ قریش کو عرب کے تمام قبائل میں مرکزی قیادت حاصل تھی۔ تمام قبائل عرب ان کی رائے کا احترام کرتے تھے۔ ان کے فیصلوں پر عمل کرتے تھے۔ ان سے سیکھتے تھے۔ اُنوں کی پشتوں پر سوار ہو کر در دراز سے سفر کر کے ان کے پاس آتے تھے اور کلام کی دونوں اقسام یعنی منظوم اور منثور میں ان کے فیصلے کے سامنے سرنگورہتے تھے۔ الغرض تمام قبائل عرب قریش سے متعلق یہ جانتے تھے کہ وہ فصاحت، بلاغت، ذکاوت، زبان و فطانت اور اعزاز و قیامت جیسی اعلیٰ صفات سے متصف ہیں۔ اور قریش کو یہ امتیازات اسلام سے پہلے ہی حاصل تھے پھر آمد اسلام کی برکت سے ان امتیازات میں ایسی مداومت اور اضافہ رونما ہوا، جس کا اعتراف اہل مدینہ اور ان کے علاوہ تمام عرب و عجم نے کیا۔

قسم کئی کو پست درجے کی خصوصیات کے ساتھ متصف ماننا وہ اِزْلام بے باکانہ، طعنہ آوارانہ اور کذب کا شفا ہے جس کو اعدائے اسلام نے اسلام کی دعوت کا انکار کرنے لیے اپنے لیے پسند کر لیا تھا، خواہ وہ اعدائے اسلام مشرکین میں سے ہوں یا انہیں کتاب میں سے، عرب و عجم میں سے ہوں یا امیین و متفقین میں سے ہوں۔ جب کہ عرب اپنی امتیت کے باوجود کلام کے تمام نشیب و فراز

اور علو و نزول سے، سب لوگوں سے نسبتاً زیادہ واقف تھے۔ جیسا کہ وہ رسول اللہ ﷺ کو تکلیف پہنچانے میں، ان کے دلائل کو توڑنے میں، ان کی دین میں نقض نکالنے میں اور اسلام کو ان کے گہوارے میں ہی ختم کرنے پر سب لوگوں سے نسبتاً زیادہ حریص تھے۔ لیکن ان کے مزاج نے ان کے اس بے کار و لغو بات کی اجازت نہ دی جس کی طرف آج طہرین نکل پڑے یعنی قسم کی میں پست درجے کی خصوصیات کا دعویٰ کرنا۔ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ قرآن کریم نے ان پر حیرت انگیز طور پر بادشاہت اختیار کر لی تھی اور قرآن کریم نے اپنی قوت کے ساتھ ان کو اسلام کی طرف کھینچنا اور عناد کو ختم کرنا شروع کر دیا تھا۔ ان میں سے جب کوئی قرآن سننا تو وہ قرآن کی بلاغت کے سامنے جھک جاتا اور اس کی فصاحت سے اس کے بدن پر لڑا طاری ہو جاتا اور وہ قصداً اپنے آپ کو کسی اور کام میں مشغول کر لیتا، اس بات سے خوف کھاتے ہوئے کہ کہیں وہ ایمان نہ لے آئے۔

اور معترضین کا یہ گمان کہ قسم کی اور قسم مدنی میں باہمی ربط نہیں ہے بلکہ ان دونوں کے اسلوب آپس میں متعارض ہیں۔ تو ان کا یہ گمان سابقہ غلط فہمیوں پر مبنی ہے جسے ہم ماقبل غلط ثابت کر چکے ہیں۔ نیز یہ ایک ایسا احمقانہ دعویٰ ہے جس کو حقیقت جھوٹا قرار دیتی ہے اور منصفانہ و بیغیانہ مزاج رکھنے والے اس کی تردید کرتے ہیں۔ اور اس امر پر سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ مکہ میں رہنے والے اعدائے اسلام جو کہ بلاغت میں کیسا تھے قرآن کریم کے زمانہ نزول میں بھی تنزیل کے اسالیب پر الزام و اتہام لگانے کی طاقت نہ رکھتے تھے جیسا کہ آج کے دور میں طہرین الزام و اتہام لگا رہے ہیں۔ کیوں کہ اہل مکہ آج کے طہرین سے زیادہ علم و عقل رکھتے تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ قرآن کریم کے اسلوب میں عدم یکسانیت کا الزام و اتہام ایک ایسا کذب ہے جو چھپانے میں رے گا اور ایسا افترا ہے جو اپنے گھرنے والے کو کل عالم میں رُسا اور ذلیل کر دے گا۔ بلکہ قریش کے ایک سردار ولید بن مغیرہ (جو کہ عرب کا بہت بڑا شاعر و ادیب بھی تھا) نے جب نبی کریم ﷺ کو قرآن پڑھتے ہوئے سننا تو اپنے ساتھیوں کو آ کر کہا:

((وَاللّٰهُ لَقَدْ سَمِعْتُ مِنْ مُحَمَّدٍ اِنْفَاً كَلَامًا مَّا هُوَ مِنَ الْاِنْسِ وَلَا مِنْ كَلَامِ الْاِنْسِ اِنَّ لَهٗ لَخَلْقًا وَّوَاوَانًا عَلَیْهِ لَطَلَاوَةٌ وَّاِنَّ اَعْلَاهُ لَمُنْمِرٌ وَّاِنَّ اَسْفَلَهُ لَمُعِدِیٌّ وَاِنَّهٗ یَعْلُوْ وَّمَا یُعْلٰی))

”اللہ کی قسم میں نے ابھی ابھی محمد (ﷺ) سے ایک ایسا کلام سنا ہے جو نہ ہی تو کسی انسان کا کلام ہے اور نہ ہی کسی جن کا۔ اس کلام میں ایک خاص مٹھاس ہے۔ اس میں عجب حلاوت و شیرینی ہے۔ اس پر (ایک خاص) طراوت و تازگی ہے اور وہ کلام اوپر سے شرمسار اور نیچے سے چشمہ دار ہے۔ یقیناً وہ کلام غالب آ کر رہے گا کبھی مغلوب نہ ہوگا۔“

ولید کا یہ کہنا تھا کہ قریش بولے: ”اللہ کی قسم ولید تو نے اپنا دین بدل لیا۔“ پھر اسے قرآن کریم پر طعن کرنے کے لیے اُبھارنے لگے۔ اب ولید نے اس کے سوا کوئی حیلہ نہ پایا کہ قرآن کریم پر سحر ہونے کا الزام لگا دے۔ لہذا اس نے کہا: ﴿فَقَالَ اِنَّ هٰذَا اِلَّا جَعْرٌ یُّؤْتٰرُ﴾ (الذہر: ۲۴) ”یہ قرآن اثر کرنے والے جادو کے سوا کچھ نہیں۔“ الغرض یہ کہ ولید کی بھی یہ جرأت نہ ہو سکی کہ وہ قرآن کریم کی آیات میں کسی قسم کی پست خصوصیات کا دعویٰ کرے یا اس کے اجزائے مابین عدم ربط و عدم مطابقت کا الزام لگائے یا اس کے اسالیب میں سے کسی پر انخطاط کا حکم لگائے۔

④ اور جب معترضین کے سابقہ تمام زعم باطل ہو گئے تو ان کا یہ زعم کے قرآن پاک معاشرے و ماحول سے متاثر ہے، بھی باطل ہو گیا اور وہ اپنے اس زعم باطل سے جو نتیجہ مرتب کرنا چاہتے تھے یعنی قرآن مجید اللہ رب العزت کا کلام نہیں بلکہ محمد ﷺ کا کلام ہے



(نعوذ باللہ) وہ بھی باطل ہو گیا۔ اور معترضین کے ان کے علاوہ اور جتنے بھی توہمات ہیں، وہ اپنی بے ہودگی کی وجہ سے، کسی جواب کے مستحق نہیں۔ کیوں کہ قرآن مجید کا اعجاز ہمیشہ سے قائم ہے اور ہمیشہ ہی ہر قوم و قبیلے ہر مقابلہ و سنگم کے لیے قائم رہے گا۔ (قرآن مجید کا اعجاز ایک مستقل بحث ہے جس کا بیان آگے آئے گا۔)

اگر آج کے دور کے شہم تعلیم یافتہ لوگوں کو اوپر بیان کردہ اعتراضات والے نعروں سے بے وقوف نہ بنایا گیا ہوتا تو ہم کبھی بھی نہ اپنے آپ کو ان اعتراضات و شبہات کو دور کرنے میں تھکتے اور نہ آپ کو تھکتے۔ پس ہمارے ساتھ ہی اس مصیبت پر صبر کیجیے۔ بے شک اللہ ہی کے ذمے ہے ہدایت دینا ہمیں بھی اور آپ کو بھی۔

**دوسرا شبہ** کہتے ہیں: کئی آیات و سورتوں کا مختصر ہونا اور مدنی آیات و سورتوں کا طویل ہونا دلالت کرتا ہے قسم کی اور قسم مدنی کے مابین عدم ربط اور عدم مطابقت پر، قسم کی کے پست درجے کی صفات کے ساتھ متصف ہونے پر اور قسم کی اور مدنی کے ماحول سے متاثر ہونے پر، جس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ قرآن کلام اللہ نہیں بلکہ محمد ﷺ کا کلام ہے (نعوذ باللہ)۔ کیوں کہ جب آپ ﷺ مکہ میں تھے اور امیوں کے درمیان اتنی ہی تھے تو اس وقت جو آیات و سورتیں جو آج تک آئیں وہ سب تفسیر و مختصر تھیں۔ اور جب آپ مدینہ میں ثقافت و تہذیب یافتہ لوگوں میں تھے تو اس وقت جو آیات و سورتیں آئیں وہ قدرے طویل تھیں۔ (العیاذ باللہ جبرانی ہے ان کے اس شبہ پر) وہ اس شبہ کے ذریعے حقیقت پر مبنی اس نظریے یعنی ”قرآن کریم من عند اللہ ہے“ میں شک و تشکیک ڈالنا چاہتے ہیں۔ (لیکن اس خیال است و مجال است و جنون)

﴿يُرِيدُونَ أَنْ يُطْفِئُوا نُورَ اللَّهِ بِأَفْوَاهِهِمْ وَيَأْبَى اللَّهُ إِلَّا أَنْ يُثَبِّتَ نُورَهُ وَكُوفِرَ الْكَافِرُونَ﴾ (التوبہ: ۳۲)  
 ”یہ چاہتے ہیں کہ اللہ کے نور کو اپنے منہ سے بجھو تک مار کر بجھاویں۔ اور اللہ اپنے نور کو پورا کے بغیر رہنے کا نہیں۔ اگرچہ کافروں کو برا ہی لگے۔“

**دوسرے شبہ کا جواب** دوسرے کے شبہ کے (چار) جوابات (ہیں، جو کہ) درج ذیل ہیں:  
 ① یہ اعتراض کسی بھی صورت قابل قبول نہیں ہے۔ کیوں کہ کئی سورتوں میں بھی ایسی سورتیں ہیں جو خوب طویل و عریض ہیں جیسا کہ سورۃ آل عمران۔ اور مدنی سورتوں میں بھی ایسی سورتیں ہیں جو اچھی خاصی مختصر ہیں جیسا کہ ﴿إِذَا جَاءَ نَصْرُ اللَّهِ وَالْفَتْحُ﴾ (الفتح: ۱۰)۔

② اور اگر معترضین کی اس سے مراد قاعدہ کلیہ و شاملہ نہیں بلکہ قاعدہ اکثریہ و غالبیہ ہے یعنی ان کے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ اکثر کئی آیات و سورتیں اور اکثر مدنی آیات و سورتیں طویل ہیں، تو تب بھی ان کی اس بات سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ قرآن کو گھڑا گیا ہے یا یہ کلام اللہ نہیں ہے۔ کیوں کہ کئی سورتوں و آیات کے اکثر حصے کے مختصر ہونے اور مدنی آیات و سورتوں کے اکثر حصے کے مطول ہونے سے قرآن کریم کی دونوں قسموں (مکی و مدنی) بلکہ مجموعی طور پر قرآن مجید کے مابین عدم ربط یا عدم مطابقت ثابت نہیں ہوتی بلکہ اس سے تو وہ صلہ، تعلق، مطابقت اور ہم آہنگی ثابت ہوتی ہے جس کو فصاحت و بلاغت سے ذوق رکھنے والا ہی سمجھ سکتا ہے۔ نیز یہ مذکورہ ہم آہنگی قرآن کے تمام اجزائیں محکم و شائع انداز میں موجود ہے جس کی مختلف اقسام و انواع کو علمائے کرام نے کتاب اللہ کی تفسیر کی مختلف شاخوں کے ضمن میں بیان کیا ہے۔



کئی اور مدنی آیات و سورتوں میں اتصال و تعلق پر ایک شاہد یہ بھی ہے کہ آپ دیکھیں گے کہ بہت سی کئی آیات، مدنی سورتوں میں شامل اور ان کا حصہ ہیں اور اسی طرح بہت سی مدنی آیات، کئی سورتوں میں پائی جاتی ہیں۔ اور ان کے اس اختلاط کی وجہ سے کوئی بھی شخص ان کے مابین تفادات و انقطاع محسوس نہیں کرتا۔ بلکہ ان کا مشاہدہ کرنے والا ان آیات میں ایک ہی قسم کا خاص جلال، کمال، اتصال اور جمال یکسانیت محسوس کرتا ہے جس کی وجہ سے پورا قرآن کریم ایک ایسی زنجیر کی مانند لگتا ہے جس کی تمام کڑیاں آپس میں بے حد مضبوطی کے ساتھ بڑی ہوئی ہوں۔ یا ایک خوب صورت ہار کی طرح دکھائی دیتا ہے جس کے عمدہ موتی انتہائی خوب صورتی کے ساتھ ایک دوسرے کے ساتھ مربوط ہوں۔ یا ایک ایسا قانون و معاہدہ معلوم ہوتا ہے جس کو آغاز و انجام کے اعتبار سے مرتب کیا گیا ہو۔

⑤ کئی آیات و سورتوں کا مختصر ہونا ان کے اس زعمِ باطل کہ قسم کی پست درجے کی صفات سے متصف ہے، پر دلالت نہیں کرتا۔ بلکہ ان کا اختصار تو ایجاز (ایجازِ عظیم بلاغت کی اصطلاح ہے) کا مظہر ہے۔ اور کلام میں ایجاز پایا جانا علامت ہے اس بات کی کہ مخاطب ذہین اور نفیم ہے اور اس کے لیے تھوڑا سا کلام بھی کفایت کر جائے گا۔ اور جب مخاطب ذکا و فہم میں پہلے سے کم ہو تو افادہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ کلام میں کسی درجہ اسباب و بسط سے کام لیا جائے کیوں کہ دونوں مخاطب یکساں نہیں۔ (الغرض کئی آیات و سورتوں میں اختصار کی وجہ مخاطبین میں پائی جانے والی اعلیٰ درجہ کی فہم و ذکا و تہی اور مدنی آیات و سورتوں میں شرح و بسط کی وجہ مخاطبین میں اس درجہ کی فہم و ذکا و تہی ہونا تھا۔) اسی وجہ سے زیادہ ترکیبی آیات و سورتیں موجز جب کہ مدنی آیات و سورتیں طویل و مبسوط ہیں۔ اور یہ وہ ہی بات ہے جس کی طرف ہم ماقبل بھی اشارہ کر چکے ہیں کہ قبیلہ قریش مکہ میں رہتے ہوئے تمام قبائل عرب میں اپنی فہم و فراست، فصاحت و بلاغت اور شرف و شجاعت کی وجہ سے قائدانہ حیثیت رکھتا تھا۔ پس ایسے حالات میں لازم تھا کہ قرآن کریم اپنی آیات و سورتوں میں ان کو اختصار کے ساتھ مخاطب کرتا، بلاغت و بیان کے قانون کی رعایت رکھتے ہوئے کہ جب مخاطب ذکی اور نفیم ہو تو کلام میں حد درجہ ایجاز ہونا چاہیے اور جب مخاطب ایسا نہ ہو تو کلام میں کسی درجہ طوالت و بسط ہونا چاہیے۔ اب کوئی یہ اشکال نہ کرے کہ اہل مکہ تو انہی تھے ثقافت و تمدن جیسی صفات سے ناواقف تھے۔ کیوں کہ ثقافت و تمدن ایک علیحدہ میدان ہے اور کلام و بیان میں ذکا و مہارت ایک علیحدہ میدان ہے۔ اور اہل مدینہ اپنی ثقافت و تمدن کے باوجود فصاحت و بلاغت جیسی صفات میں اہل مکہ سے آگے بڑھے ہوئے نہیں تھے۔ نیز مدینہ میں آبا و اہل کتاب کا قرآن مجید سے مستفید ہونا اسی صورت ممکن تھا کہ مدنی آیات و سورتوں میں کسی قدر شرح و بسط و بلند قسم مدنی میں بسط کلام سے کام لیا گیا۔ اس ساری بحث کے بعد یہ بات واضح ہوگئی کہ معترضین کے اس شبہ کا مطلق و مقصد یہ ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے اہل مکہ میں موجود پست امتیازات و صفات اور اہل مدینہ کی ثقافتی و تہذیبی صفات سے متاثر ہو کر قرآن کریم کی قسم کئی میں اختصار پر اور قسم مدنی میں طوالت پر یعنی آیات از خود بنالی تھیں اور ان کا یہ مقصد و مہذبہ جوٹ و دھوکا، فریب و دجل کے سوا کچھ بھی نہیں۔

⑥ قرآن کریم نے تمام انسانوں کو خواہ وہ کئی ہوں یا مدنی، عربی ہوں یا عجمی چینیچہ یا تھا کہ وہ اس کے مثل لے آئیں، اگرچہ چھوٹی سورتوں میں سے سب سے چھوٹی سورت کے مثل ہی لے آئیں۔ لیکن وہ تمام کے تمام عاجز آگئے اور ان میں سے منصف مزاج لوگوں نے تسلیم کر لیا کہ یہ کلام اللہ تعالیٰ ہی کا ہے۔ پس اگر کلام کو مختصر لانا بقول معترضین اس انحطاط کی وجہ سے ہوتا جو کہ اہل مکہ میں موجود تھا تو وہ لوگ جو انحطاط کا شکار نہیں تھے، اس انحطاط زدہ کلام کا مثل لانے پر تو قادر ہوتے، لیکن ایسا بھی نہیں ہوا (کہ

اہل مدینہ قسم کی میں موجود آیات و سورہ کا مشل لاسکے ہوں) کیوں کہ قرآن کریم ان تمام الزامات و اعتراضات سے بالاتر ہے۔ ﴿سُبْحٰنَكَ هَذَا بُهْتَانٌ عَظِيْمٌ﴾ (انور: ۱۶)

تیسرا شبہ ۳: کہتے ہیں: قسم کی کا شرعی تو انہیں اور احکام سے خالی ہونا اور قسم مدنی کا ان تفصیل سے بھرپور ہونا دلالت کرتا ہے اس بات پر کہ محمد ﷺ نے اپنے موجودہ ماحول سے متاثر ہو کر (نعوذ باللہ) قرآن کو گھڑا تھا۔ کیوں کہ جب آپ ﷺ مکہ میں تھے تو قرآن کا جو حصہ وجود میں آیا وہ علوم و معارف عالیہ سے خالی تھا اور جب آپ ﷺ (مدینہ پہنچے اور وہاں اہل کتاب و مہذب و مشفق (ثقافت یافتہ) لوگوں کے ساتھ رہنا شروع کیا تو اس وقت قرآن کا جو حصہ وجود میں آیا وہ علوم و معارف عالیہ سے بھرا ہوا نظر آنے لگا۔ (العیاذ باللہ)

تیسرے شبے کا جواب ۳: ہم اس شبے کو درج ذیل (چار) جوابات سے رد کرتے ہیں:

پہلا جواب ۵: یہ کہنا کہ قسم کی جملہ شرعی تو انہیں و احکام سے خالی ہے غلط ہے۔ کیوں کہ قسم مکہ میں بھی شرعی تو انہیں و احکام پائے جاتے ہیں۔ وہ علیحدہ بات ہے کہ اس قسم میں شرعی تو انہیں و احکام نسبتاً اجمالی انداز میں بیان ہوئے ہیں۔ کیوں کہ مقاصد دین پانچ ہیں:

- ① اللہ تعالیٰ فرشتوں، تمام آسمانی کتابوں، تمام رسولوں، یوم آخرت اور اچھی و بری تقدیر پر ایمان لانا
- ② اپنے نفس کی حفاظت کرنا
- ③ اپنی زبان کی حفاظت کرنا
- ④ اپنی نسل کی حفاظت کرنا
- ⑤ اپنے مال کی حفاظت کرنا

اور تحقیق قسم کی میں مندرجہ بالا پانچوں مقاصد دین کو اجمالاً بیان کرو یا گیا ہے۔ اگر آپ چاہیں تو سورۃ الانعام مکیہ:

﴿قُلْ تَعَالَوْا اَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبِّيَ عَلَيْكُمْ اَلَا تَشْفَعُوْا بِهٖ شَيْئًا﴾ (الانعام: ۱۵۱)

آیت نمبر ۱۵۱ تا ۱۵۳ پڑھ لیجیے۔ اس میں کل دس نصیحتیں بیان ہوئی ہیں جو ان پانچوں مقاصد کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہیں۔ قرآن کریم کے مطالعے کے بعد آپ پر یہ بات محضی نہیں رہ سکتی کہ عقائد سے متعلق آیات قسم کی میں بہت ظاہر، واضح اور کثرت سے پائی جاتی ہیں۔ کیوں کہ اس میں کسی قسم کا اشتباہ نہیں ہے۔ اور اگر مدنی سورتوں میں بھی اسی قسم کی آیات (عقائد والی) دو چند (تھوڑی سی زیادہ وضاحت یا تعداد کے ساتھ) پائی جائیں تو ان کو اختلاف شمار نہیں کیا جائے گا۔ (بلکہ زیادہ سے زیادہ یوں کہا جائے گا کہ قسم کی میں اجمالاً بیان تھا اور قسم مدنی میں تفصیلاً)۔

دوسرا جواب ۵: قسم مدنی میں شرعی احکام کی تفصیل کی کثرت، وہ نتیجہ مرتب نہیں کرتی جو معترضین نے کیا ہے۔ بلکہ یہ تو ایک ایسا امر ہے جو قوموں کی سیاست، قبائل کی تربیت اور مخلوق کی ہدایت کے لیے لائے ہوئے ہیں۔ کیوں کہ آگے بڑھنے کے لیے چھلانگ لگانا نقصان کا سبب ہے جب کہ آہستہ آہستہ چلنا نجاہ و توفیق کا۔ اور ویسے بھی حکمت و دانائی کا اصول ہے: "تَقْدِيْمُهُ الْاَلَهَقَّةَ عَلٰی

الْمُهْجَرِ۔“ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے مکہ میں اپنے بندوں پر وہ آیات نازل کیں جو سب سے زیادہ اہم تھیں یعنی ان کے قلوب کی اصلاح اور شرک و بت پرستی سے پاک کرنے کا انتظام فرمایا اور صحیح ایمانی عقائد اور واضح توحید سے متعلق آیات نازل فرمائیں۔ یہاں تک کہ وہ مضبوط عقائد پر قائم ہو گئے۔ اور ان کے اندر قیامت و بعثت اور جزا سے متعلق شعور پیدا ہو گیا۔ اور یہ عقائد راشدہ ان کے قلوب میں بیوست ہو گئے۔ تو اللہ تعالیٰ نے انہیں عاداتِ قبیلہ اور اخلاقی رذیلہ سے نجات عطا فرمائی اور آداب اور اچھی عادات کی طرف ان کی راہ نمائی فرمائی۔ پھر ان کو امہات العبادات کا مکلف بنایا۔ یہ وہ دور تھا جو مکہ میں تھا۔ اور جب وہ ان کاموں کے عادی ہو گئے اور اسی حال میں ان کو کئی ایام و سال گزر گئے تو ان کے نفوس ترقی و کمال کے لیے تیار ہو گئے۔ اور پھر ایک وقت ایسا آیا کہ وہ ہجرت کر کے مدینہ آ گئے۔ اور مدینہ میں شرعی قوانین اور احکام کی تفصیل نازل ہونا شروع ہو گئی۔ اور اللہ تعالیٰ نے اب ان پر دین کی تمام باریکیوں اور اسلامی قوانین کو نازل فرما کر دین کی نعمتِ عظیمہ کو مکمل و تام فرمایا۔ (الْبَيِّنَاتُ لَكُمْ دِينُكُمْ وَ اَنْتُمْ مَتَّعْتُكُمْ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَ رَضِيْتُ لَكُمْ الْاِسْلَامَ دِينًا)

زمانہ قدیم اور جدید دونوں میں مذکورہ بالا حکمتِ عملی کی ایک مثال نظامِ تعلیم میں بھی ملتی ہے۔ وہ اس طرح کہ ابتدائی مراحل میں استاد مبتدئین کو مختصر اور آسان مسائل کی تعلیم دیتا ہے۔ پس یہ عمل مشابہ ہے سو توں و قصص کے مختصر ہونے کے۔ یہاں تک کہ جب طالبِ علم کی عمر میں پختگی اور علمی استعداد میں واضح اضافہ ہو جاتا ہے تو علم کا سمندر رھانے مارنے لگتا ہے اور بہت زیادہ بڑھ جاتا۔ ایسے ہی موقع پر کہا گیا ہے: ”الْاِلْمَادُ اَدْعَى قَدْرَ الْاِسْتِعْدَادِ۔“

رہی بات ان کے اس زعمِ باطل کی کہ قرآن مجید نتیجہ ہے اس اختلاط کا، جو محمد ﷺ کا تھا اہل مدینہ کے ساتھ، وہ اہل مدینہ جو کہ تہذیب و ثقافت سے آراستہ تھے۔ پس یہ بھی ناقص ہے۔ کیوں کہ قرآن مجید تو اہل کتاب (بلکہ تمام لوگوں) کے عقائد کی اصلاح کے لیے آیا تھا، کیوں کہ وہ تمام لوگ تشریح، تحلیل، تحریم، سابقہ استوں کے وادات اور تاریخ سے متعلق بہت ساری غلطیوں، غیر حقیقی اور من گھڑت نظریات پر عمل پیرا تھے۔ قرآن مجید نے آ کر ان کو حقیقتِ حال سے آگاہ کیا۔ لہذا صحیح راستہ دکھانے والا غلط راستے پر چلنے والوں سے راہ نمائی اور ہدایت کیسے لے سکتا ہے۔ اور کیسے ایک زندہ شخص اپنی حیات و بقا میں ایک مردہ سے مدد لے سکتا ہے۔ (یعنی قرآن کی مثال راہِ راست پر گامزن اور زندہ شخص کی سی ہے تو بھلا ایسا شخص گم راہ اور مردوں سے کیسے ہدایت و اسناد اُلے سکتا ہے۔) اگر آپ چاہیں تو یہ آیات پڑھیں:

﴿قُلْ يَا هَلْ اَلِكْتِبِ تَعَاوَا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَاۤءٍ بَيْنِنَا وَ بَيْنَكُمْ... الخ﴾ (آل عمران: ۶۳)

”(اے نبی ﷺ) کہہ دیجیے: اہل کتاب جو بات ہمارے اور تمہارے دونوں کے درمیان یکساں تسلیم کی گئی ہے اس کی طرف آؤ.... (آخر تک۔)“

﴿قُلْ يَا هَلْ اَلِكْتِبِ لِمَ تَحَاجُّوْنَ فِىْ اٰبْرٰهِيْمَ وَ مَا اُنزِلَتْ التَّوْرَةُ وَ الْاِنْجِيْلُ اِلَّا مِنْ بَعْدِهِۦٓ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ﴾ (آل عمران: ۶۵)

”(اے نبی ﷺ) کہہ دیجیے: اہل کتاب تم ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں کیوں جھگڑتے ہو حالانکہ تورات اور انجیل ان

کے بعد آتری ہیں اور وہ پہلے ہو چکے تو کیا تم عقل نہیں رکھتے؟“

﴿كُلُّ الظَّاهِرِ كَانَ جَلًّا لِيَبْنِي إِسْرَائِيلَ إِلَّا مَا حَرَّمَ إِسْرَائِيلُ عَلَى نَفْسِهِ مِنْ قَبْلِ أَنْ تُبَدَّلَ التَّوْرَةُ﴾ (آل عمران: ۹۳)  
 ”بنی اسرائیل کے لیے تورات کے نازل ہونے سے پہلے کھانے کی تمام چیزیں حلال تھیں۔ جزان کے جو یعقوب نے خود اپنے اوپر حرام کر لی تھیں... (آخر تک)۔“

آیات بالا سورۃ فال عمران کی تھیں اور ذیل میں سورۃ المائدہ کی ایک آیت دی جا رہی ہے جس کی شان اہل کتاب کی طاقت اور قدرت سے بہت بلند ہے، وہ اہل کتاب جن کی بابت یہ کہا جا رہا ہے کہ قرآن مجید ان سے متاثر ہو کر وجود میں آیا (نعوذ باللہ)  
 ﴿وَكُنْتُمْ عَلَيهِمْ فِيهَا أَنْ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ وَالْعَيْنَ بِالْعَيْنِ وَالْأَنْفَ بِالْأَنْفِ...﴾ (المائدہ: ۳۵)  
 ”اور ہم نے ان لوگوں کے لیے تورات میں یہ حکم لکھ دیا تھا کہ جان کے بدلے جان اور آنکھ کے بدلے آنکھ اور ناک کے بدلے ناک... (آخر تک)۔“

**تیسرا جواب** • اگر معترضین کا زعم صحیح ہوتا تو صرف حضور اکرم ﷺ ہی اہل کتاب (جو کہ بقول معترضین مہذب و مشفق تھے) کا اثر قبول کیوں کرتے بلکہ اہل کتاب کا اثر تو ان عربوں پر ظاہر ہونا چاہیے تھا کہ جو پہلے سے مدینہ میں رہتے تھے یا مکہ یا باقی جزیرہ عرب میں رہتے تھے اور پھر وہ ہی اس نبوت و رسالت کے زیادہ حق دار ہونے تھے اور آپ ﷺ سے پہلے بھی کوئی نصحانے عرب یا قریش کے تاجروں میں سے اس نبوت و رسالت پر سبقت لے گیا ہوتا کیوں کہ ان کا تو مدینہ اور شام میں اہل کتاب کے ساتھ بہت زیادہ اختلاط تھا۔

**چوتھا جواب** • قرآن کریم نے تمام ملکوں اور مدنیوں بلکہ تمام انس و جن کو تبلیغ دیا تھا کہ اگر وہ طاقت رکھتے ہیں تو اس کلام کا مقابلہ کریں۔ چاہے سب سے چھوٹی سورت کے مثل ہی بنا لائیں۔ لیکن وہ ایسا نہ کر سکے۔ اگر حضور اکرم ﷺ نے ان ہی لوگوں سے متاثر ہو کر قرآن گھڑا تھا (نعوذ باللہ) تو پھر وہ لوگ اپنے سے متاثرہ کلام کا مثل لانے سے عاجز کیوں رہے؟ انفس و حیرانی ہے جھوٹ گھڑنے والی جماعت کے لیے اور بے حیائی و ڈھٹائی پر گام زن گروہ کے لیے۔

هَذَا كَلَامُهُ لَهُ خَبِيرٌ مَعْنَاهَا: لَيْسَتْ لَنَا عُقُولٌ

چوتھا شبہ • کہتے ہیں: قرآن نے صبح، رات، انجیر، زیتون، طور، سینا اور دیگر بہت سی مخلوقات کی قسمیں کھائی ہیں۔ اور اس ماحول کا اثر قبول کیا۔ کیوں کہ اہل مکہ اتنی تھے اور حیات کے علاوہ سے واقف نہ تھے۔ اور جب ہجرت کا واقعہ پیش آیا اور محمد ﷺ نے اہل مدینہ (جو کہ روشن خیال اور دانشور تھے) سے میل جول شروع کیا تو قرآن نے جدید اعلیٰ درجے کے ماحول کا اثر قبول کیا۔ یہ ہی وجہ ہے کہ قرآن کا مدنی حصہ ایمانِ حسیہ (ایمانِ جمع ہے یمن یعنی قسم کی) جو کہ دلالت کرتی ہیں سادگی و انحطاط پر، سے خالی ہے۔

چوتھے شبہ کا جواب • یہ شبہ درج ذیل (تین) جوابات کے ساتھ مدفوع ہے:

**پہلا جواب** • جیسا کہ پہلے بھی بیان ہو چکا کہ اہل مکہ، اہل مدینہ سے نسبتاً زیادہ بہترین

ذوق، اعلیٰ شان اور عظیم فہم و فراست کے مالک تھے۔ اور قسم کی میں خطاب انہی سے ہے جس میں ان کی صفات کو ملحوظ رکھا گیا ہے کیوں کہ قسم کی میں ایسے آسرا دروموز اور خصائص پائے جاتے ہیں جن کا ادراک وہ ہی کر سکتا ہے جو صفت بیان سے واقف ہو اور اس میں مہارت تانتہ رکھتا ہو۔ لہذا اب یہ شبہ جو کہ معترضین کا زعم باطل بھی ہے کہ اہل مکہ حیات کے علاوہ سے واقف نہ تھے باقی نہیں رہتا۔ نیز تاریخ بہترین گواہ اور ایک عادل حاکم کی مانند ہے اس معاملے میں کہ زمانہ نزول قرآن میں مکہ کے عرب کو باقی تمام عربی قبائل سے امتیاز و فضیلت حاصل تھی۔

**دوسرا جواب** قرآن کریم میں صبح یارات جیسے حسی امور کی قسم کھانا اہل مکہ کی گراوٹ پر دلالت نہیں کرتا جیسا کہ معترضین کا دعویٰ ہے۔ بلکہ یہ تو عین رعایت ہے اس متقاضی الحال کی جس کی خاطر قسم کھائی گئی۔ اور وہ یہ ہے کہ قرآن اہل مکہ کے سب سے بدترین عقیدے کی روک تھام کے لیے کوشش کر رہا تھا جو ان میں بہت مضبوطی سے راسخ ہو چکا تھا۔ اور وہ سب سے بدترین عقیدہ تھا ”شیرک“۔ اور اس عقیدے کا استیصال اور اس کی ضد میں صریح توحید کا قیام ممکن ہی نہیں تھا مگر اس صورت میں کہ ان کی عقول کو کائنات میں اللہ تعالیٰ کی پھیلی ہوئی نشانیوں اور اس کی مخلوق کی طرف متوجہ کیا جائے۔ اور ان کو اللہ تعالیٰ کی پیدا کردہ نعمتوں کی اس عظیم جماعت سے آگاہ کیا جائے جس نے ہم گھبراہوا ہے۔ تاکہ وہ ان نعمتوں کی عظمت کا احساس کرتے ہوئے ان کے پیچھے کارفرماں توت کا ادراک حاصل کر سکیں اور اللہ جو کہ اپنی خدائی میں یکتا اور تنہا ہے، پر ایمان لائیں۔ کیوں کہ وہ ہی ان تمام نعمتوں کا تین تنہا خالق ہے۔ اور عقلی اعتبار سے وہ ہی عبادت کا مستحق ہے جس نے ان تمام چیزوں کو عدم سے وجود بخشا۔

﴿اَلَمْ نَخْلُقْكُمْ اَنْفَاكُم مِّنْ لَّدُنَّا وَنُفُوْسًا﴾ (انحل: ۱۷)

”تو جو اتنی مخلوقات پیدا کرے کیا وہ اس مخلوق جیسا ہو سکتا ہے جو کچھ بھی پیدا نہ کر سکے۔ تو پھر تم غور کیوں نہیں کرتے؟“

مفکرین توحید کے سامنے بعض مخلوقات کا ذکر کرنا بعد اس کے کہ وہ اقرار کر چکے ہیں کہ ان مخلوقات کو اللہ ہی نے پیدا کیا ہے، اور اصل ان پر شرک کے چھوڑنے کو لازم کرنا اور توحید خالق کی طرف دعوت دینا ہے۔ اور قسمیں کھانے سے قرآن کریم کا یہ ہی عیلمانہ اور مقصد تھا۔ اور قرآن کریم نے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہونے والی نعمتوں کو اپنے اسلوب میں بہت خوب صورت انداز میں بیان کیا ہے۔ اور وہ اپنی اسی طرح خوب صورتی کی وجہ سے لوگوں کو مقصود تک پہنچانے میں کامیاب ہو اور اعجاز کی چوٹیوں تک پہنچنے کے لیے ایک اصول و بنیاد کی حیثیت اختیار کر گیا۔ قرآن کریم نے نعمتوں کے بیان میں مختلف انداز اپنائے اور مختلف انواع کے ساتھ ان کے تسلسل کو بیان کیا۔ پس کبھی تو قرآن آسمان کی تخلیق کو بیان کرتا ہے اور کبھی زمین کی پیدائش پر سوچنے کی دعوت دیتا ہے۔ کبھی انسان کو اس کی اپنی ذات میں غور کرنے پر ابھارتا ہے۔ اور کبھی حیوانات، نباتات اور جمادات کی انواع کو بیان کرتا ہے۔ الغرض یہی سلسلہ جاری رہتا ہے۔ پھر قرآن کریم ان تمام چیزوں کو پیش کرنے میں کبھی تو بیان و شرح کا طریقہ اختیار کرتا ہے اور کبھی حلف و قسم کا۔ کیوں کہ حلف و قسم میں اس عظمت کے معنی پائے جاتے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے اس نعمت میں دویت رکھی ہے اور وہ دلالت کرتی ہے اللہ کی توحید و عظمت پر۔ یہاں تک کہ ان نعمتوں پر قسموں کا دابر ہونا صحیح ہو جاتا ہے اور قرآن کریم کا ان قسموں کو بیان کرنا درست ہو جاتا ہے۔ یہ بات بھی واضح رہے کہ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے حسی اور معنوی دونوں امور کی قسمیں اٹھائی ہیں۔ امور حسیہ کی قسمیں

تو قابل گزر چکیں اور امور معنویہ کی ایک مثال قرآن کریم خود ہے۔ دیکھیے:

﴿وَالْقُرْآنَ الْحَكِيمَ ۝ إِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِينَ ۝ عَلٰی صَوَاطِئَ مُنْقَدِّمٍ ۝﴾ (نہس: ۲-۳)

”قسم ہے قرآن کی جو حکمت سے بھرا ہوا ہے۔ اے محمد ﷺ اے شک تم پیغمبروں میں سے ہو۔ سیدھے پرستے پر ہو۔“

(اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں امور حسیہ اور معنویہ دونوں کی قسمیں اٹھائیں) تاکہ وہ متنبہ ہو جائے کہ انعامات خواہ حسیہ

ہوں یا معنویہ، اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے ہیں۔ اور وہ ان باتوں کو جو نہ ہی تو کسی کو فائدہ پہنچا سکتے ہیں اور نہ نقصان اور نہ ہی کائنات کی تخلیق میں ان کا کوئی حصہ ہے، اس کا شریک ٹھہرانے سے ڈر جائیں۔ جیسا کہ قرآن مجید میں ہے:

﴿قُلْ اَرَأَيْتُمْ مَّا تَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللّٰهِ اَرُوْنِي مَاذَا خَلَقُوا مِنَ الْاَرْضِ اَمْ لَهُمْ شِرْكٌ فِي السَّمٰوٰتِ اِیْنُوْنٰی  
بِكُتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ هٰذَا اَوْ اَشْرَافٍ مِّنْ عِلْمِہٖ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ۝ وَمَنْ اَصْلٌ مِّمَّنْ یَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ لَّا  
یَسْتَجِیْبُ لَہٗ اِلٰی یَوْمِ الْقِیٰمَةِ وَ هُمْ عَنْ دَعْوٰہِمْ غٰفِلُوْنَ ۝ وَاِذَا حُشِرَ النَّاسُ کَانُوْا لَہُمْ اَعْدَآءٌ وَ کَانُوْا  
بِعِبَادَتِہِمْ کٰفِرِیْنَ ۝﴾ (الحقاف: ۲-۳)

”کہہ دیجیے کہ بھلا تم نے ان چیزوں کو دیکھا ہے جن کو تم اللہ کے سوا پکارتے ہو ذرا مجھے بھی تو دکھاؤ۔ کہ انھوں نے زمین سے کون سی چیز پیدا کی ہے۔ یا آسمانوں میں ان کی کوئی شرکت ہے۔ اگر سچے ہو تو اس سے پہلے کی کوئی کتاب میرے پاس لاؤ۔ یا تمہارے پاس علم انبیاء علیہم السلام میں سے کچھ ہو تو پیش کرو۔ اور اس شخص سے بڑھ کر کون گم راہ ہو سکتا ہے جو ایسے کو پکارے جو قیامت تک اُسے جواب نہ دے سکے اور ان کو ان کے پکارنے ہی کی خبر نہ ہو۔ اور جب لوگ جمع کیے جائیں گے تو وہ ان کے دشمن ہو جائیں گے اور ان کی پرستش نے انکار کر دیں گے۔“

اور اب آپ اچھی طرح جان چکے ہیں کہ شرک میں مبتلا لوگوں کو سمجھانے اور اس سے دور رکھنے کا ایک ہی طریقہ ہے اور اسی طریقے کو قرآن کریم نے اختیار کیا یعنی آفاق عالم میں مشرکین کو نظر آنے والی اللہ تعالیٰ کی نشانیوں سے توحید باری تعالیٰ کے دلائل پیش کرنا۔ پس اب یہ ہی سبیل مستقیم ہو گیا ہے ہر مشرک کو مخاطب کرنے کے لیے خواہ وہ مشرک فلاسفہ میں سے ایک ہو یا عبرتی شخصیت و صفات کا حامل ہو یا مہذب و ترقی یافتہ قوم کا استاد ہو۔ پس قرآن کریم کا بہت سی مخلوقات اور حیات (و معنویات) کی قسمیں اٹھانا ہرگز خفاطین کی سادگی، گراؤ یا انحطاط پر دلالت نہیں کرتا۔ اور نہ ہی اس الزام و وطن کو لازم کرتا ہے کہ نعوذ باللہ قرآن محمد ﷺ کا کلام ہے جو کہ مکہ کے بایسوں کی پست حالی اور انحطاط سے متاثر ہو کر وجود میں آیا جیسا کہ انھوں نے غلط بیانی کرتے ہوئے کہا:

﴿اِنْ هٰذَا اِلَّا اَخْتِلَافٌ ۝﴾ (ص: ۷)

”یہ تو بالکل گھڑی ہوئی بات ہے۔“

**تیسرا جواب** • حیات کی قسمیں اٹھانے میں وہ اسرار و رموز ہیں جو واضح کرتے ہیں کہ خفاطین سادگی، گراؤ یا انحطاط کا شکار نہیں تھے بلکہ وہ تو اعلیٰ درجے کی قابلیت، فہم و ذکا اور فصاحت و بیان جیسی بلند صفات کے مالک تھے۔ اسی وجہ سے قرآن نے یہ قسمیں اٹھائیں جیسا کہ ہم نے پہلے بھی بیان کیا۔ نیز ان قسموں میں اُن اسرارِ عظیمہ کی طرف اشارہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے ان امور میں



رکھی ہیں جن کی قسم اٹھائی ہے، تاکہ اُن کا مقسم یہ ہونا درست ہو جائے۔ اور ان اسرار کا ادراک وہ ہی کر سکتا ہے جو داناتی کی باتوں کو سمجھنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ کیوں کہ ان میں ان اسرار کی کوئی وضاحت و تفسیر موجود نہیں تھی۔ ان کو صرف وہ ہی سمجھ سکتا تھا جو عقل میں کمال اور ذوق میں سلامتی رکھتا ہو۔ اب ہم اُن اسرار میں سے چند (بطور مثال) یہاں ذکر کیے دیتے ہیں تاکہ واضح ہو جائے حال اور باقی نہ رہے اس شعبے کے لیے کوئی مجال۔

درج ذیل آیات میں اللہ تعالیٰ نے آفتاب کی روشنی اور رات کی تاریکی کی قسم اٹھائی۔

## مثال اول

﴿وَالضُّحٰی ﴿۱﴾ وَاللَّیْلِ اِذَا سَجٰی ﴿۲﴾ مَا وَّوَدَّعَا رَبُّكَ وَمَا قٰلِ ﴿۳﴾ وَ لِلْآخِرَةِ حَیْرٌ لَّكَ مِنَ الْاٰوَّلٰی ﴿۴﴾﴾

وَلَسَوْفَ یُعْطِیْكَ رَبُّكَ فَتَرْضٰی ﴿۵﴾ (یعنی: ۱-۵)

”آفتاب کی روشنی کی قسم۔ اور رات کی تاریکی کی قسم جب وہ چھا جائے۔ اے نبی ﷺ آپ کے پروردگار نے نہ آپ کو چھوڑ دیا اور نہ آپ سے ناراض ہی ہوا۔ اور آخرت آپ کے لیے دُنیا سے کہیں بہتر ہے۔ اور آپ کا پروردگار عن قریب آپ کو اتنا کچھ عطا فرمائے گا کہ آپ خوش ہو جائیں گے۔“

ان آیات کا شان نزول یہ ہے کہ ایک مرتبہ کچھ عرصے کے لیے نزولِ وحی کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ (اس عرصے کو نفرتِ وحی بھی کہا جاتا ہے۔) اس موقع پر حضور اکرم ﷺ کو اعداء نے طعن دیا کہ آپ کو آپ کے رب نے چھوڑ دیا ہے اور آپ سے ناراض ہو گیا ہے۔ تو اس موقع پر یہ آیات نازل ہوئیں جن میں اللہ تعالیٰ کا قسم اٹھانا اس طرف اشارہ کرتا ہے کہ نبی کریم ﷺ کے قلب اطہر پر وحی کی نور کی شعاعیں ”آفتاب کی روشنی“ کی مانند ہیں۔ جس سے (ہر چیز کی) زندگی کو تقویت ملتی ہے اور نباتات کے لیے نشوونما کا سبب ہوتی ہے۔ اور اس کے بعد جو نفرتِ وحی کا واقعہ پیش آیا وہ اس رات کی مانند ہے جس کی تاریکی چھا جائے۔ تاکہ قوتوں کو ذرا راحت مل جائے اور نفس آسندہ آنے والے معاملات کے لیے مستعد ہو جائے۔ کیوں کہ یہ تو معلوم ہی ہے کہ جب پہلی وحی نازل ہوئی تو اس کی شدت کیسی تھی۔ یہاں تک کہ آپ ﷺ حضرت خدیجہ بنت ابی طالب کے پاس آئے، آپ ﷺ پر کچی طاری تھی۔ جیسا کہ صحیحین کی حدیث میں موجود ہے۔ پس وحی کا منقطع ہونا صرف اُن حالات و واقعات پر مثبتیت اور تقویت کے لیے تھا جن کا آپ ﷺ کو آسندہ پیش آنے کا احتمال تھا تاکہ اس مثبتیت اور تقویت کی وجہ سے آپ ﷺ کو مخلوق کی طرف بھیجے جانے کی حکمت اپنے اتمام کو پہنچ سکے۔ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے حضور اکرم ﷺ سے فرمایا: ﴿وَلِلْآخِرَةِ حَیْرٌ لَّكَ مِنَ الْاٰوَّلٰی ﴿۱﴾﴾ (اور آخرت آپ کے لیے دنیا سے کہیں بہتر ہے۔) یعنی وحی کا دوبارہ سے شروع ہونا عن قریب دین کی تکمیل کر دے گا اور اللہ کی نعمت کا اتمام کر دے گا۔ اور کہاں ہے وحی کی ابتدا اپنی انتہا سے؟ اور کہاں ہے دین کا جمال جو کہ آیا ہے اللہ تعالیٰ کے قول: ﴿وَاقْرَأْ بِمَا نَسِیْتَ رَبُّكَ الَّذِیْ خَلَقَ ﴿۱﴾﴾ (الحق: ۱) عقائد اور احکام کی تفصیل سے جو کہ آئی ہیں مثالی قرآن میں۔ پھر معاملہ اور بھی زیادہ مؤکد ہو جاتا ہے اس قول: ﴿وَلَسَوْفَ یُعْطِیْكَ رَبُّكَ فَتَرْضٰی ﴿۵﴾﴾ (یعنی: ۵) کے ذریعے۔

پس اس تمام تفصیل سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس مقام پر ”آفتاب کی روشنی“ اور ”رات کی تاریکی“ کی قسم اٹھانے میں محض اللہ تعالیٰ کی نشانیوں اور نعمتوں کی طرف اشارہ نہیں ہے بلکہ قسم اٹھانے میں دلیل قائم کرنا مقصود ہے اس پر کہ وحی کا نزول مشابہ ہے

## مسائل العرفان فی علوم القصرآن: جلد ①

دن اور آفتاب کی روشنی کے جب کہ وحی کا رُک جانارات کی تاریکی کے مثل ہے۔ پس جب انھوں نے خوشی خوشی دن کی روشنی اور رات کی تاریکی کو قبول کر لیا، جن میں نفع ہے انسان کے لیے کہ دن کی روشنی میں انسان معاش کے لیے کوشش کرتا ہے اور روشنی حیات کے لیے بھی ضروری ہے اور رات کی تاریکی میں آرام اور نیند کا سامان کرتا ہے، تو ان پر واجب ہے کہ وہ ان دنوں و راتوں کو بھی قبول کریں جو نبی اکرم ﷺ پر گزرے یعنی نزول وحی اور نترت وحی۔

ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے انجیر اور زیتون کی قسم اٹھائی ہے:

﴿وَالزَّيْتُونِ وَ الرِّبْوٰتِ ۝ وَ طُوْرٍ مِّنْ بَيْنَيْنِ ۝ وَ هٰذَا الْبَلَدِ الْاَمِيْنِ ۝ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْ

اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ ۝﴾ (الہین: ۱-۳)

”انجیر کی قسم اور زیتون کی اور طور سینین کی۔ اور اس امن والے شہر کی۔ کہ ہم نے انسان کو بہترین سانچے میں ڈھال کر پیدا کیا ہے۔“

علامہ مرحوم شیخ محمد عبدہ اس سورت کی تفسیر میں فرماتے ہیں:

راجح یہ ہے کہ ”الہین“ اور ”الزیتون“ و رخت کی دو قسمیں ہیں۔ لیکن ان دونوں کے ذکر میں کوئی فائدہ معلوم نہیں ہوتا جیسا کہ انھوں نے ذکر کیا ہے بلکہ ان دونوں کا ذکر تو اس لیے کیا گیا ہے کہ ان کا انسانی احوال میں بہت عمل دخل ہے۔

اس قول کے قائل کا کہنا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے چاہا کہ ہمارے سامنے کتاب انسانیت کی چار فصلوں کو بیان فرمائے۔ پس جب انسان جنت میں تھا تو وہ انجیر کے پتوں کے سائے میں رہتا تھا۔ اسی دوران (ایک خطا کی وجہ سے) انسان اور اس کی بیوی کی شرمگاہ ظاہر ہونے لگی تو وہ دونوں اپنے جسم کو چھپانے کے لیے انجیر کے پتے جسم پر چپکانے لگے۔

اور زیتون سے اشارہ ہے حضرت نوح علیہ السلام اور ان کی ذریت کی طرف۔ جب انسان نے خوب فساد پھیلا یا اور طوفان کے ذریعے جن کو ہلاک ہونا تھا وہ سب ہلاک ہو گئے اور نوح علیہ السلام کو ان کی سفینہ سمیت نجات دے دی گئی اور ان کی کشتی ایک مقام پر رُک گئی۔ اس وقت نوح علیہ السلام نے ادھر ادھر دیکھا۔ انھیں ہر جانب پانی ہی پانی نظر آیا، زمین کا کوئی خشک حصہ دکھائی نہ دیا۔ سو انھوں نے ایک پرندہ بھیجا کہ وہ زمین کے کسی حصے کے خشک ہونے کی خبر لے کر آئے۔ لیکن وہ پرندہ نظروں سے اچھل ہو گیا اور کوئی خبر نہ لایا۔ پھر نوح علیہ السلام نے ایک اور پرندہ بھیجا وہ پرندہ زیتون کے درخت کا ایک پتا اٹھائے ہوئے واپس آیا، جو کہ خوش خبری اور بشارت تھی۔ پرندے کے اس عمل سے حضرت نوح علیہ السلام سمجھ گئے کہ اللہ تعالیٰ کا غضب (عذاب) ختم گیا ہے۔ اور اب اللہ تعالیٰ کی طرف سے زمین کو آباد کرنے کی اجازت مل گئی ہے۔ پھر نوح علیہ السلام اور ان کی اولاد سے بشریت کے عظیم قبائل وجود میں آئے جو کہ زمین سے بالکل ہی مٹ چکے تھے۔ پس اس زمانے کو ”زیتون کے زمانے“ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اور ”زیتون“ کی قسم اٹھانے سے اسی عظیم حادثے کی یاد دہانی کرانا مقصود ہے۔

(طور سینین) اس سے اشارہ ہے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے اور عالم میں نور توحید کے نظہ پوری طرف، بعد اس کے کہ زمین کی تمام جوانب میں بت پرستی کا اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔ پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد تمام انبیائے کرام علیہم السلام مسلسل اسی شریعت (موسیٰ علیہ السلام کی شریعت) طرف دعوت دیتے رہے یہاں تک ان (بنی اسرائیل) میں سے آخری نبی حضرت عیسیٰ علیہ السلام

تشریف لے آئے جنھوں نے روح شریعت کو ان تمام بدعات سے پاک کر دیا جو لوگوں نے دین و شریعت میں شامل کر دی تھیں۔ پھر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعد ان کی قوم پر طویل مدت گزرنی اور ان کے اندر بھی دین سے متعلق وہ ہی اختلاف پیدا ہو گئے جو ان سے پہلی قوموں میں ہوئے تھے۔ بدعات کو اختیار کرنے کی وجہ سے نور ہدایت ان سے مجھوب ہو گیا۔ اور وہ غلط تاویلات کی وجہ سے معانی میں خطا کا شکار ہو گئے۔ اور ایسی نئی باتوں اور عقائد کے مرتکب ہو گئے جن سے واپسی کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ پس ایسے حالات میں اللہ تعالیٰ نے تمام بشریت پر احسان کیا اور ایسی تاریخ کا آغاز کیا جس نے تمام تواریخ کو منسوخ کر دیا۔ اور انسانیت کے تمام سابقہ اور آنے والے اطوار کو تفصیل سے بیان کیا۔ جی ہاں! اس سے مراد مکہ مکرمہ میں نور محمدی ﷺ کے ظہور کا دور ہے۔ اور ”البلد الامین“ سے اسی دور کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ اور اسی قول پر جس کو ہم نے تفصیل سے بیان کیا قسم اور مقسم علیہ میں مناسبت کا انحصار ہے۔

یا نچو اس شبہ؟ کہتے ہیں: قرآن کریم کی قسم کی، سورتوں کی ابتدائی آیات کے حوالے سے بہت سارے لفظوں پر مشتمل ہے جیسے: ”الْحَمْدُ“ اور ”كَهَيْعَصَ“ (العیاذ باللہ) لہذا مسلمانوں کا یہ دعویٰ کہ قرآن انسانوں کے لیے بیان

اور ہدایت ہے، باطل ہو جاتا ہے۔ کیوں کہ ”الْحَمْدُ“ اور ”كَهَيْعَصَ“ بھی اللہ کا کلام ہے اور ان میں کون سی ہدایت یا بیان ہے؟ بلکہ یہ حروف یا ان جیسے حروف ہدایت سے غایت درجہ بعید ہیں۔ دلیل اس کی یہ ہے کہ کسی ایک نے بھی ان حروف سے راہ نمائی نہیں پائی اور نہ ہی راسخ فی العلم اس کا معنی جانتے ہیں۔ پس ان الفاظ سے خطاب کرنا خطابِ مہمل کی طرح ہے۔ نیز ان الفاظ کی حقیقت اس کے سوا کچھ نہیں کہ جب حضور اکرم ﷺ وحی نازل ہونے کے بعد یہود سے وحی والی آیات مسلمانوں کے لیے لکھوایا کرتے تھے تو یہودی اپنی طرف سے کلام کی ابتدا یا انتہا کے موقع پر بطور تمثیل یہ الفاظ لکھ دیا کرتے تھے اور ان کے معانی یہ تھے: ”أَوْعَزَّآلَىٰ مُحَمَّدٌ“ (مجھے محمد ﷺ نے لکھنے کی ہدایت کی تھی) یا ”أَمْرِي مُحَمَّدٌ“ (مجھے محمد ﷺ نے حکم دیا تھا) اور یہودیوں کے الفاظ اس لکھے گئے (قرآن مجید) پر ایمان لانے سے بری الذمہ ہونے کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ اور اس قول سے قریب ترین ایک اور قول بھی ہے، وہ یہ کہ بعض سورتوں کی ابتدا میں ناقابلِ تفہیم عربی حروف یا تو اس وجہ سے ہیں کہ ان سے تمثیل یا تہویل کا قصد کیا گیا ہے یا پھر اس چیز کا اظہار کرنا مقصود ہے کہ قرآن بہت گہرے اور مخفی امور کا مظہر ہے۔ یا پھر یہ عربی حروف قرآن مجید اور دیگر مختلف مصاحف کے مابین امتیاز کے لیے ایک رمز کی حیثیت رکھتے تھے۔ پھر بعد میں ان حروف کو قرآن کے ساتھ لاحق کر دیا اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ قرآن ہی بن گئے (یعنی قرآن کا حصہ بن گئے)۔ (نعوذ باللہ)

یا نچو اس شبہ کا جواب؟ یہ شبہ درج ذیل (چار) امور کی بنا پر ختم ہو جاتا ہے:

پہلا امر • نبی کریم ﷺ نے کبھی بھی یہود سے کچھ نہیں لکھوایا۔ (آپ ﷺ کے یہود سے کچھ بھی نہ لکھوانے پر تاریخ گواہ ہے) اور یہ تاریخ ایسی عادل حاکم ہے جو نہ ہی تو کسی پر رحم کرتی ہے اور نہ کسی سے دوستی۔ اے معترضین! اگر تم سچے ہو تو تاریخ سے پوچھ کر دیکھ لو۔

دوسرا امر • ان کے پاس اس کی بھی کوئی دلیل نہیں کہ سورتوں کی ابتدا میں جو حروف استعمال ہوئے ہیں وہ ان کے گمان کردہ معانی یعنی ”أَوْعَزَّآلَىٰ مُحَمَّدٌ“ یا ”أَمْرِي مُحَمَّدٌ“ پر مشتمل ہیں۔ یہود یا غیر یہود بلکہ لغات بشر میں سے کوئی ایک لغت بھی ان معانی پر استدلال

نہیں کرتی۔

**تیسرا امر** • کیا یہود قرآن کریم میں اس طرح کے طعن سے واقف نہ تھے (جو آپ نے یہودیوں کی طرف منسوب کرتے ہوئے بیان کیا ہے)۔ اگر یہ طعن حقیقت میں یہود کے نزدیک طعن ہوتا تو یہودی لوگوں میں سے سب سے پیش پیش ہوتے ان (حروف مقطعات) کا انکار کرنے میں اور ان کی توجیہات بیان کرنے میں کیوں کہ یہ یہودی وہ گروہ ہے جو نبی کریم ﷺ اور مسلمانوں سے عداوت میں سب سے زیادہ سخت ہے۔ اور وہ تو تمنا کرتے ہیں کہ کاش ان کو قرآن میں کوئی مغزہ مل جائے تاکہ وہ دعوتِ اسلام کے مینارے کو منہدم کر سکیں۔ کیا دیکھتے نہیں کہ یہود نے کیسے حق کے واضح ہو جانے کے بعد بھی حسد کرتے ہوئے قرآن (یا نبی کریم ﷺ) کا انکار کیا۔

**چوتھا امر** • قرآن کریم کا ایسے کلمات پر مشتمل ہونا جن کا معنی ظاہر نہ ہو، قرآن کے ہدایت و رحمت اور بیان للناس ہونے والے اوصاف کے سنائی نہیں ہے۔ کیوں کہ ان اوصاف کا قرآن مجید میں پایا جانا باعتبار جملۃ و مجموعۃ ہے نہ کہ باعتبار تفصیلاً اور ایک ایک لفظ کو شامل ہونے کے اعتبار سے۔ (یعنی اگر قرآن مجید کو مجموعی طور پر دیکھا جائے تو اس میں یہ اوصاف کا حقہ موجود ہیں)۔ اور اس میں تو کوئی شک ہے ہی نہیں کہ قرآن میں غالب اکثریت ایسی آیات کی ہے جو سراسر تعلیماتِ الہیہ کے لیے بیان ہے اور حق کی جانب لوگوں کے ہدایت ہے۔ اور دنیا و آخرت میں خوش بختی و سعادت کے اصولوں کو بیان کرنے کی وجہ سے عالم کے لیے رحمت ہے۔

یہ جواب منہی ہے حروف مقطعات سے متعلق علمائے کرام کی دو آراء میں سے ایک رائے پر۔ پہلی رائے یہ ہے کہ بے شک (حروف مقطعات) کا معنی مطلوب ہمیں معلوم نہیں ہے۔ لیکن یہ ان رازوں میں سے ایک راز ہے جسے اللہ تعالیٰ نے اپنے پاس محفوظ رکھا اور مخلوق میں سے کسی ایک کو بھی اس پر مطلع نہیں فرمایا۔ اور ان کے معانی پر مطلع نہ فرمانا بھی اللہ تعالیٰ کی بلند حکمتوں میں سے ایک ہے۔ وہ اس طرح کہ اللہ تعالیٰ اس کے ذریعے اپنے بندوں کو آزر مانا چاہتا ہے تاکہ خبیث اور طیب میں فرق ہو جائے اور منافقین و سچے ایمان والے جدا جدا ہو جائیں۔ بعد اس کے کہ اللہ تعالیٰ اپنی کتاب میں ان کے لیے ان حروف (مقطعات) کے علاوہ بہت سی آیات اور سورتوں میں واضح نشانیاں، ہدایت پر دلائل اور اپنی رحمت کے شواہد کھول کھول کر بیان کر چکا ہے۔ اور یہ حروف مقطعات ان آیات اور سورتوں کے مقابلے میں کوئی نسبت نہیں رکھتے مگر وہ نسبت جو ایک قطرہ سمندر کے مقابلے میں رکھتا ہے یا ”غَيْضًا مِّنْ فَيْضٍ“ ہے (یہ ایک ضرب المثل)۔

بس جو لوگ ایمان والے ہیں وہ جانتے ہیں کہ یہ حروف فواریح (حروف مقطعات) ان کے رب کے ہاں سے حق ہیں اگرچہ ان کو ان حروف کے معانی معلوم بھی نہیں۔ اور نہ ہی وہ ان کی مراد جاننے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس پر اعتماد کرتے ہوئے کہ یہ حروف صاوری ہوئے ہیں ایسی ذات کی طرف سے جو حکیم و عظیم ہے۔ اُس کی کتاب کے معانی میں خواہ وہ معانی ظاہر ہوں یا مخفی، بہر صورت حکمت موجود ہے۔ اور اس کا علم ہر شے پر وسیع ہے چاہے مخلوق کو اس شے کا علم ہو یا نہ ہو۔

﴿وَلَا يُحِيطُونَ بِشَيْءٍ مِّنْ عِلْمِہٖ اِلَّا بِمَا شَاءَ﴾ (البقرہ: ۲۵۵)

”اور لوگ اس کی معلومات میں سے کسی چیز پر دسترس حاصل نہیں کر سکتے ہاں جس قدر وہ چاہتا ہے۔“

﴿فَاَمَّا الَّذِیْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ ذُرِّیْعٌ فِیْتَبِعُوْنَ مَا نَشَآءَ مِنْهُ اِبْتِغَاءَ الْفِتْنَةِ وَابْتِغَاءَ تَاْوِیْلِهٖ ۗ وَ مَا یَعْلَمُ تَاْوِیْلَهٗ

﴿إِنَّ اللَّهَ﴾ (آل عمران: ۷)

”تو جن لوگوں کے دلوں میں کجی ہے وہ مشابہات کا اتباع کرتے ہیں تاکہ فتنہ برپا کریں اور مراد اصلی کا پتہ لگائیں حالانکہ مراد اصلی اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔“

اس کی ایک مثال یہ بھی بن سکتی ہے مثلاً آپ کے بہت سارے دوست ہوں اور آپ ان سب کو یا ان میں سے بعض کو پرکھنا چاہتے ہوں کہ ان میں سے کون کون آپ کے ساتھ مخلص و سچا ہے تو آپ ان کو ایک آزمائش میں ڈال دیتے ہیں جس کی وجہ سے آپ کھوئے اور کھرے کی پہچان حاصل ہو جاتی ہے۔

ایسے ہی موقع پر ایک شاعر کہتا ہے

أَبْلُ الزَّجَالِ إِذَا أَرَدْتَ إِخَاءَهُمْ  
فَإِذَا ظَفِرَتْ بِذِي اللَّيَافَةِ وَالسَّقَى  
وَتَوَشَّمْنَ فِعَالَهُمْ وَتَفَقَّدِ  
فِيهِ الْيَدَيْنِ قَرِيرِ عَيْنٍ فَاشْدُدِ

اور ایسے ہی موقع پر یہ ضرب المثل ”إِنْ أَخَاكَ مِنْ وَاسَاكَ“ مشہور ہے۔

اس موقع پر ایک اور مثال بھی دی جاسکتی ہے۔ فرض کریں آپ ایک استاد یا معلم ہیں اور آپ اپنے تلامذہ کو پرکھنا چاہتے ہیں کہ وہ کس قدر متوجہ و سنجیدہ ہیں اور ان کا آپ پر کس قدر اعتماد ہے اور وہ کس حد تک آپ کی علمیت کے معترف ہیں۔ بعد اس کے کہ آپ ان کو وسیع مطالعہ اور واضح تعلیمات فراہم کر چکے ہیں۔ پس آپ ان کو کسی پتیلی یا مسمے جیسے کلمات کے ذریعے آزماتے ہیں۔ تاکہ ناسمجھوں میں سے سمجھ دار ظاہر و علیحدہ ہو جائیں۔ اور آپ پر یقین و اعتماد رکھنے والے اور آپ سے محبت کرنے والے ان سے جدا ہو جائیں جو آپ کے علم و فضل کے بارے میں متردد شک و شبہ کا شکار ہیں۔ پس جو آپ پر پختہ اعتماد یقین رکھتا ہوگا سو وہ جان لے گا کہ یہ پہیلیاں اور معیات آپ کے علم کی بنا پر صادر ہوئے ہیں اگرچہ وہ خود (تلمیذ) ان پہیلیوں یا معیات کے معانی سے ناواقف ہو۔ لیکن اس کو یہ یقین ہوگا کہ آپ کی طرف سے ان مخفی معیات میں کوئی حکمت پوشیدہ ہے اور وہ حکمت ہے ”آزمانا اور پرکھنا۔“ اور جو تلمیذ آپ کے علم و فضل میں شک کا شکار ہوگا وہ اس موقع پر (اعتراضاً) کہے گا: ”معلوم نہیں کہ استاد اس سوال سے کیا چاہتا ہے؟“ یا ”استاد نے ان الفاظ و کلمات کو بولنا مناسب کیسے سمجھا؟“ یا ”استاد کا مبلغ علمی بس اتنا ہی تھا؟“ سو وہ تلمیذ یہ مطلقاً فراموش کر دے گا کہ اس سے پہلے آپ اس کو وسیع و واضح معارف و حکمتوں کے موتیوں سے ایسا توشہ دے چکے ہیں جو آپ کی علم و فضل پر دلائل و براہین کی حیثیت رکھتا ہے۔

اور اے مخاطب! اس مقام پر یہ بات بالکل بھی فراموش نہ ہونے پائے کہ اللہ تعالیٰ کا اپنے بندوں کو آزمانے سے یہ مقصود ہرگز نہیں کہ وہ پہلے ان کے حال سے ناواقف تھا، تب ہی اس نے اپنے بندوں کو آزمایا۔ ”ہرگز ہرگز ایسا نہیں“ بلکہ اللہ تعالیٰ کا علم تو ہر شے پر وسیع ہے۔ اس آزمائش سے تو پوشیدہ مخلوقات کو ظاہر کرنا اور بندوں پر ان کی اپنی جانوں میں موجود حجج و براہین کو قائم کرنا مقصود ہے۔ تاکہ وہ لوگ اللہ تعالیٰ کو اس کے عدل و جزا میں مورد الزام نہ ٹھہرائیں کہ اللہ نے اپنے بندوں میں سے بعض کو ثواب کا اہل بنا یا اور بعض کو عقاب کا۔ سورۃ الکہف، آیت نمبر ۴۹ میں ہے: ﴿وَلَا يَظْلِمُ رَبُّكَ أَحَدًا﴾ (الکہف: ۴۹) (اور تیرا رب کسی ایک پر بھی ظلم



نہیں کرتا۔)

بعض سورتوں کے ابتدائی حروف یعنی حروف مقطعات سے متعلق علمائے کرام کی دوسری رائے یہ ہے کہ ان حروف کا معنی مقصود معلوم ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ قرآن کتاب ہدایت ہے۔ اور ہدایت کا تحقق ہونا فہم معنی کے بغیر ممکن نہیں۔ بالخصوص جب کہ ہمیں حکم دیا گیا ہے کہ ہم قرآن کریم میں تدبر کریں اور اس سے مسائل کا استنباط کریں۔ اور یہ دونوں کام بھی بدون فہم معنی ممکن نہیں۔ تاہم یہ رائے رکھنے والے علمائے کرام سے ان حروف (حروف مقطعات) کے معنی مقصود بیان کرنے میں بہت سے اقوال منقول ہیں۔

ان میں سے بعض کا کہنا ہے کہ ہر سورت کی ابتدا میں جو حرف یا حروف ہیں، وہ ان سورتوں کے نام ہیں۔ اس باب میں وہ استدلال کرتے ہیں ان آثار و روایات سے جو اس میں مفید بھی ہیں۔ مثلاً نبی کریم ﷺ سے روایت کیا گیا ہے:

((ان لكل شيء قلباً وقلب القرآن ليس ومن قرأه ليس كتب الله له بقرءة بها قرءة القرآن عشر مرات)).

”بے شک ہر چیز کا دل ہوتا ہے اور قرآن کا دل سورۃ نبت ہے۔ اور جو شخص ایک مرتبہ سورۃ نبت پڑھتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے بدلے میں اس کے لیے دس مرتبہ قرآن پڑھنے کا ثواب لکھتے ہیں۔“

یہ بھی روایت کیا گیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

((مَنْ قَرَأَهُ السَّجْدَةَ حَفِظَ إِلَى أَنْ يُضْبَحَ)).

”جس نے سورۃ حم السجدہ پڑھی تو صبح تک اس کی حفاظت کی جائے گی۔“

پس ان میں سے بعض سورتیں بھی ناموں کے ساتھ مشہور ہو گئیں۔ پھر چند مختلف سورتیں ایسی بھی ہیں جن کے شروع میں ایک ہی طرح کا لفظ ہے۔ (جیسے سورۃ البقرۃ اور سورۃ آل عمران وغیرہ) اور ایک ہی نام متعدد سورتوں کا نہیں ہو سکتا۔ اس لیے ان سورتوں کے ناموں میں فرق کرنے کے لیے اس لفظ واحد کے ساتھ ایک ایک لفظ اور ملا دیا گیا تاکہ متعدد سورتوں کے نام مختلف ہو جائیں۔ لہذا کہا جانے لگا ”الم البقرۃ“ اور ”الم آل عمران“ اور ”حم السجدۃ“ وغیرہ۔ اس کی ایک مثال یہ بھی ہے، جیسے لفظ محمد بہت سارے لوگوں کا نام ہو۔ تو یہ نام بہت سارے اشخاص میں مشترک ہوا۔ اب ان میں سے ہر ایک کو دوسرے سے ممتاز کرنے کے لیے ایک اور لفظ کا اضافہ کر دیا جاتا ہے۔ لہذا مصر کے رہنے والے محمد کو ”محمد المصری“ اور شام کے رہنے والے محمد کو ”محمد الشامی“ کہہ دیا جاتا ہے۔

بعض کا ترجمان اس طرف ہے کہ یہ (حروف مقطعات) ان حروف تہجی کے آسماء ہیں جو ان کے بالمقابل وضع شدہ ہیں۔ (یعنی ”آلخ“ میں سے ”الف“ اس ”الف“ کا نام ہے جو حروف تہجی کا سب سے پہلا حرف ہے۔ اسی طرح ”لام“ اس ”لام“ کا نام ہے جو حروف تہجی میں سے ایک حرف ہے۔) اور حروف مقطعات سے مقصود مخاطبین کو یہ یاد کروانا ہے کہ یہ کلام الہی جس کا مقابلہ کرنے اور اس کا مثل لانے سے تم سب عاجز آچکے ہو، یہ ان ہی حروف تہجی سے مل کر بنا ہے جو تمہارے نزدیک مشہور و معروف ہیں۔ سو قرآن کا دار و مدار بھی ان ہی حروف پر ہے اور قرآن کا کوئی حرف بھی ایسا نہیں جو ان حروف (حروف تہجی) سے خارج ہو۔

ان میں سے بعض کا کہنا ہے: ان حروف مقطعات سے مراد ایک سورت کے اختتام اور دوسری سورت کے شروع ہونے ہر دلالت کا مقصود ہے۔

اور بعض کا کہنا ہے: ان حروف مقطعات سے مقصود ان کے ذریعے سے قسم کھانا ہے تاکہ ان کے شرف و فضل کو ظاہر کیا جا سکا۔



کیوں کہ یہ ایک اینٹ کی حیثیت رکھتے ہیں جب کہ پوری کتاب ایک عمارت کی مانند ہے۔

بعض کا کہنا ہے: ان حروف مقطعات سے مقصود حضرت محمد ﷺ کی نبوت کو بیان کرنا ہے بایں طور پر کہ نبی کریم ﷺ نے ان حروف کو جدا جدا بنے انتہا حسن ادائیگی کے ساتھ ادا کر کے دکھایا۔ حالانکہ آپ ﷺ انہی تھے اور پڑھنا لکھنا کسی سے نہ سیکھا تھا۔ اور یہ تو معروف ہے کہ حروف کو بلند و بلند ہر بار ہادیکھتے ہیں کہ کوئی ایسا شخص جس نے پڑھنا لکھنا نہ سیکھا ہو وہ پنجابی یا اردو تو ہے اور نہ ہی پڑھ سکتا ہے۔ (ہم اپنے مشاہدہ میں بھی بارہا دیکھتے ہیں کہ کوئی ایسا شخص جس نے پڑھنا لکھنا نہ سیکھا ہو وہ پنجابی یا اردو تو بڑی روانی سے بول لے گا مگر اس سے حروفِ حقیقی سن لیں یا یہ کہ یہ الفاظ کیسے ہے، اس کو کچھ بتانا ہوگا۔) پس آپ ﷺ کا ان حروف کو پڑھنا اور صحیح طریقے سے پڑھنے کا حق ادا کر دینا، مشرکین کے سامنے ایک واضح درویش دلیل تھی کہ یہ قرآن نبی کریم ﷺ اپنی طرف سے نہیں لائے بلکہ یہ تو اللہ تعالیٰ کا عطا کیا گیا ہے اس ذات کی طرف سے جو حکیم اور علم ہے۔

بعض کا کہنا ہے: حروف مقطعات سے مقصود سامعین کو متوجہ اور بیدار کرنا ہے۔ بایں طور پر کہ کلام کی ابتدا میں ایسے حروف لا کر ان کی سماعت کو کھٹکتا یا جائے تاکہ ان کے دلوں میں سمجھنے اور اس امر غریب کو جاننے کا داعیہ پیدا ہو۔ اور یہ داعیہ ان واس پر ابھار سے کہ وہ توجہ اور بیداری کے ساتھ آگے آنے والے کلام میں غور و فکر کریں۔ پس یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ آج کل ماڈرن ایجوکیشن سسٹم میں ہوتا ہے کہ لیکچر کی ابتدا میں لیکچر سے متعلق چند اشارات دیے جاتے ہیں تاکہ سنے والوں میں جستجو اور طلب پیدا ہو جائے اور وہ شوق و ذوق اور توجہ سے پورا لیکچر سنیں۔

ان میں سے بعض نے کہا: ان حروف سے مقصود مشرکین مکہ کی قرآن بیزاری والی خصلت کو دور کرنا اور انہیں قرآن کو کان لگا کر سننے پر آمادہ کرنا ہے۔ کیوں کہ معروف ہے کہ دعوتِ اسلام کے ابتدائی دور میں اسلام کے دشمن انہیں میں ایک دوسرے کو کہتے تھے: ﴿لَا تَسْمَعُوا لِهَذَا الْقُرْآنِ وَالْغَوْا فِيهِ لَعَلَّكُمْ تَعْبَهُونَ﴾ (م اجمدہ: ۲۶) ترجمہ: "اس قرآن کو سننا ہی نہ کرو اور جب پڑھنے لگیں تو شور مچا دیا کرو تاکہ تم غالب رہو۔" پس جب وہ سورتیں نازل ہوتیں جن کی ابتدا میں حروفِ حقیقی ہیں تو ان اعدائے اسلام کی سماعتوں پر دستک ہوتی کیوں کہ یہ ایسا انداز تھا کہ اس سے قبل وہ اس سے مانوس نہ تھے۔ لہذا وہ متوجہ ہوتے اور جیسے ہی ان حروف کے بعد آیاتِ بینات کا سلسلہ شروع ہوتا تو ان کے قلوب بے قابو ہو جاتے اور ان کی عقول اس فصیح اور بلخ کلام کی طرف مائل ہو جاتیں۔ پھر ان میں سے جس کے ساتھ اللہ نے ہدایت کا ارادہ کیا وہ یا تو فوری ایمان لے آیا یا پھر اللہ کی مشیت کے مطابق کچھ تاخیر سے ایمان لے آیا۔ پس اس طرح اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کے لیے حجت قائم کی گئی اور ان کو سمجھانے کے مختلف طرق اختیار کیے گئے سو اب ان کا کوئی عذر قبول نہ کیا جائے گا نہ دنیا میں اور نہ ہی آخرت میں۔

علامہ مرحوم الشیخ لفظی جوہری اپنی تفسیر میں سورۃ آل عمران کے ضمن میں لکھتے ہیں:

"جان لیجئے کہ قرآن بھی آسمانی کتاب ہے۔ اور آسمانی کتابوں میں بعض اوقات کوئی بات صراحت کے ساتھ بتائی جاتی ہے اور بعض اوقات رموز کے ذریعے۔ اور رمزی یا اشارہ مقاصدِ عالیہ، معانی اور معزز علامات میں سے ایک ہے۔ اور یہ رمز اور اشارے زمانہ قدیم سے اہل دیانات میں رائج رہے ہیں۔ کیا آپ یہود کو نہیں دیکھتے کہ وہ اُس وقت یعنی ایامِ نبوت میں مدینہ منورہ اور شرفی ممالک میں کبھر سے وہ نئے نئے اصطلاحات اور علامات کا آپس میں استعمال کرتے تھے؟ جو کہ آج ہمارے

دور میں حروف ابجد یا اعداد الجمل کے نام مشہور ہیں۔ پس وہ "الف" کو ایک، "باء" کو دو، "جیم" کو تین اور "دال" کو چار کے برابر قرار دیتے ہیں۔ اور اسی طرح حروف ابجد کی ترتیب کے مطابق حروف کو اعداد کے برابر قرار دیتے ہوئے "یا" کو دس اور "کاف" کو بیس کے برابر..... یہاں تک کہ "قاف" کو ایک سو اور "راء" کو دو سو..... اور "غین" کو ایک ہزار کے برابر قرار دیتے ہیں۔ آپ اس کی مزید تفصیل عنقریب جان لو گے۔

اور اسی طرح آپ اسکندر یہ، مصر، بلادیوم اور سوریا میں عیسائیوں کو دکھ لہیے، جو زمانہ نزول قرآن میں مخصوص حروف دینی اور مذہبی رموز کے طور پر استعمال کرتے تھے۔ جب کہ اُس وقت مصر میں یونانی زبان بطور سرکاری زبان رائج تھی۔ پس عیسائی لفظ "اکسیس" کو اس جملے: "یسوع المسیح ابن اللہ المخلص" کے لیے بطور رمز استعمال کرتے تھے۔ لفظ "اکسیس" کی تفصیل یہ ہے کہ "اکسیس" میں سے "الف" لفظ "ایسوس" کا پہلا حرف ہے۔ ("ایسوس" کا معنی "یسوع" ہے)۔ اور "ک" لفظ "کرسٹوس" کا پہلا حرف ہے۔ ("کرسٹوس" کا معنی "مسیح" ہے)۔ اور "اکسیس" کا پہلا "سین" اصل میں "تاء" تھا جو کہ نطق میں سین سے تبدیل ہو گیا اور یہ لفظ "شبو" کا پہلا حرف ہے۔ ("شبو" کا معنی اللہ ہے)۔ اور "یا" دلالت کرتا ہے "ایوٹ" پر اور "ایوٹ" کا معنی ہے "ابن"۔ اور "اکسیس" کا دوسرا "سین" بھی "تاء" سے مبدل ہے جس سے لفظ "توتیر" کی طرف اشارہ ہے۔ اور "توتیر" کا معنی ہے المخلص۔ اور ان تمام کلمات کا مجموعہ ہوا: "یسوع المسیح ابن اللہ المخلص"۔ اور لفظ "اکسیس" اتفاق سے دلالت کرتا ہے "سمکۃ" (یعنی مچھلی) کے معنی پر۔ آخر کار لفظ "السمکۃ" (مچھلی) ان لوگوں کے نزدیک ان کے معبود کے لیے "رمز" قرار پایا۔

ملاحظہ کیجیے کہ وہ کیسے ایک حرف کے ذریعے اَسْمَاء سے رمز کی طرف منتقل ہوئے اور حرف کی رمز کے ذریعے جانور کی رمز کی طرف جو دلالت کرتی ہے، بہت سارے حروف پر منتقل ہوئے۔ ایک انگریزی پوپ صموئیل مورخ کہتا ہے: رومیوں کی قبروں میں کثیر تعداد میں لکڑی اور ہڈیوں سے بنی ہوئی مچھلیوں کی چھوٹی چھوٹی تصویریں پائی گئی تھیں۔ وہ سارے کے سارے مسیحی تھے اور آپس میں تعارف کے طور پر مچھلیوں کی تصاویر کا استعمال کرتے تھے۔"

پس یہ ہی اُن اَوزَانِ اقوام کی فطرت میں شامل تھا جو بلا و عرب پر چھائی ہوئی تھیں اور عرب میں گھل مل گئی تھیں۔ قرآن مجید چوں کہ تمام انسانوں کے لیے نازل ہوا ہے خواہ وہ عرب ہوں یا عجم۔ اس لیے لازم تھا کہ قرآن مجید میں وہ منہج و انداز بھی اختیار کیا جائے جس سے دوسری اقوام بھی لذت محسوس کریں اور اس میں وہ چیزیں بھی ہوں جس سے دوسری اقوام مانوس ہوں۔ اور عنقریب آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ قرآنی سورتوں کے اوائل میں موجود رموز اور یہود و نصاریٰ کی رموز و حساب الجمل وغیرہ میں کوئی نسبت و علاقہ نہیں سوائے اس کے کہ جو نسبت ہوتی ہے ایک عقل مند آدمی اور نا سمجھ بچے کے علم میں یا علماء اور عوام الناس کے علم میں۔ اور اس کے ساتھ ہی آپ کے سامنے یہ بھی واضح ہو جائے گا کہ یہود و نصاریٰ نے کچھ رموز متعین کر رکھے تھے۔ اور یہود کی رموز درحقیقت حساب الجمل (حروف ابجد) پر مبنی تھیں۔

حضرت عبد اللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ سورۃ البقرۃ: ﴿ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ﴾ (البقرۃ: ۱) کی تلاوت فرما رہے تھے کہ اسی اثنا میں ابویاسر بن اخطب وہاں سے گزرا۔ پھر اس کے بعد اس کا بھائی عیسیٰ ابن اخطب اور کعب بن اشرف بھی آگئے۔ ان تینوں نے آپ ﷺ سے "السمکۃ" کے بارے میں پوچھا اور عرض کیا کہ ہم آپ

کو اس اللہ کا واسطہ دیتے ہیں کہ جس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں کیا یہ آیت اسی طرح آسمان سے آپ پر نازل ہوئی ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ہاں بالکل اسی طرح نازل ہوئی ہے۔ تو ٹھہری بولا: اگر آپ سچے ہیں تو میں آپ کو بتائے دیتا ہوں کہ آپ کی امت کی مدت انتہا چند ہی سال ہے۔ پھر وہ (تینوں) کہنے لگے (ایک روایت کے مطابق یہودیوں سے مخاطب ہو کر کہنے لگے) کہ ہم ایسے شخص کے دین میں کیوں کر داخل ہوں جس کی امت کے ختم ہونے کی مدت حساب الجمل کے مطابق صرف اکہتر سال ہے۔ آپ ﷺ یہ سن کر مسکرا دیے۔ ٹھی مزید بولا: کیا اس کے علاوہ (اس کے مثل) کوئی اور آیت بھی ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ہاں! ”التّصّٰ - یہ سن کر ٹھی نے کہا: یہ تو پہلی آیت سے بھی بڑی (لمبی) ہے۔ اس طرح تو ”ایک سوا کٹھ سال“ ہو گئے۔ کیا اس کے علاوہ کوئی اور آیت بھی ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ہاں! ”التّزّٰ - اب ٹھی کہنے لگا: یہ تو پہلی اور دوسری آیت سے بڑی اور لمبی ہے۔ اگر آپ سچے ہیں تو ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپ کی امت کی مدت انتہا ”دوسوا کٹھ سال“ سے زیادہ نہیں ہوگی۔ پھر کہنے لگا، کیا اس کے علاوہ کوئی اور آیت بھی ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ہاں! ”التّزّٰ - یہ سن کر ٹھی نے کہا (ایک روایت کے مطابق یہودیوں کے مجمعے سے مخاطب ہو کر کہا): ہم گواہی دیتے ہیں کہ ہم یقین کرنے والوں میں سے نہیں ہیں اور نہ ہی ہم یہ جانتے ہیں کہ آپ کے اقوال میں سے کس قول کو اختیار کریں۔ اس کے بعد ٹھی کا بھائی ابویاسر بن اخطب بولا: میری بات سنو! میں گواہی دیتا ہوں کہ ہمارے انبیاء نے ہمیں اس امت کی بادشاہت سے متعلق خبر دی تھی لیکن یہ نہیں بتایا تھا کہ وہ کتنا عرصہ رہے گی۔ اگر محمد (ﷺ) اپنی باتوں میں سچے ہیں تو میں دیکھ رہا ہوں کہ ان کو یہ سب کچھ طے لگا (یعنی حساب الجمل کے مطابق التّہّٰ، التّصّٰ، التّزّٰ اور التّزّٰ میں بیان کردہ تمام مدتیں یکجا ملیں گی جن کا مجموعہ سات سو چونتیس سال بنتا ہے۔) یہ سن کر یہود کھڑے ہو گئے اور کہنے لگے ہمارے لیے آپ کا سارا معاملہ ہی مشتبہ ہو چکا اور اب ہم نہیں جانتے کہ ان مدتوں میں سے قلیل کو لیں یا کثیر؟

ان ساری باتوں سے عاقل و ذکی سمجھ چکا ہوگا کہ حساب الجمل (اعداد الجمل) یہود کے نزدیک تعارف و پہچان کا ذریعہ تھے۔ نیز حساب الجمل رموز حریفی کی ایک نوع ہے۔ لہذا لازم ہو چکا تھا کہ قرآن مجید میں حروف مقطعات کو نازل کیا جاتا تاکہ دیگر مذاہب کے لوگ بھی قرآن کی طرف متوجہ ہوں اور ان حروف کو سمجھنے میں اپنی سوچ و فکر کو صرف کریں۔

میں نے جن طرق میں ان حروف (حروف مقطعات) میں موجود رموز سے متعلق کچھ پڑھا ہے۔ میں ان میں سے صرف

تین طریقے آپ کے سامنے بیان کروں گا۔

**طریقہ اولیٰ** • یہ حروف اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ کے ٹکڑے ہیں۔ جیسا کہ حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔ آپ رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ ”التّہّٰ“ میں سے الف سے ”آلاء اللہ“ لام سے ”لُطْفُ اللّٰہِ“ اور میم سے ”مُلْکُ اللّٰہِ“ مراد ہے۔ اور آپ رضی اللہ عنہما ہی سے مروی ہے: ”التّزّٰ“ اور ”التّصّٰ“ کا معنی ہے ”اَنَا اللّٰہُ اَعْلَمُ“ (میں ہی اللہ ہوں میں زیادہ جانتا ہوں۔) اور اسی طرح ہے تمام نواح (حروف مقطعات) میں۔ آپ رضی اللہ عنہما ہی سے مروی: ”التّہّٰ“ میں الف سے ”اللہ“ لام سے ”جبرئیل“ اور میم سے ”محمد ﷺ“ مراد ہیں اور مطلب اس کا یہ ہے کہ قرآن مجید نازل کیا گیا ہے اللہ تعالیٰ کی جانب سے حضرت جبرائیل علیہ السلام کی لسان کے ذریعے حضرت محمد ﷺ پر۔

میں کہتا ہوں کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی ان تمام روایات سے یہ مراد واضح ہوتی ہے کہ حروف مقطعات میں سے اکثر اللہ

مناہل العرفان فی علوم القسآن: جلد ①

عزوجل کی یاد دلانے والے ہیں کیوں کہ اللہ تعالیٰ کا ذکر ہر شے سے افضل ہے۔ اور جس طرح اسکندر نے اور روم میں نصاریٰ کی مقرر کردہ رمزیں ان کے معبودان کی طرف راجع تھیں اسی طرح (مسلمانوں کے نزدیک) ان حروف میں اللہ تعالیٰ کے اسماء بطور رمزی پائے جاتے ہیں۔ لیکن لازم ہے کہ یہاں کچھ ایسا ہو جو اعلیٰ اور اجل ہو (یعنی کسی ایسی تو جیبہ کا بیان ہو جس سے قرآن مجید کی عظمت و وقار مزید ظاہر ہو اور لوگوں کا اس کے مثل کلام لانے سے عاجز آ جانا اور بھی زیادہ واضح ہو جائے۔)

**مزید طریقہ ثانیہ** حروف مقطعات رسول اللہ ﷺ کی صداقت کے دلائل اور معجزات میں سے حیران کن دلیل اور معجزہ ہیں۔ اور یہ بھی وہ تو جیبہ ہے جس کو انسانی نفوس پسند کرتے ہیں۔ کیا تم نے دیکھا نہیں کہ حروف تہجی کو درست تلفظ کے ساتھ صرف وہ ہی پڑھ سکتا ہے جس نے پڑھنا لکھنا سیکھا ہو جب کہ نبی ﷺ نے آتی ہونے کے باوجود ان حروف کو پڑھا ہے۔

سورتوں کے شروع میں آنے والے حروف (فواتح السور) کی کل تعداد چودہ ہے جو کہ کل حروف تہجی کی تعداد کا نصف ہے بشرطیکہ سب سے پہلے حرف ”الف“ کو شمار نہ کیا جائے۔ اور چودہ حروف آتیس سورتوں کی ابتدا میں آئے ہیں۔ اور آتیس کا عدد کل حروف تہجی کی تعداد کے برابر ہے بشرطیکہ ”الف“ کو شمار کیا جائے۔ اور حروف مقطعات میں سے پانچ حروف ایسے ہیں جو حروف مہوسہ میں سے ہیں۔ جب کہ کل حروف مہوسہ کی تعداد دس ہے۔ اس طرح حروف مقطعات میں سے حروف مہوسہ کو الگ کیا جائے تو وہ کل حروف مہوسہ کا نصف ہوں گے۔ حروف مہوسہ کا مجموعہ ”فحشہ شخص سکت“ ہے۔ اور حروف مقطعات میں موجود حروف مہوسہ یہ ہیں:حاء، ہاء، صاد، سین، کاف۔

آپ کو معلوم ہے کہ حروف تہجی دو ہی طرح کے ہیں مہوسہ یا مجبورہ۔ مہوسہ سے متعلق اوپر لزر چکا اور مجبورہ سے متعلق اب جان لیجیے۔ حروف مجبورہ کی کل تعداد اٹھارہ ہے۔ اور اٹھارہ کا نصف ”نو“ ہے اور یہ ”نو“ کے ”نو“ فواتح السور یعنی حروف مقطعات میں موجود ہیں۔ جن کا مجموعہ ہے: ”لن یقطع أمر“۔

حروف شدیدہ کل آٹھ ہیں۔ مجموعہ ان کا ”اجدت طبقت“ ہے۔ آٹھ کا نصف چار ہوتا ہے اور یہ چاروں فواتح السور میں پائے جاتے ہیں جن کا مجموعہ ”أقطک“ ہے۔ اور حروف رخوہ کی کل تعداد تیس ہے۔ بیس کا نصف دس ہے اور یہ دس بھی فواتح السور (حروف مقطعات) میں موجود ہیں جن کا مجموعہ ”خمیس علی نصرہ“ ہے۔

حروف مطبکہ کی کل تعداد چار ہے۔ یعنی صاد، ضاد، طاء، ظاء۔ مجموعہ ان کا ”صطظض“ ہے۔ چار کا نصف دو ہے اور یہ دونوں حروف مقطعات میں موجود ہیں یعنی: صاد اور طاء۔

حروف مطبکہ کے علاوہ باقی تمام حروف ”حروف منفحہ“ کہلاتے ہیں۔ ان کی کل تعداد چوبیس ہے۔ اور چوبیس کا نصف بارہ بنتا ہے اور یہ بارہ کے بارہ فواتح السور میں مذکور ہیں۔

ملاحظہ فرمائیں کہ کیسے ان فواتح میں حروف تہجی میں سے (الف کو شمار کیے بغیر) نصف حروف استعمال ہوئے ہیں اور پھر کیسے ان حروف مقطعات کو آتیس سورتوں کی ابتدا میں لایا گیا ہے جب کہ الف کے ساتھ حروف تہجی کی تعداد بھی آتیس ہے۔ اور پھر کیسے خوب صورتی کے ساتھ حروف مہوسہ میں سے نصف، حروف مجبورہ میں سے نصف، حروف شدیدہ میں سے نصف، حروف رخوہ میں سے نصف، حروف مطبکہ میں سے نصف اور حروف منفحہ میں سے بھی نصف نصف حروف کو ان فواتح میں استعمال کیا گیا ہے! (یہ سب محض

اتقان نہیں ہو سکتا۔ بلکہ اللہ تعالیٰ کی حکمت عالیہ اور قرآن پاک کے جزات ظاہرہ میں سے ایک ہے۔ اور شاید یہ بھی اُن وجوہ میں سے ایک ہے جس کی بنا پر اہل عرب و عجم قرآن کا مشل لانے سے عاجز آ گئے۔

علمائے کرام نے اس مقام پر جو ابحاث بیان کی ہیں، میں نے ان میں سے بہت قلیل آپ کے سامنے بیان کی ہیں۔ اور میں نے تصدراً طوالت اختصاراً نہیں کی تاکہ لوگ اکتاہٹ کا شکار نہ ہو جائیں۔ اور میں نے طریقہ ثانیہ میں صرف اتنا ہی مواد بیان کیا ہے جو آپ کو یہ سمجھانے کے لیے کافی ہو جائے کہ حروف مقطعات کیسے ان اوصاف عالیہ کے حامل ہیں اور کیسے ان حروف مقطعات کو اس خاص نظام و سسٹم کے تحت لایا گیا ہے۔

مجھے یقین ہے کہ اگر کسی سیکھنے والے سے حروفِ تہجی میں سے اس منصفانہ انداز (نصف نصف کرنے) کے ساتھ حروف لانے کو کہا جائے تو وہ ایسا کرنے کی استطاعت نہیں رکھے گا۔ کیوں کہ اگر وہ حروفِ مطہقہ میں سے نصف حروف کو مد نظر رکھے گا تو حروفِ شدیدہ کی رعایت کیسے رکھ پائے گا؟ اور اسی تناسب کے ساتھ حروفِ مجہورہ میں سے نصف حروف کی رعایت کیسے رکھ پائے گا؟ اور یہ تمام دلائل ہیں رسول اللہ ﷺ کی صداقت پر۔ نیز اس صورت (طریقہ ثانیہ) سے حاصل ہونے والے فوائد زیادہ اہم ہیں پہلی صورت (طریقہ اول) سے۔ کیوں کہ پہلی صورت (طریقہ اولیٰ) میں اُسمائے الہیہ کے واسطے سے تکریر انسان کا فائدہ حاصل ہو رہا تھا جب کہ دوسری صورت (طریقہ ثانیہ) میں انسانی عقول کو کلامِ الہیہ کے سامنے گھٹنے ٹیکتے ہوئے عالمِ حیرانی میں عاجز قرار دینے کا فائدہ حاصل ہو رہا ہے۔

حروفِ مقطعات میں حروفِ تہجی اور اس کی انواع (مہوسہ و شدیدہ وغیرہ) کی نصف نصف والی تقسیم کو دیکھ کر یہ بات اور بھی زیادہ پختہ ہو جاتی ہے کہ یہ کلام اللہ تعالیٰ ہی کا ہے کیوں کہ ایامِ نبوت میں پوری دنیا میں کوئی ایک شخص بھی ان انواع سے واقف نہیں تھا۔ اور جب طویل زمانہ گزرنے کے بعد یہ اصطلاحات ظاہر ہوئیں تو ان کا نصف نصف ہونا بالکل اس تقسیم کے موافق تھا جو ایامِ نبوت میں نازل ہونے والے حروفِ مقطعات میں تھی۔

بلکہ اس تقسیم کے عجیب اور حیران کن ہونے کی وجہ سے عقل یہ فیصلہ کرتی ہے کہ آج بھی (جب کہ یہ اصطلاحات معروف و مشہور ہیں) کوئی ان اصطلاحات کی اس طرح سے منصفانہ تقسیم کرنے کی قدرت نہیں رکھتا۔ بس ثابت ہوا کہ یہ کلام اللہ تعالیٰ ہی کا ہے۔ نیز ان اصطلاحات کے بعد میں ظہور کی وجہ سے قرآن کے منزل من اللہ ہونے کے نظریے کو مزید تقویت ملتی ہے۔

**طریقہ ثالثہ** • اللہ تعالیٰ نے اس سارے عالم کو ایک مضبوط نظام اور مناسب یکسانیت کے ساتھ پیدا فرمایا ہے۔ قرآن مجید ایک آسمانی کتاب ہے اور اللہ کے بنائے گئے نظام کے عین مطابق، اُس کی صفت ابداع کے بالکل موافق اور اس کے مقررہ منہج پر رواں دواں ہے۔ اور قرآن کی یہ صفات اس پر دلالت کرتی ہیں کہ یہ کتاب اللہ ہی کی جانب سے ہے۔ کیوں کہ اگر کوئی آسمانی کتاب اللہ کے مقررہ منہج کے مخالف ہو، اُس کے افعال سے متاثر ہو اور اس کے طریقوں سے مخرف ہو تو وہ کتاب آسمانی کتاب نہیں ہو سکتی۔ بلکہ وہ ایک من گھڑت، خود ساختہ، نقل شدہ اور کذب سے بھر پور ہوگی۔ جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَلَوْ كَانُوا مِنْ عِنْدِ عَذْبِ اللَّهِ لَوجدُوا فِيهِ اخْتِلافاً كَثِيراً﴾ (الناس: ۸۲)

”اگر یہ اللہ کے سوا کسی اور کا کلام ہوتا تو اس میں وہ بہت سا اختلاف پاتے۔“

## منامیل العسرفان فی علوم القسرفان: جلد ①

الف کو شمار کیے بغیر حروفِ جمعی کی تعداد اٹھائیس ہے۔ اور عالم گواہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس اٹھائیس کے عدد کو پورے عالم میں جا بجا استعمال کیا ہے۔ ذیل میں چند مثالیں لکھی گئی ہیں جن میں اٹھائیس کا عدد موجود ہے۔

- ① دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کے جوڑا اٹھائیس ہیں۔ یعنی ہر ہاتھ میں چودہ جوڑے
- ② انسان کی سر کی ہڈی میں کُل اٹھائیس مہرے (ہڈیوں کے جوڑے جو کہ موتیوں کی مالا کی طرح آپس میں جڑے ہوتے ہیں) ہیں۔ چودہ اوپر والے حصے میں اور چودہ ہی نیچے والے حصے میں۔
- ③ تمام وہ جانور جو مکمل جسم رکھتے ہیں جیسے گائے، اونٹ، گدھے، درندے اور وہ تمام حیوانات بھی جو بچکے دیتے ہیں، اُن سب کی سر کی ہڈی میں بھی اٹھائیس مہرے ہی ہیں۔ چودہ صلب کے آخری حصے میں اور چودہ ہی بدن کے پچھلے حصے میں۔
- ④ اُڑتے وقت پرندے اپنے بازوؤں میں سے جن پروں پر اعتماد کرتے ہیں، اُن پروں کی تعداد بھی ایک بازو میں چودہ ہے اور دونوں بازوؤں کو ملا کر اٹھائیس ہوں گے۔

⑤ لمبی رُم والے جانور مثلاً گائے اور درندے وغیرہ کی رُم میں بھی باریک باریک ہڈیوں کے اٹھائیس جوڑے ہیں۔

⑥ طویل خلقت والے جانور مثلاً مچھلیاں، سانپ اور بعض حشرات کی ریزہ کی ہڈی میں بھی اٹھائیس جوڑے ہوتے ہیں۔

⑦ لغت العرب جو کہ انتھ اللغات ہے، کے کُل حروف کی تعداد بھی اٹھائیس ہے۔

اور ان اٹھائیس حروف میں سے چودہ ایسے ہیں جو لام تعریف میں مدغم ہو جاتے ہیں۔ وہ یہ ہیں: ت ذ ر ز س ش ص ض ط ظ ل ن چودہ ایسے ہیں جن کا لام تعریف میں ادغام نہیں ہوتا۔ وہ یہ ہیں: ا ب ج ح خ غ ف ق ک م ر ہ ی۔

⑧ قلم کے ساتھ لکھے جانے والے حروف کی دو قسمیں ہیں۔ پہلی قسم وہ جو منقوط ہیں اور ان کی تعداد بھی چودہ ہے۔ دیکھیے: ب ت ث ج خ ز ش ض ظ غ ف ق ن۔ دوسری قسم وہ جو غیر منقوط ہیں اور ان کی تعداد بھی چودہ ہے۔ دیکھیے: ا ح د ر س ص ط ر ع ک د ہ ل م لا۔ غیر منقوط حروف میں سے آخری حرف اصل میں حرفِ علت "الف" ہے اور سب سے پہلا حرف "ہمزہ" ہے۔ پس اس طرح یہ بھی چودہ حروف ہی ہوئے۔ اور باقی رہا "یا" تو یہ منقوط بھی ہے اور غیر منقوط بھی۔ اس طرح کہ اگر یہ وسط کلمہ میں آئے تو منقوط ہوگا اور اگر آخر میں آئے تو غیر منقوط۔ لہذا انقظوں والے حروف بھی چودہ ہی ہوں گے اور بغیر انقظوں والے بھی۔ اور انیسواں حرف منقوط بھی ہے اور غیر منقوط بھی تاکہ تقسیم میں عدل رہے (اگر انیسواں حرف صرف منقوط یا صرف غیر منقوط ہوتا تو تقسیم میں عدل باقی نہ رہتا۔) اور اس عدل کی فضیلت اس حکیم ذات کے لیے ہے جس نے عربی حروفِ جمعی وضع کیے۔

⑨ چاند کی منازل بھی اٹھائیس ہیں۔ چودہ بُرج شمالی میں اور چودہ بُرج جنوبی میں۔ ان تمام مثالوں کا حاصل یہ ہی ہے کہ تمام موجودات جن میں اٹھائیس کا عدد ہے ان کی دو قسمیں ہیں جن میں سے ہر ایک چودہ پر مشتمل ہے۔ پس اسی طرح قرآن مجید میں جو حروف عربیہ آئے ہیں وہ بھی دو قسم پر ہیں۔ ان میں سے ایک قسم چودہ حروف پر مشتمل ہے اور وہ فواتح السور میں استعمال ہوئی ہے اور دوسری قسم بھی چودہ حروف پر مشتمل ہے لیکن وہ فواتح السور میں استعمال نہیں ہوئی۔ گویا کہ اللہ تعالیٰ فرما رہے ہیں: اے میرے بندو! بے شک چاند کی اٹھائیس منازل ہیں اور دو قسموں پر مشتمل ہیں۔ ہاتھوں کے جوڑے بھی اٹھائیس ہیں اور دو قسموں (حصوں) پر مشتمل ہیں۔ اسی طرح وہ حروف جن کا ادغام لام تعریف میں ہوتا ہے اور وہ حروف جو قلم کے ذریعے لکھے جاتے ہیں اُن میں



سے ہر ایک چودہ ہیں اور ان کے اضداد بھی چودہ ہیں۔ پس اسے میرے ہندو! ان سب مثالوں کو سمجھو اور جان لو کہ یہ قرآن بھی میری طرف سے نازل کردہ ہے۔ کیوں کہ میں نے ہی اس قرآن کے حروف کو پر دے میں وہ طریقہ اختیار کیا ہے جو منازلِ قمر، اجسامِ انسانیہ، اجسامِ حیوانیہ اور حروفِ حقیقی کے نظام کو جو بد میں لانے کے لیے اختیار کیا تھا۔ پس کوئی بشر جیسے محمد ﷺ یا آپ کے علاوہ کوئی اور کیسے اور کیوں کر اس نظام کو جو بد میں لاسکتا ہے اور حروف کے ان اعداد و شمار کو میرے وضع کردہ نظام، میرے رسم کردہ طریقوں اور میرے جاری کردہ نوح کے مطابق کیسے بنا سکتا ہے؟ بے شک یہ قرآن میری ہی طرف سے نازل کردہ ہے اور میں نے ہی ان حروف کو اوائلِ السور میں رکھا ہے تاکہ تم ان سے یہ حکمتیں اخذ کر سکو۔ سو تم جان لو گے کہ میں نے آسمان وزمین اور ان کے مابین جو کچھ ہے بے فائدہ پیدا نہیں کیا۔ بلکہ عالمِ اروجی میں ایک خاص نظام مقرر کیا ہے۔ کیوں کہ اس کتاب (قرآن مجید) نے زمانے کی انتہا تک باقی رہنا ہے۔ اور اس کی لغت بھی اس کے ساتھ ہی باقی رہے گی۔ پورے عالم میں کوئی ایک لغت بھی ایسی نہیں ہے جو تغیر سے محفوظ رہی ہو سو اسے اس لغت کے جس کا محافظ دین ہو۔ اور لغتِ عربیہ کے علاوہ کوئی بھی ایسی لغت نہیں جس کی حفاظت دین نے کی ہو۔

اب! آپ پر یہ امر حقیقی نہیں رہا کہ فواجِ السور سے متعلق دونوں آراء میں سے دوسری رائے شہادت کو ختم کرنے میں پہلی رائے سے نسبتاً زیادہ مبلغ و مفید ہے۔ کیوں کہ یہ رائے لوگوں کے گمان کردہ اس وہم کو فواجِ السور کا کوئی معنی و مفہوم نہیں ہے، کی جزیہ کو ختم کر دیتی ہے اور سابقہ وجوہ میں بیان کردہ معانی و مفہام کو مزید پختہ و مقرر کر دیتی ہے۔ اور اگر اب بھی کوئی شخص حروفِ مقطعات کے معانی کو سمجھ نہ پائے تو یہ قرآن میں عیب شمار نہیں ہوگا بلکہ اس کم فہم شخص کی استعداد میں عیب گردانا جائے گا۔ کیوں کہ کتابِ اللہ میں جیسے خواص کو مخاطب کیا گیا ہے بالکل اسی طرح عوام کو بھی مخاطب کیا گیا ہے۔ ایسا ہرگز نہیں ہے کہ قرآن میں ایسے الفاظ ہوں جن کو خاص خاص لوگ سمجھ سکیں اور عوام ان کو سمجھنے سے قاصر رہے۔ (یعنی کوئی بھی شخص جس میں سمجھنے بوجھنے صلاحیت ہو وہ قرآن کو سمجھ سکتا ہے۔)

فواجِ السور سے متعلق دونوں آراء سے آپ کے سامنے یہ بات واضح ہو گئی ہے کہ قرآن مجید میں ان الفاظ (حروفِ مقطعات) کا شامل ہونا نہ ہی تو کسی لغو کلام کے قبیل سے ہے نہ ہی یہ ظاہر کرنے کے لیے ہے کہ قرآن کریم عینِ دنیف چیزوں کا مظہر ہے، نہ ہی یہ کہ یہ حروف قرآن کا حصہ نہیں تھے بلکہ زمانوں کے گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کا قرآن کے ساتھ الحاق ہوتا گیا اور نہ ہی یہ کہ یہ حروف ہذا کا ثمرہ ہیں (نغوز باللہ)۔ بلکہ فواجِ السور تو یہ ثابت کرتے ہیں کہ قرآن کریم کے من عند اللہ ہونے کی کوئی نئی نہیں کر سکتا۔ برابر ہے کہ فواجِ السور کا معنی ظاہر ہو یا ظاہر نہ ہو اللہ تعالیٰ کی ان حکمتوں کی بنا پر جو ان حروف کو لانے میں ہیں اور جن کو ہم بیان کر چکے ہیں۔ اور اللہ ہی حکمتوں والا اور علم والا ہے۔

کہتے ہیں: قرآن کی قسم کی (کی سورتیں و آیات) اذلہ اور براہین سے خالی ہیں۔ بخلاف قسمِ مدنی کے، کہ مدنی چھٹا شبہ سورتیں و آیات دلائل سے بھری ہوئی ہیں اور حج و براہین کے ذریعے مضبوط ہیں۔ یہ ایک نئی دلیل ہے اس پر کہ حضرت محمد ﷺ جس ماحول میں رہے، اس سے اثر قبول کیا۔ (یعنی جب حضور اکرم ﷺ مکہ کے ماحول میں تھے تو مکہ کے لوگ زیادہ ثقافت یافتہ نہ تھے اور دلائل و حجوتوں کی راہ سے واقف نہ تھے اس لیے کئی حصہ دلائل و براہین سے خالی ہے۔ جب کہ اہل مدینہ مہذب اور ثقافت یافتہ تھے اس لیے مدینہ میں آنے کے بعد نازل ہونے والی آیات و سورتوں نے اس اثر کو قبول کیا اور ان میں دلائل و براہین

شامل ہو گئیں۔)

① جیسا کہ پہلے بھی بیان ہو چکا ہے کہ اگر قرآن اس ماحول سے تاثر کا نتیجہ ہوتا جس ماحول میں حضور اکرم ﷺ رہے تھے تو اس ماحول کے رہنے والے اس طعن کو پیش کرنے کے زیادہ حق دار ہوتے کیوں کہ وہ اس نقص کو سب سے زیادہ جاننے والے ہوتے۔ اور پھر وہ اس طعن کو پیش کرنے میں کامیاب بھی ہو جاتے اور وہ دعوت اسلام کو باطل کرنے کے لیے بڑے وسیع باب سے داخل ہوتے۔ خاص طور جب کہ رسول اللہ ﷺ کے مکہ اور مدینہ دونوں میں ایسے تلخ ترین دشمن پائے جاتے تھے جن کی دشمنی کا کوئی علاج نہ تھا۔ (لیکن ایسا کچھ بھی نہ ہوا یعنی ان دونوں ماحولوں میں رہنے والوں میں سے کسی نے بھی یہ اعتراض نہ کیا کہ کسی آیات تو دلائل سے عاری ہیں جب کہ مدنی آیات دلائل سے بھری ہوئی کیوں ہیں؟)

② اگر یہ بات صحیح ہوتی تو (نعموذ باللہ) حضور اکرم ﷺ کی نبوت ضرور باطل ہو چکی ہوتی۔ اور اہل مکہ و مدینہ کے حق میں نبوت کا ثابت ہونا صحیح ہوتا کیوں کہ اس اعتبار سے تو وہ ہی اس کا مصدر تھے اور وہ ہی اس معاملے میں حضور اکرم ﷺ کے استاد تھے (نعموذ باللہ)۔ یہ جواب ان کے ماضی میں کیے جانے والے ساقط شدہ شبہات کے رد میں بھی دیا جا چکا ہے۔ اور وہ ساقط شدہ شبہات ایسے تھے جو دلائل کرتے تھے ان کی فساد و نفرت، حقیقت و تاریخ سے دوری و نابلدی اور گھٹیا سوچ پر۔

③ اس شبہ میں ان کا جھوٹ چھپا ہوا نہیں بلکہ بہت صریح اور واضح ہے کیوں کہ قسم کی تو اللہ تعالیٰ کی ربوبیت و اہمیت، رسول اللہ ﷺ کی رسالت و نبوت اور آخرت و قیامت سے متعلق اسلامی عقیدے پر مضبوط ترین دلائل اور عظیم جتوں سے لبریز ہے۔ سورۃ المؤمنون جو کہ کسی بے کوفور سے نیلے کہ وہ کیسے تو حید کی بنیادوں کو بلند و مضبوط، جب کہ شرک کی اساس کو کمزور کر رہی ہے۔

﴿مَا اتَّخَذَ اللَّهُ مِنْ وَلَدٍ وَ مَا كَانَ مَعَهُ مِنْ إِلَهٍ إِذًا لَذَهَبَ كُلُّ إِلَهٍ بِمَا خَلَقَ وَ لَعَلَّا بَعْضُهُمْ عَلَى بَعْضٍ سُبْحٰنَ اللَّهِ عَمَّا يُصِفُونَ ﴿۹۱﴾﴾ (المؤمنون: ۹۱)

”اللہ نے نہ تو کسی کو اپنا بیٹا بنایا ہے اور نہ اس کے ساتھ کوئی اور معبود ہے۔ ایسا ہوتا تو ہر معبود اپنی اپنی مخلوقات کو لے کر چل دیتا اور ایک دوسرے پر چڑھ دوڑتا۔ یہ لوگ جو کچھ اللہ کے بارے میں بیان کرتے ہیں اللہ اس سے پاک ہے۔“

سورۃ الانبیاء میں دیکھیے یہ سورت بھی کی ہے:

﴿لَوْ كَانَ فِيهِمَا آلِهَةٌ إِلَّا اللَّهُ لَفَسَدَتَا فَسُبْحٰنَ اللَّهِ رَبِّ الْعَرْشِ عَمَّا يُصِفُونَ ﴿۲۲﴾ لَا يُسْئَلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَ هُمْ يُسْئَلُونَ ﴿۲۱﴾ أَوِ اتَّخَذُوا مِنْ دُونِهِ آلِهَةً قُلْ هَاتُوا بُرْهٰنَكُمْ هٰذَا ذِكْرُ مَنْ مَعِيَ وَ ذِكْرُ مَنْ قَبْلِي بَلْ أَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُونَ الْحَقَّ لَهُمْ مَعْرُضُونَ ﴿۲۳﴾﴾ (الانبیاء: ۲۲-۲۳)

”اگر آسمان و زمین میں اللہ کے سوا اور معبود ہوتے تو زمین اور آسمان درہم درہم ہوجاتے۔ جو باتیں یہ لوگ بناتے ہیں تو اللہ جو مالک عرش ہے ان باتوں سے پاک ہے۔ وہ جو کام کرتا ہے اس کی پریشانی نہیں ہوگی اور جو کام یہ لوگ کرتے ہیں اس کی ان سے پریشانی ہوگی۔ کیا لوگوں نے اللہ کو چھوڑ کر اور معبود بنا لیے ہیں کہہ دو کہ اس بات پر اپنی دلیل پیش کر دو۔ یہ میری اور

میرے ساتھ والوں کی کتاب بھی ہے اور جو مجھ سے پہلے پیغمبر ہوئے ہیں، ان کی کتابیں بھی ہیں۔ بلکہ بات یہ ہے کہ ان میں اکثر حق بات کو نہیں جانتے اور اس لیے اس سے منہ پھیر لیتے ہیں۔

سورۃ العنکبوت جو کہ کئی ہے، میں دیکھیے کہ وہ کیسے نبی کریم ﷺ کی نبوت پر دلائل پیش کر رہی ہے:

﴿وَمَا كُنْتُمْ تَسْتَلُوا مِنْ قَبْلِهِ مِنْ كِتَابٍ وَلَا تَخْطُبُهُ بَيْنَ يَدَيْكَ إِذَا الْأَنْبَاءُ الْمُبْتَطِنُونَ ۝ بَلْ هُوَ آيَاتٌ بَيِّنَاتٌ فِي صُدُورِ الَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ ۝ وَمَا يُجْحَدُ بِآيَاتِنَا إِلَّا الظَّالِمُونَ ۝ وَقَالُوا لَوْلَا أَنْزَلَ عَلَيْهِ آيَاتٌ مِنْ رَبِّهِ قُلْ إِنَّمَا الْآيَاتُ عِنْدَ اللَّهِ ۝ وَإِنَّمَا أَنَا نَذِيرٌ مُبِينٌ ۝ أَوَلَمْ يَكْفِهِمْ أَنَّا أَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ يُتْلَىٰ عَلَيْهِمْ ۚ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَرُحْمَةً ۙ وَذِكْرًا لِقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ﴾ ﴿الأنکبوت: ۳۸-۵۱﴾

”اور آپ (ﷺ) اس سے پہلے کوئی کتاب نہیں پڑھتے تھے اور نہ اسے اپنے ہاتھ سے لکھ ہی سکتے تھے ایسا ہوتا تو اہل باطل ضرور شک کرتے۔ بلکہ یہ روشن آیتیں ہیں۔ جن لوگوں کو علم دیا گیا ہے ان کے سینوں میں محفوظ ہیں اور ہماری آیتوں سے وہ ہی لوگ انکار کرتے ہیں جو بے انصاف ہیں۔ اور کافر کہتے ہیں کہ اس کے پروردگار کی طرف سے نشانیاں کیوں نازل نہیں ہوئیں کہہ دو کہ نشانیاں تو اللہ ہی کے پاس ہیں۔ اور میں تو کھلم کھلا خبردار کرنے والا ہوں۔ کیا ان لوگوں کے لیے یہ کافی نہیں کہ ہم نے آپ پر کتاب نازل کی جو ان کو پڑھ کر سنائی جاتی ہے۔ کچھ شک نہیں کہ مومن لوگوں کے لیے اس میں رحمت اور نصیحت ہے۔“

پورۃ قی جو کہ کئی ہے، کی درج ذیل آیات میں تذکرہ کیجیے، جو کہ مرنے کے بعد دوبارہ جی اٹھنے پر بطور دلیل قائم کی گئی ہیں۔

﴿وَنَزَّلْنَا مِنَ السَّمَاءِ مَاءً مُبَارَكًا فَأَنْبَتْنَا بِهِ جَبْتًا وَحَبَّ الْحَصِيدِ ۝ وَالنَّخْلَ بَيْضَاتٍ لَهَا طَلْعٌ نَضِيدٌ ۝ رِزْقًا لِلْعِبَادِ ۙ وَأَحْيَيْنَا بِهِ بَلْدَةً مَيْتًا ۙ كَذَٰلِكَ الْخُرُوجُ﴾ ﴿ق: ۹-۱۱﴾

”اور ہم نے آسمان سے برکت والا پانی اتارا اور اس سے بارغ اُگائے اور کھیتی کا آناج۔ اور لے لے بے بھجور کے درخت جن کے خوشے تہہ بہ تہہ ہوتے ہیں۔ یہ سب کچھ ہندوں کو روزی دینے کے لیے کیا ہے اور اس پانی سے ہم نے مردہ زمین کو زندہ کیا بس اسی طرح قیامت کے روز نکل پڑا ہے۔“

﴿أَفَحَسِبْتُمْ بِالْخَلْقِ الْأَوَّلِ ۚ بَلْ هُمْ فِي لَبْسٍ مِنْ خَلْقٍ جَدِيدٍ﴾ ﴿ق: ۱۵﴾

”تو کیا ہم پہلی بار پیدا کر کے تھک گئے ہیں؟ نہیں! بلکہ یہ از سر نو پیدا کرنے کے بارے میں شک میں پڑے ہوئے ہیں۔“

کئی سورتوں میں تو مرنے کے بعد دوبارہ جی اٹھنے اور جزا و سزا پر عقلی دلائل بھی قائم کیے گئے ہیں۔ دیکھیے سورۃ المؤمنون:

﴿أَفَحَسِبْتُمْ أَنَّمَا خَلَقْنَاكُمْ عَبَثًا وَأَنَّكُمْ إِلَيْنَا لَا تُرْجَعُونَ﴾ ﴿المؤمنون: ۱۱۵﴾

”کیا تم یہ خیال کرتے ہو کہ ہم نے تم کو بے مقصد پیدا کیا ہے اور یہ کہ تم ہماری طرف لوٹ کر نہیں آؤ گے؟“

﴿أَمْ كُنْ تَكُنْ ۖ أَمْ كُنْ مُؤْمِنًا ۚ مَن كَانَ فَاسِقًا ۖ لَّا يَسْتَوُونَ ۝ أَمَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ فَلَهُمْ جَنَّاتُ الْمَأْوَىٰ نُزُلًا ۖ بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ﴾ ﴿الاسجد: ۱۸، ۱۹﴾

”بھلا جو مومن ہو وہ اس شخص کی طرح ہو سکتا ہے جو نافرمان ہو؟ دونوں برابر نہیں ہو سکتے۔ جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل

کرتے رہے ان کے رہنے کے لیے باغ ہیں۔ یہ مہمانی ان کاموں کی جزا ہے جو وہ کرتے تھے۔

﴿أَمْ حَسِبَ الَّذِينَ اجْتَرَحُوا السَّيِّئَاتِ أَنْ نَجْعَلَهُمْ كَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ سَوَاءً مَحْيَاهُمْ وَ مَمَاتُهُمْ سَاءَ مَا يَحْكُمُونَ ۗ﴾ وَ خَلَقَ اللَّهُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ بِالْحَقِّ وَ لِيَتَجَزَىٰ كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ وَ هُمْ لَا يُظْلَمُونَ ﴿۲۲﴾ (الباقیہ: ۲۱، ۲۲)

”جو لوگ بُرے کام کرتے ہیں کیا وہ یہ خیال کرتے ہیں کہ ہم ان کو ان لوگوں جیسا کر دیں گے جو ایمان لائے اور عمل نیک کرتے رہے اور ان کی زندگی اور موت یکساں ہوگی۔ یہ جو دعویٰ کرتے ہیں بُرے ہیں۔ اور اللہ نے آسمانوں اور زمین کو حکمت سے پیدا کیا ہے اور تاکہ ہر شخص اپنے اعمال کا بدلہ پائے اور ان پر ظلم نہیں کیا جائے گا۔“

اور سورۃ الانعام جو کہ کہیے ہے کی درج ذیل آیات پر غور کیجیے کہ ان میں کس طرح مشرکین کی دلیل کو رد اور باطل کیا گیا جو وہ اللہ کی مشیت کے حوالے سے پیش کرتے تھے۔

﴿سَيَقُولُ الَّذِينَ أَشْرَكُوا لَوْ شَاءَ اللَّهُ مَا أَشْرَكْنَا وَلَا آبَاءُنَا وَلَا حَزَمْنَا مِنْ شَيْءٍ ۗ كَذَلِكَ كَذَّبَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ حَتَّىٰ ذَاقُوا بَأْسَنَا ۗ قُلْ هَلْ عِنْدَكُمْ مِنْ عِلْمٍ فَتُخْرِجُوهُ لَوْلَا أَنْ تَتَّبِعُونَ إِلَّا الظَّنَّ وَ إِنْ أَنْتُمْ إِلَّا تَخْرُصُونَ ۗ﴾ قُلْ فَلِلَّهِ الْحُجَّةُ الْبَالِغَةُ ۗ فَلَوْ شَاءَ لَهَدَاكُمْ أَجْمَعِينَ ﴿۱۳۸﴾ (الانعام: ۱۳۸، ۱۳۹)

”جو لوگ شرک کرتے ہیں وہ کہیں گے اگر اللہ چاہتا تو ہم شرک نہ کرتے اور نہ ہمارے باپ دادا شرک کرتے اور نہ ہم کسی چیز کو حرام ٹھہراتے۔ اسی طرح ان لوگوں نے تکذیب کی قسمی جو ان سے پہلے تھے یہاں تک کہ ہمارے عذاب کا مزہ چکھ کر رہے۔ کہہ دو کیا تمہارے پاس کوئی سند ہے اگر ہے تو اسے ہمارے سامنے لاؤ۔ تم لوگ تو بس گمان کے پیچھے چلتے اور انکل کے تیر چلاتے ہو۔ کہہ دو کہ اللہ ہی کی حجت غالب ہے پھر وہ چاہتا تو تم سب کو ہدایت دے دیتا۔“

آیات بالا کے علاوہ اور بھی بہت سے دلائل و براہین ہیں جن سے سکی سورتیں اور آیات بھری ہوئی ہیں۔ لیکن اس قوم کا کیا علاج کیا جائے جس نے ہدایت کے بدلے گم راہی اور اندھے پن کو پسند کر لیا اور کذب و افترا کی راہ پر چل پڑی ہو۔ ہم اللہ سے التجا کرتے ہیں کہ وہ فتنوں کے شر سے ہمیں بچائے اور حق پر ثابت قدم رکھے۔ کیوں کہ تمام مخلوق کے قلوب اسی کے قبضے میں ہیں اور تمام معاملات اسی کی طرف سے ہیں اور اسی کی طرف لوٹ جاتے ہیں۔ جیسا کہ قرآن کریم میں ہے:

”اللہ جسے چاہتا ہے (اس کی ہٹ دھرمی کی وجہ سے) گم راہی میں ڈال دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے، (اس کے اخلاص کی وجہ سے اُسے) سیدھی راہ پر لگا دیتا ہے۔“ (الانعام: ۳۹)



## جمع و تاریخ قرآن، شبہات ان کے جوابات، اور اس بارے وارد ہونے والی روایات کے چند نمونے

”جمع قرآن“ کا لفظ کبھی تو حفظ فی الصدور یعنی زبانی یاد کرنے کے معنی پر بولا جاتا ہے۔ اور کبھی اس کا اطلاق قرآن کے تمام حروف، کلمات اور سورت و آیات کی کتابت پر ہوتا ہے۔ یعنی جمع قرآن کا معنی کبھی ہوتا ہے حفظ فی السطور۔ چنانچہ ”جمع قرآن“ کا پہلا معنی ہوا قلوب و صدور میں قرآن کا جمع ہونا اور دوسرا معنی ہوا قرآن کو کاغذ پر لکھنا۔ پھر یاد رکھیں کہ جمع بمعنی کتابت، اسلام کے عہد اول میں تین مرتبہ ہوا ہے:

① عہد نبوی ﷺ میں ② دور خلافت صدیقی میں ③ دور خلافت عثمانی میں صرف اس آخری دور میں مصاحف تیار کر کے مختلف علاقوں میں بھیجے گئے تھے۔ اس موضوع پر چند شبہات وارد ہوئے ہیں جس کی حقیقت کو واضح کرنا بہت ضروری ہے۔ ہم جب صحیح علمی حقائق کی حرارت پیش کریں گے تو وہ شبہات خود ہی پگھل کر بے نام و نشان ہو جائیں گے۔ جیسا کہ ارشاد ربانی ہے:

﴿فَأَمَّا الزَّبَدُ فَيَذْهَبُ جُفَاءً ۗ وَأَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَنَبُذْهُ فِي الْأَذْوَانِ ۗ كَذَلِكَ يُضَوِّبُ اللَّهُ الْأَمْتَالَ ۗ﴾ (الرعد: ۱۸)

”پھر جو جھاگ ہے وہ یونہی جاتا رہتا ہے اور جو لوگوں کو فائدہ دے وہ زمین میں ٹھہر جاتا ہے اسی طرح اللہ مثالیں بیان فرماتا ہے۔“

جمع قرآن بمعنی حفظ فی الصدور ۲ میں یہ تھی کہ اسے زبانی یاد کر کے لوگوں کے سامنے تھوڑا تھوڑا کر کے پڑھا جائے تاکہ لوگ بھی اس کو حفظ کر کے یاد کر لیں، و جس کی یہی تھی کہ آپ ﷺ ایک انبی ﷺ تھے اور امیوں میں ہی آپ ﷺ مبعوث ہوئے تھے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا مِنْهُمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَإِنْ كَانُوا مِنْ قَبْلُ لَنَفِي ضَالِّينَ قَبِيْنِ ۗ﴾ (الجم: ۲)

”وہی ہے جس نے ان پڑھوں میں ایک رسول انہیں میں سے مبعوث فرمایا جو ان پر اس کی آیتیں پڑھتا ہے اور انہیں پاک کرتا ہے اور انہیں کتاب اور حکمت سکھاتا ہے اور بے شک وہ اس سے پہلے صریح گمراہی میں تھے۔“

ایک اُمی کی شان یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنے اہم امور میں اپنے حافظ پر اعتماد کیا کرتا ہے اور اس کا استحضار اس کے لیے محدود



معاون ہوتا ہے، خصوصاً جب اسے ایسا قوت حافظہ بھی دیا گیا ہو جس کی بدولت اس کے لیے ان امور کو جمع کرنا اور ذہن میں محفوظ رکھنا آسان ہو، یہی صورت حال نزول قرآن کے وقت امت عزکیہ کی تھی کہ دیگر خصائص میں سے اسے سرعت حفظ اور ذہانت کی صلاحیت بھی عطا ہوئی تھی، حتیٰ کہ ان کے قلوب اور اذہان ایک کتاب اور رجسٹر کی مانند تھے جس میں وہ عرب کے انساب و ایام اور دیگر اشعار و مغاز کو محفوظ کر لیتے تھے، پھر جب قرآن آیا تو اس نے ان کی قوت بیالی کو مغلوب کیا اور ان کے جذبات پر اتنا اثر و غلبہ ڈالا اور اپنے لفظ و معنی کے اعتبار سے ان کی اعلیٰ صلاحیتوں کو متاثر کیا، چنانچہ جب انہیں اس بات کا یقین ہو گیا کہ یہ قرآن روح حیات ہے تو انہوں نے اپنی زندگی کو اس کے مطابق ڈھال لیا۔

حضور اکرم ﷺ قرآن زبانی یاد کرنے کا خوب اہتمام فرماتے کہ آپ ﷺ نزول وحی کی شدت کو برداشت بھی کرتے اور ایسے سخت حالات میں بھی اپنی زبان مبارک کو جلدی سے ہلاتے تھے اور دوسری طرف جبریل علیہ السلام بھی وحی لے کر پوری قوت سے نزول فرماتے، رسول کریم ﷺ ان تمام امور کو اس لیے برداشت کرتے کہ قرآن جلدی سے ان کے سینہ مبارک میں محفوظ ہو جائے، کہیں اس کا کوئی کلمہ یا حرف چھوٹ نہ جائے، آپ ﷺ کی یہی حالت رہی تھی کہ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو اطمینان دلایا اور وعدہ کیا کہ وہ خود قرآن کو آپ ﷺ کے سینہ میں جمع بھی فرمادے گا اور آپ ﷺ کے لیے اس الفاظ کا پڑھنا اور اس کے معانی کا سمجھنا آسان بھی کر دے گا۔ چنانچہ سورۃ القیامت میں فرمایا:

﴿لَا تُحَرِّكْ بِهِ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهِ ۗ إِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهُ وَقُرْآنَهُ ۗ فَإِذَا قَرَأَهُ فَأَنبَحْ تُرْآنَهُ ۗ تَنَّهُ ۗ إِنَّ عَلَيْنَا بَيِّنَاتَهُ ۗ﴾ (القیامت: ۱۶-۱۹)

نیز سورۃ طہ میں آپ ﷺ کو فرمایا:

﴿فَتَقَلَّبْ عَلَىٰ انْتِهَا الْمَلَائِكَةِ الْحَقُّ ۗ وَلَا تَعْجَلْ بِالْقُرْآنِ مِنْ قَبْلِ أَنْ يُقْضَىٰ إِلَيْكَ وَحْيُهُ ۗ وَقُل رَّبِّ زِدْنِي عِلْمًا ۗ﴾ (طہ: ۱۱۳)

”پس اللہ عالی شان والا سچا اور حقیقی بادشاہ ہے۔ تو قرآن پڑھنے میں جلدی نہ کر اس سے پہلے کہ تیری طرف جو وحی کی جاتی ہے وہ پوری کی جائے، ہاں یہ دعا کر کہ پروردگار میرا علم بڑھا۔“

اسی بناء پر آپ ﷺ کو جامع القرآن بھی کہا جاتا ہے کہ حضور ﷺ نے اپنے قلب مبارک میں قرآن کو جمع فرمایا اور اپنے عہد مبارک کے سید الحفاظ بھی کہا جاتا ہے، نیز قرآن کے تمام امور اور علوم احسن کی مسلمانوں کو حاجت ہوتی ہے۔ ان میں آپ ﷺ مرجع المسلمین بھی ہیں۔ آنحضرت ﷺ لوگوں کے سامنے قرآن پاک اپنے مولیٰ حقیقی کے حکم کے مطابق ٹھہر ٹھہر کر تلاوت فرماتے تھے۔ آپ ﷺ اسی قرآن کے ساتھ شب بیداری بھی کرتے، نمازوں کو زینت بخشنے، جبریل علیہ السلام ہر سال اس کا آپ ﷺ کے ساتھ دور بھی کرتے تھے، آخری سال حضور ﷺ نے دو مرتبہ ان کے ساتھ دور فرمایا۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ: ہم نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا کہ:

”جبریل علیہ السلام ہر سال ایک مرتبہ میرے ساتھ قرآن کا دور کرتے تھے، مگر اس سال دو مرتبہ میرے ساتھ دور کیا ہے، میرا



خیال ہے کہ میری اجل آچکی تھی۔<sup>①</sup>

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا بھی یہی حال تھا کہ کتاب اللہ ان کی توجہ کا مرکز تھا، وہ قرآن کو حفظ کرنے میں ایک دوسرے سے سبقت لے جاتے تھے، اس کے پڑھنے اور سمجھنے میں مقابلہ کیا کرتے تھے اور قرآن کی حتمی تعداد انہیں زبانی یاد ہوتی اس پر وہ ایک دوسرے پر فخر کیا کرتے تھے۔ بسا اوقات عورت اپنے نکاح کے مہر میں قرآن کی سورت کو مقرر کرتی کہ اس کا مہر یہ ہوگا کہ اس کا شوہر اسے قرآن کی سورت سکھائے گا۔ لوگ قیام لیل اور سحری کے وقت قرآن کی تلاوت کی لذت کی خاطر اپنی نیند کی لذت اور سونے کی راحت کو قربان کر دیا کرتے تھے۔ اور جب رات کو لوگ سو رہے ہوتے وہ نماز میں قرآن پڑھ رہے ہوتے تھے۔ حتیٰ کہ جو شخص رات کے اندھیرے میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے گھروں کے پاس سے گزرتا تو اسے شہد کی مکھی کی سی بٹھاہٹ سنائی دیتی۔

رسول کریم ﷺ نے اس قرآن سے ان کے جذبے اور لگاؤ کو پیدا کر دیا ہوا تھا کہ جو حصہ بھی قرآن کا رب تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوتا۔ آپ ﷺ ان لوگوں تک خود پہنچاتے اور جن کے گھر دور ہوتے ان کی تعلیم و قراءت کے لیے کوئی معلم بھیج دیا کرتے تھے۔ چنانچہ حضور ﷺ نے ہجرت سے قبل اہل مدینہ کے لیے مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ اور ابن ام کتوم رضی اللہ عنہ کو بھیجا تھا کہ وہ دونوں مدینہ منورہ جا کر وہاں کو قرآن کی تعلیم دیں اور اسلام کی تعلیمات سے روشناس کرائیں۔ اسی طرح معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو ہجرت کے بعد مکہ مکرمہ قرآن کی تعلیم و تحفیظ کے لیے بھیجا۔

عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ: ”جب کوئی شخص ہجرت کرتا تو حضور نبی کریم ﷺ اسے ہم میں سے ایک آدمی دے دیا کرتے جو اس کو قرآن کی تعلیم دیتا، (ایک بارتو) مسجد نبوی ﷺ میں تلاوت قرآن کی وجہ سے شور ہوتے لگا تو آپ ﷺ نے حکم دیا کہ اپنی آوازیں پست رکھیں تاکہ کوئی غلطی میں مبتلا نہ ہو۔“

اس طرح حیات رسول ﷺ میں ہی حفاظ قرآن کی ایک بڑی تعداد تیار ہو گئی جن میں چاروں خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم، حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ، حضرت سعد رضی اللہ عنہ، حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ، حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ، حضرت سالم مولیٰ ابی حذیفہ رضی اللہ عنہ، حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ، حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ، حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ، حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ، ان کے بیٹے حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ، حضرت معاذ رضی اللہ عنہ، حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ، حضرت عبداللہ بن السائب رضی اللہ عنہ، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہ، حضرت حفصہ رضی اللہ عنہ، اور حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہ۔ یہ سب تو وہ ہیں جن کا تعلق مہاجرین صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے ہے۔ انصار صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے ان حضرات نے قرآن پاک حضور ﷺ کی حیات مبارکہ میں حفظ کیا: حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ، حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ، حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ، حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ، حضرت مجب بن حارث رضی اللہ عنہ، حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ، حضرت ابو زید، (جن کے بارے میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے پوچھا گیا تو فرمایا کہ وہ میرے چچائے خاندان میں سے ہیں)

بعض علماء کہتے ہیں کہ مذکورہ حضرات میں بعض ایسے ہیں جنہوں نے وصال نبوی ﷺ کے بعد حفظ قرآن کی تکمیل کی ہے۔ بہر صورت! صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ایک بڑی تعداد قرآن مجید حفظ کر چکی تھی۔ حتیٰ کہ ہیرسونہ اور جنگ یمامہ میں ایک سو چالیس

حفاظ کرام شہید ہوئے تھے۔

امام قرظی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ: ”جنگ یمامہ میں ستر قراء کرام شہید ہوئے اور عہد رسالت میں بیر معونہ کے موقع پر بھی اتنی ہی تعداد میں قرآء شہید ہوئے تھے۔“

محقق ابن الجزری رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ: ”قرآن کریم کے نقل کرنے میں اصل اعتماد حفظ قلوب پر ہے، صحیفوں اور کتابوں میں لکھنے پر نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس امت کے لیے یہ بہت بڑا اعزاز اور خصوصیت ہے، چنانچہ امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے حدیث صحیح روایت کی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میرے رب نے مجھ سے فرمایا:

اٹھیے: اور قریش کو ڈرائیے: میں نے عرض کیا کہ اے میرے رب! تب تو وہ میرا سر کچل دیں گے اور اسے روٹی بنا دیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ:

”میں تمہاری بھی آزمائش کروں گا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ ان کی بھی آزمائش کروں گا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم ایسی کتاب اُتارنے والا ہوں کہ جسے پانی نہ دھو سکے گا جسے تم نیند اور بیداری دونوں حالتوں میں پڑھو گے، سو آپ ایک لشکر بھیجیں میں اس کے دگنا بھیجوں گا اور اپنے فرمانبرداروں کے ساتھ مل کر اپنے نافرمانوں سے لڑیں اور خرچ کریں میں بھی آیت پر خرچ کروں گا۔“ ①

اس حدیث میں اللہ تعالیٰ نے خبر دی کہ قرآن کو اپنی حفاظت کے لیے کسی ایسے کاغذ کی کوئی ضرورت ہی نہیں ہے جسے پانی سے دھویا جاسکتا ہو۔ بلکہ اس کی تلاوت ہر حال میں ہوگی، جیسا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کی صفت و شان میں آیا ہے کہ: ”انا جلیہم صدورہم“ یعنی ان کی کتاب ان کے سینے ہیں۔ جبکہ اہل کتاب کا حال اس کے برخلاف ہے کہ وہ کتابت کی صورت میں ہی اپنی کتاب کو ملحوظ کر سکتے ہیں اور اسے دیکھ کر ہی پڑھتے ہیں، زبانی نہیں پڑھ سکتے۔“

اس موقع پر صحیح بخاری کی اس روایت سے اشکال نہیں ہونا چاہیے جسے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ نقل کرتے ہیں کہ: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے وقت صرف چار آدمیوں نے قرآن جمع کیا تھا، ابوالدرداء رضی اللہ عنہ، معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ، زید بن ثابت رضی اللہ عنہ اور ابو زید رضی اللہ عنہ نیز فرمایا کہ ”و نحن و رثناہ“ کہ ہم ہی اس کے وارث ہوئے ہیں۔ ابو زید کا نام قیس بن اسکن تھا جیسا کہ ابوداد نے علی شرط اشعینی کی اسناد کے ساتھ اس کو نقل کیا ہے۔ یہ اشکال اس لیے نہیں ہونا چاہیے کہ یہاں پر حصر نسبی (اضافی) ہے، حصر حقیقی نہیں ہے کہ ان چار کے علاوہ کی نفی ہو جائے کہ عہد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں صرف ان ہی چار افراد نے قرآن جمع کیا تھا۔ اس امر کی دلیل کہ یہاں پر حصر حقیقی نہیں بلکہ اضافی ہے۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی روایت ہے جسے حضرت انس رضی اللہ عنہ ہی نقل کرتے ہیں کہ حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے سوال کیا کہ عہد رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم میں کتنے لوگوں نے قرآن کو جمع کیا تھا؟ اس پر حضرت انس رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ”چار لوگوں نے اور ان سب کا تعلق انصار سے تھا ابی بن کعب رضی اللہ عنہ، معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ، زید بن ثابت رضی اللہ عنہ اور ابو زید رضی اللہ عنہ۔“

آپ نے غور کیا کہ اس روایت میں حضرت انس رضی اللہ عنہ نے ابوالدرداء رضی اللہ عنہ کی بجائے ان چار افراد میں حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کا ذکر کیا ہے۔ دونوں روایتوں میں وہ سچے ہیں، کیونکہ یہ بات غیر معتول ہے کہ وہ اپنے آپ کو جھوٹا بنائیں، اس سے

ثابت ہوا کہ ان کا مقصد حصر سے حصر اضافی ہی ہے، چنانچہ کہا جائے گا کہ ان کا مقصد تین افراد ذکر کرنے میں ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کو شامل کرنے کا تھا اور کبھی تو ان افراد میں ابوالدرداء رضی اللہ عنہ کو شامل کرنا تھا، ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کو شامل کرنا نہیں تھا۔ یہ تو جیہ اگرچہ بعید از عقل لگتی ہے لیکن دونوں روایتوں میں تطبیق پیدا کرنے کے لیے اسی کو اختیار کرنا ہوگا۔ جبکہ ان مذکورہ دو روایات کے علاوہ دیگر روایات میں چار افراد کچھ اور ذکر کیے گئے ہیں۔

اسی لیے امام ماوردی رضی اللہ عنہ لکھتے ہیں کہ: "حضرت انس رضی اللہ عنہ کے قول کہ "ان کے علاوہ کسی نے قرآن کو جمع نہیں کیا" سے یہ لازم نہیں آتا کہ حقیقت میں ایسا ہی ہو، کیونکہ اس کا تو احاطہ کرنا ممکن نہیں ہے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم کی تعداد بھی زیادہ تھی، پھر وہ مختلف علاقوں میں متفرق طور پر موجود تھے یہ دعویٰ تو تب نام ہو سکتا ہے جب ہر صحابی رضی اللہ عنہ سے وہ ملاقات کرتے اور وہ ان کو اپنے بارے میں بتاتے کے عہد نبوی ﷺ میں انہوں نے جمع قرآن کو مکمل نہیں کیا تھا، ایسا ہونا بہت دشوار ہے تو پھر حضرت انس رضی اللہ عنہ کی بات واقع کے مطابق کیسے ہو سکتی ہے؟ حالانکہ صحیح بخاری میں حفص بن عمر کے واسطے سے یہ روایت آتی ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: "قرآن چار لوگوں سے حاصل کرو۔ عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ، سالم رضی اللہ عنہ، معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ، اور ابی بن کعب رضی اللہ عنہ۔"

آنحضور ﷺ نے جن چار افراد کا ذکر کیا ان میں پہلے دو تو مہاجرین میں سے ہیں اور آخری دو کا تعلق انصار سے ہے۔<sup>①</sup> امام ماوردی رضی اللہ عنہ کا اس سے مقصد شاید حصر حقیقی کی نفی کرنا اور حصر اضافی کی اسی طرح سے توجیہ پیش کرنا ہے جس طرح سے ہم نے پیش کی ہے اور استدلال میں حدیث انس رضی اللہ عنہ ہی کو ذکر کیا ہے۔ دیگر روایات جن کے بارے میں بعض حضرات نے تو اترا تا قول کیا ہے ان میں تصریح کچھ اور ناموں کی ہے جو روایت انس میں مذکور چار افراد کے علاوہ ہیں۔ مثلاً:

① امام نسائی نے سند صحیح کے ساتھ حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ انہوں نے فرمایا:

"میں نے قرآن جمع کیا پس میں ہرات اسے پڑھتا، حضور ﷺ کو یہ بات پہنچی تو ان سے فرمایا کہ:

"اس قرآن کو ایک مہینے میں پڑھا کرو.... آخر حدیث تک۔"<sup>②</sup>

② ابن ابی داؤد رضی اللہ عنہ نے سند حسن کے ساتھ محمد بن کعب القرظی رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: "عہد رسالت ﷺ میں پانچ انصار صحابہ رضی اللہ عنہم نے قرآن کو جمع کیا، معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ، عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ، ابی بن کعب رضی اللہ عنہ، ابوالدرداء رضی اللہ عنہ، اور ابویوب انصاری رضی اللہ عنہ۔"

بعض علماء نے مذکورہ حدیث انس میں یوں تطبیق دی ہے کہ "اس جمع سے" مراد کتابت قرآن ہے نہ کہ حفظ قرآن۔ اور بعض حضرات کی رائے یہ ہے کہ جمع قرآن سے مراد تمام وجوہ قراءت کو جمع کرنا ہے یا اس سے مراد قرآن کو رسول کریم ﷺ سے بالمشافہ حاصل کرنا ہے یا اس سے مراد قرآن کو تھوڑا تھوڑا کر کے جمع کرنا ہے یہاں تک کہ اس کا نزول مکمل ہوا۔

امام ابوبکر باقلائی رضی اللہ عنہ نے اس کے آٹھ جوابات دیے ہیں اور اس کے ذریعہ انہوں نے حدیث انس پر ہونے والے اشکال کو دور کرنے کی کوشش کی ہے، لیکن ابن جریر عسقلانی رضی اللہ عنہ نے ان جوابات کی تضعیف کی ہے اور دیگر اہل علم بھی ان کی تقلید کرتے ہیں۔

① اخراج بخاری، کتاب فضائل القرآن، باب ۸

② سنن النسائی کے کتاب الصیام: ۶۰

بہر کیف! بات کرنا بہت آسان ہے ہم نے اس اشکال سے بچنے کے لیے جو جواب دیا ہے وہ کافی ہے۔

البتہ اس اشکال کا جواب جو امام مازری رحمۃ اللہ علیہ نے دیا ہے وہ مجھے بہت بھایا ہے، اسے ذکر کیے دیتا ہوں کہیں وہ نہ جائے، چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ کے اس قول سے ملاحدین کی ایک جماعت نے اپنے دعویٰ پر استدلال کیا ہے۔ حالانکہ اس حدیث میں ان کے لیے کوئی مستدل نہیں ہے، کیونکہ ہمیں یہ بات تسلیم نہیں کہ یہ حدیث اپنے ظاہر پر محمول ہے، کیونکہ اگر یہ حدیث ہم اپنے ظاہر پر تسلیم کر لیں تو ان ملاحدین کے پاس اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ فی الواقع بھی معاملہ ایسا ہی تھا؟ اگر ہم ان کی بات مان بھی لیں تو صحابہ رضی اللہ عنہم کے ایک جم غفیر میں سے ہر فرد کے سارے قرآن کو حفظ نہ کرنے سے یہ لازم نہیں آتا کہ اتنے جم غفیر نے اس مجموعہ کو حفظ نہ کیا ہو! تو اتر کی شرط میں یہ بات نہیں ہے کہ ہر فرد نے سارا قرآن حفظ کیا ہو، بلکہ تمام افراد بھی اگر علی التعمیم سارا قرآن حفظ کر لیں تو اس کے لیے کافی ہے، جبکہ امام قرطبی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ: ”جنگ یمامہ میں ستر قراء شہید ہوئے اور عبد بن مسعود رضی اللہ عنہ میں بیرونہ کے موقع پر بھی اتنی ہی تعداد شہید ہوئی۔“ نیز وہ کہتے ہیں کہ: ”حضرت انس رضی اللہ عنہ نے صرف چار افراد کا ذکر اس لیے کیا ہے کہ ان چار افراد سے ان کا زیادہ تعلق تھا دوسروں سے اس قدر نہ تھا یا اس وجہ سے کہ یہ چار ہی ان کے ذہن میں تھے دوسرے نہیں تھے۔“

اس موقع پر ہم نے جو بات ذکر کی ہے وہ صرف صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی حد تک نہیں ہے کہ جن کے سینوں نے حیات رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں کتاب اللہ کو جمع اور محفوظ کیا، بلکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد بھی ہزاروں صحابہ رضی اللہ عنہم نے قرآن کے حفظ کی تکمیل کی ہے، ان میں سات صحابہ رضی اللہ عنہم قراءت قرآن میں مشہور ہوئے جن کے نام یہ ہیں: حضرت عثمان، حضرت علی، حضرت ابی بن کعب، حضرت ابوالدرداء، حضرت زید بن ثابت، حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ۔ ان سب نے اپنے سینوں میں قرآن کو جمع بھی کیا اور دیگر بہت سے لوگوں کو پڑھایا بھی۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو بہترین جزا عطا فرمائے۔ (آمین)

قارئین کرام! حضرت انس رضی اللہ عنہ کی مذکورہ حدیث کے بارے میں ہم سے اس سے زیادہ کی خواہش نہ کیجئے۔

کیونکہ بعض ملاحدین نے تو اتر قرآن پر الزام لگانے میں اسی حدیث کو اپنا مورد بنایا ہے اور ہمارا بھی کام ہے کہ ہم ایسے الزامات کا جواب دیں اور الزام لگانے والے کو لاجواب کریں، اسی لیے ہم نے چاہا کہ اس مناسبت سے اس موضوع پر کلام طویل کیا جائے تاکہ ایک جانب تو ذمہ داری ادا ہو اور دوسری جانب وارد شدہ شبہات کا جواب بھی ہو جائے۔“

﴿وَكَيْفَ يُصْرَنَ اللَّهُ مَن يَنْصُرُهُ ۖ إِنَّ اللَّهَ لَقَوِيٌّ عَزِيزٌ﴾ (ج: ۳۰)

**جمع قرآن بمعنی کتابت و رعہد رسالت صلی اللہ علیہ وسلم** اس سے پہلے ہم بتا چکے ہیں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم رہتی تھی کہ قرآن کو زبانی یاد کر کے دلوں میں محفوظ کر لیا جائے، کیونکہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم ہی امی تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت بھی امیوں (ان پڑھوں) میں ہوئی تھی، علاوہ ازیں اس دور میں آلات کتابت بھی میسر نہیں تھے۔ اس وجہ سے حفظ فی الصدور پر اعتماد کیا جاتا تھا جو حفظ فی السطور کے مقابلہ میں زیادہ بہتر طریقہ تھا۔ پھر اس دور میں اہل عرب کی عادت بھی تھی کہ وہ اپنے صدور اور قلوب کے صفحات پر عرب کے اشعار، انساب اور مفاخر و ایام کو ثبت و نقش کیا کرتے تھے۔

لیکن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب رضی اللہ عنہم نے قرآن کی طرف زیادہ توجہ کی، اسی لیے قرآن کو لکھنے کی طرف اس

قدر توجہ اور اہتمام نہ تھا جس قدر اس کے حفظ اور زبانی یاد کرنے پر توجہ تھی، البتہ اپنے دور میں جس قدر وسائل کتابت دستیاب تھے اس کے مطابق لکھنے کا بھی اہتمام کیا گیا۔

چنانچہ رسول کریم ﷺ نے کتابت وحی کے لیے کچھ لوگ مقرر فرمائے۔ جب بھی قرآن کا کوئی حصہ نازل ہوتا آپ ﷺ اس کے لکھنے کا حکم دیتے، تاکہ اس کو محفوظ بھی کیا جاسکے، اور کتاب اللہ کے بارے میں زیادہ سے زیادہ احتیاط اور ضبط و اعتماد کو قائم بھی رکھا جاسکے کہ قرآن کا حفظ اور اس کی کتابت ایک دوسرے کے لیے معاون ہو جائے۔ ان کا تان وحی میں بلند درجے کے صحابہ نبی ﷺ بھی شامل تھے، جن کے نام یہ ہیں: ابوبکر صدیق نبی، عمر فاروق نبی، عثمان غنی نبی، علی مرتضیٰ نبی، معاویہ نبی، ابان بن سعید نبی، خالد بن الولید نبی، ابی بن کعب نبی، زید بن ثابت نبی اور ثابت بن قیس نبی وغیرہ۔

آنحضرت ﷺ ان کی راہ نمائی بھی فرماتے کہ اس حصہ قرآن کو سورت کی کس جگہ لکھنا ہے، چنانچہ یہ حضرات اسے لکھتے جو ان کو میسر آتا جیسے کھجور کی شاخ، باریک قسم کا سفید پتھر، پارچے، کھال کا ٹکڑا، شانوں اور پسلیوں کی ہڈیاں وغیرہ۔ اس کے بعد لکھی ہوئی آیات وغیرہ کو بیت نبوی ﷺ میں رکھ دیا جاتا تھا، تو قرآن اپنی مجموعی شکل میں آپ ﷺ کے عہد مبارک میں اس طرح سے موجود تھا، البتہ کسی صحیفہ یا مصحف میں لکھا ہوا نہیں تھا بلکہ جس طرح ہم نے ذکر کیا کہ مختلف ہڈیوں اور پارچوں وغیرہ کی شکل میں متفرق انداز میں مکتوب تھا۔

حضرت ابن عباس نبی سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ پر جب کوئی سورت نازل ہوتی تو آپ ﷺ کسی کتابت وحی کو بلاتے اور اس سے فرماتے: اس سورت کو اس مقام پر رکھ دو (لکھ لو) جہاں فلاں فلاں بات مذکور ہے<sup>①</sup> زید بن ثابت نبی سے روایت ہے کہ وہ فرماتے ہیں کہ: ”ہم لوگ رسول اللہ ﷺ کے پاس قرآن کو مختلف ٹکڑوں میں جمع کرتے تھے۔“<sup>②</sup>

اس کا مطلب یہ ہے کہ قرآنی آیات کو نبی کریم ﷺ کی ہدایت کے مطابق مرتب کیا جاتا تھا، اور یہ ترتیب بھی جبریل علیہ السلام کے بتانے پر ہوا کرتی تھی، یعنی ترتیب توقیفی تھی، کیونکہ یہ بات ثابت ہے کہ جبریل علیہ السلام فرمایا کرتے تھے کہ: ”اس (آیت) کو فلاں جگہ پر رکھ دو۔“ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ جبریل علیہ السلام اللہ کے حکم سے ایسا کہتے ہوں گے۔

بعض صحابہ کرام نبی ﷺ قرآن پاک کو لکھا کرتے تھے اور وہ رسول اللہ ﷺ سے جتنی تعداد میں قرآن کا حصہ پاتے اسے کاغذ یا ہڈی یا شانے کی ہڈی وغیرہ پر لکھ لیتے تھے مگر سورتوں کی ترتیب اور تسلسل کا التزام نہ کرتے تھے، جس کی وجہ یہ ہے کہ جب وہ رسول اللہ ﷺ پر نازل شدہ کوئی سورت حفظ کر لیتے یا اسے لکھ لیتے، پھر مثلاً اگر وہ کسی سریرہ میں چلے جاتے اور ان کی عدم موجودگی میں کوئی سورت نازل ہو جاتی تو واپسی پر اس کے لکھنے کے بعد اسے حفظ بھی کر لیتے، اس طرح وہ عدم موجودگی میں جو حصہ چھوٹ جاتا تھا اس کی تلافی کر لیتے تھے، اور حسب سہولت اسے بھی جمع کرتے، جس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ ان کے لکھے ہوئے حصے میں تقدیم و تاخیر ہو جاتی۔

جبکہ بعض صحابہ کرام نبی ﷺ اپنے حافظے پر اعتماد کرتے تھے اور عرب کی اس عادت کے مطابق لکھا نہیں کرتے تھے کہ وہ عرب کے انساب و اشعار اور ان کے مفاز کو لکھے بغیر زبانی یاد کیا کرتے تھے۔

① سنن ابی داؤد، کتاب الصلوٰۃ باب ۱۲۲

② سنن الترمذی، النساہ، ۷۳، دروہ احمد فی المسند ۱۸۵/۵

حاصل کلام یہ کہ عہد رسالت ﷺ میں سارا قرآن لکھا ہوا موجود تھا، نیز اس میں ان حروف سبجہ کی بھی رعایت رکھی گئی تھی جس پر قرآن کا نزول ہوا، البتہ بعض صحابہ رضی اللہ عنہم چند منسوخ آیات اور بعض ایسی آیات جو خبر واحد سے ثابت تھیں انہیں لکھ چکے تھے۔ اور بعض غیر مرتب انداز میں لکھا تھا۔ اسی طرح قرآن اس مبارک زمانہ میں صحیفوں اور عام مصاحف میں جمع شدہ شکل میں نہیں تھا۔

عہد نبوی ﷺ میں قرآن یا مصاحف میں جمع کیوں نہ کیا گیا؟ ﴿قرآن مجید صحف یا مصاحف کی میں مندرجہ ذیل وجوہات کی

بناء پر جمع نہیں کیا گیا:

① ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں صحف یا مصاحف میں جمع قرآن کے جو دوای اور اسباب پیش ہوئے وہ اس سے پہلے پیدا نہیں ہوئے تھے اس لیے ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اسے صحیفوں میں لکھوایا، اسی طرح حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دور میں جو دوای اور اسباب مصاحف میں لکھوانے کے وجود میں آئے وہ اس سے پہلے نہیں آئے تھے اس لیے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے مختلف مصاحف میں قرآن کو لکھوایا۔

آنحضور ﷺ کے مبارک دور میں مسلمان خیر و بھلائی کے ساتھ تھے، قراء کی تعداد بھی زیادہ تھی اور اسلام بھی ابھی زیادہ نہیں پھیلا تھا، فتوے سے بھی امن تھا، کتابت کی بجائے زیادہ تر اعتماد حفظ پر رہا، آیات کتابت بھی میسر نہ تھے اور حضور ﷺ کی توجہ اور اہتمام بھی قرآن کو زبانی یاد کرنے پر زیادہ تھی، یہاں تک کہ قرآن کی ان حروف سبجہ کے مطابق ادائیگی پر اہتمام تھا جس کے مطابق قرآن کا نزول ہوا۔

② ابھی حضور ﷺ پر وحی کا سلسلہ جاری تھا، قرآن کی کوئی آیت یا آیات کے منسوخ ہونے کا احتمال بھی موجود تھا۔

③ قرآن کا نزول یکبارگی نہیں ہوا تھا بلکہ بیس برس سے زیادہ تھوڑا تھوڑا کر کے نازل ہوا۔

④ قرآن کی آیات اور اس کی سورتوں کی ترتیب بھی نزول کے مطابق نہ تھی، آپ جانتے ہیں کہ قرآن کا نزول اسباب و ضروریات کے مطابق ہوا ہے، لیکن اس کی ترتیب بھی دیگر وجوہات پیش نظر تھیں۔

آپ کے علم میں یہ بات ہے کہ اگر قرآن کو (عہد رسالت ﷺ میں) صحف یا مصاحف میں جمع کر دیا جاتا اور جبکہ حال وہ تھا جس کی ہم نے ابھی وضاحت کی ہے تو اس میں بس تغیر و تبدل کا احتمال تھا کہ قرآن کا کوئی حصہ منسوخ ہوتا یا کوئی اور سبب پیش آتا تو اس میں تبدیلی کرنا پڑتی۔ جبکہ حالات بھی ناساعد تھے اور آیات کتابت بھی ناپید تھے۔ اور اس دور میں زیادہ تر حفظ قرآن پر اعتماد کیا جاتا تھا۔

لیکن جب نزول قرآن کا اختتام اور آنحضور ﷺ کا وصال ہو گیا اور نسخ کا احتمال بھی نہ رہا اور ترتیب بھی درست ہو گئی اور پھر قرآن کو صحف یا مصاحف میں نقل کرنے کے اسباب بھی وجود میں آئے تو اللہ تعالیٰ نے خلفائے راشدین کو اس کی توفیق بخشی، چنانچہ انہوں نے حفاظت قرآن اور شریعت کے قانون اول کی محافظت کی خاطر اس ذمہ داری کو پورا کیا، جس کی تصدیق اللہ تعالیٰ کے اس فرمان سے ہوئی ہے۔“



﴿إِنَّا نَحْنُ نُزَلِّلُ اللَّيْلَ كَدًّا وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ﴾ (الجم: ۹)

”ہم نے قرآن کو نازل کیا ہے اور ہم میں اس کی ضرور حفاظت بھی کریں گے۔“

**جمع قرآن، عہد صدیقی میں** صدیق نبینو پر آئی تو حضرت ابو بکر صدیق نبینو کو چند بڑی سخت قسم کی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا، جن میں ایک جنگ یمامہ بھی ہے جو ۱۲ھ کو پیش آئی۔

اس جنگ میں مسلمانوں اور میلہ کذاب کے شیعین کے درمیان گھسان کی لڑائی ہوئی، یہ معرکہ بڑا خون ریز قسم کا تھا، اس میں بہت سے قراء صحابہ اور حفاظ قرآن شہید ہو گئے جن کی تعداد ستر تک بتائی جاتی ہے، بعضوں نے تو پانچ سو تک بتائی ہے۔ جن میں سالم مولیٰ ابی حذیفہ نبینو بھی شامل تھے۔ مسلمانوں پر اس کا بہت اثر ہوا حضرت عمر فاروق نبینو نے اس معاملہ کو بڑا سنگین خیال کیا اور ابو بکر صدیق نبینو کے پاس گئے اور انہیں سارا واقعہ بھی سنایا اور جمع قرآن کی تجویز بھی پیش کی۔

اس خدشہ کے پیش نظر کہ کہیں حفاظ قرآن کی وفات اور قراء صحابہ نبینو کی شہادت سے قرآن کا ضیاع نہ ہو جائے! ابو بکر صدیق نبینو کو شروع میں تو اس بارے تردید ہوا، کیونکہ وہ رسول اکرم ﷺ کی مقرر کردہ حدود کے آگے بہت زیادہ توقف اختیار کرنے والے تھے۔ نیز انہیں یہ اندیشہ بھی ہوا کہ کہیں اس تجدیدی کاروائی سے کوئی تبدیلی واقع نہ ہو جائے یا اس نئے امر سے کسی بدعت کا ارتکاب نہ ہو جائے۔ لیکن دونوں کے درمیان تھوڑی دیر مذاکرات ہوئے پھر ان پر مصلحت کی صورت واضح ہو گئی اور انہوں نے اس درست فکر اور رائے کو تسلیم کر لیا اور اللہ نے ان کے سینہ کو کھول دیا اور انہیں اس بات کا یقین ہو گیا کہ جس کام کا حضرت عمر نبینو مشورہ دے رہے ہیں وہ دراصل کتاب اللہ کی حفاظت ہی کا ایک مفید ذریعہ ہے اور اس طرح اللہ کی کتاب ہر طرح کی تحریف اور ضیاع سے محفوظ بھی رہے گی، اور یہ امر نہ تو دین میں نو پیدا امور میں سے ہے اور نہ ہی دین میں بے جا اضافے اور بدعات سے ہے۔ بلکہ یہ تو ان قواعد سے مستفاد اور ماخوذ ہے جن کو خود رسول اللہ ﷺ نے کتابت قرآن کی مشروعیت اور کتابان وحی کے لیے وضع فرمایا تھا، اور پھر ان کے لکھے ہوئے قرآن کو اپنے پاس محفوظ کر لیا تھا، حتیٰ کہ پھر آپ ﷺ کی وفات ہو گئی۔

امام ابو عبد اللہ الحما سی رضی اللہ عنہما اپنی کتاب ”فہم السنن“ میں رقمطراز ہیں کہ: ”قرآن حکیم کی کتابت کوئی بدعتی امر نہیں ہے، کیونکہ آنحضرت ﷺ فوراً اس کی کتابت کا حکم دیا کرتے تھے، ہاں البتہ اس وقت قرآن مختلف پارچوں، شانے کی ہڈیوں اور کھجور کی شاخوں پر متفرق صورت میں موجود تھا، اس کے بعد صدیق اکبر نبینو نے ان اشیاء کو ایک جگہ سے دوسری جگہ اجتماعی صورت میں نقل کرنے کا حکم دیا، یہ ایسا ہی تھا جیسے مختلف اوراق ہوں جو رسول اللہ ﷺ کے گھر میں موجود تھے جن پر قرآن متفرق صورت میں موجود تھا، پھر ان متفرق چیزوں کو ایک شخص نے جمع کر دیا اور ایک دھاگے سے باندھ دیا تاکہ کوئی حصہ اس کا ضائع نہ ہو جائے۔“

**صدیق اکبر نبینو کے حکم کا عملی اجراء** ابو بکر صدیق نبینو نے اس خواہش کی تکمیل کا ارادہ کر لیا اور انہوں نے اللہ کے عطا کردہ نور سے یہ سمجھا کہ اس امر کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لیے ایک ایسے آدمی کا انتخاب کیا جائے جو بلند مرتبہ صحابہ نبینو میں سے ہو، یعنی زید بن ثابت نبینو کا، اس لیے کہ حضرت زید بن ثابت نبینو کی ذات میں جمع قرآن کے لیے جو متاثر کن صلاحیتیں موجود تھیں وہ اور کسی شخص میں موجود نہ تھیں، کیونکہ وہ حافظ قرآن بھی تھے، کتابان وحی میں

## منامیل العسرفان فی علوم القرآن: جلد ①

سے بھی تھے، حضور ﷺ کی آخری زندگی میں قرآن کے آخری دور میں بھی موجود تھے۔ اس سے بڑھ کر وہ بڑے دانش مند، متقی پرہیزگار، امانت دار، اعلیٰ اخلاق کے مالک اور دینی استقامت رکھنے والے انسان تھے، چنانچہ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اس بارے میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مشورہ کیا، انہوں نے اس پر اتفاق کیا، حضرت زید آئے تو ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ان کے سامنے اپنی لکڑی پیش کی اور اس امر کی خواہش ظاہر کی کہ وہ اس کو اعلیٰ جامہ پہنائیں۔

حضرت زید رضی اللہ عنہ کو پہلے تو کچھ تردد ہوا، لیکن ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ان کے مشکوک شبہات کو دور کرتے رہے اور اس کی مصلحت بھی واضح کرتے رہے، یہاں تک انہیں تسلی ہو گئی اور وہ اس کام کے لیے تیار ہو گئے جس کے لیے انہیں بلایا گیا تھا، چنانچہ انہوں نے قرآن جمع کرنا شروع کر دیا، ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور عمر فاروق رضی اللہ عنہ اور دیگر کبار صحابہ رضی اللہ عنہم ان کی نگرانی کرنے لگے، اور اس عظیم منصوبہ میں ان کی مدد کرتے رہے، یہاں تک کہ ان کا مقصد پایہ تکمیل کو پہنچا۔

﴿وَبَيَّنَّا اللَّهُ لَكُمْ لَآ أَنْ يَتَّخِذَ نُورًا وَّلَوْ كَوَّاهَا الْكَافِرُونَ﴾ (التوبة: ۳۲)

”اور خدا اپنے نور کو پورا کئے بغیر رہنے کا نہیں اگرچہ کافروں کو برا ہی لگے۔“

اسی کے بارے میں امام بخاری رضی اللہ عنہ اپنی صحیح میں نقل کرتے ہیں کہ زید بن ثابت رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ: ”اہل یمامہ کی شہادت (یعنی جنگ یمامہ میں ستر قراء کی شہادت) کے بعد ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے مجھے بلا بھیجا تو میں حاضر ہوا تو دیکھا کہ ان کے پاس حضرت عمر رضی اللہ عنہ بھی موجود ہیں، ابوبکر رضی اللہ عنہ فرماتے لگے: ”حضرت عمر رضی اللہ عنہ میرے پاس آئے اور کہنے لگے کہ جنگ یمامہ میں قرآن کے قراء کی شہادتیں بہت ہو گئی ہیں، اور مجھے اس بات کا خدشہ ہے کہ کہیں دوسری جگہوں پر بھی قراء کی شہادت سے قرآن کا اکثر حصہ ضائع نہ ہو جائے اور میرا خیال ہے کہ آپ قرآن کو جمع کرنے کا حکم دیں، میں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے کہا کہ بھلا میں ایسا کام کیسے کر سکتا ہوں جسے حضور ﷺ نے نہیں کیا؟ عمر رضی اللہ عنہ کہنے لگے کہ خدا کی قسم! یہ کام خیر والا ہے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ مجھ سے بار بار بات کرتے رہے یہاں تک کہ اللہ نے اس کام کے لیے میرا سینہ کھول دیا، اور اب میری رائے بھی وہی ہے جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی ہے۔ زید رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ پھر ابوبکر صدیق فرماتے لگے کہ:

”تم جو ان اور عقیلہ آدمی ہو، ہم تجھے الزام بھی نہیں دیتے، اور تم رسول اللہ ﷺ کے لیے وحی بھی لکھا کرتے تھے، لہذا قرآن کو تلاش کر کے اسے جمع کرو۔“

(زید رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ) اللہ کی قسم! اگر یہ حضرات مجھے کسی پہاڑ کے منتقل کرنے کی ذمہ داری دیتے تو میں یہ کام کر لیتا، اور میرے لیے یہ زیادہ دشوار نہ ہوتا یہ نسبت اس کام کے کہ جس کا مجھے جامع قرآن نے حکم دیا ہے! میں نے عرض کیا کہ: آپ لوگ ایسا کام بھلا کیسے کر سکتے ہو جو خود حضور ﷺ نے نہیں کیا! صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: واللہ! اس میں خیر ہے، ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ برابر مجھ سے بات چیت کرتے رہے، یہاں تک کہ اللہ نے میرے لیے بھی اس کام کے لیے سینہ کھول دیا جس کے لیے اللہ نے ابوبکر رضی اللہ عنہ اور عمر رضی اللہ عنہ کا سینہ کھولا!

چنانچہ میں نے قرآن کی تلاش شروع کر دی اور میں قرآن کو کھجور کی شاخوں، سفید پتھروں اور لوگوں کے سینوں سے جمع کرتا رہا، یہاں تک کہ میں نے سورۃ التوبہ کا آخری حصہ ابوخریمہ انصاری رضی اللہ عنہ کے پاس پایا۔ ان کے علاوہ کسی اور کے پاس نہیں ملا، یعنی

﴿لَقَدْ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مِّنْ أَنفُسِكُمْ عَزِيزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ﴾ (التوبہ: ۱۲۸)

”(لوگو) تمہارے پاس تم ہی میں سے ایک پیغمبر آئے ہیں۔ تمہاری تکلیف ان کو گراں معلوم ہوتی ہے۔“

تآ آ خر سورۃ براءت۔ پھر یہ صحف ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پاس رہے یہاں تک کہ ان کی وفات ہوئی، اس کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس ان کی حیات تک رہے، پھر حضرت حفصہ بنت عمر رضی اللہ عنہا کے پاس وہ صحف موجود ہے۔

آپ نے ملاحظہ کیا کہ اس حدیث سے پتہ چل رہا ہے کہ کبار صحابہ رضی اللہ عنہم بھی قرآن کی حفاظت کا کس قدر اہتمام فرماتے تھے: ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ اور عمر فاروق کو زید بن ثابت رضی اللہ عنہ پر کتنا اعتماد تھا! نیز اس سے معلوم ہوا کہ حضرت زید رضی اللہ عنہ میں اس کام کی اہلیت اور صلاحیت موجود تھی، جیسا کہ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے خود ان کے مذکورہ فضائل ذکر فرمائے، نیز حضرت زید رضی اللہ عنہ کے تقویٰ، پرہیزگاری اور امانت و دیانت پر ان کے اس قول سے تائید ہوتی ہے کہ ”اگر یہ حضرات مجھے کوئی پہاڑ اپنی جگہ سے منتقل کرنے کا کہتے تو وہ میرے لیے اس کام سے زیادہ دشوار گزار نہ ہوتا جس کا مجھے جامع قرآن نے حکم دیا۔“

اور ان کی دانش مندی کی شہادت ان کا ازل الامر تردد ہونا اور توقف اختیار کرنا اور پھر ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ سے بات چیت کرنے کے بعد مطمئن ہونا ہے، اور ان کی تجربہ کاری کا پتہ ان کے اس قول سے لگتا ہے کہ: ”پھر میں نے قرآن کو تلاش کرنا شروع کر دیا اور میں اسے کھجور کی شاخوں، سفید باریک چوڑے پتھروں اور لوگوں کے سینوں سے جمع کرنے لگا۔“

زید بن ثابت رضی اللہ عنہ نے جمع قرآن میں وہ دقیق کتابت صحف میں صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا طریق کار لیا اور محکم طریقہ اختیار کیا جو ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ اور

عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے وضع کیا تھا، اس طریقہ میں اس بات کی ضمانت موجود تھی کہ کتاب اللہ اپنی شان کے مطابق پوری پوری احتیاط بہتری اور تحقیق و تدقیق پر مبنی تھی، چنانچہ انہوں نے صرف زبانی یاد ہونے پر اکتفاء نہیں کیا، نہ صرف ہاتھ سے لکھے ہونے پر ادر نہ صرف کان سے سنے ہونے پر اکتفاء کیا۔ بلکہ حضرت زید رضی اللہ عنہ نے جمع قرآن میں دو اہم مصادر پر اعتماد کرتے ہوئے مختلف حصوں کو جمع و اخذ کرنا شروع کیا۔

① وہ حصہ جو رسول اللہ ﷺ کے سامنے لکھا گیا ہو۔

② وہ حصہ جو لوگوں کے سینوں میں محفوظ ہو۔

انہوں نے اس سلسلہ میں اس قدر حزم و احتیاط کو اختیار کیا کہ لکھے ہوئے حصے کو اس وقت تک قبول نہیں کرتے تھے جب تک کہ اس بات پر دو عادل گواہ گواہی نہ دے دیتے کہ یہ حصہ رسول اللہ ﷺ کے سامنے لکھا گیا تھا۔

اس کی دلیل وہ روایت ہے جو ابن ابی داؤد رضی اللہ عنہ نے یحییٰ بن عبد الرحمن بن حاطب کے طریق سے نقل کی ہے کہ انہوں نے کہا: ”حضرت عمر رضی اللہ عنہ آئے اور انہوں نے فرمایا کہ جس نے آنحضرت ﷺ سے قرآن کا کوئی حصہ بھی حاصل کیا ہو وہ اسے لیے آئے، لوگ قرآن کو کاغذوں، تختیوں اور کھجور کی شاخوں پر لکھتے تھے، اور آپ رضی اللہ عنہ کسی کا کوئی حصہ اس وقت تک قبول نہ کرتے جب تک کہ دو گواہ اس پر گواہی دے دیتے۔“

نیز اس کی دلیل وہ روایت بھی ہے جو ابو داؤد رضی اللہ عنہ نے ہی نقل کی ہے لیکن ہشام بن عروہ عن ابیہ کی سند سے نقل کیا ہے کہ:

”محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ“

ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت زید رضی اللہ عنہ سے فرمایا:

”تم دونوں مسجد کے دروازے پر بیٹھ جاؤ! جو شخص تمہارے پاس اس پر دو گواہ لائے کہ یہ کتاب اللہ کا حصہ ہے، اسے تم لکھ لو۔“  
(وہو حدیث رجالہ ثقات وان کان منقطعاً، قال ابن حجر: المراد بالشاہدین: الحفظ والکتابۃ))

علامہ سخاوی رضی اللہ عنہ کی جمال القراء سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ: شاہدین سے دو عادل مرد مراد ہیں، ان کی عبارت یہ ہے: ”اس سے مراد یہ ہے کہ دو شخص اس بات پر گواہی دیں کہ یہ حصہ، رسول اللہ ﷺ کے سامنے لکھا گیا تھا۔“

حضرت زید رضی اللہ عنہ نے صرف حفظ پر اکتفا نہیں کیا، اسی لیے امام بخاری رضی اللہ عنہ کی سابقہ روایت میں ہے کہ: انہوں نے سورۃ براءت کا آخری حصہ صرف حضرت ابو خذیمہ رضی اللہ عنہ کے پاس پایا تھا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ حصہ تحریری شکل میں صرف ابو خذیمہ انصاری رضی اللہ عنہ کے پاس پایا تھا۔ ورنہ خود حضرت زید رضی اللہ عنہ کو اور دیگر بہت سے صحابہ رضی اللہ عنہم کو وہ حصہ زبانی یاد تھا۔ مگر ان کا ارادہ یہ تھا کہ حفظ اور کتابت دونوں صورتوں میں جمع قرآن کا کام کریں، تاکہ خوب احتیاط اور اکتفا ہو سکے۔

اس اعلیٰ درجے کے طریق کار کے مطابق قرآن پاک ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ، عمر فاروق رضی اللہ عنہ اور دیگر اکابر صحابہ رضی اللہ عنہم کی زیر نگرانی جمع ہوا اور ساری امت کا بغیر تکریم کے اس پر اجماع منعقد ہوا۔ یہ ایک لازوال تاریخی منقبت و فضیلت ہے جس کا ذکر خیر ہوتا رہے گا کہ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی نگرانی میں، عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی تجویز پر اور زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کی تنفیذ و تعمیل کی صورت میں اور باقی صحابہ رضی اللہ عنہم کی معاونت اور اجماع کے ساتھ سارا عمل پایہ تکمیل کو پہنچا۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ: ”مصاحف میں اجر کے اعتبار سے عظیم انسان ابوبکر رضی اللہ عنہ ہیں، اللہ تعالیٰ ابوبکر رضی اللہ عنہ پر رحم فرمائے کہ انہوں نے سب سے پہلے قرآن جمع کیا۔“ ①

حضرت زید رضی اللہ عنہ کے جمع کردہ صحف میں انتہائی احتیاط اور اہتمام خاص کا خیال رکھا گیا تھا، چنانچہ ان صحف کو پہلے ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اپنے پاس محفوظ رکھا، پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کی وفات کے بعد ام المومنین حضرت حفصہ بنت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے پاس محفوظ رکھا۔

یہاں تک حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے حضرت حفصہ رضی اللہ عنہ سے ان صحف کو طلب کیا اور قرآن کے مصاحف کے لکھوانے میں ان ہی پر اکتفا کیا۔ اور پھر ان کو وہ واپس کر دیے۔ (اس کی تفصیل آگے آرہی ہے)

یہ صحف بہت سے امتیازی خصوصیات کی وجہ سے ممتاز حیثیت کے حامل تھے:

① ان کو تلاش و جستجو کے بہت ہی دقیق طریقوں سے جمع کیا گیا تھا نیز ان میں علمی ثبوت تحقیق کے بہترین اصول کا لحاظ رکھا گیا تھا۔ جیسا کہ ابھی اس کے طریق کار کے بیان میں وضاحت ہوئی ہے۔

② ان صحف میں ان آیات پر اکتفاء کیا گیا تھا جن کی تلاوت منسوخ نہیں ہوئی۔

③ ان صحف کو اجماع امت کا شرف بھی حاصل ہوا اور تو اتر روایات کا بھی، اور اس تو اتر پر یہ اعتراض نہیں کیا جاسکتا کہ سورت

براءت کا آخری حصہ تو صرف ابو خزیمہ رضی اللہ عنہ کے پاس ملا تھا، کیونکہ اس سے مراد یہ ہے کہ یہ حصہ تحریر کی شکل میں صرف ان کے پاس موجود تھا۔ یہ امر اس کے منافی نہیں کہ وہ حصہ دیگر بہت سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے پاس محفوظ شکل میں موجود تھا جو حد تو اتر کو پہنچا ہوا ہے۔ ہم نے کئی بار یہ بات کہی ہے کہ: اس وقت اصل اعتماد حفظ اور زبانی یاد ہونے پر تھا، کتابت پر اعتماد بطور مصدر و مآخذ صرف احتیاط اور اہتمام کی بناء پر تھا۔

یہ بات بھی پیش نظر رہنی چاہیے کہ حضرت زید رضی اللہ عنہ کا جمع قرآن ان حروف سبعہ کو بھی شامل تھا جس کے ساتھ قرآن امت اسلامیہ کی سہولت کی خاطر نازل ہوا تھا وہ حروف سبعہ بھی مختلف چیزوں پر لکھے گئے تھے۔

ملاحظہ ✽ مذکورہ طرز پر قرآن کا صحف یا مصحف میں اپنی سابقہ خصوصیات کے ساتھ جمع ہونا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ سے قبل کسی کے ہاں معروف نہ تھا، یہ اس بات کے منافی نہیں کہ صحابہ رضی اللہ عنہم کے پاس تو کئی صحف یا مصحف موجود تھے جنہوں نے اس سے پہلے ان میں قرآن لکھا تھا، (کیونکہ) ان مصاحف کو وہ شرف حاصل نہیں ہوا جو عہد صدیقی میں جمع کردہ صحف کو حاصل ہوا یعنی خوب باریک بینی سے بحث و جستجو، غیر منسوخ التلاوة آیات پر اکتفاء کرنا، پھر ان کا حد تو اتر کو پہنچانا، نیز امت کا اس پر اجماع ہونا اور حروف سبعہ کو بھی جامع ہونا وغیرہ جیسا کہ اس سے پہلے گزرا۔ اب اس بحث میں یہ کہنا ہمارے لیے باعث اعتراض نہیں ہوگا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ کے بعد سب سے پہلے قرآن کو جمع کیا تھا۔ نیز ہمارے موضوع کے صاف اور واضح ہونے پر اس روایت سے استدلال کرنا بھی مضرب نہیں ہوگا جو امام سیوطی رضی اللہ عنہ نے ابن الغریس سے نقل کی ہے یعنی محمد بن سیرین حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنے گھر میں بیٹھے رہے، ابو بکر رضی اللہ عنہ سے کسی نے کہا کہ: حضرت علی رضی اللہ عنہ آپ رضی اللہ عنہ سے بیعت کرنا پسند نہیں کرتے۔ ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے انہیں بلا بھیجا اور پھر ان سے پوچھا کہ کیا آپ میری بیعت کو پسند نہیں کرتے؟ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کہا کہ میرا خیال ہے کہ کتاب اللہ میں زیادتی کی جارہی ہے، مجھے یہ خیال آیا کہ میں جب تک اسے جمع نہ کر لوں اپنی چادر نہ پہنوں سوائے نماز کے، ابو بکر رضی اللہ عنہ نے ان سے فرمایا: تمہارا خیال بہت اچھا ہے محمد (ابن سیرین) کہتے ہیں کہ اس نے عمر سے پوچھا کہ کیا انہوں نے قرآن کو ترتیب نزول کے اعتبار سے جمع کیا تھا اول فلاؤل کے مطابق؟ تو عمر نے کہا کہ: اگر تمام جن و انس بھی اس طرح جمع کرنے کے لیے اکٹھے ہو جائیں تو کبھی نہ کر سکتے۔“

ابن ابی شیبہ رضی اللہ عنہ نے ایک دوسرے طریق سے ابن سیرین رضی اللہ عنہ سے یہی اثر نقل کیا ہے اس میں یہ ہے کہ انہوں نے اپنے مصحف میں ناسخ و منسوخ آیات بھی لکھی تھیں، نیز ابن سیرین کہتے ہیں کہ میں نے یہ کتاب طلب کی اور مدینہ بھی لکھا اس کے بارے میں لیکن مجھے یہ دستیاب نہ ہو سکی۔

ہم کہتے ہیں کہ اس طرح کی روایات ہماری بحث اور گفتگو کے منافی نہیں ہے اور نہ ہی اس سے ہمارے موضوع پر کوئی قدغن ہے، کیونکہ زیادہ سے زیادہ ایسی روایات سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور بعض دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم نے بھی ایک مصحف میں قرآن لکھا تھا، لیکن اسے وہ اجماعی شان اور مذکورہ خصوصیات حاصل نہ تھیں جو عہد صدیقی میں جمع کردہ صحف یا مصحف کو حاصل ہوئیں۔ صحابہ رضی اللہ عنہم کے وہ انفرادی نوعیت کے مصاحف تھے، انہیں وہ اعتماد اور خصوصیات حاصل نہ تھیں۔ اگرچہ ان کو زبانی تقدم حاصل تھا لیکن ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کا جمع کردہ مصحف بہر صورت اولیت کا حامل ہے، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس حقیقت کا خود بھی اعتراف کیا ہے

## مناب العسرفان فی علوم القسرفان: جلد ①

اس حدیث میں جس کو ابن ابی داؤد و بیہقی نے مصاحف میں سند حسن کے ساتھ ابھی ذکر کیا تھا کہ: مصاحف میں اجر کے اعتبار سے سب سے عظیم انسان ابو بکر بنیہو ہیں، اللہ ابو بکر پر رحم فرمائے، انہوں نے سب سے پہلے کتاب اللہ کو جمع کیا۔  
یہ ابو الحسن (حضرت علی بنیہو) کی طرف سے واضح اعتراف ہے کہ مذکورہ طریق پر قرآن کو جمع کرنے کا اولین شرف ابو بکر صدیق بنیہو کو حاصل ہے۔

**جمع قرآن عہد عثمانی میں** ﴿﴾ حضرت عثمان غنی بنیہو کے زمانہ خلافت میں اسلامی فتوحات کا دائرہ وسیع ہو گیا، آبادی میں اضافہ ہو گیا جس کی وجہ سے مسلمان مختلف اطراف و بلاد میں پھیل گئے ایک نسل نوا بھری جسے قرآن کی تعلیم کی ضرورت تھی۔ دوسری طرف پیغمبر ﷺ کا عہد اور وحی و نزول قرآن کا دور بہت گزر چکا تھا، جو لوگ مختلف اسلامی علاقوں میں بستے تھے وہ اپنے اپنے علاقوں میں مشہور صحابہ بنیہو کی قراءت کے مطابق قرآن پڑھنے لگے تھے۔ چنانچہ شام کے لوگ ابی بن کعب کی قراءت، کوفہ کے لوگ عبداللہ بن مسعود بنیہو کی قراءت کے مطابق پڑھنے لگے تھے، چنانچہ شام کے لوگ ابی بن کعب بنیہو کی قراءت، کوفہ کے لوگ عبداللہ بن مسعود بنیہو کی قراءت اور دیگر حضرات ابوموسیٰ اشعری بنیہو کی قراءت کے مطابق قرآن پڑھتے تھے جس کی بناء پر ان میں حروف اداء اور وجوہ قراءت کا اس قدر اختلاف ہوا کہ قرآن کی تلاوت میں باہمی نزاع کا دروازہ کھل گیا، اور صحابہ کرام کے درمیان اشتباہ پیدا ہو گیا قبل اس کے کہ انہیں یہ معلوم ہوتا کہ قرآن کا نزول سات حروف پر ہوا ہے، بلکہ ان کا نزاع شدت اختیار کر گیا، جس کا سبب یہ تھا کہ وہ دو نبوت اور رسول کریم ﷺ و جو باسعادت سے کافی دور ہو چکے تھے جن کے حکم اور فرمان پر انہیں اطمینان حاصل ہو جایا کرتا تھا۔ قرآن کی تلاوت کا معاملہ اس قدر شدت اختیار کر گیا کہ لوگ ایک دوسرے کی تکفیر کرنے لگے، قریب تھا کہ زمین پر نساؤ عظیم برپا ہو جاتا، اور یہ شورش کہیں رکنے کا نام نہیں لے رہی تھی بلکہ تمام اسلامی شہروں حتیٰ کہ مجاز اور مدینہ تک اس آگ کے شعلے بھڑکنے لگے، کیا چھوٹے اور کیا بڑے سب اس تکفیر میں مبتلا ہو گئے۔

ابن ابی داؤد نے المصاحف میں ابوالقباہ کی سند سے یہ بات نقل کی ہے کہ انہوں نے فرمایا: حضرت عثمان کے دور خلافت میں حال یہ ہوا کہ ایک معلم ایک شخص کی قراءت کے مطابق تعلیم دیتا دوسرا دوسرے آدمی کی قراءت کے مطابق قرآن سکھاتا، جب بچے آپس میں ملتے اور ان کی قراءتیں مختلف ہوتیں، یہاں تک کہ یہ بات معلمین تک پہنچتی تو وہ ایک دوسرے کی تکفیر کرتے۔ چنانچہ یہ بات حضرت عثمان بنیہو کو پہنچی تو انہوں نے لوگوں سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا: ”تم میرے سامنے اختلاف کرتے ہو، تو جو شہر مجھ سے دور واقع ہیں ان میں اس سے زیادہ اختلاف ہوگا۔“

حضرت عثمان غنی بنیہو نے بالکل سچ فرمایا، واقعی جو علاقے جیسے مجاز اور مدینہ وغیرہ ان میں زیادہ شدت سے اختلاف پایا جاتا تھا، پھر جو لوگ ان علاقوں میں موجود لوگوں کی قراءت کا اختلاف سنتے تھے وہ جب کسی مجلس میں جمع ہوتے یا دشمن سے جہاد کے موقع پر آپس میں ملتے تو اس امر پر تعجب کا اظہار کرتے اور اس تعجب اور انکار میں دوسروں کو روکتے جب بھی وہ قرآن کے طرق ادا کے اختلاف میں زیادتی کو سنتے، پھر ان کا تعجب قرآن میں شبک و شبکہ کی حد کو پہنچا، پھر اس سے آگے نکل کر گناہ اور معصیت کی حد کو پہنچ گیا اور اس سے ایسا فتنہ رونما ہونے لگا کہ قریب تھا کہ اس میں قتل و غارت اور خون ریزی کا ایسا سلسلہ چل نکلتا جیسے یہود و نصاریٰ میں ان کی کتاب کے بارے میں باہمی جدل و اختلاف ہوا تھا، جیسا کہ حضرت حدیثہ بنیہو نے آئندہ آنے والی حدیث میں حضرت



عثمان بن عفان کو صورت حال سے آگاہ کیا تھا۔

علاوہ ازیں جن سات حروف پر قرآن کا نزول ہوا تھا ان علاقوں کے لوگ اس سے بھی واقف نہ تھے اور ان کے لیے آسان بھی نہ تھا کہ ان تمام حروف کی معرفت حاصل کر لیتے، اور آپس کے اختلاف کے معاملہ میں ان ہی سے محاکمہ کر لیتے۔ کیونکہ صورت حال یہ تھی کہ جو صحابی جس صوبہ یا علاقے میں موجود تھا وہ صرف ان ہی حروف کے مطابق لوگوں کو قرآن پڑھاتا تھا جو اسے معلوم تھے جس کے مطابق قرآن کا نزول ہوا تھا۔ ان کے سامنے کوئی جامع مصحف موجود نہیں تھا کہ آپس کے اختلاف اور نزاع میں اس کی طرف رجوع کرتے۔

ان ہی اسباب و واقعات کی بناء پر حضرت عثمان بن عفان اپنی اصابت رائے اور صداقت لکڑے سمجھا کہ اس افتراق و انتشار کا تدارک کیا جائے قبل اس کے کہ اس میں مزید وسعت پیدا ہو، اور اس بیماری کا جز سے خاتمہ کر دیا جائے پہلے اس سے کہ یہ لاعلاج ہو جائے، چنانچہ آپ بنی ہنظلہ نے بڑے بڑے صحابہ بنی ہنظلہ اور اصحاب بصرہ لوگوں کو جمع کیا اور اس فتنہ کے علاج کے لیے باہمی مشورہ کیا اور پھیلے ہوئے اس اختلاف و نزاع کی سرکوبی کے لیے آپس میں مشاورت کی، چنانچہ سب کا اس بات پر اجماع ہوا کہ چند مصاحف لکھ کر ان شہروں میں بھیجے جائیں اور لوگوں کو حکم دیا جائے کہ ان مصاحف کے علاوہ جو کچھ بھی ان کے پاس ہو اسے جلا دیا جائے اور ان کے علاوہ کسی اور چیز پر اعتماد نہ کیا جائے، اس سے باہمی اختلاف و نزاع بھی ختم ہوگا اور اس اختلاف کے اندھیرے میں یہ عثمانی اور قانونی مصاحف ایک روشنی کا مرتبہ حاصل کرے گا اور اس شب فتنہ میں روشن چراغ، اس نزاع و اختلاف میں حاکم عادل اور اس مرض سے واقع شدہ مصیبت سے کامل شفا کا ذریعہ بنے گا۔

حضرت عثمان بن عفان غنی بنی ہنظلہ نے ۲۴ھ کے تقریباً آخر میں اور ۲۵ھ کے اوائل میں اس اجتماعی فیصلے پر عمل درآمد کروانا شروع کر دیا، چنانچہ آپ نے چار منتخب صحابہ بنی ہنظلہ اور قابل اعتماد حفاظ صحابہ بنی ہنظلہ کو اس کی ذمہ داری سونپی، جن کے نام یہ ہیں: زید بن ثابت، عبداللہ بن زبیر، سعید بن العاص، اور عبدالرحمن بن حارث بن ہشام بنی ہنظلہ یہ آخری تین صحابہ بنی ہنظلہ قبیلہ قریش سے تعلق رکھتے تھے۔

حضرت عثمان بن عفان نے ام المومنین حضرت حفصہ بنت عمر بنی ہنظلہ کو پیغام بھیجا، انہوں نے وہ صحیفے جو ان کے پاس موجود تھے آپ بنی ہنظلہ کو بھجوادئے۔ یہ صحیفے وہ تھے جن میں قرآن عہد صدیقی میں جمع کیا گیا تھا، چنانچہ چار صحابہ کی کمیٹی نے اسے نقل کرنا شروع کر دیا۔ بعض روایات میں آتا ہے کہ جن لوگوں کو مصاحف لکھنے کے لیے بلا گیا تھا وہ بارہ آدمی تھے، یہ لوگ اس وقت تک کچھ نہیں لکھتے جب تک کہ صحابہ کرام بنی ہنظلہ کے سامنے اسے پیش نہ کرتے اور وہ اس بات کا اقرار نہ کرتے کہ واقعی رسول اللہ ﷺ نے اس طریقے پر قرآن پڑھا ہے جس کو ہم ان مصاحف میں پاتے ہیں۔

مصاحف کی کتابت میں حضرت عثمان بن عفان کا طریق کار صحابہ بنی ہنظلہ کا اس امر پر اتفاق تھا کہ وہ ان مصاحف میں تب ہی کچھ لکھتے تھے جب انہیں اس کا قرآن ہونا یقین کے ساتھ معلوم ہو جاتا کہ آخری دور کے موقع پر یہ حصہ قائم اور برقرار تھا اور اس کو صحت

منائل العسرفان فی علوم القرآن: جلد ①  
 کا یقین ہو جاتا کہ حضور ﷺ کی طرف اس کی نسبت بالکل درست ہے یہ حصر منسوخ نہیں ہوا اور اس کے علاوہ جو حصہ ہوتا اسے تھوڑے دیتے تھے۔ مثلاً ﴿فَأَسْعَوْا﴾ (المہمہ: ۹) کی جگہ ﴿فَامضُوا﴾ الی ذکر اللہ کی قراءت اور ﴿وَكَانَ وِرَاءَهُمْ مَلِكٌ يَأْخُذُ كُلَّ سَفِيحَةٍ غَصْبًا﴾ (التکویف: ۷۹) میں لفظ ﴿صَالِحِيَّوْ﴾ کا اضافہ حذف کر دیتے تھے۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی اس کمپنی نے متعدد مصاحف لکھے، اس لیے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا مقصد یہ تھا کہ ایک متفقہ مصحف لکھ کر مسلمانوں کے مختلف علاقوں میں بھیج دیا جائے، چونکہ علاقے متعدد تھے اس لیے متعدد مصاحف لکھوائے، نیز ان مصاحف کو اثبات حذف اور بدل وغیرہ، کے لحاظ سے بھی متفاوت لکھوایا، کیونکہ آپ رضی اللہ عنہ کا مقصد یہ تھا کہ ان مصاحف میں حروف سبجہ کی آ جائیں۔ انہیں نقطوں اور شکل (اعراب) سے خالی رکھا تاکہ سارے احتمالات بھی پائے جائیں، چنانچہ بعض کلمات ایسے تھے کہ انہیں نقطوں اور شکل (اعراب) سے مجرد ہونے کی وجہ سے ایک سے زیادہ طریقوں سے پڑھا جا سکتا تھا۔ مثلاً ﴿فَتَبَيَّنُوا﴾ جو کہ ﴿إِنْ جَاءَكُمْ فَاسِقٌ بِنَبَأٍ فَتَبَيَّنُوا﴾ کا حصہ ہے (المہمات: ۶۰) نقطے اور شکل (اعراب) سے خالی ہونے کی صورت میں ﴿فَتَبَيَّنُوا﴾ بھی پڑھا جا سکتا ہے جو کہ ایک دوسری قراءت ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کے فرمان:

﴿وَأَنْظُرْ إِلَى الْعِظَامِ كَيْفَ نُنشِزُهَا﴾ (البقرہ: ۲۵۹)

”اور (اب اپنے گدھے کی) ہڈیوں کو دیکھو کہ ہم کس طرح انہیں اٹھاتے ہیں۔“

میں لکھ ﴿نُنشِزُهَا﴾ جب نقطوں سے مجرد ہو تو ﴿نُنشِزُهَا﴾ راء کے ساتھ بھی پڑھا جا سکتا ہے جو کہ ایک دوسری قراءت ہے، اسی طرح لفظ ﴿أَوْ﴾ ہے جس کے بارے میں آتا ہے کہ اسے سنتیس (۳۷) طرح سے پڑھا جا سکتا ہے۔  
 البتہ جو کلمات دیگر قراءات کے باوجود نقطوں اور اعراب سے خالی ہونے پر بھی کثرت قراءت پر دلالت نہیں کرتے انہیں وہ بعض مصاحف میں اس طریقے سے لکھتے تھے کہ اس سے معلوم ہو جاتا کہ اس میں ایک اور قراءت بھی ہے اور بعض دیگر مصاحف میں دوسرے طرز پر لکھتے جس سے معلوم ہوتا کہ اس میں ایک دوسری قراءت بھی ہے۔ جیسے لفظ ﴿وَأُخِي﴾ تضعیف کے ساتھ اور ﴿أَوْخِي﴾ ہمزہ کے ساتھ، یہ دونوں قراءتیں ہیں اس فرمان خداوندی میں:

﴿وَوَضِي يَهَاءُ يَرْوَهُمْ بَيْنَهُ وَيَعْقُوبُ﴾ (البقرہ: ۱۳۲)

”اور ابراہیم نے اپنے بیٹوں کو اسی بات کی وصیت کی اور یعقوب نے بھی۔“

اسی طرح ﴿تَخْتَبُهَا الْأَنْهَارُ﴾ کی قراءت اور ﴿مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ﴾ لفظ ﴿مِنْ﴾ کے اضافہ کے ساتھ، جو اس فرمان الہی میں ہیں: ﴿لَهُمْ جَنَّاتٌ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ﴾ (البقرہ: ۸۹) اب یہ بھی دو قراءتیں ہیں۔

حاصل کام یہ ہے کہ جس لفظ میں وجوہ قراءات مختلف نہ ہوتیں ان کو تو وہ ایک ہی صورت میں لکھتے تھے اور جس لفظ میں وجوہ قراءات مختلف ہوتیں تو اگر محتمل وجوہ کی وجہ سے اسے ایک خط میں لکھنا ممکن نہ ہوتا تو اسے ایسے طرز پر لکھتے کہ ایک مصحف میں بعض وجوہ آتیں اور پھر دوسرے مصحف میں دوسرے طریقے پر لکھتے کہ دیگر وجوہ قراءات بھی آ جائیں۔ وہ اس بات سے بچتے کہ ایک ہی مصحف میں دو طرزوں پر اس لفظ کو لکھیں اس ڈر سے کہ کسی کو یہ دو ہم ہونے لگے کہ یہ لفظ ایک ہی قراءت میں سررطور پر دو

وجہوں پر نازل ہوا ہے حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ بلکہ یہ دو مستقل قراءتیں ہیں کہ وہ لفظ ایک قراءت میں ایک پر اور دوسری قراءت میں دوسری وجہ پر نازل ہوا ہے۔ اسی طرح وہ لوگ اس بات سے بھی احتیاط کرتے کہ وہ اس لفظ کو ایک مصحف میں دو طریقے پر لکھیں کہ ایک کو اصل مصحف میں اور دوسرے کو اس کے حاشیہ میں، تاکہ کسی کو یہ خیال نہ ہو کہ دوسرا پہلے کی تصحیح کے لیے ہے۔ علاوہ ازیں ایک کو اصل میں اور دوسرے کو حاشیہ میں لکھنا یا اس کے برعکس کرنا ترجیح بلا مرجح ہے، جیسے لفظ ”وطني“ تفسیف کے ساتھ لکھنا اور ”اَوْضَى“ ہمزہ کے ساتھ لکھنا، (جیسا کہ پہلے گزرا ہے) لیکن جس لفظ میں قراءت کا اختلاف ہوتا اور ایک ہی صورت میں اس کا رسم ہونا اس پر دلالت کرتا تو وہ اس اختلاف قراءت کا محتمل ہوتا تھا اور اس لفظ پر نقطے اور اعراب کا نہ ہونا بھی اس پر معاون ہوتا تھا، جیسے ﴿فَتَبَيَّنُوا﴾ اور ﴿نُنشِرُهَا﴾ وغیرہ الفاظ (جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے)

اس طرح ایک ہی خط کی دو منقول لفظوں پر دلالت ایسی ہوتی جیسے ایک مشترک لفظ دو معقول معانی پر دلالت کرتا ہے۔ ان صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو رسم مصاحف میں اس خاص طرز کو اختیار کرنے کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ انہوں نے جناب رسول کریم ﷺ سے قرآن کو ان تمام وجوہ قراءت کے ساتھ اور ان تمام حروف کے ساتھ اخذ کیا تھا جن پر قرآن کا نزول ہوا ہے۔ چنانچہ یہ طریقہ ایسا تھا جو قرآن کی تمام وجوہ قراءت کا احاطہ کرتا تھا، تاکہ یہ نہ کہا جائے کہ ان لوگوں نے اس کی قراءت کا کوئی حصہ ساقط کر دیا یا کسی کو اس کے کسی حرف کے ساتھ قراءت کرنے سے منع کر دیا جبکہ تمام قراءت اور حروف حضور نبی کریم ﷺ سے نقل تو اتر کے ساتھ منقول ہیں اور خود رسول اللہ ﷺ فرمایا کرتے کہ: ”تم ان میں سے جو قراءت بھی کرو گے درست کرو گے لہذا خشک و شبہ میں نہ پڑو۔“

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اس کام کے لیے جو طریق کار وضع کیا تھا اس میں یہ بات بھی شامل تھی کہ انہوں نے ان قریشی حضرات سے کہا تھا کہ: جب تمہارا اور زید بن ثابت رضی اللہ عنہما کا قرآن کے کسی حصے کے بارے اختلاف ہو تو اسے قریش کی زبان میں لکھنا کہ قرآن ان ہی کی زبان میں اترے۔“ ①

چنانچہ انہوں نے اس پر عمل کیا، یہاں تک جب وہ مصاحف میں لکھ چکے تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے وہ مصحف حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کو واپس بھیج دیئے اور تمام علاقوں میں بھی ان کا لکھا ہوا مصحف بھیج دیا اور حکم دیا کہ اس کے سوا جو مصحف یا صحیفہ بھی ہوا اس کو جلادیا جائے۔

اس بارے میں امام بخاری رضی اللہ عنہ اپنی صحیح میں اپنی سند کے ساتھ ابن شہاب رضی اللہ عنہ سے نقل کرتے ہیں کہ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ نے ان کو بیان کیا کہ: حدیفہ بن الیمان رضی اللہ عنہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے پاس آئے، اور وہ فتح ارمینیا اور آذربایجان میں اہل عراق کے ہمراہ اہل شام کے ساتھ لڑتے تھے، حضرت حدیفہ رضی اللہ عنہ کو ان لوگوں کے اختلاف قراءت نے پریشان کر دیا۔ چنانچہ حضرت حدیفہ رضی اللہ عنہ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے کہا کہ:

”اے امیر المؤمنین! اس امت کا ادراک کیجیے پہلے اس سے کہ وہ یہود نصاریٰ کی طرح آپس میں اختلاف کرنے لگیں۔“

چنانچہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کو پیغام بھیجا کہ ہمیں وہ مصحف بھیج دو جو مصاحف میں لکھے ہیں، ہم آپ کو واپس لوٹا دیں گے، حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو وہ مصاحف بھجوا دیئے۔

## مسائل العرفان فی علوم القرآن: جلد ①

پھر حضرت عثمان بن عفان نے زید بن ثابتؓ، عبداللہ بن زبیرؓ، سعید بن العاصؓ، اور عبدالرحمن بن حارث بن ہشامؓ کو لکھنے کا حکم دیا، انہوں نے مصاحف میں نقل کیا اور حضرت عثمان بن عفانؓ تین قریشی لوگوں سے کہا کہ: جب تمہارا اور زید بن ثابت بن عفانؓ کا قرآن کسی حصے کے بارے میں اختلاف ہو تو اسے قریش کی زبان میں لکھ لینا کہ قرآن ان ہی کی زبان میں اُترا ہے، چنانچہ انہوں نے اس حکم کی تعمیل کی، پھر جب وہ مصاحف میں ان صحف کو لکھ چکے تو حضرت عثمان بن عفانؓ نے وہ صحف حضرت حفصہ بن عفانؓ کو واپس کر دیئے۔ اور تمام اطراف میں ان حضرات کو لکھا ہوا صحیفہ بھیج دیا اور حکم دیا کہ اس کے علاوہ جو صحیفہ یا صحف ہوا اسے جلا دیا جائے۔“ (ایضاً)

جب حضرت عثمان بن عفانؓ نے سابقہ صورت میں مصاحف کی نقل کا حکم مکمل کروا لیا اور تمام اطراف عالم میں اسے بھیج دیا تو حکم دیا کہ اس کے علاوہ جو کچھ بھی کسی کے پاس موجود ہو اس کو جلا دیا جائے خواہ صحیفوں کی شکل میں ہو یا مصاحف کی صورت میں ہو۔ یہ کام اس لیے کیا تاکہ ایک لحاظ سے اختلاف و نزاع کا جڑ سے خاتمہ ہو اور دوسرے اعتبار سے تمام مسلمان، کتاب اللہ کے بارے میں ایک ہی طریق پر جمع ہو جائیں۔ اور ان ہی مصاحف پر عمل پیرا ہو جائیں جو ان امتیازات و خصوصیات کا حامل ہے جو کسی دوسرے میں موجود نہیں ہیں۔ وہ خصوصیات درج ذیل ہیں:

- ① اس طریق پر اکتفاء کرنا جو تو اترے ثابت ہے نہ کہ جس کی روایت خبر آحاد پر مشتمل ہے۔
- ② منسوخ التلاوة آیات کا اور آخری دور میں جو حصہ برقرار نہیں رہا اسے بھی ترک کرنا۔
- ③ سورتوں اور آیتوں کی موجودہ معروف طریقے پر ترتیب، جبکہ ابوبکر صدیقؓ کے صحف اس کے برخلاف تھے ان میں سورتوں کی بجائے آیات کو مرتب کیا گیا تھا۔
- ④ ان مصاحف کی کتابت اس طریقے پر تھی کہ قرآن کی مختلف وجوہ قراءات اور ان حروف کو جامع اور حاوی تھی جس پر نزول قرآن ہوا تھا یعنی کلمات قرآن کو نقطوں اور اعراب سے معرئی رکھا گیا تھا اور اگر ایک طرز کتابت ان وجوہ قراءات وغیرہ کا محتمل نہ ہوتا تو مختلف مصاحف میں وجوہ قراءات کو تقسیم کر دیا جاتا تھا۔ (جیسا کہ پہلے تفصیل سے بیان ہوا)۔
- ⑤ ان مصاحف کو ہر اس چیز سے خالی رکھا گیا جو حقیقت میں ”قرآن“ نہیں تھا، جس طرح بعض صحابہؓ اپنے خاص مصاحف میں بعض الفاظ کے معانی، تشریح یا ناخ و منسوخ کی وضاحت وغیرہ لکھ لیتے تھے۔ تمام صحابہؓ نے حضرت عثمان بن عفانؓ کے حکم کی تعمیل میں اپنے مصاحف کو جلا دیا اور مصاحف عثمانی پر سب متفق ہو گئے، یہاں تک حضرت عبداللہ بن مسعودؓ جن کے بارے میں منقول ہے کہ انہوں نے پہلے تو مصاحف عثمانی کا انکار کیا تھا اور اپنے خاص صحف کو جلانے سے انکار کیا تھا لیکن پھر صحابہؓ نے عثمانیہ کی ایک بڑی جماعت کی طرف رجوع کر لیا تھا جب ان کے سامنے مصاحف عثمانی کے امتیازی اوصاف ظاہر ہوئے اور پتہ چلا کہ ساری امت اس پر متفق ہو چکی ہے اور مسلمانوں کے کلمہ اس پر ایک ہو چکا ہے۔

اس کے بعد ایک اسلامی نفاذ اور ماحول سازگار ہوا جو پہلے نزاع اور افتراق کا شکار تھا، اور صحف ابن مسعودؓ، صحف ابی بکرؓ، صحف عائشہؓ، صحف علیؓ، صحف سالم مولیٰ ابی حذیفہؓ، اور دیگر تمام مصاحف قصہ ماضی بن گئے یا تو انہیں

یانی میں دھو دیا گیا یا نذر آتش کر دیا گیا۔

﴿وَكَفَىٰ اللَّهُ الْمُؤْمِنِينَ الْقِتَالَ - وَكَانَ اللَّهُ قَوِيًّا عَزِيزًا﴾ (الاحزاب: ۵)

”اور خدا مومنوں کو لڑائی کے بارے میں کافی ہوا اور خدا طاقتور (اور) زبردست ہے۔“

اللہ تعالیٰ کی ذات بھی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے راضی ہوئی کہ انہوں نے اپنے اس عمل اور کارنامے کی بدولت اپنے رب تعالیٰ کو راضی کیا، قرآن کی محافظت کی، امت میں اتحاد و یگانگت پیدا کی، فتنہ کا دردرازہ بند کیا، تمام مسلمان اس روز سے آج تک ان کے اس مبارک عمل کا شکر اور پھل چنتے رہیں اور آئندہ بھی چنتے رہیں گے۔

آپ رضی اللہ عنہ کے اس عمل پر قدغن نہیں لگائی جاسکتی کہ انہوں نے مصاحف عثمانیہ کے خلاف باقی تمام مصاحف اور صحف کو نذر آتش کر دیا تھا۔ کیونکہ آپ اچھی طرح اس کی وجہ جانتے ہیں، نیز حضرت عثمان نے یہ عمل از خود نہیں کیا بلکہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے مشورہ سے کیا تھا، ان کی آراء بھی اس مبارک عمل میں ان کے موافق تھیں بلکہ حضرت عثمان کو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی معاونت، تائید اور قدر افزائی سے ہی کامیابی حاصل ہوئی۔

ابو بکر الانباری رضی اللہ عنہ، حضرت سید بن غفلہ رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا: ”میں نے حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کو فرماتے ہوئے سنا کہ انہوں نے فرمایا:

”اے لوگو کی جماعت! خدا سے ڈرو، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے بارے میں غلو بازی سے اجتناب کرو یعنی ان کو یہ نہ کہو کہ وہ مصاحف کو جلانے والے ہیں، قسم ہے اللہ تعالیٰ کی انہوں نے مصاحف کو صحابہ رسول ﷺ کی جماعت کے مشورے سے ہی جلا یا تھا۔“

عمر بن سعید رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ: حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

”اگر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دقت میں والی ہوتا تو میں بھی وہی کام کرتا جو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے کیا تھا۔“

(اللہ تعالیٰ ان سب سے راضی ہو، اور اس مبارک عمل پر ان کو بہترین جزا عطا فرمائے؟)

آپ جمع قرآن کے مسئلہ کو تین ادوار میں تقسیم کر سکتے ہیں:

خلاصہ بحث: ① عہد نبوی ② عہد صدیقی ③ عہد عثمانی

عہد نبوی ﷺ میں جمع قرآن کا معنی یہ ہے کہ آیات کو لکھنا اور ترتیب دینا اور سورتوں میں خاص جگہ پر ان کو رکھنا، البتہ اس عہد میں آیات کجھور کی شانوں، ہڈیوں اور پتھر کے ٹکڑوں میں بکھری ہوئی تھیں اور کتابت کے آلات جس قدر میرے تھے اس قدر کاغذوں پر بھی لکھی گئیں۔ اس عہد میں جمع قرآن کا مقصد قرآن کے وثوق و اعتماد کا زیادہ سے زیادہ لحاظ رکھنا، اگرچہ اس دور میں زیادہ تر اعتماد حفظ قرآن پر تھا۔

اور عہد صدیقی میں جمع قرآن کا معنی یہ ہے کہ قرآن کو صحف میں لکھنا اور نقل کرنا، آیات بھی مرتب کرنا، غیر منسوخ السلاوة حصے پر اکتفاء کرنا اور تواتر اور اجماع کے ساتھ اس کی توثیق کرنا۔ اس دور میں جمع قرآن کا مقصد قرآن کو کتابت کی شکل میں

حکمناہل العرفان فی علوم القرآن: جلد ①

مرتب مجموعہ بنت کر محفوظ کرنا، اس خدشہ کے پیش نظر کہ کہیں حاملین و حافظین قرآن کی وفات کے سبب اس قرآن کا کوئی حصہ ضائع نہ ہو جائے۔

اور عبد عثمانی میں جمع قرآن کا معنی یہ ہے کہ قرآن کو ان صحف سے نقل کر کے ایک مصحف امام میں جمع کر دینا اور پھر اس سے مختلف مصاحف لکھوا کر اطراف عالم اسلام میں بھیج دینا، اور سورتوں اور آیات کی ترتیب کے ساتھ ان مذکورہ اوصاف و امتیازات کا بھی ان میں لحاظ رکھا جانا جن کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ اس دور میں جمع قرآن کا مقصد اس فتنہ کا خاتمہ تھا جو مسلمانوں میں اختلاف قراءت کے سبب پھیل چکا تھا اور مسلمانوں میں وحدت اور یکگت پیدا کرنا اور کتاب اللہ کی تغیر و تبدیلی سے حفاظت کرنا مقصود تھا۔ جس کے بارے میں ارشاد باری ہے:

﴿لَا تَبْدِيلَ لِكَلِمَاتِ اللَّهِ ۚ ذَٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ﴾ (یونس: ۶۳)

”خدا کی باتیں بدلتی نہیں۔ یہی تو بڑی کامیابی ہے۔“

**جمع قرآن کے بارے میں مختلف شبہات اور ان کے جوابات**

قرآن ہمیشہ سے اعدائے اسلام کا ہدف رہا ہے، اس پر مختلف مطاعن کے تیر برساتے رہے ہیں اور اس کے علوم کو محض جھوٹ اور غلط بیانی سے موردِ شبہات و الزامات بنا تے آئے ہیں اور پھر لوگوں میں ظلم و تعدی کے ساتھ ان شبہات کی ترویج و اشاعت بھی کرتے ہیں۔ ہم ذیل میں ان کے چند شبہات مع جوابات پیش کرتے ہیں:

**پہلا شبہ**

اس شبہ کی بنیاد سات طرح کے شبہوں پر ہے: وہ کہتے ہیں کہ جس طریقے پر قرآن کی جمع و تدوین کا کام ہوا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا کچھ حصہ ساقط ہوا ہے، آج ہمارے ہاتھوں وہ قرآن نہیں ہے جس کے بارے میں محمد ﷺ کا جاننا یہ ہے کہ یہ کلام اس پر نازل ہوا ہے، ان لوگوں نے اس شبہ کے بارے میں درج ذیل مزعومات پر اعتماد کیا ہے۔

① محمد ﷺ نے فرمایا کہ: اللہ فلاں شخص پر رحم فرمائے کہ اس نے مجھے فلاں آیات یاد دلا دی، میں نے تو ان آیات کو ساقط اور حذف کر دیا تھا، ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ وہ آیات تو مجھے بھلا دی گئیں تھیں۔ ② اس میں خود نبی ﷺ اعتراف کر رہے ہیں کہ انہوں نے قصداً بعض آیات قرآنی ساقط کر دی تھیں یا انہیں بھلا دی گئی تھیں!

② سورة الاعلیٰ میں جو یہ الفاظ آتے ہیں: ﴿سَنُقَرِّئُكَ ۙ وَلَا تَسْتَبِي ۙ اِلَّا مَا شَاءَ اللّٰهُ﴾ (الاعلیٰ: ۶۰، ۷۰) اس استثناء سے معلوم ہوتا ہے کہ محمد ﷺ نے قصداً چند آیات ساقط کر دی تھیں یا انہیں یاد نہیں رہیں بھلا دی گئی تھیں!

③ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے بھی قرآن کا بعض وہ حصہ حذف کر دیا تھا جس کے حذف کرنے میں انہوں نے مصلحت سمجھی، اس میں آیت متعہ بھی تھی جس کو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ساقط کر دیا تھا بلکہ جو شخص اس آیت کو پڑھتا آپ اس کو مارتے تھے، خود حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اس پر ان کی تفسیح کرتے ہوئے فرمایا: قرآن پر کوڑے لگاتے ہیں، اس سے دوسروں کو روکتے ہیں، اس نے قرآن میں



تخریف اور تبدیلی کر دی ہے۔

④ ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نے بھی قرآن کا وہ حصہ حذف کر دیا تھا جس کو وہ نقل کرتے تھے آج ہم مصحف میں یہ حصہ دستیاب نہیں پاتے۔  
 (اللَّهُمَّ انا نستعينك ونسعديك ونستغفرك ونتوب اليك ونؤمن بك ونتوكل عليك ونؤمنى عليك  
 الخير كله، ونشكرك ولا نكفرك ونخلع ونترك من يفجرك اللهم اياك نعبد ولك نصلی ونسجدُ واليك  
 نسعی، ونحفد، نرجو رحمتك ونخاف عذابك ان عذابك الجد بالکفار ملحق)).

⑤ قرآن کی بہت سی آیات ایسی تھیں جن کی محافظت کی صورت صرف صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا ان کو زبانی یاد رکھنا تھا۔ ان میں کچھ تو حضور ﷺ کے غزوات میں شہید ہو گئے اور کچھ ان کے خلفاء اولین کی لڑائیوں میں قتل ہو گئے اس طرح جو حصہ ان کو یاد تھا وہ ان ہی کے ساتھ ضائع ہو گیا، ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کو جمع قرآن کا حکم بعد میں دیا تھا اس لیے حضرت زید رضی اللہ عنہ صرف وہ حصہ جمع کر پائے جو اس وقت موجود اور زندہ صحابہ رضی اللہ عنہم کو یاد تھا۔

⑥ قرآن کا جو حصہ ہڈیوں وغیرہ پر لکھا ہوا تھا اس میں کوئی نظم و ضبط نہ تھا، اس کا کچھ حصہ ضائع ہو چکا تھا اور علی کا جو خیال ہے کہ اس میں کچھ آیات ایسی تھیں جو حرفاً تو منسوخ تھیں لیکن حکماً منسوخ نہیں تھیں، ان کا عجیب قسم کا زعم و خیال ہے جبکہ حقیقت حال یہی ہے کہ جن ہڈیوں پر آیات لکھی تھیں وہ ضائع ہو گئی تھیں اور ان کا صرف معنی و مفہوم باقی رہ گیا تھا جو لوگوں کے سینوں میں محفوظ تھا۔

④ جب حجاج نے بنو امیہ کی نصرت و مدد شروع کی تھی تو اس نے تمام مصاحف جمع کر کے ان سے بہت سی ایسی چیزیں حذف کر دی تھیں جو ان کے بارے میں نازل ہوئیں اور بہت سی ایسی چیزوں کا ان میں اضافہ کر دیا تھا جو ان میں موجود نہیں تھیں، اس نے ارادے کے مطابق چھ نئے مصاحف لکھوائے اور ان کو مصر، شام، مکہ، مدینہ اور بصرہ کو ذبح کیا، آج یہی قرآن ہمارے ہاں متداول ہے۔ اس نے سابقہ تمام مصاحف اور اس کے نسخے منگوا کر سرکہ میں ڈال دیئے تھے حتیٰ کہ وہ ریزے ریزے ہو گئے، اس کے اس عمل کا مقصد صرف بنو امیہ کی تائید تھا، چنانچہ اب قرآن میں ایسا کوئی حصہ باقی نہیں رہا جس میں بنو امیہ کی برائیاں مذکور ہوں!؟

مزعوماتِ باطلہ کا رد  
 اس شبہ کا حاصل یہ ہے کہ اس وقت جو قرآن ہمارے پاس موجود ہے وہ ناقص ہے۔ اس کا کچھ بیان کیے ہیں۔ اب ہم آپ کے سامنے ان مزعومات کی تردید کرتے ہیں تاکہ ہم اس شبہ کی اصل بنیاد چس کر سکیں۔

① ان کا پہلا استدلال (ذکر کردہ حدیث) ان کے لیے قابل حجت نہیں ہے یعنی اس بنیادی حدیث میں شک و شبہ کا ہونا جس پر قرآن کی کتابت اور اس کا جمع ہونا جی ہے، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ مذکورہ حدیث ہر طرح کے شبہ سے محفوظ اور مضبوط ہے کہ یہ آیات ان وثائق میں لکھی ہوئی تھیں جو رسول کریم ﷺ نے صحابہ رضی اللہ عنہم کو لکھوائی تھیں، نیز جن صحابہ رضی اللہ عنہم نے حضور ﷺ سے ان آیات کو اخذ کیا تھا ان کے سینوں میں بھی وہ محفوظ تھیں ایسے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی تعداد بھی حد تو اتنی کم نہ تھی جو ان تمام کا اس کی صحت پر اتفاق بھی ہے، جیسا کہ جمع قرآن کے طریق کار میں یہ بات معروف ہے، بہت زیادہ جی کہا جا سکتا ہے کہ اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اس آدمی کا ان آیات کو پڑھنا آ شخصور رضی اللہ عنہم کے لیے یاد آوری کا باعث بنا جو آیات آپ ﷺ

بھلا دیئے گئے یا حصہ نے نسیان ان کو حذف کر دیا تھا۔ بھول کر کوئی کام ہو جانا حضور ﷺ کے اعتماد کے منافی نہیں ہے، اس سے جمع قرآن اور کتابت قرآن کی دقت مشکوک نہیں ہوتی۔ کیونکہ اس آدی سے پہلے ہی حضور ﷺ کو وہ آیات یاد تھیں نیز کتابت ان وحی کو لکھوا بھی دی تھیں اور لوگوں کو بھی پہنچادی تھیں انہوں نے ان آیات کو یاد بھی کر لیا تھا، ان ہی میں سے مذکورہ روایات میں وہ آدی (عباد بن بشر) بھی ہیں جسے وہ آیات یاد تھیں۔ مذکورہ حدیث میں ایسی کوئی بات بھی نہیں ہے جس سے پتہ چلے کہ وہ آیات کا تہان وحی کے تحریر کردہ مجموعہ میں محفوظ نہیں تھیں اور نہ ہی اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تمام اصحاب رسول ﷺ ان آیات کو بھول گئے تھے کہ ان کے ضیاع کا اندیشہ پیدا ہونے لگے، مصحف امام کے لکھوانے اور جمع کرتے وقت ان آیات کے سقوط اور حذف کا احتمال پیدا ہو جائے! جیسا کہ انکل سے کام لینے والے لوگ، الزام تراشی کرتے ہیں، بلکہ خود مذکورہ روایت سے صراحت کے ساتھ یہ امر ثابت ہوتا ہے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم میں ایسے حضرات بھی موجود تھے جو ان آیات کو پڑھتے تھے اور رسول کریم ﷺ ان سے وہ آیات سنا کرتے تھے۔

علاوہ ازیں جمع قرآن کا طریق کار خود اس بات کا مؤید ہے کیوں کہ ان صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے مصحف میں وہی آیات لکھی تھیں جن کے حفظ اور کتابت اور قرآنیہ پر سب کا اجماع ہو گیا تھا، ان ہی میں مذکورہ آیات بھی ہیں جن پر ساری بحث و کلام کا مدار ہے۔ اس موقع پر دو امور پیش نظر رہنا ضروری ہیں:

① بعض روایات میں جو لفظ ”أَنْسَقَطُوهُنَّ“ آیا ہے اس کا معنی ہے کہ میں نے ان آیات کو نسیاناً ساقط اور حذف کر دیا، جیسا کہ دوسری روایت میں خود لفظ ”أَنْسَقَطُوهُنَّ“ بھی وارد ہے، یہ بات ناممکن ہے کہ اس سے مراد قصداً ساقط کرنا لیا جائے، اس لیے کہ رسول کریم ﷺ کی شان اقدس سے یہ بعید تر ہے اور معقول بھی نہیں ہے کہ آنحضور ﷺ اپنی جانب سے قرآن میں کوئی کمی بیشی فرمائیں ورنہ (نعمو باللہ) آپ کا خائن ہونا لازم آئے گا وہ بھی بہت بڑی خیانت! اور پھر خائن شخص، رسول ﷺ اور پیغمبر بھی نہیں ہو سکتا۔

یہ تو خواہش نفس سے خالی عقلی حکم ہے، نقلی حکم بھی یہی ہے، اللہ تعالیٰ اپنی کتاب میں فرماتے ہیں:

﴿إِنَّا نَحْنُ نُزَلِّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَفِظُونَ﴾ (الحجر: ۹)

”بیشک یہ (کتاب) نصیحت ہم ہی نے اتاری ہے اور ہم ہی اس کے نگہبان ہیں۔“  
نیز فرماتے ہیں:

﴿قُلْ مَا يَكُونُ لِي أَنْ أَدِينَهُ مِنْ تِلْكَ آيَاتِنَا نَفْسِي ۚ إِنَّ آتِيجُ إِلَّا مَا يُوْحَىٰ إِلَيَّ ۚ إِنِّي أَخَافُ إِنْ عَصَيْتُ رَبِّي عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيمٍ﴾ (یونس: ۱۵)

”کہہ دو کہ مجھ کو اختیار نہیں ہے کہ اسے اپنی طرف سے بدل دوں۔ میں تو اسی حکم کا تابع ہوں جو میری طرف آتا ہے۔ اگر میں اپنے پروردگار کی نارمانی کروں تو مجھے بڑے (سخت) دن کے عذاب سے خوف آتا ہے۔“

② مذکورہ حدیث کی روایات سے یہ بات معلوم اور مستفاد نہیں ہوتی کہ یہ آیات جنہیں رسول اللہ ﷺ نے عباد بن بشر سے سنا تھا

آپ ﷺ کے ذہن شریف سے بالکل محو ہو گئی تھیں، زیادہ سے زیادہ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ آیات آنحضور ﷺ کے ذہن میں موجود نہ ہیں پھر عباد کے پڑھنے پر یاد آگئیں۔ کسی چیز کا ذہن سے غائب ہو جانا یا کسی چیز کے بارے ذہن کا غافل ہو جانا اس کو ساقط یا محو کرنا نہیں کہلاتا۔ جس کی دلیل یہ ہے کہ جب حافظ کا ذہن کسی دوسری چیز میں مشغول ہوتا ہے تو کوئی آیت وغیرہ اس کے ذہن سے غائب ہو سکتی ہے، اور اسے اس وقت یقین ہوتا ہے کہ اس کے حافظے میں وہ اس طرح سے محفوظ ہے کہ جب اس کا کوئی داعیہ پایا جائے گا تو وہ اس کو محض کر لے گا اور پھر اسے پڑھ بھی لے گا۔ البتہ ایسا مکمل نسیان جو حافظہ سے کسی چیز کے محو ہونے کے مترادف ہو حضور ﷺ کے بارے میں اس کے محال اور ناممکن ہونے پر دلیل موجود ہے کہ ایسا نسیان رسالت تبلیغ کی ذمہ داری میں خلل انداز ہونے کی وجہ سے آنحضور ﷺ کے لیے محال ہے، جب حضور ﷺ کو کوئی نسیان پیش آتا تو وہ گرام کے موسم کے بادل کی طرح ہوتا جو ختم ہونے کے لیے آتا تھا، اور اس میں کوئی شک نہیں آنحضور ﷺ کا اس موقع پر نسیان کا پیش آنا اپنی ذمہ داری کے ادا کر دینے لوگوں تک ان آیات کے پہنچا دینے اور پھر لوگوں کے ان کو یاد کر لینے کے بعد پیش آیا، ایسا نسیان ہرگز رسالت و تبلیغ کے امور میں خلل انداز نہیں ہوتا۔

علامہ بدر الدین العینی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی شرح صحیح البخاری میں باب نسیان القرآن میں لکھا ہے کہ:

”جمہور اہل علم کہتے ہیں کہ حضور ﷺ پر نسیان کا پیش آنا ان امور میں جس کا تعلق احکام کی تبلیغ و تعلیم سے نہ ہو جائز ہے، بشرطیکہ آپ ﷺ کو اس پر قائم نہ رکھا جائے بلکہ ضروری ہے کہ آپ ﷺ کو اس کی یاد دہانی کرائی جائے، اور نسیان اس کے علاوہ ہو وہ تبلیغ احکام سے قبل پیش نہیں آ سکتا، اور جس امر کو حضور ﷺ نے آگے پہنچا دیا ہو اس کا نسیان جیسا کہ اس حدیث میں ہے، وہ بغیر کسی اختلاف کے جائز ہے۔“

اس کتاب کی پہلی طباعت میں میں نے اس روایت کو بعض مصنفین کی اجابح میں موضوع کہا تھا، لیکن نظر ثانی اور بعض اہل علم و فطانت کے متنبہ کرنے کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ مذکورہ حدیث صحیح درجہ کی ہے۔ شیخین نے اسے روایت کیا ہے۔ چنانچہ صحیح البخاری میں ہشام بن عروہ عن عائشہ رضی اللہ عنہا مروی ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ:

”نبی کریم ﷺ نے مسجد میں ایک شخص کو (قرآن) پڑھتے ہوئے سنا تو فرمایا: اللہ اس پر رحمت فرمائے کہ اس نے مجھے فلاں سورت کی فلاں آیات یاد دلا دی۔“

ایک دوسری روایت میں امام بخاری نے یہ اضافہ بھی ذکر کیا ہے کہ:

”اور فرمایا کہ میں نے تو فلاں فلاں سورت سے ان آیات کو ساقط کر دیا تھا۔“ ①

صحیح مسلم میں بھی ہشام اپنے والد سے وہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے نقل کرتے ہیں کہ: حضور نبی کریم ﷺ نے ایک شخص کو رات

کے وقت پڑھتے ہوئے سنا تو فرمایا:

”اللہ اس پر اپنی رحمت فرمائے! اس نے مجھے فلاں فلاں آیت یاد دلا دی جسے میں فلاں فلاں سورت سے ساقط کر چکا تھا۔“ ②

① البخاری، کتاب الشہادات، باب ۱۱

② صحیح مسلم، کتاب صلاة المسافرين حدیث ۲۲۴

امام نووی رحمۃ اللہ علیہ اپنی کتاب ”العیان فی آداب حملۃ القرآن“ میں لکھتے ہیں کہ:  
 ”صحیحین میں بھی یہ موجود ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرمائی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک آدمی کو پڑھتے ہوئے سنا تو فرمایا:  
 اللہ اس پر رحم فرمائے، اس نے مجھے ایک آیت یاد دلا دی جس کو میں ساقط کر چکا تھا۔“  
 اور صحیح کی ایک روایت میں ”كنت أنسىتها“ کے الفاظ ہیں کہ جو مجھے بھلا دی گئی تھی۔

سبحان ربی! ﴿لَا يَصِلُ رَبِّي وَلَا يَنْسَى﴾ (طہ: ۵۲)

② باقی رہا ان کا دوسرا استدلال یعنی: اللہ تعالیٰ کی اس فرمان: ﴿سَنُقَرِّئُكَ فَلَا تَنْسَى﴾ (الاعلیٰ: ۷۶) میں استثناء کے ذکر سے استدلال کرنا تو یہی ہے ان کے زعم کو ثابت نہیں کرتا کیونکہ یہ حقیقی استثناء نہیں ہے بلکہ صوری استثناء ہے، اور اس کی حکمت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو اس بات کی تعلیم دینا چاہتا ہے کہ میں نے ﴿فَلَا تَنْسَى﴾ میں جو عدم نسیان کا وعدہ اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا ہے وہ محض میرا فضل و احسان ہے، اگر میں چاہوں تو بھلا بھی سکتا ہوں۔ پھر اس صوری استثناء میں دو فائدے ہیں:

① اس کا ایک فائدہ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے متعلق ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہمہ وقت یہ بات یاد رکھیں کہ وہ اللہ کی نعمت و فضل کے حق دار رہیں گے جب تک کہ قرآن کو یاد رکھیں گے، اسے بھولیں گے نہیں۔

② دوسرا فائدہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت سے متعلق ہے کہ امت بھی جان لے کہ ان کے جس نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے خصائص اور عطایا سے نوازا ہے وہ اس کی وجہ سے دائرہ عبودیت سے باہر نہیں ہو گئے، لہذا ان نصاریٰ کی طرح کسی فتنہ میں مبتلا نہ ہو جائیں جو اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں مبتلائے فتنہ ہوئے۔ اور اس بات کی دلیل کہ مذکورہ استثناء حقیقی نہیں بلکہ صوری ہے۔ دو امور ہیں:

① ان آیات کا شان نزول اس پر دال ہے، وہ یہ ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو کثرت تلاوت قرآن سے تھکا دیا کرتے تھے نزول وحی کے وقت، اس ڈر سے کہ کہیں بھول نہ جائیں یا کوئی حصہ قرآن کا چھوٹ نہ جائے، چنانچہ اللہ کی رحمت اس بات کی متقاضی ہوئی کہ اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کو اس حوالے سے تسلی دیدیں اور اس مشقت سے نکال کر راحت پہنچائیں اس پر مذکورہ آیت اتری، جیسا کہ یہ آیات نازل ہوئی تھیں:

﴿لَا تَحْزَنْ بِهِ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهِ ۗ إِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهُ وَقُرْآنَهُ﴾ (التیلہ: ۱۷، ۱۶)

”اور (اے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) وحی کے پڑھنے کیلئے اپنی زبان نہ چلایا کرو کہ اسکو جلد یاد کرلو۔ اسکا جمع کرنا اور پڑھانا ہمارے ذمہ ہے۔“

نیز یہ آیت نازل ہوئی:

﴿وَلَا تَعْجَلْ بِالْقُرْآنِ مِنْ قَبْلِ أَنْ يُقْضَىٰ إِلَيْكَ وَحْيُهُ ۗ وَقُلْ رَبِّ زِدْنِي عِلْمًا﴾ (طہ: ۱۱۳)

”اور قرآن کی وحی جو تمہاری طرف بھیجی جاتی ہے اس کے پورا ہونے سے پہلے قرآن کے (پڑھنے کے) لئے جلدی نہ کیا

کر اور دعا کرو کہ میرا پروردگار مجھے اور زیادہ علم دے۔“

① آیت مذکورہ کے جزد ﴿إِلَّا مَا شَاءَ اللَّهُ﴾ میں وقوع نسیان کو مشیت الہی پر موقوف کیا گیا ہے اور مشیت الہی وقوع پذیر نہیں ہوئی جس کی دلیل مزر جکی کہ ﴿إِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهُ وَقُرْآنَهُ﴾ (العنقید: ۱۶، ۱۷) جب ایسا ہے تو نسیان بھی واقع نہیں ہوا۔ کیونکہ معلق علیہ کا عدم حصول، معلق کے عدم حصول کو مستزہم ہوتا ہے، جو شخص اسالیب لغت کا ذوق رکھتا ہو اور جس کی نظر وجوہ اولہ پر ہو اسے اس بات میں ذرا بھی تردد نہ ہوگا کہ مذکورہ آیت دراصل اللہ کی طرف سے تاکید و وعدہ پر مشتمل ہے کہ رسول ﷺ کو اللہ خود پڑھادیں گے۔ تو وہ کبھی نہ بھولیں گے یہ وعدہ ابدی طور پر ہے کہ کسی بھی وقت اس میں حقیقی استثناء نہیں ہے۔ بصورت دیگر مذکورہ آیت، حضور ﷺ کے لیے باعث تسلی کیسے ہو سکتی ہے، نیز ان آیات کا نزول بھی عبث اور لغو کلام کے مشابہ ہو جائے گا۔ علامہ شیخ محمد عبدہ مرحوم مذکورہ آیت میں استثناء کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”چونکہ یہ وعدہ ربانی لزوم اور ابدی قسم کا تھا تو ممکن تھا کہ یہ وہم ہوتا کہ اللہ کی قدرت اس کے غیر کو شامل نہیں ہے اور یہ امر اس کے ارادے سے خارج ہوگا اس لیے استثناء کے انداز میں فرمایا: ﴿إِلَّا مَا شَاءَ اللَّهُ﴾ مطلب یہ ہوا کہ جب وہ ذات آپ ﷺ کو کوئی بات بھلانا چاہے گی تو کوئی چیز اس کو بے بس نہیں کر سکتی، تو اصل مقصد ہے نسیان کی بالکل نفی کرنا، اہل علم کہتے ہیں کہ: یہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص اپنے صاحب سے کہتا ہے: ”انت سہمی فیما املکت إلا ما شاء اللہ“ یعنی تو میرا حصہ دار ہے اس چیز میں جس کا میں مالک ہوں مگر جو اللہ چاہے تو اس کا مقصد کسی چیز کا استثناء کرنا نہیں ہوتا، یہ دراصل قلت کوئی کے معنی میں استعمال کرتا ہے۔ اسی طرز پر یہ ارشاد الہی بھی ہے:

﴿وَأَمَّا الَّذِينَ سَعِدُوا فإِنَّهُمْ فِيهَا مَا كَادَ اصْبِحُونَ السَّمُوتُ وَالْأَرْضُ إِلَّا مَا شَاءَ رَبُّكَ عَطَاءٌ غَيْرُ مَجْذُوبٍ﴾ (مور: ۱۰۸)

”اور جو نیک بخت ہوں گے وہ بہشت میں (داخل کئے جائیں گے اور) جب تک آسمان اور زمین ہیں ہمیشہ اس میں رہیں گے۔ مگر جتنا تمہارا پروردگار چاہے۔ کہ خدا کی بخشش ہے جو کبھی منقطع نہیں ہوگی۔“

اس طرح کا استثناء اس بات پر تنبیہ کے لیے ہوتا ہے کہ اگر وہ ذات اپنی عطا کردہ چیز کو سلب کرنا چاہے تو کوئی چیز اسے روک نہیں سکتی۔ اور جو یہ بات آتی ہے کہ حضور ﷺ اپنی کوئی بات جو آپ ﷺ کو یاد تھی بھول گئے تھے۔ اگر تو یہ بات درست ہے تو اس کا تعلق اس قرآن اور احکام سے نہیں ہے جو اللہ تعالیٰ نے نازل فرمایا ہے جس کی تبلیغ کا آپ ﷺ کو حکم دیا گیا تھا، اس کے علاوہ جو بات بھی کہی جاتی ہے وہ اصل میں لحدین کی کارستانیوں ہیں جس سے غافل لوگوں کی عقلیں متاثر ہوئیں چنانچہ انہوں نے اس چیز کو ٹوٹ کر دیا جسے اللہ نے پاکیزہ بنایا تھا، لہذا جو شخص صاحب شریعت ﷺ کی عظمت سے واقف ہے تو وہ اللہ کی کتاب پر ایمان رکھتا ہے اس کے لیے یہ بات نامناسب ہے کہ وہ ایسی کسی بات کو اس سے متعلق قرار دے۔“

استثناء کے معنی و مفہوم کے سلسلہ میں یہ ایک رائے ہے، یہاں ایک اور توجیہ بھی ہے، اور وہ یہ ہے کہ یہ استثناء حقیقی ہے، لیکن اس سے منسوخ التلاوة حصہ مراد ہے نہ کہ دوسرا کوئی حصہ۔ آیت مذکورہ کا مطلب یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ اپنے پیغمبر ﷺ کو پڑھادیں گے

﴿مناہل العرفان فی علوم القرآن: جلد ۱﴾  
 تو وہ اسے نہیں بھولیں گے مگر جسے وہ چاہے یعنی جس کی تلاوت منسوخ کر دی جائے کسی حکمت کی بناء پر جیسا کہ علماء نے نسخ کی بحث میں اس کی حکمتیں بیان کی ہیں۔

اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے:

﴿مَا نُنسخ مِنْ آيَةٍ أَوْ نُنسِهَا نَأْتِ بِخَيْرٍ مِمَّنْهَا أَوْ مِثْلَهَا﴾ (البقرہ: ۱۰۶)

”ہم جس آیت کو منسوخ کر دیتے یا اسے فراموش کر دیتے ہیں تو اس سے بہتر یا ویسی ہی اور آیت بھیج دیتے ہیں۔“

ایک قراءت میں یوں ہے:

﴿مَا نُنسِكُ مِنْ آيَةٍ أَوْ نُنسِخُهَا﴾ مطلب یہ ہوا کہ ہم جس آیت کو بھی اپنی حکمت و مصلحت کے تقاضے کے مطابق لے جاتے ہیں صرف الفاظ یا صرف حکم یا دونوں کو ختم کر کے اور اس کی جگہ کوئی اور آیت لے آتے ہیں یا اس کے بدلے کوئی نہیں لاتے، ﴿نَأْتِ بِخَيْرٍ مِمَّنْهَا﴾ تو اس سے بہتر یعنی ایک اور نوع کی آیت لے آتے ہیں جو منسوخ شدہ آیت کے مقابلے میں حال و موقع کے مناسب بھی ہوتی ہے اور اجر و ثواب میں بھی بندوں کے لیے زیادہ بہتر ہوتی ہے، نیز ہمزہ کو الف سے بدل کر بھی (او مغلھا) پڑھا گیا ہے۔ نفع و ثواب میں اس کے مثل ہوتی ہے۔

بہر حال! مذکورہ آیت: ﴿سَنُنْفِثُكَ وَلَا تَسْتَسِي﴾ (الاعلیٰ: ۷۰) میں استثناء کا جو بھی مفہوم لیا جائے اس سے یہ بات معلوم نہیں ہوتی کہ پیغمبر ﷺ کوئی ایک حرف بھی اس کلام کا بھول گئے ہوں جس کی تلاوت اور مخلوق کو اس کی تبلیغ کا حکم دیا گیا ہو اور جس کی قراءت اور بلاغ جس کی قراءت پر بقائے شریعت کا آپ ﷺ کو حکم دیا گیا تھا۔

اور یہ اس بناء پر کہ ”نسیان“ سے مکمل طور پر حافظے سے محو ہونا مراد ہو، اگر اس سے ذہن سے کوئی چیز غائب ہو جانا مراد ہو تو ابھی اس سے پہلے اس پر بات ہو گئی ہے۔

یہ بات آپ کے خیال میں بھی نہ آئے کہ پیغمبر ﷺ کا سہو یا نسیان اس کے مقام و مرتبہ پر اثر انداز ہوتا ہے! کیونکہ یہ سہو و نسیان کے دوامی ایک حد تک تو قابل تعریف ہیں۔ جیسا کہ ایک شاعر کہتا ہے:

يا سائلني عن رسول الله كيف سها  
 والسهو من كل قلب غافل لا هي  
 سها عن كل شيء ء شرها فسها  
 عما سوى الله فالتعظيم لله

”اے وہ شخص جو رسول اللہ ﷺ کے سہو کے بارے میں پوچھتا ہے کہ آپ ﷺ کو کیسے سہو ہوا؟ سہو و نسیان تو غافل اور لا پرواہ کو ہوا کرتا ہے، آپ ﷺ کا دل اللہ کے سوا ہر چیز کو بھول چکا تھا، لہذا اللہ کی ذات تعظیم کی حقدار ہے۔“

ان حضرات کا تیسرا اور چوتھا استدلال کہ بعض صحابہ رضی اللہ عنہم نے مصلحت کے خیال سے جمع کردہ قرآن کا کچھ حصہ حذف کر دیا تھا، آیت متعہ اور صیغہ قنوت بھی اس میں شامل تھا! یہ استدلال بھی بے بنیاد ہے، جبکہ اس کے مقابلے میں صحیح اور کثیر نصوص اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم تو قرآن کی احتیاط کے معاملہ میں بہت زیادہ فکر مند رہتے تھے، قرآن کی حفاظت اور اس کے تحفظ کے بارے میں سب سے زیادہ ہوشیار تھے اس لیے انہوں نے تو اترا سے ثابت شدہ حصے کو ہی قرآن میں شام کیا اور



## منائل العسرفان فی علوم القرآن: جلد ۱

جو حصہ تو اتر سے ثابت نہ ہوا اسے چھوڑ دیا کیونکہ وہ قطعی نہ تھا، ان کا دین بھی اور عقل بھی انہیں اس بات پر آمادہ نہیں کرتی تھی کہ وہ ایک غیر قطعی چیز کی قرآنیت کے قائل ہوں۔ یہ بات پہلے گزر چکی ہے کہ انہوں نے عہد صدیقی اور عہد عثمانی میں مصحف کی کتابت کے دوران بہت سے مضبوط دساتیر لکھے تھے۔ اگر آپ چاہیں تو ان کو ملاحظہ کر سکتے ہیں تاکہ آپ کو پتہ چلے کہ وہ لوگ کس قدر ضلالت و گمراہی سے بچنے والے تھے۔

یہ لوگ جو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر کتاب اللہ کے بارے میں طعن و الزام لگاتے ہیں کہ انہوں نے کتاب اللہ کا وہ حصہ حذف کر دیا جو کہ غیر متواتر تھا یا عرضہ اخیرہ (آخری دور) کے موقع پر موجود نہ تھا یا جو حصہ منسوخ التلاوة تھا اور جن کو اس کے نسخ کی خبر نہ ہوئی وہ اس کو پڑھتا تھا، ہم کہتے ہیں کہ ایسے لوگ جو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر طعن زنی کرتے ہیں اور قرآن کے معاملہ میں اس طرح کی باتیں کرتے ہیں انہیں چاہیے کہ اپنے آپ کو الزام دیں اور خود کو سبکی سے بچائیں، کیونکہ مسلمان تو ہمیشہ سے معزز رہے ہیں کہ کتاب اللہ کے بارے میں بغیر علم کے کچھ نہیں کہتے، جب تک کوئی قطعی حجت موجود نہیں ہوتی کوئی بات کتاب اللہ کی طرف منسوب نہیں کرتے، ان کی طرح قرآن کے ساتھ بھی تحریف شدہ کتب یا تبدیل کردہ اناجیل جیسا سلوک نہیں کرتے۔ ہم ان کو وہ بات یاد دلاتے ہیں جسے وہ بار بار ہرایا کرتے ہیں کہ: ”جس کا اپنا گھر شیشہ کا ہو وہ دوسروں پر پتھر نہ مارے۔“

اس موضوع کے بارے میں فیصلہ کن بات یہ ہے کہ جس آیت متعہ اور صیغہ قنوت کا یہ دعویٰ کرتے ہیں اور ان سے استدلال کرتے ہیں ان کا قرآن ہوتا ثابت نہیں ہے۔ کہ یہ دونوں چیزیں بھی قرآن کا حصہ قرار دی جائیں (ایسا نہیں ہے) اگر ان کو ان کی قرآنیت کا دعویٰ ہے تو پھر فرمان الہی: ﴿قُلْ هَاتُوا بُرْهَانَكُمْ﴾ (البقرہ: ۱۱۱) کے تحت ان کے ذمہ اس کا ثبوت فراہم کرنا لازم ہوگا۔

صاحب ”الانصار“ لکھتے ہیں: ”کلام قنوت جو منقول ہے کہ حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نے اپنے مصحف میں اس کو لکھا تھا، اس سے اس کا قرآن منزل ہونا ثابت نہیں ہوتا۔ بلکہ وہ دعایٰ ایک قسم تھی، اگر بالفرض وہ قرآن ہوتا تو لازمی بات ہے کہ قرآن کی طرح ہم تک ضرور اسے نقل کیا جاتا اور اس کی صحت کا قطعی علم ہوتا، پھر وہ فرماتے ہیں کہ اس بات کا بھی امکان ہے کہ وہ پہلے قرآن کا حصہ ہو پھر اسے منسوخ کر کے صرف اس کو دعایٰ کے طور پر پڑھنے کی اجازت دے دی گئی ہو اور اسے اس حصہ کے ساتھ خلط ملط کر دیا گیا ہو جو قرآن نہیں ہے۔ حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے تو صحیح روایت کے مطابق جو بات مروی ہے، وہ یہ ہے کہ انہوں نے اپنے مصحف میں کچھ دعایٰ یا تفسیری حصہ لکھ لیا تھا جو حقیقت میں قرآن کا جزو نہیں تھا۔“

یہ دعویٰ ہی قنوت ہے جسے علمائے حنفیہ نے اخذ کیا ہے۔ بعض حضرات نے ذکر کیا ہے کہ حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نے اسے اپنے مصحف میں اس کو ثبت کیا تھا اور اس کا نام سورۃ الطلحہ والحقد رکھا تھا، کیونکہ اس میں یہ دو الفاظ مذکور ہوئے ہیں۔ آپ اس توجیہ سے واقف ہو چکے ہیں۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جو خاص اپنے لیے مصاحف لکھا کرتے تھے وہ بسا اوقات ان مصاحف میں قرآن کے بعض معانی یا تفسیری کلمات بھی لکھ لیتے تھے جو دراصل قرآن کا جزو نہ ہوتے تھے یا چند دعایٰ لکھ لیتے تھے جو دراصل قرآن کا جزو نہ ہوتے تھے یا چند دعایٰ لکھ لیتے تھے جو قرآنی دعایٰ کی طرح ہوتی تھیں یعنی جن کا نماز میں قنوت کے وقت پڑھنا

## منامیل العسرفان فی علوم القرآن: جلد ۱

درست ہوتا، اور انہیں اس بات کا پورا علم ہوتا تھا کہ یہ چیزیں قرآن کا جزو نہیں ہیں، لیکن کتابت کا سامان دستیاب نہ ہونے اور صرف اپنے لیے قرآن کے لکھنے کی وجہ سے وہ ایسا کرتے تھے۔ کیونکہ انہیں اپنے بارے میں قرآن کے التباس و اشتباہ سے پوری طرح اطمینان حاصل تھا، مگر بعض کوتاہ بین قسم کے لوگ سمجھنے لگے کہ انہوں نے مصاحف میں جو کچھ بھی لکھا ہے وہ محض اس لیے لکھا ہے کہ یہ قرآن ہے حالانکہ حقیقت حال ایسی نہیں ہے۔ بلکہ حقیقت وہی تھی جو ابھی آپ ﷺ کو معلوم ہوئی۔

علاوہ ازیں حضور نبی کریم ﷺ کی مبارک زندگی میں ایک وقت ایسا بھی آیا ہے کہ آپ ﷺ نے غیر قرآن کی کتابت سے منع فرما دیا تھا، جیسا کہ امام مسلم رحمہ اللہ روایت کرتے ہیں کہ:

”میری باتیں نہ لکھا کرو اور جس نے قرآن کے سوا میری کوئی بات لکھی ہو اسے چاہیے کہ اسے مٹا دے۔“

یہ سب اس وقت تک تھا۔ جب قرآن کا دیگر کلام کے ساتھ التباس و اشتباہ کا اندیشہ موجود تھا۔

۵ ان حضرات کا پانچواں استدلال کہ قرآن کی بہت سی آیات کے تحفظ کا ذریعہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم تھے، بہت سے صحابہ شہید ہو گئے، جو حصہ ان کے پاس محفوظ تھا وہ ان کے ساتھ ہی ضائع ہو گیا!

ان کا استدلال ہمیں تسلیم نہیں، کیونکہ قرآن کا جو حصہ ان شہداء اور قراء کو یاد تھا اور ان کے سینوں میں محفوظ تھا وہ صرف ان ہی کے پاس محفوظ نہیں تھا بلکہ جو صحابہ زندہ تھے اور شہید نہیں ہوئے وہ بھی اس حصہ کو محفوظ رکھے ہوئے تھے، جس کی دلیل حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا فرمان ہے:

”مجھے خدشہ ہے کہ تمام علاقوں سے قراء کرام وفات نہ پا جائیں۔“

اس کا صاف مطلب یہی ہے کہ سب کے سب فوت نہیں ہو گئے تھے، اصل مسئلہ صرف خوف و اندیشہ کا تھا۔ نیز یہ بات بھی سب جانتے ہیں کہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ بھی، حضرت عمر رضی اللہ عنہ، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ، حضرت علی رضی اللہ عنہ، حضرت زید بن ثابت اور دیگر بہت سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بھی قرآن کے حافظ تھے، نیز یہ سب حضرات جمع قرآن کی تکمیل تک زندہ رہے ان کی زندگی میں ہی قرآن کو مختلف مصاحف میں نقل کیا گیا ہے، حضرت زید رضی اللہ عنہ نے مکمل قرآن لکھا تھا، کوئی لفظ بلکہ حرف بھی نہیں چھوڑا۔ حتیٰ کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم خود اس بات کی توثیق کرتے تھے کہ جمع قرآن کے سلسلہ میں حفظ اور کتابت دونوں پر اعتماد کیا جائے، صرف ایک چیز پر نہیں۔ اور پھر کتابت میں بھی وہ اس بات کو یقینی بناتے کہ یہ حصہ، حضور ﷺ کے سامنے لکھا گیا ہے۔ اور اس پر باقاعدہ دو گواہ طلب کیے جاتے تھے۔ جیسا کہ اس کی وضاحت پہلے ہو چکی ہے۔

۶ ان حضرات کا چھٹا استدلال کہ ہڈیوں پر لکھا ہوا قرآن کا حصہ منظم طور پر نہیں تھا اور منضبط طریقے پر موجود نہیں تھا۔ اس استدلال کو وہ بات مخدوش کر دیتی ہے جو جمع قرآن کے بارے میں ابھی ہم نے بیان کی ہے کہ قرآن کی آیات توثیقی ہیں، اور حضور ﷺ کا تباہ و جی کو ہدایت دیا کرتے تھے کہ یہ آیت فلاں سورت کی فلاں جگہ پر لکھ دو، نیز آپ ﷺ اپنے اصحاب رضی اللہ عنہم کو بھی اسی ترتیب کے مطابق پڑھایا کرتے تھے اور تمام لوگ اسے یاد بھی کرتے تھے اور کمزور حافظے والے اسی طرز پر اپنے لیے لکھ لیتے تھے، یہاں تک کہ قرآن کی ترتیب اور اس کی آیات کا نظم و ضبط حفظ و کتابت دونوں اعتبار سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے درمیان معروف ہو چکا تھا۔ جو حصہ رسول اللہ ﷺ کے سامنے لکھا گیا تھا اس کو قرآن کی شکل میں ہر چڑے اور ہڈی پر بھی اسی



طرح مرتب صورت میں پایا، اگرچہ وہ ہڈیاں اور چمڑے وغیرہ منتشر اور بکھرے ہوئے ہوتے تھے۔

اس کے علاوہ ہم کئی بار یہ بات کر چکے ہیں کہ (جمع قرآن کے سلسلہ میں) اعتقاد صرف تحریر پر نہیں تھا بلکہ اس کے ساتھ حفظ و تعلیم پر بھی تھا۔ یقینی بات ہے کہ حفظ و کتابت دونوں کو ملحوظ رکھنا قرآنی آیات کے منظم و مرتب اور منضبط ہونے کی ضمانت دیتا ہے۔ باقی اس استدلال کے ذیل میں ان کا یہ کہنا کہ آیات قرآن کا کچھ حصہ ضائع ہو گیا تھا! اس بارے میں بظاہر ان کا اعتقاد اس منقول بات پر ہے کہ سورۃ برآة کے آخر سے ایک آیت دستیاب نہیں ہو رہی تھی پھر وہ خزیمہ بن ثابت رضی اللہ عنہما کے پاس ملی۔ اس سے انہوں نے سمجھا کہ شاید یہ ہماری طرف سے اس بات کا اعتراف ہے کہ لکھے ہوئے قرآن کا کچھ حصہ ضائع ہو چکا تھا!

حالانکہ بات ایسی نہیں جیسی انہوں نے سمجھی، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم کو وہ آیت صرف حضرت خزیمہ رضی اللہ عنہ کے پاس مکتوب حالت میں ملی جبکہ دیگر تمام آیات متعدد صحابہ رضی اللہ عنہم کے پاس مکتوب حالت میں موجود تھیں۔ کیونکہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اس آیت کو پڑھتے بھی تھے، یاد بھی کرتے تھے، اچھی طرح اس سے واقف بھی تھے، جس کی دلیل ان کا یہ قول ہے: ”ایک آیت نہیں مل رہی تھی۔“ کیونکہ اگر ایسی بات تھی جیسے تم کہتے ہو تو انہیں یہ کیسے معلوم ہوا کہ یہ آیت لکھنے سے رہ گئی ہے، اگر انہیں وہ آیت یاد نہیں تھی؟ نیز ان حضرات کا اس استدلال کے ذیل میں یہ بات کہنا کہ! بعض حصے کے ضائع ہونے کے سبب ہی بعض صحابہ رضی اللہ عنہم کو نسخ آیات کا دعویٰ کرنا پڑا۔ یہ ان کا عجیب قسم کا دعویٰ ہے، یہ بے بنیاد بات ہے، اس کا مقصد نسخ کا انکار اور اس کو مطعون کرنا ہے۔ عنقریب نسخ اور اس کی حکمت پر تفصیلی گفتگو آ رہی ہے اور ان شاء اللہ مخصوص بحث کے تحت اس بارے میں شہادت اور ان کے جوابات بھی ذکر کیے جائیں گے۔

⑥ ان حضرات کا ساتواں استدلال یعنی کہ حجاج کی طرف جو بات انہوں نے منسوب کی ہے۔ وہ بالکل جھوٹی ہے، اس پر کوئی دلیل موجود نہیں ہے۔ تاریخ سے کوئی ثبوت پیش کیا جائے کہ حجاج نے قرآن میں کمی بیشی کرنا تو دور کی بات ہے اس کا مصاحف کو جمع کرنے کا ثبوت بھی پیش نہیں کر سکتے۔

اگر یہ بات ہوتی، حجاج نے ایسا کوئی کام کیا ہوتا تو ہم تک ضرور متواتر طور پر یہ بات پہنچتی، کیونکہ ایسی باتیں تو اتار سے نقل ہوا کرتی ہیں اس کے دوامی و اسباب کثرت سے موجود ہوتے ہیں، بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ حجاج نے ایسا کوئی کام کیا ہو ساری امت اس قرآن کا اقرار کرتی ہے اور اس کے دور میں حسن بصری جیسے ائمہ دین موجود تھے وہ بھلا کیسے خاموش رہ سکتے تھے، وہ کیسے نکیر نہ کرتے اور دفاع نہ کرتے اور پھر ان کو نقل کا مطالبہ نہ کیا جاتا۔ یہ محض الزام و بہتان ہے۔ علاوہ ازیں حجاج بن یوسف تو محض ایک اسلامی علاقے کا گورنر تھا وہ کیسے مصاحف کو جمع کر کے انہیں نذر آتش کر سکتا ہے۔

اگر ہم فرض کر لیں کہ حجاج کو ایسی شان و شوکت حاصل تھی کہ اس زمانے کے تمام لوگ اسلام اور قرآن کے بارے میں اس عظیم حادثے کے متعلق خاموش رہے تو پھر حجاج کے زمانے کے بعد کس چیز نے مسلمانوں کو خاموش کر دیا تھا؟ اگر حجاج میں اس بات کی طاقت تھی کہ قرآن میں جیسے چاہے کمی بیشی کر کے اس کو کھلواڑ بنائے تو حفاظ کے دلوں میں جو قرآن موجود تھا اس پر اس کا تسلط کیونکر ممکن تھا! وہ بھی تو اس کے دور میں ہزاروں کی تعداد میں موجود تھے۔ معلوم ہوا کہ یہ سب بے بنیاد دعوے ہیں اس کا بودا پرین خود ان کے الفاظ میں موجود ہے۔ لوگوں کو جہالت و ضلالت میں ڈالنے کے مترادف ہے۔

مسائل العرفان فی علوم القرآن: جلد ①

تیسرا شبہ کی گئی ہے، اس کی دلیل یہ ہے کہ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے معوذتین کو قرآن کا جزو ماننے سے انکار کیا ہے اور قرآن کا بعض حصہ ایسا ہے جو ابوبکر رضی اللہ عنہ اور عمر رضی اللہ عنہ کا کلام ہے۔

اس شبہ کا جواب ① ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے یہ روایت صحیح درجہ کے ساتھ منقول نہیں ہے جس سے تم لوگ استدلال کرتے ہو کہ وہ معوذتین کو قرآن کا حصہ مانتے تھے۔ یہ مسئلہ بہت سی کتب تفسیر و علوم قرآن میں پوری بسط و تفصیل کے ساتھ مع جوابات مذکور ہے۔

اس بارے میں علماء نے جو کچھ فرمایا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ: مسلمانوں کا تو اتر قرآن کے وجوب پر اتفاق ہے۔ لیکن اس پر اس روایت سے اشکال ہوتا ہے جس میں منقول ہے کہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ، فاتحہ اور معوذتین کی قرآنیت کا انکار کرتے تھے۔ بلکہ یہ مروی ہے کہ انہوں نے اپنے مصحف سے معوذتین کو کھرچ دیا تھا یہ خیال کرتے ہوئے کہ معوذتین، قرآن کا حصہ نہیں ہے۔ علماء نے اس کا جواب دیتے ہوئے اس روایت کی صحت سے انکار کیا ہے۔ چنانچہ امام نووی رضی اللہ عنہ شرح المہذب میں لکھتے ہیں: "مسلمانوں کا اس پر اجماع ہے کہ معوذتین اور سورۃ فاتحہ، قرآن کا حصہ ہے، اور جو اس کے کسی حصے کا انکار کرتا ہے وہ کافر ہوگا اور ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے اس بارے جو کچھ منقول ہے وہ بے بنیاد اور غلط ہے۔"

ابن نزم رضی اللہ عنہ "القدرح المعلیٰ" میں لکھتے ہیں: یہ بات ابن مسعود رضی اللہ عنہ پر جھوٹ اور من گھڑت ہے۔ بلکہ خود ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے بھی قراءت عام صحیح سند کے ساتھ منقول ہے اور اس کے اندر معوذتین اور فاتحہ بھی موجود ہے۔ صحیح مسلم میں حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ: "حضور ﷺ نے یہ دونوں سورتیں نماز میں تلاوت فرمائیں۔" ابن حبان رضی اللہ عنہ نے تو ایک دوسری سند سے حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ سے یہ بھی نقل کیا ہے: "اگر تجھ سے ہو سکے کہ نماز میں یہ دونوں پڑھنا نہ چھوٹے تو ضرور ایسا کرو۔" امام احمد رضی اللہ عنہ نے بھی ابوالعلاء بن الخثیر کے طریق سے ایک صحابی رسول ﷺ سے نقل کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ہمیں معوذتین پڑھائیں اور ان صحابی رضی اللہ عنہ نے بھی فرمایا: "جب تم نماز پڑھو تو ان معوذتین کو پڑھا کرو۔" ①

② اس بات کا احتمال موجود ہے کہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا معوذتین اور فاتحہ کا انکار اس کی صحت کے متعلق پہلے تھا، لیکن جب بعد میں ان کی قرآنیت پر اجماع ہو گیا تو ان کا نام بھی ان لوگوں کے سرفہرست آ گیا جو اس بات پر ایمان رکھتے تھے کہ یہ دونوں بھی قرآن کا حصہ ہیں۔

بعض اہل علم کا خیال ہے کہ: "اس بات کا بھی احتمال ہے کہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے خود معوذتین کو حضور ﷺ سے سماعت نہ فرمایا ہو اور ان کے نزدیک معاملہ تو اتر کی حد کو نہ پہنچا ہو اس لیے انہوں نے ان دونوں کے بارے میں توقف اختیار کیا ہو، انہوں نے انکار اس لیے نہیں کیا کہ وہ ابھی اسی بحث و جستجو میں تھے ان پر لازم تھا کہ وہ اس معاملہ میں تحقیق کرتے۔"

شاید اس جواب سے دلوں کو اطمینان اور تسلی حاصل ہو، کیونکہ عاصم کی قراءت جو زرعد بن ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے حوالہ سے منقول ہے اس میں معوذتین اور فاتحہ دونوں موجود ہیں اور یہ قراءت بھی صحیح درجہ کی ہے۔ اور ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے اس کا نقل ہونا بھی

صحیح سند کے ساتھ ہے۔ اسی طرح ابن مسعود رضی اللہ عنہما کا معوذتین کا انکار کرنا ایک ایسے طریق سے مروی ہے کہ ابن حجر رحمہ اللہ نے اس کی تصحیح کی ہے۔ لہذا ان دو روایتوں میں تطبیق دینے کے لیے اس انکار والی روایت کو ابن مسعود رضی اللہ عنہما کی پہلی روایت پر محمول کرنا چاہیے۔

جس طرح حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہما سے معوذتین کی قرآنیت کا انکار منقول ہے اسی طرح فاتحہ کی قرآنیت کا انکار بھی منقول ہے، بلکہ فاتحہ کی قرآنیت کا انکار تو سرے سے بے بنیاد اور گمراہی میں پڑنا ہے، اس لیے کہ سورۃ فاتحہ، ام القرآن اور السبع المثانی ہے یعنی نماز کی ہر رکعت میں اسے پڑھا اور دہرایا جاتا ہے، خواہ کوئی مسلمان مرد ہو یا مسلمان عورت سب اسے نماز میں دہراتے ہیں لہذا یہ بات ناممکن ہے کہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہما سے فاتحہ کی قرآنیت کا معاملہ مخفی ہو، اس کی قرآنیت سے انکار تو بہت بعید ہے۔ زیادہ سے زیادہ جو بات اس بارے میں ان سے منقول ہے وہ یہ ہو سکتی ہے کہ انہوں نے اسے اپنے مصحف میں تحریر نہیں کیا تھا۔ اس سے انکار معلوم نہیں ہوتا ہے۔ ابن قتیبہ رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ”باتی ابن مسعود رضی اللہ عنہما کا فاتحہ کو اپنے مصحف سے ساقط کرنا وہ اس وجہ سے نہ تھا کہ ان کا خیال تھا کہ معاذ اللہ فاتحہ قرآن کا حصہ نہیں ہے، بلکہ ان کا خیال تھا کہ قرآن تو وہ ہے جو حنک و نسیان اور کمی و زیادتی کے خدشے سے دور دو لوحوں کے درمیان لکھا اور جمع کیا گیا ہے۔“

اس کا مطلب یہ ہے کہ ابن مسعود رضی اللہ عنہما کا اپنے مصحف میں فاتحہ کے نہ لکھنے کا واضح سبب یہی تھا کہ یہ قرآن کا حصہ ہے، اور اس کے بارے میں حنک و نسیان اور کمی و زیادتی کا کوئی اندیشہ بھی نہیں ہے۔

④ اگر ہم یہ بات تسلیم کر لیں کہ ابن مسعود رضی اللہ عنہما نے معوذتین کا اور فاتحہ کا بلکہ سارے قرآن کا انکار کیا تھا، تو ان کے انکار سے ہمیں کوئی فرق نہیں پڑتا، کیونکہ اس انکار سے تو قرآن پر کوئی اعتراض وارد نہیں ہوتا اور اس سے وہ علم قطعی بھی ختم نہیں ہوتا جس کی بنیاد پر اس کا تو اثر قائم ہے۔ کیونکہ دنیا میں اس بات کا کوئی بھی قائل نہیں۔ تہ کہ تو اثر اور اس پر بنی علم قطعی دینی کی یہ بھی شرط ہے کہ کوئی ایک بھی اس کا مخالف نہ ہو چاہے وہ کسی شمار میں بھی نہ ہو۔

ابن قتیبہ رحمہ اللہ ”مشکل القرآن“ میں لکھتے ہیں: ”ابن مسعود رضی اللہ عنہما نے گمان کیا کہ معوذتین، قرآن کا جزو نہیں ہے، اس لیے کہ انہوں نے حضور ﷺ کو دیکھا تھا کہ آپ ﷺ ان معوذتین کے ذریعہ حسن بنیو و حسین بنیو کو اللہ کی پناہ میں دیتے تھے تو ان کے خیال میں یہ بات بیٹھ گئی، ہم یہ نہیں کہتے کہ انہوں نے اس بارے میں درست کہا ہے، مہاجرین و انصار سے بھی خطائیں سرزد ہوئی ہیں۔“

⑤ ان معترضین نے یہ جو زعم کیا کہ قرآن کی آیت:

﴿وَمَا مُحَمَّدٌ إِلَّا رَسُولٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ﴾ (آل عمران: ۱۴۳)

”اور محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) تو صرف (خدا کے) پیغمبر ہیں ان سے پہلے بھی بہت پیغمبر ہو گزرے ہیں۔“

اللہ کا کلام نہیں ہے بلکہ ابوبکر رضی اللہ عنہما کا کلام ہے۔ یہ محض باطل اور غلط خیال ہے جس پر کوئی دلیل موجود نہیں ہے۔ روایات صحیحہ میں آتا ہے کہ یہ آیت، غزوۃ احد کے موقع پر نازل ہوئی ہے، اصحاب رسول ﷺ جو خطا سرزد ہو گئی تھی اس پر سرزنش کی گئی تھی یہ اللہ کا کلام ہے، ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہما کا کلام نہیں ہے، اس کی تفصیل یہ ہے کہ جب مسلمان غزوۃ احد میں گرفتار مصیبت ہوئے،



حضور ﷺ کے ربائی دانت مبارک شہید ہوئے، چہرہ مبارک زخمی ہوا، آپ ﷺ کے گھٹنے بھی خندوش ہوئے اور جنگجوؤں میں یہ بات پھیل گئی کہ رسول اللہ ﷺ شہید ہو گئے! اس موقع پر کچھ مسلمان کہنے لگے، کاش! کوئی ہمارا قاصد بن کر عبد اللہ بن ابی کے پاس جائے اور ہمارے لیے ابوسفیان سے امان لے لے، اور کچھ لوگ بے ہمت ہو کر بیٹھ گئے، کچھ منافق لوگ بھی کہنے لگے کہ محمد (ﷺ) اب قتل ہو گئے ہیں لہذا اپنے پہلے والے دین کو اختیار کر لو۔ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کے چچا حضرت انس بن النضر کہنے لگے: ٹھیک ہے، حضور ﷺ شہید ہو گئے لیکن رب محمد ﷺ تو شہید نہیں ہوئے، اور حضور ﷺ کے بعد اب زندہ رہ کر تم کرو گے بھی کیا؟ لہذا جیسے حضور ﷺ دین کی خاطر لڑتے ہوئے چلے گئے تم بھی اسی مقصد کے لیے لڑو اور جس دین پر حضور ﷺ نے وفات فرمائی تم بھی اس پر وفات پاؤ۔ پھر کہنے لگے: اے اللہ! ان مسلمانوں نے جو بات کہی میں آپ سے اس کے بارے معذرت چاہتا ہوں اور منافقین نے جو کچھ کہا میں اس سے براءت کا اظہار کرتا ہوں۔ اس کے بعد انہوں نے اپنی تلوار سونپی اور لڑتے رہے حتیٰ کہ شہید ہو گئے۔

مردی ہے کہ اس دوران جس نے سب سے پہلے رسول اللہ ﷺ کو شناخت کیا وہ کعب بن مالک رضی اللہ عنہ تھے، جیسا کہ مذکور ہے کہ وہ فرماتے ہیں کہ: میں نے خود کے نیچے آپ ﷺ کی آنکھیں چمکتی ہوئی دیکھیں تو میں نے بلند آواز میں پکارا! اے مسلمانوں کی جماعت! خوشخبری سنو! اللہ کے رسول ﷺ یہاں پر باحیث ہیں، چنانچہ آپ ﷺ کے تیس صحابہ رضی اللہ عنہم فوراً اپنے آپ اور آپ ﷺ کا دفاع کرنے لگے پھر حضور ﷺ نے اپنے ساتھیوں کو بھاگ جانے پر ملامت کی، تو وہ کہنے لگے: یا رسول اللہ ﷺ! ہمارے باپ دادا اور ہماری اولاد آپ ﷺ پر قربان! ہمیں آپ ﷺ کے شہید ہونے کی خبر ملی تھی اس سے ہمارے دل مرعوب ہو گئے۔ اور ہم واپس بھاگ اٹھے۔ اس پر یہ آیت اتری:

﴿وَمَا مَحْضِدًا إِلَّا رَسُولٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ﴾ (آل عمران: ۱۴۴)

”اور محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) تو صرف (خدا کے) پیغمبر ہیں ان سے پہلے بھی بہت پیغمبر ہو گزرے ہیں۔“

جو لوگ یہ الزام لگاتے ہیں کہ قرآن میں اس آیت کا اضافہ کیا گیا ہے اور یہ ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کا کلام ہے ان کا بظاہر استدلال حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس قول سے ہے۔ جو انہوں نے وفات رسول ﷺ کے وقت پیش کیا تھا۔ اور ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے مذکورہ آیت کے ذریعہ اس کا جواب دیا تھا اور ان کے قول کی تردید کی تھی، اس سے ان معترضین نے سمجھا کہ مذکورہ آیت اصل میں ابو بکر رضی اللہ عنہ کا کلام ہے۔ حالانکہ یہ بھی رب العزت کا کلام ہے جو اللہ نے وفات رسول ﷺ سے چند سال پہلے نازل فرمایا تھا اور ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ سمیت تمام مسلمان اس آیت سے بھی واقف تھے اور انہیں یہ آیت بھی یاد تھی، البتہ اس موقع پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے اس آیت کا ذہول ہو گیا تھا۔ کیونکہ وفات رسول ﷺ کا صدمہ اور حادثہ بہت شدید تھا، رسول رحمت اور ہادی امت ﷺ کی وفات پر ان کا دل پارہ پارہ ہوتا جا رہا تھا۔

اسی کا اثر تھا کہ رسول اللہ ﷺ کی وفات کے روز حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس آیت سے ذہول کا شکار ہوئے اور اس دن کھڑے ہو کر کہنے لگے: کچھ منافق لوگ خیال کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کی وفات ہو گئی ہے، حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ وہ اپنے رب کے پاس ملنے گئے ہیں جیسے موسیٰ بن عمران علیہ السلام گئے تھے، وہ اپنی قوم سے چالیس راتیں غائب رہے، پھر بعد میں واپس آ گئے۔ لوگ



منائل العسرفان فی علوم القرآن: جلد ①

ان کے آنے سے پہلے بھی یہی کہتے تھے کہ وہ وفات پا گئے ہیں۔ اللہ کی قسم! رسول اللہ ﷺ بھی موسیٰ علیہ السلام کی طرح ضرور واپس آئیں گے، جو لوگ حضور ﷺ کی وفات کا خیال رکھتے ہیں ان کے ہاتھ پاؤں ضرور کاٹ دیئے جائیں گے۔ اس موقع پر ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہما اصل صورت حال بتانے اٹھ کھڑے ہوئے اور فرمایا: "اے عمر رضی اللہ عنہما! ٹھہرو! خاموش ہو جاؤ! پھر انہوں نے اللہ کی حمد و ثناء بیان کی، پھر فرمایا: لوگو! جو شخص محمد ﷺ کی بندگی کیا کرتا تھا تو وہ جان لے کہ وہ وفات پا گئے ہیں۔ اور جو اللہ کی بندگی کرتا تھا وہ جان لے کہ وہ زندہ جاوید ذات ہے جسے کبھی موت نہیں آئے گی پھر یہ آیت تلاوت فرمائی:

﴿وَمَا مُحَمَّدٌ إِلَّا رَسُولٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ﴾ (آل عمران: ۱۴۳)

"اور محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) تو صرف (خدا کے) پیغمبر ہیں ان سے پہلے بھی بہت پیغمبر ہو گزرے ہیں۔" راوی کا بیان ہے کہ خدا جانتا ہے کہ لوگوں کا حال یہ تھا کہ جیسے ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہما کی تلاوت کرنے پر ہی انہیں اس آیت کے نزول کا علم ہوا ہو۔ چنانچہ لوگوں نے مذکورہ آیت حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہما سے اخذ کی اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کہنے لگے: "میں نے ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہما کو یہ آیت تلاوت کرتے سنا تو میں حیران و ششدر رہ گیا اور یہاں تک کہ زمین پر جا گرا، میرے دونوں پاؤں مجھے سہارا نہیں دے رہے تھے اور مجھے یقین ہو گیا کہ حضور ﷺ کی وفات ہو گئی ہے۔" اب غور کریں کہ مذکورہ آیت سے ذرا بھی محسوس نہیں ہوتا کہ یہ کوئی ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہما کا کلام ہو! بلکہ یہ آیت بھی اپنے ضمن میں ان دلائل میں سے ایک ہے جن سے اس کا کلام اللہ ہونا معلوم ہوتا ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بھی خوب جانتے تھے کہ یہ آیت، کلام اللہ میں سے ہے۔ جو حضور ﷺ کی رحلت کے حادثہ فاجعہ کے پیش آنے سے کئی سال پہلے نازل ہو چکی تھی۔

لیکن جن لوگوں کی خواہش اور ضد اور ہمت دھرمی نے اندھا کر دیا ہو ان کا کیا کیا جائے؟

﴿فَإِنَّهَا لَا تَعْلَىٰ أَلْبُصَارُ وَلَكِنَّ تَعْلَىٰ الْقُلُوبُ الَّتِي فِي الصُّدُورِ﴾ (البقرہ: ۱۷۶)

"آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں بلکہ وہ دل اندھے ہو جایا کرتے ہیں جو سینوں میں موجود ہیں۔"

⑤ ان معترضین نے جو یہ دعویٰ کیا کہ آیت قرآنی: ﴿وَآتَيْنَاهُم مِّن مَّقَابِرٍ مُّصَلًّى﴾ (البقرہ: ۱۷۵) اللہ کا نہیں بلکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہما کا کلام ہے، یہ دعویٰ بھی اسی طرح مردود ہے جس طرح ہم نے سابقہ آیات ﴿وَمَا مُحَمَّدٌ إِلَّا رَسُولٌ﴾ ... الخ کے بارے میں ان کے دعویٰ کی تردید کی تھی۔ بلکہ ان معترضین کا یہ دعویٰ زیادہ واضح البطلان ہے۔ اس لیے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہما سے تو مردی ہے کہ انہوں نے ہی نبی کریم ﷺ سے عرض کیا تھا: "کاش ہم مقام ابراہیم کو نماز گاہ بنا لیتے!" اسی پر یہ آیت اتری تھی۔ ﴿وَآتَيْنَاهُم مِّن مَّقَابِرٍ مُّصَلًّى﴾ (البقرہ: ۱۷۵) ①

یہاں ایک فرق ہے حضرت عمر رضی اللہ عنہما کی اس آرزو کے بارے کہے گئے الفاظ میں جو نزول آیت کا سبب بنے اور قرآن کے الفاظ میں جو اس سبب نازل ہوئے۔

وہ فرق یہ ہے کہ آپ دیکھتے ہیں کہ آیت قرآنی میں صیغہ امر آیا ہے اور اس میں لفظ ”کو“ شامل نہیں ہے۔ جبکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہما کے آرزو کردہ الفاظ میں ایک تفاعل ماضی کا صیغہ استعمال ہوا ہے اور دوسرا یہ کہ اس میں لفظ ”کو“ بھی شامل ہے۔ اور قرآن کا حضرت عمر رضی اللہ عنہما کی تمناؤں یا کسی کی بھی تمنا اور آرزو پورا کرنا اس بات پر دلالت نہیں کرتا ہے کہ جو حصہ، آرزوؤں کو پورا کرنے کی خاطر نازل ہو جائے وہ حضرت عمر رضی اللہ عنہما کا کام شمار کر لیا جائے۔

بلکہ دونوں کے درمیان بہت زیادہ فرق اور بُعد پایا جاتا ہے۔

**تیسرا شبہ** بعض غالی قسم کے شیعہ دعویٰ کرتے ہیں کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہما اور ان سے پہلے والے یعنی حضرات ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما نے قرآن پاک میں تحریف کی اور اس کی بہت سی آیات اور سورتوں کو ساقط کر دیا وہ حضرت ہشام بن سالم عن ابی عبد اللہ رضی اللہ عنہما کی سند سے روایت کرتے ہیں کہ: جس قرآن پاک کو حضرت جبریل علیہ السلام حضرت محمد ﷺ کے پاس لائے تھے وہ سترہ ہزار آیات پر مشتمل تھا۔ محمد بن نصر نے بھی ان سے روایت کیا کہ سورۃ ”لعد یکن“ (یعنی سورۃ البینہ) میں قریش کے ستر آدمیوں کے اور ان کے آباء کے نام تھے۔

محمد بن جہم ہمالی وغیرہ نے حضرت ابوعبد اللہ سے روایت کیا کہ سورۃ النحل کے یہ الفاظ ﴿ اَمَّا هِيَ اَرْبَىٰ مِنْ اُمَّةٍ ﴾ (نحل: ۹۲) کلام اللہ کے الفاظ نہیں بلکہ اپنی جگہ سے ہٹے ہوئے ہیں جو الفاظ نازل ہوئے وہ درحقیقت یہ ہیں ﴿ اَمَّا هِيَ اَرْبَىٰ مِنْ اُمَّةٍ ﴾۔ بعض نے کہا کہ قرآن پاک میں ایک سورۃ تھی جس کا نام ”سورۃ الولایت“ تھا وہ پوری کی پوری ساقط کر دی گئی اور سورۃ الاحزاب کا بھی اکثر حصہ ساقط کر دیا گیا کیونکہ وہ ”سورۃ الانعام“ کے برابر تھی اس میں سے انہوں نے اہل بیت کے فضائل ساقط کر دیے۔

اسی طرح انہوں نے دعویٰ کیا کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہما نے ﴿ لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا ﴾ (التوبہ: ۴۰) سے پہلے ﴿ وَبَلَّغْ ﴾ کے الفاظ ساقط کر دیے۔ اور ﴿ وَقِفُوهُمْ اِنَّهُمْ سَخِرُوا لَوْ لَنْ ﴾ (الاعانات: ۲۳) کے بعد ﴿ عَنْ وَاٰیةٍ عَلٰی ﴾ کے الفاظ بھی ساقط کر دیے اور ﴿ وَكَفٰی اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ النَّبَاتِ ﴾ (الاحزاب: ۲۵) کے بعد ﴿ عَلٰی بِنِ اَبِي ظَلِيْپٍ ﴾ کے الفاظ ساقط کر دیے اور ﴿ وَسَيَعْلَمَنَّ الَّذِيْنَ كَلِمَاتُهَا ﴾ (الشعراء: ۲۲۷) کے بعد ﴿ اِلٰلٍ مُّحَدِّثٍ ﴾ کے الفاظ کو بھی ساقط کر دیا۔ اس کے علاوہ اور بھی بہت سی جگہیں ہیں جہاں تحریف ہوئی ہے۔

لہذا وہ قرآن جو آج مشرق و مغرب میں مسلمانوں کے ہاتھ میں ہے وہ ان شیعوں کے نزدیک تورات و انجیل سے بھی بڑھ کر حریف شدہ ہے اس میں ان سے بھی زیادہ کمزور تالیف ہیں اور ان سے بھی زیادہ لغو، بے ہودہ اور بے بنیاد باتیں ہیں:

﴿ فَتَالَهُمْ اللّٰهُ اَنۡ اَنۡبٰی يُؤۡفِكُوۡنَ ۙ ﴾ (التوبہ: ۳۰)

”اللہ تعالیٰ نے انہیں برباد کر کے کہاں بیکے جا رہے ہیں۔“

① یہ الزامات محض جہتیں ہیں جو سند اور دلیل سے خالی ہیں یہ تو ذکر کیے جانے کے بھی مستحق نہیں ہیں لیکن چونکہ بعض ملحدین انہیں بار بار پیش کرتے ہیں اور بعض دیوانے اس سے دھوکہ کھا جاتے ہیں اس لیے ان کی تردید کرنا پڑی ان کی تردید کے لیے صرف اتنی

بات کافی ہے کہ یہ لوگ ان پر دلیل نہ لاسکے دلیل تو درکنار شہدہ دلیل بھی نہ لاسکے اور کبھی بھی نہیں لاسکتے۔

والدعاویٰ مالہم یقیسوا علیہا بینات ابناءہا ادعیاء  
”وہ دعوے جن پر قائم نہ ہوں دلائل وہ ان لوگوں کی طرح ہیں جن کے بیٹے کسی اور کی طرف منسوب ہوں۔“  
لیکن ان کی حماقت اور بے وقوفی اسی طرح مشہور معروف ہے۔

﴿وَمَنْ يُؤْمِنِ اللَّهُ فَمَا لَهُ مِنْ مُكْرِمٍ إِنَّ اللَّهَ يَفْعَلُ مَا يَشَاءُ﴾ (الح: ۱۸)

”جس کی اللہ تعالیٰ تو جبر کرے اس کا اکرام کوئی نہیں کر سکتا بے شک اللہ تعالیٰ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔“

① بعض شیعہ علماء خود اپنے آپ کو ان بے وقوفیوں سے مبرا کرتے ہیں اور اس کی طاقت ہی نہیں رکھتے کہ یہ ان کی طرف منسوب ہو چنانچہ انھوں نے کچھ ایسے شیعہوں کی طرف منسوب کر دیا جن کی طرف تکفیر بے لگام ہو کر جاگھسی اور درنگی ان سے دور ہوگئی۔  
طبری ”مجمع البیان“ میں کہتا ہے:

((اما الزيادة فيه (ای فی القرآن) فمجمع علی بطلانها واما النقصان فقد روی عن قوم من اصحابنا وقوم من المحشوية والصحيح خلافه وهو الذي نصره المرتضى واستوفى الكلام فيه غاية الاستيفاء... الخ)).

”قرآن پاک میں اضافہ؟ اس کے باطل ہونے پر اجماع ہے اور کی؟ ہمارے اصحاب میں سے ایک قوم سے نیز مشویہ میں سے بھی ایک قوم سے مروی ہے لیکن صحیح قول اس کے خلاف ہے یہی وہ قول ہے جس کی مرقضی نے نصرت کی اور اس میں بھرپور کلام فرمایا ہے۔“

”مجمع الزوائد“ میں طبری کی یہ عبارت بھی ہے:

((اما الزيادة في القرآن فمجمع علی بطلانها واما النقصان فهو اشد استحالة)).

”قرآن پاک میں زیادتی کے باطل ہونے پر اجماع ہے اور کی بھی انتہا درجہ کی محال ہے۔“

قرآن پاک کے صحیح منقول ہونے کا علم ایسے ہے جیسے شہروں، بڑے بڑے واقعات، کتب مشہورہ اور عربوں کے لکھے گئے اشعار کا علم ہے کیونکہ اس کا سخت اہتمام کیا گیا اور اس کے نقل اور حفاظت کے اسباب بہت زیادہ ہو گئے اور اس حد تک بڑھ گئے کہ ہمارے ذکر کردہ میں کوئی چیز بھی اس حد تک نہیں پہنچی اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن پاک نبوت کا نعر ہے اور علوم شرعیہ اور احکام دینیہ کا ماخذ ہے اور مسلمان کے علماء اس کی حفاظت و حمایت میں اس حد تک پہنچے کہ انھوں نے اس میں مرجع اختلاف یعنی اعراب، قرأت، حروف اور آیات ہر چیز کو پہچان لیا تو پھر اس میں اہتمام صادق اور ضبط شدید کے باوجود تبدیلی یا نقص کے ممکن ہے؟“

② تو اترا قائم ہے اور اجماع منقہ ہو چکا ہے کہ مصحف کے دو گتوں کے درمیان جو بھی موجود ہے وہ کتاب اللہ ہے اور اس میں نہ کوئی کمی ہے نہ زیادتی نہ تغیر ہے نہ تبدیلی اور علم کے طریقوں میں واضح ترین طریقہ تو اترا بھی ہے اور اجماع حق کے راستوں میں سے قوی ترین راستہ ہے۔

﴿فَمَا ذَا بَعْدَ الْحَقِّ إِلَّا الضَّلَالُ﴾ (یونس: ۳۲)

”حتیٰ کہ بعد گمراہی کے سوا کیا ہو سکتا ہے؟“

⑤ امام علی بن ابوطالب کرم اللہ وجہہ (جن کے بارے میں یہ لوگ سمجھتے ہیں کہ وہ ان کی نصرت کرتے ہیں اور ان نامعقول باتوں میں وہ ان کی ہم نوائی کرتے ہیں) سے صحیح سند کے ساتھ مروی ہے کہ انھوں نے حضرت ابو بکر بنیہنیو نے زمانے میں بھی جمع قرآن کو سراہا اور حضرت عثمان بنیہنیو کے زمانے میں بھی جمع قرآن کو سراہا شاید آپ کو یاد ہو کہ انھوں نے حضرت ابو بکر بنیہنیو کے جمع قرآن کے بارے میں فرمایا کہ ”مصاحف میں سب سے بڑا جو حضرت ابو بکر بنیہنیو کو ہوگا اللہ تعالیٰ ابو بکر بنیہنیو پر رحمت فرمائے کہ وہ پہلے آدمی ہیں جنھوں نے کتاب اللہ کو جمع کیا“ اسی طرح حضرت عثمان بنیہنیو کے جمع قرآن کے بارے میں فرمایا کہ: ”اے لوگوں کی جماعت! اللہ تعالیٰ سے ڈرو! اور حضرت عثمان بنیہنیو کے بارے میں غلو سے بچنا اور تمہارا کہنا کہ یہ مصاحف کو جلانے والے ہیں۔ اللہ کی قسم انھوں نے یہ مصاحف رسول اللہ ﷺ کے صحابہ بنیہنیو کی جماعت کی موجودگی میں جلانے تھے۔“

نیز حضرت علی بنیہنیو نے فرمایا کہ: ”اگر حضرت عثمان بنیہنیو کے دور میں میں حاکم ہوتا تو مصاحف کے بارے میں وہی کرتا جو حضرت عثمان بنیہنیو نے کیا“ اس طریقے سے امام (علی بنیہنیو) نے ان بہتان بازوں کی زبانیں بند کر دیں اور ان جو حضرت عثمان بنیہنیو کے چال بازیوں کو انھی کی رسوا کردوں میں ڈال دیا۔ تو پھر یہ کہاں تک جائیں گے؟

﴿إِذْ تَبَرَّأَ الَّذِينَ اتَّبَعُوا مِنَ الَّذِينَ آتَوْهُمُ بِالْبُرْهَانِ وَالْعَدَابِ وَنَقَطَعَتْ بِهِمُ الْأَسْبَابُ﴾ (البقرہ: ۱۷۶)

”اس دن (کفر کے) پیٹھو اپنے پیروؤں سے بیزاری کریں گے اور (دونوں عذاب الہی) دکھ لیں گے اور ان کے آپس کے تعلقات منقطع ہو جائیں گے۔“

﴿رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوبَنَا بَعْدَ إِذْ هَدَيْتَنَا وَهَبْ لَنَا مِنْ لَدُنْكَ رَحْمَةً ۗ إِنَّكَ أَنْتَ الْوَهَّابُ﴾ (آل عمران: ۸)

”اے پروردگار! جب تو نے ہمیں ہدایت بخشی ہے تو اس کے بعد ہمارے دلوں میں کئی نہ پیدا کر دیجیو اور ہمیں اپنے ہاں سے نعمت عطا فرما۔ تو تو بڑا عطا فرمانے والا ہے۔“

⑥ خلافت، حضرت ابو بکر، عمر اور عثمان بنیہنیو کے بعد حضرت علی بنیہنیو پر ختم ہو گئی پھر انہیں کیا مانع تھا کہ وہ اس وقت قرآن پاک کے حق میں لب کشائی کرتے اور تمہارے اس خیال اور بہتان کے مطابق پہلے والوں نے قرآن پاک میں جو غلطیاں کیں انھیں کرتے۔ جبکہ وہ ان کے باطل عقیدے کے مطابق امام معصوم بھی تھے نیز یہ کہ وہ قرآن کی حفاظت کرنے والوں میں سے ایک نمایاں شخصیت تھے اور دین و اسلام کی حفاظت کرنے میں اللہ تعالیٰ کی مخلوق میں سے سب سے زیادہ بہادر تھے پھر ان کے بعد امارت ان کے بیٹے حضرت حسن بنیہنیو کی طرف منتقل ہو گئی پھر انھیں اس فرصت کے رواں دواں ہوتے ہوئے آخر تک کس نے منع کیا کہ اللہ تعالیٰ کی کتاب کی حقیقت امت کے سامنے ظاہر ہو جائے۔ یہ بے بنیاد باتیں ہیں یہ باتیں جنہوں نے ہی کہہ سکتا ہے اور ایسی باتوں کی تصدیق صرف وہی شخص کر سکتا ہے جس کے اندر عقل کم ہو۔

چوتھا شبہ ﴿﴾ مروی ہے کہ حضرت عبد اللہ بن مسعود بنیہنیو نے فرمایا کہ اے مسلمانوں کی جماعت! مجھے قرآن پاک کے نسخوں کی کتابت سے برطرف کر دیا جاتا ہے اور اس کے سوا ایک آدمی بن جاتا ہے (اللہ تعالیٰ کی قسم!) میں نے اسلام قبول کر لیا تھا اور وہ کافر آدمی کی پشت میں تھا۔

کہتے ہیں کہ اس آدمی سے ان کی مراد حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ ہیں اور اس کلام سے ان کی مراد صحیح قرآن پر طعن کرنا تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یہ قرآن جو ہمارے سامنے ہے قابل بھروسہ نہیں ہے اور حد تو اتر تک بھی نہیں پہنچا ہوا۔ ان کے اس شبہ کا رد مندرجہ ذیل ہے:

① حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا یہ کلام (اگر صحیح ہو تو بھی) جمع قرآن کے طعن پر دلالت نہیں کرتا بلکہ صرف اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ وہ اپنے بارے میں یہ رائے رکھتے تھے کہ وہ زیادہ بہتر ہیں کہ ان کی طرف جمع قرآن کو منسوب کیا جائے۔ کیونکہ اس معاملہ میں انھیں حضرت زید رضی اللہ عنہ کی نسبت اپنے اوپر زیادہ بھروسہ تھا اور یہ قطعاً اس کے منافی نہیں کہ وہ زید رضی اللہ عنہ میں بھی اس چیز کے انجام دہی کی اہلیت اور کفایت سمجھتے تھے جو ان کی طرف منسوب ہے اگرچہ اپنی جان میں وہ اپنے آپ کو ان سے بڑھ کر لائق اور قابل سمجھتے تھے۔ بہر حال مسئلہ کا تعلق اندازہ کے ساتھ ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ، حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا اندازہ حضرت زید رضی اللہ عنہ کے لیے ہونا حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے اندازہ کی نسبت زیادہ درست ہے کیونکہ نہ ہو کہ پیچھے آپ کو معلوم ہو چکا ہے کہ ان کے اندر کس قدر اہلیت اور خوبیاں باکمال انداز میں جمع تھیں جنہوں نے انہیں اس نامور مقصود کو سرانجام دینے کے قابل بنایا۔ مزید یہ کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ان کے ساتھ تین آدمی اور بھی ملائے تھے پھر یہ بھی ہے کہ وہ اور جوہر صحابہ رضی اللہ عنہم کی طرف رخ کرتے تھے اور متوجہ ہوتے تھے۔ آپ کے لیے اتنی بات کافی ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ قرآن پاک کی حفاظت کرنے والے اور اسے سکھلانے والے تھے۔

اس جواب کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے اعتراض کو صحیح فرض کیا جائے تو بھی وہ جمع قرآن کی کمیٹی کے کی تالیف کے طریقہ کار پر ہوگا نفس جمع قرآن پر نہ ہوگا اس کے علاوہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا گزشتہ بالا کلمہ بھی اس سے بڑھ کر کچھ بھی دلالت نہیں کرتا کہ وہ عمر میں حضرت زید رضی اللہ عنہ سے بہت زیادہ بڑے تھے کیونکہ حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ مسلمان تھے اور زید رضی اللہ عنہ اس وقت اپنے باپ کی پشت میں پوشیدہ تھے۔ یہ بات حضرت زید رضی اللہ عنہ پر کوئی طعن نہیں بنتی کیونکہ کتنے پہلے لوگ ہوئے ہیں جنہیں بعد والوں کی وجہ سے چھوڑ دیا جاتا ہے۔

اگر معاملہ عمر کا ہوتا تو بہت سا نظام فاسد ہو جاتا پھر یہ بات بھی ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے کلام کو دیکھا جائے تو ایک اعتبار سے حضرت زید رضی اللہ عنہ میں طعن بھی مفہوم ہوتا ہے وہ یہ کہ ان کا باپ کا فر تھا حالانکہ یہ بھی طعن نہیں ہے کیونکہ بہت سے صحابہ رضی اللہ عنہم ایسے ہیں جو شروع میں کفار تھے اور اپنے کافر آباء کی پشتوں سے نمودار ہوئے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ:

﴿وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ أُخْرَىٰ﴾ (الانعام: ۱۶۴)

”کوئی کسی کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔“

نیز فرمایا کہ:

﴿قُلْ لِلذَّيْنِ كَفَرُوا وَإِنْ يَنْتَهُوا يُخْفَرْ لَهُمْ مَآ قَد سَلَّمَ﴾ (الانعام: ۳۷)

”آپ کفار سے کہہ دیجیے کہہ اگر تم رک جاؤ تو تمہارے گزشتہ گناہ بخش دے جائیں گے۔“

④ اگر ہم مان لیں کہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے جو منقول ہوا وہ صحیح ہے اور یہ بھی مان لیں کہ ان کا مقصد جمع قرآن کے صحیح ہونے پر طعن ہی تھا پھر بھی یہ مسلم نہیں کہ وہ اس طعن پر برقرار رہے ہوں۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ ان سے ثابت ہے کہ جب انہیں معلوم ہوا کہ حضرت عثمان کا مصحف حق ہے تو انہوں نے آخری زندگی میں اپنا مصحف جلا دیا اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے مصحف کی طرف رجوع کر لیا دوسری دلیل ان سے عاصم بن زرعہ والی جو قرأت منقول ہے وہ ہے اور وہ قرأت پیچھے گزر چکی۔

⑤ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا یہ کلام (اگر مان بھی لیا جائے کہ یہ صحیح ہے اور اس سے ان کی مراد جمع قرآن کے صحیح ہونے پر طعن ہی ہے اور وہ اس پر برقرار ہے اور انہوں نے رجوع بھی نہیں کیا پھر بھی) ہم نہیں مانتے کہ یہ تو اتر قرآن کے ابطال پر دلالت کرتا ہے کیونکہ پیچھے گزر چکا کہ اس کی روایت کی صحت کے قطعی ہونے میں اتنی بات کافی ہے کہ اسے اتنی جماعت روایت کرے کہ ان کا جھوٹ پر جمع ہونا محال ہو اور اس میں تو اتر کی شرائط بھی پائی جاتی ہوں اور اس کی شرائط میں سے یہ نہیں ہے کہ اس میں کوئی مخالف مخالفت نہ کرتا ہو لہذا تو اتر قرآن کو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ اس میں حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ یا ان کے علاوہ کسی اور نے مخالفت کی ہو کیونکہ صحابہ رضی اللہ عنہم کی ایک بہت بڑی جماعت تھی جس نے ایک مرتبہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں اس طریقے پر جمع قرآن کا اقرار کیا اور دوسری مرتبہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں اقرار کیا۔

**پانچواں شبہ** قرآن پاک متواتر کیسے ہو سکتا ہے؟ حالانکہ حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں جمع قرآن کے بارے میں فرمایا ”میں اٹھا اور قرآن پاک پارچوں، کندھے کی ہڈیوں، کھجور کے پتوں اور لوگوں کے سینوں سے تلاش کرنا شروع کر دیا حتیٰ کہ میں نے سورۃ التوبہ کی دو آیتیں حضرت خزیمہ انصاری رضی اللہ عنہ کے پاس پائیں ان کے علاوہ مجھے اور کسی کے پاس نہیں ملیں اور وہ دو آیتیں: ﴿لَقَدْ جَاءَهُمْ رَسُولٌ﴾ (نحل: ۱۱۳) پھر یہ بات بھی ہے کہ قرآن پاک کیسے متواتر سکتا ہے؟ حالانکہ حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ سے یہ بھی مروی ہے کہ انہوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانے میں ہونے والے جمع قرآن کے بارے میں فرمایا کہ مجھے سورۃ الاحزاب کی ایک آیت جو میں رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو پڑھتے سنا کرتا تھا نہیں ملی وہ مجھے کسی کے پاس بھی نہیں ملی سوائے حضرت خزیمہ انصاری رضی اللہ عنہ کے جن کی گواہی کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دو آدمیوں کی گواہی کے برابر قرار دیا تھا اور وہ آیت: ﴿مِنَ الْمُؤْمِنِينَ رِجَالٌ صَدَقُوا مَا عَاهَدُوا اللّٰهُ عَلَيْهِمْ﴾ (الاحزاب: ۲۳) ہے۔

**جواب** ① حضرت زید رضی اللہ عنہ کا یہ کلام تو اتر کو باطل نہیں کرتا اس کی وضاحت یہ ہے کہ یہ آیتیں سورۃ التوبہ کی آخری آیتیں ہیں ان کا قرآن ہونا صرف حضرت خزیمہ رضی اللہ عنہ کے قول سے ثابت نہیں ہوا بلکہ صحابہ کی بہت بڑی جماعت کی خبر دینے سے ثابت ہوئی ہے جنہوں نے اسے اپنے سینوں میں محفوظ کیا ہوا تھا لیکن اپنے اوراق میں لکھا ہوا نہیں تھا اور حضرت زید رضی اللہ عنہ کے قول کہ ”میں نے سورۃ التوبہ کی دو آیتیں ان کے علاوہ کسی اور کے پاس نہیں پائیں“ کا مطلب یہ ہے کہ ان کے علاوہ کسی اور کے پاس لکھی ہوئی نہیں پائیں حضرت ابو خزیمہ رضی اللہ عنہ جس چیز میں مفرد تھے وہ ان آیتوں کی کتابت تھی حفظ نہیں تھا اور متواتر میں کتابت شرط نہیں بلکہ صرف اتنی جماعت کا روایت کرنا شرط ہے جن کا جھوٹ پر جمع ہونے سے اطمینان ہو اگرچہ ان میں سے کسی ایک نے ہی لکھا ہو چنانچہ حضرت



## منابر العرفان فی علوم القرآن: جلد ①

البخیرہ انصاری رحمۃ اللہ علیہ کا لکھنا تو اتر کے مقتضی اور مطلوب سے بھی بڑھ کر بطور احتیاط اور بطور بھر و سہ تھا تو اس میں ان کے منفرد ہونے سے تو اتر میں فرق کیسے پر سکتا ہے؟

② حضرت زید بن عیینہ سے سورۃ الاحزاب کی آیت ﴿مِنَ الْمُؤْمِنِينَ رِجَالٌ صَدَقُوا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِمْ﴾ (الاحزاب: ۲۳) کے بارے میں جو مروی ہے اس بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ حضرت زید بن عیینہ نے حضرت خزیمہ بن ثابت انصاری رحمۃ اللہ علیہ کے علاوہ کسی اور کے پاس لکھا ہوا نہیں پایا۔ حضرت زید بن عیینہ کی اس عبارت سے ان کی مراد یہی ہے؟ اس پر دلیل حضرت زید بن عیینہ کا اپنا قول ہے کہ انھوں نے فرمایا: "فَقَدْتُ آيَةَ قُرْنِ سُورَةِ الْأَحْزَابِ" (میں نے سورۃ الاحزاب کی ایک آیت نہیں پائی) اب حضرت زید کی لفظ "فقدت" کے ساتھ تعبیر سے ظاہر ہوتا ہے کہ انھیں یہ آیت یاد تھی اور وہ اس آیت کو جانتے پہچانتے تھے لیکن انھیں لکھی ہوئی نہیں مل رہی تھی انھیں ملی تو صرف حضرت خزیمہ بن عیینہ کے پاس ملی ورنہ حضرت زید بن عیینہ کو کس نے بتلایا کہ انھیں ایک آیت نہیں مل رہی۔

③ حضرت زید بن عیینہ کا گزشتہ بالا کلام جو سورۃ التوبہ اور سورۃ الاحزاب کے بارے میں تھا یہ ان کے عدم تواتر پر دلالت نہیں کرتا ہے کہ اگر فرض کر لیا جائے حضرت خزیمہ بن عیینہ کے انفرادے مراد یہ ہو کہ وہ اسے اپنے حافظے سے ذکر کرنے میں منفرد تھے تو بھی ان کا یہ کلام زیادہ سے زیادہ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ وہ ابتداءً ان کے ذکر میں منفرد تھے پھر جو انہوں نے اسے ذکر کیا تو صحابہ رضی اللہ عنہم کو یاد آ گیا اور یہ صحابہ رضی اللہ عنہم کی جماعت تھی جن کے جھوٹ پر جمع ہونے سے اطمینان ہے چنانچہ یہ آیات اس تواتر کے قائم ہونے کے بعد نسخوں اور مصحف میں لکھ دی گئیں۔

**چھٹا شبہ** قرآن پاک کی آیات پتھروں، کججور کی شاخوں اور ہڈیوں پر لکھی جاتی تھیں تاکہ وہ ضائع نہ ہو جائیں اور ایک بہت بڑا حصہ ایسا باقی رہ گیا جو لوگوں کے سینوں میں محفوظ تھا اس سے بہت سے ایسے مسائل پیدا ہو گئے جنہیں محققین نے تسلیم کیا ہے یہ مسائل اس بات کے ثبوت کے لیے کافی ہیں کہ موجودہ قرآن ان تمام آیات کو جامع نہیں ہیں جنہیں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زبان سے پڑھا بعض کی قرأت میں اختلاف ہے، کسی کے الفاظ میں اور بعض کے معانی میں۔

بالفاظ دیگر موجودہ قرآن نازل شدہ پورے قرآن کو جامع نہیں ہے اس لیے کہ یقیناً اس کا ایک بہت بڑا حصہ ضائع ہو گیا ہو گا اور ایک حصہ بھلا دیا گیا ہو گا۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ "تم میں سے کوئی نہ کہے کہ میں نے پورا قرآن حاصل کر لیا ہے کیونکہ اس کا ایک بہت بڑا حصہ ضائع ہو چکا ہے بلکہ اسے کہنا چاہیے کہ میں نے اس کا ظاہری حصہ حاصل کر لیا" اس سے ثابت ہوتا ہے کہ موجودہ قرآن لوح محفوظ میں لکھے گئے پورے قرآن پر مشتمل نہیں ہے اور نہ ہی اس قرآن کے مطابق ہے جو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ہونٹوں سے صادر ہوا ہے خصوصاً یہ کہ اس کی بہت سی آیات میں ایک بہت بڑا ہوش ربا اختلاف ہوا ہے اور اس کی صحیح عبارت کو کوئی نہیں جانتا۔

**جواب ①** پتھروں اور ہڈیوں پر قرآن پاک کی کتابت اور اس کے ایک حصہ کا انسانوں کے سینوں میں محفوظ ہونے سے ایک بھی مسئلہ پیدا نہیں ہوتا چ جائیکہ بہت سے مسائل پیدا ہوئے ہوں یہ تو ایک وہم ہے جو ان کے خیال میں پیدا ہو گیا ہے اس کی دلیل یہ ہے کہ انہوں نے اس ظالمانہ اقدام پر کوئی دلیل ذکر نہیں کی۔

- ② پتھر، کھجور کی شاخیں اور ہڈیوں پر قرآن پاک کی کچھ آیات لکھی ہوئی ایسی نہیں کہ ان کے بارے میں مترضین یہ خیال قائم کر لیں یا لوگوں کے ذہن میں وسوسہ پیدا کریں کہ ان پر کتابت نہیں ہو سکتی تھی بلکہ عرب اپنے جنگوں میں رہن بہن اور شہری و مساکل سے دور ہونے کی وجہ سے پتھروں کی کثیر انواع جو ان کے پاس موجود تھیں ان میں سے باریک قسم کے پتھروں کو چرن لیتے تھے جو صحیفہ کی مانند ہوتے تھے ان پر کتابت بھی ہو سکتی تھی اور وہ باقی بھی رکھ سکتے تھے اور وہ ایسے ہوتے جیسے آج ہم دیکھتے ہیں کہ چونے سے بنے ہوئے صفحات پر بڑی خوبصورت لکھائی ہوتی ہے اسی طرح کھجور کی شاخوں سے پتے وغیرہ اتار لیے جاتے اور انھیں پالش اور صفائی وغیرہ کر کے ان کے چوڑے جزء پر لکھ دیا جاتا اور وہ بھی صحیفہ کی مانند ہو جاتا تھا اور ہڈیوں میں اس طرح بہت ہی کم ہوتا تھا اس کی دلیل یہ ہے کہ اس میں وارد ہونے والی روایات میں اس کی ایک خاص نوع کی تصریح ہے اور وہ خاص نوع کندھے کی ہڈی ہے وہ اس لیے کہ کندھے کی ہڈی چوڑی، باریک اور لمبائی ہوتی ہے اس پر لکھائی سہولت کے ساتھ ممکن ہے۔
- ③ اس سے ان کا یہ نتیجہ نکالنا کہ "موجودہ قرآن پاک ان تمام آیات کو محیط نہیں ہے جو محمد ﷺ کی زبان اقدس سے صادر ہوئیں" یہ نتیجہ بھی الٹا اور سمجھ بھی اٹنی۔ کیونکہ قرآن پاک کی کتابت اور اس کا ایک ہی وقت میں ہزاروں اصناف کی مخلوقات کے سینوں میں محفوظ ہو جانا اس قرآن کے بقاء کا تقاضا کرتا ہے، کیوں؟ اس لیے کہ کتابت اور حفظ میں سے کوئی ایک امر بھی اس کے اطمینان کے لیے کافی تھا پھر جب قرآن پاک پورا کا پورا بہت سے لوگوں کی لکھائی میں لکھا گیا اور بہت سی جماعتوں کے سینوں میں محفوظ ہو گیا تو پھر اس کے بارے میں آپ کو کیا شک ہے؟

- ④ ان کا کہنا کہ "اس کے کچھ حصے میں قرأت، لفظ یا معنی کے اعتبار سے اختلاف ہے" اگر اس سے ان کی مراد تعدد قرأت یا وجوہ ادا میں اختلاف ہے تو "نزول قرآن علی سہۃ احرف" کی بحث میں گزشتہ بالا بیان ان کی تردید کے لیے کافی ہے اور قرأت کی بحث میں بھی عقرب اس کا بیان آ رہا ہے جو اس موضوع میں چار چاند لگا دے گا اور اگر اس سے ان کی مراد کچھ اور ہے تو اس کی وضاحت ان کی ذمہ داری ہے۔ آپ کو یہ جاننا بھی کافی ہے کہ قرآن پاک کے حروف کا اختلاف ایسا معاملہ ہے جس کا تقاضا حکمت کرتی ہے اور دعوت اسلام کا عموم اس کو واجب کرتا ہے خصوصاً جنھیں رسول اللہ ﷺ کی زیارت نصیب ہوئی ہو اور ان کے مختلف قبائل اور کئی طرح کے لہجے ہوں اور مختلف زبانیں ہوں وہ عرب جن میں ایک ہی عربیت سرایت کی ہوئی تھی اور انھیں عام عربی زبان جمع کیے ہوئے تھی تو اگر قرآن پاک کی ادائیگی کے حروف اور ان کے کلمات کے بولنے کی کیفیات مختلف ہو گئیں تو کونسا عیب رونما ہو گیا؟ یہ تو اس لیے ہوا کہ وہ تمام عربی قبائل کو وضع ہو جائے اور اس کے الفاظ کی تلاوت اور اس کے معانی کا فہم آسان ہو جائے۔ نیز یہ وجہ بھی تھی کہ کوئی یہ نہ کہے کہ اگر قرآن پاک ہماری زبان میں نازل ہوتا تو ہماری کیا بات تھی؟ ہم بھی اس جیسا کلام لے آتے اور ہم بھی اس کی بلاغت کا معارضہ کر لیتے۔

﴿وَاللّٰهُ عَلٰی اٰمُوْرہٖ وَّلٰكِنَّ اَکْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ﴾ (یوسف: ۲۱)

"اور اللہ تعالیٰ کو اپنے کام پر پوری قدرت ہے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔"

- ⑤ ان کا کہنا کہ "وجوہ قرآن کا نازل شدہ پورے قرآن پر محیط ہونا ناممکن ہے.. الخ" یہ کلام سند اور دلیل سے کورا ہے اس کی تردید کی ضرورت ہی نہیں اگر وہ مذکورہ بالا دلائل سے استدلال کریں تو گو یا کہ انھوں نے مٹری کے گھر سے بھی کمزرتین گھر کا سہارا لیا

اور مذکورہ بالا دلائل کی کمزوری آپ کو معلوم ہو چکی اور اگر وہ اس بات سے استدلال کریں جسے جو انھوں نے ابن عمر رضی اللہ عنہما کی طرف منسوب بات کے بعد ذکر کیا تو بھی انہوں نے کوئی نئی بات نہیں کہی کیونکہ ابن عمر رضی اللہ عنہما کی طرف یہ نسبت غلط اور جھوٹی ہے اور اگر اسے صحیح بھی فرض کر لیا جائے تو بھی یہ ساقط ہے اور اگر اسے منفوع بھی فرض کر لیا جائے تو بھی یہ ساقط ہے اور اس میں تبدیلی یا کسی بیشی سے سلامتی کے قطعی اور بھرپور دلائل کے معارض ہونے کی بناء پر کا لعدم ہے اب اس استدلال کی حیثیت گویا کہ ایک خبر واحد کی سی ہو گئی۔

① انھوں نے اپنے شبہ کا اختتام ابتداء سے بھی بڑھ کر کیا اس لیے کہ انھوں نے ان شبہات کی بناء جھوٹ اور تضاد بیانی پر رکھی ہے پھر اس میں مزید نئی تہمت کا اضافہ کر دیا جو سند اور دلیل سے خالی ہے وہ یہ کہ قرآن کی بہت سی آیات میں بہت بڑا اختلاف واقع ہوا ہے اس کی صحیح عبارت کو کوئی بھی نہیں جانتا اس طریقے سے وہ ایک تہمت سے دوسری تہمت کی طرف منتقل ہو گئے اور جھوٹ پر جھوٹ سے استدلال کیا اور ان کی عزت اور عقلمیں بے وقعت ہو کر رہ گئیں اور انھوں نے اس حد تک جو کہا تعصب اور خواہش کی بناء پر کہا اور آپ بخوبی جانتے ہیں کہ موجود قرآن جو ہم تک پہنچا ہے وہ ہر قسم کی فضولیات سے محفوظ ہو کر ہم تک ایسے پہنچا ہے جسے وہ رسول اللہ ﷺ کی زبان سے صادر ہوا اور جیسے اللہ تعالیٰ نے اپنے قلم کے ساتھ اسے لوح محفوظ میں لکھا:

﴿وَإِنَّهُ لَكِتَابٌ عَزِيزٌ ۚ لَا يَأْتِيهِ الْبَاطِلُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهِ ۚ تَنْزِيلٌ مِنْ حَكِيمٍ

حٰمِيٓٓٓ ۝﴾ (فعلت: ۳۲، ۳۱)

”بے شک وہ بڑی عالی مرتبہ کتاب ہے۔ باطل اس کے پاس نہ آگے سے آسکتا ہے نہ پیچھے سے یہ حکمت والے اور خوبوں والے کی طرف سے اتارا گیا ہے۔“

اور ان کا یہ خیال کہ اس میں بڑے بڑے ہوش ربا اختلافات ہیں اس کے بارے میں آپ کو ”نزل قرآن علی سہۃ حرف“ کی بحث میں وجوہ قراءت کا اختلاف اور اس کی حکمت کو اچھی طرح جان چکے ہو اور یہ بھی جان چکے ہو کہ یہ کس پسائی یا تاقض کا باعث بھی نہیں ہے تو پھر یہ ہوش ربا کیسے ہو گیا؟

اور قرآن پاک کی صحیح عبارت کا علم اور اس کا محفوظ ہونا ایسا اجتماعی امر ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے دور سے آج تک امت کے ہر طبقے میں ان لوگوں کے جھوٹ پر جمع ہونے سے بالکل امن ہے۔

اب ان دجالی جاہلوں کا دعویٰ کہ قرآن پاک کی صحیح عبارتوں کا علم کسی کو بھی نہیں یہ ایسا دعویٰ ہے جس کا عیب ناک ہونا بالکل ظاہر اور اس کا جھوٹا ہونا روز روشن کی طرح واضح ہے۔

صاحب ”مسلم الثبوت“ (جو کہ اصول فقہ اسلامی کی مشہور ترین کتاب ہے) نے فرمایا کہ جو قرآن خبر آحاد کی طرح منقول ہوا ہو وہ کبھی بھی قرآن نہیں بن سکتا اور اس میں کسی بھی مذہب والے کا اختلاف منقول نہیں، اس پر دلیل یہ ہے کہ اس کو نقل کرنے کے محرکات بہت زیادہ تھے جو ایک چیلنج کو متضمن تھے دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ الفاظ اور معنی ہر اعتبار سے احکام کی اصل موجود ہے اسی وجہ سے صحابہ کا اس کی حفاظت کے لیے جدوجہد کرنا تو اترا قطعی کے ساتھ مشہور و معروف ہے۔ اور اس کے نقل کے جتنے بھی محرکات تھے وہ

عادتا تو اتر کے ساتھ منقول ہیں لہذا ان کا وجود عادتا ہر ایک کے نزدیک تو اتر کو لازم ہے جب لازم یعنی تو اتر منٹھی ہو گیا تو ملزم بھی بالکل منٹھی ہو جائے گا اور خبر آحاد کی طرح نقل ہونے والا کبھی بھی قرآن نہیں ہو سکتا... الخ

کتاب وسنت کے دفاع کے خطوط یا محرکات یا اسباب جو صحابہ رضی اللہ عنہم میں بکثرت پائے جاتے تھے اور ان کی وجہ سے انہوں نے قرآن وحدیث کو اچھی طرح زبانی یاد کر لیا اور قرآن وحدیث میں خوب اچھی طرح پختگی حاصل کر لی۔

گزشتہ بالا اور ان جیسے شبہات میں غور کرنے والے پر روز روشن کی طرح واضح ہو چکا کہ ایک قوم صحابہ رضی اللہ عنہم سے قرآن پاک حاصل کرنے والے طریقہ پر کیچڑ اچھالنے کی کوشش کر رہی ہے یہ قوم کبھی تو کہتی ہے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم نے جب قرآن پاک جمع کیا انہیں زبانی یاد نہیں تھا اور جنہیں یاد تھا وہ جمع قرآن سے پہلے ہی وفات پا گئے تھے یا شہید ہو گئے تھے اور کبھی کہتے ہیں کہ صحابہ رضی اللہ عنہم کو جمع قرآن میں پختگی ہی نہ تھی بلکہ وہ اس میں ادھر ادھر کی ملاپتے اور پھر اس میں جو چاہتے ہی زیادتی کر لیتے۔

دشمنان اسلام کے اس قسم کے حملے بہت زیادہ کثرت پکڑ گئے اور اتنے ہو گئے کہ اگر ہم ان کے تمام شبہات کی چھان بین کرنے لگ جائیں تو ہماری اس کتاب کا حجم بہت زیادہ ہو جائے اور ہم ہدایت والی لذت دار علی آب و ہوا سے نکل کر قیل و قال، لڑائی جھگڑے، حملہ اور دفاع والے میدان میں نکل جائیں گے۔

اسی طرح دشمنان اسلام کے حملے صحابہ رضی اللہ عنہم کے راستے سے سنت نبویہ پر بھی کثرت کے ساتھ ہوتے چلے گئے کبھی تو یہ لوگ اس بات کو بہت بڑا سمجھتے ہیں کہ ان حضرات نے احادیث شریفہ کو کیسے حفظ کر لیا حالانکہ ان کا مجموعہ بہت بڑا ہے اور کبھی ان پر نیابت کی تہمت لگاتے ہیں، کبھی حد سے بڑھنے کی تہمت لگاتے ہیں کبھی تہمت لگاتے ہیں کہ ان میں پختگی اور تحقیق نہیں تھی۔ ان لوگوں نے اس پر جھوٹ کی اتنی بڑی بنیاد ڈال دی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی کوئی دلیل نازل نہیں کی۔

۱ وہ صحابہ رضی اللہ عنہم پر ان بہتان کی جسارت کر کے قابل اعتماد لوگوں کو کتاب اللہ اور سنت رسول سے پھسلانا چاہتے ہیں یہاں تک کہ وہ چاہتے ہیں کہ مسلمانوں کو ان کے دین سے ہٹادیں اور وہ غیر مسلموں کے راستے میں رکاوٹیں اور دام کھڑے کرنا چاہتے ہیں تاکہ کہیں ایسا نہ ہو کہ اسلام انہیں اپنے پرکشش محان، پلٹ کر رکھ دینے والی قوت اور پاکیزہ تعلیمات کی بدولت انہیں اپنی طرف کھینچ لے۔ ظلم یہ ہے کہ اس قوم کے تمام شبہات متشابہ ہیں اور ان کی تردید کے طریقے بھی علیحدہ متشابہات ہیں کیونکہ گزشتہ بالا مقدمہ کے بعد حفاظت اور بچاؤ کے وجوب کا تقاضا یہ ہے کہ ہم کتاب وسنت کے دفاع کے خطوط میں سے ایک مضبوط ترین خط قائم کریں اور اس خط کو دو طرح کے عنوانات کے تحت کھینچیں۔ پہلی قسم کے عوائل آسمانوں کو چھوتے ہے کیونکہ یہ ان عوائل اور دوامی کو ظاہر کرتے ہیں جو رسول اللہ ﷺ کے صحابہ رضی اللہ عنہم میں پائے جاتے تھے یہاں تک کہ وہ ان میں بھر پور کثرت کے ساتھ ہو گئے جن کی بدولت وہ قرآن وسنت کو حفظ کرتے اور انہیں متواتر مستفیض طریقے سے نقل کرتے اور دوسری قسم کے عوائل واسباب بھی آسمان سے تجاوز کرتے ہیں کیونکہ ان میں وہ دوامی اور عوائل پر دئے ہوئے ہیں جو صحابہ رضی اللہ عنہم میں باکمال طور پر پائے جاتے تھے یہاں تک کہ ان حضرات نے ان کی بدولت قرآن پاک میں بھر پور گہرائی اور دقت نظر حاصل کی اور قرآن اور متعلقات قرآن کو جمع کیا اور حدیث شریف اور اس کے متعلقات میں بھی بھر پور گہرائی اور دقت نظری حاصل کی۔

اور میں اس عظیم الشان ہم میں اللہ تعالیٰ سے رہنمائی اور توفیق کا سوال کرتا ہوں۔

﴿لِيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْ بَيِّنَاتٍ وَيَعْيِي مَنْ حَيَّ عَنْ بَيِّنَاتٍ وَإِنَّ اللَّهَ لَسَمِيعٌ عَلِيمٌ﴾ (الانفال: ۳۲)

”تا کہ ہلاک ہووے اتمامِ حجت کے بعد ہلاک ہو اور جو زندہ رہے وہ اتمامِ حجت کے بعد زندہ رہے، بے شک اللہ تعالیٰ سننے والا اور علم والا ہے۔“

**پہلا سبب** یعنی وہ دواعی اور اسباب جو صحابہ رضی اللہ عنہم میں کتاب و سنت اور انہیں نقل کرنے کے لیے پائے جاتے تھے۔

سب سے پہلے ہم ان عوامل اور اسباب کی تشریح کرتے ہیں جو صحابہ رضی اللہ عنہم کو کتاب و سنت کی حفاظت اور نقل کرنے میں میسر آئے تاکہ کوئی بھی ان عوامل و اسباب کو ان کے لیے بعید نہ سمجھے اور اس طریقے سے کتاب و سنت کے حصول میں کوئی بھی عیب جوئی نہ کرے۔

**پہلا عامل** پہلا عامل یہ ہے کہ وہ حضرات امی تھے (یعنی کسی سے پڑھے ہوئے نہیں تھے) نہ وہ پڑھنا جانتے تھے اور نہ ہی خط و کتابت کے ماہر تھے البتہ ایک بہت ہی تھوڑی سی جماعت تھی (جو پڑھی ہوئی تھی) ان کا حکم مجموعہ پر نہیں لگایا جاسکتا اور ان میں اس رچ بچی بسی اُمت کی وجہ سے دیہات پن کا غلبہ تھا اور شہری اسباب ان سے دور تھے اور اس وقت عالم کی دو مہذب جماعتیں جو علمی و سونگہ تھیں یعنی مشرق میں فارس اور مغرب میں روم یہ لوگ ان تک بھی رسائی نہیں کر سکتے تھے اور یہ بات یقینی ہے کہ کسی بھی امت میں اُمت کو ختم کر کے لکھنے کو فروغ دینا سادگی اور سیدھے پن کی طرز سے تہذیب و تمدن کی طرف نکلنے پر ہی موقوف ہے۔

پھر اس اُمت نے ان لوگوں کو ایسا بنا دیا تھا کہ جن چیزوں کو یاد کرنے اور محفوظ کرنے کی ضرورت ہوتی ہے ان میں وہ لوگ اپنے حافظے اور یادداشت کی طرف ہی رجوع کرتے اس وجہ سے صحابہ رضی اللہ عنہم کا رجوع اپنے حافظے کی طرف ہوتا تھا جسے وہ کتاب و سنت کے علم کے لیے اختیار کرتے تھے کیونکہ قرآن و حدیث کے علم کے احاطے کے لیے حافظہ ہی واحد راستہ ہے یا تقریباً واحد راستہ ہے۔

اگر ان لوگوں کے اندر کتابت شائع ہوتی تو وہ سطور و نقوش پر اعتماد کرتے نہ کہ سینے میں موجود حافظے پر، ہاں البتہ رسول اللہ ﷺ نے قرآن پاک کی کتابت پر بھی عمل کیا کہ آپ ﷺ کے کچھ کاتب تھے جو وحی لکھتے تھے اور بعض صحابہ رضی اللہ عنہم اپنے لیے بھی اسی طرح قرآن پاک لکھا کرتے تھے لیکن یہ اور وہ دونوں طرح کے حضرات اتنی بڑی اُمت میں ایک چھوٹی سی جماعت کی حیثیت رکھتے تھے اور شاید آپ کو یاد ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں قرآن پاک کی کتابت کی غرض، قرآن کریم کی اختیاط اور پختگی میں اضافہ کرنا تھا یعنی وہ اسے اپنے حافظے کے ذریعے محفوظ کر کے پھر قلم بند کرتے تھے۔ جبکہ سنت نبویہ کی کتابت سے آپ ﷺ نے اپنے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو اذلائع کیا تھا تاکہ قرآن پاک کے ساتھ خلط ملط نہ ہو جائے چنانچہ آپ ﷺ نے فرمایا:

(( لَا تَكْتُبُوا عَنِّي وَمَنْ كَتَبَ عَنِّي غَيْرَ الْقُرْآنِ فَلْيَنْحُهُ وَحَدِّثُوا عَنِّي فَلَا حَرَجَ وَمَنْ كَذَّبَ عَنِّي مُتَعَمِّدًا فَلْيَتَّبِعُوا مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ )).

”میری طرف سے کوئی بات مت لکھو جس نے بھی میری طرف سے کوئی بات لکھی ہو وہ مٹا دے اور میری طرف سے حدیث

”محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ“



بیان کرو! اس میں کوئی حرج نہیں اور جس نے مجھ پر جھوٹ بولا اسے اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنانا چاہیے۔<sup>①</sup>

ہاں البتہ رسول اللہ ﷺ کو ڈر ہوا کہ قرآن کریم، احادیث مبارکہ کے ساتھ خلط ملط نہ ہو جائے کیونکہ وہ لوگ جیسے قرآن پاک کو لکھتے اسی طرح احادیث مبارکہ کو بھی لکھا کرتے تھے یا وجہ یہ تھی کہ ان کی کوششیں منتشر تھیں وہ پورے قرآن اور پوری احادیث مبارکہ کو لکھ نہیں سکتے تھے اس لیے آپ ﷺ نے انہیں اولاً اہم یعنی قرآن پاک پر منحصر کیا خصوصاً جب ہمیں معلوم ہے کہ ان کے پاس کتابت کے اسباب بہت ہی کم تھے حتیٰ کہ وہ لوگ جیسا کہ آپ جان چکے ہو کہ وہ لوگ باریک سفید پتھروں، کھجور کی شاخوں اور ہڈیوں پر لکھا کرتے تھے۔

ایک طرف تو ان پر رحمت کرتے ہوئے دوسری طرف انہیں اہم ترین کو اہم پر مقدم کرنے پر مقید کرتے ہوئے نیز قرآن کی احادیث مبارکہ کے ساتھ مشتبہ ہونے سے حفاظت کرنے کی عرض سے آپ ﷺ نے انہیں کتابت حدیث سے منع کر دیا کیونکہ اوراق کی قلت اور کتابت کے آلات کی کمی کے پیش نظر انہوں نے احادیث مبارکہ کو قرآن پاک کے کنارے پر لکھ دیا تھا۔

پھر جب التباس کا خوف ختم ہو گیا اور خلط ملط ہونے کا ڈر نہ رہا اور ہر شخص کے لیے معاملہ آسان ہو گیا تو ان کے لیے قرآن پاک کی طرح احادیث مبارکہ لکھنے میں بھی کوئی حرج نہ رہا اس لیے وہ احادیث جو احادیث مبارکہ لکھنے کے بارے میں وارد ہوئی ہیں انہیں آخری حکم پر محمول کیا جائے گا نیز وہ احادیث جن میں کسی خاص شخص کو کتابت حدیث کی اجازت دی گئی انہیں بھی اسی پر محمول کیا جائے گا اور اس موضوع کے لیے ایک خاص بحث سے آگے آپ چاہیں تو اسے علوم حدیث میں تلاش کریں۔

جب تک قرآن وحدیث کی کتابت نہیں تھی تو ہر چیز سے قبل سب کا رجوع حافظے اور یادداشت پر تھا اور یہ رجوع آج تک ہوتا چلا آ رہا ہے کہ لوگوں کے سینوں سے یعنی ایک ثقہ سے دوسرے ثقہ اور ایک امام سے دوسرے امام تک نبی کریم ﷺ تک احادیث کو حاصل کیا جاتا ہے۔

اب اس کے علاوہ اور کیا ہے؟ کیا ایک آدمی اتنی ہے اور امت بھی اتنی ہے اور وہ دونوں حافظے میں دوسروں سے بڑھ کر ہیں اس کی وجہ وہی ہے جو ہم نے پیچھے آپ کو بتادی۔

**دوسرا عامل** صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ایک ایسی امت تھے کہ ذہانت، فراست، قوت حافظہ، مخلصانہ طبیعت، تیز فہمی اور دلجمعی میں ان کی مثال دی جاتی تھی۔ تاریخ عربیہ میں اس کے بہت سے شواہد ہیں جن کی تفصیل طول کلام کا باعث ہوگی شاید آپ کو بھی اس کا کچھ علم ہوگا حتیٰ کہ ان میں سے ایک شخص جو بھی سنتا تھا پہلی مرتبہ ہی اسے یاد کر لیا کرتا تھا خواہ وہ کتنا ہی زیادہ اور لمبا کیوں نہ ہو بعض اوقات وہ ان کی زبان اور لغت میں بھی نہیں ہوتا تھا بلکہ کسی دوسری زبان میں ہوتا تھا آپ کے لیے اتنا جاننا ہی کافی ہے کہ ان کے دماغ اشعار کے دفتر ہوتے تھے ان کے دل ان کے انساب کے رجسٹر ہوتے تھے اور ان کے دل ان کی جنگوں واقعات وحادث کی پوری کتاب ہوتی تھی۔ اسلام سے پہلے یہ تمام خصائص ان میں اور تمام امت عربیہ میں مضمحل تھے اس کے بعد اسلام آیا تو یہ صلاحیتیں اور قوتیں ان میں مزید تر ہو گئیں اور جب ان کی طبیعت میں مزید شائستگی آئی۔ ان کے دل مزید پاکیزہ ہوئے اور ان کی عقلوں میں مزید بلندی آئی تو ان کی خوبیاں اور خصائص کو مزید چار چاند لگ گئے خصوصاً جب وہ سچی ترین بات سنتے یعنی

① صحیح مسلم، ابی سعید خدری، کتاب الزہد والرتاقین حدیث ۷۲



کتاب اللہ سنتے اور بہترین رہنمائی یعنی محمد ﷺ کی رہنمائی کو سنتے۔

**تیسرا عامل** زندگی پر انحصار کرنا اور باکمال بننے میں اپنی کوشش اور وقت کو صرف نہ کرنا ہے بسا اوقات ان کے پاس چند لقمے ہوتے تھے جو ان کی کمر کو سیدھا کرتے تھے ان کی معیشت کو صرف اتنی مقدار کافی ہو جاتی تھی جسے شاعر اپنے قول میں اس طرح ذکر کرتا ہے:

وَمَا الْعَيْشُ إِلَّا نَوْمَةٌ وَتَبْتَاعُ  
وَتَسْمُو عَلَى رَأْسِ التَّخْيِيلِ وَمَاءُ  
نہیں ہے زندگی مگر تھوڑا سا سولینا اور سیدھا ہو جانا  
اور کھجور کے درخت پر کھجور اور پانی

آپ جیسے لوگ جانتے ہیں کہ اس طرح کی پر امن اور خاموش زندگی اور ایسی خوشگوار اور سیدھی زندگی بہت سادقت اور کوشش مہیا کر دیتی ہے اور انسان موجود پر راضی ہو جاتا ہے اور جو موجود نہیں ہوتا اس میں اس کا دل مشغول نہیں ہوتا اسی وجہ سے اس کا بڑا اثر سوچ کے خلوص، قوت، حافظہ اور تیز فہمی پر ہوتا ہے خصوصاً صحابہ رضی اللہ عنہم کے اذہان حفظ قرآن اور حفظ حدیث کی طرف متوجہ ہوتے تھے۔ یہ قائل کے مندرجہ ذیل قول کے مطابق ہے:

((فَصَادَفَ قَلْبُنَا خَالِيَنَا فَتَمَّ كُنَّا))

”خالی دل میں آ کر جاگزیں ہوئی۔“

**چوتھا عامل** ان کی اللہ عزوجل اور اس کے رسول ﷺ کے ساتھ سچی محبت اور ایسی محبت جو ان کے دل دماغ میں رچ بس چکی تھی اور ان کا پختہ اعتقاد بن چکی تھی اور آپ علم نفیات میں بخوبی جانتے ہیں کہ محبت جب کبھی ہو اور رسوخ پڑ جائے تو محبت کرنے والے کو اپنے محبوب کی یادگاروں کو سوچنے، اس کی بات سے لذت حاصل کرنے کی خبروں کو انوکھا سمجھنے اور اس سے صدار ہونے والے عمل اور منہ سے نکلنے والی ہر بات کو محفوظ کرنے پر مجبور کر دیتی ہے اسی طرح صحابہ رضی اللہ عنہم کی اللہ تعالیٰ سے محبت کتاب اللہ اور سنت رسول کو یاد کرنے کا قوی ترین عامل ہے جیسا کہ قائل نے کہا:

لَهَا أَحَادِيثُ مِنْ ذِكْرِكَ تَسْمَعُهَا  
عَنِ الْعَرَابِ وَ تَلْهِنُهَا عَنِ الرَّادِ  
لَهَا بِوَجْهِكَ نُورٌ يُسْتَضَاءُ بِهِ  
وَمِنْ حَدِيثِكَ فِي أَعْقَابِهَا حَادِ  
إِذَا سَكَّتَ مِنْ لَلَالِ السَّيْرِ وَ أَعَدَّهَا  
رُوحُ الْقُدُومِ فَتَحْتِنَا عِنْدَ مِينَادِ

جبکہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی اللہ تعالیٰ سے گہری محبت اتنی زیادہ تھی کہ اس کی تشریح اور بیان کی ضرورت نہیں اور نہ ہی اس پر دلائل اور براہین قائم کرنے کی ضرورت ہے وہ خیر القرآن کے لوگ تھے، جیسا کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ”خیر القرون قرنی ثلثہ الذین یلونہم“ (سب سے بہتر میرا زمانہ ہے پھر اس کے بعد والا) یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنی جانیں اور قیمتی مال بالکل بے قیمت کر کے اس کی رضا کے راستے میں خرچ کر دیے یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اللہ تعالیٰ کا فضل تلاش کرتے ہوئے دنیا کو ان چیزوں کے بدلے فرودخت کر دیا جن میں وہ لوگ اللہ تعالیٰ کی رضا تلاش کیا کرتے تھے یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اسلام کی ہدایت کو

## مسائل العرفان فی علوم القسّر ان: جلد ۱

مشرق و مغرب تک پہنچایا اور دعوت اسلامیہ کی کامیابی کے حصول میں ہر شہر اور ہر دیہات میں عجیب و غریب اعمال پیش کیے اور وہی اس لائق تھے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی قرآن پاک میں بارہا تعریف کی اور رسول اللہ ﷺ نے اپنی عظیم الشان احادیث میں ان کی خوب تعریف کی۔

اور رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ان کی محبت کے مظاہر کو ان کی سچی تاریخ نے ظاہر کیا کہ کوئی کسی سے بھی اتنی محبت نہیں کرتا جتنا کہ وہ محمد ﷺ کے صحابہ کرام کے ساتھ محبت کرتا ہے ان میں سے ہر آدمی کا خون رسول اللہ ﷺ کے قدم کے نیچے لگنے والے لگانے پر بھی قربان ہے آپ ﷺ کے وضو کا پانی سخت سردی کے دنوں میں بھی بھاگ کر لیتے اور اس سے برکت حاصل کرتے ان کا باپ یا بیٹا اگر رسول اللہ ﷺ کے ساتھ دشمنی کرتا ہوتا تو وہ ان کے بدترین دشمنوں میں سے ہوتا اور محمد ﷺ کی حدیث کے لیے ان کے مردوں اور عورتوں میں ہر ایک کے دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرتا یہاں تک کہ یہ عورتوں کی نمائندگی کرنے والی ہے جو رسول اللہ ﷺ سے عرض کر رہی ہے کہ ”یا رسول اللہ ﷺ ہم پر ہمارے مرد آپ سے فائدہ حاصل کرنے میں ہم پر غالب ہیں آپ ہمارے لیے کوئی دن مقرر فرمادیں جس میں ہم آپ کے پاس آئیں اور آپ ہمیں وہ علم سکھلا دیں جو اللہ تعالیٰ نے آپ کو سکھلایا“ اس کے علاوہ بہت سے شواہد اور مظاہر ہیں جو اس عظیم اور شریف محبت کی انتہا پر دلالت کرتے ہیں اس شعر کے قائل پر اللہ تعالیٰ رحم فرمائے۔

أَسْرَتٌ قُرَيْشٌ مُّسْلِمًا فِي غَزْوَةٍ  
قَرِيشٌ نَے ایک مسلمان کو کسی غزوہ میں قید کر لیا  
فَتَصْحَبِي بَلَاءٌ وَجَلِي إِلَى السِّيَافِ  
اور بے خوف ہو کر جلا دے پاس پہنچ گیا  
وَأَنَّكَ النَّبِيُّ فِئْتِي مِنَ الْإِتْلَافِ  
اور نبی کریم ﷺ کو تمہاری جگہ قتل کر دیا جائے  
وَيُضَابُ أَنْفُ مُحَمَّدٍ بِرُ عَافٍ  
اس نے جواب دیا کہ ہرگز نہیں یہ کبھی نہیں ہو سکتا کہ میں ہلاکت سے بچ جاؤں۔ اور نبی کریم ﷺ کی ناک سے نکسیر بھی پھوٹ پڑے۔“

اس محبت کے مظاہر میں سے (جیسا کہ آپ دیکھ چکے) ان کا کتاب اللہ کی طرف ایک دوسرے سے آگے بڑھنا ہے کہ وہ اسے آپ ﷺ سے حاصل کرتے اور اسے محفوظ کرتے۔ اس کے بعد آپ ﷺ کی نورانی سنت کی طرف پیش قدمی کرتے اور آپ ﷺ کے اقوال، افعال اور تقریرات کو پوری طرح سے یاد کرتے بلکہ آپ ﷺ کے طریقے اور اقوال کی بحث، اس کی صفت اور شکل پر آگاہی میں مہارت حاصل کرتے جیسا کہ آپ کو واضح ہو گا کہ حضرت حسن و حسین رضی اللہ عنہما نے رسول اللہ ﷺ کے حلیہ کے بارے میں کیسے سوال کیا؟ اور ان کے والد حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہما اور ان کے ماموں ہند بن ابی ہالہ رضی اللہ عنہما کے ذریعے انہیں کس طرح جواب دیا گیا محمد ﷺ کی شاندار صورت اور مصور ماہر اور صانع قادر کے حکم سے کیسا متشکل کیا۔ (ترزی کتاب اشہال)

قرآن پاک کی بلاغت جو اس حد تک ہے کہ ہر بیان پر فائق ہے اور اس نے ہر زبان کو گونگا کر کے رکھ دیا اور ہر معارض اور مخالف کی زبان بند کر کے رکھ دی اور ہر جھگڑنے والے اور ہر اٹنی سیدھی مارنے والے کی کمر توڑ کر رکھ دی یہاں تک کہ اس کا مقام قائم ہو گیا اور یہ مقام دنیا میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے حبیب ﷺ اور حق تعالیٰ کی

طرف سے اس کے رسول اللہ ﷺ کی تائید بن کر قائم و دائم رہے گا۔ اللہ تعالیٰ کے کلام کے اعجاز اور بلاغت کے بعد حضرت محمد ﷺ کا کلام ہے جو اپنی چمک دیک، خوشنمائی اور فوقیت میں نیز اپنے الفاظ کی فصاحت اور اپنے معانی اور ہدایت کی رفعت میں اپنی مثال آپ ہے۔ آپ ﷺ لوگوں میں سب سے زیادہ فصیح و بلیغ تھے اور عرب میں اس اعتبار سے اپنے تمام فصحاء بلغاء کی وجہ سے مقتدا کی حیثیت رکھتے تھے اور سب سے اچھی نظم اور سب سے اچھی نثر کو یاد کر کرنے میں ایک دوسرے سے آگے بڑھتے تھے اسی بناء پر ان میں ایک ہوا چل پڑی کہ ہر شخص قرآن پاک کو حفظ کرنے، اسے سمجھنے اور اس پر عمل کرنے میں لگ گیا ان کا سونا جاگنا قرآن پاک کے ساتھ ہو گیا اسی طرح سنت نبویہ کو یاد کرنا اور اس پر عمل کرنا بھی قرآن کی طرح ان کی توجہ کا مرکز بن گیا وہ اس کی ایک دوسرے سے ہدایت کرتے اور اس میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے جیسا کہ آپ ﷺ کے ہونے لگے۔

قرآن پاک کی بلاغت کے رموز اور اس کے اعجاز کی وجہ نیز کلام نبوت کی بلاغت اور اس کا امتیاز اور میدان بیان میں عربوں کا ایک دوسرے سے آگے بڑھنا یہ سب چیزیں ایسی ہیں کہ کسی شرح و بیان کی محتاج نہیں ادھر اللہ تعالیٰ کی کتاب ہے جو ہمارے سامنے حق ہی بولتی ہے یہ وہ کتاب ہے جو تمام مخلوق کو اپنے اعجاز کا نتیجہ کرتی ہے اور ادھر نبوت کا سمندر ہے جو ہر گوہر اور ہر موتی کو چار چاند لگا دیتا ہے اور اپنی کامل ہدایات اور گراں قدر حکمتوں کی بدولت ٹھانٹیں مارتا ہے اور اس طرف عربی ادب کی تاریخ ہے جو صناعت کلام میں ان عربوں کی فوقیت اور فصاحت کے میدان میں ان کی تمام مخلوق پر سبقت اور اسرار بلاغت خصوصاً قرآن پاک کی بلاغت کے ذوق میں ان کے امتیاز کو محفوظ اوراق میں مندرج کرتی ہے۔

کتاب وسنت کے علم و عمل، حفظ و فہم اور تعلیم و نشر کی ترغیب اور اسی طرح ان سے اعراض اور لا پر دہی سے چھٹا عامل

ترہیب۔

قرآن پاک میں ہم اللہ تعالیٰ سبحانہ کا ارشاد پڑھتے ہیں کہ:

﴿إِنَّ الَّذِينَ يَتْلُونَ كِتَابَ اللَّهِ وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ وَالْفَقْرَاءَ مِمَّا رَزَقْنَاهُمْ سِرًّا وَعَلَانِيَةً يَرْجُونَ تِجَارَةً لَّنْ تَبُورَ ۚ لِيُؤْتِيَهُمْ أَجْرَهُمْ وَيَزِيدَهُمْ مِنْ فَضْلِهِ ۗ إِنَّكَ عَفُورٌ شَكُورٌ ۝﴾ (فاطر: ۲۹، ۳۰)

”جو لوگ خدا کی کتاب پڑھتے اور نماز کی پابندی کرتے ہیں اور جو کچھ ہم نے ان کو دیا ہے اس میں پوشیدہ اور ظاہر خرچ کرتے ہیں وہ اس تجارت (کے فائدے) کے امیدوار ہیں جو کبھی تباہ نہیں ہوگی۔ کیونکہ خدا ان کو پورا پورا بدلہ دے گا اور اپنے فضل سے کچھ زیادہ بھی دے گا وہ تو بخشنے والا (اور) قدر دان ہے۔“

آپ نور فرمائیں کہ کیسے اللہ تعالیٰ نے تلاوت قرآن کو نماز قائم کرنے اور زکوٰۃ ادا کرنے پر مقدم کیا؟ اور آپ دیکھیں کہ ہم قرآن پاک میں اللہ جل ذکرہ کا یہ ارشاد بھی پڑھتے ہیں:

﴿كِتَابٌ أَنْزَلْنَاهُ إِلَيْكَ مُبَارَكٌ لِيَدَّبَّرُوا آيَاتِهِ وَلِيَتَذَكَّرَ أُولُو الْأَلْبَابِ ۝﴾ (ص: ۲۹)

”(یہ) کتاب جو ہم نے تم پر نازل کی ہے بابرکت ہے تاکہ لوگ اس کی آیتوں میں غور کریں اور تاکہ اہل عقل نصیحت پکڑیں۔“ اب آپ دیکھیں کہ اللہ تعالیٰ نے اس باکمال طریقے سے قرآن میں تدبر، نصیحت اور وعظ حاصل کرنے کی کس طرح

ترغیب دی ہے؟ اسی طرح ہم اللہ تعالیٰ عزوجل کا قول پڑھتے ہیں کہ:

﴿إِنَّ الَّذِينَ يَكْتُمُونَ مَا أَنْزَلْنَا مِنَ الْبَيِّنَاتِ وَالْهُدَىٰ مِنْ بَعْدِ مَا بَيَّنَّاهُ لِلنَّاسِ فِي الْكِتَابِ ۖ أُولَٰئِكَ يَلْعَنُهُمُ اللَّهُ وَيَلْعَنُهُمُ النَّجِيُّونَ ۗ (الَّذِينَ تَابُوا وَأَصْلَحُوا وَبَيَّنُّوا فَأُولَٰئِكَ أَتُوبُ عَلَيْهِمْ ۗ وَأَنَا التَّوَّابُ الرَّحِيمُ ﴿۱۶۰﴾﴾ (البقرہ: ۱۵۹-۱۶۰)

”جو لوگ ہمارے حکموں اور ہدایتوں کو جو ہم نے نازل کی ہیں (کسی غرض فاسد سے) چھپاتے ہیں باوجودیکہ ہم نے ان لوگوں کے (سمجھانے کے) لیے اپنی کتاب میں کھول کھول کر بیان کر دیا ہے ایسوں پر خدا اور تمام لعنت کرنے والے لعنت کرتے ہیں۔ ہاں جو توبہ کرتے ہیں اور اپنی حالت درست کر لیتے اور (احکام الہی کو) صاف صاف بیان کر دیتے ہیں تو میں ان کے قصور معاف کر دیتا ہوں اور میں بڑا معاف کرنے والا (اور) رحم والا ہوں۔“

اب آپ نور کریں کہ قرآن پاک اور اس کی ہدایت کو چھپانے والے کی وعید کس طرح ہے؟

اس کے بعد آپ ﷺ کا قول پڑھتے ہیں کہ:

((ما اجتمع قوم في بيت من بيوت الله يتلون كتاب الله ويتدارسونه بينهم الا نزلت عليهم السكينة وغشيتهم الرحمة وحفتهم الملائكة وذكروا هم الله فيمن عندنا)).

”اللہ تعالیٰ کے گھروں میں سے کسی گھر میں کوئی بھی قوم جمع ہوتی ہے اور کتاب اللہ کی تلاوت اور اس کا آجس میں دور کرتی ہے تو ان پر ضرور سکینت نازل ہوتی ہے اور رحمت انھیں ڈھانپ لیتی ہے اور فرشتے انھیں گھیر لیتے ہیں اور اللہ تعالیٰ ان کا ذکر اس مخلوق میں کرتا ہے جو اس کے پاس ہے۔“ ①

نیز صحیح بخاری کتاب الفضائل میں اور مسلم شریف میں بھی ہم ایک حدیث پڑھتے ہیں کہ:

((خَيْرُكُمْ مَنْ تَعَلَّمَ الْقُرْآنَ وَعَلَّمَهُ)).

”تم میں سے سب سے بہترین وہ ہے جو قرآن پاک کو سیکھے اور سکھائے۔“

اور ابوداؤد، ترمذی اور ابن ماجہ میں ہم پڑھتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ:

((عرضت على دنوب امي فلما اردتبا اعظم من سورة القرآن واية اوتيهارجل ثم نسيها)).

”میرے سامنے امت کے گناہ پیش کیے گئے میں نے اس سے بڑھ کر کوئی گناہ نہیں دیکھا کہ کسی آدمی کو قرآن پاک کی

کوئی سورۃ یا آیت ملی ہو اور وہ اسے بھلا دے۔“ ②

کیا یہ اور اس جیسی بہت سی مثالیں ایسی نہیں ہیں جو ہماری ہمتوں کو ابھارتی اور عزائم کو متحرک کرتی ہیں کہ قرآن پاک کو حفظ کیا جائے اسے اپنے سینے میں محفوظ کیا جائے اور اس کی ہمیشہ تلاوت کی جائے کہیں ایسا نہ ہو کہ اسے بھلانے کی وعید میں وقوع ہو جائے اور وہ وعید بہت سخت ہے جیسا کہ آپ کن پکھے ہو۔

① مسلم کتاب الامارت ۱۳۸، مسند احمد ۲/۲۳۲ اور ۳۵۵

② ابوداؤد کتاب الصلوٰۃ ترمذی ثواب القرآن ۱۹۰

جبکہ سنت نبویہ کی شان میں آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ:

﴿وَمَا أَنْتُمْ بِالرُّسُولِ فَخُذُوهُ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوا﴾ (البقرہ: ۷)

”اور رسول جو کچھ تمہارے پاس لائیں اسے لے لو اور جس سے منع کر دیں اس سے رک جاؤ۔“

نیز فرمایا کہ:

﴿مَنْ يُطِيعِ الرَّسُولَ فَقَدْ أَطَاعَ اللَّهَ﴾ (النساء: ۸۰)

”جس نے رسول ﷺ کی اطاعت کی اس نے اللہ تعالیٰ کی ہی اطاعت کی۔“

اور فرمایا کہ:

﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَن كَانَ يَرْجُوا اللَّهَ وَالْيَوْمَ الْآخِرَ وَذَكَرَ اللَّهَ كَثِيرًا﴾ (الاحزاب: ۲۱)

”تم کو پیغمبر خدا کی پیروی (کرنی) بہتر ہے (یعنی) اس شخص کو جسے خدا (سے ملنے) اور روز قیامت (کے آنے) کی امید ہو اور وہ خدا کا ذکر کثرت سے کرتا ہو۔“

نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ:

﴿فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتَّىٰ يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِي أَنفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا﴾ (النساء: ۶۵)

”تمہارے پروردگار کی قسم یہ لوگ جب تک اپنے تنازعات میں تمہیں منصف نہ بنائیں اور جو فیصلہ تم کر دو اس سے اپنے دل میں تنگ نہ ہوں بلکہ اس کو خوشی سے مان لیں تب تک مومن نہیں ہوں گے۔“

سنت نبویہ یعنی حدیث شریف کی ترغیب میں آپ ﷺ کا قول آیا ہے کہ:

((نصرت اللہ امر اسمع منا حدیثاً فاذاہ کما سمعہ فرب مبلغ او عی من سامع))

”اللہ تعالیٰ ناس فیض کو سرسبز و شاداب رکھے جس نے ہماری کوئی حدیث سنی ہو اور وہ اسے ایسے آگے پہنچا دے جیسا اس نے

سنی بہت سے ایسے لوگ جن کے پاس حدیث پہنچی ہو وہ حدیث کو سننے والوں سے بھی زیادہ یاد کرنے والے ہوتے ہیں۔“ ①

یہ ایک متواتر حدیث ہے اور آپ ﷺ نے اپنے حجۃ الوداع کے خطبہ میں فرمایا کہ:

((الافلیبلغ الشاهد الغائب لعل بعض من یبلغه ان یکون او عی له من بعض من سمعہ))

”خبردار! موجود لوگ غائبین تک پہنچا دیں ہو سکتا ہے کہ جس تک پہنچے وہ سننے والوں میں سے بھی کسی سے زیادہ یاد کرنے

والا ہو۔“ ②

① سنن ابوداؤد کتاب العلم ۱۰، سنن ترمذی کتاب العلم ۷، ابن ماجہ کتاب الماک ۷۶، مسند دار المقدمہ ۲۴، مسند احمد ۴۳

② صحیح بخاری کتاب العلم باب ۹، کتاب العید ۱۸، الاطعمہ ۵، العن ۱۸، صحیح مسلم کتاب الحج حدیث ۳۳۶



اور سنت سے اعراض کرنے پر وعید کے طور پر آپ ﷺ کا ارشاد وارد ہوا ہے کہ:  
(من رغب عن سنتی فلیس منی))۔

”جس سے میری سنت سے منہ موڑا وہ مجھ سے نہیں ہے۔“ ①

آپ ﷺ نے فرمایا کہ:

”کیا ایسا ہونے والا نہیں ہے کہ ایک آدمی کو میری حدیث پہنچے گی اور وہ اپنے تخت پر تکیہ لگائے ہوئے بیٹھا ہوگا اور کہہ رہا ہو گا کہ ہمارے اور تمہارے درمیان کتاب اللہ کافی ہے ہمیں اس میں جو حلال ملا ہم نے اسے حلال سمجھا اور اس میں ہم نے جو حرام پایا اسے حرام سمجھا رسول اللہ ﷺ نے جسے حرام کیا وہ بھی اللہ تعالیٰ کے حرام کردہ کی طرح ہے۔“ ②

ابوداؤد نے اس کے شروع میں یہ بھی اضافہ کیا کہ:

(انی اوتیت الکتاب ومثلہ معہ))۔

”بے شک مجھے کتاب دی گئی اور اس کے ساتھ اس جیسا اور بھی۔“

اب آپ اس جیسی آیات کریمہ اور احادیث شریف میں دیکھتے ہیں کہ ایک ضعیف مومن کی ہمت کو نبوت کی امتیازی خصوصیات کی طرف توجہ کرنے کے لیے کس طرح ابھارتی ہیں کہ ان سے ہدایت طلب کی جائے اور نبی کریم ﷺ کی انوکھی اور بے مثال باتوں کو یاد کیا جائے آپ تو کجا صحابہ رضی اللہ عنہم کو دیکھیں کہ وہ اس میدان میں تو اتنا اور بلند ہمت ہونے میں بے مثال ہے۔

کتاب وسنت کا دین میں مرتبہ ہے، چنانچہ کتاب اللہ ہی شریعت کی اصل اول ہے اور کتاب اللہ ہی دنیا سا تو اوا عامل اور آخرت کا جامع ترین دستور ہے اور کتاب اللہ ہی وہ منظم قانون ہے جو انسان کا اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق قائم کرتا ہے اور یہی وہ منظم قانون ہے جو انسان کا ان تمام چیزوں کے ساتھ تعلق وابستہ کرتا ہے جس میں وہ بستا ہے۔ اس کے بعد سنت ہے جو شریعت کی اصل ثانی ہے اور سنت ہی قرآن پاک کی شرح کرتی ہے اس کے مجمل کی تفصیل مطلق کو مقید، اس کے عام کو خاص اور اس کے بہم کو تبیین کرتی ہے نیز اس کے رموز و اسرار کو ظاہر کرتی ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ:

﴿وَ أَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتَابَ الَّذِي كَرَّمْنَا بِالنَّبِيِّينَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُونَ﴾ (آئل: ۳۴)

”اور ہم نے تم پر بھی یہ کتاب نازل کی ہے تاکہ جو (ارشادات) لوگوں پر نازل ہوں ہیں وہ ان پر ظاہر کر دو تاکہ وہ غور کریں۔“

اسی بنا پر یحییٰ بن کثیر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ”سنت کتاب پر قاضی ہے اور کتاب اللہ سنت پر قاضی نہیں ہے“ امام سیوطی رضی اللہ عنہ نے ان کلمات کی مراد کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا کہ ”خلاصہ یہ کہ قرآن پاک کے سنت کی طرف محتاج ہونے کا معنی یہ ہے کہ سنت عمرآن پاک کی وضاحت کرتی ہے اور اس کے جملات کی تفصیل کرتی ہے کیونکہ اس کی بلاغت اور اختصار کی وجہ سے اس میں موتی ہیں جس کے چھپے ہوئے مخفی رازوں کو جاننے اور انھیں ظاہر کرنے والے کی ضرورت ہے اور یہی وہ چیز ہے جو آپ ﷺ پر نازل ہوئی

① مسلم شریف کتاب النکاح حدیث ۸

② ابوداؤد سنن ابن ماجہ المقدمہ ۲، سنن ترمذی کتاب العلم ۱۰، مسند الدارمی مقدمہ ۳۹، مسند احمد ۱۳۲/۴



## مناب العرفان فی علوم القرآن: جلد ۱

ہے اور سنت کے کتاب اللہ پر قاضی ہونے کا مطلب بھی یہی ہے جبکہ قرآن ایسا نہیں ہے کہ وہ سنت کی وضاحت کرے اور نہ ہی اس کا قاضی ہے کیونکہ وہ خود ہی واضح ہے اس لیے کہ یہ آغاز اور ایجاز میں قرآن کی حد تک نہیں پہنچ سکتی کیونکہ یہ اس کی شرح ہے اور شرح کی شان یہی ہوتی ہے کہ وہ شروع سے زیادہ واضح سمین ہوتی ہے۔“

اور اس بات میں کوئی شک نہیں کہ صحابہ رضی اللہ عنہم کتاب و سنت کے مرتبہ کو خوب جانتے تھے اور اس میں کوئی تعجب نہیں کہ وہ اسے سمجھنے، یاد کرنے اور اس پر عمل کرنے میں خوب حریص تھے۔

**آٹھواں عامل** بہت سے واقعات و حوادث اور بہت سے سوالوں کا کلام اللہ اور کلام رسول کے ساتھ مرتبط ہونا ان کی شان بھی یہی ہے کہ اس کا بھرپور اہتمام ہو، اذہان چوکنا ہوں اور سوچ و فکر متوجہ ہو کہ اس بارے میں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کا کیا فیصلہ ہوتا ہے اور اس بارے میں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی کیا بات ہوتی ہے اور کیا جواب ارشاد ہوتا ہے اسی وجہ سے وحی الہی اور کلام نبوی نفوس میں اچھی طرح راسخ ہو جاتا ہے اور زمانے کے گزرنے کے ساتھ ساتھ اذہان میں منقش ہوتا چلا جاتا ہے۔

اب آپ ایک مرتبہ قرآن پاک کے باغات میں سیر کیجئے آپ کو اس کے تجدد و وقوع میں حوادث و آفات آتے جاتے نظر آئیں گے کبھی تو یہ قرآن پاک سوال کرنے والوں کے سوالوں کے جوابات دے رہا ہوگا جیسے:

﴿وَيَسْأَلُونَكَ عَنِ الزَّوْجِ الَّذِي زُوِّجْنَا مِنْهُ قُلِ اللَّهُمَّ إِنِّي سَأَلْتُكَ عَنِ الزَّوْجِ الَّذِي زُوِّجْنَا مِنْهُ قُلِ اللَّهُمَّ إِنِّي سَأَلْتُكَ عَنِ الزَّوْجِ الَّذِي زُوِّجْنَا مِنْهُ قُلِ اللَّهُمَّ إِنِّي سَأَلْتُكَ عَنِ الزَّوْجِ الَّذِي زُوِّجْنَا مِنْهُ﴾ (النور: ۸۵)

”اور تم سے روح کے بارے میں سوال کرتے ہیں۔ کہہ دو کہ وہ میرے پروردگار کی ایک شان ہے۔ اور تم لوگوں کو (بہت ہی) کم علم دیا گیا ہے۔“

کبھی یہ پیش آمدہ مشکل کی وضاحت اور طاری شدہ فتنے کا فیصلہ کر رہا ہوتا ہے جیسے اللہ تعالیٰ کا قول:

﴿إِنَّ الَّذِينَ جَاءُوا بِالْإِفْكِ عُصْبَةٌ مِّنْكُمْ لَا تَصْبُوهَا شَرًّا لَّكُم بَلْ هُوَ خَبْرٌ لَّكُم﴾ (النور: ۱۱)

”بے شک جو لوگ بہتان لے کر آئے وہ تمہارے اندر کی ایک جماعت ہے تم اسے اپنے لیے برامت سمجھ بلکہ یہ تمہارے لیے بہتر ہے۔“

أُولَئِكَ مُبَرَّءُونَ مِمَّا يَقُولُونَ لَهُمْ مَغْفِرَةٌ وَرِزْقٌ كَرِيمٌ﴾ (النور: ۲۶) تک

”یہ لوگ بڑی ہیں اس بات سے جو یہ لوگ کہہ رہے ہیں ان کے لیے مغفرت اور عزت کی روزی ہے۔“

یہ سورت نور کی چھ آیات ہیں جو بڑے خوفناک ترین واقعہ کے بارے میں نازل ہوئیں۔ وہ واقعہ حضرت ام المؤمنین سیدہ جلیلہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پر تہمت ہے وہ عائشہ رضی اللہ عنہا جو رسول اللہ ﷺ کی زوجہ محترمہ وہ عائشہ رضی اللہ عنہا جو حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی بیٹی ہیں۔ ان آیات میں اجتماعی اسباق ہیں جنہیں پڑھا گیا اور قیامت تک لوگوں کے سامنے پڑھی جاتی رہیں گی اور اس پاک دامن پاکیزہ خاتون کی برأت محفوظ اوراق میں لکھی جاتی رہے گی یہ وہ برأت ہے جو سات آسمان سے نازل ہوئی۔

کبھی یہ قرآن مسلمانوں کی فکروں کو ان کی غلطی کی تصحیح کی طرف متوجہ کرتا ہے اور انہیں درنگی کے طور طریقے کی طرف

رہنمائی کرتا ہے جیسا کہ سورۃ آل عمران آیت ۱۲۱ میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ:

﴿وَإِذْ عَدَوْتُ مِنْ أَهْلِكَ تُبَوِّئُ الْمُؤْمِنِينَ مَقَاعِدَ لِلْقِتَالِ﴾ (آل عمران: ۱۲۱)

”اور جب آپ اپنے گھروالوں سے نکل کر موئین کو لڑائی کے ٹھکانوں پر بٹھلا رہے تھے۔“

اس کے بعد والی بہت سی آیات تک۔

یہ تمام آیات غزوہ احد کے بارے میں نازل ہوئیں جو مسلمانوں کی اس خوفناک موقع پر ان کی غلطی پر رہنمائی کر رہی ہیں اور انھیں کسی دوسرے موقعہ پر ایسے ہولناک پریشان کن معاملہ میں واقعہ ہونے سے بچنے پر تشبیہ کر رہی ہیں۔

اسی طریقے پر قرآن پاک میں سورتیں اور آیات اس قدر نازل ہوئی ہیں کہ انھیں شمار نہیں جاسکتا اور نہ ہی وہ گنی جاسکتی ہیں۔

اور جب آپ حدیث نبوی شریف کے بانوں میں گھومیں تو آپ کو اس باب میں بھی عجیب و غریب چیزیں نظر آئیں گی۔

آپ محزو میہ کا قصہ ہی دیکھ لیں جس نے چوری کی تھی اور اس کے بارے میں سفارش کرنے والے کو رسول اللہ ﷺ نے کیا فرمایا کہ:

((وایہ اللہ لو ان فاطمۃ بنت محمد سرقت لقطعتم یدھا)).

”خدا کی قسم اگر فاطمہ بنت محمد ﷺ بھی چوری کرتیں تو بھی میں اس کا ہاتھ ضرور کاٹتا۔“ ①

اس کے بعد آپ غور کریں قبیلہ جہینہ کی اس عورت کی حدیث کے بارے میں جس نے رسول اللہ ﷺ کے سامنے زنا کا

اقرار کیا اور وہ زنا سے حاملہ تھی آپ ﷺ نے کیا حکم جاری فرمایا؟ کہ اس کے وضع حمل تک اس کے ولی نے اس کی کفالت کی اس کے

بعد اسے لایا گیا اور اسے رجم کیا گیا پھر رسول رحمت ﷺ نے اس کا نماز جنازہ پڑھایا۔ اور جب آپ ﷺ سے سوال کیا گیا کہ

آپ ﷺ اس کا جنازہ کیسے پڑھ رہے ہیں حالانکہ وہ زانیہ تھی آپ ﷺ نے فرمایا کہ اس نے ایسی توبہ کی کہ اگر اہل مدینہ سے ستر

افراد پر بھی تقسیم کر دی جائے تو انھیں کافی ہو جائے کیا اس سے بڑھ کر بھی کوئی افضل چیز آپ نے دیکھی کہ اس نے اپنی جان کو اللہ تعالیٰ

عزوجل کے لیے قربان کر دیا۔ ②

آپ غور کریں حدیث جبریل علیہ السلام میں کہ اس میں جبریل علیہ السلام رسول اللہ ﷺ سے اسلام ایمان، احسان اور قیامت اور

اس کی علامت کے بارے میں سوال کر رہے ہیں جبکہ صحابہ رضی اللہ عنہم اسے دیکھ رہے ہیں اور سن رہے ہیں اور آخر میں آپ ﷺ انھیں

فرماتے ہیں کہ یہ جبریل علیہ السلام ہیں جو تمہارے پاس آئے تھے تاکہ وہ تمہیں تمہارا دین سکھائیں۔ ③

سنو نبوی میں غور کرنے سے بہت سی مثالیں ملیں گیں جو اسی طرح کے واقعات حوادث اور سوالوں کے گرد گھوم رہی ہوں

گی۔ علمائے نفسیات کے نزدیک یہ بات طے ہے کہ معلومات کا ان کے ساتھ فکر میں مقترن امور کے ساتھ ارتباط انھیں زمانے تک

دیر پورا ورنفوس میں ثابت قدم رکھتا ہے اس لیے یہ بات کوئی انوکھی نہیں کہ ہم نے جو ذکر کیا وہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے لیے کتاب اللہ اور

① بخاری فہماک اصحاب النبی ﷺ ۱۸، کتاب الحدود ۱۲، مسلم کتاب الحدود حدیث ۸، ۱۹، ابوداؤد ۴، ترمذی کتاب الحدود ۶،

نسائی کتاب السارق ۵، ابن ماجہ کتاب الحدود ۶، دارقطنی کتاب الحدود ۵، مسند احمد ۳۸۶/۳

② صحیح مسلم کتاب الحدود ۲۳، ترمذی کتاب الحدود ۹، مسند احمد ۴۳۰/۴

③ بخاری کتاب الامایان باب ۳، مسلم کتاب الامایان ۱۴، ابوداؤد کتاب السنۃ ۱۶، نسائی کتاب المواعیت ۱۶، ابن ماجہ مقدمہ ۵، مسند احمد ۱۵/۱

سنت رسول ﷺ کو حفظ کرنے کا باعث اور سبب بن گیا اور ایسے وقت جبکہ وہ حضرات ان واقعات و حوادث کا مشاہدہ کر رہے تھے اور خطاب حق کو بالمشافہ سن رہے تھے اور سید الخلق کے کلام کو آسنے سامنے سن رہے تھے اور یہ سننا اور مشاہدہ کرنا بھی ان موزوں مناسبات اور قائم شدہ اسباب میں تھا جنہوں نے ان کے نفوس کو ان واقعات میں اللہ تعالیٰ کے فیصلے کا منتظر بنا دیا اور ان کے بارے میں رسول اللہ ﷺ کے ارشادات کا نقشہ بنا دیا چنانچہ کلام ان مشتاق لوگوں پر ایسے اترتا جیسے خشک زمین پر بارش اترتی ہے اور وہ زمین اسے حریص و مشتاق ہو کر پٹی جاتی ہے اور اسے قلبی نگاہ کے ساتھ لیتی ہے اور اسے تھامتھی اور بیداری میں اس پر حریص ہوتی ہے اور اس کے ذریعے سرسبز و شاداب ہوتی ہے اور اسے حقیقت شمار کرتی ہے اس سے نفع حاصل کرتی ہے اور نفع پہنچاتی ہے بلکہ اس کے ذریعے وہ سرسبز و زرخیز ہوتی ہے پھلتی بڑھتی ہے اور ہر طرح کے تر و تازہ جوڑے لگاتی ہے۔

قرآن پاک ہمیشہ اعجاز کے ساتھ ہی مقہر ن رہا ہے اور بعض احادیث نبویہ ایسے امور کے ساتھ ملی ہوئی ہیں جو عادت کے خلاف ہیں جو دل کو حیران کر دیتے ہیں دیکھنے والے کا شوق بڑھاتے اور سننے والے کو مہبوت کر دیتے ہیں۔ ہم نے اس اعجاز اور خرق عادت کو حفظ صحابہ رضی اللہ عنہم کے عوامل میں شمار کیا اس لیے کہ جو چیز عام ضابطے اور قانون کے مطابق ہوتی ہے اس کی شان یہ ہوتی ہے کہ جو بھی اس کا مشاہدہ کرتا ہے وہ اس کے حافظہ میں بیٹھ جاتی ہے اور جو بھی اس کا معاینہ کرتا ہے اس کے دل میں مرتکز ہو جاتا ہے خواہ وہ فرد ہو یا پوری جماعت ہوتی کہ اسے بنیاد بنا لیا جاتا ہے، جس کے حدوث سے دنوں اور سالوں کی تاریخ لکھی جاتی ہے اور اس کے وجود پر مرنے اور جینے کو قیاس کیا جاتا ہے۔

جبکہ قرآن کریم کا اعجاز اس میں ایسے سرایت کیے ہوئے ہے جیسے پانی سبز لکڑی میں سرایت کیے ہوتا ہے کہ کوئی سورۃ اور کوئی بھی آیت اس سے خالی نہیں ہوتی اور اس کے اعجاز کی وجوہ کو سب سے زیادہ جاننے والے اور اس کی بلاغت کے اسرار کے ذوق کو سب سے زیادہ جاننے والے اصحاب رضی اللہ عنہم محمد ہی ہیں کیونکہ وہ لوگ اسی معرفت میں ظہور پذیر ہوئے اور یہ ذوق ان کی خالص عربی فطرت، ان کا عالی شان صاف ستھرا سلیقہ اور ان کا بیان کے فنون اور زبان کی صنعت میں ماہر ہونے ہی کا نام ہے اسی وجہ سے قرآن ان کی حیات صحیحہ تھی اسی کے ساتھ وہ کھڑے ہوتے اور بیٹھتے، اس کے ساتھ وہ سوتے اور جاگتے، اسی کے ساتھ رہتے سہتے اور معاملات کرتے اور اسی کے ساتھ متلذذ ہوتے اور عبادت گزار کرتے اور اللہ تعالیٰ کے قول

﴿وَكَذَلِكَ أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ رُوحًا مِّنْ أَمْرِنَا﴾ (الشوریٰ: ۵۲)

”اور ہم نے آپ کی طرف اپنی طرف سے روح کو وحی کیا۔“

میں روح کا بھی یہی معنی ہے اور تاریخ میں کوئی ایسی جماعت نہیں ہے جسے قرآن نے روح کے ساتھ متصور کر لیا ہو۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے اس اعلیٰ اور اشرف طبقہ میں صحابہ رضی اللہ عنہم کے طبقے کو متصور کر لیا وہ صحابہ رضی اللہ عنہم جنہوں نے اپنی زندگی اس کے سامنے پیش کر دی اس نے انہیں زندگی بخشی اور ان کی طبیعت کو ایک نئے سانچے میں ڈھال دیا اسی طرح اللہ تعالیٰ نے انہیں میں ”خلقاً آخر“ کے ساتھ تعبیر کیا۔

﴿فَتَبَارَكَ اللَّهُ أَحْسَنُ الْخَالِقِينَ﴾ (المؤمنین: ۱۴)

”بارکرت ہے وہ اللہ جسب سے اچھا خالق ہے۔“

جبکہ سنت نبویہ میں سے بعض سنن ایسے معجزات کے ساتھ ملے ہوئے ہیں جو فارق للعادۃ ہیں اور آپ کے سامنے معجزات کی احادیث ہیں جو بہت کثرت کے ساتھ ہیں اور ان میں تعجب اور خوشی ہوتی ہے لیکن ہم آپ کو اس میں ادھر ادھر کی باتیں کرنے والا ہونے سے بچانا چاہتے ہیں کیونکہ ہمارے سامنے صحیح احادیث کا بہت بڑا مجموعہ اور بہت بڑی تعداد ہے:

﴿وَلَا يَمِينُكَ وَمِثْلُ خَيْبِرٍ﴾ (فاطر: ۱۳)

”بہت زیادہ خبر رکھے والے کی طرح آپ کو کوئی بھی خبر نہیں دے سکتا۔“

یہاں ہم آپ کے سامنے صرف ایک نمونہ پیش کرتے ہیں جسے بخاری و مسلم نے حضرت ابو العباس سہل بن سعد ساعدی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ خبیر کے دن رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ”کل کو میں ایک ایسے شخص کو جھنڈا عطا کروں گا جس کے ہاتھ پر اللہ تعالیٰ فتح نصیب فرمائے گا وہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ محبت کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ اور اس کا رسول بھی اس کے ساتھ محبت کرتے ہیں۔ اب لوگوں نے بڑی بے چینی کے ساتھ رات گزاری کہ جھنڈا کسے ملے گا جب صبح ہوئی تو سب لوگ رسول اللہ ﷺ کے پاس آئے ہر ایک کو امید تھی کہ جھنڈا اسے ملے آپ ﷺ نے فرمایا کہ ”علی رضی اللہ عنہ بن ابی طالب کہاں ہیں؟“ کسی نے کہا یا رسول اللہ ﷺ اس کی آنکھ میں تکلیف ہے آپ ﷺ نے فرمایا اسے بلا لاؤ! انھیں بلایا گیا آپ ﷺ نے ان کی آنکھ پر اپنا لعاب لگا لیا اور ان کے لیے دعا کی وہ ٹھیک ہو گئے اور ایسے ٹھیک ہو گئے گویا کہ انھیں تکلیف تھیں ہی نہیں آپ ﷺ نے انھیں جھنڈا عطا فرمایا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ! میں ان کے ساتھ قتال کرتا رہوں گا جب تک کہ وہ لوگ ہم جیسے نہ ہو جائیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا ٹھیک ہے اسی طرح کرتے رہو یہاں تک کہ آپ ان کے پاس قیام پذیر ہو جاؤ پھر انھیں اسلام کی دعوت دو! اور انھیں بتلاؤ کہ ان پر اللہ تعالیٰ کا کون سا حق واجب ہے؟ اللہ کی قسم! اگر تمہاری وجہ سے اللہ تعالیٰ نے کسی ایک آدمی کو بھی ہدایت دے دے تو یہ تمہارے لیے سرخ اونٹوں سے بہتر ہے۔<sup>①</sup>

اس مقام پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کو رسول اللہ ﷺ کی وصیت کرنا صرف یہی واحد ایسی چیز ہے جو ان جھوٹوں کی زبان کا نئے کے لائق ہے جو دعویٰ کرتے ہیں کہ اسلام تلوار اور طاقت کے زور پر قائم ہوا ہے اور اس نے تشدد اور سختی کا سہارا لیا ہے اور کسی دلیل اور حجت کی بناء پر نہیں پھیلا اور کسی قسم کی سلامتی اور رحمت لے کر نہیں آیا۔

﴿كَبُرَتْ كَلِمَةً تَخْرُجُ مِنْ أَفْوَاهِهِمْ إِنَّ يَقُولُونَ إِلَّا كَذِبًا﴾ (الکہف: ۵)

”کتنی بڑی بات ہے جو ان کے مونہوں سے نکل رہی ہے سوائے جھوٹ کے کچھ بھی نہیں بول رہے ہیں۔“

تعلیم و تربیت میں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول اللہ ﷺ کی حکمت اور دعوت و ارشاد میں حسن سیاست ایسی چیزیں ہیں جنہوں نے کتاب و سنت کو اذہان میں راسخ کر دیا اور حفظ و یاد کرنے کو صحابہ رضی اللہ عنہم کے لیے آسان کر دیا۔

① صحیح بخاری کتاب فضائل الصحابہ ۹، کتاب الغازی ۳۸، صحیح مسلم کتاب الجہاد حدیث ۱۳۲، فضائل الصحابہ ۳۲، ترمذی کتاب الناقب ۲۰، ابن ماجہ مقدمہ ۱۱، مسند امام احمد ۳۱/۱۰

## مسائل العسرفان فی علوم القرآن: جلد ①

جہاں تک قرآن پاک کا تعلق ہے تو آپ کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ آپ اس کے ذریعے تعلیم و تربیت میں اللہ تعالیٰ کی حکمت کو جان لیں کہ اللہ تعالیٰ نے اسے امت اسلامیہ پر اس زبان میں نازل کیا جو ان کے دلوں میں محبوب ترین زبان تھی اور اس دل فریب اسلوب اور اس معجز نظم پر اتارا جو دلوں میں گھر کرنے والا تھا اور اس نے اسے نازل کرنے میں تدریج کا راستہ اپنایا ایک دم میں نازل نہیں کیا کہ کہیں وہ ان پر بوجھ نہ بن جائے اور وہ اس سے عاجز ہو جائیں بلکہ اس نے اسے تھوڑا تھوڑا کر کے بیس یا بیس سے کچھ زائد سالوں میں نازل کیا پھر اس کی بہت سی سورتوں اور آیات کو حوادث اور اسباب خاصہ کے ساتھ جوڑا اور اسے دلیل و حجت کے ساتھ منظم بنایا اور اس کے ذریعے عقول و مضامین کو مخاطب کیا اور اس کے ساتھ ان کی مصلحتوں، بھلائیوں اور خوش بختیوں کو وابستہ کیا اور ان سب کے شروع میں ان کے ساتھ اپنی رحمت و واسعہ کو صادر کیا گیا کہ وہ لوگ اسے اپنے ہاتھوں سے چھو رہے تھے اور اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔

﴿مَا يُرِيدُ اللَّهُ لِيَجْعَلَ عَلَيْكُمْ مِنْ حَرَجٍ وَ لَكِنْ يُرِيدُ لِيُطَهِّرَكُمْ وَ لِيُبَيِّنَ لَكُمْ نِعْمَتَهُ عَلَيْكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ﴾ (المائدہ: ۶۰)  
 ”اللہ تعالیٰ تم پر تنگی ڈالنا نہیں چاہتا بلکہ وہ تو تمہیں پاکیزہ کرنا چاہتا ہے نیز وہ تم پر اپنی نعمت پوری کرنا چاہتا ہے تاکہ تم شکر کرو۔“

﴿مَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِنَفْسِهِ وَ مَنْ أَسَاءَ فَعَلَيْهَا وَ مَا رَبُّكَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَالَمِينَ﴾ (نعلت: ۳۶)

”جس نے اچھا عمل کیا اس نے اپنے لیے کیا اور جس نے برا کیا وہ اسی پر پڑے گا اور تیرا رب بندوں پر ظالم نہیں ہے۔“

جبکہ سنت نبویہ کو اس تعلیم و تربیت کے باب میں ایک امتیازی مقام حاصل ہے یہاں تک کہ جب اس جدید زمانے میں علماء تعلیم و تربیت کے میدان میں ایضاً کے وسائل اور تشویق کی اقسام کو حکمت میں شمار کیا تو حضرت محمد ﷺ چودہ صدیوں پہلے بلکہ علم تربیت اور علم نفسیات کے پیدا ہونے سے بھی پہلے ایضاً کے ان وسائل کی رعایت میں معلم اول تھے۔ یہ شوق دلانے والے خوشگوار وسائل آپ کے سامنے ہیں کہ ان کے ذریعے ہدایت کے منتظر قلوب کھل گئے اور آپ ﷺ کی تعلیمات سے آپ ﷺ کے صحابہؓ کے دل پر ہو گئے اور وہ ایسے ہو گئے جیسے ان کے اندر حروف و کلمات کے ساتھ کتاب لکھ دی گئی ہو۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ ﷺ سب سے زیادہ فصیح اللسان تھے سب سے زیادہ واضح بیان کرنے والے تھے اور سب سے عمدہ تقریر کرنے والے تھے کلام کے چشمے بھوٹ پڑتے تھے آپ ہی وہ شخصیت تھے جنہیں جوامع الکلم عطا کیے گئے کلام کا آغاز و انجام بڑی وضاحت کے ساتھ کیا کرتے تھے اور اسے ایسے تفصیل کے ساتھ بیان کرتے تھے کہ اس میں مقام و افہام کی رعایت ہوتی تھی کوئی بھی بات اس طرح جاری نہیں ہوتی تھی کہ اس کی رونق کو ختم کر دے یا اس میں سے کچھ کم کر دے بلکہ اس طرح بات کرتے کہ اگر کوئی اسے شمار کرنا چاہے تو شمار کر سکے۔ آپ ﷺ کا معمول یہ تھا کہ آپ ﷺ کلام کو تین مرتبہ دہراتے بلکہ اگر ضرورت ہوتی تو تین سے بھی زیادہ مرتبہ دہراتے تاکہ وہ بات اچھی طرح یاد ہو جائے جیسا کہ مسلم شریف کی حدیث میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

”محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ“

(هلک المتنتعون)). ①

”فلو کرنے والے اور اللہ تعالیٰ کی حدود سے تجاوز کرنے والے ہلاک ہو گئے۔“

آپ ﷺ نے یہ کلمہ تین بار دہرایا اسی طرح جیسا کہ بخاری و مسلم کی حدیث میں آیا ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ”خبر دار! کیا میں تمہیں سب سے بڑے کبیرہ گناہ کے بارے میں نہ بتلاؤں؟“ (یہ کلمہ آپ ﷺ نے تین مرتبہ دہرایا) ہم بنے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ! ضرور بتلائیں آپ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ شکر کرنا، والدین کی نافرمانی کرنا اور خردار جھوٹ اور جھوٹی گواہی آپ ﷺ ایک لگا کر بیٹھے تھے کہ اٹھ کر بیٹھ گئے اور اس کو بار بار دہراتے رہے حتیٰ کہ ہم نے کہا کہ کاش آپ ﷺ خاموش ہو جائیں۔

آپ ﷺ کا طریقہ کار اس طرح تھا جب آپ ﷺ خطبہ ارشاد فرماتے تو آپ ﷺ کی آنکھیں سرخ ہو جاتیں، آواز بلند ہو جاتی اور غصہ تیز ہو جاتا حتیٰ کہ ایسا ہو جاتا جیسے کوئی لشکر کو ڈراتے ہوئے ”صَبَّحْكُمْ وَمَسَاكُم“ کہہ رہا ہو آپ ﷺ فرمایا کرتے کہ میں اور قیامت اس طرح بھیجے گئے اور آپ ﷺ اپنی شہادت کی اور درمیان والی بڑی انگلی کو ملاتے اور فرماتے کہ ”اما بعد: بے شک سب سے اچھی بات اللہ تعالیٰ کی کتاب ہے اور سب سے اچھا طریقہ محمد ﷺ کا طریقہ ہے اور سب سے برا امر نئی پیدا ہونے والی چیز ہے اور ہر نئی پیدا ہونے والی چیز بدعت ہے اور ہر بدعت گمراہی ہے“ اس کے بعد فرمایا کرتے کہ ”میں ہر مومن کے اس کی جان سے بھی زیادہ قریب ہوں جس نے مال چھوڑا اور جس نے قرض چھوڑا یا اہل و عیال چھوڑے تو وہ میرے ذمہ ہیں۔“ ②

آپ ﷺ کے ایضاح کے مسائل میں سے یہ بھی ہے کہ آپ ﷺ لوگوں کے لیے عمدہ قسم کی مثالیں بیان کیا کرتے تھے جو ان کے لیے معانی کی وضاحت کر دیتی تھیں گویا کہ وہ شبیہ و نافی میں ظاہر ہونے والی وہ ہیں ہے یا ایسا سورج ہے جو بلند ہو اور اس کے نیچے کوئی بادل نہ ہو۔

آپ اس بات میں غور فرمائیں کہ ”آپ ﷺ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی ضرورت اور ان دونوں کو چھوڑ دینے کے خطرے کے پیش نظر مثال بیان کرتے“ پھر غور کرنے کے بعد اپنے رب کی قسم کھا کر مجھے بتلائیے کہ کیا تمہارے ذہن میں یہ انوکھی مثال وضاحت کرتی ہے؟

بخاری شریف میں حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ ”اللہ تعالیٰ کی حدود کی پابندی کرنے والے اور ان میں پڑنے والے کی مثال اس قوم کی سی ہے جنہوں نے قرعہ کے ذریعے کشتی کی منزلوں کو مقرر کیا کوئی اس کے اوپر والے حصے میں سوار ہو گیا اور کوئی نیچے والے حصہ میں سوار ہو گیا نیچے والوں کو جب پانی کی طلب ہوتی تو وہ اوپر والوں کے پاس سے گزرتے انہوں نے کہا کہ اگر ہم اپنے حصے میں سوراخ کر لیں اور اوپر والوں کو تنگ نہ کریں تو کیسا ہے؟ اب اگر اوپر والے بھی ان کو چھوڑ دیں کہ جانے دو جو چاہیں کریں تو سب کے سب ہلاک ہو جائیں گے اور اگر ان کا ہاتھ پکڑ لیں گے تو وہ بھی بیخ جا جائیں اور باقی بھی سب لوگ بیخ جائیں گے۔“ ③

① صحیح مسلم، کتاب العلم: ۷ ② صحیح مسلم، کتاب الحج: ۴۳

③ صحیح بخاری، باب الشکر، کتاب العلم: ۶



آپ ﷺ کے ایضاح کے وسائل میں سے وہ سوالات بھی ہیں جو آپ ﷺ نے اپنے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے سامنے پیش کیے جن کے ذریعے ان کی حاضر دماغی کا امتحان لیتے اور ان کا دماغ تیز کرتے تھے تاکہ وہ آپ ﷺ کی رہنمائی کو نفوس کی تنگی اور دلوں کی پیاس کے ساتھ حاصل کریں تاکہ وہ ان میں اچھی طرح قرار پکڑ لیں اور وہ ان میں ایسے جاگزیں ہو جائیں جیسے جسم میں روح جاگزیں ہوتی ہے۔

آپ کے سامنے ایک مثال پیش کرتا ہوں کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ”کیا تمہیں معلوم ہے کہ مفلس کون ہے؟ صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا کہ مفلس وہ شخص ہے جس کے پاس کوئی درہم یا دینار نہ ہوں اور نہ ہی اس کے پاس کوئی مال و متاع ہو۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ میری امت کا مفلس وہ شخص ہوگا جو قیامت کے دن نماز، روزے اور زکوٰۃ لے کر آئے گا اس نے کسی کو گا لی دی ہوگی کسی پر تہمت لگائی ہوگی کسی کا مال کھایا ہوگا اور کسی کا خون کیا ہوگا ان میں سے ایک کو اس کی نیکیاں دی جائیں گی، دوسرے کو دی جائیں گی، پھر جب اس کی نیکیاں ختم ہو جائیں گی اور اس کے ذمہ قرض باقی رہ جائے گا تو ان کی برائیاں اس پر ڈال دی جائیں گی اور اس کے بعد اسے آگ میں پھینک دیا جائے گا۔“<sup>①</sup>

آپ ﷺ کے ایضاح کے وسائل میں سے عجیب و غریب ذریعے یہ بھی ہے کہ آپ ﷺ اپنے ہاتھ مبارک کی کٹیروں کی مدد سے معانی کی وضاحت کرتے اور انہیں اذہان کے قریب کرتے تھے حالانکہ آپ ﷺ نبی امی تھے نہ آپ ﷺ نے کوئی کتاب پڑھی، نہ کسی استاد کے پاس بیٹھے اور نہ ہی کسی مدرسہ میں گئے اور کسی قسم کی نقشہ نگاری یا انجینئرنگ نہیں پڑھی۔

صحیح بخاری میں ہم پڑھتے ہیں کہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ”ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ نے ہمارے لیے ایک مربع خط کھینچا اور اس کے درمیان میں ایک خط کھینچا اور اس (یعنی درمیانی) خط کے ارد گرد کی خطوط کھینچنے اور ایک خط باہر کو نکلتا ہوا کھینچنا اور فرمایا کہ کیا تمہیں معلوم ہے کہ یہ کیا ہے؟ ہم نے عرض کیا اللہ اور اس کا رسول ہی بہتر جانتے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ یہ انسان ہے (یعنی درمیان والا خط) اور یہ اس کی موت ہے جو اسے گھیرے ہوئے ہے (یعنی مربع خط) اور یہ اعراض و حوادث ہیں جو اسے نوح رہے ہیں (یعنی اس کے ارد گرد والے خطوط) اگر ایک حادثہ سے بچ نکلتا ہے تو دوسرا آ پکڑتا ہے اور یہ اس کی اُسیدیں ہیں (یعنی باہر نکلا ہوا خط)۔“

آپ ﷺ کی پر حکمت سیاست میں سے یہ بھی ہے کہ آپ ان کی غلط فہمی کے موقع کو غنیمت سمجھتے اور اسی وقت ان کی سوچ کو صحیح کر دیتے اور وہ چونکہ اس وقت متوجہ ہوتے تھے اس لیے انہیں صحیح تعلیم تلقین کر دیتے۔

اس قبیل سے ایک قصہ ہے جسے بخاری و مسلم نے نقل فرمایا کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ کی ازواج کے گھروں کی طرف تین آدمی آئے اور انھوں نے آپ ﷺ کی عبادت کے بارے میں سوال کیا جب انہیں بتلایا گیا تو گویا کہ انھوں نے اسے کم سمجھا اور کہنے لگے کہ ہم کہاں اور رسول اللہ ﷺ کہاں ان کے تو اگلے اور پچھلے گناہ معاف کر دیئے گئے ہیں۔ ان میں سے ایک نے کہا کہ میں ہمیشہ نماز پڑھوں گا دوسرے نے کہا کہ میں ہمیشہ روزہ رکھتا رہوں گا اور تیسرے نے کہا کہ میں عورتوں سے علیحدہ رہوں گا کبھی بھی نکاح نہیں کروں گا چنانچہ ان کے پاس رسول اللہ ﷺ تشریف لائے اور فرمایا کہ تمہی ہودہ لوگ جنہوں نے

یہ کہا اللہ کی قسم! میں تم سب سے زیادہ اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والا ہوں اور تم سب سے زیادہ متقی ہوں لیکن پھر بھی میں روزے بھی رکھتا ہوں چھوڑتا بھی ہوں نماز بھی پڑھتا ہوں اور سوتا بھی ہوں اور بیویوں سے نکاح بھی کرتا ہوں اب جو بھی شخص میری سنت سے روگردانی کرے گا وہ مجھ سے نہیں۔

آپ ﷺ کے ایضاح کے وسائل میں سے عملی مثال پیش کرنا بھی ہے۔ آپ ﷺ نماز پڑھتے اور فرماتے کہ ”نماز پڑھو اور ایسے نماز پڑھو جیسے مجھے نماز پڑھتے دیکھتے ہو“ آپ ﷺ حج کرتے اور فرماتے کہ ”مجھ سے اپنے مناسک سیکھو“ اور اپنی شہادت والی اور درمیان والی انگلی کو ملا کر فرماتے کہ ”میں اور قیامت اس طرح بھیجے گئے ہیں۔“

ترغیب وترہیب جن کے ذریعے کتاب وسنت کے سمندر بہہ رہے ہیں اور اس میں شک نہیں کہ انسان کی اپنی ذات کے ساتھ محبت کی جبلت اسے اپنے لیے ہر خیر کو وجود میں لانے اور ہر شر کو مٹانے کی طرف دھکیلاتی ہے خواہ ان میں جلدی ہو یا دیر، اسی بنا پر توفیق والے نفوس قرآن پاک کی ہدایت اور رسول اللہ ﷺ کی سنت کو محفوظ کرنے پر حریص ہوتے ہیں اور حتی الامکان انہیں محفوظ کرنے پر عملی مجاہدہ کرتے ہیں۔

جبکہ گمراہ نفوس جن پر ذلت چھائی ہوتی ہے وہ اس سعادت سے خواہشات اور شہوت پرستی کی گردش میں پھرے ہوئے ہیں یا اس مقام سے تعصب یا فتنہ پر جمود کے جاب میں پوشیدہ ہیں یا وہ جہالت کی تاریکی کے ساتھ گمراہی اور مصیبت کے کچھروں میں دھسے ہوئے ہیں۔

ہمیں قرآن وسنت سے ترغیب وترہیب کے شواہد تلاش کرنے کی ضرورت نہیں کیونکہ ان کی رو اس سے بھی زیادہ بہہ رہی ہے جتنی کہ ترغیب وترہیب کی انواع اور وعدے اور وعید ان کے فنون اور تشیروانذار کے مختلف طرح کے اسلوب کو مختلف وجوہ، طرح طرح کے اعتبارات میں مل جانا گیا ہے خواہ وہ عقائد میں ہوں یا عبادات میں یا معاملات و اخلاق میں۔

آپ کی خدمت میں بطور نصیحت قرآن کی ترغیب وترہیب کی مثال پیش خدمت ہے کیونکہ نصیحت مؤمنین کو نفع دیتی ہے اللہ تبارک وتعالیٰ ایک سورۃ یعنی سورۃ السجدہ میں فرماتا ہے کہ:

﴿وَكَالُوا إِذَا ضَلَلْنَا فِي الْأَرْضِ أَإِنَّا لَفِي خَلْقٍ جَدِيدٍ ۚ بَلْ هُمْ بِلِقَائِي رَبِّهِمْ كَفِرُونَ ۝ قُلْ يَتَوَفَّكُم مَّلَكُ الْمَوْتِ الَّذِي ذُكِّرَكُمْ بِكُمْ ثُمَّ إِلَىٰ رَبِّكُمْ تُرْجَعُونَ ۝ وَلَوْ تَرَىٰ إِذِ الْمُجْرِمُونَ نَاكِسُوا رُءُوسِهِمْ عِندَ رَبِّهِمْ رَبَّنَا أَبْصَرْنَا وَسَمِعْنَا فَارْجِعْنَا نَعْمَلْ صَالِحًا إِنَّا مُوقِنُونَ ۝ وَلَوْ شِئْنَا لَآتَيْنَا كُلَّ نَفْسٍ هُدًىٰ وَلَٰكِن حَقَّ الْقَوْلُ مِنِّي لَأَمْلَأَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ ۝ قَدْ وُفِّئَ بِمَا نَسِيتُمْ لِقَاءَ يَوْمِكُمْ هَٰذَا إِنَّا نَسِينَاكُمْ وَذُوقُوا عَذَابَ الْخُلْدِ بِمَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ ۝ إِنَّمَا يُؤْمِنُ بِآيَاتِنَا الَّذِينَ إِذَا ذُكِّرُوا بِهَا خَرُّوا سُجَّدًا وَسَبَّحُوا بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُونَ ۝ تَتَجَافَىٰ جُنُوبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ يَدْعُونَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَطَمَعًا ۚ وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنفِقُونَ ۝ فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّا أُخْفِيَ لَهُمْ مِنْ قُرَّةِ أَعْيُنٍ ۚ جَزَاءً لِّمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ۝ أَفَمَنْ كَانَ مُؤْمِنًا كَمَنْ كَانَ فَاسِقًا ۚ لَا يَسْتَوُونَ ۝ أَمَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ فَلَهُمْ أَجْرٌ غَيْرُ لَمَّا كَانُوا يَعْمَلُونَ ۝ وَ

أَمَّا الَّذِينَ فَسَقُوا فَمَا لَهُمْ النَّارُ ۖ كَلِمًا أَرَادُوا أَنْ يَخْرُجُوا مِنْهَا أَعْيُدُّوا فِيهَا وَ يُقِيلُ لَهُمْ ذُوقُوا عَذَابَ النَّارِ  
الَّذِي كُنْتُمْ بِهِ تَكْتُمُونَ ۝ وَلَنَذِقَنَّاهُمْ مِنَ الْعَذَابِ الْأَذَىٰ ذُوْنَ الْعَذَابِ الْأَكْبَرِ لَعَنَهُمُ يَوْمَ يَرْجَعُونَ ۝ وَمَنْ  
أَظْلَمُ مِمَّنْ ذُكِّرَ بِآيَاتِ رَبِّهِ ثُمَّ أَعْرَضَ عَنْهَا إِنَّا مِنَ الْمُجْرِمِينَ مُنتَقِمُونَ ﴿۱۰۰﴾ (سجده: ۱۰۰-۲۲)

” اور کہنے لگے کہ جب ہم زمین میں ملایا میٹ ہو جائیں گے تو کیا از سر نو پیدا ہوں گے حقیقت یہ ہے کہ یہ لوگ اپنے پروردگار کے سامنے جانے ہی کے قائل نہیں۔ کہہ دو کہ موت کا فرشتہ جو تم پر مقرر کیا گیا ہے تمہاری روحیں قبض کر لیتا ہے پھر تم اپنے پروردگار کی طرف لوٹنا چاہو گے۔ اور (تم تعجب کرو) جب دیکھو کہ گنہگار اپنے پروردگار کے سامنے سر جھکائے ہوں گے اور کہیں گے اے ہمارے پروردگار ہم نے دیکھ لیا اور سن لیا تو ہم کو (دنیا میں) واپس بھیج دے کہ نیک عمل کریں بیشک ہم یقین کرنے والے ہیں۔ اور اگر ہم چاہتے تو ہر شخص کو ہدایت دے دیتے لیکن میری طرف سے یہ بات قرار پا چکی ہے کہ میں دوزخ کو جنوں اور انسانوں سب سے بھر دوں گا۔ سو (اب آگ کے) مزے چکھو اس لئے کہ تم نے اس دن کے آنے کو بھلا رکھا تھا (آج) ہم بھی تمہیں بھلا دیں گے اور جو کام تم کرتے تھے انکی سزا میں ہمیشہ کے عذاب کے مزے چکھتے رہو۔ ہماری آیتوں پر تو وہی لوگ ایمان لاتے ہیں کہ جب ان کو ان سے نصیحت کی جاتی ہے تو سجدے میں گر پڑتے ہیں اور اپنے پروردگار کی تعریف کے ساتھ تسبیح کرتے ہیں اور غرور نہیں کرتے۔ ان کے پہلو پھونوں سے الگ رہتے ہیں (اور) وہ اپنے پروردگار کو خوف اور امید سے پکارتے ہیں اور جو (مال) ہم نے ان کو دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔ کوئی متنفس نہیں جانتا کہ ان کے لئے کسی آنکھوں کی ٹھنڈک چھپا کر رکھی گئی ہے یہ ان کے اعمال کا صلہ ہے جو وہ کرتے تھے۔ بھلا جو مومن ہو وہ اس شخص کی طرح ہو سکتا ہے جو نافرمان ہو؟ دونوں برابر نہیں ہو سکتے۔ جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے ان کے (رہنے کے) لئے باغ ہیں یہ مہمانی ان کاموں کی جزا ہے جو وہ کرتے تھے۔ اور جنہوں نے نافرمانی کی ان کے رہنے کے لئے دوزخ ہے جب چاہیں گے کہ اس میں سے نکل جائیں تو اس میں لوٹا دیئے جائیں گے اور ان سے کہا جائے گا کہ دوزخ کے عذاب کو تم جھوٹ سمجھتے تھے اس کے مزے چکھو۔ اور ہم ان کو (قیامت کے) بڑے عذاب کے سوا عذاب دنیا کا بھی چکھائیں گے شاید (ہماری طرف) لوٹ آئیں۔ اور اس شخص سے بڑھ کر کون ظالم ہے جس کو اس کے پروردگار کی آیتوں سے نصیحت کی جائے تو وہ ان سے منہ پھیر لے، ہم گنہگاروں سے ضرور بدلہ لینے والے ہیں۔“

آپ بصیرت کی آنکھ سے دیکھیں کہ ان ترغیبات میں کس کس طرح کے اسلوب اور ان تربیبات میں کیسے کیسے فنون ہیں جو ان آیات کے ضمن میں آئی ہیں اور قرآن پورا کا پورا اسی طرح کے انوارات سے بھرا ہوا ہے آپ اس باب میں سنت نبویہ کو بھی اسی طرح کا ٹھانٹیں مارتا ہوا سمندر ہی سمجھئے۔ آپ کی خدمت میں ایک نمونہ بلکہ نمونے پیش خدمت ہیں جو آپ کی اس وقت تک رہنمائی کرتے رہیں گے جب تک کہ نفوس بشریہ وعدوں اور وعیدوں سے متاثر ہوتے رہیں گے اور اس تاثر کے نتیجے میں اوامر و نواہی قرار پکڑتے رہیں گے اور وہ ذہن میں جاگزیں ہوتے رہیں گے اور وہ فکر اور سوچ کے صحیفے میں منقش ہوتے رہیں گے پھر انسان اس کی

## مسائل العسافان فی علوم التفسیر آن: جلد ۱

بدولت عمل و اتباع کی طرف گھسٹا چلا جائے گا۔ دیکھیں آپ ﷺ ہی وہ شخصیت ہیں جو صلہ رحمی کرنے والے کو وسعت رزق اور عمر میں برکت کی خوشخبری دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ”جو شخص پسند کرتا ہو کہ اس کا رزق بڑھا دیا جائے اور اس کی عمر بڑھا دی جائے اسے چاہیے کہ صلہ رحمی کرے۔“<sup>①</sup>

اور وہی شخصیت ہیں جو آخرت کو اپنا نعم بنانے والے کے لیے وعدہ بیان کرتے ہیں دنیا کو اپنا نعم بنانے والے کے لیے وعید بیان کرتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ ”جس شخص کا غم آخرت بن گیا تو اللہ تعالیٰ اس کے دل میں غناء پیدا کر دے گا اللہ تعالیٰ اس کی اجتماعیت کو جمع کر دے گا اور دنیا ذلیل ہو کر اس کے پاس آئے گی اور جس کا غم دنیا بن گیا اللہ تعالیٰ فقر کو اس کے سامنے رکھ دے گا اس کی اجتماعیت کو بکھیر دے گا اور مقدر سے زیادہ دنیا میں ملے گی نہیں“<sup>②</sup>

آپ ﷺ ہی وہ شخصیت ہیں جو موئین کو قتل پر ابھارتے اور انھیں دفاع اور مقابلے پر آمادہ کرتے تھے چنانچہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ”جو شخص اللہ کے راستے میں نکلا اللہ تعالیٰ اس کا ضامن ہے کہ اسے میرے راستے میں جہاد کرنے، مجھ پر ایمان رکھنے اور میرے رسولوں کی تصدیق کرنے کے سوا کسی نے بھی نہیں نکالا اب میرے ذمے ہے کہ میں اسے جنت میں داخل کر دوں یا اسے اس کے گھر اجریا غنیمت کے ساتھ لوٹا دوں۔ اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں محمد ﷺ کی جان ہے اللہ کے راستے میں کوئی بھی زخم لگتا ہے قیامت کے دن اسی صورت میں آئے گا جیسے وہ زخم لگا تھا اس کا رنگ خون کا رنگ ہی ہوگا لیکن اس کی خوشبو مشک کی طرح ہوگی اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں محمد ﷺ کی جان ہے اگر مجھے مسلمانوں پر مشقت کا خوف نہ ہوتا تو میں اللہ عزوجل کے راستے میں جہاد کرنے والی جماعت کے پیچھے کبھی بھی نہ بیٹھتا لیکن مجھے اتنی وسعت نہیں کہ میں انھیں سوار کر سکوں اور انھیں بھی اتنی وسعت نہیں کہ وہ میرے پیچھے چلیں اور ان پر مجھ سے پیچھے رہنا شاق ہو جائے گا اس ذات کی قسم! جس کے قبضہ میں محمد ﷺ کی جان ہے مجھے تو صرف یہ پسند ہے کہ میں اللہ تعالیٰ کے راستے میں جہاد کروں اور قتل ہو جاؤں پھر جہاد کروں اور قتل ہو جاؤں۔“<sup>③</sup>

ان کلمات نبویہ میں آپ دیکھ رہے ہیں کہ کتنی قوت ہے زبردست اور انقلاب لانے والی قوت ہے جو انھیں ذہن میں چراغ بنا دیتی ہے جیسا کہ نفوس کو دین اور وطنوں کے دفاع کے لیے آسان اور ہل بنا دیتا ہے یہاں تک کہ ان مرغوبات کو کھاتے ہوئے سنتا ہے تو وہ کھانا ختم ہونے تک بھی صبر نہیں کر سکتا بلکہ اس کے ہاتھ میں جو کچھ بھی ہوتا ہے وہ اسے پھینک دیتا ہے اور موت کا شوق رکھتے ہوئے جہاد کے لیے اٹھ کھڑا ہوتا ہے اسے یہی تڑپ ہوتی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے راستے میں شہید ہو جائے اسی طرح امام مالک رحمہ اللہ نے حضرت یحییٰ بن سعید رحمہ اللہ سے روایت کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے جہاد کی ترغیب دی اور جنت کا ذکر کیا انصار کا ایک آدمی کھجوریں کھا رہا تھا اس نے کہا کہ میں تو دنیا پر بہت حریص ہوں گا اگر میں ان کے ختم ہونے کا انتظار کروں چنانچہ اس نے اپنے ہاتھ کی کھجوروں کو پھینکا اور تلوار اٹھا کر قتال کرنے لگ گیا حتیٰ کہ قتل ہو گیا۔<sup>④</sup>

① بخاری کتاب البیوع باب ۱۳، ترمذی

② ترمذی، ابواب النیامہ ۳، مسند احمد ۱۸۳/۵

③ بخاری کتاب الذبائح ۳۱، مسلم کتاب الامارۃ ۱۰۳، مسند احمد ۲۳۱/۲، نسائی کتاب الجہاد ۱۳

④ مواظ امام مالک حدیث ۱۰۰۵

## مناب العرفان فی علوم القرآن: جلد ①

بارہواں عامل ﴿﴾ صحابہ رضی اللہ عنہم کا کتاب اللہ اور سنت رسول سے ہدایت حاصل کرنا کہ وہ حضرات کتاب و سنت میں جسے حرام پاتے اسے حرام سمجھتے اور جسے حلال پاتے اسے حلال سمجھتے قرآن وحدیث میں جو نصیحت اور رہنمائی آتی اس کی اتباع کرتے اور ان کے ظاہر و باطن تربیت اور آداب اسلامیہ کے پابند ہوتے ان کا دستور قرآن ہے اور ان کے سامنے رسول اللہ ﷺ ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ علم پر عمل کرنا اسے نفس میں پوری طرح راسخ کر دیتا ہے اور اسے نظر و فکر کے صحیفہ میں اچھی طرح نقش کر دیتا ہے جیسا کہ فن تربیت اور علم نفسیات میں معروف ہے کہ دقیق معارف کی مویذ ہوتی ہے اور مثالیں تو اعداد کومندر ج کرتی ہیں اور عمل سے بڑھ کر کوئی بھی تطبیق نہیں اور اتباع سے بڑھ کر کوئی مثال نہیں خصوصاً معارف دینیہ جو کہ اس کے نفاذ سے پھلتی پھولتی ہیں اور اس کی اتباع سے بڑھتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِن تَشْكُوهُم لَبِعَلَّكُمْ فُرْقَانًا﴾ (الانفال: ۲۹)

”اے ایمان والو! اگر تم اللہ تعالیٰ سے ڈرو گے تو وہ تمہارے لیے فرق کرنے والی چیز بنا دے گا۔“

یعنی ہدایت، اور نور جس کے ذریعے حق و باطل کے درمیان فرق کر سکو گے نیز ہدایت اور گمراہی کے درمیان فرق کر سکو گے جیسا کہ بعض تفاسیر میں آیا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ مجاہدہ مشاہدہ کا سبب بنتا ہے نیز دلوں کی طہارت اور نفوس کا تزکیہ بندے کے دل میں حکمت کا چشمہ جاری کرتا ہے۔

امام غزالی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ”کتاب اور تعلیم اسے پورا نہیں کرتے (یعنی حکمت کو جو دل میں جاری ہوتی ہے) بلکہ حکمت جو اعداد و شمار سے باہر ہے وہ صرف مجاہدہ سے اور اعمال ظاہرہ اور اعمال باطنہ کے مراقبہ سے نیز خلوت میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ بیٹھنے سے ہی حاصل ہوتی ہے بشرطیکہ دل خلوص فکر کے ساتھ حاضر ہوا اور ہر چیز سے منقطع ہو کر اللہ تعالیٰ سے وابستہ ہو۔ یہی الہام کی چابی اور یہی کشف کا منبع ہے، کتنے محترم ہیں جو بڑے لیے عرصہ تک پڑھتے رہے لیکن اپنے سموع کے ایک کلمہ پر بھی قادر نہ ہو سکے اور کتنے لوگ ہیں جنہوں نے بہت مختصر عرصہ تعلیم حاصل کی لیکن عمل اور مراقبہ قلب میں کمال حاصل کر گئے اللہ تعالیٰ نے انہیں حکمت کے اتنے لطائف عطا کیے کہ جن میں عقلمندوں کی عقلیں حیران ہیں اسی وجہ سے آپ ﷺ نے فرمایا کہ ”جس شخص نے اپنے علم پر عمل کیا اللہ تعالیٰ اسے وہ علم بھی عطا کر دے گا جو اس کے پاس نہیں تھا۔“

تیرہواں عامل ﴿﴾ آپ ﷺ کا ان کے درمیان موجود ہونا آپ ﷺ انہیں کتاب و سنت زبانی یاد کراتے تھے جسے انھوں نے یاد نہیں کیا تھا اور انہیں وہ علم سکھاتے تھے جس سے وہ لوگ ناواقف تھے اور وہ لوگ جو سوال کرتے آپ ﷺ ان کا جواب دیتے اور جب وہ غلطی کرتے تو آپ ﷺ انہیں درست بات بتلاتے اور جب انہیں کسی بات میں شک ہوتا تو آپ ﷺ انہیں حقیقت امر سے آگاہ کرتے یہ سب کچھ صبر، بردباری، وسعت قلب، کرم نفس اور دل کی خوشی کے ساتھ ہوتا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ ایک ایسا اہم عامل ہے کہ ان کے لیے حفظ اور زبانی یاد کرنے کو آسان اور سہل بنا دیتا تھا اس لیے کہ یہ بات یقینی ہے کہ آپ ﷺ ایک واضح ماخذ اور چشمہ شریں تھے۔ جب ہم نے ملاحظہ کر لیا کہ آپ ﷺ ہمیشہ مسکراتے چہرہ والے نرم مزاج اور نرم دل تھے۔ سخت مزاج، بدخو، اونچا بولنے والے، فحش گو اور عیب لگانے والے نہ تھے۔ جو شخص بھی آپ ﷺ

کے پاس بیٹھتا یا کسی ضرورت میں بات چیت کرتا آپ ﷺ رک جاتے جب تک وہ واپس نہ ہو لیتا اگر کوئی شخص کسی ضرورت سے سوال کرتا تو آپ ﷺ اسے رد نہ فرماتے مگر وہ حاجت پوری کر کے یا کوئی اچھی بات کہہ کر۔ آپ ﷺ کی فراموشی اور اخلاق اتنا وسیع تھا کہ آپ ﷺ گویا ان کے باپ کی طرح بن چکے تھے اور آپ ﷺ کے سامنے وہ لوگ اپنے حق میں برابر تھے آپ ﷺ کی مجلس علم، حیا، امانت اور صبر کی مجلس تھی آپ ﷺ اس میں انھیں قرآن پاک سکھلاتے اور اس میں سنت کی نشر و اشاعت ہوتی اور ہدایت کی خوشبو میں بہکتیں۔

## قرآن کریم کے خاص عوامل

گزشتہ بالا عوامل کتاب و سنت کے درمیان مشترک تھے جن کی بدولت صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے لیے کتاب و سنت کو حفظ کرنا ان کا احاطہ کرنا اور ان کو خوب سمجھنا آسان ہو گیا تھا۔

اب یہاں ان عوامل کو شروع کیا جاتا ہے جو صحابہ رضی اللہ عنہم میں بخوبی پائے جاتے تھے اور وہ قرآن پاک کے ساتھ خاص ہیں سنت کے ساتھ ان کا تعلق نہیں ہے۔

① اللہ تعالیٰ نے امت عرب کو نہیں بلکہ تمام مخلوق کو جلیج کیا اور فرمایا کہ:

﴿قَلْبًا تَوَّابًا يَحْدِيهِمْ وَيُشَلِّهِمْ﴾ (الطور: ۳۳)

”اس جیسی کوئی بات تو لائیں۔“

جب وہ اس سے بھی عاجز آگئے تو اللہ پاک نے فرمایا کہ:

﴿قَاتُوا بَعْضُهُمْ سُوْرًا وَيُشَلِّهِمْ﴾ (ہود: ۱۳)

”اس جیسی دس سورتیں ہی لے آؤ۔“

جب اس سے بھی عاجز ہو گئے تو فرمایا کہ:

﴿قَاتُوا بِسُوْرَةٍ مِّنْ قُرْآنٍ وَيُشَلِّهِمْ﴾ (البقرہ: ۱۲۲)

”اس جیسی کوئی ایک سورت لے آؤ۔“

جب تیسری مرتبہ بھی عاجز آگئے تو ان کی شکست ان پر چسپاں کر دی اور اعجاز کے اس میدان میں قرآن پاک کی جیت کا

اعلان کر دیا اور فرمایا کہ:

﴿قُلْ لَّيْسَ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰى اَنْ يَّاتُوْا بِسُوْرٍ هٰذَا الْقُرْآنِ لَا يَأْتُوْنَ بِسُوْرَةٍ وَّلَوْ كَانَتْ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيْرًا﴾ (اسراء: ۸۸)

”کہہ دو کہ اگر انسان اور جن اس بات پر مجتمع ہوں کہ اس قرآن جیسا بنا لائیں تو اس جیسا نہ لائیں گے اگرچہ وہ ایک



دوسرے کے مددگار ہوں۔“

یہ چیلنج جس کی وجہ سے قرآن پاک کو امتیاز حاصل ہوا ہے اس نے تمام لوگوں کی آنکھوں کو کھول دیا اور وہ لوگ پوری قوت کے ساتھ اس کی طرف متوجہ ہوئے دوست دشمن سب اکٹھے ہو گئے آپ ﷺ کے دوست اور تعین نے اس حیثیت سے پڑھا کہ وہ اس کے ذریعے آپ ﷺ کے دشمنوں کو خاموش کر لیں اور اس کے اعجاز کے ذریعے اپنے دین اور نبی کی تائید کریں اور دشمن اور مخالفین نے اس کا پیچھا کیا اور چھان بین میں لگ گئے اس امید پر یہ چیلنج بھی ان اسباب میں سے ہے جو قرآن پاک کو نقل، تواتر اور اس کے ہر زبان پر جاری ہونے کے لیے مہیا ہو گئے۔

② آپ ﷺ کا قرآن پاک کی کتابت کا اہتمام کرنا جیسے بھی کتابت کے ذرائع مہیا ہوئے اس لیے کہ آپ ﷺ نے اپنے صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے بعض کو وحی کی کتابت کے لیے مقرر کیا اور جس وقت آپ ﷺ نے سنت کی کتابت سے منع کیا تھا جیسا کہ پیچھے مسلم شریف کی روایت میں گزرا کہ

((لا تکتبوا عنی ومن کتب عنی شدیداً غیر القرآن فلیمحہ))۔

”میری طرف سے نہ لکھو جس نے میری طرف سے قرآن کے علاوہ کچھ بھی لکھا اسے مٹا دینا چاہیے۔“

اس وقت جن حضرات نے اپنے لیے قرآن پاک کو لکھا تھا آپ ﷺ نے اسے برقرار کیا۔

اسے بیان کرنے کی چنداں ضرورت نہیں کہ کتاب بھی حفظ اور یاد کرنے کو آسان کرنے کے ذرائع میں سے ہے۔

③ نماز میں قرآن پاک کی قرأت کا مشروع ہونا۔ خواہ وہ نماز فرض ہو یا نفل، خواہ سری ہو یا جہری، رات کی ہو یا دن کی حتیٰ کہ نماز جنازہ میں بھی قرآن پاک مشروع ہے اور اس معاملہ میں خطبہ جمعہ بھی نماز کی طرح ہے اور یہ ایک فعلی ذریعہ ہے صحابہ رضی اللہ عنہم سے پڑھتے اور سنتے تھے، پھر اسی طرح اسے یاد کر لیتے تھے مرد عورت، چھوٹے بڑے، مالدار فقیر سب ہی برابر تھے انہیں جس قدر بھی صلاحیتیں میسر ہوتی گئیں۔

④ قرآن پاک کی تلاوت کی ترغیب خواہ غیر نماز میں ہو اور خواہ بغیر وضو کے اگر آپ چاہیں تو پڑھیں۔

﴿إِنَّ الَّذِينَ يَتْلُونَ كِتَابَ اللَّهِ وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ وَأَنفَقُوا مِمَّا رَزَقْنَاهُمْ سِرًّا وَعَلَانِيَةً يَرْجُونَ تِجَارَةً لَّنْ تَبُورًا ۗ لِيُؤْتِيَهُمُ اللَّهُ جُورَهُمْ وَيَزِيدَهُم مِّن فَضْلِهِ ۗ إِنَّهُ غَفُورٌ شَكُورٌ ۝﴾ (فاطر: ۲۹، ۳۰)

”جو لوگ خدا کی کتاب پڑھتے اور نماز کی پابندی کرتے ہیں اور جو کچھ ہم نے ان کو دیا ہے اس میں پوشیدہ اور ظاہر خرچ کرتے ہیں وہ اس تجارت (کے فائدے) کے امیدوار ہیں جو کبھی تباہ نہیں ہوگی۔ کیونکہ خدا ان کو پورا پورا بدلہ دے گا اور اپنے فضل سے کچھ زیادہ بھی دے گا وہ تو بخشنے والا (اور) قدر دان ہے۔“

نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں کہ ”جو شخص قرآن پاک پڑھتا ہے اور وہ اس کا ماہر ہے تو وہ اعمال لکھنے والے مکر نیک کار

فرشتوں کے ساتھ ہوگا اور جو شخص قرآن پڑھتا ہے اور اس میں اکتا ہے اور اسے شاق گزرتا ہے اسے دو ہزار اجر ہے۔“ ⑤

نیز آپ ﷺ نے فرمایا کہ "دو اشخاص کے علاوہ کسی شخص کے بارے میں حسد جائز نہیں ایک وہ شخص جسے اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک عطا کیا ہو اور وہ اسے دن رات پڑھتا ہو اور دوسرا وہ شخص جسے اللہ تعالیٰ نے مال عطا کیا ہو اور وہ دن رات اسے خرچ کرتا ہو۔" ①

نیز آپ ﷺ نے فرمایا کہ "جو شخص کتاب اللہ کی ایک آیت پڑھے اس کے لیے ایک نیکی اور ایک نیکی کا اجر دیا گیا ہوتا ہے میں نہیں کہتا ﴿اللّٰہُ عَٰلَمُ الْغُیُوبِ﴾ ایک حرف ہے بلکہ الف ایک حرف، لام ایک حرف اور میم ایک حرف ہے۔" ②

نیز آپ ﷺ فرماتے ہیں کہ "تم میں سے بہتر وہ شخص ہے جو قرآن پاک کو دیکھے اور سکھائے۔" ③

کیا کوئی سمجھ سکتا ہے کہ اصحاب ﷺ نے ان احادیث کو یا ان جیسی احادیث کو سنا ہوا تو کیا وہ ایک لفظ بھی قرآن پاک کی تلاوت سے سستی کر سکتا ہے؟ پھر کیا یہ تلاوت اس بات کا وسیلہ نہیں بنے گی کہ وہ قرآن پاک کے ماہر ہو جائیں اور اسے محفوظ کریں؟

④ رسول اللہ ﷺ کا قرآن کی تعلیم اور اس کی نشرو اشاعت کا اہتمام کرنا۔ آپ ﷺ لوگوں کے سامنے اسے اس طرح ٹھہر ٹھہر کر پڑھتے تھے جیسے اللہ تعالیٰ نے انھیں حکم دیا تھا اور آپ ﷺ انھیں خطبہ اور نماز میں بھی قرآن سناتے نیز دروس و مواضع میں، دعوت و ارشاد میں اور فتویٰ و قضاء میں بھی انھیں قرآن پاک سناتے تھے۔

آپ ﷺ قراء کی جماعتیں ہر طرف کے شہروں میں بھیجتے جو انھیں کتاب اللہ کی تعلیم دیتے جیسا کہ حضرت معصوم بن عمیر رضی اللہ عنہما اور ابن اُم مکتوم رضی اللہ عنہما کو ہجرت سے قبل مدینہ والوں کی طرف بھیجا۔ اسی طرح حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہما کو فتح مکہ کے بعد مکہ کی طرف بھیجا تاکہ انھیں قرآن پڑھائیں۔ حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ جب کوئی شخص ہجرت کرتا تو نبی کریم ﷺ اسے ہم میں سے کسی آدمی کی طرف بھیجتے جو اسے قرآن پاک سکھاتا۔

⑤ وہ برکتیں اور عظمتیں جن کی وجہ سے قرآن پاک دوسری کتابوں سے ممتاز ہے، کیونکہ اس میں بہت سی ایسی ترجیحات ہیں جنہیں ہم نے آپ کے سامنے بیان کر دیا اور بہت سی ایسی بھی ہیں جنہیں ہم نے آپ کے سامنے بیان نہیں کیا جیسے اس کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کرنا یا مثلاً جنبی، حائضہ یا نفاس والی کے لیے اس کی قرأت کا حرام ہونا اسی طرح اس کے مصحف کو ہاتھ لگانا اور اسے ان تمام لوگوں کے لیے اٹھانے کا حرام ہونا اور بے وضو کے لیے بھی اس کا چھونا حرام ہونا وغیرہ وغیرہ۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ برکتیں اور عظمتیں اس کی طرف نظروں کو متوجہ کرتی ہیں اس پر ایمان لانے والے اس کی طرف کیسوی کرتے ہیں اور اس کے علم کا احاطہ کرتے ہیں اور عملی طور پر اس کی تعلیم کے لیے سرگرم ہوتے ہیں یہ وہ اسباب ہیں جنہوں نے ہر زمانے میں اور علاقے میں مسلمانوں کو اس طرف دھکیلا کہ انھوں نے کتاب اللہ کے حفظ کا اہتمام کیا حتیٰ کہ ہمارا زمانہ بھی جس میں ہم رہتے ہیں۔ اب آپ کا کیا خیال ہے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم کا زمانہ جو نور و علم، تقویٰ و ہدایت اور نشرو دعوت کا زمانہ تھا اس میں کیا حال ہوگا؟

① بخاری فضائل قرآن باب ۲۰، مسلم کتاب السائزین حدیث ۲۶۶

② ترمذی ثواب القرآن ۱۶، ابوداؤدی الوتر ۲۰، مسند احمد ۱۹۲/۲

③ بخاری کتاب فضائل القرآن ۲۱

یہ دس سے کچھ اوپر عوائل ہیں جو رسول کریم ﷺ کے صحابہ میں باکمال طور پر پائے جاتے تھے جن کی بناء پر انھوں نے کتاب اللہ اور سنت رسول کو حفظ کر لیا تھا اور ہم نے اس طریقے سے جمع کر کے آپ کے سامنے پیش کر دیے اور ہمارا اعتقاد ہے کہ ان کے علاوہ بھی کچھ عوائل شخصیت ہیں جو بعض قراء اور بعض محدثین میں پائے جاتے ہیں اگر آپ ان عوائل کو جاننا چاہتے ہیں تو ان قراء کے اور صحابہ میں سے روایت کے لیے سرفہرست ہونے والے حضرات کی سوانح عمری پڑھیے اگر آپ چاہیں تو ان میں رجوع بھی کریں اور ہم نے جو آپ کے سامنے ذکر کیا اس میں حرص بھی کریں اور اس میں اپنے تیز دھار علمی آلات کو بھی ڈھال لیجیے جو انھیں ان بددیانتوں کے سامنے بھی مشہور کر دیں جو بغیر کسی علم کے صحابہ رضی اللہ عنہم کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں اور صحابہ رضی اللہ عنہم میں طعن کا راستہ اپناتے ہوئے کتاب و سنت میں طعن کرتے ہیں کہ ان میں حفظ و ضبط نہیں تھا۔

ہم اہم عالم کو ان اسباب کا نتیجہ کرتے ہیں جو صحابہ رضی اللہ عنہم میں پائے جاتے تھے حتیٰ کہ انھوں نے کتاب و سنت کو نقل کیا۔ یہ ان سے ہم تک تو اتار کے ساتھ پہنچا خصوصاً قرآن کریم۔

اولئك اهلنا فجنني بسئلهم  
یہ میرے آباء ہیں ان کی مثل میرے پاس لے آ

اللہ تعالیٰ انھیں اپنی رحمت اور رضا سے ڈھانپے اور ان پر اپنے جو دوا و احسان کی بارش برسائے۔ آمین

**دوسرا سبب** وہ عوائل جن کی بدولت صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے کتاب و سنت میں تحقیق و جستجو کی۔

اب ہم صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے کتاب و سنت کے حفظ کے عوائل سے فارغ ہو چکے اب ترقی کرتے ہوئے ان عوائل کی طرف پیش قدمی کرتے ہیں جن کی بدولت صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے تحقیق و جستجو کی چنانچہ ہم ذکر کرتے ہیں کہ صحابہ رضی اللہ عنہم کی تاریخ میں غور کرنے والا جب ان کی تحقیق و جستجو کو جانتا ہے تو وہ ان کے حفظ سے بھی زیادہ حیران ہوتا ہے اس لیے کہ تحقیق و جستجو ایسی فضیلت ہے جو ایک پہلو سے امانت کاملہ اور پختہ عقل کی طرف لوٹی ہے، پھر دوسرے پہلو سے دیکھیں تو وہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں کمال کے درجہ کو پہنچی ہوئی تھی اس لیے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی کتاب اور سنت رسول ﷺ کے لیے کامل درجہ کی تحقیق و جستجو، باریک بینی کے ساتھ پرہیز، منفرد احتیاط اور گہری تحقیق کرتے تھے اور یہ صفات ان تمام چیزوں میں تھیں جو کتاب اللہ اور سنت کے ساتھ اتصال رکھتی تھیں خواہ ان کا تعلق قریب سے تھا یا بعید سے، یہ تحقیق و جستجو جو اپنی دستِ حقیقہ میں منفرد ہے اس کے بہت سے اسباب اور ذرائع ہیں جو ہمیں ابھارتے ہیں کہ ہم انھیں آپ کے سامنے پیش کریں۔ یہ کتاب و سنت کے دفاع کے لیے تیز دھار اسلحہ کی مانند ہیں نیز صحابہ رضی اللہ عنہم کے کتاب اللہ اور سنت رسول ﷺ کی ادائیگی کے دفاع کا بھی ذریعہ ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے اپنی حکم کتاب میں تحقیق و جستجو کا حکم دیا اور قرآن کریم اور احادیث نبویہ رضی اللہ عنہم سے نابلد ہو کر کوئی پہلا عالم بات بتلانے یا خبر دینے میں بے عقلی اور جلد بازی سے منع کیا اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِن جَاءَكُمْ فَاسِئَلٌ بِبَنِي قَتَبَيْتُمْ أَوْ أَنْ قُتِبْتُمْ فَكُفُّوا عَنْهَا قَاتِلُوا أَهْلَ قَتَبِهَا لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ﴿۶۱﴾ (النجم: ۶۱)

”مومنو! اگر کوئی بدکردار تمہارے پاس کوئی خبر لے کر آئے تو خوب تحقیق کر لیا کرو (مبادا) کہ کسی قوم کو نادانی سے نقصان

پہنچا دو پھر تم کو اپنے کئے پر نادم ہونا پڑے۔“

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے بغیر دلیل کے بات کے پیچھے پڑنے سے منع فرمایا سوائے ان باتوں کے جنہیں کانوں نے سنا ہو یا آنکھوں نے دیکھا ہو یا کسی دلیل کی بنا پر دل اس کا اعتقاد رکھتا ہو۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے عزائمہ نے فرمایا کہ:

﴿وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ إِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ أُولَٰئِكَ كَانَ عِنْدَهُ مُسْتَوْلاً﴾ (بنی اسرائیل: ۳۶)

”اور (اے بندے) جس چیز کا تجھے علم نہیں اس کے پیچھے نہ پڑ۔ کہ کان اور آنکھ اور دل ان سب (جوارج) سے ضرور باز پرس ہوگی۔“

قرآن پاک نے ان لوگوں کو بے نقاب کیا جو ظن کے پیچھے چلتے ہیں ایسی چیزوں میں حق میں ظن کافی نہیں ہوتا چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ:

﴿إِنَّ يَتَّبِعُونَ آيَاتَ الظَّنِّ ۖ وَإِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِي مِنَ الْحَقِّ شَيْئًا﴾ (النجم: ۲۸)

”وہ صرف ظن پر چلتے ہیں اور ظن یقین کے مقابلہ میں کچھ کام نہیں آتا۔“

اس کے علاوہ کتاب و سنت میں بہت سے دلائل ہیں جو غور و فکر کی دعوت دیتے ہیں اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ہی ان تعلیمات کے مخاطب اور ان کے سامنے بیٹھنے والے تھے۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ آداب اسلامیہ ان کے رسوخ اور پرہیزگاری کے اہم ترین عوامل میں سے ہیں خصوصاً ان چیزوں میں جن کا تعلق کتاب و سنت کے ساتھ ہے اور یہ بات بہت ہی بعید بلکہ پوری طرح محال ہے کہ انہوں نے ان اعلیٰ نصیحتوں کو نظر انداز کر دیا ہو حالانکہ وہ لوگ سب سے بہتر طبقہ تھے جنہیں لوگوں کے لیے مبعوث کیا گیا۔

انہوں نے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول و مصطفیٰ ﷺ پر جھوٹ باندھنے کی جو شدید ترہیب، دھمکی اور وعید سن **دوسرا عامل** رکھی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ:

﴿وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرَىٰ عَلَى اللَّهِ كَذِبًا أَوْ قَالَ أُوحِيَ إِلَيَّ وَلَمْ يُوحَ إِلَيْهِ شَيْءٌ وَمَنْ قَالَ سَأُنزِلُ مِثْلَ مَا أَنْزَلَ اللَّهُ﴾ (الانعام: ۹۳)

”اور اس سے بڑھ کر ظالم کون ہوگا جو اللہ تعالیٰ نے جھوٹ باندھنے یا کہے کہ مجھ پر وحی نازل ہوگی حالانکہ اس پر کوئی وحی نازل نہیں ہوئی۔ اس نے کہا کہ جیسے اللہ تعالیٰ نے نازل کیا اسی طرح کام میں بھی نازل کروں گا۔“

آپ دیکھیں کہ اللہ تعالیٰ نے اس پر جھوٹ باندھنے والے کو کیسے اس کی لڑی میں پر دیا جس نے کہا کہ مجھ پر وحی نازل ہوئی حالانکہ اس پر کوئی وحی نازل نہیں ہوئی اور اس شخص کی لڑی میں پر دیا جس نے کہا کہ عنقریب میں بھی ایسے ہی نازل کروں گا جیسے اللہ تعالیٰ نے نازل کیا؟ پھر آپ دیکھیں کہ اللہ تعالیٰ نے کیسے اسے ان دونوں پر مقدم کیا اور وعید میں اسے پہلے لایا اور اس کی صفت کو ظلم میں حد سے تجاوز کرنے والوں میں سب سے پہلے بیان کیا۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ:

﴿وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرَىٰ عَلَى اللَّهِ الْكِبْرَ وَهُوَ يُدْعَىٰ إِلَى الْإِسْلَامِ﴾ (الصف: ۷)

”اس سے بڑھ کر کون ظالم ہوگا جو اللہ تعالیٰ پر جھوٹا الزام لگائے حالانکہ اسے اسلام کی دعوت کی جا رہی ہو۔“

﴿وَيَوْمَ الْقِيَامَةِ تَرَى الَّذِينَ كَذَبُوا عَلَى اللَّهِ وُجُوهُهُم مُّسْوَدَّةٌ أَلَيْسَ فِي جَهَنَّمَ مَثْوًى لِّلْمُتَكَبِّرِينَ﴾ (الزمر: ۶۰)

”اور جن لوگوں نے خدا پر جھوٹ بولا تم قیامت کے دن دیکھو گے کہ ان کے منہ کالے ہو رہے ہوں گے کیا غرور کرنے والوں کا ٹھکانہ دوزخ نہیں ہے؟“

اور سنت نبوی ﷺ میں ہم پڑھتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ”جس نے مجھ پر جھوٹ باندھا اسے چاہیے کہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنا لے۔“ ①

یہ ایک مشہور حدیث ہے بلکہ متواتر ہے۔ وارد ہے کہ اسے ہاتھ، صحابہ رضی اللہ عنہم نے نقل کیا جن میں سے عشرہ مبشرہ بھی ہیں اور کوئی حدیث ایسی مشہور و معروف نہیں ہے کہ جس پر عشرہ مبشرہ حضرات جمع ہوئے ہوں سوائے اس حدیث کے۔ اور کوئی حدیث بھی ایسی نہیں ہے جو ساٹھ سے زائد صحابہ رضی اللہ عنہم سے مروی ہو سوائے اس حدیث کے۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے یہ تربیات بھی سنیں اور ان جیسی تربیات بھی سنیں اور اس جیسی تربیات قرآن و سنت میں کم نہیں ہیں بلکہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے رسول اللہ ﷺ سے ان احادیث کی ممانعت بھی سن رکھی تھی جو جھوٹ سے کم درجہ ہو لیکن حدیث میں کی بیشی سے متعلق ہو۔ اس لیے کہ آپ ﷺ نے صحابہ رضی اللہ عنہم کوضعفاء اور کم عقل راویوں کی روایت سے بھی ڈرایا اور فرمایا کہ:

”میری امت میں آخر میں کچھ ایسے لوگ بھی ہوں گے جو تمہیں ایسی ایسی احادیث سنائیں گے جو تم نے سنی ہو گی اور نہ ہی تمہارے آباؤ اجداد نے سنی ہوں گی تم ان سے بچ کر رہنا۔“ ②

بلکہ انھیں کم عقل راویوں کی روایت سے بھی ڈرایا اور فرمایا کہ ”بے شک شیطان ایک آدمی کی صورت میں ایک قوم کے پاس آتا ہے اور انھیں جھوٹی حدیث سنا تا ہے پھر وہ لوگ تتر بتر ہو جاتے ہیں اور ان میں سے ایک آدمی کہتا ہے کہ میں نے ایک آدمی سے سنا اس کی شکل میں پہچانتا ہوں اور نام کا پتا نہیں وہ یوں یوں حدیث بیان کر رہا تھا۔“ ③

اسلام نے بچ بولنے کا حکم دیا اور جھوٹ بولنے سے مطلق منع کیا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَكُونُوا مَعَ الصّٰدِقِينَ﴾ (التوبہ: ۱۱۹)

”اے اہل ایمان! خدا سے ڈرتے رہو اور راستبازوں کے ساتھ رہو۔“

اور آپ بخوبی جانتے ہیں کہ اس مقام میں اس صیغہ کے ساتھ خطاب اور پھر اس سے پہلے تقویٰ کا حکم، اس میں اشارہ ہے کہ جس نے جھوٹ بولا اور بہتان لگایا اس کا راستہ کفر اور گمراہی والا راستہ ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے صراحتاً فرمایا کہ:

﴿إِنَّمَا يَفْتَوِي الْكٰذِبَ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِآيٰتِ اللّٰهِ ۚ وَ اُوْلٰئِكَ هُمُ الْكٰذِبُوْنَ﴾ (النمل: ۱۰۵)

① بخاری کتاب العلم باب ۳۸ کتاب الایمان ۱۱۲، ابوداؤد کتاب الایمان، ترمذی کتاب الجن ۵۰، ابن ماجہ ۲۳۳،

دارمی مقدمہ ۶۲۵، ۵۰۳، منہاجہ ۱/۶۵

② مسلم شریف۔ ③ صحیح مسلم المقدمہ حدیث ۶

”جھوٹ افتراء تو وہی لوگ کیا کرتے ہیں جو خدا کی آیتوں پر ایمان نہیں لاتے۔ اور وہی جھوٹے ہیں۔“

اور نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ ”سچ کو لازم پکڑو! کیونکہ وہ نیکی کے ساتھ ہے اور یہ دونوں جنت میں ہوں گے اور جھوٹ سے بچ کر رہو کیونکہ یہ گناہ کے ساتھ ہے اور یہ دونوں دوزخ میں ہوں گے۔“<sup>①</sup>

حضرت معفوان بن سلیم رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ ہم نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ! کیا مؤمن بزدل ہو سکتا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ”ہاں“ ہم نے عرض کیا کہ کیا وہ بخیل ہو سکتا ہے؟ فرمایا کہ ”ہاں“ ہم نے عرض کیا کہ کیا مؤمن جھوٹا ہو سکتا ہے؟ فرمایا کہ ”نہیں۔“<sup>②</sup>

اب آپ پہلی حدیث میں غور فرمائیں کہ کیسے سچ کو نیکی اور جنت کی طرف رہنمائی کرنے والا بتایا اور جھوٹ کو گناہ اور دوزخ کی طرف رہنمائی کرنے والا بتایا۔ اس کے بعد دوسری حدیث میں غور فرمائیں کہ کیسے جھوٹ کو بزدلی اور بخل سے بھی برا شمار کیا گیا اور اسے ایسی بھیا تک صورت میں بیان کیا کہ وہ اور ایمان کبھی بھی ایک آدمی میں جمع نہیں ہو سکتے۔

اور آپ کو بڑا ہی تعجب ہو گا جب آپ کو معلوم ہو گا کہ رسول اللہ ﷺ نے جھوٹ کی مذمت میں مباغذ کیا حتیٰ کہ بالکل معمولی اور چھوٹی چھوٹی اشیاء اور چھوٹے چھوٹے امور میں بھی۔ آپ نبی کریم ﷺ کی طرف توجہ سے کان لگائیں کہ آپ ﷺ کیسے دھسکی آ میز طریقے سے مزاح میں بھی جھوٹ بولنے سے منع فرماتے ہیں چنانچہ آپ ﷺ فرماتے ہیں کہ ”بربادی ہو اس شخص کے لیے جو قوم کو نہانے کے لیے بات کرے اور جھوٹ بولے بربادی ہو اس کے لیے، بربادی ہو اس کے لیے۔“<sup>③</sup>

پھر آپ توجہ فرمائیں کہ آپ ﷺ اس شخص کے بار میں وعید بیان بیان کرتے ہیں جو اپنے خواب کے بارے میں جھوٹ بولتا ہے، چنانچہ آپ ﷺ فرماتے ہیں کہ ”جو شخص خواب کے بارے میں جھوٹ بولتا ہے قیامت کے روز اسے مکلف بنایا جائے گا کہ وہ جو کہ دو دنوں میں گرہ لگائے اور وہ کبھی بھی ان کے درمیان گرہ نہیں لگا سکے گا۔“<sup>④</sup>

اب آپ کو رب کی قسم مجھے بتلائیے کہ کیا یہ اعلیٰ اور ممتاز طبقہ جس نے یہ احادیث سنیں اور اس سے کئی گنا احادیث رسول اللہ ﷺ وہن مبارک سے سنیں یہ وہ طبقہ ہے جس نے بڑی تحقیق اور غور و فکر کے ایمان قبول کیا اور اسے اپنی سعادت اور عزت کا راستہ سمجھ کر پختہ کیا، یہ وہ طبقہ ہے جس نے اپنی جانوں اور مالوں کو اللہ کے لیے جنت کے بدلے میں اس کی نعمتوں اور دوام سمیت فروخت کر دیا۔ ہم کہتے ہیں کہ کیا یہ طبقہ اس کے بعد بھی پسند کرے گا کہ وہ بے سوچے سمجھے کچھ کہے یا ابریزھوں کے بل پھر جائے؟ اور پھر اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ پر جھوٹ بولے یا کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ ﷺ میں تحقیق و جستجو نہ کرے؟ یہ بہت ہی بعید ہے یہ صرف غافل عقلموں سے ہی ممکن ہے۔

① ابن ماجہ کتاب اللہ عابد باب ۵، مسند احمد ۱، ۵۳

② موطا باب ماجاء فی الصدق والکذب حدیث ۱۸۱۶

③ ابوداؤد کتاب الادب ۸۰، ترمذی کتاب الزہد باب ۱۱

④ بخاری کتاب التعمیر ۲۳۵، ترمذی کتاب الرؤیا ۸۱، دارمی کتاب الرؤیا ۸



چوتھا عامل ﴿ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم تفسیر اور تعلیم کے دلدادہ اور بحث اور جستجو کے دیوانے اور اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے کلام کے فریفتہ تھے۔ وہ اپنی مجلس قرآن پاک کے پڑھنے پڑھانے اور اس کے فہم کے لیے منقہ کرتے اور طلب علم اور حصول علم کے لیے سفر کرتے تھے اور رسول اللہ ﷺ انہیں قرآن پاک سکھلانے کا خوب بڑھ چڑھ کر اہتمام کرتے، آپ ﷺ ان کے سامنے قرآن پڑھتے اور ان کو خطبہ بھی قرآن کے ساتھ دیتے تھے اور اپنی نماز میں ان کی امامت کو بھی قرآن پاک کی قرأت کے ذریعے مزین کرتے۔ نیز اپنے دروس و مواعظ کو بھی قرآن پاک سے مزین کرتے اس سے بڑھ کر یہ کہ آپ ﷺ جیسے ان کے سامنے قرآن پاک پڑھنا پسند کرتے اسی طرح ان سے سننا بھی پسند کرتے تھے۔ بخاری و مسلم نے روایت کیا کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں چاہتا ہوں کہ کسی اور سے سنوں میں نے آپ ﷺ کے سامنے سورۃ النساء پڑھنی شروع کی حتیٰ کہ جب میں اس آیت پر پہنچا:

﴿ فَكَيْفَ إِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ أُمَّةٍ بِشَهِيدٍ وَجِئْنَا بِكَ عَلَىٰ هَؤُلَاءِ شَهِيدًا ۗ ﴾ (النساء: ۴۱)

”بھلا اس دن کیا حال ہوگا جب ہم ہر امت میں سے احوال بتانے والے کو بلائیں گے اور تم کو ان لوگوں کا (حال بتانے کو) گواہ طلب کریں گے۔“

آپ ﷺ نے فرمایا کہ اب بس کرو! میں نے جب آپ ﷺ کی طرف دیکھا تو آپ ﷺ کی آنکھیں بہہ رہی تھیں۔ ① صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا حال بھی اسی طرح تھا انہیں یہی فکر ہوتی تھی کہ وہ قرآن پاک کو پڑھیں اور سنیں بخاری و مسلم نے حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ”اشعری لوگ جب رات کو داخل ہوتے ہیں تو میں ان کی آوازوں کو پہچان لیتا ہوں اور رات کو قرآن پاک کی تلاوت کی وجہ سے ان کے گھروں کو پہچان لیتا ہوں اگرچہ جب وہ دن کو اترتے ہیں تو میں نے ان کے گھروں کو نہ دیکھا ہو۔“ ②

اور داری وغیرہ نے اپنی مختلف سندوں کے ساتھ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے روایت کیا کہ وہ حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے فرمایا کرتے تھے کہ ”آپ ہمیں ہمارے رب کی یاد دلائیے وہ ان رضی اللہ عنہ کے پاس قرآن پڑھا کرتے تھے۔“ ③

پچھتے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا سنت نبوی کی حفاظت کا بھر پورا اہتمام کرنا گزر چکا کہ انہوں نے کس طرح اپنی توجہ اس کی طرف کی اور نبی کریم ﷺ سے سیکھے اور علم حاصل کرنے کے لیے ملاقات کا کس قدر اہتمام کیا۔ کھول ریاضۃ عبدالرحمن بن ظنم ریاضی سے روایت کرتے ہیں کہ مجھے رسول اللہ ﷺ کے دس صحابہ رضی اللہ عنہم نے بتلایا کہ ہم مسجد قبا میں علم پڑھ رہے تھے کہ ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ ہمارے پاس تشریف لائے اور فرمایا کہ ”جو سیکھنا چاہو سیکھ لو کیونکہ سیکھے بغیر اللہ تعالیٰ تمہیں کبھی بھی اجر نہیں دے گا۔“ ④ داری نے اسے صحیح سند کے ساتھ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ پر موقوف نقل کیا۔ اور اس حدیث میں علم کا لفظ کتاب کے علم کو بھی شامل ہے اور حدیث کے علم کو بھی۔

① صحیح بخاری کتاب المغازی باب ۳۸، مسلم کتاب ملاحۃ المسافرین حدیث ۲۳۸

② بخاری کتاب المغازی باب ۳۸، صحیح مسلم کتاب فضائل الصحابہ حدیث ۱۶۶

③ داری، فضائل قرآن ۳۳

④ داری مقدمہ باب العمل بالعلم حسن لینیہ ۸

## منائل العسرفان فی علوم القرآن: جلد ۱

کیا یہ شوق ان کے قرآن و سنت میں تحقیق و جستجو کے اسباب میں سے نہیں ہے جیسا کہ ان کے قرآن و سنت کو حفظ کرنے کے دعویٰ میں سے تھا اس لیے کہ کسی چیز کا مشہور اور شائع ہونا اور اس کے ساتھ زبانوں کا نرم ہونا اسے خوب ظاہر اور واضح کر دیتا ہے کہ اس میں نہ کوئی التباس رہتا ہے نہ کوئی کھوٹ رہتا ہے اور نہ اس میں کوئی دخل و خیل نظر اندازی کرتا ہے۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو تحقیق و جستجو کے وسائل میسر تھے اور قرآن و سنت کی معرفت میں جو چیزیں سمجھ میں نہیں آتی تھیں ان کی حقیقت کو جاننے تک رسائی بھی انھیں آسان تھی اس کی وجہ یہ تھی کہ انھیں رسول اللہ ﷺ کی ہم عصرت حاصل تھی وہ اپنی زندگی میں آپ ﷺ کے ساتھ تعلق و وابستہ رکھتے تھے جس کی وجہ سے ان کے دل شک شبہ سے پاک رہتے تھے اور ان کے دل راحت پاتے تھے علم کے انوارات اور یقین کے حقائق ان پر منکشف ہوتے تھے۔

جب نبوت کا آفتاب غروب ہو گیا اور آپ ﷺ اپنے رب کے جوار میں منتقل ہو گئے تو بھی انھیں یہ کام آسان تھا کہ جن حضرات نے اپنے کانوں سے نبی کریم ﷺ کے ارشادات کو سنا وہ ان کے ساتھ و ابستہ رہیں اور اس دن ایک بہت بڑی جماعت اور بہت بڑی تعداد تھی جنہوں نے آپ ﷺ کی حدیث کو سن رکھا تھا یہ حضرات ان کے شہروں میں قیام کرتے اور ان کی مجالس میں بیٹھتے اگر ان میں سے کوئی بھی شخص کتاب اللہ کی کسی آیت میں یا رسول اللہ ﷺ کی کسی حدیث میں شک کرتا تو اسے اپنے علاوہ بیسیوں لوگوں سے تحقیق و جستجو کرنا بغیر کسی تکلف اور مشقت کے آسان تھا۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں شجاعت جو کہ فطری شجاعت تھی نیز ان کے اندر صاف گوئی تھی اور وہ بھی ان کے اندر فطری چھٹا عامل تھی۔ یہ لوگ انھی خوبیوں میں پیدا ہوئے اور پلے بڑھے۔ وہ اپنی فطرت اور ماحول کے اعتبار سے انھی صفات میں ڈھلے۔ جیسا کہ جنگل میں رہنے والی قوم ہوتی ہے جو شہر کے آلودہ چکر فریب کو نہیں جانتی اور نہ ہی وہاں کے مذہب و نفاق سے مانوس ہوئی ہوتی ہے۔ پھر جب اسلام آیا تو اس نے اس مہذب قوم کو عزت دی اور انھیں مزید ترقی دی اور اس پر صحیح شہریت اور پاکیزہ رہن سہن کی بنیاد رکھی، جیسا کہ آپ نے اصداق الحدیث اور خیر الہدیٰ میں سنا، یہاں تک کہ اگر ان میں سے کوئی شخص بھرے مجمع میں کھڑا ہوتا اور امیر المؤمنین اپنی سلفت کا خطاب کر رہا ہوتا تو اسے بھی پوری قوت و مصراحت اور سختی کے ساتھ ٹوک دیتا تھا بلکہ اگر کوئی عورت جامع مسجد کے درمیان میں کھڑی ہوتی اور مسلمانوں کا خلیفہ خطبہ دے رہا ہوتا تو وہ خلیفہ کی بات کو کاٹ دیتی اور اس خلیفہ کی رائے اس عورت کی رائے کے معارض ہوتی اور اس کی دلیل اس عورت کی دلیل سے ٹکراتی ہوتی اور اس عورت کا اعتقاد یہ ہوتا کہ اس معاملہ میں امیر المؤمنین درستی سے ہٹ کر غلطی کھا رہے ہیں تو بھی امیر المؤمنین ان دونوں حالتوں میں ان دونوں کی تصریح سے خوش ہوتے اور اس جرأت سے خوش ہوتے اور اس سخت مزاج عربی کے اپنی جگہ کھڑے ہوتے ہوئے اپنی خوشی کا اظہار کرتے اور اس طرح اپنے رائے سے اس محترم عورت کی رائے کی طرف رجوع کا اظہار کرتے جس نے آپ کے سامنے حجت قائم کی۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ معاملہ آپ سے بعید نہیں اور نہ ہی آپ سے ڈھکا چھپا ہے نہ تو اس وقت کا واقعہ جب وہ اپنے خلافت کے ہوتے ہوئے کھڑے خطبہ دے رہے تھے اور نہ ہی اس وقت کا واقعہ جب وہ اپنے مہر پر کھڑے عورتوں کے مہر میں اضافہ کرنے سے منع کر رہے تھے۔

اب آپ دیکھیں کہ کیا عقل اور منطق پسند کرتی ہے کہ اس صاف گو اور قوی امت کو کوئی عیب لگایا جائے اور ان پر جھوٹ کی

تہمت لگائی جائے یا اللہ تعالیٰ کے کلام اور اس کے رسول ﷺ کی سنت میں جھوٹ پر خاموش رہنے کی تہمت لگائی جائے؟  
پھر آپ بتلائیں کہ کیا یہ مخلوق جن میں وہ حضرات رونما ہوئے انہیں کتاب اللہ اور سنت رسول ﷺ میں کامل تحقیق و جستجو،  
بھرپور جھان بین پر براہیمت نہیں کرے گی۔ (تحقیق آنکھوں والوں کے لیے صبح روشن ہو چکی)

21

ساتواں عامل ﴿﴾ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر اسلام نے جو ذمہ داری ڈالی ان کا اس ذمہ داری پر اجتماعی طور پر کفیل اور ذمہ دار بننا۔  
اس نے ان کی آنکھوں کو ہر اس شخص پر کھول کر رکھ دیا جو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول اللہ ﷺ پر جھوٹ  
باندھے یا بہتان تراشی کرے یا بغیر علم کے شریعت میں ٹانگ اڑائے یا بغیر دلیل کے دین میں فتویٰ دے۔

ہاں: تحقیق ان میں کا ہر ایک اس بات کا اعتقاد رکھتا ہے کہ وہ امت کے جسم میں ایک عضو ہے اس کی ذمہ داری ہے کہ وہ اور  
تمام لوگ مل کر ملت کی حفاظت کریں اور اس کا اعتقاد ہے کہ وہ جماعت کی عمارت کی ایک اینٹ ہے اس کی ذمہ داری ہے کہ وہ دھوکہ،  
فریب، افتراء پردازی اور جھوٹ سے اس کی حفاظت کرے خصوصاً شریعت کی بنیادوں یعنی قرآن اور اس کی دوسری بنیاد یعنی سنت  
رسول اللہ ﷺ کی سلامتی میں کوشش کرے۔

آپ کے سامنے کتاب و سنت ہے اگر آپ چاہیں تو ان میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے دلائل پڑھیں وہ بہت کثیر  
اور مشہور معروف ہیں جو صحابہ رضی اللہ عنہم کی اس اجتماعی اسلامی کفالت کو امت کے افراد کے مابین اس طرح مضبوط کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ  
پر بہتان باندھنے والوں میں سے کسی کے لیے کوئی گنجائش نہیں چھوڑتے اور نہ ہی رسول اللہ ﷺ کی حدیث میں ادھر ادھر کی مارنے  
والوں کے لیے کوئی حیلہ چھوڑتے ہیں۔

آپ حق تعالیٰ کے کلام کی طرف کان لگائیں کہ وہ کس طرح جھلائی کی دعوت اور نصیحت کی فضیلت پر ابھاڑتے ہوئے سورۃ  
آل عمران میں فرماتا ہے کہ:

﴿وَلْتَكُنْ مِنْكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ۗ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ﴿١٠٤﴾  
وَلَا تَتَّبِعُوا كَاذِبِينَ تَقَرُّ قُلُوبًا وَارْتَاخُوا فَارًا ۗ مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْبَيِّنَاتُ ۗ وَأُولَٰئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ ﴿١٠٥﴾ يَوْمَ تَبْيَضُّ  
وُجُوهُهُمُ وَتَسْوَدُّ وُجُوهُهُمُ ۗ فَأَمَّا الَّذِينَ يَنْسَوْنَ وُجُوهُهُمْ ۗ أَكْفَرْتُمْ بَعْدَ آيَاتِنَا كُفْرًا ۚ فَذُوقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ  
تَكْفُرُونَ ﴿١٠٦﴾ وَأَمَّا الَّذِينَ ابْصَرَتْ وُجُوهُهُمُ فَفِي رَحْمَةِ اللَّهِ ۗ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ﴿١٠٧﴾ تِلْكَ آيَاتُ اللَّهِ تَتْلُوهَا عَلَيْكَ  
بِالْحَقِّ ۗ وَمَا اللَّهُ يُرِيدُ ظَلْمًا لِّلْعَالَمِينَ ﴿١٠٨﴾ وَبِاللَّهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ ۗ إِلَى اللَّهِ تُرْجَعُ الْأُمُورُ ﴿١٠٩﴾ كُنْتُمْ  
خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ۗ وَتُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ ۗ وَلَوْ آمَنَ أَهْلُ الْكِتَابِ  
لَكَانَ خَيْرًا لَهُمْ ۗ مِنْهُمْ الْمُؤْمِنُونَ ۖ أَكْثَرُهُمُ الْفٰسِقُونَ ﴿١١٠﴾ كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ  
بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ۗ وَتُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ ۗ وَلَوْ آمَنَ أَهْلُ الْكِتَابِ لَكَانَ خَيْرًا لَهُمْ ۗ مِنْهُمْ الْمُؤْمِنُونَ ۖ  
أَكْثَرُهُمُ الْفٰسِقُونَ ﴿١١١﴾﴾﴾ (آل عمران: ۱۰۴-۱۱۰)

”اور تم میں ایک جماعت ایسی ہونی چاہے جو لوگوں کو نیکی کی طرف بلائے اور اچھے کام کرنے کا حکم دے اور برے کاموں  
سے منع کرے یہی لوگ ہیں جو نبیجات پانے والے ہیں۔ اور ان لوگوں کی طرح نہ ہونا جو متفرق ہو گئے اور احکام میں

## منامہ العسرافان فی علوم القسراں: جلد ①

آنے کے بعد ایک دوسرے سے (خلافت و) اختلاف کرنے لگے یہ وہ لوگ ہیں جن کو (قیامت کے دن) بڑا عذاب ہوگا۔ جس دن بہت سے منہ سفید ہوں گے اور بہت سے سیاہ تو جن لوگوں کے منہ سیاہ ہوں گے (ان سے خدا فرمائے گا) کیا تم ایمان لا کر کافر ہو گئے تھے؟ سو (اب) اس کفر کے بدلے عذاب (کے مزے) چکھو۔ اور جن لوگوں کے منہ سفید ہو گئے وہ خدا کی رحمت (کے باغوں) میں ہوں گے اور ان میں ہمیشہ رہیں گے۔ اور جن لوگوں کے منہ سفید ہو گئے وہ خدا کی رحمت (کے باغوں) میں ہوں گے اور ان میں ہمیشہ رہیں گے۔ اور جو کچھ آسمانوں میں اور جو کچھ زمین میں ہے سب خدا ہی کا ہے اور سب کاموں کا رجوع (اور انجام) خدا ہی کی طرف ہے۔ (مومنو!) جتنی باتیں (یعنی توہین) لوگوں میں پیدا ہوئیں تم ان سب سے بہتر ہو کہ نیک کام کرنے کو کہتے ہو اور برے کاموں سے منع کرتے ہو اور خدا پر ایمان رکھتے ہو اور اگر اہل کتاب بھی ایمان لے آتے تو ان کے لیے بہت اچھا ہوتا ان میں ایمان لانے والے بھی ہیں (لیکن تمھوڑے) اور اکثر نافرمان ہیں۔“

آپ اللہ کے اشارہ میں غور کریں جسے اللہ تعالیٰ نے سورۃ المائدہ میں ارشاد فرمایا کہ:

﴿لُعِنَ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ بَنِي إِسْرَائِيلَ عَلَى لِسَانِ دَاوُدَ وَعِيسَى ابْنِ مَرْيَمَ ذَلِكَ بِمَا عَصَوْا وَكَانُوا يَعْتَدُونَ ﴿٥٨﴾ كَانُوا لَا يَتَنَبَّأُونَ عَنْ مَنكِبِكُمْ فَعَلَوْهُ لِيُبْسَ مَا كَانُوا يَفْعَلُونَ ﴿٥٩﴾﴾ (المائدہ: ۵۸، ۵۹)

”جو لوگ بنی اسرائیل میں کافر ہوئے ان پر داؤد اور عیسیٰ بن مریم کی زبان سے لعنت کی گئی۔ یہ اس لئے کہ نافرمانی کرتے تھے اور حد سے تجاوز کرتے تھے۔ (اور) برے کاموں سے جو وہ کرتے تھے ایک دوسرے کو روکتے نہیں تھے۔ بلاشبہ وہ برا کرتے تھے۔“

پھر آپ غور فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ نے تمام بنی نوع انسان پر حکم قائم کیا کہ وہ خسارے میں عرق ہیں سوائے ان لوگوں کے جنھوں نے چار سعادتوں کے عناصر کو جمع کیا اور وہ چار سعادتیں یہ ہیں:

① ایمان ② اچھے اعمال ③ حق کی وصیت ④ صبر کی وصیت

اور یہ اللہ تعالیٰ کے مندرجہ ذیل قول ہے

﴿وَالصُّبْرُ ﴿١﴾ إِنَّ الْإِنْسَانَ لِرَبِّهِ لَكَنُفٍ ﴿٢﴾ إِلَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ وَكَانُوا بِالْحَقِّ آوًا ﴿٣﴾﴾ (العصر: ۱-۳)

”عصر کی قسم۔ کہ انسان نقصان میں ہے۔ مگر وہ لوگ جو ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے اور آپس میں حق بات کی تلقین اور صبر کی تاکید کرتے رہے۔“

رسول اللہ ﷺ کے اصحاب نے یہ سنا اور اللہ تعالیٰ کی بات کو جو حضرت جبریل علیہ السلام کے واسطے رسول اللہ ﷺ تک پہنچی اسے خود رسول اللہ ﷺ کے دہن مبارک سے سنا پھر اس کے بعد یہی باتیں رسول اللہ ﷺ کے کلام سے بھی سنیں جیسے مندرجہ ذیل احادیث ہیں۔

مناب العرفان فی علوم القسآن: جلد ۱

① آپ ﷺ فرماتے ہیں کہ "اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے تم ضرور بالضرور بھلائیوں کا حکم دو اور برائیوں سے منع کرو! ورنہ قریب ہے کہ اللہ تعالیٰ تم پر اپنا عذاب بھیج دے پھر تم دعا مانگو اور وہ قبول نہ ہو۔" ②

حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ہم نے رسول اللہ ﷺ کے ہاتھ پر بیعت کی کہ ہم ہرنگی اور وسعت خوشی اور ناگواری کے حال میں خوب اطاعت کریں گے نیز اس بات پر بیعت کی کہ ہم پر کسی کو ترجیح دی جائے اور اس بات پر کہ ہم امیر سے جھگڑا نہیں کریں گے سوائے اس کے کہ کوئی واضح کفر سامنے آجائے اور اس بارے میں اللہ کی طرف سے کوئی واضح دلیل ہو اور اس بات پر بیعت کی کہ ہم جہاں کہیں بھی رہیں اللہ کے بارے میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کی پرواہ نہیں کریں گے۔" ③

**آٹھواں عامل** ان کے ساتھ سچے وعدے کرنا اور انہیں عمل کرنے کے لیے تیار کرنا جیسا کہ ان کی اس طرف رہنمائی کی اور اس کے ساتھ انہیں ادب سکھلایا جیسا کہ آپ نے سن کر جان لیا اور آپ جانتے ہیں کہ تربیت تعلیم کا غیر علم کا غیر ہے اور کسی بھی فرد یا امت کی کامیابی اس کے تربیت کے پھولوں کو چوسنے اور نفسیات کے بانگوں اور خلقی قوانین کے پھلوں کو توڑنے کی مقدار کے بقدر ہی مضمر ہے۔

اور کیا علم بھی تو شفا کا ہتھیار ہوتا ہے اور کبھی فنا سے ڈرانے والا ہوتا ہے جیسا کہ ہم دیکھتے اور سنتے ہیں ہائے کتنا خطرہ ہے ان چیزوں میں جنہیں ہم دیکھتے اور سنتے ہیں۔

اسلام نے یہ اعلیٰ پہلو امت کی بنیاد میں پالیا اور اسے بھرپور توجہ دی اور اسے نافذ کرنے اور اس پر عمل کرنے کا اس کے علم اور کلام سے بھی بڑھ کر اہتمام کیا اور شاید آپ کو یاد ہوگا کہ آپ میں مسجد قبائلیں علم پڑھنے والوں سے یہ حکمت سے بھرپور اور سونے جیسی قیمتی نصیحت کی کہ "جتنا چاہو علم حاصل کر لو عمل کیے بغیر اللہ تعالیٰ تمہیں کوئی اجر نہیں دے گا۔"

اور شاید آپ کو یاد ہو کہ اسلام جھوٹ کی کسی بھی قسم کے مرتکب کو سخت ترین سزا دینے کا حکم دیتا ہے اور جھوٹ بھی کسی کی عزت میں پڑنے کی اقسام میں سے ایک قسم ہے، اور وہ سزا حد قذف ہے جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے سورت نور میں فرمایا کہ:

﴿وَ الَّذِينَ يَزُمُونَ الْمَحْضَدَةَ ثُمَّ كَفَرُوا يَأْتُوا بِأَرْبَعَةِ شُهَدَاءَ فَاجْتَبُوا لَهُمْ قُرْبَانًا كَبِيرًا وَ تَصَدَّقُوا عَلَيْهِمْ وَلَئِنْ فَتَنُوا فَلا تَقْبَلُوا لَهُمْ شَهَادَةً أَبَآءُ ۚ وَ أُولَئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ ﴿۴﴾﴾ (النور: ۴)

"اور جو لوگ پرہیزگار عورتوں کو بدکاری کا الزام لگائیں اور اس پر چار گواہ نہ لائیں تو ان کو اسی درجے مارو اور کبھی ان کی شہادت قبول نہ کرو اور یہی بدکردار ہیں۔"

آپ غور فرمائیں کہ اس جھوٹی تہمت لگانے والے کی کس طرح پکڑ کی اسی کوڑے لگانے کو مقرر کیا اور اس کی گواہی کو بھی رد کر دیا اور اس پر فاسق ہونے کا حکم لگایا بلکہ فرمایا کہ: ﴿وَ أُولَئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ ﴿۴﴾﴾ "یہی فاسق لوگ ہیں۔" یعنی ان کے علاوہ کوئی بھی فاسق نہیں ہے۔ اور ان کے علاوہ کوئی نہیں ہے جو دین اور ادب کی حدود سے خارج ہے۔

① ترمذی عن خدیفہ بن حسن، کتاب الفتن، ۹ مسند احمد ۱۵۰۶

② بخاری، کتاب الاحکام باب ۴۳، صحیح مسلم کتاب الامارات حدیث ۴۲، ۴۱

پھر آپ اپنے سننے والے کو یہ روایت سنا کر محظوظ کریں جسے ابو داؤد نے اپنی سنن میں روایت کیا کہ حضرت عبداللہ بن عامر سے روایت ہے کہ ”یک مرتبہ رسول اللہ ﷺ ہمارے گھر تشریف لائے اس وقت میں ایک چھوٹا بچہ تھا میں کھیلنے چلا گیا میری امی جان نے کہا کہ آؤ میں تمہیں کچھ دوں آپ ﷺ نے فرمایا کہ آپ سے کیا دینا چاہتی ہیں؟ انھوں نے عرض کیا کہ کھجور آپ ﷺ نے فرمایا کہ اگر آپ سے کچھ بھی نہ دیتیں تو تمہارے لیے ایک جھوٹ لکھ دیا جاتا۔“<sup>①</sup>

آپ اس اعلیٰ قسم کی تربیت کے بارے میں تصور فرمائیں کہ نبی کریم ﷺ نے ماں کے لیے اتنا بھی جائز نہیں رکھا کہ وہ اپنے چھوٹے بچے سے کوئی ایسا وعدہ کرے جو سچا نہ ہو بلکہ اسے سوال کر رہے ہیں کیا اگر بچہ آ جائے تو کون سی چیز ہے جو آپ سے دینا چاہ رہی ہیں؟ اس کے بعد مزید پتہ چلتی کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اگر اس نے اس وعدہ کی خلاف ورزی کی تو اللہ اس کے بارے میں ایک جھوٹ لکھ دے گا۔ اسی طرح اس مقام پر ”کذبہ“ کا لفظ ہی اس کی ڈانٹ ڈپٹ کے لیے کافی تھا اور اسی سے وہ جان لیتی کہ جھوٹ کا لفظ ہی عذاب کا ایک کوڑا ہے، جو صحابہ رضی اللہ عنہم اور صحابیات رضی اللہ عنہن کو ڈرا کر رکھ دیتا تھا، اس کی وجہ یہ ہے کہ انھوں نے اس کی شاعت سن رکھی تھی اور اس کی خرابی تو وہ لوگ جانتے تھے اور ان کے نفوس میں سچ کی فضیلت اور حق کا شرف جز پلائے ہوئے تھا۔ کیا اس اعلیٰ تربیت کے بعد بھی یہ کہنا صحیح ہوگا کہ صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم اور اس کے رسول ﷺ پر جھوٹ بولا کرتے تھے اور تحقیق نہیں کیا کرتے تھے۔ خبردار! یہ لوگ (جو صحابہ کے بارے میں ایسا کہتے ہیں) بہتان تراشی کرتے ہوئے ایسی بات چھوڑ دیتے ہیں جسے یہ لوگ جانتے بھی نہیں اور ان اعلیٰ کردار شخصیات کو مجروح کرتے ہوئے اور ان بے قصور حضرات پر تہمت زنی کرتے ہوئے حد سے تجاوز کرتے ہیں۔ حالانکہ یہ حضرات تہمت کے مستحق نہیں ہیں۔ بربادی وہ ان کے لیے اس دن جس دن کا ان سے وعدہ کیا گیا ہے۔

وہ نیک نمونہ اور عمدہ اسوہ جو وہ رسول اللہ ﷺ میں عمدہ، کامل جاذب اور پسندیدہ پاتے تھے۔ آپ سے مخفی نوال عامل نہ رہے کہ نیک نمونہ اور اچھی پیشوائی تعلیم و تربیت، تادیب و تہذیب کے عوامل میں سے سب سے اچھا عامل ہے، خصوصاً نبی ﷺ اور اس کے تبعین کے درمیان اور استاذ اور شاگرد کے درمیان اور امیر و مامور کے درمیان اور حاکم اور اس کی رعیت کے درمیان۔

ہم دیکھتے ہیں کہ علماء نفسیات، علماء معاشرت، تربیت و تعلیم کے سربراہ اور اخلاق و امم کے بائین ہمیشہ اچھی پیشوائی کے بارے میں گفتگو کرتے ہیں اور اچھی پیشوائی کے بارے میں ہی وصیت بھی کرتے ہیں اور جب بحث کرتے ہیں تو بھی اسی کے بارے میں ہی بحث کرتے ہیں۔ اس لیے کہ تاثیر و اصلاح، تربیت و فلاح میں اس کا اہم مقام ہے اور افراد و امم میں اس کا کردار برابر ہے۔ اور تاریخ نے محمد ﷺ سے بڑھ نہ کوئی اعلیٰ پیشوا جانا نہ اعلیٰ نمونہ اور نہ ہی ان سے بلند امامت جانی، کمال بشری کے تمام گوشوں میں نظر دوڑا میں تاریخ کبھی بھی ایسا بلند کردار نہیں جانے گی خصوصاً آپ ﷺ کا پسندیدہ اخلاق اور اعلیٰ ادب اور اس سے بھی بڑھ کر آپ ﷺ کا صدق اور امانت اور آپ ﷺ کی تحقیق اور باریک بینی۔

کیوں کہ آپ ﷺ صدق و امانت کے ساتھ مشہور و معروف تھے حتیٰ کہ آپ ﷺ اپنی بعثت اور رسالت سے پہلے ہی



## مناب العسرفان فی علوم القرآن: جلد ①

مشہور تھے، جب آپ ﷺ چلتے تو لوگ اپنی انگلیوں سے اشارہ کر کے کہتے کہ یہ وہ شخص ہے جو صادق ہے اور جب آپ ﷺ کوئی فیصلہ فرماتے تو وہ لوگ آپ ﷺ کے فیصلے کو پسند کرتے اور کہتے کہ یہ شخص امین ہے۔

یہ فضائل آپ ﷺ میں روز روشن کی طرح واضح تھے جو اہل جاہلیت میں سے منصفین کے ایمان کا باعث بنے اور آپ ﷺ کے سخت دشمن بھی ان کا اعتراف کرنے پر مجبور تھے جیسا کہ آپ ﷺ کے وفادار تابعین بھی اس پر ایمان لائے ہوئے تھے۔

دیکھیں یہ ابوسفیان بن حرب ہے جو آپ ﷺ کے معارض لشکر کا سردار ہے قیصر روم کے سامنے محمد ﷺ کے صدق کا اقرار کر رہا ہے اور اس بات کا اقرار کر رہا ہے کہ انھیں آپ ﷺ کی رسالت سے پہلے بھی آپ ﷺ کا کوئی ایک جھوٹ بھی یاد نہیں ہے اس تمام قصے کے پیش نظر قیصر قریب تھا کہ متاثر ہو کر ایمان قبول کر لیتا جو اس شہادت کے جسے محمد ﷺ کے اس دن کے بدترین دشمن نے اپنی زبان سے اقرار کیا پھر ابوسفیان کی بات کاٹنے ہوئے اور محمد ﷺ کے صدق کی تعریف کرتے ہوئے یوں گویا ہوا کہ ”یہ نہیں ہو سکتا کہ محمد ﷺ کو لوگوں کے سامنے جھوٹ بولنا چھوڑ دیں اور اللہ تعالیٰ پر جھوٹ باندھیں۔“

یہ حدیث لمبی ہے اور مشہور ہے اسے امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی صحیح میں روایت کیا اگر آپ چاہیں تو وہاں رجوع کر سکتے ہو۔<sup>①</sup>

اور یہ قریش کا بولنے والا ہے جو ایک گھنگلو کے ذیل میں کہتا ہے کہ ہم آپ کی تکذیب نہیں کرتے بلکہ جو دین لے کر آپ آئے ہیں اس دین کی تکذیب کرتے ہیں۔ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی:

﴿قَوْمَهُمْ لَا يَمْلِكُ بُونُكَ وَ لَكِنَّ الظَّالِمِينَ يَأْتِي اللَّهُ بِحُجُودٍ ۝﴾ (الانعام: ۳۳)<sup>②</sup>

”بے شک وہ آپ کو نہیں جھٹلاتے بلکہ اللہ تعالیٰ کی آیات کو جھٹلاتے ہیں۔“

پیغمبر اسلام کی قابل فخر باتوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ آپ ﷺ نے بنی عامر بن صعصعہ پر اسلام پیش کیا اور یہ ہجرت سے پہلے اور دین کی تقویت اور شان و شوکت سے پہلے کی بات ہے ان کے ایک بڑے نے کہا کہ اگر ہم آپ کے حکم کی اتباع کر لیں پھر اللہ تعالیٰ آپ کو مخالفین پر غلبہ عطا فرمادے تو کیا آپ کے بعد امارت میں ہمارا بھی حصہ ہوگا؟ آپ ﷺ نے ان دائی حکمت سے لبریز الفاظ میں جواب دیا کہ ”امارت اللہ تعالیٰ کے لیے ہے وہ جہاں چاہتا ہے اسے رکھتا ہے اس پر ان کے بڑے نے کہا کہ ”کیا ہمارے سینے آپ کے علاوہ کسی اور عرب کے سامنے جھک جائیں؟ پھر جب اللہ تعالیٰ آپ کو غلبہ دے تو امارت کسی اور کی ہو جائے؟ ہمیں آپ کی امارت کی ضرورت نہیں۔“

یہاں اسلام کی سیاست ظاہر ہوتی ہے کہ وہ ایک صریح اور واضح سیاست ہے جو راہ راست پر اور بڑی بلند مرتبہ والی ہے نہ وہ چکر بازی جانتی ہے اور نہ ہی کسی جھوٹ اور گمراہی کا سہارا لیتی ہے جیسا کہ پیغمبر اسلام ﷺ کی صاف گوئی، ان کا صدق ان کا بلند مرتبہ ہونا ظاہر ہے۔

ہاں البتہ نبی کریم ﷺ انتہائی تنگی کے اندر ہوتے تھے دشمن یا دوست سے قدرے معاونت کے خواستگار ہوتے تھے اور

① بخاری کتاب بد الوعی باب ۶

② سنن ترمذی تفسیر سورۃ الانعام آیت ۳۳، حدیث ۳۰۶۳

عرب کا یہ قبیلہ کمانے اور کمانی سے تقویت حاصل کر سکتا تھا اور آپ ﷺ نہ وعدہ خلافی کر سکتے، نہ جھوٹ بول سکتے اور نہ ہی معاہدہ شکنی کر سکتے تھے۔

وہ لوگ آپ سے سوال کرتے ہیں کہ اگر وہ اسلام قبول کر لیں تو کیا آپ ﷺ کے بعد یہ لوگ خلیفہ ہوں گے؟  
 آپ ﷺ منہ بھر کر ان کو جواب دیتے ہیں کہ "امارت صرف اللہ تعالیٰ کے لیے ہے اسے وہ جہاں چاہتا ہے رکھ چھوڑتا ہے۔" اگر آپ ﷺ مثلاً انشاء اللہ کہہ دیتے تو وہ سب لوگ آپ ﷺ کے قریب ہو جاتے اور آپ کی جماعت اور مسلمانوں کے لشکر میں شامل ہو جاتے۔

کیا شان ہے اسلام کی سیاست اور پیغمبر اسلام ﷺ کے اخلاق کی!

جب رسول اللہ ﷺ کے یہ اعلیٰ اخلاق صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں مشعل راہ تھے تو کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ ان انوار سے پارہ نور نہ چنتے ہوں اور کمان کی اس تانت کو چلاتے نہ ہوں؟ تو پھر ان کے بارے میں کیسے کہا جا سکتا ہے کہ وہ جھوٹ بولتے تھے یا کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ ﷺ میں تحقیق نہیں کرتے تھے۔

﴿سُبْحٰنَكَ هٰذَا بُهْتَانٌ عَظِيْمٌ﴾ (النور: ۱۶)

"تو پاک ہے یہ تو (بہت) بڑا بہتان ہے۔"

**دسواں عامل** صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی اسلام کے تمام فضائل پر اعلیٰ تربیت ہونا اور اس دین حنیف کے آداب کے ساتھ ان کا ہونا باکمال ادب سیکھنا اور ان کا اللہ تعالیٰ سے شدید خوف کرنا اور ان کے نفوس کا اس قدر صاف اور خالص ہونا کہ وہ جھوٹ کے ساتھ متفق نہیں ہو سکتے تھے خصوصاً اللہ تعالیٰ پر جھوٹ باندھنے میں اور افضل المخلوقات صلوات اللہ وسلامہ علیہ پر بے بنیاد الزام لگانے میں۔

علماء اخلاق اور وہ علماء جو علم نفسیات یا علم معاشرت میں مشغول ہیں وہ کہتے ہیں کہ جھوٹ بہت بڑا گناہ ہے یہ گناہ صرف ایسے شخص سے ہی صادر ہو سکتا ہے جو ادب سے گرا ہوا ہو اور اس کا پھیلنا صرف اسی جگہ پر اور اسی قوم میں متصور ہو سکتا ہے جو مہذب نہ ہو۔ جب ہم صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی تاریخ میں غور کرتے ہیں تو بڑا عجیب مشاہدہ کرتے ہیں کہ اسلام نے انھیں کتنا عظیم ادب سکھلایا اور ان کی کتنی اعلیٰ تربیت کی کہ انھیں ایسے بنا دیا جیسے زمین میں چلتے فرشتے ہوں خصوصاً صدق و امانت، تحقیق و احتیاط کے معاملے میں۔ اور یہ ان کثیر فضائل میں سے ہیں جو قرآن پاک نے ان کے بارے میں بیان کیا اور رسول اللہ ﷺ کی اس توجہ کا نتیجہ ہیں جو علم، عمل اور مراقبہ کے اعتبار سے آپ ﷺ نے ان کے ساتھ برتی یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کے فضل اور نعمت کے ساتھ ان کے دل ان پر منطوق ہو گئے اور ان کے نفوس شرف و شرافت کے مہادگی سے لبریز ہو گئے ان کی شرافت انکار کرتی ہے کہ وہ جھوٹ کے قریب جائیں یا حملہ آوری کر کے بدنامی پیدا کریں۔ خصوصاً کتاب عزیز کے مقام اور صاحب رسالت ﷺ کے کلام پر حملہ آوری کرنا۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ "رسول اللہ ﷺ کے اصحاب کو جھوٹ سے بڑھ کر کوئی بھی خصلت گراں نہیں گزرتی تھی آپ ﷺ کو اپنے صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے کسی کے بارے میں جب معلوم ہوتا کہ اس نے جھوٹ بولا تو آپ ﷺ کے سینے سے وہ بات

۱) مناب العرفان فی علوم القسمران: جلد ۱

اس وقت تک ختم نہیں ہوتی تھی جب تک کہ آپ ﷺ کو یہ معلوم نہ ہو جاتا کہ اس نے اللہ تعالیٰ عزوجل سے توبہ کر لی ہے۔ (مسلم نے اپنی صحیح کے مقدمہ میں اسے روایت کیا)

**دیگر عوامل** • جب آپ صحابہ رضی اللہ عنہم کے حفظ کتاب و سنت کے گزشتہ بالا عوامل میں سے بعض میں غور فرمائیں گے تو بعض عوامل آپ کو ایسے بھی ملیں گے جو ان کے کتاب و سنت میں تحقیق و جستجو کے دوائی ہونے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ اس لیے ان کے اعادہ کی بجائے ان کی طرف اشارہ پر اکتفاء کیا جاتا ہے۔

① عربوں کی ذکاوت، قوت حافظہ اور ان کی طبیعت کا خلوص۔۔۔ انہیں اس میں کوئی ٹھک نہیں کہ یہ عوامل ان کے تحقیق و جستجو کے عوامل میں سے بھی ہیں اس لیے کہ جو شخص ان صفات میں پلا بڑھا اس کی شان یہی ہوتی ہے کہ وہ اپنے حافظہ میں مضبوط ہو لہذا اسے مزید بڑھانے اور بھگڑنے میں پڑنے کی ضرورت نہیں۔

② صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول اللہ ﷺ سے محبت جس طرح ایک عامل ہے اسی طرح وہ ان حضرات کے تحقیق و جستجو کے عوامل میں سے بھی ہے اس لیے کہ محب صادق اس وقت تک مطمئن نہیں ہوتا جب تک کہ اسے پوری طرح تسلیم نہ ہو جائے کہ یہ اس کے حبیب کا کلام ہے اور اس میں کوئی التماس یا شک نہیں ہے اور وہ اپنے حبیب پر جھوٹ کو بھی بھی پسند نہیں کرتا اور نہ ہی اس پر جھوٹے الزام کو پسند کرتا ہے اور نہ یہ پسند کرتا ہے کہ اس کے کلام میں کوئی دھبہ یا مشقی ہو خصوصاً جب وہ حبیب اسے ناپسند کرتا ہو (دیکھیے حفظ کے عوامل میں سے چوتھے عامل کو)

③ صحابہ رضی اللہ عنہم کا فصاحت، بیان کے میدان میں کھڑے ہونا اور نقد کلام میں ان کا بلند مرتبت ہونا نیز قرآن پاک کے اعجاز نبوی کریم ﷺ کی بلاغت کے ادراک میں ان کا کمال ذوق۔ یہ تمام چیزیں ایسی ہیں جو ان کے لیے تحقیق و جستجو آسان کر دیتی ہیں اور ان پر آسان کر دیتی ہیں کہ وہ تردید کر سکیں ان چیزوں کی جو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کے کلام میں سے نہیں ہیں اس لیے کہ وہ فاضل اور مفضول اسالیب کے درمیان فرق کو پہچان سکتے ہیں اور ان کے کلام کا اپنی جہی بلاغت کے ساتھ موازنہ کر سکتے ہیں۔ (دیکھیے حفظ کے عوامل میں سے پانچواں عامل)

④ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے علم کا دین میں کتاب و سنت کے قائم مقام ہونا جو بلا شک و شبہ انہیں ان کی تحقیق و جستجو کا اہتمام کرنے والا اور ان میں احتیاط کرنے والا بنادیتا ہے۔ (دیکھیے حفظ کے عوامل میں سے ساتواں عامل)

⑤ کتاب کا اعجاز کے ساتھ متصل ہونا اور سنت کا بعض معجزات و غرائب کے ساتھ متصل ہونا اس کے بعد قرآن پاک کی اکثر آیات اور اکثر احادیث رسول ﷺ کا حوادث و واقعات کے ساتھ متصل ہونا یہ سب چیزیں نفوس میں ایسی قابلیت پیدا کر دیتی ہیں کہ انہیں قرآن و سنت میں وثوق ہو جاتا ہے اور انہیں ان میں کوئی اشتباہ باقی نہیں رہتا اور نہ ہی ان میں اضافہ اور جھوٹ کو قبول کرتے ہیں۔ (دیکھیے حفظ کے عوامل میں سے آٹھواں عامل اور نوواں عامل)

جب آپ نے یہ اور اس طرح کے دس عوامل جمع کر لیے جو آپ کے سامنے لکھے ہوئے ہیں تو آپ نے دس سے زائد عوامل دیکھ لیے جو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی امانت اور ان کے کتاب و سنت میں تحقیق و جستجو پر قائم شدہ دلائل ہیں۔

تحقیق و جستجو کے مظاہر ۷ اسی طرح ہم صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی تاریخ کی ورق گردانی کریں اور ان کے آثار کے پیچھے چلیں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ وہ حق کے شواہد ہیں اور ان کی رگ رگ میں سچ کی فضیلت جوستہ ہے

اور وہ جھوٹ اور اس جیسی چیزوں سے خوب دور بھاگتے ہیں اور ان سے بالکل پاک صاف ہیں۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو دیکھیں کہ وہ فرماتے ہیں کہ ”ہمارے نزدیک تم میں سب سے زیادہ محبوب وہ نہیں ہے جس کا نام ہمیں اچھا لگتا ہو بلکہ جب ہم تمہیں دیکھیں تو ہمیں تم میں سے سب سے زیادہ محبوب وہ ہوگا جس کا اخلاق سب سے اچھا ہو اور جب ہم تمہیں جانیں تو ہمیں تم میں سے سب سے زیادہ محبوب وہ شخص ہوگا جس کی بات سب سے زیادہ سچی ہو۔“

اور ادھر حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو دیکھیں کہ وہ فرماتے ہیں کہ ”سب سے بڑا گناہ اللہ کے نزدیک جھوٹی زبان ہے۔“ ایک مقام پر فرماتے ہیں کہ ”جب میں تمہیں رسول اللہ ﷺ کی طرف سے کوئی حدیث بیان کروں میں آسمان سے گرجاؤں تو یہ مجھے زیادہ پسند ہے اس بات سے کہ میں نبی کریم ﷺ پر جھوٹ بولوں۔“

اگر آپ چاہیں تو حضرت سعید بن المسیب رضی اللہ عنہ کے واقعہ کو ملاحظہ کریں آپ کو تعجب ہوگا یہ بھی ان حضرات میں سے ایک تھے جن کی تربیت صحابہ رضی اللہ عنہم نے کی تھی ”ایک مرتبہ ان کی آنکھیں خراب ہو گئیں اور مد آنکھوں کے باہر تک آگئی (اور وہ سفید میل ہے جو آنکھوں میں سے آنسوؤں کے بہنے کی جگہ سے نکلتی ہے) کسی نے ان سے کہا کہ آپ اپنی آنکھوں کو صاف کر لیں؟ انھوں نے فرمایا کہ پھر طبیب کا قول کہاں چلا جائے گا کہ اس نے کہا تھا کہ اپنی آنکھوں کو ہاتھ نہ لگانا اور میں نے کہا تھا کہ میں ایسا نہیں کروں گا۔“

حضرت مجاہد رضی اللہ عنہ سے منقول ایک واقعہ میں غور فرمائیں کہ حضرت بشیر عدوی رضی اللہ عنہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کے پاس آئے اور انھوں نے حدیث بیان کرنی شروع کی اور فرمایا کہ ”قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم“ (رسول ﷺ نے فرمایا) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہم سے اجازت نہیں دے رہے تھے اور نہ ہی اس کی طرف دیکھ رہے تھے انھوں نے عرض کیا کہ یا ابن عباس! کیا ہوا کہ مجھے نظر نہیں آ رہا کہ آپ میری حدیث کو سنتے ہوں؟ میں رسول اللہ ﷺ کی طرف سے حدیث سناؤں اور آپ نہ سنیں؟ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہم نے فرمایا ہم پہلے جب کسی آدمی کو ”قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم“ کہتے سنتے تو فوراً اپنی آنکھیں اس کی طرف پھیر لیتے اور اپنے کان اھر کو متوجہ کر لیتے تھے اب جب لوگ ہر طرح کی خشک دتر باتیں کرنے لگے تو ہم لوگوں سے صرف وہی لیتے ہیں جنہیں ہم جانتے ہوتے ہیں۔“

اس انتہائی پرہیزگاری اور نازک احتیاط کی بناء پر بہت سے اکابر صحابہ رضی اللہ عنہم روایت حدیث سے کنارہ کشی کرنے لگے ان سے تھوڑی سی مقدار کے سوا کچھ نہیں سنا گیا حالانکہ ان کے پاس رسول اللہ ﷺ کے اصحاب کی ایک بڑی جماعت موجود تھی۔

حضرت ابن زبیر رضی اللہ عنہ حدیث بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ میں نے اپنے ابا جان سے عرض کیا کہ کیا بات ہے کہ مجھے دکھائی نہیں دیتا کہ فلاں فلاں کی طرح رسول اللہ ﷺ کی حدیث بیان نہیں کرتے؟ انھوں نے فرمایا کہ میں نے جب سے اسلام قبول کیا اس وقت سے آپ ﷺ سے جدا نہیں ہوا لیکن میں نے آپ ﷺ کو فرماتے سنا کہ ”جس نے مجھ پر جھوٹ باندھا وہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنا لے۔“

جب ان حضرات کے سنت نبوی ﷺ کے بارے میں تقویٰ اور احتیاط کا یہ عالم ہے تو ان کا کتاب اللہ کے بارے میں احتیاط اور تقویٰ کا کیا عالم ہوگا؟ میرا خیال یہ ہے کہ جب آپ قرآن کے سات حروف پر نازل ہونے کے اولہ میں رجوع کریں گے تو آپ کو اس صورت حال کے خوشگوار اور تعجب خیز واقعات کا مشاہدہ ہوگا۔ دیکھیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہما حضرت ہشام بن حکیم رضی اللہ عنہما کی گردن کو پکڑتے ہوئے انھیں گھسیٹ کر رسول اللہ ﷺ کے پاس لے کر آتے ہیں انھوں نے ان سے صرف اس بات کا انتقام لیا کہ انھوں نے سورۃ الفرقان کو پڑھا لیکن اس طریقے پر نہیں پڑھا جس طریقے پر حضرت عمر رضی اللہ عنہما نے نہیں پڑھا تھا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ یہ اس طرح نازل ہوا۔ حضرت عمر نے انھیں نہیں چھوڑا بلکہ انھیں رسول اللہ ﷺ کے پاس لے کر آئے اور آپ ﷺ نے انھیں حکم دیا کہ انھیں چھوڑ دو! پھر آپ ﷺ نے ان دونوں کو قرأت کرنے کا حکم دیا اور دونوں کی قرأت کے بارے میں فرمایا کہ اسی طرح نازل ہوا۔ اور آپ ﷺ نے فرمایا کہ:

”بے شک یہ قرآن پاک سات حروف پر نازل ہوا اب تم اسی حرف پر پڑھو جو تمہیں آسان لگے۔“

یہ حضرت عمر رضی اللہ عنہما اور حضرت ہشام رضی اللہ عنہما کے مابین ہونے والا واقعہ ہے اسی طرح کے واقعات حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہما اور عبداللہ بن کعب رضی اللہ عنہما اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما وغیرہ کے اپنے شاگردوں کے ساتھ پیش آئے۔ اس موضوع کی تفصیلی روایات اپنے مقام پر آپ کے سامنے پیش کی جائیں گی۔

اس کے ساتھ اس انتہائی باریک بینی کو بھی شامل کر لیں جسے ہم نے آپ کے سامنے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہما اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہما کے دستور میں میں جمع صحیفوں اور مصاحف میں جمع قرآن کے سلسلے میں اجمالاً ذکر کر دیا تھا وہ بھی آپ کے قریب ہیں اگر آپ چاہیں تو ان کی طرف رجوع کر سکتے ہیں۔

جمع قرآن کے ان دونوں دستوروں کے مشابہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہما کا سنت کی حمایت میں دستور بھی ہے جو انتہائی احتیاط اور تحقیق و جستجو پر مشتمل ہے۔ اس لیے کہ انھوں نے اصحاب نبویہ رسول کو جمع کیا اور اپنی امارت میں ان سے مشورہ کیا پھر مندرجہ ذیل طریقہ کار تک پہنچے۔

وہ خبر واحد کے بارے میں غور کرتے اور اس میں انتہائی گہری تحقیق اور کھود کرید سے کام لیتے انھیں کتاب اللہ پر اور متواتر یا مشہور احادیث رسول پر پیش کرتے اگر کوئی حدیث ذرا بھی مخالف ہوتی تو اسے ایک طرف کو کر دیتے اور رد کر دیتے اور اگر مخالف نہ ہوتی تو اس کے راوی میں نظر ثانی کرتے جس کی عدالت، ضبط، صدق اور تحریر معلوم ہوتی اس کی روایت کو قبول کرتے ورنہ کسی اور طریق سے تزکیہ کا مطالبہ کرتے جو اس کا شاہد بنتا اور اسی روایت کو وہ بھی روایت کرتے۔ اس کے اور اُس کی ناگوار کی وجہ سے انھوں نے روایت کی تقلیل کا التزام کیا ہے کیونکہ کثرت خطا کا عمل اور اشتباہ کا مقام ہوتا ہے۔

البتہ ان کے تقویٰ اور اللہ سے شدید خوف نے انھیں مجبور کر دیا تھا کہ وہ رسول اللہ ﷺ کی حدیث کو اس گہرے اور راد راستہ پر قائم دستور کے مطابق ان تین قواعد کی رعایت کرتے ہوئے محفوظ کریں۔

① خبر میں نظر و فکر ② مخبر میں نظر و فکر ③ کم روایتیں کرنا

اللہ تعالیٰ ابن خطاب رضی اللہ عنہما پر رحم فرمائے کہ انھوں نے بھی کتاب و سنت کی احتیاط میں حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہما کے وضع کردہ

تو انہیں کوئی اپنا یا اٹھی کو مسونہ بنایا اور اٹھی کو بلند کیا اور انھیں میں اضافہ بھی کیا، یہاں تک کہ وہ امین اور ثقہ راویوں کے ساتھ مضبوط ہو گئے اور کثرت سے روایت کرنے والے صحابہ کے لیے گردن کے پھندے کو ٹنگ کر دیا یہاں تک مروی ہے کہ انھوں نے تین مشہور صحابہ رضی اللہ عنہم کو ایک پورا سال تک قید کر دیا انھوں نے ان سے صرف اس چیز کا انتقام لیا کہ انھوں نے کثرت کے ساتھ روایات نقل کیں۔

جب یہ ثابت ہو گیا تو یہ ایک عبرتناک سبق ہے جو عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی طرف سے عام لوگوں کے لیے اصول تشریح، اور روایات میں تدقیق اور غور و فکر کے متعلق ہے خواہ اس کا تعلق اخذ روایت سے ہو یا ادائے روایت سے ہو۔ جیسا کہ کسی شاعر نے کہا کہ:

انی وقتلی سلیگًا ثم اعقله      کالشور یضرب لہما عافت البقر  
 ”بے شک میں اور میرا سلیک کو قتل کرنا پھر اس کے درثاء کو قتل کرنا۔ ایسے ہے جیسے گا میاں (کسی کھیت پر) چڑھا آئیں تو تیل کو مارا جاتا ہے۔“

اس کے بعد حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا دور آیا وہ بھی قدم بقدم ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما کے پیچھے چلے کیونکہ کتاب نے اٹھی کے سائے اور حفاظت میں ایک مضبوط ستون اور گھنے سائے میں پناہ حاصل کی اور ان دونوں حضرات کے زمانے میں سنت ایک ستون کی طرح بن گئی تھی جس کی پشت تو یہ تھی یہاں تک کہ بنو امیہ نے اسے اسی صورت پر حاصل کیا جس صورت پر اسے خلفاء راشدین نے چھوڑا تھا یعنی سفید روشن کہ اس کی رات بھی دن کی مانند تھی۔

عہد اموی میں سنت اپنے محافظوں اور اپنے اعزاز کی حفاظت میں بٹھری ہوئی تھی یہاں تک کہ دوسری صدی کے شروع میں بادشاہوں کا ستارہ عادل عمر بن عبد العزیز رضی اللہ عنہ تھیں، طلع ہوا انھوں نے بھی سنت نبوی کی صیانت و حفاظت کی ضرورت میں اپنے دادا حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کو زمانہ دوہرایا۔ لیکن انھوں نے دیکھا کہ یہ کام کتابت اور سطور میں نقش کے طریقے سے ہی ہو سکتا ہے۔

اگرچہ اس سے قبل گزشتہ ادوار میں اس کی حفاظت سینوں اور قلوب میں حفاظت کے ذریعے ہی ہوئی تھی۔ اسی وجہ سے حدیث نبوی رضی اللہ عنہم ایک نئے اور سعادت مند دور کی طرف منتقل ہوئی اور وہ دور کتابت اور قلم بندی کا دور تھا جس کا حدیث نبوی کا ہمارے تک پہنچنے میں انتہائی اثر تھا اور یہ علم کی انتہائی دقیق ترازو اور دقیق بحث وزن کی گئی تھی۔

نتیجہ ❶ اس تمام بحث کا نتیجہ یہ ہے کہ کتاب و سنت کی حفاظت فولاد کی دیواروں کے ذریعے ہوئی ہے اور دین کی لایعنی سے حفاظت شریعت کے اصول کے ذریعے ہوئی اور امت کے بعد والے لوگوں نے اپنے نیک اسلاف سے ایک مضبوط سبق حاصل کیا جس سے دین کی تحقیق کی ضرورت پوری ہوئی نیز انھوں نے کتاب و سنت کی حفاظت میں بیدار مغزی، راویوں کی تنقید اور مرویات کی جانچ پڑتال کے لزوم کا سبق بھی حاصل کیا اور اسی کے ذریعے مکرو فریب اور مکرو فریب کرنے والوں کے طریقوں کو پکڑا گیا اور جھوٹے اور وضاعین کے لیے جال بنا گیا اور دین اسلام محفوظ سلطنت اور محفوظ حرم والا ہو گیا اور اس درجہ تک پہنچ گیا کہ اقوام عالم اور ادیان دنیا نے اس پر فخر کیا اور ایسا فخر کیا کہ اس کی مثل کبھی مل نہیں سکتی بلکہ جب سے اللہ تعالیٰ نے زمین اور آسمان کو بنایا اس وقت سے آج تک آسانی یا وضعی شریعتوں میں سے کسی بھی شریعت کی تاریخ میں کبھی کوئی اس کے قریب بھی نہیں ہو سکتا۔

مقام کی نزاکت ❷ اسے قاری کرم یہ نہ سمجھنا کہ میں نے مبالغہ کیا یا بڑھا کر بات کی اگرچہ میں نے بات لمبی کی اور زیادہ کی لیکن پھر بھی یہ بحث بہت زیادہ قابل قدر اور نازک ہے اس کی عظمت اور نزاکت کا اتصال اس ممتاز جماعت کے ساتھ ہے جسے اللہ تعالیٰ نے



اپنی کتاب کو حاصل کرنے اور اپنے رسول ﷺ کی ہم عصری کے لیے چنا۔ نیز اسے ہدایت اسلام اور دین حنیف کی چراگاہ کے دفاع کے لیے آپ ﷺ کی عمدہ طریقے سے نیابت کے لیے چنا۔ یہی وہ لوگ ہیں جو امت کی عمارت کے ایک کونہ کے پتھر ہیں۔ انہی سے امت نے کتاب اللہ کو حاصل کیا، سنت رسول میں مہارت حاصل کی، اسلام کی تعلیمات حاصل کیں ان سے پہلے کسی اور سے حاصل نہیں کیں لہذا ان کی شان سے چشم پوشی کرنا اور ان کی تحقیر کرنا بلکہ ان کا احترام کیے بغیر ان کی طرف نظر کرنا اس عالی شان مرکز کے ساتھ جمع نہیں ہو سکتا جس کا انھوں نے ٹھکانہ پکڑا اور اس عظیم مقصد کے موافق نہیں ہے جس کے لیے وہ آمادہ ہوئے اور اٹھ کھڑے ہوئے جیسا کہ ان کے بارے میں طعن اور ان میں عیب جوئی کرنا اسلام کی عمارت کو گرادیتا ہے اور شریعت اسلام کے ستونوں کو منہدم کر دیتا ہے اور قرآن کے صحیح ہونے میں شک پیدا کرتا ہے اور سنت سید الانام کے اعتقاد کو ضائع کر دیتا ہے۔

صحابہ رضی اللہ عنہم پر سب سے شدید جرح یہ ہوتی ہے کہ انھیں سوہ حفظ اور عدم ضبط کی تہمت لگائی جائے اور انھیں اور اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول اللہ ﷺ پر بہتان کا طعن کیا جائے اور ان میں تحقیق و جستجو اور کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ ﷺ کو امت کی طرف نقل کرنے میں تحقیق و جستجو نہ کرنے کا عیب لگایا جائے۔

اسی وجہ سے علماء متقدمین و متاخرین نے صحابہ رضی اللہ عنہم کے کھمار کے دفاع کا بھر پور اہتمام کیا اس لیے کہ یہ اسلام کے قلعے کی حفاظت ہے (جیسا کہ آپ دیکھ چکے ہیں) اور یہ دفاع خواہشات کا مصلہ نہیں ہیں اور نہ ہی مصیبت کی بے رحمی ہے بلکہ تجزیہ نگاری اور تحقیقات، تاریخ اسماحت اور باکمال وسیع تحقیقات کا نتیجہ ہیں جنہوں نے ان کی تعداد کو گنا اور ان کے ایک ایک فرد کی تحقیق کی اور انہیں رجال کے دقیق ترین اوزان پر پیش کیا جن کی وجہ سے امت اسلامیہ تمام امتوں اور نسلوں پر فخر کرنے لگی۔

اس تحقیق و تدقیق کے مکمل کرنے کے بعد صحابہ رضی اللہ عنہم اس کارنامے سے سرفرو ہوئے کیونکہ وہ خیر امت تھے جنہیں لوگوں کے لیے نکالا گیا اور نامور جماعت تھے جنہیں تاریخ نے جانا اور نبی کریم ﷺ کے قابل ترین صحابہ تھے جو روئے زمین پر ظہور پذیر ہوئے اور بھر پور حافظہ اور ضبط والی جماعت تھی اس لیے انھوں نے کتاب اللہ اور سنت رسول ﷺ کی حفاظت کی۔

اہل سنت والجماعت مجبور ہیں کہ وہ اپنی رائے کا عقیدہ کی طرح اظہار کریں اس لیے انھوں نے طے کر دیا کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سب کے سب عادل ہیں اس رائے سے صرف بدعتی اور زنادقہ علیحدہ ہوئے اللہ تعالیٰ ان کا برا کرے۔ ابو ذر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ:

”جب تم دیکھو کہ کوئی شخص صحابہ رضی اللہ عنہم کی تنقیح کر رہا ہے تو سمجھ لو کہ وہ زندیق ہے۔“ اس کی وجہ یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ حق ہیں، قرآن پاک حق ہے اور وہ جولائے وہ بھی حق ہے اور یہ سب کچھ ہم تک پہنچایا ہے تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے پہنچایا ہے اور یہ لوگ (یعنی زنادقہ) ہمارے گواہوں کو مجروح کرنا چاہتے ہیں تاکہ کتاب و سنت کو باطل قرار دیں جبکہ ان کی جرح زیادہ ضروری ہے کیونکہ وہ زنادقہ ہیں۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بارے میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے شہادت عالیہ ﴿مگزشتہ بالا﴾

دیکھتے ہیں کہ حق تعالیٰ اصحاب محمد ﷺ کی بارہادرج فرماتا ہے اور رسول اللہ ﷺ کو دیکھتے ہیں کہ وہ کئی مواقع پر ابو بھر پور تعریف کرتے ہیں اگر آپ چاہیں تو اللہ تعالیٰ کے مندرجہ ذیل ارشادات کو پڑھیں۔

﴿مُحَمَّدًا رَسُولَ اللَّهِ وَالَّذِينَ مَعَهُ أَشِدَّاءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَاءَ بَيْنَهُمْ تَرَاهُمْ رُكْعًا سَجِدًا يَتَّبِعُونَ فَضْلًا مِّنَ اللَّهِ وَرِضْوَانًا سِيَّاهُمْ فِي وُجُوهِهِمْ مِّنْ أَثَرِ السُّجُودِ ذَٰلِكَ مَثَلُهُمْ فِي التَّوْرَةِ وَمَثَلُهُمْ فِي الْإِنْجِيلِ ۖ كَزَرْعٍ أَخْرَجَ شَطْطَهُ فَآزَرَهُ فَاسْتَغْلَظَ فَاسْتَوَىٰ عَلَىٰ سَوَابِهِ لِيُعْجِبَ الزُّرَّاعَ لِيُغَيِّظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ وَعَدَّ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ مِنْهُمْ مَغْفِرَةً وَأَجْرًا عَظِيمًا﴾ (التح: ۲۹)

”محمد (ﷺ) خدا کے پیغمبر ہیں اور جو لوگ ان کے ساتھ ہیں وہ کافروں کے حق میں تو سخت ہیں اور آپس میں رحم دل (اسے دیکھنے والے) تو انکو دیکھتا ہے کہ (خدا کے آگے) بھگتے ہوئے سربسجود ہیں اور خدا کا فضل اور اس کی خوشنودی طلب کر رہے ہیں (کثرت) عباد کے اثر سے ان کی پیشانیوں پر نشان پڑے ہوئے ہیں ان کے یہی اوصاف تورات میں (مرقوم) ہیں اور یہی اوصاف انجیل میں ہیں (وہ) گویا ایک کھیتی ہیں جس نے (پہلے زمین سے) اپنی سوئی نکالی پھر اس کو مضبوط کیا پھر سوئی ہوئی اور پھر اپنی نال پر سیدی کھڑی ہو گئی اور لگی کھیتی والوں کو خوش کرنے تاکہ کافروں کا جی جلائے جو لوگ ان میں سے ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے ان سے خدا نے گناہوں کی بخشش اور اجر عظیم کا وعدہ کیا ہے۔“

پھر اگر آپ چاہیں تو اللہ تعالیٰ عز اسمہ کا مندرجہ ذیل ارشاد تلاوت فرمائیں:

﴿لَا يَسْتَوِي مِنْكُمْ مَنْ أَنْفَقَ مِنْ قَبْلِ الْفَتْحِ وَقَتْلَ أُولَٰئِكَ أَعْظَمُ دَرَجَةً مِّنَ الَّذِينَ أَنْفَقُوا مِنْ بَعْدُ وَقَاتَلُوا ۗ وَكَلَّا وَعَدَّ اللَّهُ الْحُسْنَىٰ ۗ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرٌ﴾ (المد: ۱۰)

”جس شخص نے تم میں سے فتح (مکہ) سے پہلے خرچ کیا اور لڑائی کی وہ (اور جس نے یہ کام پیچھے کئے وہ) برابر نہیں ان لوگوں کا درجہ ان لوگوں سے کہیں بڑھ کر ہے جنہوں نے بعد میں خرچ (اموال) اور (کفار سے) جہاد و قتال کیا اور خدا نے سب سے (ثواب) نیک (کا) وعدہ تو کیا ہے اور جو کام تم کرتے ہو خدا ان سے واقف ہے۔“

﴿لِلْفُقَرَاءِ الَّذِينَ أُخْرِجُوا مِنْ دِيَارِهِمْ وَأَمْوَالِهِمْ يَبْتَغُونَ فَضْلًا مِّنَ اللَّهِ وَرِضْوَانًا وَيَنْصَرُونَ لِلَّهِ وَرَسُولِهِ أُولَٰئِكَ هُمُ الصَّادِقُونَ ۗ وَالَّذِينَ تَبَوَّءُوا الدَّارَ وَالْإِيمَانَ مِن قَبْلِهِمْ يُجْزَوْنَ مَن هَٰجَرَ إِلَيْهِمْ وَلَا يَجِدُونَ فِي صُدُورِهِمْ حَاجَةً مِّمَّا أُوتُوا وَيُؤْتُونَ عَلَىٰ أَنفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ ۗ﴾ (الحشر: ۹، ۸)

”(اور) ان مفلسان تارک الوطن کے لئے بھی جو اپنے گھروں اور مالوں سے خارج (اور جدا) کر دیے گئے ہیں (اور) خدا کے فضل اور اس کی خوشنودی کے طلبگار اور خدا اور اس کے پیغمبر کے مددگار ہیں یہی لوگ سچے (ایماندار) ہیں۔ اور (ان لوگوں کے لئے بھی) جو مہاجرین سے پہلے (ہجرت کے) گھر (یعنی مدینے) میں مقیم اور ایمان میں (مستقل) رہے اور جو لوگ ہجرت کر کے انکے پاس آتے ہیں ان سے محبت کرتے ہیں اور جو کچھ ان کو ملا اس سے اپنے دل میں کچھ خواہش (اور حش) نہیں پاتے اور انکو اپنی جانوں سے مقدم رکھتے ہیں خواہ ان کو خود احتیاج ہی ہو۔“

اور آپ غور فرمائیں اللہ تعالیٰ عزوجل کے اس ارشاد کے بارے میں کہ:

﴿كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ...﴾ (التح: آل عمران:)

”تم بہترین امت ہو تمہیں نکالا گیا ہے لوگوں کی نفع رسانی کے لیے۔“

اسی طرح اللہ تعالیٰ کا قول:

﴿وَكَذَلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَسَطًا لِتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ وَكَيُوتَ الرِّسُولَ عَلَيْكُمْ شَهِيدًا... إِنَّ اللَّهَ بِالنَّاسِ لَكَرِيمٌ﴾ (البقرہ: ۱۴۳)

”اور اسی طرح ہم نے تم کو امت معتدل بنایا ہے تاکہ تم لوگوں پر گواہ بنو اور پیغمبر (آخر الزماں) (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) تم پر گواہ بنیں اور جس قبلے پر تم (پہلے) تھے اس کو ہم نے اس لئے مقرر کیا تھا کہ معلوم کریں کہ کون (ہمارے) پیغمبر کا تابع رہتا ہے اور کون الٹے پاؤں پھرجاتا ہے اور یہ بات (یعنی تحویل قبلہ لوگوں کو) گراں معلوم ہوئی مگر جن کو خدا نے ہدایت بخشی ہے (وہ اسے گراں نہیں سمجھتے) اور خدا ایسا نہیں کہ تمہارے ایمان کو یونہی کھو دے خدا تو لوگوں پر بڑا مہربان (اور) صاحب رحمت ہے۔“

اس میں کوئی شک نہیں کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اس خطاب کے بالکل سامنے تھے اور وہ اس کے مضمون میں بالکل ظاہر اور واضح تھے اور اول امر میں اپنی ترجیحات کے ساتھ تحقیق تھے۔

رسول اللہ ﷺ کی اپنے صحابہ رضی اللہ عنہم کے بارے میں شہادت

کی تفہیم یعنی جن و انس پر سوائے انبیاء اور مرسلین کے فضیلت اور کمال امتیاز پر شاہد ہیں۔

ترمذی اور ابن حبان نے اپنی صحیح میں روایت کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ:

((اللہ اللہ فی اصحابی لا تتخذوہم غرضا فمن احبہم فبحبی احبہم ومن ابغضہم فببغضی ابغضہم ومن اذہم فقد اذانی ومن اذانی فقد اذی اللہ فیوشک ان یاخذہ))۔

”اللہ سے ڈرو! اللہ سے ڈرو! میرے صحابہ کے بارے میں اللہ سے ڈرو! انھیں نشانہ نہ بناؤ جس نے ان سے محبت کی اس نے میری محبت کی وجہ سے محبت کی اور جس نے ان کے ساتھ بغض کیا اس نے میرے ساتھ بغض ہونے کی وجہ سے بغض کیا جس نے انھیں ستایا اس نے مجھے ستایا اور جس نے مجھے ستایا اس نے اللہ تعالیٰ کو ستایا اب عنقریب وہ اسے گرفت میں لے لے گا۔“ ①

مسند بزار میں ایک روایت ہے جس کے تمام مرادی ثقہ ہیں کہ ”بے شک اللہ تعالیٰ نے میرے صحابہ رضی اللہ عنہم کو جن و انس میں سے منتخب فرمایا سوائے انبیاء و مرسلین کے۔“ اور صحیح بخاری اور مسلم میں آپ ﷺ نے اپنے صحابہ رضی اللہ عنہم کی شان میں فرمایا کہ:

((لو انفق احدکم مثل اُحد ذہباً ما ادرك مداحہم ولا نصیفہ))۔ ②

”اگر تم میں سے کوئی شخص اُحد کے برابر بھی صدقہ کر دے تو ان کے ایک مد بلکہ اس کے نصف تک بھی نہیں پہنچ سکتا۔“

اور آپ ﷺ سے ایک متواتر حدیث ہے کہ:

((خیر القرون قرنی ثم الذین یلونہم... الخ))۔

① ترمذی کتاب المناقب، ۵۸، مسند احمد، ۸۴، ۴

② صحیح بخاری فضائل الصحابہ، ۵، صحیح مسلم فضائل الصحابہ، ۲۲۱، ۲۲۲

”سب سے بہترین زمانہ میرا زمانہ ہے پھر اس کے بعد والا....“ ①

آپ کتاب وسنت میں ان شہادات عالیہ کو دیکھ رہے ہیں کہ کیسے صحابہ رضی اللہ عنہم کے مقام کو چوٹی تک پہنچا دیا ہے اور طعنہ لگانے والوں اور عیب جوئی کرنے والوں کے لیے کوئی دلیل بلکہ شبہ دلیل بھی نہیں چھوڑی ہے۔

درحقیقت عقل اگر خواہش نفس اور تعصب سے خالی ہو تو صحابہ رضی اللہ عنہم کے انتخاب میں اللہ تعالیٰ کی حکمت ۴

سمجھتی ہے کہ وہ اپنی حتمی اور آخری شریعت کو نقل کرنے کے لیے امت کے نچلے درجے کے لوگوں کو یا عیب والی جماعت کو چنے۔ اللہ تعالیٰ اس سے بہت زیادہ بلند وبالا ہے اسی وجہ سے اس طبقہ کریمہ یعنی طبقہ صحابہ رضی اللہ عنہم کی توثیق ایک اعتبار سے کتاب وسنت اور اصول اسلام کی حفاظت ہی کا نام ہے اور دوسرے اعتبار سے اخلاقی طور پر مستحق کو اس کا انصاف فراہم کرنے کا نام ہے اور تیسرے اعتبار سے اللہ تعالیٰ کا اس عظیم مقصد کے لیے انہیں منتخب کرنے میں اس کی کامل حکمت کو خراج تحسین پیش کرنے کا نام ہے اسی طرح ان حضرات رضی اللہ عنہم کی توہین اس حکیمانہ انتخاب میں عیب لگانا اور اس انتخاب اور کریم میں طعن لگانے کے مترادف ہے جو اس سے بھی بڑھ کر ہے جس سے کتاب وسنت اور دین کا انہدام لازم آتا ہے۔

امت عربیہ کی تاریخ اور اس کے طابع اور خصوصیات کی ورق گردانی کرنے والا ان کے عصر، ان کے جوہر کے خالص پن ان کی خصوصیات کے عالی پن کی سلامتی کو دیکھتا ہے جو اسے اس جگہ لاکھڑا کرتی ہے کہ وہ اطمینان کے ساتھ حکم لگا تا ہے کہ یہ امت ”خیر امت اخرجت للناس“ ہے پھر اسلام نے انہیں پگھلایا قرآن نے انہیں پاک صاف کیا اور سید الانام رضی اللہ عنہم نے ان کے میل پھیل کو ڈور کیا۔

لیکن اسلام پر بعد میں بھی اسی طرح کی یا اس سے بھی زیادہ آزمائشیں آئیں جو اس پر پہلے آئی تھیں اور آج کے زمانے میں زبانیں کتاب اللہ کے بارے میں بغیر علم کے چلنے لگیں، سنت رسول میں بغیر دلیل کے گھسنے لگیں اور صحابہ رضی اللہ عنہم میں بغیر کسی شرم و حیا کے عیب لگانے لگیں اور شریعت کی حفاظت کرنے والوں پر بغیر کسی دلیل کے کچھڑا چھالا جانے لگا کبھی ان پر حافظے کی کمزوری کی تہمت لگائی جانے لگی کبھی اپنے پاس سے اضافہ کرنے کی اور کبھی عدم تحقیق کی تہمت لگانے لگے۔ ہم نے آپ کو خوب مواد فراہم کر دیا اور خوب اسلحہ بھی دے دیا اب آپ میدان میں اتریں اور دشمنوں کا خوف مت کریں۔

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِن تَنصُرُوا اللَّهَ يَنصُرْكُمْ وَيُخْرِجْ أَعْدَاءَكُمْ﴾ (عمر: ۷)

”اے اہل ایمان! اگر تم خدا کی مدد کرو گے تو وہ بھی تمہاری مدد کرے گا اور تم کو تباہت قدم رکھے گا۔“

اللہ تعالیٰ اسلام کی نصرت کے ذریعے ہماری نصرت کرے اور ہمارے قدموں اور قلموں کو تباہت قدم رکھے۔ ابتداء اور انتہاء میں الحمد لله وصلی اللہ علی سیدنا محمد والہ وصحابتہ الاعلام۔ آمین۔

## قرآن پاک کی آیات اور سورتوں کی ترتیب

آیت کا معنی • آیات القرآن "آیت" کی جمع ہے اور لغت کی زبان میں آیت کا اطلاق کئی معانی پر ہوتا ہے۔  
① مجزہ • جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان:

﴿سَلِّ بِنِي إِسْرَائِيلَ كَمَا آتَيْنَاهُمْ مِنْ آيَاتِهِمْ بَيِّنَاتٍ﴾ (البقرہ: ۲۱۱)

"بنی اسرائیل سے سوال کرو کہ ہم نے تمہیں کتنے مجزے دیے۔"

② علامت • جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿إِنَّ آيَةَ مُلْكِهِ أَنْ يَأْتِيَكُمُ التَّابُوتُ فِيهِ سَكِينَةٌ مِّنْ رَبِّكُمْ﴾ (البقرہ: ۲۴۸)

بے شک اس کی سلطنت کی نشانی یہ ہے کہ تمہارے پاس ایک تابوت آئے گا جس میں تمہارے رب کی طرف سے سکینہ ہوگی۔"

③ عبرت • جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ:

﴿إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَةً﴾ (البقرہ: ۲۳۸)

"بے شک اس میں یقیناً عبرت ہے۔"

④ عجیب امر • جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ:

﴿وَجَعَلْنَا ابْنَ مَرْيَمَ وَ أُمَّهُ آيَةً﴾ (المومن: ۵۰)

"اور ہم نے ابن مریم اور ان کی والدہ کو ایک عجیب امر بنا دیا۔"

⑤ جماعت • جیسے کہتے ہیں کہ:

((خرج القوم بأيتهم))

"قوم اپنی جماعت کے ساتھ نکلی۔"

یعنی جماعت کے ساتھ نکلی: مطلب یہ ہے کہ انہوں نے اپنے پیچھے کچھ نہیں چھوڑا۔"

⑥ برہان اور دلیل • جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَمِنْ آيَاتِهِ خَلْقَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافَ أَلْسِنَتِكُمْ وَأَلْوَانِكُمْ﴾ (الروم: ۲۲)

"اس کے دلائل میں سے آسمانوں اور زمین کی تخلیق اور تمہاری زبانوں اور رنگوں کا مختلف ہونا ہے۔"

مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے وجود، اقتدار اور انصاف باکمال کے دلائل میں سے آسمانوں اور زمینوں کے جہانوں کا پیدا

کرنا اور زبانوں اور رنگوں کا مختلف ہونا ہے۔

یہ سب لغوی اطلاقات ہیں جو ایک دوسرے کو مستلزم ہیں۔ پھر اصطلاح میں آیت اس معنی کے ساتھ خاص ہے کہ وہ "ایک حصہ جو ابتداء اور انتہاء رکھتا ہے اور قرآن پاک کی سورتوں میں مندرج ہوتا ہے۔" گزشتہ بالا ان لغوی معانی اور اصطلاحی معنی کے درمیان مناسبت واضح ہے، اس لیے کہ آیت قرآنی معجزہ بھی ہے، نیز یہ اس کے لانے والے پیغمبر ﷺ کے صدق پر علامت ہے اور اس میں نصیحتیں اور عبرتیں ہیں اور جو نصیحتیں حاصل کرنا چاہے اس کے لیے نصیحت ہے اور یہ اپنے بلند اور معجز مقام پر ہونے کی وجہ سے امور عجیبہ میں سے بھی ہے۔ اور اس میں جماعت کا معنی بھی پایا جاتا ہے اس لیے کہ یہ کلمات اور حروف کے مجموعے کا نام ہے اور اس میں برہان اور دلیل کا معنی بھی ہے۔ اور یہ دلیل ہے اس ہدایت اور علم پر جو اس کے ضمن میں پائے جاتے ہیں اور یہ دلیل ہے اللہ تعالیٰ کی قدرت اس کے علم اور اس کی حکمت پر۔ نیز یہ دلیل ہے اس کے رسول ﷺ کے صدق پر یعنی وہ اپنی رسالت میں سچے ہیں۔

## آیت کو پہچاننے کا طریقہ

قرآن پاک کی آیات کو پہچاننے کا کوئی طریقہ نہیں بلکہ یہ شارع کی طرف سے توفیقی ہے، کیونکہ قیاس اور رائے کی اس میں گنجائش نہیں، بلکہ یہ محض تعلیم اور ارشاد ہے۔ اس لیے کہ علماء نے ﴿التَّحَصُّصُ﴾ کو ایک آیت شمار کیا ہے۔ اس کی نظیر ﴿التَّحَصُّصُ﴾ کو آیت شمار نہیں۔ اور ﴿لَيْسَ﴾ کو آیت شمار کیا اور اس کی نظیر ﴿طَسَّ﴾ کو آیت شمار نہیں کیا اور ﴿حَمَّ﴾، ﴿عَسَقَ﴾ کو دو آیات شمار کیا اور ان کی نظیر ﴿كَمْ يَعْصُ﴾ کو دو آیات شمار نہیں کیا، بلکہ ایک آیت شمار کیا ہے۔ اگر یہ معاملہ قیاس پر مبنی ہوتا تو مذکورہ بالا دو مثل کا حکم ایک ہوتا اور اس طرح مختلف نہ ہوتا۔

یہ کوئیوں کا مذہب ہے۔ اس لیے کہ انھوں نے ہر سورۃ کے شروع میں آنے والے حرف ہجاء کو ایک آیت شمار کیا سوائے ﴿حَمَّ﴾، ﴿عَسَقَ﴾ کے کہ انھوں نے اسے دو آیات شمار کیا اور سوائے ﴿طَسَّ﴾ کے اور جن میں "ر" آتا ہے یعنی ﴿الرَّ﴾ اور ﴿التَّ﴾ اور جو الگ الگ حروف ہیں جیسے "ق، ص، ن" انھیں آیت میں شمار نہیں کیا۔

اور کوئیوں کے علاوہ دیگر حضرات نے سورۃ کے شروع میں آنے والے حروف ہجاء کو مطلقاً آیت شمار نہیں کیا۔ ہم نے کہا کہ یہ مسئلہ توفیقی ہے آپ پر یہ اختلاف مشتبہ نہ رہے۔ اس لیے کہ ہر ایک اسی حد پر وقف کرتا ہے جو اس تک پہنچی ہے یا اسے معلوم ہوئی ہے۔

آپ یہ نہ کہنا کہ انھوں نے ایک کلمہ کو آیت کیسے شمار کر دیا؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ شارع کی طرف سے اسی طرح وارد ہوا ہے جیسا کہ "الرحمن" کو سورۃ الرحمن کے شروع میں ایک آیت شمار کیا گیا ہے اور اسی طرح "مدھا متان" کو بھی ایک آیت شمار کیا گیا ہے۔ اس لیے کہ جب یہ نازل ہوئی ہیں تو ان پر وقف تھا۔

بخاری، ابوداؤد اور نسائی نے حضرت ابوسعید بن معنی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا کہ "میں مسجد میں نماز پڑھ رہا تھا کہ مجھے رسول اللہ ﷺ نے پکارا میں نے جواب نہیں دیا، اس کے بعد میں آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا، میں نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ!



ہیں نماز پڑھ رہا تھا، آپ ﷺ نے فرمایا کہ کیا اللہ تعالیٰ نے نہیں فرمایا کہ:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اسْتَجِيبُوا لِلَّهِ وَلِلرَّسُولِ إِذَا دَعَاكُمْ﴾ (الانفال: ۲۴)

”اے ایمان والو! اللہ اور اس کے رسول کا جواب دو جب بھی وہ تمہیں پکاریں۔“

اس کے بعد فرمایا کہ میں تمہیں ایک سورۃ سکھانا چاہتا ہوں جو قرآن کی سب سے بڑی سورت ہے اور مسجد سے نکلنے سے پہلے سکھانا چاہتا ہوں اس کے بعد آپ ﷺ نے میرا ہاتھ پکڑا جب نکلنا چاہا تو میں نے عرض کیا کہ کیا آپ نے نہیں فرمایا تھا کہ ”میں آپ کو قرآن پاک کی ایسی سورت سکھانا چاہتا ہوں جو قرآن پاک کی سب سے بڑی سورت ہے؟“ آپ ﷺ نے فرمایا کہ:

﴿الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ﴾ (الفاتحہ: ۱)

یہ سبغ ثنائی اور قرآن عظیم ہے جو مجھے دیا گیا ہے... الخ۔ ①

یہ حدیث دلالت کرتی ہے کہ سورۃ فاتحہ کی سات آیات ہیں اور اس بات پر بھی دلالت کرتی ہے کہ آیت:

﴿وَلَقَدْ آتَيْنَاكَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِي وَالْقُرْآنَ الْعَظِيمَ﴾ (الجم: ۸۷)

”اور ہم نے آپ کو سبغ ثنائی اور قرآن عظیم عطا کیا۔“

اس میں سبغ ثنائی سے مراد یہی سورۃ فاتحہ ہے۔ ترمذی اور حاکم نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا کہ ہر چیز کی کوئی چوٹی ہوتی ہے اور قرآن پاک کی چوٹی سورۃ البقرۃ ہے اور اس میں ایک آیت ہے جو قرآن پاک کی آیتوں کی سردار ہے اور وہ آیت الکرسی ہے۔ ②

مسلم اور ترمذی نے حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے روایت کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ:

”اے ابوالمنذر کیا آپ کو معلوم ہے کہ آپ کو قرآن پاک کی جتنی آیات یاد ہیں ان میں سے سب سے بڑی آیت کونسی

ہے؟ میں نے عرض کیا ﴿اللَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ ۖ الْحَيُّ الْقَيُّومُ﴾ آپ ﷺ نے میرے سینے پر ہاتھ مارا اور فرمایا کہ اے

ابوالمنذر آپ کو علم مبارک ہو۔ ③

صحاح ستہ میں سے نسائی کے علاوہ باقی پانچ حضرات نے حضرت ابوسعود بدری رضی اللہ عنہ کی روایت کو نقل فرمایا کہ نبی کریم ﷺ

نے فرمایا کہ:

”جس شخص نے کسی رات سورۃ البقرۃ کی آخری دو آیات کو پڑھا تو یہ اسے کفایت کریں گی۔“ ④

امام احمد نے اپنی مسند میں حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کیا کہ:

① بخاری تفسیر سورۃ ۱، ابوداؤد صلوٰۃ الوتر ۱۵، مسند احمد ۳، ۲۱۱، ۴

② سنن ترمذی کتاب فضائل القرآن باب ماجاء فی فضل سورۃ البقرۃ حدیث ۲۸۷۸، مستدرک حاکم ۶۱۰، ۱

③ مسلم کتاب صلوٰۃ المسافرين ۲۵۸، ابوداؤد کتاب الوتر ۱۷، مسند احمد ۳، ۲۲، ۵

④ مسلم کتاب صلوٰۃ المسافرين ۲۵۵، ۲۵۶، صحیح البخاری کتاب المغازی ۱۲

”رسول اللہ ﷺ نے مجھے ”ال حم“ میں سے تیس آیات والی ایک سورۃ پڑھائی“ فرمایا کہ یعنی سورۃ الاحقاف اس لیے کہ جب کوئی سورت تیس آیات سے زیادہ ہو تو اسے ثلاثین کہتے ہیں۔

ابن العربی نے فرمایا کہ: نبی کریم ﷺ نے ذکر فرمایا کہ:

”سورۃ فاتحہ سات آیات ہیں اور سورۃ الملک تیس آیات ہیں... الخ۔“

دوسری رائے: آیات کی معرفت کے بارے میں بعض علماء کا مذہب یہ ہے کہ بعض آیات سمائی تو قیسی ہیں اور بعض قیاسی ہیں۔ ان کا مدار فاصلہ پر ہے اور فاصلہ وہ کلمہ ہے جو آیت کے آخر میں ہوتا ہے اس کی نظیر نثر میں جمع اور شعر میں بیت کے قافیہ کی علامت ہوتا ہے۔ کہتے ہیں کہ اگر کسی مقام کے بارے میں ثابت ہو جائے کہ نبی کریم ﷺ نے اس جگہ ہمیشہ وقف کیا ہے تو ہم اسے متحقق سمجھیں گے کہ یہ فاصلہ ہے اور جس کے بارے میں ثابت ہو جائے کہ یہاں آپ ﷺ نے ہمیشہ وصل کیا ہے تو ہم اسے متحقق سمجھیں گے کہ یہ فاصلہ نہیں ہے اور جس جگہ کبھی وقف کیا اور کبھی وصل تو یہاں وقف میں احتمال ہے کہ یہ فاصلہ کو بتلانے کے لیے ہے یا وقف تام کو بتلانے کے لیے یا استراحت کے لیے۔ اور وصل میں احتمال ہے کہ وہ فاصلہ نہ ہو یا فاصلہ ہو اس لیے ملا یا گیا ہو کہ اسے پہلے بتلا دیا گیا ہو۔ اس میں قیاس کی گنجائش ہے اور قیاس کا معنی غیر منصوص کو منصوص علیہ کے ساتھ ملحق کیا جانے کسی ایسے امر کی وجہ سے جو اس کا تقاضا کرتا ہو اور اس میں کوئی ممانعت بھی نہیں ہے اس لیے کہ یہ قرآن پاک میں کسی زیادتی یا نقصان کا سبب نہیں بنتا بلکہ اس کا نتیجہ فصل یا وصل کے محل کی تمیز ہوتا ہے۔

بعض اوقات قرآن پاک کے ایک لفظ میں دو امور ملحوظ ہوتے ہیں، ان میں سے ایک تقاضا کرتا ہے کہ اسے فاصلہ سمجھا جائے اور دوسرا اس کے خلاف کا متقاضی ہوتا ہے۔ اس کی مثال سورۃ فاتحہ میں پہلا ”علیہم“ ہے۔ بعض حضرات نے اسے آیت کا سرا شمار کیا اور بعض حضرات نے اسے اس طرح نہیں سمجھا۔ اس کا سبب یہ ہے کہ ”بسم اللہ“ کے بارے میں اختلاف ہے کہ آیا سورۃ فاتحہ کی آیت ہے یا نہیں؟ حلالہ ان حضرات کا اس میں اتفاق ہے کہ سورۃ فاتحہ کی آیات کی تعداد سات ہے۔ چنانچہ جن کا مذہب یہ ہے کہ ”بسم اللہ“ سورۃ فاتحہ کی آیت ہے انھوں نے ﴿صِرَاطَ الَّذِينَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ﴾ سورۃ کے آخر تک کو ایک آیت شمار کیا اور جن حضرات کا مذہب یہ ہے کہ ”بسم اللہ“ سورۃ فاتحہ کی آیت نہیں ہے وہ پہلے ”علیہم“ کے بعد کو ساتویں آیت شمار کرتے ہیں اور اس کلمہ کو فاصلہ شمار کرتے ہیں۔ اس لیے کہ یہ چھٹی آیت کے بعد واقع ہوا ہے اسے فاصلہ شمار کرنے پر وجہ ترجیح یہ ہے کہ اس صورت میں آیات کی مقدار کے درمیان مناسبت متحقق ہوتی ہے بخلاف اس کے کہ اسے فاصلہ شمار نہ کیا جائے، کیونکہ یہ آخری آیت باقی آیات سے بہت زیادہ لمبی اور زیادہ ہو جاتی، اور اسے فاصلہ نہ شمار کرنے پر وجہ ترجیح یہ ہے کہ یہ سورۃ فاتحہ کے باقی فواصل کے مثل نہیں ہے کیونکہ اس کے فواصل میں سے ہر ایک میں آخری حرف سے پہلے ”یاء“ مدہ ہے۔ مزید یہ کہ کسی بھی سورت میں اس طریقے پر کوئی فاصلہ نہیں آیا ہے۔

جاننا چاہیے کہ کبھی آیت قرآنی کا اطلاق کیا جاتا ہے اور اس سے اکثر آیات یا آیت کا کچھ حصہ مراد لیا جاتا ہے لیکن یہ بطور مجاز یا توسع ہوتا ہے۔

ایک حصہ پر آیت کا اطلاق ﴿ جیسے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ قرآن پاک میں سب سے زیادہ امید والی آیت:

﴿وَإِنَّ رَبَّكَ لَذُو مَغْفِرَةٍ لِّلنَّاسِ عَلَى ظُلْمِهِمْ﴾ (الرعد: ۴)

”بے شک تیرا رب یقیناً لوگوں کی مغفرت کرنے والا ہے ان کے ظلم پر۔“

یہ جملہ بالاتفاق آیت کا کچھ حصہ ہے۔

ایک سے زائد حصہ پر آیت کا اطلاق ﴿ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہما کا قول کہ سب سے زیادہ محکم آیت:

﴿فَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَرَهُ ﴿۲۷﴾ وَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ

ذَرَّةٍ شَرًّا يَرَهُ ﴿۲۸﴾﴾ (الزلزل: ۸، ۷)۔

”تو جس نے ذرہ بھر نیکی کی ہوگی وہ اس کو دیکھ لے گا۔ اور جس نے ذرہ بھر برائی کی ہوگی وہ اسے دیکھ لے گا۔“

حالانکہ یہ بالاتفاق دو آیات ہے۔

## قرآن پاک کی آیات کی تعداد

صاحب تیان نے فرمایا: قرآن پاک کی آیات کی تعداد کے بارے میں شارکنندگان کا اتفاق ہے کہ وہ چھ ہزار دو سو سے کچھ زائد ہیں اور زائد کتنی ہیں؟ اس کی مقدار میں ان کے شمار کے مطابق اختلاف ہے چنانچہ معنی اول کے شمار کے مطابق سترہ ہیں نافع کا بھی یہی قول ہے۔

مدنی اخیر کے شمار کے مطابق شیبہ کے نزدیک چودہ ہیں اور ابو جعفر کے نزدیک دس ہیں کی تعداد کے مطابق ہیں۔

کوئی تعداد کے مطابق چھتیس ہیں اور یہ قول حمزہ زیات سے مروی ہے۔

بصری تعداد کے مطابق پانچ ہیں اور عاصم بحدری سے بھی یہی مروی ہے انہی کی ایک روایت میں چار ہیں، ایوب بن سہل

نے بھی یہی کہا ہے بصریوں کی ایک روایت میں ہے کہ انھوں نے کہا کہ انیس ہیں حضرت قتادہ رضی اللہ عنہما سے بھی یہی مروی ہے۔

شامی تعداد و شمار کے مطابق سولہ ہے اور یحییٰ بن حارث ذماری سے بھی یہی مروی ہے۔

صاحب تیان نے اس سے پہلے یہ بھی فرمایا کہ ”کل تعداد حضرت عبداللہ بن کثیر کی رضی اللہ عنہما کی طرف منسوب ہے جو قرآن سلمہ

میں سے ایک ہیں، وہ یہ بات حضرت مجاہد سے اور وہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اور وہ حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے

ہیں۔

مدنی تعداد کی دو اقسام ہیں: ① عدد مدنی اول ② عدد مدنی اخیر

عدد مدنی اول متعین طور پر کسی کی طرف منسوب نہیں ہے اسے بس اہل کوفہ اہل مدینہ سے مرسل نقل کرتے ہیں اور اس میں

کسی کا نام نہیں لیتے اور وہ اسے لیتے ہیں اگرچہ ان کے لیے تعداد مخصوص ہے۔

اور مدنی اخیر والا عدد ابو جعفر بن یزید بن کھاع کی طرف منسوب ہے جو کہ قراء عشرہ میں سے ایک تھے نیز شیبہ بن نصاح کی طرف بھی منسوب ہے اسے اسماعیل بن جعفر بن ابو کثیر انصاری نے ان دونوں حضرات سے سلیمان بن جازر ریشیہ کے واسطے سے روایت کیا ہے۔

جس نے عدد مدنی اذل کو ابو جعفر اور شیبہ کی طرف منسوب کیا اور عدد مدنی اخیر کو اسماعیل بن جعفر کی طرف منسوب کیا اسے غلطی لگ گئی۔

معلوم ہوتا ہے کہ ان کا اس غلطی میں پڑنے کا سبب یہ ہے کہ بعض کتابوں میں مذکور ہے کہ نافع نے ان دونوں حضرات سے عدد مدنی اذل کو روایت کیا اور ابو عمر بن ہشیر نے عدد مذکور کو ابو جعفر بن ہشیر کے سامنے پیش کیا اب ان دونوں حضرات سے اس طرح روایت کرنا اس بات کا تقاضا نہیں کرتا کہ اسے ان دونوں کی طرف منسوب کیا جائے جب کہ نسبت مدنی اخیر اگر ان کی طرف منسوب ہو جائے تو اس میں شک نہیں کیا جاسکتا۔ .... الخ۔

ہم نے یہ باتیں نقل کرنے کا ارادہ اس لیے کیا کہ اس موضوع میں روز روشن کی طرح وضاحت ہو جائے کیونکہ اس میں بعض منقول امور مضطرب ہیں۔

اس اختلاف کا سبب یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ صحابہ کو سکھانے کے لیے کہ یہ آیت کا سرا ہے، آیات کے سروں پر وقف کیا کرتے تھے پھر جب انھیں معلوم ہو جاتا تو آپ ﷺ اس آیت کو مابعد کے ساتھ ملا دیا کرتے تھے تاکہ پورا معنی معلوم ہو جائے اب بعض لوگ سمجھتے تھے کہ جس پر آپ ﷺ نے وقف کیا تھا وہ فاصلہ نہیں تھا اس وجہ سے وہ اس پوری عبارت کو ایک آیت سمجھتے ہوئے اسے مابعد کے ساتھ ملا دیتے۔ جب کہ بعض حضرات اسے مستقل آیت سمجھتے اور اسے مابعد کے ساتھ نہیں ملاتے تھے اور آپ جان چکے ہیں کہ اس بارے میں لب کشائی کرنے کی گنجائش ہے اس لیے کہ اس سے قرآن پاک میں کوئی زیادتی یا نقصان لازم نہیں آتا۔

قرآن پاک کی آیات لمبا ہونے یا چھوٹا ہونے میں مختلف ہیں سب سے لمبی آیت، آیت دین ہے جو سب سے بڑی سورت یعنی سورۃ البقرۃ میں ہے اور سب سے چھوٹی آیت ﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا﴾ ہے جو سورۃ ﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا﴾ کے شروع میں واقع ہوئی ہے۔

## آیات کو پہچاننے کے فوائد

بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ قرآن پاک کی آیات کو پہچاننے کا کوئی فائدہ نہیں ان کی تردید کے لیے ہم اس کے ایک کی بجائے تین فوائد ذکر کرتے ہیں:

پہلا فائدہ • یہ معلوم ہے کہ ہر تین چھوٹی آیتیں نبی کریم ﷺ کا معجزہ ہیں، اس طرح وہ بڑی آیت بھی اسی حکم میں ہے جو تین چھوٹی آیات کے برابر ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے علی الاطلاق ایک سورۃ کا چیلنج کیا اور فرمایا کہ:

﴿وَلٰنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰی عَبْدِنَا فَأْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّثْلِهٖ ۙ﴾ (البقرۃ: ۲۳)

”اگر تمہیں اس کلام میں شک ہے جو ہم نے اپنے بندے پر نازل کیا تو اس جیسی کوئی سورہ ہی لے آؤ!“  
 اور ”سورہ“ جیسے بڑی سورہ پر صادق آتی ہے ایسے چھوٹی سورت بھی صادق آتی ہے اور قرآن پاک میں سب سے چھوٹی  
 سورت سورت کوثر ہے جو تین چھوٹی آیات پر مشتمل ہے۔ لہذا ثابت ہوا کہ ہر تین چھوٹی آیتیں معجزہ ہیں اور ایک لمبی آیت جو اس کے  
 برابر ہو وہ بھی اس کے درجہ میں ہے۔

**دوسرا فائدہ** • جن حضرات کی رائے یہ ہے کہ فواصل پر وقف سنت ہے ان کے نزدیک آیت کے سرے پر وقف بخوبی ہو سکے گا۔  
 ان حضرات کی بناء ایک حدیث کے ظاہر پر ہے جس سے انھوں نے استدلال کیا ہے جسے ابوداؤد نے حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت  
 کیا کہ: نبی کریم ﷺ جب وقف کرتے تو ایک ایک آیت پر وقف کرتے اور فرماتے ﴿بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ﴾ پھر وقف  
 کرتے ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ﴾ پھر وقف فرماتے ﴿الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ﴾ پھر وقف فرماتے۔

صاحب تیمان نے ایک اور مقام پر فرمایا کہ ”بعض علماء نے فرمایا کہ: ”اس حدیث سے استدلال کرنا جیسا کہ ذکر ہوا اس  
 میں نظر ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ ایک حدیث غریب ہے اور اس کی سند بھی متصل نہیں ہے۔ اسے یحییٰ بن سعید اموی وغیرہ نے حضرت  
 ابن جریج سے انھوں نے ابن ابی ملیکہ سے اور انھوں نے حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا جبکہ اصح یہ ہے کہ لیث نے ابن ابی ملیکہ  
 سے انھوں نے یعلیٰ بن مالک سے روایت کیا کہ انھوں نے حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے رسول اللہ ﷺ کی قرأت اور نماز کے بارے میں  
 سوال کیا تو انھوں نے فرمایا کہ تمہیں ان کی نماز سے کیا واسطہ؟ اس کے بعد انھوں نے آپ ﷺ کی قرأت ایک ایک حرف کی تفصیل  
 کے ساتھ بیان کی۔“<sup>①</sup>

میں کہتا ہوں کہ ان دونوں احادیث کے درمیان تطبیق ممکن ہے کہ نبی کریم ﷺ کبھی ہر فاصلہ پر وقف کر لیتے اگرچہ معنی تام  
 نہ ہو اس کا مقصد آیات کے سروں کو جٹلانا ہوتا تھا اور کبھی وقف میں تمام معنی کی اتباع کرتے تھے اور آیات کے سروں پر وقف کا  
 التزام نہیں کرتے تھے تاکہ ہر حرف کی قرأت واضح ہو جائے۔ اس بناء پر یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ جہاں لوگوں کو آیات کے بیان  
 کی ضرورت ہوتی وہاں آیات کے سروں پر وقف کرنا بہتر ہے اگرچہ معنی تام نہ ہو اور جہاں لوگوں کو آیات کے سرے پہچاننے کی  
 ضرورت نہ ہو وہاں وقف بہتر نہیں سوائے اس کے کہ معنی تام ہو جائے۔

یہ بھی احتمال ہے کہ گزشتہ بالا حدیث میں لفظ ”مفسرۃ حرفا حرفا“ (ایک ایک حرف کو وضاحت سے) مراد ترتیل ہو اور  
 حرف کو ان کے مخارج سے نکالنا ہو اس صورت میں اس حدیث کا دوسری حدیث سے تعارض بھی نہیں ہوگا۔

**تیسرا فائدہ** • نماز اور خطبہ میں آیات سے باخبر ہونا۔

امام سیوطی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ”آیات، ان کی تعداد اور ان کے فواصل پر احکام شرعیہ مرتب ہوتے ہیں، ان میں ایک یہ ہے  
 کہ جس شخص کو سورہ فاتحہ نہ آتی ہو اس کے لیے آیات سے باخبر ہونا ضروری ہے، اس لیے کہ اس پر اس کے بدلے میں سات آیات  
 واجب ہیں۔ نیز اسے خطبہ میں جاننا بھی ضروری ہے اس لیے کہ اس میں پوری ایک آیت کی تلاوت ضروری ہے اگر وہ آیت طویل نہ  
 ہو تو اس کا کچھ حصہ کافی نہ ہوگا اسی طرح اگر طویل پھر بھی اس کا کچھ حصہ کافی نہ ہوگا جیسا کہ جمہور نے اسے محقق کیا ہے۔

① ترمذی ثواب القرآن باب ۲۳ ابوداؤد کتاب الوتر ۲۰ نسائی نے الفتاح میں ۱۰۳ اور قیام اللیل میں ۱۰۳، مسند احمد ۶/۲۹۳

اس کے بعد فرمایا کہ ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اس سے باخبر ہونا اس سورت میں جو نماز میں پڑھی جاتی ہے یا جو اس کے قائم مقام ہو۔ صحیح بخاری میں ہے کہ آپ ﷺ صبح کی نماز میں ساٹھ آیات سے سو آیات تک پڑھا کرتے تھے۔ ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ قیام اللیل کی قراءت میں اس سے آگاہ ہونا... الخ سوائے اس کے کہ ہڈی ریشیہ نے اپنی کتاب ”کامل“ میں نقل کیا کہ جاننا چاہیے کہ ایک قوم تعداد اور اس کے فوائد سے ناواقف رہی حتیٰ کہ زعفرانی نے فرمایا کہ ”بے شک عدد علم نہیں ہے بعض لوگ صرف اپنی دکان چکانے کے لیے اس میں مشغول ہوئے حالانکہ ایسا نہیں ہے بلکہ اس میں وقف کو بچانے کے اعتبار سے بہت سے فوائد ہیں اس لیے کہ اس بات پر اجماع ہے کہ نصف آیت سے نماز صحیح نہیں ہے۔ اور علماء کی ایک جماعت نے فرمایا کہ ایک آیت کافی ہے اور دیگر حضرات نے فرمایا کہ تین آیات اور کچھ لوگوں نے کہا کہ سات آیات کے بغیر چارہ نہیں ہے اور اعجاز ایک آیت سے کم میں واقع نہیں ہو سکتا اور اس میں تعداد کا بہت بڑا فائدہ ہے... الخ لیکن متعین طور پر ہمیں نہیں معلوم کہ ہڈی ریشیہ کا اس کلام سے کیا مقصد تھا اور کس مذہب کے بارے میں وہ بات کر رہے ہیں۔

## آیات قرآن کی ترتیب

امت کا اجماع منعقد ہے کہ قرآن کریم کی آیات کی اس طریقے پر ترتیب جیسے آج ہم دیکھ رہے ہیں وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے توفیق ہی ہے اور رائے اور اجتہاد کی اس میں گنجائش نہیں ہے بلکہ حضرت جبریل علیہ السلام رسول اللہ ﷺ کے پاس آیات لے کر نازل ہوتے اور آپ ﷺ کی قراءت کے بارے میں رہنمائی فرماتے کہ کوئی سورت کی کس آیت کو کہاں رکھے۔ پھر نبی کریم ﷺ انھیں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے سامنے پڑھا کرتے اور وحی لکھنے والوں کو ان کی کتابت کا حکم دیتے اور ان کے لیے اس سورت کی تعیین کرتے جس میں وہ آیت ہے اور اس سورت میں آیت کی جگہ بھی متعین فرماتے۔ اور آپ ﷺ بار بار ان کے سامنے اس کی تلاوت کرتے کبھی نماز میں، کبھی مواظپ میں اور کبھی حکم و احکام میں اور جبریل علیہ السلام آپ ﷺ کے ساتھ ہر سال دور کیا کرتے اور آخری سال دو مرتبہ دور کیا۔ یہ سب اس ترتیب کے مطابق ہوتا تھا جو ہمارے ہاں مصاحف میں ہے اسی طرح ہر وہ شخص جو قرآن پاک کو حفظ کرتا یا صحابہ رضی اللہ عنہم سے قرآن پاک کا کچھ حصہ حفظ کرتا وہ بھی اسی ترتیب کے مطابق کرتا تھا اسی طرح پھیلتا اور شائع ہوتا چلا گیا اس نے مقامات اور لوگوں کے کانوں کو پر کر دیا وہ آپس میں اس کا دور کرتے اور نماز میں اس کی قرات کرتے ایک دوسرے سے حاصل کرتے اور ایک دوسرے کو سناتے، اسی ترتیب کے ساتھ جو اس وقت قائم ہے۔ قرآن کریم کی آیات کی ترتیب میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم یا خلفاء راشدین میں سے کسی ایک کا بھی کوئی دخل یا تصرف نہیں تھا بلکہ ابو بکر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں جو جمع ہوا وہ اس سے زیادہ نہیں تھا کہ وہ کھجور کی شاخوں اور پتھروں سے اوراق کی طرف منتقل ہو گیا اور جو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دور میں جمع قرآن ہوا وہ بھی اس سے بڑھ کر نہیں ہوا کہ وہ صحیفوں سے مصاحف میں منتقل ہوا اور یہ دونوں اسی ترتیب کے موافق تھیں جو محفوظ اور متواتر ہے نبی کریم ﷺ کی طرف سے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے۔ ہاں البتہ اس پر پوری طرح اجماع ہو چکا اور اس میں ذرا بھی شک نہیں ہے اور جنھوں نے اس اجماع کو نقل کیا وہ بھی ایک جماعت ہے جن میں سے ایک علامہ زرکشی ہیں جنھوں نے ”البرہان“ میں اسے نقل فرمایا اور ابو جعفر



## مناب العرفان فی علوم القرآن: جلد ۱

نبینہو ہیں جنہوں نے ”المناسبات“ میں اسے نقل فرمایا۔ اس کی عبارت یوں ہے (ترجمہ) ”سورتوں میں آیات کی ترتیب آپ ﷺ کی توفیق سے واقع ہوئی اور آپ ﷺ نے بغیر کسی اختلاف کے مسلمانوں کے درمیان اس کا حکم دیا۔“

یہ اجماع بہت سی نصوص کی طرف منسوب ہے جن میں سے کچھ آپ کے سامنے قریب ہی گزر چکی ہیں۔ ان میں سے ایک وہ روایت ہے جسے امام احمد بن حنبل، ربیع بن جریب نے حضرت عثمان بن ابوالعاص نبینہو سے روایت کیا کہ میں رسول اللہ ﷺ کے پاس بیٹھا تھا کہ اچانک آپ ﷺ نے اپنی نظروں کو بلند کیا اور پھر اسے پست کر لیا اس کے بعد فرمایا کہ میرے پاس حضرت جبریل علیہ السلام آئے اور انہوں نے مجھے حکم دیا کہ میں اس آیت کو سورت کی اس جگہ رکھوں:

﴿إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ وَإِيتَايَ ذِي الْقُرْبَىٰ ...﴾ (الم: ۹۰) ①

”خدا تم کو انصاف اور احسان کرنے اور رشتہ داروں کو (خرچ سے مدد) دینے کا حکم دیتا ہے... الخ۔“

ان میں سے ایک وہ روایت ہے جو سنن صحیحہ میں ہے جن میں نبی کریم ﷺ کی مختلف سورتوں کی قرأت کا بیان ہے جیسے سورۃ البقرۃ، سورۃ آل عمران، سورۃ نساء وغیرہ نیز آپ ﷺ کا سورۃ الاعراف کو مغرب کی نماز میں پڑھنا اور سورۃ ﴿قَدْ أَفْلَحَ الْمُؤْمِنُونَ﴾ کو اور سورۃ الروم کو صبح کی نماز میں پڑھنا اور سورۃ ”السمۃ“ اور سورۃ ﴿هَلْ أَتَى عَلَى الْإِنْسَانِ﴾ کو جمعہ کے دن صبح کی نماز میں پڑھنا اور سورۃ ”الجمعة“ اور سورۃ ”المنافقین“ کو جمعہ کی نماز میں پڑھنا اور سورۃ ”ق“ کو خطبہ میں پڑھنا اور سورۃ ”القدر“ کو اور سورۃ ”ق“ کو عید کی نماز میں پڑھنا۔ آپ ﷺ یہ سب سورتیں آیات کی اسی ترتیب کے مطابق پڑھا کرتے تھے جو صحابہ نبینہو کے سامنے مصحف میں دیکھی اور سنی جاتی تھی۔

ان میں سے ایک وہ روایت بھی ہے جسے امام بخاری ربیع بن جریب نے کتاب تفسیر القرآن میں تفسیر سورۃ البقرۃ کے تحت حضرت ابن الزبیر نبینہو سے روایت کیا کہ میں نے حضرت عثمان نبینہو سے عرض کیا کہ:

﴿وَالَّذِينَ يُتَوَكَّفُونَ مِنْكُمْ وَيَدْرُونَ أَرْوَاجًا﴾ (البقرۃ: ۲۳۳)

”وہ لوگ جو تم میں سے وفات پا جائیں اور اپنی بیویاں چھوڑ جائیں۔“

اسے ایک اور آیت نے منسوخ کر دیا پھر آپ اسے کیوں لکھ رہے ہیں یا اسے لکھی ہوئی کیوں چھوڑ رہے ہیں حالانکہ یہ منسوخ ہے انہوں نے فرمایا کہ اسے جھتکتے ہیں اس میں سے کوئی چیز اپنی جگہ سے بدل نہیں سکتا۔

یہ حدیث روز روشن کی طرح واضح ہے کہ اس آیت کو منسوخ ہونے کے باوجود اپنے مقام پر رکھنا توفیقی ہے۔ حضرت عثمان نبینہو کا اعتراف ہے کہ وہ اس میں سے کسی چیز میں تصرف نہیں کر سکتے، اس لیے کہ اس جیسی چیزوں میں رائے کی گنجائش نہیں ہے۔

ان میں ایک وہ روایت بھی ہے جسے امام مسلم نے (کتاب الفرائض میں حدیث نمبر ۹ پر) حضرت عمر نبینہو سے روایت کیا کہ میں نے نبی کریم ﷺ سے جتنا آیت کلام کے بارے میں سوال کیا اتنا کسی بھی چیز کے بارے میں سوال نہیں کیا حتیٰ کہ آپ ﷺ نے میرے سینے میں اپنی انگلی چھوئی اور فرمایا کہ:

”آپ کو آیت الصیف کافی ہے جو سورۃ النساء کے آخر میں ہے۔“

اب آپ دیکھ رہے ہیں کہ آپ ﷺ نے اس آیت کی جگہ سورۃ النساء کے اندر بتلادی اور وہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد:

﴿يَسْتَفْتُونَكَ قُلِ اللَّهُ يُفْتِيكُمْ فِي الْكَلِمَةِ...﴾ (النساء: ۵۳) ہے۔

**تنبیہ:** بعض حضرات نے ذکر کیا کہ کلمات ستر ہزار نو سو چونتیس ہیں اور بعض نے اس کے علاوہ کہا بعض نے کہا کہ کلمات کے تعداد میں اختلاف کا سبب یہ ہے کہ کلمہ کی ایک حقیقت ہوتی ہے اور ایک مجاز۔ پھر اس کا تلفظ بھی ہوتا ہے اور کتابت بھی اور ان میں سے ہر ایک کا اعتبار جائز ہے۔ اور علماء میں سے جس نے جو بھی تعبیر کی وہ جائز ہے۔ سخاوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ: ”میں نہیں جانتا کہ کلمات اور حروف کو شمار کرنے میں بھی کوئی فائدہ ہے اس لیے کہ اگر اس سے کوئی فائدہ ہو تو اس کتاب میں ہو سکتا ہے جس میں کمی بیشی کا احتمال ہو اور قرآن پاک میں یہ چیز ممکن ہی نہیں.... الخ لیکن احادیث میں حروف کا اعتبار ثابت ہے چنانچہ ترمذی نے (کتاب ثواب القرآن باب ۱۶ پر) حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً نقل کیا کہ ”جس نے کتاب اللہ کا کوئی حرف پڑھا تو اسے اس کے بدلے ایک نیکی ملے گی اور ایک نیکی کا اجر دس گنا ہوتا ہے، میں نہیں کہتا کہ ﴿الْحَمْدُ﴾ ایک حرف ہے بلکہ الف ایک حرف اور لام ایک حرف اور میم ایک حرف ہے“ یزید طبرانی نے حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً نقل کیا کہ ”قرآن پاک کے دس لاکھ بیس ہزار حروف ہیں جس نے انہیں صبر کے ساتھ ثواب کی امید رکھتے ہوئے پڑھا تو اسے ہر حرف کے بدلے حور عین میں سے ایک بیوی دی جائے گی“ سیوطی نے اسے ذکر کرنے کے بعد فرمایا کہ اس کے راوی ثقہ ہیں سوائے شیخ طبرانی محمد بن عبید بن آدم بن ابویاس کے کہ جن کے بارے میں ذہبی رحمۃ اللہ علیہ نے کلام کیا ہے۔ پھر فرمایا کہ یہ تعداد جو اس حدیث میں ذکر ہوئی قرآن پاک کی ان آیات پر محمول ہے جن کی کتابت منسوخ ہو چکی ہے۔ اس لیے کہ اس وقت جو قرآن موجود ہے وہ اس تعداد تک نہیں پہنچتا۔ ان کی مراد یہ ہے کہ یہ بڑی تعداد جو اس حدیث میں مروی ہے اس میں قرآن کے عام حروف لمخوط ہیں جو نازل ہوئے خواہ وہ منسوخ ہوئے یا نہیں ہوئے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

**شبیہ اور اس کا ازالہ:** کہتے ہیں کہ ابوداؤد نے اپنی سند کے ساتھ حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ سے انھوں نے اپنے ابا جان سے روایت کیا کہ حارث بن خزیمہ رضی اللہ عنہ سورۃ براءت کی آخری ان دونوں آیات کو لے کر آئے اور فرمایا کہ میں گواہی دیتا ہوں کہ میں نے یہ دو آیات نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنیں اور محفوظ کیں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ:

”میں گواہی دیتا ہوں کہ میں نے یہ دونوں آیات سنی ہیں پھر فرمایا کہ اگر تین آیات ہوتیں تو میں انھیں علیحدہ کر دیتا اب قرآن پاک کی آخری سورۃ کو لکھو اور انھیں اس کے آخر میں لگا دو!“ وہ کہتے ہیں کہ یہ حدیث دلالت کرتی ہے کہ آیات کی ترتیب تمام قرآن میں تو قیسی نہیں بلکہ وہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی خواہش کے مطابق تھی اور وہ اس میں تصرف کر سکتے تھے اگرچہ بعض میں ہی کیوں نہ ہو۔

**جواب:** ① یہ خبر قطعی دلیل کے معارض ہے اور وہ قطعی دلیل امت کا اجماع ہے اور قطعی کا معارض ساقط ہوتا ہے جس کا اعتبار نہیں کیا جاتا لہذا یہ خبر مردود ہوگی اس کے قائل پر۔

② یہ حدیث ان تمام احادیث کے معارض ہے جو اس کے خلاف پر دلالت کرتی ہیں اور وہ ان گنت ہیں اور ان میں سے اکثر پیچھے گزر چکیں بلکہ ابن ابی داؤد ہی کی اپنی نقل کردہ حدیث بھی اس کے معارض ہے وہ یہ کہ انھوں نے یہ حدیث بھی نقل کی کہ حضرت

ابن ابی بنیہ سے روایت ہے کہ انھوں نے قرآن پاک کو جمع کیا جب وہ سورۃ برأت کی آیت:

﴿ثُمَّ انصَرَفُوا صَرَفَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ بِاَنَّهُمْ قَوْمًا لَا يَفْقَهُوْنَ﴾ (التوبہ: ۱۲۷)

تک پہنچے تو انھوں نے سمجھا کہ یہ سب سے آخر میں نازل ہونے والی آیت ہے جبکہ حضرت ابی بنیہ نے فرمایا کہ مجھے رسول اللہ ﷺ نے اس کے بعد بھی دو آیتیں پڑھائی ہیں:

﴿لَقَدْ جَاءَكُمْ رَسُولٌ... الخ﴾ (التوبہ: ۱۲۸)

## سورتوں کی ترتیب

سورۃ کا معنی لغت میں سورۃ کا اطلاق کس معنی پر ہوتا ہے اس کے بارے میں ہم صاحب قاموس کا قول ذکر کرتے ہیں وہ فرماتے ہیں کہ: ((السورة المَنزُوةُ، ومن القرآن معرفة، لانها منزلة بعد منزلة: مقطوعة

عن الاخرى والشرط وما طال من البناء وحسن وعرق من عروق الحائض)).

”سورۃ کا معنی ”منزلت“ ہے اور قرآن پاک کی سورتیں مشہور و معروف ہیں اس لیے کہ وہ ایک منزلت کے بعد دوسری

منزلت ہے۔ اور ”شرف“ اور ”عمارت کا بلند اور خوبصورت حصہ“ اور ”علامت“ اور دیوار کے رڈوں میں سے ایک رڈا۔“

اس کی اصطلاحی تشریح یوں کی جاسکتی ہے ”کہ آیات قرآنی کا ایک مستقل مجموعہ جس کی ابتداء بھی ہو اور انتہا بھی ہو“ کہتے ہیں کہ یہ ”سورۃ النبلا“ سے مشتق ہے اس لیے کہ اس میں ایک کلمہ کو دوسرے کلمہ کی جانب میں اور ایک آیت کو دوسری آیت کی جانب میں رکھا جاتا ہے جیسے ایک دیوار میں ہر اینٹ کو دوسری اینٹ کے ساتھ رکھا جاتا ہے اور اس کے ہر رڈے کو دوسرے رڈے پر قائم کیا جاتا ہے۔

یا اس کی وجہ یہ ہے کہ اس میں علو اور معنوی رفعت کے معنی پائے جاتے ہیں جو دیوار کے علو کے اور رفعت کے مشابہ ہیں، یا اس وجہ سے کہ یہ محمد ﷺ کے لیے بچاؤ اور حفاظت ہیں نیز محمد ﷺ جو اللہ کی کتاب یعنی قرآن اور دین حق یعنی اسلام لے کر آئے ہیں ان کے لیے بھی بچاؤ اور حفاظت ہیں اس اعتبار سے کہ یہ ایک معجزہ ہے جو ہر مقابل کی زبان بند کر دیتا ہے اور اللہ تعالیٰ ان کے ذریعے حق کو حق اور باطل کو باطل بنا کر واضح کرتا ہے اگرچہ مجرمین کو تاگوار محسوس ہو۔ یہ سورۃ المدنیہ کے بھی مشابہ ہے اس لیے کہ وہ انھیں دشمنوں کے حملے اور گمراہوں کے غلبے سے بچاتی اور حفاظت کرتی ہے۔

قرآن کی سورتیں طویل اور مختصر ہونے میں مختلف ہیں سب سے چھوٹی سورت ”سورۃ الکواثر“ ہے اور یہ تین چھوٹی آیات پر مشتمل ہے اور سب سے بڑی سورت ”سورۃ البقرۃ“ ہے اور وہ دوسو پچاس یا دوسو چھیالیس آیات پر مشتمل ہے اور اس کی اکثر آیات لمبی ہیں بلکہ اس میں ایک آیت ”آیت الدین“ ہے جو قرآن پاک کی سب سے بڑی آیت ہے جیسا کہ گزر چکا اور سورۃ البقرۃ اور سورۃ الکواثر کے درمیان بہت سی سورتیں ہیں جو طوالت، توسط اور اختصار میں مختلف ہیں طویل اور متوسط ہونا اور ابتداء و انتہاء کی حد

بندی کا مرجع اللہ تعالیٰ کی طرف ہی ہوتا ہے۔ جو ایک بلند و بالا حکم کی وجہ سے ہوتا ہے اسے جو جانتا ہے جانتا ہے اور جو نہیں جانتا وہ نہیں جانتا۔

## سورتیں بنانے کی حکمت

قرآن پاک کی سورتوں کی شکل میں حصے بنانے میں بہت سے فوائد اور حکمتیں ہیں۔

① لوگوں کے لیے آسانی پیدا کرنا اور انھیں قرآن پاک کا دور اور حفظ کرنے کا شوق دلانا۔ اس لیے کہ اگر وہ ایک حصے پر ہوتا اور اس کے کئی حصے نہ ہوتے تو اسے یاد کرنا اور سمجھنا دشوار ہو جاتا اور انھیں اس بڑے سمندر میں گھسنا ٹھکا دیتا جس میں نزدیک سے کوئی بندرگاہ یا کنارہ نظر نہیں آتا۔

② گفتگو کے موضوع یا کلام کے محور پر دلالت ہو جاتی ہے کیونکہ ہر سورۃ میں کوئی نمایاں موضوع ہوتا ہے جس کے بارے میں گفتگو ہوتی ہے جیسے سورۃ البقرۃ، سورۃ یوسف، سورۃ النمل اور سورۃ الجن وغیرہ۔

③ اس بات کی طرف اشارہ ہو جاتا ہے کہ قرآن پاک کے اعجاز میں سورۃ کا طویل ہونا شرط نہیں ہے اگرچہ وہ چھوٹی ہونے میں سورۃ الکوثر کی حد تک کیوں نہ ہو۔

④ صاحب کشف نے قرآن پاک کی تفصیل اور اس کی سورتوں کی شکل میں حصے کرنے کے بہت سے فوائد لکھے ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ جب کسی جنس کے تحت اصناف و انواع ہو جاتی ہیں تو وہ خوبصورت اور عظیم الشان بن جاتی ہے بخلاف اس کے وہ ایک باب ہو۔

⑤ پڑھنے والا جب کوئی سورت یا کتاب کا کوئی باب ختم کرتا ہے پھر دوسری سورت یا باب شروع کرتا ہے تو اسے بشاشت اور خوشی حاصل ہوتی ہے اور وہ اپنے مقصد کی طرف پھرتی سے رواں دواں ہو جاتا ہے اگرچہ وہ لمبی کتاب میں ہی چلتا رہے اس کی مثال مسافر کی سی ہے کہ جب وہ ایک میل یا فرسخ طے کر لیتا ہے تو اس سے اسے تسلی سکون اور آسودگی ملتی ہے اور مزید چلنے کے لیے ہشاش بشاش ہو جاتا ہے۔ اسی وجہ سے قرآن پاک کے سید پارے اور انعام بنائے گئے۔

⑥ حافظ جب کسی سورۃ کو یاد کر لیتا ہے تو اس کا اعتقاد ہو جاتا ہے کہ اس نے کتاب اللہ کے ایک مستقل مجموعے کو حاصل کر لیا اب وہ اپنے یاد شدہ حصے کو بڑا سمجھتا ہے اسی سے متعلق حضرت انس رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے کہ:

”جب کوئی شخص سورۃ بقرہ اور آل عمران پڑھ لیتا تھا تو وہ ہمارے درمیان بلند مرتبہ اور عظمت والا ہوتا تھا۔“<sup>①</sup>

⑦ اشکال و نظائر کے آٹنے اور ان کے ایک دوسرے کے موافق ہونے کے اعتبار سے تفصیل ہو جانا اور اسی کے ذریعے معانی اور نظم بھی آتے ہیں اس کے علاوہ اور بھی بہت سے فوائد ہیں۔

علاء کرام نے سورتوں کو چار اقسام میں تقسیم کیا ہے اور ہر ایک کو ایک معین نام کے ساتھ خاص سورتوں کی اقسام کیا ہے۔ ① طویل ② معین ③ مثالی ④ مفصل

① طویل سات سورتیں ہیں:

① سورة البقرة ② آل عمران ③ النساء ④ مائدہ ⑤ الانعام ⑥ اعراف

یہ چھ ہوئیں اور ساتویں میں اختلاف ہے آیا کہ وہ سورة انفال اور برأت کا مجموعہ ہے؟ کیونکہ ان دونوں کے درمیان "بسم اللہ" کے ساتھ فصل نہیں ہے یا وہ سورة یونس ہے؟

② منوں وہ سورتیں ہیں جن کی آیات سو سے زائد ہیں یا سو کے قریب ہیں۔

③ مثالی وہ سورتیں ہیں جو آیات کی تعداد میں معین کے قریب قریب ہیں۔ فزاء نے کہا کہ یہ وہ سورتیں ہیں جن کی آیات سو سے کم ہوں اس لیے کہ یہ طویل اور منوں کی بنسبت زیادہ مرتبہ بار بار پڑھی جاتی ہیں۔

④ مفصل یہ وہ سورتیں ہیں جو قرآن پاک کے آخر میں ہیں اور یہ کہاں سے شروع ہوتی ہیں اس میں بارہ مختلف اقوال ہیں بعض نے کہا کہ یہ سورة "ق" سے شروع ہوتی ہیں اور بعض نے اس کے علاوہ کا قول کیا ہے امام نووی رحمہ اللہ نے اس قول کو صحیح قرار دیا کہ یہ سورة الحجرات سے شروع ہوتی ہیں انھیں مفصل اس لیے کہتے ہیں کہ ان کی سورتوں کے درمیان "بسم اللہ" کے ذریعے فصل کثرت کے ساتھ ہوتا ہے بعض نے کہا کہ انھیں مفصل اس لیے کہتے ہیں کہ ان میں سے منسوخ ہونے والی سورتیں کم ہیں اسی وجہ سے انھیں محکم بھی کہتے ہیں۔ جیسا کہ بخاری میں حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انھوں نے فرمایا کہ "جن سورتوں کو تم مفصل کہتے ہو وہ محکم ہیں۔"

مفصل کی تین اقسام ہیں: طویل، اوساط، اور قصار۔ طویل "سورة الحجرات" سے "بروج" تک ہیں اور اوساط "سورة الطلاق" سے "لم یکن" تک ہیں اور قصار "سورة اذ لزلت" سے قرآن کے آخر تک ہیں۔

## سورتوں کی ترتیب میں مذاہب

سورتوں کی ترتیب میں تین اقوال ہیں:

① سورتوں کی ترتیب جو اس وقت ہمارے سامنے ہے یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے توفیق نہیں ہے بلکہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اجتہاد سے ہے۔ یہ قول جمہور علماء کی طرف منسوب ہے۔ جن میں مالک قاضی ابوبکر بھی ہیں جیسا کہ ان دونوں کے اقوال کے بارے میں معتقد قول ہے۔ اس مذہب کی طرف ابن فارس نے کتاب "المسائل الخمس" میں اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ "قرآن کو دو طرح سے جمع کیا گیا۔"

① سورتوں کی تالیف جیسے سب طویل کو مقدم کرنا اور منوں کو ان کے بعد لانا یہ وہ کام ہے جسے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے انجام دیا۔

② اور دوسرا جمع، سورتوں میں آیات کو جمع کرنا ہے یہ وہ کام ہے جسے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سرانجام دیا اور اس طریقے سے سرانجام



دیا جیسے آپ ﷺ کو حضرت جبرئیل علیہ السلام نے اپنے رب عزوجل کے حکم سے بتلایا۔

ان دونوں کی رايوں پر دو امور سے استدلال کیا گیا ہے۔

**پہلی دلیل**؟ ایک تو یہ کہ حضرت عثمان بنی ہشام کے زمانے میں جو جمع قرآن ہوا اس سے پہلے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے مصاحف سورتوں کی ترتیب میں مختلف تھے اگر یہ ترتیب توقیفی ہوتی اور نبی کریم ﷺ سے منقول ہوتی تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے لیے قطعاً گنجائش نہ تھی کہ وہ اس سے بے پروا ہی برتتے اور اس سے تجاوز کرتے اور اس میں اس طرح اختلاف کرتے جو ہمارے سامنے روایات کے ذریعہ مقرر ہوا ایک طرف حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہم کا مصحف ہے جو سورۃ فاتحہ سے شروع ہوتا ہے اس کے بعد سورۃ البقرۃ اس کے بعد سورۃ النساء اس کے بعد سورۃ آل عمران اور اس کے بعد سورۃ الانعام ہے۔

اور دوسری طرف حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہم کا مصحف ہے کہ جو سورۃ البقرۃ سے شروع ہوتا ہے اس کے بعد سورۃ النساء پھر آل عمران ہے یعنی شدید اختلاف ہے۔ اور ایک جانب حضرت علی رضی اللہ عنہم کا مصحف ہے جس کی ترتیب نزول کے مطابق ہے سب سے پہلے "اقراء" پھر "ق" پھر "المزل" اس کے بعد "تبت" اور پھر "الکویر" ہے۔ اسی طرح کی سورتوں کے آخر تک اور مدنی سورتوں کے آخر تک۔

**دوسری دلیل**؟ ابن اشعث نے "المصاحف" میں سند کے ساتھ حضرت ابو محمد القرظی سے روایت کیا کہ انھوں نے فرمایا کہ "حضرت عثمان رضی اللہ عنہم نے انھیں حکم دیا کہ وہ طویل کا سلسلہ جاری رکھیں انھوں نے سورۃ انفال اور سورۃ التوبہ کو سب طویل میں شامل کیا اور ان دونوں کے درمیان "بسم اللہ" کے ساتھ فصل کیا... الخ" اس سے شاید اس روایت کی طرف اشارہ ہے جسے امام احمد ترمذی، نسائی، ابن حبان اور حاکم نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہم سے روایت کیا کہ "میں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہم سے عرض کیا کہ تمہیں سورۃ انفال پر کس نے ابھارا حالانکہ وہ مشائی میں سے ہے اور سورۃ برأت پر کس نے ابھارا حالانکہ وہ مکیں میں سے ہے آپ نے ان دونوں کو ملا دیا اور ان دونوں کے درمیان ﴿بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ﴾ کی سطر نہیں لکھی اور تم نے انھیں سب طویل میں رکھ دیا؟ حضرت عثمان رضی اللہ عنہم نے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ پر متعدد سورتیں نازل ہوتی تھیں۔ آپ ﷺ پر جب کوئی چیز نازل ہوتی تو اپنے کسی کاتب کو بلا تے اور فرماتے کہ "ان آیات کو اس سورت میں رکھ دو جس میں فلاں فلاں بات لکھی ہوئی ہے" اور سورۃ انفال مدینہ میں نازل ہونے والی پہلی سورتوں میں سے ہے اور سورۃ البرأت قرآن پاک کی آخر میں نازل ہونے والی سورتوں میں سے ہے اور ان دونوں کا قصہ ایک دوسرے سے مشابہ ہے، میں سمجھتا تھا کہ یہ بھی اسی سورت کا حصہ ہے آپ ﷺ کا وصال ہو گیا اور آپ ﷺ نے یہ واضح نہیں فرمایا کہ یہ اسی سورت کا حصہ ہے اس وجہ سے میں نے اسے اس کے ساتھ ملا دیا اور ان دونوں کے درمیان ﴿بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ﴾ نہیں لکھی اور انھیں سب طویل میں رکھ دیا۔<sup>①</sup>

مگر ہے کہ اس مذہب کے ساتھ ان احادیث کے ذریعے تجزیہ کیا جائے جو توقیف پر دلالت کرتی ہیں جو قول ثانی کے دلائل میں آپ کے سامنے آ رہی ہیں۔ نیز پہلی دلیل کے ساتھ اسی احتمال کے ذریعے بھی تجزیہ ممکن ہے کہ ہو سکتا ہے کہ جن صحابہ رضی اللہ عنہم نے ترتیب میں اختلاف کیا ان کا یہ اختلاف ان کے توقیف کو جاننے سے پہلے ہوا ہو یا یہ اختلاف خاص ان سورتوں میں ہوا ہو جن میں

① ابوداؤد کتاب السنن ۱۲۲، ترمذی تفسیر سورۃ التوبہ، مسند احمد ۱، ۵۷۱، مسند رک ماکم ۱/۲۲۱



توقیف وارد نہ ہوئی ہو اور جن میں توقیف ہو ان میں اختلاف نہ ہوا ہو اور دوسری دلیل کا تجزیہ اس طرح ہو سکتا ہے کہ یہ اپنے ورود کے محل کے ساتھ خاص ہے اور وہ محل سورۃ الانفال، توبہ اور یونس ہیں لہذا اس سے پورے قرآن پر حکم کو عام کر دینا درست نہ ہوگا۔

**دوسرا قول** تمام سورتوں کی ترتیب آیات کی ترتیب کی طرح توقیفی ہے ان کی رسول ﷺ نے تعلیم دی ہے اور کسی بھی سورۃ کو آپ ﷺ کے حکم کے بغیر اپنی جگہ نہیں رکھا گیا اور رائے والوں کی دلیل یہ ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا اس مصحف پر اجماع ہے جو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دور میں لکھا گیا اور ان میں سے کسی نے بھی اس سے اختلاف نہیں کیا۔ اور ان حضرات کا اجماع صرف اسی صورت میں تام ہو سکتا ہے کہ جس ترتیب پر انھوں نے اجماع کیا ہے وہ توقیفی ہو اس لیے کہ اگر وہ اجتہاد سے ہوتی تو ان کے اختلاف کی وجہ سے مصاحف والوں کے درمیان بھی یقیناً اختلاف واقع ہوتا لیکن ان میں اختلاف واقع نہیں ہوا بلکہ انھوں نے اختلاف سے گریز کیا اور اپنی ترتیب سے بھی گریز کیا اور اپنے مصاحف سے روگردانی کی اور انھیں جلا دیا اور سب نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے مصحف اور ان کی ترتیب کی طرف رجوع کیا۔ اس کے بعد ان لوگوں نے اپنے مذہب کے لیے روایات کو نقل کیا جیسا کہ وہ دلائل ہیں جن پر اجماع کا دارومدار ہے۔

ان میں سے ایک روایت وہ ہے جسے امام احمد اور ابوداؤد نے حضرت حذیفہ ثقفی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا وہ فرماتے ہیں کہ ”میں بھی اس وفد میں تھا جو تھقیف قبیلہ میں سے اسلام لایا تھا.... آگے فرماتے ہیں کہ ہمیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ مجھ پر قرآن پاک کا ایک حزب پڑھنے سے رہ گیا تھا میں نے چاہا کہ جب تک اسے پورا نہ کر لوں اس وقت تک باہر نہ نکلوں ہم نے رسول اللہ ﷺ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے پوچھا کہ تم قرآن پاک کے حزب کس طرح کرتے تھے انھوں نے کہا کہ تین سورتیں، پانچ سورتیں، سات سورتیں، نو سورتیں، گیارہ سورتیں، تیرہ سورتیں۔ اور مفصل کا ایک حزب جو کہ سورۃ ”قی“ سے قرآن پاک کے آخر تک ہے۔ ان لوگوں نے کہا کہ یہ دلیل ہے کہ سورتوں کی ترتیب جیسے اس وقت مصاحف کے اندر ہے رسول اللہ ﷺ کے دور میں بھی اسی طرح تھی۔<sup>①</sup> لیکن ہمارے سمجھنے کے مطابق یہ دلالت واضح نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ سے ہی مدد مانگتے ہیں اس اعتراض سے نکلنے کے لیے مگر یہ کہ یہ حدیث حزب مفصل کے بارے میں خاص ہو بخلاف باقی احزاب کے۔

ان لوگوں نے اپنے مذہب کے لیے اس بات سے بھی استدلال کیا ہے کہ قرآن میں جو ہم حضرات میں ہیں ان میں ترتیب اور لگا تار پڑھنے کا التزام نہیں ہے اگر معاملہ اجتہاد کے ساتھ ہوتا تو اس تجانس و تماثل کا ہمیشہ لحاظ کیا جاتا حالانکہ ایسا نہیں ہے اس کی دلیل یہ ہے کہ مستحبات کے درمیان لگا تار ہونا مرتب نہیں ہے حالانکہ ان میں آپس میں مماثلت ہے کہ ان میں سے ہر ایک کو اللہ تعالیٰ کی تسبیح کے ساتھ شروع کیا گیا ہے بلکہ ان سورتوں کے درمیان سورۃ قد سمع، المحتحنة اور المنافقون کے ذریعے فصل کیا گیا ہے۔ نیز یہ بھی دلیل ہے کہ طسّمہ الشعراء اور طسّمہ القصص کے درمیان بھی مماثلت ہے لیکن یہ ایک دوسرے کے بعد نہیں آئیں بلکہ ان دونوں کے درمیان ان سے بھی چھوٹی سورت کے ذریعے فصل کیا گیا ہے اور وہ سورت ”طسّم“ ہے۔ ابو جعفر نحاس رضی اللہ عنہ نے بھی اس مذہب کی تائید کی ہے اور فرمایا کہ: ”مختار یہ ہے کہ اس ترتیب پر سورتوں کی تالیف رسول اللہ ﷺ کی طرف سے ہے جس کی دلیل حضرت واصلہ رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے کہ:

① مسند امام احمد ۹/۳ ابوداؤد فی شہر رمضان ۹

((اعطیت مکان التوراة السبع الطوال))۔

”مجھے تورات کی سب سے طویل ملی ہیں۔“

اسی طرح ابو بکر انباری نے بھی اس مذہب کی تائید کی اور فرمایا کہ:

”اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک کو آسمان دنیا کی طرف نازل کیا اس کے بعد میں سال سے زائد عرصہ میں اسے تھوڑا تھوڑا کر کے نازل کیا چنانچہ کسی پیش آنے والے معاملے کے بارے میں کوئی سورت نازل ہوتی اور کسی پوچھنے والے کے جواب کے طور پر کوئی آیت نازل ہوتی اور جبریل علیہ السلام نبی کریم ﷺ کو اس سورۃ، آیات یا حروف کی جگہ سے آگاہ فرماتے یہ سب کچھ نبی کریم ﷺ کی طرف سے ہوتا تھا اب جس نے بھی کوئی سورت مقدم کی یا مؤخر کی اس نے قرآن پاک کی ترتیب خراب کر دی۔“

ابن اشتر نے کتاب ”المصاحف“ میں ابن وہب عن سلیمان بن بلال کی سند سے نقل کیا کہ انھوں نے فرمایا کہ میں نے ربیعہ کو سنان سے پوچھا جا رہا تھا سورۃ البقرۃ اور آل عمران کو مقدم کیوں کیا گیا حالانکہ ان سے پہلے اسی سے بھی زائد سورتیں مکہ میں نازل ہوئیں اور یہ سورتیں مدینہ میں نازل ہوئیں؟ انھوں نے فرمایا کہ انھیں مقدم کیا حالانکہ قرآن پاک کو اس کی اجازت سے تالیف کیا گیا جس نے اس کی تالیف کی ہے.... یہاں تک کہ فرمایا کہ یہ وہ چیز ہے جس پر اکتفاء کیا جاتا ہے سوال نہیں کیا جاتا۔ اس مذہب کا تجزیہ مندرجہ ذیل طریقوں سے ممکن ہے۔

- ① جو روایت انھوں نے پیش کی ہے یہ اور ان جیسی مثالیں اپنے محل کے ساتھ خاص ہوتی ہیں لہذا توفیق کا حکم تمام کی طرف راجع نہیں ہو سکتا پھر یہ بھی ہے کہ یہ ترتیب کے توفیقی ہونے کا فائدہ دینے میں نئی ہے۔
- ② حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث جو قول اول کے بارے میں گزر چکی واضح ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ”سورۃ الانفال، التوبہ اور یونس کی ترتیب میں اجتہاد کیا تھا۔“

③ اجماع جس کا انھوں نے سہارا لیا تمام سورتوں کی ترتیب کے توفیقی ہونے پر دلالت نہیں کرتا اس لیے کہ اجماع میں شرط نہیں ہے کہ وہ تمام سورتوں کی ترتیب میں کسی نص کا سہارا لے بلکہ اتنا کافی ہے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم کو انھی کا اجتہاد جس کی وہ توفیق دیے گئے اس بات پر محمول کرے کہ وہ سورتوں کے بارے میں عثمان رضی اللہ عنہ کی ترتیب پر اجماع کر لیں اور اپنے مصاحف کی ترتیب کو چھوڑ دیں تاکہ امت کا کلمہ ایک ہو جائے اور فتنہ و نزاع کی جڑ ہی کٹ جائے۔ جب کہ ہر ایک کی رائے کو اس ترتیب پر چھوڑ دیا جائے۔

بعض سورتوں کی ترتیب نبی کریم ﷺ کی طرف سے توفیقی تھی اور بعض کی ترتیب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اجتہاد سے تھی۔ اس رائے کی طرف بڑے بڑے علماء گئے ہیں اور ہو سکتا ہے کہ یہ سب سے زیادہ بہتر رائے ہو۔ اس لیے کہ بہت سی احادیث ایسی وارد ہوئی ہیں جو بعض سورتوں کی ترتیب کا فائدہ دیتی ہیں۔ جیسا کہ رائے ثانی یعنی توفیق کے قائلین کی رائے میں گزر چکا اور دوسری بعض احادیث ایسی گزریں جو توفیق کا فائدہ دیتی ہیں بلکہ بعض آثار وارد ہوئے ہیں جو تصریح کرتے ہیں کہ بعض سورتوں میں ترتیب اجتہاد کی وجہ سے تھی جیسے ابھی حدیث گزری جو قول اول کے بارے میں تھی اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔

البتہ اس مذہب کی تائید کرنے والے اس بارے میں اختلاف کرتے ہیں کہ کن سورتوں کی ترتیب توقیفی ہے اور کن کی اجتہاد ہے؟ چنانچہ قاضی ابو محمد بن عطیہ نے فرمایا کہ: ”اکثر سورتوں کی ترتیب نبی کریم ﷺ کے زمانے میں ہی معلوم تھی جیسے سبع طول ﴿حَمْدٌ﴾ والی سورتیں اور مفصل، ان کے علاوہ باقی سورتوں کے بارے میں ممکن ہے کہ ان کا معاملہ امت کے سپرد کر دیا گیا ہو۔ ابو جعفر بن زبیر نے فرمایا کہ آثار، ابن عطیہ کی عبارت سے بڑھ کر شہادت دیتے ہیں اور ان میں بہت ہی قلیل سورتیں رہ جاتی ہیں جن میں اختلاف کا جاری ہونا ممکن ہو، جیسے آپ ﷺ کا قول کہ ”زہرا دین کو پڑھو! یعنی سورۃ البقرۃ اور آل عمران کو۔“ ①

جیسے حضرت سعید بن خالد بن ہنیو کی حدیث ہے کہ:

”رسول اللہ ﷺ نے ایک رکعت میں سبع طول کو پڑھا۔“ ②

اور اس میں یہ بھی ہے کہ ”آپ ﷺ ایک مفصل کو جمع کرتے تھے“ اور امام بخاری و بیہقی نے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہما سے روایت کیا کہ آپ ﷺ نے ”بنی اسرائیل“، ”کہف“، ”مریم“، ”طہ“، اور ”انبیاء“ کے بارے میں فرمایا کہ ”یہ عتاق اول میں سے ہیں اور یہ میری پرانی یاد کردہ سورتیں ہیں۔“ انھوں نے بھی نسیق میں اسی ترتیب کے مطابق پڑھا جو ترتیب قائم ہے۔ نیز صحیح بخاری میں ہے کہ آپ ﷺ جب بھی رات کو اپنے بستر پر تشریف لاتے تو ہر رات کو (یہ عمل کرتے کہ) اپنی دونوں ہتھیلیوں کو جمع کرتے اور ان میں پھونک مارتے اور ﴿قُلْ هُوَ اللَّهُ أَحَدٌ﴾ اور معوذتین پڑھتے۔ ③

سیوطی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ”شرح صدر جس مذہب کی طرف ہوتا ہے وہ بیہقی کا مذہب ہے، وہ یہ کہ سورۃ برأت اور انفال کے علاوہ تمام سورتوں کی ترتیب توقیفی ہے اور یہ مناسب نہیں کہ کسی سورۃ کو پہلے پڑھنے سے استدلال کیا جائے کہ اس کی ترتیب بھی اسی طرح ہے۔ اس سورت میں سورۃ نساء کو آل عمران سے پہلے پڑھنے والی حدیث کے ذریعے اعتراض لازم نہیں آئے گا اس لیے کہ قرأت میں سورتوں کی ترتیب واجب نہیں ہے اور ممکن ہے کہ یہ بیان جواز کے لیے کیا ہو۔

ہر حال میں معاملہ نرم ہے حتیٰ کہ زکریٰ رضی اللہ عنہ نے اس اختلاف کو لفظی بنانے کی کوشش کی اور فرمایا کہ ”دونوں فریقوں (یعنی یہ کہنے والے کہ ترتیب اجتہاد سے ہے اور یہ کہنے والے کہ ترتیب توقیفی ہے) کے درمیان اختلاف لفظی ہے، اس لیے کہ دوسرے قول والے کہتے ہیں کہ آپ ﷺ نے ان کی طرف اس ترتیب کا اشارہ کیا اس لیے کہ انھیں اس کے اسباب نزول اور مواقع کلمات کا علم تھا اسی وجہ سے مالک رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ انھوں نے قرآن پاک کو اسی ترتیب پر جمع کیا جسے وہ نبی کریم ﷺ سے سنا کرتے تھے حالانکہ ان کا قول ہے کہ سورتوں کی ترتیب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اجماع کی وجہ سے تھی لہذا اختلاف اس طرف لوٹنے گا کہ یہ تو توقیف تو لی وجہ سے ہے یا محض اسناد فعلی کی وجہ سے ہے اس لیے کہ اس میں ان کے لیے غور و فکر کی گنجائش باقی رہ جاتی ہے اس بارے میں جعفر بن زبیر نے سبقت کی ہے۔

① مسلم فی کتاب صلوة المسافرين و تعمرہ حدیث ۲۵۲

② مصنف ابن ابی شیبہ

③ بخاری کتاب فضائل القرآن باب ۱۳

## ترتیب کا احترام

خواہ سورتوں کی ترتیب تو قیفی ہو یا اجتہادی ہر صورت میں اس ترتیب کا احترام ضروری ہے خصوصاً مصاحف کی کتابت میں اس لیے کہ یہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اجماع کی وجہ سے ہے اور اجماع حجت ہے دوسری وجہ یہ ہے کہ اس ترتیب کا خلاف فتنہ کا باعث ہوگا اور فتنہ کا ازالہ اور فساد کے ذرائع کو روکنا واجب ہے۔

بہر حال تلاوت میں سورتوں کی ترتیب واجب نہیں بلکہ مستحب ہے۔ آپ کی خدمت میں امام نووی رحمہ اللہ کا قول پیش کیا جاتا ہے کیونکہ ان کی کتاب ”التبیان“ میں اس موضوع کے بارے میں آیا ہے اس کی عبارت مندرجہ ذیل ہے:

(ترجمہ) علماء نے فرمایا کہ:

((الاختیار ان یقرأ علی ترتیب المصحف... الخ)).

یعنی پسندیدہ یہی ہے کہ اسی ترتیب پر پڑھا جائے چنانچہ پہلے سورۃ فاتحہ، پھر بقرہ، پھر آل عمران اور پھر ان کے بعد والی سورتیں ترتیب کے مطابق پڑھی جائیں خواہ قرأت نماز میں ہو یا غیر نماز میں، یہاں تک کہ ہمارے بعض اصحاب نے فرمایا کہ جب پہلی رکعت میں سورۃ ﴿قُلْ اَعُوذُ بِرَبِّ النَّاسِ﴾ پڑھے تو دوسری رکعت میں سورۃ فاتحہ کے بعد سورۃ بقرہ پڑھے۔

ہمارے بعض اصحاب نے فرمایا کہ جب کوئی سورت پڑھے تو اس کے بعد والی سورت پڑھنا مستحب ہے، اس کی دلیل یہ ہے کہ مصحف کی یہ ترتیب کسی حکمت کی وجہ سے ہی ہے اس لیے ان کی محافظت کرنا چاہیے سوائے اس کے کہ شریعت میں اس کا کوئی استثناء وارد ہوا ہو، جیسے جمعہ کے دن صبح کی نماز کے بارے میں وارد ہوا ہے کہ پہلی رکعت میں سورۃ السجدہ اور دوسری رکعت میں ﴿هَلْ اَنْتَ عَلٰی الْاِنْسَانِ﴾ وارد ہوئی ہیں، اور نماز عید کے بارے میں پہلی رکعت میں ق اور دوسری رکعت میں ﴿اَفْتَرَبَّتِ السَّاعَةُ﴾ پڑھنا وارد ہوئی ہیں اسی طرح فجر کی دو رکعتوں کے بارے میں پہلی رکعت میں ﴿قُلْ يَا أَيُّهَا الْكَافِرُونَ﴾ اور دوسری رکعت میں ﴿قُلْ هُوَ اللهُ أَحَدٌ﴾ وارد ہوئی ہیں۔ اور وتر کی رکعات میں پہلی میں ﴿سَبِّحْ اسْمَ رَبِّكَ الْأَعْلَى﴾ دوسری میں ﴿قُلْ يَا أَيُّهَا الْكَافِرُونَ﴾ اور تیسری میں ﴿قُلْ هُوَ اللهُ أَحَدٌ﴾ اور معوذتین وارد ہوئی ہیں۔

اگر لگاتار پڑھے تو چھوڑ دے اور کوئی ایسی سورت پڑھے جو پہلی سورت کے ساتھ ملی ہوئی نہیں ہے یا ترتیب کو چھوڑ دے اور پہلے والی سورت کو پڑھے لے تو اس بارے میں بھی بہت سے آثار وارد ہوئے ہیں۔ حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے صبح کی پہلی رکعت میں سورۃ الکہف اور دوسری میں سورۃ یوسف پڑھی۔

ایک جماعت نے مصحف کی ترتیب کی مخالفت کو مکروہ قرار دیا۔ ابن ابوداؤد نے حسن سے روایت کیا کہ وہ قرآن پاک کو مصحف کی تالیف کے علاوہ پڑھے جانے کو مکروہ سمجھتے تھے اور وہ اپنی صحیح سند کے ساتھ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ انھیں کہا گیا کہ فلاں شخص قرآن پاک کو الٹا پڑھتا ہے انھوں نے فرمایا کہ اس کا دل الٹا ہے۔

باقی رہی یہ بات کہ سورۃ کو آخر سے اول تک پڑھنا کیسا ہے؟ یہ بالکل ممنوع اور قطعی ممنوع ہے اس لیے کہ اس سے اعجاز کی

بعض قسمیں ختم ہو جاتی ہیں اور آیات کی ترتیب کی حکمتیں زائل ہو جاتی ہیں چنانچہ ابن ابی داؤد ایک جلیل القدر تابعی امام نجفی رضی اللہ عنہ اور امام مالک بن انس رضی اللہ عنہما سے نقل کرتے ہیں کہ یہ حضرات اسے مکروہ سمجھتے تھے اور مالک اسے عیب دار سمجھتے تھے اور فرماتے تھے کہ: (هذا عظیم)۔ ”یہ بڑی سنگین بات ہے۔“

”جبکہ بچوں کو مصحف کے آخر سے ازل تک تعلیم دینا اچھا ہے اور یہ اس باب سے نہیں ہے اس لیے کہ یہ ایک زائد قرأت ہے جو چند گئے پنے ایام میں ہوتی ہے جس کے ذریعے انھیں حفظ کرنا آسان ہو جاتا ہے واللہ اعلم۔“

دو چھوٹے اشکال ① قرآن پاک کی ترتیب توفیقی کیسے تھی حالانکہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے مصاحف مختلف تھے۔؟

جواب ① جو لوگ کہتے ہیں کہ تمام سورتوں کی ترتیب اجتہادی ہے ان پر تو یہ شبہ وارد نہیں ہو سکتا اور جو لوگ کہتے ہیں قرآن پاک کے کچھ حصے کی ترتیب اجتہادی ہے اور کچھ کی ترتیب توفیقی ہے ان کی طرف سے آسان جواب یہ ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے درمیان جو اختلاف واقع ہوا وہ اجتہادی قسم میں ہو تو توفیقی قسم میں نہیں ہوا۔

اور جو لوگ کہتے ہیں کہ تمام سورتوں کی ترتیب توفیقی ہے ان کی طرف سے جواب اس طرح ممکن ہے کہ انھوں نے جو اختلاف کیا وہ توفیق کے علم سے پہلے کیا تھا جب عثمان رضی اللہ عنہ نے قرآن پاک کو اس ترتیب پر جمع کیا تو انھیں بھی اس چیز کا علم ہو گیا جسے وہ نہیں جانتے تھے اسی وجہ سے انھوں نے اپنے مصاحف کی ترتیب کو چھوڑ دیا اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی ترتیب کو اختیار کر لیا۔ ان کے مصاحف میں اختلاف کا معاملہ اس طرح بھی سمجھا جا سکتا ہے کہ وہ انفرادی مصاحف تھے وہ مصاحف انھوں نے لوگوں کے لیے نہیں لکھے تھے بلکہ اپنے لیے لکھے تھے۔ اب یہ بات بالکل واضح ہے کہ ان میں سے کوئی بھی شخص ان میں کچھ لکھتا تھا تو صرف وہی لکھتا تھا جو اسے اس کے انفرادی اجتہاد کے ذریعے پہنچا کبھی اس سے کوئی ایسی چیز بھی فوت ہو جاتی جو اس کے علاوہ کسی اور سے فوت نہیں ہوتی بلکہ کسی دینی تحقیق یا وسیع علم کے اسی وجہ سے ان انفرادی مصاحف میں کچھ ایسی آیات بھی ملتی تھیں جو منسوخ ہو چکی تھیں اور کبھی اس مصحف والے کو اس کا نسخ ہونا پہنچا نہیں ہوتا تھا اور کبھی اس مصحف والا اسے اسی طرح چھوڑ دیتا تھا کیونکہ اس کا نسخ مشہور ہو چکا ہوتا تھا اور اسے ختم کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی تھی۔ جیسا کہ وارد ہوا ہے کہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے نسخہ میں فاتحہ نہیں تھی بعض اوقات مصحف والا اپنے مصحف میں کوئی ایسی بات لکھ دیتا جو قرآن میں نہیں ہوتی تھی بلکہ کسی ضرورت کی وجہ سے لکھتا تھا جیسا کہ قنوت حنفیہ میں گزر چکا کسی صحابی نے اپنے مصحف میں کچھ لکھا ہوا تھا اور اس کا نام سورت الخلع والحفد رکھا ہوا تھا۔

دوسرا شبہ ② کہتے ہیں کہ قرآن پاک کی ترتیب کیسے توفیقی ہو سکتی ہے حالانکہ پیچھے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث گزر چکی کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے سورۃ الانفال اور سورۃ برأت کے بارے میں کچھ نہیں سنا بلکہ وہ ان کا اجتہاد اور نظر دیکھا تھا۔

جواب ② جو لوگ کہتے ہیں کہ ترتیب اجتہادی ہے ان کے قول کے مطابق تو یہ شبہ وارد ہی نہیں ہوتا اور جوگ کہتے ہیں کہ کچھ ترتیب اجتہادی ہے اور کچھ توفیقی ان کے قول کے مطابق بھی اشکال وارد نہیں ہوتا ازل تو ظاہر ہے اور ثانی اس لیے نہیں کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا یہ اجتہاد قرآن پاک کے اس حصے کے بارے میں تھا جس کی ترتیب کے بارے میں شارع کی طرف سے توفیق وارد نہیں ہوئی تھی۔

اور جن لوگوں کا قول ہے کہ تمام سورتیں توفیقی ہیں انھوں نے اس شبہ کے دو جواب دیے ہیں۔

”محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ“

- ① حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی یہ حدیث صحیح نہیں ہے اس لیے کہ اس کے راوی امام ترمذی رضی اللہ عنہ نے اس کی تخریج میں فرمایا کہ یہ ”حسن غریب“ ہے یہ یزید فارسی عن ابن عباس رضی اللہ عنہما کی سند کے علاوہ کسی بھی سند سے معروف نہیں ہے اور یہ ”یزید“ مجہول الحال ہے اس لیے اس کی اس حدیث پر اعتماد نہیں کیا جائے گا جو ترتیب قرآنی میں منفرد ہے۔
- ② اس کے صحیح ہونے کو فرض کر لیا جائے تو بھی ممکن ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کو جواب دینا توقیف کو جاننے سے پہلے تھا اس کے بعد انھیں علم ہو گیا۔ لیکن اس جواب پر اشکال وارد ہوتا ہے کہ روایت سے مستفاد ہوتا ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا جواب جمع قرآن اور ترتیب سور کے بعد تھا تو پھر توقیفی کیسے ہو گیا حالانکہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہما جامع اور مرتب ہیں اور توقیف کی دلیل نہیں جانتے؟





## قرآن پاک کی کتابت، رسم، مصاحف اور ان کے متعلقات کے بیان میں

① کتابت یہ بات تو مشہور و معروف ہے کہ امت عربیہ امت کے لقب سے موسوم تھی اس بات کے ساتھ مشہور تھی کہ وہ نہیں جانتی تھی کہ کتابت کیا ہے اور خط کیا ہے اور قرآن پاک بھی اس امت کی امت کو بیان کرتے ہوئے اس طرح گویا ہے کہ:

﴿هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا مِنْهُمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَإِنْ كَانُوا مِنْ قَبْلُ لَفِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ﴾ (البقرہ: ۱۲۹)

”وہی تو ہے جس نے ان بڑھوں میں انہی میں سے (محمد کو) پیغمبر بنا کر بھیجا جو ان کے سامنے انکی آیتیں پڑھتے اور ان کو پاک کرتے اور انہیں (خدا کی) کتاب اور دانائی سکھاتے ہیں۔ اور اس سے پہلے تو یہ لوگ صریح گمراہی میں تھے۔“

اس قاعدہ سے قریش کے بہت ہی قلیل لوگ مستثنیٰ تھے جنہوں نے اسلام سے پہلے لکھنا سیکھا اور پڑھا گویا کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ارہاس اور نبی کریم ﷺ کی بعثت کی تمہید، دین اسلام کی تثبیت اور قرآن کے ذریعے آپ ﷺ پر نازل ہونے والی وحی کی تکمیل تھی اس لیے کہ کتابت ”تنزیل مقدس“ کو محفوظ اور ضبط کرنے کا اہلی سبب ہے اور اس کا ضائع ہونا بھول جانا اس میں زیادہ بعید ہوتا ہے۔

مؤرخین کے الفاظ متفق ہیں کہ قریش مکہ نے خط و کتابت حرب بن امیہ بن عبد شمس کے علاوہ کسی بھی راستے نہیں سیکھی لیکن حرب نے کس سے سیکھی اس میں اختلاف ہے چنانچہ ابو عمرو دانی ذکر کرتا ہے کہ اس نے عبداللہ بن جدعان سے خط و کتابت سیکھی اور زیادہ بن انعم اس بارے میں یوں گویا ہے کہ ”میں نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے عرض کیا کہ اے قریش کی جماعت! کیا تم زمانہ جاہلیت میں عربی اس طرح لکھا کرتے تھے جس میں تم وہ چیزیں جمع کرتے ہو جو جمع ہیں اور ان چیزوں کو متفرق کرتے ہو جو متفرق ہیں الف لام اور میم کے ساتھ تم ہجاء کرتے ہو اور شکل و تقطیع بناتے ہو اور جو بھی چیزیں آج لکھی جاتی ہیں تم لکھتے ہو؟ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ ہاں میں نے عرض کیا کہ تمہیں کس نے کتابت سکھائی؟ فرمایا کہ حرب بن امیہ نے میں نے عرض کیا کہ حرب بن امیہ کو کس نے سکھایا؟ انھوں نے فرمایا کہ عبداللہ بن جدعان نے میں نے کہا کہ عبداللہ بن جدعان کو کس نے سکھایا؟ فرمایا کہ اہل انبار نے میں نے عرض کیا کہ اہل انبار کو کس نے سکھایا؟ فرمایا کہ ایک آنے والے نے جو ان کے پاس سین کے پہاڑوں کی طرف سے آیا تھا میں نے عرض کیا کہ اسے کس نے سکھایا فرمایا کہ خلیجان بن موہب نے جو اللہ تعالیٰ کے نبی ہود علیہ السلام کا کاتب تھا۔

جبکہ کلبی کی روایت ہمارے سامنے یہ بیان کرتی ہے کہ حرب نے کتابت بشر بن عبد الملک سے سیکھی اور اس روایت میں عوانہ کہتے ہیں کہ ”سب سے ہمارے اس خط یعنی خط جزم میں جس نے لکھا وہ مرا مر بن مرہ، السلم بن سدرہ اور عامر بن جدہ ہیں وہ

عرب کے قبیلٹی سے تھے انھوں نے سیدنا ہود علیہ السلام کے کاتب وحی سے سیکھا پھر انہوں نے اہل انبار کو سکھایا اور انھی سے کتابت عراق، حیرہ وغیرہ میں پھیل گئی پھر اسے دومۃ الجندل والے اکیدر بن عبد الملک کے بھائی بشر بن عبد الملک نے سیکھا اسے حرب بن امیہ کی صحبت حاصل تھی اس لیے کہ اس کی تجارت ان کے ہاں عراق کے علاقے میں تھی چنانچہ حرب نے اس سے کتابت سیکھی اس کے بعد بشر اس کے ساتھ سفر کرتے ہوئے مکہ آیا اور اس نے صہباء بنت حرب کے ساتھ نکاح کر لیا یہ اوسفیان کی بہن تھی چنانچہ اہل مکہ کی ایک جماعت نے اس سے کتابت سیکھی۔“

اسی وجہ سے ایک تعداد ملتی ہے جو اسلام سے قبل ہی لکھنا پڑھنا جانتی تھی لیکن امیوں کے اتنے بڑے جگھٹے کے سامنے یہ ایک چھوٹی سی مقدار تھی۔ اس بارے میں اہل دومۃ الجندل کا ایک شخص قریش پر احسان جلتا ہے ہونے کہتا ہے کہ:

لا تجحدوا نعماء بشر علیکم  
تم اپنے اوپر ہونے والے بشر کے انعام کو نہ جھٹلاؤ  
فقد کان میمون النقیبة ازھرا  
وہ بابرکت اور صاف شفاف رائے والا تھا  
من الھمال ما قد کان مبعثرا  
بہت سا مال جو کہ منتشر اور بکھرا ہوا تھا  
وضاہیتمو کتاب کسزی و قیصرا  
اور تم کسرئی اور قیصر کے کاتبین کے مشابہ ہو گئے  
وما زبرت فی الصحف اقلام حبیر  
اور حیر کے قلموں نے مصافح میں جو کچھ لکھا ان سے بھی مستغنی ہو گئے  
تم حیر قبیلے کی سند سے بھی مستغنی ہو گئے

یہ تو اہل مکہ تھے جبکہ اہل مدینہ کے درمیان اہل کتاب یہودی تھے نبی کریم ﷺ تشریف لائے تو ان میں ایک یہودی بچوں کو کتابت سکھاتا تھا اور ان میں دس سے بھی زائد افراد تھے جو کتابت اچھی طرح جانتے تھے جن میں سے منذر بن عمرو، ابی بن وہب، عمرو بن سعید اور زید بن ثابت رضی اللہ عنہم بھی تھے۔ اور یحییٰ زید بن ثابت رضی اللہ عنہم ہیں جنھوں نے نبی کریم ﷺ کے حکم سے یہود سے کتابت سیکھی۔

اسلام میں کتابت کا مقام ﴿﴾ کی کوشش کی اور کتابت کی شان برہنے لگی اور اس کا مقام بلند ہونے لگا۔ اگر آپ کو کوئی شک ہے تو دیکھیں یہ قرآن پاک کی وہ آیات ہیں جو شروع میں نازل ہوئیں ان میں حق تعالیٰ قلم کی مدح سرائی کرتا ہے اور قلم کے ذریعے اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو جو سکھاتا ہے اس کی مدح سرائی کرتا ہے چنانچہ فرماتا ہے کہ:

﴿اقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ ۝ خَلَقَ الْإِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۝ اقْرَأْ وَرَبُّكَ الْأَكْرَمُ ۝ الَّذِي عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ۝ عَلَّمَ الْإِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ﴾ (العلق: ۱-۵)

”(اے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اپنے پروردگار کا نام لے کر پڑھو۔ جس نے (عالم کو پیدا کیا) جس نے انسان کو خون

کی پینکی سے بنایا۔ پڑھو اور تمہارا پروردگار بڑا کریم ہے۔ جس نے قلم کے ذریعے سے علم سکھایا۔ اور انسان کو وہ باتیں سکھائیں جن کا اس کو علم نہ تھا۔  
اور ادھر سورۃ ”ن“ ہے جس میں اللہ تعالیٰ قسم کھا رہا ہے قلم کی اور جو وہ (قلم کے ذریعے) لکھتے ہیں اس کی چنانچہ فرمایا ہے کہ:

﴿وَإِنَّا لَنَعْلَمُ مَا تُسْطَرُّونَ ۖ مَا آتَتْ بِرِغْمَةٍ رَبِّكَ بِعَجُونٍ ۖ﴾ (القلم: ۲۰، ۲۱)

”ن قلم کی اور جو (اہل قلم) لکھتے ہیں اس کی قسم۔ کہ (اے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) تم اپنے پروردگار کے فضل سے دیوانے نہیں ہو۔“

ادھر رسول اللہ ﷺ ہے جو اپنے صحابہ رضی اللہ عنہم کو خط لکھنے اور کتابت میں مہارت حاصل کرنے پر آمادہ کر رہے ہیں اور ان کے لیے ہر ممکن شرعی وسیلے مہیا کر رہے ہیں۔

حتیٰ کہ وارد ہوا ہے کہ غزوہ بدر میں ساتھ مشرک قید ہوئے آپ ﷺ ان میں سے کسی ایک سے جو فد یہ قبول کرتے ان میں سے یہ بھی ہوتا کہ میرے صحابہ میں سے دس کو خط و کتابت سکھلاؤ اسی طرح رسول اللہ ﷺ نے اپنے عمل سے یہ اعلان کر دیا کہ پڑھنا اور لکھنا حریح کے برابر ہیں۔ یہی وہ انتہائی تھی جس کے نتیجے میں ایک امت غلامی سے آزادی حاصل کر پائی۔  
اسی طرح کے طریقے سے امت کے اندھیرے اسلام کے انوار سے ختم ہونا شروع ہو گئے اور اس کی جگہ علم، کتابت اور قراءت آ گئے اس سے یہ بات بہت واضح ہو جاتی ہے کہ اسلام علم، شہریت اور تمدن کا دین ہے۔

**نبی کریم ﷺ پڑھتے لکھتے تھے**  
یہاں تک کہا گیا کہ نبی کریم ﷺ نے اپنی آخری عمر میں پڑھنا لکھنا بھی سیکھ کے مقام پر قرآن جیسی کوئی بھی سورت لانے سے عاجز آ گئے گویا کہ اس میں حکمت یہ تھی کہ خط و کتابت کے شرف کی طرف اشارہ ہو جائے اور رسول اللہ ﷺ کی امت جو شروع عمر میں تھی وہی وقت حالت تھی جس کا تقاضا اقامت دلیل اور اعجاز نے کیا تھا جو محمد ﷺ کی نبوت اور رسالت اور واضح کرنے والی تھی اور اس بات کی وضاحت کرنی والی تھی کہ آپ ﷺ حق کے ساتھ معجزات ہیں جنہیں حق تعالیٰ نے اپنی مخلوق کی طرف بھیجا۔ اگر اس وقت آپ ﷺ پڑھنے لکھنے والے ہوتے اور امت ان پڑھ ہوتی تو ان کا شبہ پھیل جاتا کہ آپ ﷺ جو کچھ لائے ہیں وہ اطلاع و درس کا نتیجہ ہے اور کتابوں میں نظر و فکر اور بحث کا نتیجہ ہے۔  
اس معنی میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ:

﴿وَمَا كُنْتُمْ تَشْكُرُونَ مِنْ قَبْلِهِ مِنْ كِتَابٍ وَلَا تَحْطُلُهُ بِيَمِينِكُمْ إِذْ آتَاكُمُ الْمُطَلُونَ ۖ﴾ بَلْ هُوَ آيَاتٌ بَيِّنَاتٌ فِي

صُدُورِ الَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ ۚ وَمَا يَجْحَدُ بِآيَاتِنَا إِلَّا الظَّالِمُونَ ۖ﴾ (المکوث: ۴۹، ۴۸)

”اور تم اس سے پہلے کوئی کتاب نہیں پڑھتے تھے اور نہ اسے اپنے ہاتھ سے لکھ ہی سکتے تھے ایسا ہوتا تو اہل باطل ضرور شک کرتے۔ بلکہ یہ روشن آیتیں ہیں جن لوگوں کو علم دیا گیا ہے ان کے سینوں میں (محفوظ) ہیں ہماری آیتوں سے وہی لوگ

انکار کرتے ہیں، جو بے انصاف ہیں۔“

علامہ آلوسی رحمۃ اللہ علیہ اس آیت کی تفسیر کے بعد فرماتے ہیں کہ ”اس بات میں اختلاف ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نبوت کے بعد پڑھتے لکھتے تھے یا نہیں؟ بعض نے کہا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اچھی طرح سے کتابت نہیں کر سکتے تھے ”العقد یوبن“ میں بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے اسی قول کو اختیار کیا اور فرمایا کہ یہ اصح ہے اور بعض حضرات نے دعویٰ کیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کتابت کو نہیں جانتے تھے لیکن بعد میں جاننے والے بن گئے تھے۔ اور اسے نہ جانا معجزہ کے سبب تھا جو اس آیت میں بیان ہوا جب قرآن نازل ہو گیا اور خشک کرنے کا معاملہ ظاہر ہو گیا تو اس وقت آپ نے کتابت سیکھ لی۔“

ابن ابی شیبہ وغیرہ نے روایت کیا کہ: ”آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب تک پڑھ لکھ نہیں لیا تھا اس وقت تک آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو موت نہیں آئی تھی“ شعی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اسے نقل کیا اور اس کی تصدیق کی اور فرمایا کہ میں نے بہت سی اقوام کو یہ کہتے سنا اور آیت میں بھی اس کے منافی کچھ نہیں ہے۔“

ابن ماجہ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس رات مجھے سیر کرائی گئی جنت کے دروازے پر لکھا ہوا دیکھا کہ ”صدقہ دس گنا اور قرض اٹھارہ گنا“<sup>①</sup> پھر فرمایا کہ ”کتابت کے لیے بہت سی احادیث شاہد ہیں جو بخاری وغیرہ میں موجود ہیں جیسا کہ صلح حدیبیہ میں وارد ہے کہ ”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خط کو پکڑا آپ صلی اللہ علیہ وسلم ٹھیک طرح سے لکھ نہیں سکتے تھے چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے لکھا کہ یہ محمد بن عبداللہ کا فیصلہ ہے۔“<sup>②</sup>

یہ مذہب ابوذر عبد بن احمد ہروی، ابو فتح نسیا پوری اور مغارہ میں سے ابوالولید باجی کا ہے انھوں نے اسے سمنانی سے نقل کیا اور اس میں ایک کتاب لکھی اس کی طرف ابن مزین نے سبقت کی۔ ابوالولید نے جب یہ کہا تو انھیں طعن دیا گیا اور زندقہ ہونے کی تہمت لگائی گئی اور ممبر پر گالیاں دی گئیں اس کے بعد ان کے لیے مجلس قادم کی گئی اور انھوں نے اپنے دعویٰ پر دلیل قائم کی اسے اطراف کے علماء کی طرف لکھا گیا اور انھوں نے بھی انھی کے موافق جواب دیے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسی ہونے کے بعد کتابت کو جان لینا معجزہ کے منافی نہیں بلکہ یہ ایک اور معجزہ ہے اس لیے کہ یہ بغیر سیکھے ہے۔

بعض اکابرین نے باجی کی کتاب کی تردید کی اس لیے کہ صحیح حدیث میں ہے:

”ہم ایک اتی امت ہیں نہ لکھنا جانتے ہیں اور نہ حساب جانتے ہیں۔“<sup>③</sup>

اور فرمایا کہ احادیث میں جہاں کہیں بھی ”کتب“ (لکھا) کا لفظ ہے وہاں معنی یہ ہوگا کہ ”امرو بالکتابۃ“ (کتابت کا حکم دیا) جیسا کہ کہا جاتا ہے کہ ”کتب السلطان بکذا الفلان“ (بادشاہ نے فلاں کے لیے یہ لکھا) اور اللہ تعالیٰ کے قول میں ”من قبلہ“ کا ”ولا تمخطہ“ پر مقدم ہونا گویا کہ اس بات میں صریح ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مطلقاً نہیں لکھا۔ اور درمیان والی قید کا مابعد کی طرف راجع ہونا بے محل ہے۔

① ابن ماجہ صدقات: ۱۹

② بخاری کتاب الصلح، ۶، مسلم کتاب الجہاد، ۹۲، ابوداؤد کتاب الجہاد، ۱۵۶، دارمی کتاب السیر، ۶۳، مسند احمد، ۴/۲۹۸

③ بخاری کتاب الصوم باب ۱۳، مسلم کتاب الصوم باب ۱۵، ابوداؤد کتاب الصوم باب ۴، نسائی کتاب الصیام باب ۱۷، مسند احمد، ۲/۱۲۲

بعض اکابرین نے سمجھا کہ اس کا رجوع ماقبل اور مابعد دونوں کی طرف ہے چنانچہ انھوں نے کہا کہ اس سے مفہوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ کتاب کے نازل ہونے کے بعد لکھنے اور پڑھنے دونوں پر قادر تھے اگر یہ اعتبار نہ ہوتا تو کام اعتبار سے خالی ہوتا۔ اور آپ جانتے ہیں کہ اگر ذکر کردہ رجوع کو تسلیم کر لیا جائے تو فائدے والا معاملہ تام نہیں ہوتا سوائے اس کے کہ مفہوم کی حجیت کا قول نہ کیا جائے جبکہ یہ گمان کرنے والا خود اس کی حجیت کا قائل نہیں ہے۔

اس کے بعد علامہ آلوسی رحمۃ اللہ علیہ اس رد کو باطل قرار دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:

”یہ بات مخفی نہیں کہ آپ ﷺ کا فرمان کہ ”ہم ایک اتی ہیں نہ لکھتے ہیں نہ حساب جانتے ہیں“ یہ کتابت کی نفی کے استمرار میں نص نہیں ہے ہو سکتا ہے کہ یہ اس اعتبار سے ہو کہ جب آپ ﷺ کو مبعوث کیا گیا اس وقت آپ اور وہ لوگ جن کی طرف آپ ﷺ کو بھیجا گیا یعنی آپ کے سامنے جو عرب لوگ تھے ان میں سے اکثر لوگ اتی ہوں اور لکھنا اور حساب کرنا نہ جانتے ہوں اب بعد میں اکثر لوگوں میں امیت کا وصف باقی نہ رہنا مضرب نہیں ہے۔ اور جو ذکر کیا کہ ”کتاب“ کی تاویل ”امر بالکتابت“ کے ساتھ یہ خلاف ظاہر ہے۔

صحیح مسلم کی شرح میں نووی رحمۃ اللہ علیہ نے قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ سے نقل کرتے ہوئے فرمایا کہ:

”ہماری ذکر کردہ روایت میں یہ کہنا کہ ”ولا یحسب یکتب فکتب“ (آپ ﷺ اچھی طرح سے لکھنا نہیں جانتے تھے چنانچہ آپ ﷺ نے لکھا) گویا کہ یہ تصریح ہے کہ آپ ﷺ نے خود لکھا اب اس سے مجاز کی طرف جانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ پھر فرمایا کہ ”اس مسئلہ میں ہر گروہ نے بات کو لسب کر دیا اور ہر گروہ نے اس مسئلہ میں دوسرے کو طنز و تشنیع کی ہے۔“ فاللہ تعالیٰ اعلم... الخ۔

میں کہتا ہوں کہ تشنیع کرنا نہ علماء کا طریقہ ہے اور نہ ہی محققین کا ادب ہے اور جس مسئلہ کو ہم نے چھیڑ رکھا ہے وہ اجتہادی ہے اور اس قسم کے مسائل میں ضروری ہے کہ جوادہ راجح ہوں ان سے حکم لگایا جائے خواہش نفس کی بنا پر نہ لگایا جائے۔ جب ہم نے دونوں فریقین کے دلائل کا جائز لیا تو ہم ملاحظہ کرتے ہیں کہ امیت والے دلائل قطعی ہیں اور ﴿کَتَبَ﴾ اور ﴿حَظَّ بِيَمِينِهِ﴾ والے دلائل ظنی اور غیر یقینی ہیں اور کسی نے بھی ان کے قطعی اور یقینی ہونے کا دعویٰ نہیں کیا۔ پھر اس کے اور اُس کے درمیان تعارض ظاہر ہے لیکن یہ تعارض بھی ظاہری ہے اس کا رفع اس طرح ممکن ہے کہ امیت والے دلائل کو ہم پہلے حالات پر محمول کرتے ہیں اور کتابت والے دلائل کو آخری حالات پر محمول کرتے ہیں۔ اور یہ بات ادلہ کو جمع کرنے کے لیے ہے ورنہ اس میں کوئی شک نہیں کہ ادلہ کو جمع کرنا بہتر طریقہ ہے نسبت اس کے کہ بعض کو عمل دیا جائے اور بعض کو عمل چھوڑا جائے جب تک دونوں میں قوت استدلال ہو اور جب تک کسی بھی حال میں انھیں جمع کرنا ممکن ہو اور اگر جمع کرنا ممکن نہ ہو تو اس وقت قطعی کو قبول کرنے اور ظنی کو رد کرنے میں کوئی جھگڑا نہیں اس لیے کہ اول نسبت ثانی کے اقوی ہے۔ اور

﴿وَإِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِي مِنَ الْحَقِّ شَيْئًا﴾ (البقرہ: ۲۸)

”اور گمان حق بات کے مقابلے میں کچھ بھی فائدہ نہیں دیتا۔“

یہی میزان صحیح ہے تاکہ تعارض ختم ہو جائے اور ترجیح قائم ہو جائے اور اختلاف و اشتباہ... ت اسی کا فیصلہ کرو۔

﴿وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوَىٰ فَيُضِلَّكَ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ﴾ (ص: ۲۶)

”اور خواہش کی پیروی مت کرو نہ اللہ کے راستے سے بھٹک جاؤ گے۔“

## قرآن پاک کی کتابت

جب ہم نے آپ کے سامنے عربی خط و کتابت کے بارے میں ایک تاریخی لب لباب پیش کر دیا تو آپ کی نظر کو اس طرف پھیرتے ہیں کہ ہم نے بحث جمع قرآن میں کتابت قرآن کی بحث کو (صفحہ ۲۳۲ سے صفحہ ۲۵۶ تک) پوری طرح بیان کر دیا اور وہاں ذکر کر دیا تھا کہ قرآن پاک کیسے لکھا گیا؟ اور کس چیز میں لکھا گیا اس کے بعد حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے دور میں اور پھر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دور میں کیسے لکھا گیا۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ اور آپ ﷺ کے صحابہ رضی اللہ عنہم کا اہتمام ایک اعلیٰ اہتمام تھا اس اہتمام پر آپ کی رہنمائی اس طرح ہو سکتی ہے کہ آپ ﷺ کے کچھ کاتبین تھے جو آپ کی وحی لکھتے تھے جن میں سے خلفاء اربعہ، حضرت معاویہ، ابان بن سعید، خالد بن ولید، ابی بن کعب، زید بن ثابت، ثابت بن قیس، ارم بن ابی اور حنظلہ بن ربیع رضی اللہ عنہم وغیرہ حضرات تھے جب آپ ﷺ پر کوئی چیز نازل ہوتی تو آپ ﷺ ان کا ہاتھ میں سے کسی کاتب کو بلاتے اور جو نازل ہوا ہوتا اس کی کتابت کا حکم دیتے اگرچہ ایک کلمہ ہی کیوں نہ ہو جیسا کہ مروی ہے کہ جب

﴿لَا يَسْتَوِي الْقَعْدُونَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ عَزَّوَالِي الضَّرَّ وَالْمُهْجَرُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنْفُسِهِمْ﴾ (النساء: ۹۵)

”نہیں برابر ہو سکتے وہ ایمان والے جو بغیر عذر کے بیٹھ رہتے ہیں اور وہ مجاہد جو اللہ تعالیٰ کے راستے میں اپنے مال اور جانوں سے جہاد کرتے ہیں۔“

نازل ہوئی تو ابن ام مکتوم رضی اللہ عنہ اور حضرت عبد اللہ بن جحش رضی اللہ عنہ نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ! ہم دونوں نابینا ہیں کیا ہمارے لیے کوئی رخصت ہے؟ اس پر اللہ تعالیٰ نے ”غیر اولی الضر“ (بغیر عذر والے) نازل کیا۔

آپ نے فرمایا کہ ”کندھے کی ہڈی اور دوات لے آؤ“ اور حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کو حکم دیا کہ اسے لکھ دو انھوں نے لکھ دیا۔ حضرت زید رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ”گویا کہ میں کندھے کی ہڈی کے جوڑے کے پاس اس کی جگہ کو دیکھ رہا ہوں۔“ اور بخاری کی روایت میں صرف اس مقام پر عبد اللہ بن ام مکتوم پر اکتفاء کیا اس میں ابن جحش نہیں ہے۔

شاید آپ کو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہم کی حدیث یاد ہوگی کہ ”رسول اللہ ﷺ پر جب کوئی سورت نازل ہوتی تو آپ ﷺ کسی کاتب کو بلاتے اور فرماتے کہ ”اس آیت کو اس جگہ رکھو جہاں فلاں فلاں بات لکھی ہوئی ہے۔“ نیز آپ ﷺ نے فرمایا کہ ”جس نے میری طرف سے کچھ لکھا اور قرآن کے علاوہ ہوتا اسے منادینا چاہیے۔“ اور حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے زید بن ثابت رضی اللہ عنہ سے ارشاد فرمایا کہ تم ایک نوجوان آدمی ہو ہم آپ پر کوئی تہمت نہیں لگاتے کیونکہ آپ رسول اللہ ﷺ کی وحی کو لکھنے والے تھے۔



اس کے ساتھ یہ بھی ملا لیں کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم قرآن پاک کو ان چیزوں میں لکھتے تھے جو بھی انھیں میرا آتی تھیں حتیٰ کہ ہڈیوں میں، کپڑے کی کتروں میں، کھجور کے درخت کی شاخوں میں اور پتلے پتھروں میں وغیرہ وغیرہ۔ یہ ایسی چیز ہے جو دلالت کرتی ہے کہ وہ حضرات اس عظیم الشان معاملہ میں کس طرح ابتلاء میں رہے تھے۔

**رسم مصحف** مصحف کے رسم سے مراد وہ وضع ہے جسے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے قرآن پاک کے کلمات اور حروف کی کتابت میں پسند فرمایا، مکتوب میں اصل یہ ہے کہ وہ منطوق کے پوری طرح موافق ہو اس میں کسی قسم کی کمی یا زیادتی نہ ہو اور نہ ہی کوئی تبدیلی یا تفسیر ہو لیکن مصاحف عثمانیہ میں اس قاعدے کو چھوڑ دیا گیا ہے چنانچہ اس میں بہت سے حروف ایسے پائے گئے ہیں جن کا رسم ادا سے نطق کے مخالف ہے، یہ کئی معزز اغراض کی بناء پر تھا جو آپ کو بعد میں معلوم ہوں گی۔

قرآن پاک کے رسم کے بارے میں علماء کرام نے بڑے اہتمام سے کلام کیا ہے اور اس بارے میں بھی کلام کیا ہے کہ یہ کلمات جن کا رسم آیا ہے یہ ان کے الفاظ کے پیمانے کے مطابق نہیں ہے۔ بعض حضرات نے اس میں منفرد تاالیفات لکھی ہیں جن میں سے امام ابو عمرو دوانی بھی ہیں کہ انھوں نے اس میں ایک کتاب لکھی جس کا نام ”المقتع“ رکھا گیا۔ نیز علامہ ابو عیاض مراکشی بھی ہیں جنہوں نے اس میں ”عنوان الدلیل فی رسمو خط التنزیل“ نامی کتاب لکھی۔ نیز ان میں سے علامہ شیخ محمد بن احمد بھی ہیں جو اتوبی کے نام سے مشہور ہیں اس لیے کہ انھوں نے ایک نظم لکھی جس کا نام ”اللؤلؤ المنظوم فی ذکر جملہ من المرسمو“ رکھا اس کے بعد علامہ مرحوم شیخ محمد خلف حسینی آئے جو کہ مصر کے شہروں میں قاریوں کے استاذ تھے انھوں نے اس منظوم کی شرح کی، اور اس شرح کا حاشیہ بھی لگا یا اور اس کتاب کا نام ”مرشد الحیوان الی معرفة ما یحب اتباعہ فی رسم القرآن“۔

**قواعد رسم مصحف** مصحف عثمانی کے خط اور رسم کے کچھ قواعد ہیں جنہیں علماء نے چھ قواعد میں منصر کیا ہے۔

① حذف ② زیادتی ③ ہمزہ ④ بدل ⑤ فصل و وصل ⑥ اور جن میں دو قرائتیں ہیں وہ ان میں سے ایک مطابق پڑھی جاتی ہیں۔ اور اب آپ کی خدمت میں کچھ اجمال کے ساتھ پیش خدمت ہے تاکہ اس کے اور ہمارے زمانے کے اس اصطلاحی خط کے درمیان فرق واضح ہو جائے جو آپ کے سامنے ہے۔

① **قاعدہ حذف** اس کا خلاصہ ہے کہ ”یا“ نداء کے الف کو حذف کر دیا جائے جیسے ”یا ایہا الناس“ اور ہائے تنبیہ کا بھی جیسے ”ہانتہم“ اور کلمہ ”نا“ کا جبکہ وہ ضمیر کے ساتھ ملا ہو جیسے ”انھینکم“ اور لفظ جلالہ سے جیسے ”انہ“ کا اور کلمہ ”الہ“ کا بھی، الرضن اور سخن کا اور لام کے بعد جیسے خلف اور دولا موں کے درمیان جیسے ”الکلالہ“ پر تثنیہ میں جیسے ”رجلن“ اور ہر جمع سے مذکر یا مؤنث کی تصحیح کے لیے جیسے ”تفغون، المؤمنات“ اور ہر کسی جمع سے جو مفائل کے وزن پر ہو جیسے ”المساجد“ اور ”النصاری“ اور ہر عدد سے جیسے ”ثلث، بسملہ“ سے اور ”مثال“ وغیرہ کے امر کے شروع سے وغیرہ (سوائے ان کلمات کے جو اس سے مستثنیٰ ہیں)

اور یاء کو حذف کیا جاتا ہے ہر منقوص منون سے رفع اور جر کی صورت میں جیسے ”غیر باغ ولا عاد“ اور ان کلمات سے ”اطیعون، اتقون، خافون، ارہبون، فارسون، وعبدون“ (سوائے مستثنیات کے)

اور واؤ کو حذف کیا جاتا ہے جبکہ دوسری واؤ کے ساتھ واقع ہو جیسے ”لا یستون، فأو، الی الکھف“ اور لام کو حذف کیا جاتا ہے جبکہ وہ لام میں مدغم ہو جیسے ”الیل“ اور ”الذی“ (سوائے مستثنیات کے)۔



اس جگہ بعض حذف ایسے ہیں جو کسی قاعدے کے تحت داخل نہیں ہیں جیسے "مالک" کے کلمہ سے الف اور "ابراہیم" کے کلمہ سے یاء، اسی طرح افعال اربعہ میں سے واؤ کا حذف "ویدعو، الانسان، ویمحو اللہ الباطل، یومر ییدعو الداع، سندعو الزبانیہ۔"

① زیادتی کا قاعدہ ● اس کا خلاصہ یہ ہے کہ ہر جمع والے اسم یا وہ اسم جو جمع کے حکم میں ہو اس کے آخر میں الف زیادہ کرنا جیسے "ملا قوارہم، بنو اسرائیل، اولو الالباب" اور ہمزہ مرسومہ کے بعد واؤ کو زیادہ کرنا جیسے "تالله تفتا" کو "تالله تفتؤ" لکھا جاتا ہے اور کلمات "مائة، مائتین، الظنون، الرسول" اور "السبیل" میں جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ:

﴿ وَ تَطْفُونُ بِاللَّهِ الظُّنُونَا ۝﴾ (الاحزاب: ۱۰)

﴿ وَ اطعنا الرسولَا ۝﴾ (الاحزاب: ۶۶)

﴿ فَأَصْلُونَا السَّبِيلَا ۝﴾ (الاحزاب: ۶۷)

اور ان کلمات میں "یاء" کو بڑھایا جاتا ہے جیسے "نبأ، اناء، من تلقاء، بابکم المفتون، باید" جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ:

﴿ وَ السَّبَاءُ بَيْنَهُمَا يَأْتِينِ ۝﴾ (الذاریات: ۳۷)

اور کچھ کلمات کے شروع میں واؤ کو بڑھایا جاتا ہے جیسے: "اولو، اولیک، اولاء، اولات۔"

② ہمزہ کا قاعدہ ● اس کا خلاصہ یہ ہے کہ ہمزہ جب ساکن ہو تو اپنے ما قبل کی حرکت کے مطابق لکھا جاتا ہے جیسے "اذن، اوتمن، البأساء" (سوائے مستثنیات کے)

جبکہ ہمزہ تحرکہ اگر کلمہ کے شروع میں ہو اور اس کے ساتھ کوئی حرف زائد بھی ہو تو مطلقاً الف ہی لکھا جاتا ہے خواہ وہ مفتوح ہو یا کسورہ جیسے "ایوب"، "اولو"، "إذا"، "سأصرف"، "سأنزل"، "قبأی"۔ (سوائے مستثنیات کے)

اور جب ہمزہ درمیان میں ہو تو اسے اپنی حرکت کی جنس کے حرف سے لکھا جاتا ہے جیسے "سأل، سُئِلَ، تقروء" سوائے مستثنیات کے اور اگر ایک طرف کو ہو تو اپنے ما قبل کی حرکت کی جنس کے مطابق لکھا جائے گا۔ جیسے "سبأ، شاطئ، لؤلؤ" (سوائے مستثنیات کے) اور اگر اس کا ما قبل ساکن ہو تو وہ مخدوف ہوتا ہے جیسے "ملء الارض یخرج الخبء" (سوائے مستثنیات کے) اور سب میں مستثنیات کثرت کے ساتھ ہیں۔

③ قاعدہ بدل ● اس کا خلاصہ یہ ہے کہ "الف" کو "واؤ" لکھا جاتا ہے تاکہ اس کی عظمت شان ظاہر جائے جیسے "الصلوة، الزکوٰۃ، الحیوة" (سوائے مستثنیات کے)

اور "یاء" لکھا جاتا ہے جبکہ وہ یاء سے بدل ہو جیسے "یتوفکم، یا حسرتی، یا اسفی" اسی طرح ان کلمات میں الف کو یاء لکھا جاتا ہے "الی، علی، ائی جمعنی کیف؟، معنی، ہلی، حتئی، لدی، سوائے" "لدا الباب" کے جو سورۃ یوسف میں آتا ہے وہ الف کے ساتھ لکھا جاتا ہے۔

نون تا کید خفیفہ میں نون کو الف لکھا جاتا ہے نیز کلمہ اذن میں بھی۔ اور "ہاء" تانیث کو تاء مفتوحہ لکھا جاتا ہے جیسے "رحمت" جو سورۃ البقرۃ، اعراف، حم، مریم، روم اور زخرف میں آیا ہے اور "نعمت" جو سورۃ بقرۃ آل عمران، مائدہ، ابراہیم، نحل، لقمان، فاطر اور

طور میں آیا ہے اور "لعنت اللہ" اور کلمہ "معصیت" میں جو سورۃ "قد سمع اللہ" میں آیا ہے اور ان کلمات میں "ان شجرت الزقوم، قرت عین، جنت نعیم، بقیۃ اللہ" اور "امرأۃ" کے لفظ میں جبکہ اس کی اضافت اس کے شوہر کی طرف ہو رہی ہو جیسے "امرات عمران" اور "امرات نوح" وغیرہ۔

⑤ **وصل و فصل کا قاعدہ** ● اس کا خلاصہ یہ ہے کہ کلمہ "آن" کا کلمہ "لا" کے ساتھ وصل ہوگا جبکہ "لا" اس کا بعد آیا ہو البتہ دس مقامات اس سے مستثنیٰ ہیں جیسے "ان لا تقولوا"، "ان لا تعبدوا الا اللہ"۔

اور کلمہ "من" کا "ما" کے ساتھ وصل ہوگا جب وہ اس کے بعد آئے اور اس قاعدہ سے "من مالکت ایمانکم" جو سورۃ النساء اور روم میں واقع ہوئے ہیں اور سورۃ النافین میں "من مارزقناکم" مستثنیٰ ہیں۔ اور کلمہ "من" کو مطلقاً "من" کے ساتھ ملایا جائے گا۔

اور کلمہ "عن" کو کلمہ "ما" کے ساتھ ملایا جائے گا، سوائے اللہ تعالیٰ کے قول ﴿عَنْ مَا نُهَوُّ عَنْهُ﴾ (سورۃ الاعراف: ۱۶۶) اور کلمہ "ان" کو "ما" کے ساتھ ملایا جائے گا اگر وہ اس کے بعد آئے سوائے اللہ تعالیٰ کے قول ﴿وَ اِنْ مَا تُرِيَدُ لَكَ﴾ (الرعد: ۴۰) کے۔ اور کلمہ "آن" کو بھی مطلقاً "ما" کے ساتھ ملایا جائے گا اس میں کوئی استثناء نہیں۔

اور کلمہ "کل" کو بھی ما بعد آنے والے "ما" کے ساتھ ملایا جائے گا سوائے اللہ تعالیٰ کے ﴿كُلَّمَا رُزِقُوا إِلَى الْفِتْنَةِ﴾ (النساء: ۹۱) اور ﴿قِنْ كُلِّ مَا سَأَلْتُمُوهُ﴾ (ابراہیم: ۳۴) کے اور کلمات "نعنا" "زینما" "کانما" اور "ویکان" کو بھی ملا کر پڑھا جائے گا۔

① **قاعدہ جس میں دو قراءتیں ہوں** ● اس کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک کلمہ جب دو طرح سے پڑھا جائے تو اسے ان میں سے ایک کے رسم کے ساتھ لکھا جائے گا جیسا کہ مندرجہ ذیل کلمات کو مصحف میں بغیر الف کے لکھا جاتا ہے۔ ﴿مَلِيكَ يَوْمَ الدِّينِ﴾ ﴿يُخَيِّعُونَ اللّٰهَ﴾ ﴿وَعَدْنَا مُوسَىٰ﴾ ﴿تَفَاخُوْهُمْ﴾ وغیرہ اور یہ سب کلمات الف کے اثبات اور حذف دونوں طرح پڑھے جاتے ہیں۔ اسی طرح مندرجہ ذیل کلمات تائے مفتوحہ کے ساتھ لکھے جاتے ہیں ﴿عَلِيَّتِ الْجُبِّ﴾ ﴿يوسف: ۱۵﴾ ﴿اَنْزَلَ عَلَيْهِ اَنْثٰ﴾ (الانکبوت: ۵۰) ﴿تَمْرِيْتٍ مِّنْ اَكْمَامِهَآ﴾ (نمل: ۴۷) ﴿وَهُمْ فِي الْغُرُوْبِ اَوْمُوْنَ﴾ ﴿سبا: ۳﴾ یہ اس لیے کہ یہ کلمات جمع ہیں اور انہیں جمع اور واحد دونوں طرح پڑھا جاتا ہے اور اس کے علاوہ ایسے کلمات اور بہت سے ہیں آپ کو مثال دینے اور وضاحت کرنے کے لیے اتنے ہی کافی ہیں جو ہم نے ذکر کر دیے۔

## رسم عثمانی کی خصوصیات و کمالات

اس رسم کے کئی نوید و کمالات ہیں۔

پہلا فائدہ ● حتی الامکان ایک کلمہ میں مختلف قراءات کی طرف دلالت ہو جاتی ہے، وہ اس طرح کہ رسم کا قاعدہ میں یہ لحاظ رکھا جاتا ہے کہ ایک کلمہ میں جب دو یا دو سے زائد قراءتیں ہوتی ہیں تو اس طرح لکھی جاتی ہے کہ اس میں ان قراءتوں کا احتمال بھی ہوتا ہے پھر اگر ایک حرف اس کا احتمال نہ رکھتا ہو اس طرح کہ اختلاف قراءت سے حرف کی صورت بدل جاتی ہو تو

حرف مائل العسرفان فی علوم القسردان : جلد ۱

رسم اس حرف پر ہوگا جو اصل قاعدہ کے خلاف ہوتا کہ اس کے ذریعے جواز قراءت اور حرف کے ذریعے اصل معلوم ہو جائے اور جب کسی کلمہ میں ایک ہی قرأت ہو تو اس کا رسم اس حرف پر ہوگا جو اصل ہے جیسے ﴿إِنْ هَذَا مِنْ لِسَانِكَ﴾ (ظ: ۶۳) یہ ایسے کلمہ کی مثال ہے جو ایک صورت میں لکھا گیا اور متعدد صورتوں میں پڑھا جاتا ہے۔ (اب آپ دیکھیں) کہ یہ مصحف عثمانی میں ”ان ہذان لساحران“ لکھا ہوا ہے یعنی نہ نقطہ ہے نہ اعراب نہ ”ان“ اور ”ہذان“ کے نون میں شد ہے اور نہ جزم اور نہ ہی ہذان کے ذال کے بعد الف ہے اور نہ ہی یاء۔

اب رسم میں آپ دیکھ رہے ہیں کہ اس طرح آیا ہے کہ اسے چار وجوہ پر پڑھا جاسکتا ہے اور یہ چاروں وجوہ صحیح سند کی طرف لوٹتی ہیں۔

- ① نافع ویشیہ کی قرأت جو ”ان“ کے نون کو شد دیتے ہیں اور ”ہذان“ کے نون کو الف کے ساتھ تخفیف دیتے ہیں۔
- ② ابن کثیر کی قرأت جو کہ ”ان“ میں نون کو مخفف کرتے ہیں اور ”ہذان“ میں نون کو مشد د کرتے ہیں۔
- ③ حفص ویشیہ کی قرأت جو کہ ”ان“ میں نون کو مشد د کرتے ہیں اور ”ہذان“ میں الف کے ساتھ۔
- ④ ابو عمر کی قرأت جو کہ ان میں تشدید اور ”ہذین“ میں یاء اور نون کی تخفیف کرتے ہیں۔ غور فرمائیں کہ یہ مثالی طریقہ قرأت کی وجوہ کے لیے ایک ضابطہ ہے تاکہ آپ کو معلوم ہو جائے کہ ہمارے نیک اسلاف مصحف کے بارے میں رسم عثمانی کے قواعد میں ہم سے زیادہ دور نظری اور ہم سے زیادہ سیدھا راستہ رکھتے تھے۔

**دوسرا فائدہ** مختلف معانی کا فائدہ دینا ایسے طریقے کے ساتھ جو تقریباً ظاہر ہوں جیسے ﴿أَمْ قَوْمٌ يَكُونُ عَلَيْهِمْ وَكَيْلًا﴾ (النساء: ۱۰۰) کے کلمہ میں قطع کرنا اور اللہ تعالیٰ کے قول ﴿أَقْمِنُ يَتَشَبَّهُ سَوِيًّا عَلَى صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ﴾ (اللہ: ۲۲) میں وصل کرنا۔ اس لیے کہ ”اقمن“ اس طرح لکھا گیا ہے یعنی میم اول کو میم ثانی میں مدغم کر دیا گیا ہے اور ان دونوں کی کتابت ایک میم مشد کی صورت میں کی گئی ہے اور کتابت میں ام اول کا قطع اس بات پر دلالت کرنے کے لیے ہے کہ یہ ”ام“ منقطعہ ہے جو بل کے معنی میں ہے اور ام ثانیہ جس کا وصل کیا گیا ہے اس بات پر دلالت کرنے کے لیے ہے کہ یہ اس کی طرح نہیں ہے۔

**تیسرا فائدہ** کسی دقیق اور مخفی معنی پر دلالت کرنے کے لیے جیسے ”آئین“ میں یاء کی زیادتی جو کہ اللہ تعالیٰ کے قول: ﴿وَالسَّمَاءَ بَنَيْنَاهَا بِأَيْدِينَا وَرَأَيْنَا كُوفِينَ﴾ (الذريات: ۴) اور اسی طرح ”ہائید“ لکھا گیا ہے یہ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کی قوت کی تعظیم کی طرف اشارہ ہو جائے۔ جس نے آسمان کو بنایا نیز اس صرف اشارہ ہو جائے کہ اس کی قوت کے مشابہ کوئی نہیں۔ یہ اس قاعدہ مشہورہ پر متفرع ہوتا ہے کہ:

(زیادۃ المبنی تبدل علی زیادۃ المعنی)۔

”الفاظ کی زیادتی معنی کی زیادتی پر دلالت کرتی ہے۔“

ان افعال اربعہ کی کتابت بھی اسی قبیل سے ہے ”ویدعو الانسان، ویمحو اللہ الباطل، یوم یدع الداع، سندعو الزبانیۃ“ کہ ان میں واؤ کو حذف کیا گیا اور مصحف عثمانی میں اس طرح لکھا گیا ”ویدع الانسان، ویمح اللہ الباطل، یوم یدع الداع، سندع الزبانیۃ“ لیکن تمام کے تمام بغیر نقطے اور اعراب کے ہیں۔

علماء نے فرمایا کہ ان کے حذف میں راز یہ ہے کہ ﴿وَيُنْعِ الْإِنْسَانَ﴾ (الاسراء: ۱۱) میں دلالت ہے کہ یہ دعا انسان پر آسان ہے وہ اس میں جلدی کرتا ہے جیسے وہ جھلائیوں میں جلدی کرتا ہے بلکہ اس کی طرف شکر و ثابت کرنا اپنی ذات کے اعتبار سے خیر سے زیادہ قریب ہے اور ”ومح انہ الباطل“ میں واؤ کو حذف کرنے میں اشارہ ہے کہ وہ بڑی ہی جلد ختم اور مضعل ہو جائے گا۔ اور ﴿يَوْمَ يُنْعِ الدَّاعِ﴾ (القدر: ۶۰) میں واؤ کو حذف کرنے میں اشارہ ہے دعا کی جلدی کی طرف اور تمیز کی بھی جلدی کی طرف اور ﴿سَنَنْعُ الزَّكَايَةَ﴾ (الطن: ۱۸) میں واؤ کو حذف کرنے میں سرعت فعل اور ﴿الزَّكَايَةَ﴾ (مخصوص فرشتے جو جنہیوں کو آگ کی طرف دھکیلیں گے) کی جلدی سے بات ماننے اور ان کی گرفت کی قوت پر۔

ان اسرار کو رکاشی و پختہ کا قول جمع کرتا ہے (ترجمہ) ان چار کلمات سے انہیں حذف کر دینے میں راز یہ ہے کہ فعل فاعل پر جلدی اور سہولت کے ساتھ واقع ہو جاتا ہے نیز وجوہ میں منفعل یعنی اس سے متاثر ہونے والے کے سختی کے ساتھ قبول کرنے کی طرف اشارہ ہو جاتا ہے۔

**چوتھا فائدہ** اصل حرکت پر دلالت، جیسے کسرہ کو یا لکھنا۔ اللہ تعالیٰ کے مندرجہ ذیل قول میں ﴿وَلِإِنِّي ذِي النُّقْرٰنِ﴾ (نمل: ۹۰) میں اس لیے کہ اس کی کابت اس طرح ہے ﴿وَلِإِنِّي ذِي النُّقْرٰنِ﴾ (نمل: ۹۰) ہیں اسی طرح ﴿سَّوْرٰنِکُمْ دَارَ الْفٰسِقِیْنَ﴾ (الاعراف: ۱۳۵) میں ضمہ کی کابت واؤ کے ساتھ ہے اس لیے کہ ﴿سَّوْرٰنِکُمْ﴾ اس طرح لکھا گیا ہے اسی طرح اصل حرف پر دلالت جیسے ”الصلوة“ اور ”الزکوٰۃ“ کو ”الصلوٰۃ“ اور ”الزکوٰۃ“ لکھا گیا ہے تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ ان میں الف، واؤ سے منقلب ہے (بغیر نقطے اور اعراب کے جیسا کہ گزرا)

**پانچواں فائدہ** بعض لغات فصیح کا فائدہ جیسے ہائے تائید کو تائے مفتوحہ کی شکل میں لکھنا تاکہ طلی کی لغت کی طرف اشارہ ہو جائے اور اس قسم کی مثالیں گزر چکیں اور جیسے اللہ تعالیٰ کا قول ﴿يَوْمَ يَأْتُ لَا تَنْكَلُمُنَّ نَفْسٌ اِلَّا بِاٰذٰنِهٖ﴾ (حدود: ۱۰۵) یہاں ”یأتی“ کو ”یأت“ کے حذف کے ساتھ لکھا گیا ہے اور ”یأت“ اس طرح لکھا گیا ہے تاکہ ہذیل کی لغت کی طرف اشارہ ہو جائے۔

**چھٹا فائدہ** لوگوں کو اس بات پر ابھارنا کہ قرآن پاک کو ثقہ رجال سے حاصل کریں اور اس رسم عثمانی کے مطابق نہ بولیں جو فی الجملہ منطوق کے مطابق صحیح واقع نہیں ہوئی۔

اس فائدے کے ضمن میں دو خوبیاں اور بھی ہیں۔

① قرآن پاک کے الفاظ، ان کے اداء کے طریقے، حسن ترتیل اور اس کی تجوید میں توفیق۔ اس لیے کہ مصحف سے یہ چیزیں علی وجہ الیقین معلوم ہونا ناممکن ہے جہاں رسم کا قاعدہ اور اس کی کابت کی اصطلاح ہوگی وہ طاعت کندہ غلطی کرتا ہے اور بعض اوقات قاری پر تجوید کے بعض احکام بھی مخفی رہ جاتے ہیں جیسے قلقلہ، اظہار، ادغام، روم اور اشام وغیرہ چہ جائیکہ کہ اس کی تطبیق کا اثناء۔ اسی وجہ سے علماء نے طے کیا ہے کہ صرف مصاحف پر اعتماد کرنا جائز نہیں بلکہ اداء اور قرأت میں پختگی بھی ضروری ہے کہ وہ کسی ثقہ حافظ سے حاصل کرے اور اگر آپ کو کوئی شک ہے اپنے رب کی قسم سے مجھے بتلائے کہ کیا صرف اکیلے مصحف خواہ کوئی بھی ہو پڑھنے والے کو سورتوں کے آغاز کے صحیح تلفظ پر رہنمائی کر سکتا ہے؟ جیسے کھبعض، حم عسق، طسم؟ اسی باب سے روم اور اشام

منابہ العرفان فی علوم القرآن: جلد ①

بھی ہیں۔ جیسے اللہ تعالیٰ کے قول "مالک لا تا مناع علی یوسف" میں "لا تا مناعا" کے لفظ ہیں۔

**دوسری خوبی** • سند کا رسول اللہ ﷺ تک متصل ہونا اور یہ اس امت اسلامیہ کی خصوصیات میں سے ہے جس کی وجہ سے یہ امت باقی امتوں سے ممتاز ہوئی۔

ابن حزم نے کہا ثقہ کا ثقہ سے نقل کرنا اور اسے اتصال کے ساتھ نبی پاک ﷺ تک پہنچا دینا یہ ایسی چیز ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے ذریعے مسلمانوں کو تمام ملتوں پر خصوصیت دی اور ارسال و اعضاء یہ تو یہود کی بھی بہت سی کتابوں میں پایا جاتا ہے لیکن وہ اس میں موسیٰ علیہ السلام کے اتنے قریب نہیں ہوتے جتنا کہ ہم محمد ﷺ کے قریب ہوتے ہیں بلکہ وہ توقف کرتے ہیں اور اتنا توقف کرتے ہیں کہ ان کے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے درمیان تیس صدیوں کا فاصلہ ہوتا ہے وہ تو محض شمعون علیہ السلام وغیرہ تک پہنچ سکتے ہیں اس کے بعد فرمایا کہ جبکہ نصاریٰ ان کے پاس اس طرح کی نقل سوائے طلاق کی تحریم کے کوئی نہیں اور ایسی نقل جو ایسی سند پر مشتمل ہو جس میں کذاب یا مجہول بعین ہوں وہ یہود و نصاریٰ کے نقل میں کثیر ہیں اور باقی رہے صحابہ اور تابعین کے اقوال! یہود کے لیے تو ممکن ہی نہیں کہ وہ کسی نبی کے صحابی یا تابعی تک پہنچ جائیں اور نصاریٰ کے لیے بھی ممکن نہیں کہ وہ شمعون اور بولس سے اوپر پہنچ سکیں۔

## کیا مصحف عثمانی کا رسم توقیفی ہے

مصحف کے بارے میں علماء کی تین آراء ہیں۔

**پہلی رائے** یہ توقیفی ہے اس کے خلاف جائز نہیں یہ جمہور کا مذہب ہے انھوں نے استدلال یوں کیا کہ نبی کریم ﷺ کے کا تین تین تھے جو وہی کو نقل کرتے تھے انھوں نے قرآن پاک کی کتابت فعلاً اسی طرح سے کی تھی اور رسول اللہ ﷺ نے انھیں ان کی کتابت پر برقرار رکھا آپ ﷺ کا زمانہ گزر گیا اور قرآن پاک اسی حالت پر تھا اسی میں کسی قسم کی کوئی تبدیلی رونما نہیں ہوئی تھی بلکہ وارد ہوا ہے کہ آپ ﷺ کا تین وحی کے لیے قرآن پاک کی رسم اور کتابت کے بارے میں قواعد وضع کیا کرتے تھے اسی وجہ سے آپ ﷺ نے اپنے کاتب وحی حضرت معاذیہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا کہ "ودات کو درست رکھو! اور قلم کو تیزھا کا نو! سین کو جدا جدا کر کے لکھو اور ہم کو مت مٹاؤ اور اللہ کو اچھا کر کے لکھو الرحمن کو لبا کر اور الرحیم کو خالی چھوڑ دو اور قلم اپنے بائیں کان پر رکھو یہ یاد دہانی کا بڑا سبب ہوگا۔"

اس کے بعد حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ تشریف لائے اور انھوں نے بھی قرآن پاک کو اسی رسم کے مطابق محفوظ میں لکھا پھر انھیں کے نقش قدم پر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اپنی خلافت میں چلے اور ان صحف کو اسی طرز پر لکھوایا اور نبی کریم ﷺ کے صحابہ رضی اللہ عنہم نے حضرت ابو بکر اور عثمان رضی اللہ عنہم کے اس عمل کو برقرار رکھا حتیٰ کہ معاملہ اس کے بعد تابعین تک پہنچا اور پھر صحابہ تابعین تک پہنچا کسی نے بھی اس رسم کی مخالفت نہیں کی اور کہیں منقول نہیں کہ کسی نے یہ سوچا ہو کہ اس رسم کو تبدیل کر کے کسی دوسری رسم میں لکھ دے جو تالیف کے فردغ۔ بہت سے مشاغل اور علوم کے تقدم کے زمانے میں رونما ہو گئے۔ بلکہ رسم عثمانی محترم ہو کر باقی رہی مصاحف کی کتابت میں اسی کی نہایت کی گئی اس کے استقلال کو کسی نے نہیں چھیڑا اور نہ ہی اس کی چراگاہ کو کسی نے مباح سمجھا۔



اس دلیل کا خلاصہ یہ ہے کہ مصاحف عثمانیہ کا رسم کئی امور کی وجہ سے کامیاب ہوا ان میں سے ہر ایک اسے اہمیت اور وجوب اتباع کے لائق بنا دیتا ہے۔ ان امور میں سے رسول اللہ ﷺ کا اس پر برقرار رکھنا، اس کے دستور کا حکم دینا، صحابہ رضی اللہ عنہم کا اجماع جو کہ بارہ ہزار سے زیادہ تھے پھر اس کے بعد تابعین اور ائمہ مجتہدین کے دور میں اس پر امت کا اجماع۔ اور آپ جانتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کی اتباع ان چیزوں میں واجب ہے جن چیزوں کا آپ ﷺ نے حکم دیا یا اس پر برقرار رکھا۔ اس یہ کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ:

﴿قُلْ إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ اللَّهَ فَاتَّبِعُونِي يُحْبِبْكُمُ اللَّهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ﴾ (آل عمران: ۳۱)

”آپ فرمادیجئے کہ اگر تم اللہ تعالیٰ سے محبت کرتے ہو تو میری اتباع کرو! اللہ تعالیٰ تم سے محبت کرے گا اور تمہارے گناہوں کو معاف کر دے گا۔“

اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے نقش قدم کی پیروی کرنا بھی واجب ہے، خصوصاً خلفاء راشدین کی اتباع، اس لیے کہ حضرت عباس بن ساریہ رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے جس میں آپ ﷺ فرماتے ہیں کہ: ”تم میں سے جو شخص زندہ رہے گا وہ عنقریب بہت سے اختلافات دیکھے گا تم پر میری اور میرے بعد خلفاء راشدین کی سنت لازم ہے انہیں داڑھوں کے ذریعے مضبوط تمام لو۔“<sup>①</sup> اور اس میں کوئی شک نہیں کہ امت کا اجماع خواہ کسی بھی زمانے میں ہو واجب الاتباع ہے خصوصاً عصر ازل میں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ:

﴿وَمَنْ يُشَاقِقِ الرَّسُولَ مِنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدَىٰ وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيلِ الْمُؤْمِنِينَ نُوَلِّهِ مَا تَوَلَّىٰ وَنُصَلِّهِمْ جَهَنَّمَ وَسَاءَتْ مَصِيرًا﴾ (النساء: ۱۱۵)

”اور جو شخص سیدھا راستہ معلوم ہونے کے بعد پیغمبر (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی مخالفت کرے اور مؤمنوں کے راستے کے سوا اور راستے پر چلے تو جہدہ رہ چلتا ہے ہم اسے ادھر ہی چلنے دیں گے اور (قیامت کے دن) جہنم میں داخل کریں گے اور وہ بری جگہ ہے۔“

جن لوگوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی کتابت پر اجماع امت کو نقل کیا ان میں سے ایک صاحب متقع بھی ہیں جو سند کے ساتھ حضرت مصعب بن سعد رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ انھوں نے فرمایا کہ: ”میں نے لوگوں کو پایا جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے مصاحف کو ضائع کیا تو انھیں یہ اچھا لگا اور کسی نے بھی اس پر کوئی عیب نہیں لگایا“ اسی طرح شارح عقلیہ نے بھی حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت کیا کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے مسلمانوں کے ہر لشکر کی طرف ایک مصحف بھیجا اور انھیں حکم دیا کہ ”اس کے خلاف کسی کے پاس کوئی بھی مصحف ہو تو وہ اسے جلا دے۔“ اور کوئی بھی نہیں جانا گیا کہ جس نے ان مصاحف عثمانیہ کے رسم کی مخالفت کی ہو۔ مصحف کی ان اصطلاحات پر اجماع کا انعقاد دلیل ہے کہ ان سے عدول جائز نہیں۔ اللہ تعالیٰ امام خراز پر رحم کرے وہ فرماتے ہیں:

① ابوداؤد کتاب السنۃ، ۵، ترمذی کتاب العلم، ۱۰۶، ابن ماجہ مقدمہ، ۶، دارمی مقدمہ، ۱۶، مسند احمد، ۱۲۶/۳

و بعدہ جردہ الامام  
اس کے بعد امام نے اسے بے اعراب کر دیا  
و لا یكون بعدہ اضطراب  
اور اس کے بعد کوئی اضطراب نہ ہو  
و قصة اختلافهم شهيرة  
ان کے اختلاف کا قصہ مشہور ہے  
فینسعی لاجل ذا ان نقتفی  
اس وجہ سے ہمیں چاہیے کہ اقتداء کریں  
و نقتدی بفعله وما رأى  
و نقتدی بفعله وما رأى  
اور ہم اقتداء کریں ان کے فعل اور رائے کی

فی مصحف لیقتدی الانام  
ایک مصحف میں تاکہ سب لوگ اس کی اقتداء کریں  
وکان فیما قد رأى صواب  
وکان فیما قد رأى صواب  
اور ان کی رائے میں درستی تھی  
کقصۃ الیمامۃ العسیرہ  
کقصۃ الیمامۃ العسیرہ  
جیسا کہ یمامہ کا قصہ تنگی والا  
مرسوم ما اصله فی البصیفی  
مرسوم ما اصله فی البصیفی  
اسی رسم کی جس کی اصل مصحف میں ہے  
فی جعله لمن یخط ملجاء  
فی جعله لمن یخط ملجاء  
جسے انھوں نے لکھنے والے کے لیے ذریعہ حفاظت بنایا

## رسم عثمانی کے التزام میں علماء کرام کے اقوال

سخاوی رضی اللہ عنہ نے اپنی سند کے ساتھ فرمایا کہ حضرت مالک رضی اللہ عنہ سے پوچھا گیا کہ آپ کی کیا رائے ہے کہ اگر کوئی شخص مصحف لکھوانا چاہے تو آپ کا کیا خیال ہے کہ وہ ان جوں کی طرح لکھ سکتا ہے جنہیں آج کل لوگوں نے بنایا ہوا ہے؟ انھوں نے فرمایا میں اسے جائز نہیں سمجھتا بلکہ وہ پہلے طریقہ کتابت پر ہی لکھے۔ سخاوی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ امام مالک رضی اللہ عنہ کا مذہب ہی حق ہے اس لیے کہ اس میں پہلی حالت کی بقاء ہے تاکہ بعد و الا طبقہ اس سے سیکھ لے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ بعد والوں سے یہی بہتر ہے اس لیے کہ اس کے خلاف میں طبقہ اولیٰ میں پائی جانے والی اولیت سے لوگوں کو نا آشنا رکھنا لازم آتا ہے۔

ابو عمرو دانی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ”اس میں علماء امت کا کوئی بھی شخص مخالف نہیں ہے۔“ ابو عمرو دانی رضی اللہ عنہ نے یہ بھی فرمایا کہ امام مالک رضی اللہ عنہ سے قرآن پاک کے حروف کے بارے میں پوچھا گیا جیسے واؤ اور الف کے کیا انھیں مصاحف میں تبدیل کیا جا سکتا ہے اگر اس میں ایسی کوئی چیز ہے؟ انھوں نے فرمایا کہ نہیں۔ ابو عمرو نے فرمایا کہ اس سے مراد وہ الف اور واؤ زائدہ ہیں جو رسم میں لفظ معدوم ہیں جیسے ”اولو“ امام احمد بن حنبل رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ واؤ، الف یا یا وغیرہ میں مصحف عثمانی کے خط کی مخالفت کرنا حرام ہے۔

”المنج فی نقد الشافعیہ“ کے حواشی میں ہے کہ ”کلمہ“ ”الربا“ ”کو“ ”واؤ“ اور ”الف“ کے ساتھ لکھا جاتا ہے جیسا کہ رسم عثمانی میں ہے اور قرآن پاک میں اس کلمہ کو یا ء کے ساتھ یا الف کے ساتھ نہیں لکھ سکتے۔ اس لیے کہ ان کا رسم ایک سنت ہے جس کی اتباع کی جاتی ہے۔

محیط بر بانی جو نقد حنفی میں ہے میں آیا ہے کہ ”(ترجمہ) مصحف کو رسم عثمانی کے بغیر لکھنا نہیں چاہیے“ علامہ نظام الدین نیساوی نے فرمایا کہ (ترجمہ) ائمہ کی ایک جماعت نے فرمایا کہ قراء، علماء، اور اہل کتاب پر واجب ہے کہ وہ مصحف کے خط میں اس رسم

## منامیل العسرفان فی علوم القرآن: جلد ۱

کی اتباع کریں اس لیے کہ یہ رسم حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کی ہے اور یہ رسول اللہ ﷺ کے امین تھے اور وحی کے کاتب تھے۔ بیہقی نے شعب الایمان میں فرمایا کہ ”جو شخص مصحف لکھے اسے چاہیے کہ اسے انہی حرف ہجاء کے مطابق لکھے جن کے مطابق یہ مصاحف لکھے گئے اور ان کی مخالفت نہ کرے اور انھوں نے جو کچھ بھی لکھا اسے تبدیل نہ کرے کیونکہ وہ کثیر علم والے سچے دل والے سچی زبان والے اور عظیم ترین امانت والے تھے اب ہمارے لیے مناسب نہیں کہ اپنی طرف سے ان کی درستگی کریں۔

اس پہلی رائے کا تجزیہ اس طرح ممکن ہے کہ ان کے بیان کردہ دلائل اس رسم کے بغیر قرآن کی کتابت کے حرام ہونے پر دلالت نہیں کرتے ہیں اس لیے کہ اس میں نہ گناہ والی ذانت اور وعید ہے اور نہ ہی حرام والی نہی اور دھمکی ہے۔ اس میں زیادہ سے زیادہ رسم عثمانی پر کتابت کے جواز، اس کی وجاہت اور وقت پر دلالت ہے اور یہ اتفاق و تسلیم کا محل ہے۔

**دوسری رائے** رسم عثمانی اصطلاحی ہے تو فیقی نہیں اس بناء پر اس کی مخالفت جائز ہے اس رائے کی طرف ابن خلدون اپنے مقدمہ میں مائل ہوئے ہیں۔ قاضی ابوبکر نے ”الانتصار“ میں فرمایا کہ ”کتابت کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے امت پر کچھ بھی فرض نہیں کیا اس لیے قرآن پاک کے کاتبین اور مصاحف لکھنے والوں میں سے کسی سے معین رسم نہیں حاصل کی گئی کہ یہی واجب ہو اور اس کے علاوہ کو ترک کرنا واجب ہو اس لیے کہ اس کا وجوب صحیح و توقیف سے ہی معلوم ہوا ہے اور کتاب کی عبارتوں اور ان کے مفہوم میں ایسا نہیں ہے کہ قرآن پاک کا رسم اور اس کا ضبط ایک مخصوص طریقے اور ایک محدود حد کے علاوہ جائز ہی نہ ہو اور اس سے تجاوز نا جائز ہو اسی طرح سنت رسول ﷺ بھی کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو اسے واجب کرتی ہو یا اس پر دلالت کرتی ہو اجماع امت میں بھی اس کو واجب کرنے والی کوئی چیز نہیں نیز قیاسات شریعہ اس پر دلالت نہیں کرتے۔

بلکہ سنت رسول دلالت کرتی ہے کہ رسم کسی بھی طریقے پر آسان جائز ہو، ہے اس لیے کہ رسول اللہ ﷺ اس کے رسم کا حکم دیتے اور کوئی معین طریقہ بیان نہیں کرتے اور نہ ہی کسی طریقے پر کتابت سے کسی کو منع فرماتے اسی وجہ سے مصاحف کے خطوط مختلف ہیں بعض ایسے ہیں جو الفاظ کو ان کے خرج کے مطابق لکھتے ہیں اور بعض وہ ہیں جو کمی زیادتی کرتے ہیں اس لیے کہ انھیں علم ہے کہ یہ اصطلاحی ہے اور لوگوں پر حال مخفی نہیں ہے اسی وجہ سے اسے کوئی خط کے مطابق لکھنا بھی جائز ہے اور خط اذل کے ساتھ بھی اور لام کو کاف کی صورت میں لکھنا بھی جائز ہے اور ایقنات کو کثیرھا کرتا بھی جائز ہے۔ اور اس کے علاوہ بھی دیگر وجوہ سے لکھنا جائز ہے اور یہ بھی جائز ہے کہ قدیمی خط اور ہجاء کے ساتھ لکھا جائے اور یہ بھی جائز ہے کہ مصحف کو جدید خطوط اور ہجاء کے ساتھ لکھا جائے اور ان کے درمیان بھی جائز ہے۔

جب مصاحف کے خطوط اور اس کے اکثر حروف مختلف ہیں اور ان کی صورتیں متغیر ہیں اور لوگوں نے اسے جائز بھی قرار دیا اور یہ بھی جائز قرار دیا کہ ہر شخص اپنی عادت کے مطابق لکھے اور آسان اور مشہور ترین اور اولیٰ ترین طریقے سے لکھے نہ اس میں کوئی گناہ ہے اور نہ ہی کوئی منکر تو اس سے معلوم ہوا کہ اس بارے میں لوگوں پر کوئی مخصوص حد منقول نہیں ہوئی جیسا کہ قرأت اور اذان میں منقول ہے۔

اس کا سبب یہ ہے کہ خطوط علامات اور رسم ہیں جو ارشادات، عقود اور سوم کے قائم مقام ہیں اور ہر رسم کلمہ پر دلالت کرتی ہے اور اس کی قرأت کی وجہ کے لیے مقید ہے اس کی صحت واجب اور کاتب کی تصویب ضروری ہے خواہ وہ کسی بھی وجہ پر ہو۔

بالمجہ جو بھی دعویٰ کرے کہ لوگوں پر رسم مخصوص واجب ہے اس پر اپنے دعویٰ پر دلیل قائم کرنا ضروری ہے اور کہاں سے دلیل لائے... الخ۔

اس مذہب کا تجزیہ اس طرح کیا گیا ہے۔

① وہ دلائل جو جہور نے اپنے مذہب کی تائید میں بیان کیے ہیں وہ بالکل آپ کے سامنے بالکل قریب ہیں بعض سنت سے ہیں بعض صحابہ، تابعین اور تبع تابعین کے اجماع کے ساتھ ہیں۔

② ان کا یہ دعویٰ کرنا کہ سنت رسول اللہ ﷺ کی نصوص میں کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو اسے واجب کرتی ہو یہ دعویٰ مردود ہے کیونکہ پیچھے گزر چکا کہ رسول اللہ ﷺ نے کاتبین وحی کو اس پر برقرار رکھا جن میں سے زید بن ثابت رضی اللہ عنہ بھی ہیں جنہوں نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو مصحف لکھا اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے مصاحف لکھے اور ابھی حدیث گزری کہ جس میں رسول اللہ ﷺ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے فرما رہے ہیں کہ: "دوات کو درست رکھو اور قلم کو تر چھا کا لو... الخ۔"

③ قاضی ابوبکر کا کہنا کہ اسی وجہ سے مصاحف کے خطوط مختلف ہیں... الخ یہ مسلم نہیں کیونکہ اجماع قائم ہو چکا اور مستفہد بھی ہو چکا اور لوگ رسم توقیفی سے واقف ہو چکے اور وہ رسم عثمانی تھا۔

اس موقع پر ہم مزید ذکر کرتے ہیں کہ علامہ ابن مبارک رضی اللہ عنہ نے اپنے شیخ عارف باللہ عبد العزیز دباغ سے نقل کرتے ہوئے اپنی کتاب "الابریہ" میں فرمایا کہ "قرآن کا رسم اللہ تعالیٰ کے اسرار میں سے ایک سر ہے جس کا مشاہدہ کیا جاتا ہے اور اس کی کمال رفعت کو ظاہر کرتا ہے۔" ابن مبارک نے فرمایا کہ میں نے ان سے عرض کیا کہ کیا "الصلوة، الزکوٰۃ، الحیوۃ اور مشکوٰۃ" میں جو واو الف کا بدل ہے اور "ساوریکم، اولئک، اولاء اور اولات" میں واو کی زیادتی اور "ہذہم، ملائکہ، بایکہ اور باید" میں "یا" کی زیادتی؟ کیا یہ تمام چیزیں نبی پاک ﷺ یا صحابہ رضی اللہ عنہم سے صادر ہیں؟ انہوں نے فرمایا کہ "یہ نبی کریم ﷺ سے صادر ہیں، آپ ﷺ نے ہی اپنے صحابہ میں سے کاتبین کو حکم دیا کہ وہ انہیں اسی صورت پر لکھیں اور انہوں نے نہ کی نہ زیادتی بلکہ جو نبی پاک ﷺ سے سنا وہی لکھا" میں نے عرض کیا کہ علماء کی جماعت نے رسم کے معاملہ میں رخصت دی ہے اور کہا کہ یہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی اصطلاح ہے وہ اس میں اس طریقے پر چلے جس پر قریش زمانہ جاہلیت میں لکھا کرتے تھے اور یہ صحابہ رضی اللہ عنہم سے اس لیے صادر ہوا کہ قریش نے اہل حیرہ سے کتابت سیکھی اور اہل حیرہ ربا کو واو کے ساتھ بولا کرتے تھے لہذا انہوں نے ان کی زبان کے مطابق لکھا اور قریش الف کے ساتھ بولا کرتے تھے ان کی واو کے ساتھ کتابت غیر کی زبان اور ان کی تقلید کی بناء پر تھا حتیٰ کہ قاضی ابوبکر باقلانی نے فرمایا کہ "ہر وہ شخص جو دعویٰ کرتا ہو کہ لوگوں پر رسم مخصوص واجب ہے اس پر ضروری ہے کہ وہ اپنے دعویٰ پر دلیل قائم کرے کیونکہ کتاب و سنت اور اجماع میں کوئی بھی ایسی دلیل نہیں ہے جو اس پر دلالت کرتی ہو۔"

صحابہ اور ان کے علاوہ کسی کے لیے بھی رسم قرآن بلکہ ایک بال میں بھی کوئی اختیار نہیں ہے یہ تو صرف نبی کریم ﷺ کی طرف سے توقیفی ہے آپ ﷺ نے ہی انہیں حکم دیا کہ وہ اسے ہیئت معروضہ پر لکھیں یعنی الف کی زیادتی کے ساتھ لکھیں اس لیے کہ اس میں ایسے اسرار ہیں جن تک عقول پہنچ نہیں سکتیں۔ جیسے نظم قرآنی معجز ہے اسی طرح اس کا رسم بھی معجز ہے اور عقل اس راز تک کیسے پہنچ سکتی ہے کہ صافہ میں الف کو زیادہ کیا گیا ہے "فتنہ" میں نہیں اسی طرح "باید" اور "بایکہ" میں یا کو زیادہ کیا گیا اور

﴿سَعَوْ﴾ (سورۃ الحج: ۵۱) میں الف کو زیادہ کیا گیا اور ﴿سَعَوْ﴾ (انسا: ۵) میں کم کیا گیا اور ﴿عَتَوْ﴾ (جہاں ① بھی ہو) میں الف کی زیادتی اور ﴿عَتَوْ﴾ (الفرقان: ۲۱) میں الف کی کمی اسی طرح "امنوا" میں الف کی زیادتی اور "جاؤ، ② جاؤ، ③ تبوءوا، ④ اور فاؤ ⑤" میں اس کا نہ ہونا اور ﴿يَعْفُوا الَّذِي﴾ (البقرہ: ۲۳۷) میں الف کی زیادتی اور ﴿يَعْفُو عَنْهُمْ﴾ (انسا: ۹۹) میں الف کا نہ ہونا؟ یا کیسے عقل پہنچ سکتی ہے کہ متشابہ کلمات میں سے بعض کو حذف کیا گیا اور بعض کو نہیں جیسے سورۃ یوسف میں اور زخرف میں الف کو حذف کرنا اور "المہیعاد" میں الف کو مطلقاً ثابت رکھنا اور سورۃ الانفال میں اسے حذف کر دینا اور "بیراجا" جہاں بھی واقع ہوا ہے میں "الف" کو ثابت رکھنا اور اور فرقان میں حذف کر دینا۔ اور کیسے عقل پہنچ سکتی ہے بعض تاہات کو علیحدہ کیا گیا ہے اور بعض کو دوسرے کے ساتھ ملا یا گیا ہے یہ سب اسرار الہیہ اور اغراض نبویہ کی بناء پر ہے، انھیں لوگوں پر مخفی رکھا گیا اس لیے کہ یہ اسرار باطنی ہیں جو فتح ربانی کے بغیر کھولے نہیں جا سکتے گویا کہ یہ سورتوں کے شروع میں حروف مقطعات اور الفاظ کے قائم مقام ہیں کیونکہ ان کے بڑے بڑے اسرار اور کثیر معانی ہیں اکثر لوگ ان کے اسرار تک نہیں پہنچ سکتے اور نہ ہی ان معانی الہیہ تک پہنچ سکتے ہیں جن کی طرف ان میں اشارہ کیا گیا ہے اسی طرح حرف بحرف اس رسم کا معاملہ بھی ہے جو قرآن پاک میں ہے۔

اور جس کسی نے کہا کہ صحابہ ① نے مذکورہ رسم پر اتفاق کر لیا تھا اس کے کلام کا بطلان بالکل ظاہر ہے اس لیے کہ قرآن پاک نبی پاک ﷺ کے زمانے اور آپ ﷺ کے سامنے لکھا گیا اس صورت میں جس چیز پر صحابہ ① نے اتفاق کیا وہ یا تو عین ہیئت ہے یا غیر ہیئت۔ اگر عین ہیئت ہے تو اصطلاح باطل ہے، اس لیے کہ نبی کریم ﷺ کا سابق ہونا اس کے معنی ہے اور اتباع کو واجب کرتا ہے اور اگر غیر ہیئت ہے تو کیسے ہو سکتا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے اس ہیئت پر لکھا جو مثلاً رسم قیاسی کی طرح ہے اور صحابہ ① نے اس کی مخالفت کی اور کسی اور ہیئت پر لکھ لیا؟ یہ دودو جہہ کی بناء پر غیر صحیح ہے۔

① صحابہ ① نے مخالفت کی طرف نسبت اور یہ مجال ہے۔

② صحابہ اور غیر صحابہ تمام امت نے اجماع کر لیا کہ قرآن پاک میں کسی حرف کی زیادتی یا نقصان جائز نہیں اور دو گتوں کے درمیان جو ہے وہ کلام اللہ ہے جب مثلاً نبی کریم نے الرحمن اور عالمین کا الف ثابت کر دیا اور مافہ میں الف کو نہیں بڑھایا اور نہ ہی "ولا وضعوا" میں اور نہ ہی "یابد" میں یا کو زیادہ کیا تو کیا صحابہ ① نے اس کے برعکس کیا اور اس کی مخالفت کی؟ اس سے لازم آتا ہے کہ انھوں نے قرآن پاک میں زیادتی یا کمی کر کے تصرف کیا (حالات کا وہ اس سے بالکل بری تھے) اور کسی ایسے کام میں پڑ گئے کہ جن میں انھوں نے اور دوسروں نے ایسی چیز پر اجماع کر لیا جس کا کرنا کسی ایک کے لیے بھی جائز نہ تھا۔ اور (اس صورت میں) دو گتوں کے درمیان جو کچھ بھی ہے سب کے سب میں شک پیدا ہو جائے گا اس لیے کہ جہاں بھی ہم نے سمجھا کہ اس جگہ حروف ناقص ہیں یا زائد ہیں ان حروف پر جو نبی کریم ﷺ کے علم میں تھا یا آپ ﷺ کے پاس تھا یا یہ سمجھا کہ یہ وحی نہیں ہے اور نہ ہی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے اور ہم اسے بعد نہیں جانتے تو ہم تمام قرآن میں شک کریں گے اور اگر ہم کسی

① سورۃ الاعراف: ۷۷-۷۸، سورۃ الزمر: ۵۱، ② سورۃ البقرہ: ۶۱

③ آل عمران: ۱۸۳، ④ سورۃ البقرہ: ۹۰، ⑤ سورۃ البقرہ: ۲۲۶

صحابی کے بارے میں جائز سمجھ لیں کہ انھوں نے قرآن پاک کی کتابت میں کوئی حرف ایسا بڑھ دیا جو وحی نہیں ہے تو لازم آئے گا کہ ہم کسی دوسرے صحابی کے بارے میں جائز قرار دیں کہ انھوں نے وحی کے کسی حرف میں کمی بھی کی ہوگی اس لیے کہ ان دونوں کے درمیان کوئی فرق نہیں اس صورت میں اسلام کا کراپورا کا پورا ٹوٹ جائے گا۔

اس کے بعد ابن المبارک نے کلام کرنے کے بعد فرمایا کہ ”میں نے ان سے عرض کیا کہ اگر رسم توفیقی ہے اور اس کی وحی نبی کریم ﷺ کی طرف کی گئی ہے اور یہ الفاظ قرآن کی طرح ہے تو یہ تو اتر کے ساتھ نقل ہوتی کیوں نہیں آئی تاکہ اس کا شک بالکل ختم ہو جاتا اور الفاظ قرآنی کی طرح اس پر دل مطمئن ہو جاتا؟ کیونکہ قرآن پاک کا کوئی بھی حرف ایسا نہیں جو متواتر نقل نہ ہو اور اس میں کسی قسم کا اختلاف اور اضطراب بھی واقع نہیں ہوا ہے جبکہ رسم، اخبار آحاد کے ذریعے نقل ہوئی ہے جیسا کہ اس موضوع کی کتابوں سے معلوم ہوتا ہے اور جو چیز اخبار آحاد سے نقل ہوتی ہے اس کے ناقلین میں اکثر اضطراب واقع ہوتا ہے تو امت وحی میں سے کسی چیز کو کیسے ضائع کر سکتی ہے؟ فرمایا کہ ”امت نے وحی سے کچھ بھی ضائع نہیں کیا قرآن پاک بھرا اللہ الفاظ بھی۔ محفوظ اور رسماً بھی اہل عرفان، گواہوں اور دیکھنے والوں نے اس کے الفاظ اور رسم کو محفوظ کیا اور اس میں سے ایک بال بھی ضائع نہیں کیا اور اسے مشاہدہ سے اور دیکھ کر پایا جو تو اتر سے بھی اوپر کی چیز ہے اور باقی لوگوں نے ان کے الفاظ کو محفوظ کیا جو ان تک تو اتر کے ساتھ پہنچے اور رسم کے بعض حروف میں ان کا اختلاف محض نہیں اور نہ ہی امت کو ضائع کرنے والا کہہ سکتے ہیں جیسا کہ عام لوگوں کو قرآن کی جہالت اور اس کے الفاظ کا حفظ نہ ہونا محض نہیں ہے۔“

**تیسری رائے** صاحب تیمان اور ان سے پہلے صاحب برہان کا میلان عز بن عبد السلام کے کلام کے مفہوم کی طرف ہے کہ جائز ہے بلکہ واجب ہے کہ اس وقت عام لوگوں کے لیے مصحف کی کتابت ان کے ہاں معروف اصطلاح کے مطابق کی جائے اور ان کے لیے رسم عثمانی کے مطابق کتابت کرنا جائز نہیں تاکہ جہاں کی طرف سے کوئی تغیر واقع نہ ہو لیکن اس وقت بھی رسم عثمانی کی حفاظت واجب ہے جیسے ہمارے سلف صالحین کی طرف سے وارثت میں ملنے والے آثارِ نبویہ کا اثر چالیس جاہلین کی جہالت کی رعایت کی وجہ سے اسے چھوڑا نہیں جائے گا بلکہ عارفین کے ہاتھوں میں باقی رہ جائے گا جن سے زمین خالی نہیں ہے۔

اس مقام پر تیمان کی عبارت آپ کی خدمت میں پیش ہے کہ وہ کہتے ہیں:

((واما کتابتہ ای المصحف علی ما احدث الناس من الہجاء... الخ)).

”جبکہ مصحف کی کتابت ان حروف تہجی پر جنہیں لوگوں نے تیار کر لیا ہے اس پر اہل مشرق جاری ہیں اس بناء پر کہ یہ التباس سے بعید ہے اور اہل مغرب نے اس سے کنارہ کشی کی ان کی بنیاد امام مالک رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ ان سے سوال کیا گیا کہ کیا مصحف کو ان حروف ہجاء پر لکھا جاسکتے ہیں جنہیں آج کل کے لوگوں نے تیار کیا ہوا ہے؟ انھوں نے فرمایا کہ نہیں بلکہ پہلی کتابت کے مطابق ہی لکھا جائے۔ برہان میں ہے کہ میں نے کہا کہ یہ پہلی صدی میں تھا اور علم زندہ اور تروتازہ تھا لیکن التباس کا خوف ہے۔“ اسی وجہ سے شیخ عز الزہدین بن عبد السلام نے فرمایا کہ:

”اس وقت ائمہ کی اصطلاح کے مطابق رسم اول کے مطابق مصحف کی کتابت کرنا جائز نہیں تاکہ جہاں کی طرف سے تغیر واقع نہ ہو جائے لیکن اسے مطلقاً جاری کرنا جائز نہیں کہ کہیں علم کے مٹ جانے کا سبب نہ بن جائے۔ اور ایک اور چیز بھی



ہے جسے قدماء نے منکرم کیا ہے وہ یہ کہ جاہلین کی جہالت کی مراعات کو ترک نہیں کیا جائے گا اور اللہ کے لیے حجت قائم کرنے والے سے زمین خالی نہیں ہے۔“

میں کہتا ہوں کہ یہ رائے دوا اعتبار سے قرآن پاک کی احتیاط کی رعایت پر قائم ہوتی ہے۔

① اس کی کتابت ہر زمانے میں اس کی معروف رسم کے مطابق کی جائے تاکہ لوگ التباس اور غلطی فی القرآن سے دور ہو جائیں۔

② اس کی رسم اوّل جو منقول ہے اسے باقی رکھا جائے جیسے عارفین اور وہ لوگ پڑھتے ہیں جن پر التباس کا خوف نہیں ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ احتیاط بھی ایک بہت بڑا دینی مقصود ہے خصوصاً قرآن پاک کی حفاظت میں۔

## قرآن کی کتابت اور اس کے رسم کے بارے میں پیدا ہونے والے شبہات

پہلا شبہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ جب ان کی خدمت میں مصحف پیش کیا گیا تو فرمایا کہ: ((احسنتم واجملتم ان فی القرآن لحناستقیبہ العرب بالسنعما)).

”بہت اچھا اور عمدہ کام کیا ہے شک قرآن پاک میں غلطیاں بھی ہوتی ہیں جنھیں عرب اپنی زبانوں سے درست کر لیں گے۔“

اور کہتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ اسے تبدیل نہ کرو کیونکہ عرب اسے تسبیل کر لیں گے یا فرمایا کہ عرب اپنی زبانوں کے ساتھ اسے درست کر لیں گے اگر کاتب ثقیف سے ہو اور لکھانے والا ہذیل سے ہو تو بھی اس میں یہ حرف نہیں ملیں گے۔

اسلام کے دشمنوں نے یہ دونوں روایتیں ذکر کیں اور کہا کہ یہ دونوں رسم عثمانی میں صریح طعن ہیں تو مصحف عثمان اور ان کا تبع قرآن محل ثقہ اور صحابہ رضی اللہ عنہم کا اجماع کیسے بن سکتا ہے اور کیسے توفیقی بن سکتا ہے؟ اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ خود فرما رہے ہیں اور منہ بھر کر فرما رہے ہیں کہ ”ان فیہ لحناس“ اس میں غلطیاں ہیں۔

**جواب ①** یہ دونوں روایتیں ضعیف الاسناد ہیں اور ان میں اضطراب و انقطاع ہے۔

علامہ آلوسی رضی اللہ عنہ نے اپنی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ ”یہ بات حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے بالکل ثابت ہی نہیں ہے ہو سکتا ہے کہ آپ بھی میرے ساتھ ان دونوں روایتوں کے سقوط کی طرف نظر ڈالیں تو آپ کو ان دونوں دلیلوں میں تناقض سا نظر آئے گا جو ان کے دھصف میں ظاہر ہے کہ مصحف کے لکھنے والوں کو تو کہہ رہے ہیں کہ انھوں نے اچھا کیا اور عمدہ کیا اور انھوں نے جو مصحف لکھا اس کے بارے میں فرما رہے ہیں کہ اس میں غلطیاں ہیں کیا جن لوگوں نے مصحف میں غلطیاں کی ہوں انھیں یوں کہا جاتا ہے کہ تم نے اچھا کیا اور عمدہ کیا؟

اللہ تعالیٰ کی مدد سے ہی جواب دیا جاسکتا ہے کہ یوں کہا جائے کہ اس سے مراد کوئی اور معنی ہے۔

② حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا کمال ضبط اور احتیاط جو کہ معروف ہے وہ اس جیسی مثالوں کے صدور کو محال بنا دیتی ہیں آپ ان کا گزشتہ بالا دستور دیکھیں جو انھوں نے جمع قرآن میں اپنا یا پھر اس روایت کو دیکھیں جسے حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے

غلام عبدالرحمن بن ہانی سے روایت کیا کہ میں حضرت عثمان بن عفانؓ کے پاس تھا کہ وہ مصاحف کو پیش کر رہے تھے انہوں نے مجھے بکری کے کندھے کی ہڈی دے کر حضرت ابی بن کعبؓ کی طرف بھیجا اس میں لکھا ہوا تھا "لَمْ يَتَسَنَّ" اور "لا تبدل للخلق" اور "فَأَمْهَلِ الْكَافِرِينَ" انہوں نے دوات منگائی اور دو لاموں میں سے ایک کو مٹا دیا اور "يَخْلُقِ اللَّهُ" لکھ دیا اور "فامهل" کو مٹا کر "مهمل" لکھ دیا اور "لَمْ يَتَسَنَّ" لکھ دیا اور اس میں ہاء کو بڑھا دیا۔۔۔

ابن الانباریؒ نے فرمایا کہ "کیسے دعویٰ کیا جاسکتا ہے کہ انہوں نے غلطی کو دیکھ کر اسے جاری کر دیا؟ حالانکہ وہ جو لکھتے تھے اس میں خوب غور و فکر کرتے تھے اور اس پر دوسروں کو مطلع کرتے تھے اور اسے لکھنے والوں کے ذریعے اس کے اختلاف کو دور کیا کرتے تھے اور حق کو ثابت کرتے اور درستی کا اثبات اٹھیں لازم کرتے اور اسے قائم رکھتے۔

⑤ اگر مذکورہ بالا دونوں روایتوں کو صحیح فرض کر لیا جائے تو بھی اس کی تاویل حضرت عثمان بن عفانؓ سے صحیح مصحف کو لکھوانے اور جمع میں قرآن میں صحیح متواتر اور متفق علیہ روایات سے ہونیز انتہائی تحقیق و جستجو، دقت اور ضبط سے ہو سکتی ہے۔

بایں طور کہ "لحنًا" (غلطی) سے مراد مذکورہ دونوں روایتوں میں قرأت اور لغت کی غلطی ہو اور معنی یہ ہوگا کہ قرآن پاک اور اس کے مصحف کے رسم میں ایسی وجہ ہے کہ اس پر تمام عربوں کی زبان جاری نہیں ہو سکتی لیکن تھوڑا سا زمانہ بھی گزرے گا کہ مشق اور کثرت کے ساتھ تلاوت قرآن کی وجہ سے تمام کی زبانیں جاری ہو جائیں گی بعض جلیل القدر علماء نے بھی اس کی مثال دی ہے کہ مثلاً کلمہ "الصراط" جو کہ سین سے بدل ہے اب عرب رسم پر عمل کرتے ہوئے اسے صاد کے ساتھ پڑھتے ہیں اور اصل پر عمل کرتے ہوئے سین کے ساتھ۔

حضرت سعید بن جبیرؒ سے مروی ہے کہ وہ "والمقيمین الصلوة" پڑھتے تھے اور کہتے تھے کہ یہ کاتبوں کی دوسرا شبہ ہے۔

**جواب** سابقہ طرز کے مطابق اس کی توجیہ بھی یہی ہوگی کہ حضرت سعید بن جبیرؒ نے کلمہ لحن سے مراد خطا نہیں لیا بلکہ لغت اور وجہ قرأت مراد لی ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ:

﴿وَلَتَعْرِفَنَّهُمْ فِي لَحْنِ الْقَوْلِ﴾ (محمد: ۳۰)

"آپ انہیں انداز گفتگو سے بھی پہچان لو گے۔"

اس توجیہ کے پر دلیل یہ ہے کہ حضرت سعید بن جبیرؒ خود پڑھتے تھے ﴿وَالْمُقِيمِينَ الصَّلَاةَ﴾ (النساء: ۱۱۲) اگر لحن سے ان کی مراد خطا ہوتی تو وہ خود اپنے لیے بھی اس قرأت کو پسند نہ کرتے جب وہ ایک چیز کو خطا سمجھ رہے ہیں تو پھر اسے پسند کیسے کر رہے ہیں؟

یہ کلمہ سورۃ النساء اس طرح ہے:

﴿لَكِنَّ الْرِيسُخُونَ فِي الْعِلْمِ مِنْهُمْ وَالْمُؤْمِنُونَ يُؤْمِنُونَ بِمَا أُنزِلَ إِلَيْكَ وَمَا أُنزِلَ مِنَ الْقُرْآنِ وَالْمُقِيمِينَ الصَّلَاةَ وَالْمُؤْتُونَ الزَّكَاةَ وَالْمُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ أُولَئِكَ سَنُؤْتِيهِمْ أَجْرًا عَظِيمًا﴾ (النساء: ۱۱۲)

”مگر جو لوگ ان میں سے علم میں کچے ہیں اور جو سوکن ہیں وہ اس (کتاب) پر جو تم پر نازل ہوئی اور جو (کتابیں) تم سے پہلے نازل ہوئیں (سب پر) ایمان رکھتے ہیں اور نماز پڑھتے ہیں اور زکوٰۃ دیتے ہیں اور خدا اور روزِ آخرت کو مانتے ہیں۔ ان کو ہم عنقریب اجر عظیم دیں گے۔“

اب کلمہ ﴿وَالْمُؤْمِنِينَ الصَّلٰوةَ﴾ (النساء: ۱۶۲) کو جمہور نے ”یا“ کے ساتھ منصوب پڑھا، جیسا کہ آپ دیکھ رہے ہیں اور ایک جماعت نے واؤ کے ساتھ پڑھا جن میں سے ابو عمرو بھی ہیں جیسا کہ ان کی روایت یونس اور ہارون سے ہے دونوں قرأتوں میں سے ایک صحیح وجہ پر ہے اور لغت عربیہ میں فصح ہے نصب کا مدار معراج پر ہوگا اور تقریری عبارت ”وامدح المقيمين الصلوة“ ہوگی اور رفع کا مدار عطف پر ہوگا اور معطوف علیہ مرفوع ہے جیسا کہ آپ دیکھ رہے ہیں۔

تیسرا شبہ ﴿عَبَّاسٌ بَنِيَّوْهُ﴾ سے اللہ تعالیٰ کے قول: ﴿حَتَّىٰ تَسْتَأْذِنُوا ۚ وَ تَسْمِعُوا﴾ (النور: ۲۷) کے بارے میں مروی ہے کہ انھوں نے فرمایا کہ تاب سے غلطی ہوگئی درست ﴿حَتَّىٰ تَسْتَأْذِنُوا ۚ وَ تَسْمِعُوا﴾ (النور: ۲۷) ہے۔

**جواب ۱** ابو حیان اس کے جواب میں فرماتے ہیں کہ جس نے حضرت ابن عباسؓ سے یہ روایت نقل کی وہ اسلام پر اعتراض کرنے والا اور دین میں لحد ہے اور حضرت ابن عباسؓ اس سے بری ہیں۔

۲ ابن ابی حاتم اور ابن الانباری نے ”المصاحف“ میں اور ابن جریر اور ابن مردویہ نے بھی حضرت ابن عباسؓ سے روایت کیا کہ انھوں نے ”تسْتَأْذِنُوا“ کی تفسیر میں فرمایا کہ ”یعنی اجازت والے سے اجازت لے لو یعنی گھر والے سے۔“

۳ قراء نے ”تسْتَأْذِنُوا“ کے علاوہ کوئی قرأت نقل نہیں کی اگر یہ نقل حضرت ابن عباسؓ سے صحیح ہوتی تو وہ بھی نقل کرتے کہ انھوں نے ”تسْتَأْذِنُوا“ پڑھا۔

۴ اگر ہم تسلیم کر لیں کہ یہ خبر حضرت ابن عباسؓ سے ثابت ہے تو بھی ہم اسے پس پشت ڈالتے ہوئے در کرتے ہیں کہ صحت کا یہ دعویٰ صحیح نہیں اس لیے کہ یہ قطعی اور متواتر قرأت کے معارض اور وہ قرأت ”تسْتَأْذِنُوا“ ہے اور قاعدہ ہے کہ قطعی کا معارض سابقہ ہوتا ہے اور روایت جب مصحف کی رسم کے مخالف ہو تو وہ شاذ ہوتی ہے اور اس کی طرف التفات نہیں کیا جاتا اور نہ ہی اس پر بھروسہ کیا جاتا ہے۔

چوتھا شبہ ﴿اَفْلَهٗمُ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا﴾ (الرعد: ۳۱) ہے انھوں نے فرمایا کہ میرا خیال ہے کہ کاتب نے اسے سوتے ہوئے لکھا تھا۔

**جواب ۵** یہ روایت بھی حضرت ابن عباسؓ سے صحیح سند کے ساتھ مروی نہیں ہے ابو حیان نے فرمایا کہ بلکہ یہ کسی لحد اور زندیق کا قول ہے۔ زنجشیری نے فرمایا کہ ہم اس کی تصدیق نہیں کر سکتے جو اللہ تعالیٰ کی اس کتاب میں آیا جس کے پاس باطل نہ سامنے سے آ سکتا ہے نہ پیچھے سے یہ کیسے مخفی رہ سکتا ہے کہ امام (یعنی مصحف امام) یعنی مصحف عثمان و دونوں گنتوں کے درمیان باقی ہے حالانکہ یہ

مصنف ان حضرات کے ہاتھ میں رہا تھا جو اللہ تعالیٰ کے دین میں محتاط اور اس پر نگہبان تھے اس کی عظمتوں اور دقائق سے غافل نہ تھے۔ خصوصاً اس قانون سے جس کی طرف رجوع ہوتا تھا اور اس قاعدہ اور بنیاد پر جس پر بناء تھی اللہ کی قسم یہ ایک تھوٹا الزام ہے اس میں ذرا بھی سچ نہیں ہے۔ فراء نے فرمایا کہ: "لا یتلی الا کما أنزل" (جیسے نازل ہوا اس کے علاوہ کس طرح بھی نہیں پڑھا گیا) "أَفَلَمْ یَایس... الخ" اس بناء پر یہ روایت درمتروغہ میں حضرت ابن عباس سے غیر صحیح روایت ہے اور "أفلم ینیس" کا معنی "أَفَلَمْ یَعْلَمُوا" (کیا انھوں نے نہیں جانا) ہے قاسم بن معن نے فرمایا کہ یہ ہوازن کی لغت ہے۔ اور اس میں عربی شعر بھی آیا ہے شاعر نے کہا:

اقوال لهم بالشعب اذ یاسرونی  
 أَلَمْ تَایسُوا آتِیَ ابْنِ فَارِسٍ زَهْدَمِ  
 "میں انھیں گھائی میں کہہ رہا تھا وہ مجھے قید کر رہے تھے۔ کیا تم نہیں جانتے کہ میں گھوڑ سوار زہدم کا بیٹا ہوں۔  
 یعنی "أَلَمْ تَعْلَمُوا" (کیا تم نہیں جانتے؟)

**پانچواں شبہ** وہ کہتے ہیں کہ اعتراض کی وجہ میں سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی یہ روایت بھی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی قول ﴿وَقَضَىٰ رَبُّكَ أَلَّا تَعْبُدُوا إِلَّا إِيَّاهُ﴾ (الاسراء: ۲۳) کے بارے (اور آپ کے رب نے فیصلہ کیا کہ تم اس کے علاوہ کسی کی عبادت نہ کرو) کے بارے میں فرمایا کہ یہ "ووصی ربک" وادو صاد کے ساتھ مل گئی اور وہ ﴿وَوَصَّىٰ رَبُّكَ﴾ پڑھا کرتے تھے اور فرماتے تھے کہ ﴿أَمَرَ رَبُّكَ﴾ (تیرے نے حکم دیا) یہ دونوں وادو میں ایک صاد کے ساتھ مل گئی اور ان سے مروی ہے کہ انھوں نے فرمایا کہ "اللہ تعالیٰ نے یہ تمہارے نبی کی زبان میں نازل کیا۔" ﴿وَقَضَىٰ رَبُّكَ أَلَّا تَعْبُدُوا إِلَّا إِيَّاهُ﴾ (الاسراء: ۲۳) ایک وادو کے ساتھ مل گئی اب لوگوں نے ﴿وَقَضَىٰ رَبُّكَ﴾ پڑھ دیا اگر "قضاء" کے لفظ سے نازل ہوتا تو کوئی بھی شرک نہ کرتا۔

**ان سب کا جواب** ① ابن الانباری فرماتے ہیں کہ یہ روایات ضعیفہ ہیں۔

② یہ روایات متواتر اور قطعی روایات کے معارض ہیں اور وہ قرأت "وقضی" ہے اور قطعی کا معارض ساقط ہوتا ہے۔

③ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے خود مشہور ہے کہ انھوں نے "وقضی" پڑھا اور یہ اس لیے کہ ان روایات میں ان کی طرف جو یہ پُر فریب روایات منسوب ہیں جنھیں دشمنان اسلام نے طبع سازی کرتے ہوئے گھڑا ان پر دلیل ہو جائے۔

ابو حیان نے "المحر" میں فرمایا کہ متواتر "وقضی" ہے اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی اسی طرح مشہور و معروف ہے نیز حضرت حسن اور قادم سے بھی اسی طرح مشہور و معروف ہے جس کا معنی "أَمَرَ" ہے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہما اور ان کے ساتھیوں نے فرمایا کہ یہ "ووصی" کے معنی میں ہے اس صورت میں "وقضی" والی روایت جس پر حضرت ابن عباس اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہما وغیرہ کا اجماع منقطع ہو چکا ہے نہیں ہے اور نہ ہی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے اور ہم اسے بعینہ نہیں جانتے تو ہم تمام قرآن میں شک کریں گے اور اگر ہم کسی اس لیے اس طرح کی گری پڑی روایات کو ٹھکڑوں کے علاوہ کسی کے پلے کے ساتھ نہیں لٹکا یا جائے گا۔

**چھٹا شبہ** وہ کہتے ہیں کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ بھی مروی ہے کہ وہ ﴿وَلَقَدْ آتَيْنَا مُوسَىٰ وَ هَارُونَ الْفُرْقَانَ وَ ضِيَاءً﴾ (الانبیاء: ۴) پڑھتے اور فرماتے کہ اس وادو کو لے کر ﴿أَلَّذِينَ قَالُوا لَهُمُ النَّاسُ مِنَ النَّاسِ قَدْ جَمَعُوا لَكُمْ﴾ (آل عمران: ۱۷۳) میں لگا دو اور یہ بھی مروی ہے کہ انھوں نے فرمایا کہ اس وادو کو ہٹا کر ﴿أَلَّذِينَ يَحْمِلُونَ الْعَرْشَ وَمَنْ

حَوْلَهُ ﴿عَافِيَةً﴾ میں لگا دو۔

**جواب ۱** ﴿﴾ یہ متواتر اور جماعی قرأت کے معارض ہونے کی وجہ سے ساقط ہے۔

۲ قرآن پاک کی بلاغت واؤ کے وجود کا فیصلہ کرتی ہے حذف کا نہیں اس لیے کہ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے آیت میں مذکور ”الفرقان“ کی تفسیر کی ہے ”النصر“ کے ساتھ۔

اسی بناء پر ”الضياء“ بمعنی ”التوراة“ یا ”الشريعة“ ہوگی لہذا واؤ کا یہ مقام اسی تقابز کی وجہ سے ہے۔

وہ کہتے ہیں کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اللہ تعالیٰ کے قول:

﴿مَثَلُ نُورٍ كَمِثْلِكَ نُورُهُ كَمِثْلِكَ وَفِيهَا مِصْبَاحٌ﴾ (النور: ۳۵)

کے بارے میں بھی منقول ہے کہ یہ کاتب کی غلطی ہے وہ اس سے بہت بڑا ہے کہ اس کا نور طالعے کے نور کی طرح ہو بلکہ

مومن کا نور طالعے کی طرح ہوتا ہے۔

**جواب ۱** ﴿﴾ یہ روایت متواتر اور قطعی روایات کے معارض ہونے کی وجہ سے ساقط ہے۔

۲ کسی بھی قاری سے یہ منقول نہیں ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے ”مثل نور المؤمن“ پڑھا ہو، پھر کیسے ہو سکتا ہے کہ حضرت

ابن عباس رضی اللہ عنہما کسی چیز کو خطا سمجھتے ہوں اور پھر اسے پڑھتے بھی ہوں؟ اور جسے وہ درست سمجھتے ہوں اسے چھوڑتے ہوں؟ خبر

دار یہ ایک بدنام جھوٹ ہے اگر ان لوگوں نے اسے حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہما کی طرف منسوب کیا ہو تو معاملہ اور بھی زیادہ

آسان ہو جائے گا اس لیے کہ قراءات شاذہ میں مروی ہے کہ حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہما نے ”مثل نور المؤمن“ پڑھا اور

مناسب یہ ہے کہ ان روایات کو اس بات پر محمول کیا جائے کہ حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہما نے قراءت معروفہ متواترہ میں ضمیر کی تفسیر کا ارادہ کیا

اور وہ ”مثل نورہ“ ہے لہذا یہ روایت ان سے تفسیر میں ہے قرأت میں نہیں دلیل یہ ہے کہ وہ ”مثل نورہ“ پڑھا کرتے تھے۔

ان شبہات میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے جتنی بھی روایات ہیں ان

کا ایک عمومی دفاع بھی ہے وہ یہ کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے

قرآن پاک حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہما سے سیکھا اور جمع مصاحف میں یہ دونوں تھے اور حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہما حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہما

کے زمانے میں ہونے والے جمع قرآن میں بھی تھے اور کاتب وحی بھی تھے اور یہ وہی لکھا کرتے تھے جو نبی کریم ﷺ کا حکم یا ان کا

اقرار ہوتا تھا اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے جانتے تھے اور اس کا یقین بھی رکھتے تھے اب اس صورت میں محال ہے کہ وہ اپنی زبان

سے کوئی ایسا لکھ بولیں جو جمع قرآن یا رسم قرآن پر اعتراض کا باعث ہو۔ ورنہ کیسے ممکن ہے کہ وہ حضرت زید بن کعب رضی اللہ عنہما اور ابی بن کعب رضی اللہ عنہما

سے حاصل بھی کریں اور ان کے جمع اور رسم پر اعتراض بھی کریں۔

وہ کہتے ہیں کہ حضرت ہشام بن عروہ کے والد سے روایت کرتے ہیں کہ میں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے

﴿إِنَّ هَذَا لِسَاحِرٍ﴾ کے بارے میں سوال کیا اور ﴿وَالْمُؤْمِنُونَ الصَّالِحُونَ وَالْمُؤْمِنُونَ الزَّكَاةَ﴾ (النساء: ۱۲۳)

اور ﴿إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هَادُوا وَالصَّابِقِينَ﴾ (المنافقہ: ۶۹) کے کلموں کے بارے میں سوال کیا تو انھوں نے فرمایا کہ اے مجھے ایسے

کاتبوں کا عمل ہے انھوں نے کتابت میں غلطی کی۔ امام سیوطی رضی اللہ عنہ نے اس حدیث کے بارے میں فرمایا کہ اس کی سند صحیح اور شیخین کی

شرط کے مطابق صحیح ہے۔

وہ لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ حضرت ابو خلف جو کہ بنی تمیم کے مولیٰ ہیں روایت کرتے ہیں کہ میں عبید بن عمیر کے ساتھ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی خدمت میں حاضر ہوا میں آپ کے پاس ایک آیت کے بارے میں پوچھنے آیا ہوں کہ رسول اللہ ﷺ اسے کیسے پڑھتے تھے؟ انھوں نے فرمایا کہ کون سی آیت؟ میں نے عرض کیا کہ ﴿وَالَّذِينَ يُؤْتُونَ مَا آتَوْا﴾ (المومن: ۶۰) یا ﴿الَّذِينَ يُؤْتُونَ مَا آتَوْا﴾؟ انھوں نے فرمایا کہ تمہیں کیسے پسند ہے؟ میں نے عرض کیا کہ ”اس جان کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان سے ان میں سے ایک طریقے سے پڑھنا مجھے تمام دنیا سے زیادہ پسند ہے انھوں نے فرمایا کہ وہ کون سا طریقہ ہے؟ میں نے عرض کیا کہ: ﴿الَّذِينَ يُؤْتُونَ مَا آتَوْا﴾ انھوں نے فرمایا کہ میں گواہی دیتی ہوں کہ رسول اللہ ﷺ کہ ہم اسی طرح پڑھا کرتے تھے اور اسی طرح نازل ہوئی۔ (اور فرمایا کہ) لکن الہجاء حرف“ لیکن ہجاء ایک حرف ہے۔“

**جواب ①** ان روایات کی سند جتنی بھی صحیح ہو پھر بھی متواتر قطعی کے خلاف ہے اور قطعی کا معارض مردود ہوتا ہے اس لیے اس کی طرف توجہ نہیں دی جائے گی اور ان پر عمل نہیں کیا جائے گا۔

② ”کتاب اتحاف فضلہ البشر“ میں تصریح ہے کہ ”ہذان“ کو مصحف میں بغیر الف اور یاء کے لکھا گیا ہے تاکہ اس میں پائی جانے والی چار قرأتوں کا احتمال ہو سکے، جیسا کہ ہم نے پیچھے رسم عثمانی کے فوائد میں کھول کھول کر بیان کر دیا اس صورت میں یہ کہنا معقول نہ ہوگا کہ کاتب نے خطا کی کیونکہ کاتب نے نہ الف لکھا اور نہ یہ یاء لکھا اگر اس مقام پر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے خیال کے مطابق خطا ہوتی تو وہ کاتب کی طرف منسوب نہ کرتیں بلکہ ان قاریوں کی طرف منسوب کرتیں جو ”ان“ کی تشدید اور ”ہذان“ میں الف کا تلفظ کرتے ہیں حالانکہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے بلکہ کسی اور سے بھی منقول نہیں ہے کہ انھوں نے مذکورہ بالا طریقے سے پڑھنے والوں کو غلط قرار دیا ہو۔ وہ کیسے غلط قرار دے سکتی ہیں حالانکہ یہ قرأت متواتر ہے اور اجماعی ہے؟ بلکہ اکثر قراء کی قرأت ہے اور عربی میں اس کا ایک فصیح مرتبہ اور مقام ہے جو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا جیسوں پر مخفی نہیں رہ سکتا۔ یہ تشنیہ کے تمام حالات میں اس کے ساتھ الف کو لازم کرنا ہے۔ عربی شاعر کے قول میں بھی آیا ہے۔

واھا لسلیمی ثم واھا ثم واھا یالیت عیناھا لنا وفاھا

”واہ سلیمی کے لیے پھر واہ اور پھر واہ۔ کاش کہ اس کی آنکھوں نے ہمارے ساتھ وفا کی ہوتی۔“

وموضع الخلل من رجلاھا بشمن یرضی بہ اباھا

”اس کے پاؤں میں اس کے پازیب کی جگہ۔ کی اتنی قیمت ہے کہ اس کا باپ بھی اس پر راضی ہو جاتا ہے۔“

ان اباھا و ابا اباھا قد بلغانی المجد غایتھا

”بے شک اس کا باپ اور دادا۔ بزرگی میں انتہا کو پہنچا ہوا ہے۔“

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے بعید ہے کہ وہ اس قرأت کا انکار کریں اگرچہ اسے مصحف کا رسم اکیلے ہی لائے۔

⑤ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی طرف جو منسوب ہے کہ انھوں نے ﴿وَالْبُقِیَّاتِ الصَّلٰوةِ﴾ میں یاء کے ساتھ مصحف کے رسم کو غلط قرار دیا یہ بھی مردود ہے اس لیے کہ ابوحیان نے ”المحرر“ میں فرمایا کہ:



”اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور ابان بن عثمان رضی اللہ عنہما سے منقول ہے کہ اسے ”یا“ کے ساتھ لکھنا صحیف کے کاتب کی غلطی ہے۔“ جبکہ یہ بات ان دونوں سے ثابت نہیں کیونکہ یہ دونوں عربی اور فصیح تھے اور قبطی صفات عرب زبان میں مشہور ہے اور یہ ایک وسیع باب ہے جس پر سیبویہ نے شواہد قائم کیے ہیں۔

زنجشری نے فرمایا کہ انھوں نے جو دعویٰ کیا ہے کہ صحیف کے خط میں خطا ہے اس کی طرف التفات نہیں کیا جائے گا اس کی طرف کبھی وہ شخص توجہ کر سکتا ہے جس نے کتاب میں (یعنی سیبویہ کی کتاب میں) نظر نہ کی ہو اور نہ ہی عرب کے مذاہب کو جانا ہو اور نہ ہی اسے معلوم ہو کہ اختصاص کی بناء پر نصب بھی ایک تفنن ہے اور اس پر یہ بات بھی مخفی ہو کہ سابقین اولین جن کی مثالیں تورات میں بھی اور انجیل میں بھی وہ اسلامی غیرت اور اس کے اعتراضات کو ذور کرنے میں بہت زیادہ باہمت تھے پھر وہ کتاب اللہ میں کیسے ایک دراز چھوڑ سکتے تھے جس بعد والوں کو بھرنا پڑے اور کیسے پھینچ چھوڑ سکتے ہیں جسے بعد والے سیتے رہیں۔

⑤ ”الصائبون“ واؤ کے ساتھ اس قرأت کے بارے میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے منقول ہی نہیں کہ اسے پڑھنے والے کو انھوں نے غلطی پر قرار دیا ہو اور یہ بھی منقول نہیں کہ انھوں نے واؤ کو چھوڑ کر ”یا“ کے ساتھ پڑھا ہو لہذا یہ معقول ہی نہیں کہ انھوں نے واؤ لکھنے والے کو غلطی پر قرار دیا ہو۔

⑥ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا کلام جو اللہ تعالیٰ کے قول ”یوتون ما اتو“ کے بارے میں ہے یہ قرأت متواترہ اجماعی کے انکار کا فائدہ نہیں دیتا بلکہ انھوں نے سوال کرنے والے کو کہا کہ تمہیں دونوں میں سے کونسا پسند ہے؟ اور وہ رسول اللہ ﷺ سے تھے اور خود پڑھے ہوئے پھر منحصر نہیں کر رہیں بلکہ صرف یہ فرما رہی ہیں کہ مسوع ومنزل فقط اسی طرح ہے۔ اور یہ دوسری قرأت کے مسوع قرأت ہونے کے منافی نہیں ہے۔ خصوصاً جبکہ یہ نبی کریم ﷺ سے متواتر ہو۔

اور ان کا فرمایا کہ ”لکن الھجاء حرف“ یہ کلمہ ”حرف“ سے ماخوذ ہے جس کا معنی قرأت اور لغت ہے لہذا معنی یہ ہو گا کہ یہ قرأت متواترہ جس کے ساتھ صحیف لکھا گیا یہ بھی ایک لغت اور قرآن کریم کی وجوہ اداء میں سے ایک وجہ ہے۔ اور یہ کہنا صحیح نہ ہو گا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی اس حدیث میں ”حرف“ کا کلمہ ”تحریف“ سے ماخوذ ہے جس کا معنی خطا ہے اور نہ یہ حدیث متواتر کے معارض ہو جائے گی اور قبطی کا معارض ساقط ہوتا ہے۔

نواں شبہ ۱۱) وہ کہتے ہیں کہ حضرت خارجہ بن زید بن ثابت رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ انھوں نے فرمایا کہ حضرت زید بن ثابت سے کہا گیا کہ اے ابوسعید! آپ کو غلطی لگ گئی یہ ”ثمانیہ ازواج من الضان الثنین الثنین ومن الابل الثنین الثنین ومن البقر الثنین الثنین“ ہے انھوں نے فرمایا کہ نہیں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ:

﴿فَجَعَلَ مِنْهُ الْوُجُوہِیْنَ الذَّكَرَ وَالْاُنثٰی﴾ (التیلہ: ۳۹)

”یہ دو جوڑے ہیں ان میں سے ہر ایک جوڑا ہے مذکر ایک جوڑا اور مؤنث ایک جوڑا... الخ۔“

دشمنان اسلام نے کہا کہ یہ روایت دلالت کرتی ہے کہ صحیف لکھنے والوں نے تصرف کیا اور انھوں نے قرآن پاک کی کتابت اور رسم میں جو چاہا اختیار کر لیا۔

**جواب:** حضرت زید رضی اللہ عنہ کا یہ کلام ان کے دعویٰ پر دلالت نہیں کرتا بلکہ انھوں نے جو لکھا اور پڑھا اور نبی کریم ﷺ سے سنا اس کی توجیہ بیان کرنے پر دلالت کرتا ہے اس پر نہیں کہ یہ ان کا تصرف اور اپنی طرف سے خواہش ہے۔

صحابہ رضی اللہ عنہم سے قرآن پاک میں اس طرح کیسے متصور ہو سکتا ہے حالانکہ وہ اپنے کمال ضبط اور کتاب سنت میں تحقیق و جستجو میں ضرب المثال تھے خصوصاً حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ اور آپ نے گزشتہ بلاسطور میں جان لیا کہ حضرت زید اپنے حفظ، امانت، دین اور تقویٰ میں کیا تھے؟ اور آپ نے مصحف اور مصحف کی کتابت میں ان کا دقیق و حکیم طریقہ کار بھی جان لیا تو پھر کہاں الٹے جا رہے ہیں؟

**دسوال شبہ:** وہ کہتے ہیں کہ مروان نے ہی سورۃ فاتحہ ﴿مَلِكِ يَوْمِ الدِّينِ﴾ (الفاتحہ: ۳) یعنی ﴿مَلِكِ﴾ میں الف کے حذف کے ساتھ پڑھا تھا اور وہ کہتے ہیں کہ انھوں نے اسے اپنی طرف سے حذف کیا تھا نبی پاک ﷺ کی طرف سے اس میں کوئی حدیث وارد نہیں ہوئی چہ جائیکہ یہ آپ ﷺ سے لفظ یا قراءت متواتر ہو یا کتابتا اور سما آپ ﷺ سے صحیح ہو۔

**جواب:** یہ بالکل جھوٹا اور بدنام قسم کا بہتان ہے اس لیے کہ ان کے پاس اس کی کوئی دلیل نہیں ہے اور نہ ہی کوئی سند ہے۔

دوسرا جواب یہ بھی ہے کہ دلیل قائم ہو چکی اور تو اترا تمام ہو چکا اور اجماع بھی منقطع ہو چکا کہ نبی کریم ﷺ نے ﴿مَلِكِ﴾ یَوْمِ الدِّينِ ﴿﴾ (الفاتحہ: ۳) کو الف کو قائم رکھ کر بھی پڑھا اور اسے حذف کر کے بھی اور آپ ﷺ کے صحابہ رضی اللہ عنہم نے ان سے اسے حاصل کیا اب جنھوں نے دونوں طرح پڑھا وہ حضرت علی، ابن مسعود اور ابی بن کعب رضی اللہ عنہم ہیں اور جنھوں نے قصر کے ساتھ یعنی الف کو حذف کر کے پڑھا وہ ابوالدرداء، ابن عباس اور ابی عمر رضی اللہ عنہم ہیں اور جنھوں نے مد کے ساتھ یعنی الف کو ثابت رکھتے ہوئے پڑھا وہ ابو بکر، عمر اور عثمان رضی اللہ عنہم ہیں یہ سب لوگ مروان سے پہلے تھے بلکہ مروان کے پیدا ہونے سے پہلے اور مروان کے پڑھنے سے پہلے کے ہیں۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہوگا کہ مروان کی قرأت اتفاقاً قصر کی ہو فقط اور اس سے ہمیں کچھ بھی نقصان نہیں۔

تیسرا جواب یہ ہے کہ ﴿مَلِكِ﴾ کا کلمہ مصحف عثمانی میں ”ملك“ اس طرح لکھا ہوا ہے جیسا کہ گزرا۔

**جواب کا خلاصہ:** یہ اور ان جیسے شبہات نصوص قطعیہ اور واضح دلائل کے ذریعے مدفوع ہیں۔ کہ تمام قرآن جسے اللہ تعالیٰ نے نازل کیا اور اس کے اثبات اور رسم کا حکم دیا اور کسی ناسخ نے اسے اپنی تلاوت میں نسخ نہیں کیا یہ وہ قرآن ہے جس کا مصحف عثمانی نے دو گتوں کے درمیان احاطہ کیا اور اس سے نہ کسی چیسز کو کم کیا اور نہ زیادہ کیا بلکہ اس کی ترتیب اور نظم دونوں اسی طرح ثابت میں جس طرح اللہ تعالیٰ نے اسے پر دیا اور جس آیت یا سورت کی جیسے نبی پاک ﷺ نے ترتیب بنائی اس میں سے نہ کسی مؤخر کو مقدم کیا اور نہ ہی کسی مقدم کو مؤخر، اور امت نے نبی پاک ﷺ سے ہر سورت کی ترتیب اور اس کے موقع کو ضبط کیا جیسا کہ آپ ﷺ سے نفس قرأت اور نفس تلاوت ثابت ہیں جیسا کہ گزرا اور جیسا کہ عنقریب قراءات پر کلام کرتے ہوئے آگے آئے گا انشاء اللہ۔

اس طرح کے شبہات کے رد میں ہمیشہ دو امور ملاحظہ کرنے چاہئیں:

① یہ سنہری قاعدہ جسے علماء نے وضع کیا ہے کہ خبر آخر حادث جب کسی قطعی دلیل کے معارض ہو جائیں تو وہ درجہ اعتبار سے ساقط ہو جائیں گی اور انھیں دہرا پر مار دیا جائے گا تو پھر اس کی سند کا درجہ صحیح کیسے ہو سکتا ہے۔

② ہم نے آٹھویں بحث میں دفاعی لائن کھینچی ہے وہ ایک مضبوط قلعہ ہے جو صحابہ رضی اللہ عنہم اور ان کو سوا حفظ، عدم تحقیق و جستجو اور چھان میں خصوصاً کتاب اللہ اور سنت رسول میں ہوا اس سے بچائی ہے۔

## ہمارے زمانے میں رسم عثمانی کے التزام پر شبہ

وہ کہتے ہیں کہ بہت سے طلباء قرآن پاک کو محفوظ نہیں کر پاتے اور مصحف میں قرأت اچھی طرح سے نہیں کر پاتے اس لیے کہ انھیں رسم عثمانی کی معرفت نہیں ہوتی پھر ہم اس رسم کے پابند کیوں ہیں اور آج کی معروف اصطلاحی کتابت پر اسے کیوں نہیں لکھ پاتے تاکہ مبتدیوں کے لیے آسانی ہو جائے اور لوگوں کے سہل ہو جائے۔

**جواب ①** اس کے جواز میں علماء کی آراء مختلف ہیں بلکہ بعض نے کہا (یعنی عز بن عبد السلام نے کہا) کہ عام لوگوں کے لیے مصحف کی کتابت ان کی حدیث کی کتابت کی اصطلاح کے مطابق کرنا واجب ہے کیونکہ اس کے بغیر التباس کا خوف ہے جیسا کہ اس کی کتابت رسم عثمانی کے مطابق کرنا واجب ہے تاکہ اس گراں قدر میراث کی حفاظت ہو جائے اور علماء کرام کی آراء کی تشریح گزر چکی اور وہ آپ سے بعید نہیں ہے۔

① رسم عثمانی کے کچھ مرجحات اور فوائد بھی ہیں جنہیں ہم نے پیچھے ذکر کر دیا۔

② جمہور کا مذہب بھر پور دلائل پر مبنی ہے جو ان کے نزدیک اس رسم کے التزام کے وجوب پر دلالت کرتے ہیں اور وہ دلائل بھی پیچھے گزر چکے ہیں۔

③ ہمارے زمانے کے اصطلاحی خط اور کتابت میں تغیر و تبدل ہو سکتا ہے اور قرآن کی عظمت میں مبالغہ کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ اسے رسم میں تبدیلی اور تغیر سے محفوظ رکھا جائے۔

④ مصحف کو جدید خط کی اصطلاحات کے تابع کرنا بسا اوقات اسے فتنہ کی طرف گھسیٹ لے جاتا ہے جیسے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانے میں ایک فتنہ رونما ہوا جس نے انھیں جمع قرآن پر مجبور کر دیا۔ بعض اوقات بعض لوگ یا بعض قبیلے مصحف کے رسم میں ان کے قواعد کے اختلاف کے وقت ایک دوسرے کو کہتے ہیں کہ میرا رسم تم سے اچھا ہے یا میرا مصحف تم سے اچھا ہے یا میرا رسم تم سے درست اور تمہارا رسم غلط ہے بلکہ بعض اوقات تو معاملہ یہاں تک پہنچ جاتا ہے کہ وہ ایک دوسرے کو گنہگار کہنے یا ایک دوسرے سے لڑائی کرنے لگ جاتے ہیں۔

اور یہ بات طے ہے کہ ان مفاسد کو دور کرنا جلسہ مصلحت پر مقدم ہے۔

⑤ رسم عثمانی اس عام رسم کے مشابہ ہے جو امت کو تمام زمان و مکان میں اپنے رب کی کتاب کو لکھنے پر جمع کرتی ہے جیسے لغت عربیہ ایسی زبان ہے جو امت کو ہر زمانے اور ہر مکان میں اپنے رب کی کتاب کو پڑھنے پر جمع کرتی ہے اور یہ رسم امت کو ایک لڑی میں پروتی ہے نہ ماضی میں کوئی فرق پڑتا ہے نہ حال میں اور نہ ہی مستقبل میں۔

⑥ لوگوں کے لیے قرآن پاک کی خوب اشاعت کرتے ہوئے قرآن پاک کی قرأت آسان ہو جاتی ہے اور یہ اشاعت بھی ایک مضبوط اور دقیق ہو جاتی ہے نیز مدارس میں تجوید اور متعلمین کے صیغوں میں بھی مضبوط اشاعت ہو جاتی اور آخر میں ممکن ہے کہ جیسا کہ ”ہجۃ الازھر“ میں فرمایا کہ مصحف کے ہر صفحہ کے ذیل میں ہم آپ کو بتلائیں گے کہ ان میں کتنے کلمات ہیں جو رسم

## مسائل العرفان فی علوم القرآن: جلد ①

معروف اور اصطلاحی مالوف کے مخالف ہیں خصوصاً مصاحف عثمانیہ کی رسم جو خط و املاء میں ہمارے قواعد کے مخالف نہیں ہے مگر بہت کم اور مزید یہ کہ دونوں اسموں کے فرق سے ہوشیار قاری کو اس میں غور و فکر کے وقت التباس اکثر نہیں ہوتا۔

ادامت پر صدیاں اور زمانے گزر چکے لیکن انھیں رسم عثمانی کے التزام میں ذرا بھی عیب محسوس نہیں ہوا حالانکہ شروع میں سب سے پہلے جس چیز پر بھروسہ کیا گیا وہ لوگوں کے سینوں سے (قرآن پاک کو) وصول کرنے کا طریقہ تھا اور تعلق (یعنی وصول کرنے) سے رسم کا ابہام ختم ہو جاتا ہے خواہ وہ ابہام کیسا ہو کیوں نہ ہو۔ آنکھوں کے دیکھنے کے بعد بیان کی ضرورت نہیں۔

### مصاحف کی تفصیل

شاید آپ کو یاد ہو کہ گزشتہ بلا اسماٹ میں ہم نے مصاحف عثمانیہ کے فروغ اس کی کتابت و رسم کو ذکر کیا تھا اور یہ بھی ذکر کیا تھا کہ اس کے علاوہ جو انفرادی مصاحف بعض صحابہ کے پاس تھے انھیں جلواد یا اور ان مصاحف کو بھی جلواد یا جو ایک دوسرے کے مخالف تھے جس قدر بھی انھیں معلوم ہوا کہ ان میں سے کسی ایک کو قراءات کے حروف کا علم ہے یا ان میں سے کسی کو آخری مرتبہ میں ہونے والے منسوخ یا غیر منسوخ کا علم ہے۔ مصاحف عثمانیہ کے تعلقات کے احاطہ کے لیے مناسب یہ ہے ہم آپ کے ساتھ مندرجہ ذیل باتیں کریں۔

جن مصاحف کو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے لکھا ان کا مجموعہ ان حروف سبچہ پر **مصاحف عثمانیہ میں حروف سبچہ** مشتمل تھا جن پر قرآن پاک نازل ہوا جیسا کہ ہم اسے نزول قرآن علی سبچہ حروف کی بحث میں ایک خاص عنوان کے تحت اچھی طرح سے بیان کر آئے ہیں اگر آپ چاہیں تو وہاں رجوع کر لیں اس کی تائید اس سے ہوتی ہے کہ ان مصاحف کو ان صحیفوں سے لکھا گیا ہے جو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں جمع کیے گئے اور یہ صحیفے حصہ بنائے پاس تھے۔

اور اس بات پر اتفاق ہے کہ یہ صحیفے جن میں قرآن پاک لکھا گیا انھی حروف سبچہ کے ساتھ لکھا گیا جن پر یہ نازل ہوا اور یہ کہیں وارد نہیں ہوا کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ان میں سے چھ حروف کو ترک کرنے اور ایک کو باقی رکھنے کا حکم دیا جیسا کہ بعض علماء کا یہ مذہب ہے۔ لہذا ہمیں متفق علیہ کو پکڑنا چاہیے تاکہ ہمارے پاس ایسی چیز ثابت ہو جائے جو اس کی نئی کرنے والی ہو پھر کیا وجہ ہے کہ ہم شک کی وجہ سے یقین کو چھوڑ دیں؟ پھر فتنہ کو ہانا اور مسلمانوں کے درمیان کلمہ کا ایک ہونا اس بات پر موقوف نہیں کہ ہم چھ حروف کو چھوڑ دیں اور ایک حرف کو باقی رکھیں بلکہ فتنہ کو ہٹنے اور کلمہ کا ایک ہونے کا ذریعہ یہ ہے کہ نازل ہونے والے کا اسی طرح اقرار کیا جائے جس طرح وہ نازل ہوا یعنی اس کے حروف سات ہونے کو اس امت کے لیے رحمت شمار کرنا۔ اس باب میں زیادہ سے زیادہ جو چیز واجب ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ مسلمان علمی طور پر ان حروف کو گھیر لیں اور باقی کو چھوڑ دیں اور اس کے سوا کسی پر اعتماد نہ کریں حتیٰ کہ ان میں سے ہر ایک اپنے علاوہ کی قرأت کو درست سمجھے جب تک کہ اس کی قراءت حد سے تجاوز نہ کرے۔ اسی طریقے سے ان کے فتنے دور ہوں گے اور ان کا کلمہ ایک ہوگا اور اسی طریقے پر ہوں جن پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عمل کیا جبکہ بعض صحابہ کے درمیان اس طرح

کے فتنے بھڑک گئے تھے چنانچہ آپ ﷺ ان کا علاج اس طرح سے کیا کہ انھیں سمجھایا کہ قرآن سات حروف پر نازل ہوا اور یہ معنی ان میں پختہ ہو گیا اور آپ نے حکم دیا کہ اختلاف کرنے والوں میں سے ہر ایک اپنی قرأت میں درست ہے اور قرآن پاک اسی طرح نازل ہوا اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہما جمہور صحابہ رضی اللہ عنہم اور تمام امت سے ممکن نہیں کہ وہ اس بارے میں رسول اللہ ﷺ کے طریقے کو چھوڑ دیں۔ ”وَأَنَّ خَيْرًا هَدَىٰ هَدَىٰ مُحَمَّدًا“

باقی رہی یہ بات کہ ہم آپ کے سامنے حضرت عثمان رضی اللہ عنہما کے قول کے معنی کی تفسیر کر دیں جو انھوں نے قریش کی ایک جماعت سے فرمایا تھا کہ ”جب تم اور زید بن عتبہ قرآن پاک کی کسی چیز میں اختلاف کرو تو اسے قریش کی زبان میں لکھو کیونکہ یہ قرآن ان کی زبان میں نازل ہوا چنانچہ انھوں نے ایسا ہی کیا۔“ بعض حضرات نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہما کے اس جملہ سے یہ سمجھا کہ انھوں نے چھ حروف کو چھوڑنے کا حکم دیا اور مصاحف لکھنے میں صرف قریش کے حروف اور صرف ان کی لغت میں لکھنے پر اکتفا کیا۔

یہ کنی وجوہ سے مردود ہے۔

① الفاظ یہ معنی ادا نہیں کر رہے۔

② قرآن پاک میں بہت سے کلمات ایسے ہیں جو دوسرے قبائل کی لغت سے ہیں قریش کی لغت سے نہیں اس بارے میں آپ اس بحث کو دیکھیں جو ہم نے پیچھے نزول قرآن علی سبعة احرف کی بحث میں بیان کر آئے ہیں نیز اس بحث کو دیکھیں جسے علامہ سیوطی نے ”الاتقان“ میں ”النوع السابع والثلاثين“ میں بیان کیا۔

③ مصاحف عثمانیہ سبعة احرف پر مشتمل تھے جیسا کہ ہم نے ابھی بیان کیا۔

④ ہمارے پاس کوئی صریح نقل ایسی نہیں آئی کہ انھوں نے سبعة احرف میں سے کچھ بھی چھوڑا ہو چکا جیسا کہ وہ ایک کے علاوہ سب کو چھوڑ دیں اگر انھوں نے ایسا کیا ہوتا تو یہ بھی متواتر منقول ہوتا اس لیے کہ یہ ایک عظیم الشان امر ہے جس کے نقل اور تواتر پر بہت سے اسباب متوجہ ہیں۔ ہمارے پاس بعض سندوں سے جو بات پہنچی ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ انھوں نے ”التابوت“ کے بارے میں اختلاف کیا جو اللہ تعالیٰ کے کلام میں سورة البقرة آیت ۲۳۸ میں ہے:

هُوَ وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ إِنَّ آيَةَ مُلْكِهِ أَنْ يَأْتِيَكُمُ التَّابُوتُ فِيهِ سَكِينَةٌ مِّنْ رَبِّكُمْ ﴿۱۸۴﴾ (البقرة: ۲۳۸)

”ان سے ان کے نبی ﷺ نے کہا کہ اس کی امارت کی علامت یہ ہے کہ وہ تمہارے پاس ایک تابوت لائے گا جس میں تمہارے رب کی طرف سے سکینہ ہوگی۔“

اب ان میں اختلاف ہوا کہ وہ اسے ”تائے مفتوحہ“ (ت) کے ساتھ لکھیں یا ہاء کے ساتھ حضرت عثمان رضی اللہ عنہما نے انھیں حکم دیا کہ وہ اسے تائے مفتوحہ کے ساتھ لکھیں اس لیے کہ لغت قریش میں یہ اسی طرح ہے۔

یہ ہمیں واضح کرتا ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہما نے اپنے اس کلمہ میں صرف کتابت اور رسم کے اختلاف کو مراد لیا الفاظ، لغات اور حروف کا اختلاف مراد نہیں لیا یا ان کی مراد یہ تھی کہ لغت قریش میں کامل درجہ کا تواتر ہے جو دوسری لغتوں میں نہیں لہذا اختلاف کی صورت میں اسی کو پکڑو، حضرت عثمان رضی اللہ عنہما کا یہ ارشاد صرف اسی غرض سے تھا یہی وہ تواتر تھا جس کی انھوں نے اپنی کتابت اور جمع کے دستور میں شرط رکھی تھی۔ مزید یہ کہ وہ مصاحف جو ان صحیفوں سے نقل ہوئے جنھیں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہما نے جمع کیا اور جو تواتر اور اجماع

## مسائل العرفان فی علوم القرآن: جلد ۱

امت کے ساتھ منصف شہود میں آئے جیسا کہ ہم ذکر کر آئے تو کیا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور ان کے موافق صحابہ رضی اللہ عنہم اس بات کو پسند کرتے تھے کہ وہ اس اجماع کو توڑ دیں اور اس کو توڑ کر بے کار چھوڑ دیں اور وہ بھی ایک ایسے معاملہ میں جس میں اللہ تعالیٰ نے تعدد وجوہ اور تعدد حرف کو آج تک امت کے لیے رحمت بنا رکھا ہے یہ بعید از عقل ہے۔

ہم نے کہا کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے قرآن پاک کو صحیفوں میں جمع کیا اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اسے مصاحف میں جمع کیا اور لکھا۔ صحف اور مصاحف میں بنیادی فرق یہ ہے کہ صحف صحیفہ کی

جمع اور صحیفہ ورق یا چمڑے کا وہ ٹکڑا ہے جس میں لکھا جاتا ہے۔

جبکہ صحف ”أَصْفَافٌ“ سے اسم مفعول کے وزن پر ہے ”أَصْفَافٌ“ کا معنی ”لکھے ہوئے اوراق کو جمع کرنا“ یعنی اس میں صحیفوں کو جمع کیا گیا۔ گویا کہ مصف کے لغوی معنی اس میں دو گتوں کا معنی ملحوظ ہے اور وہ اس کی دو جانب یا دو جلدیں ہیں جن میں ان کے اوراق کے مجموعے کو لیا جاتا ہے تاکہ اس کے صحیفوں کی حفاظت اور پختگی ہو سکے۔

اور ”صُفُفٌ“ میں یہ معنی ملحوظ نہیں ہیں اگرچہ ان دونوں الفاظ کا ان دونوں معانی میں استعمال ہونا صحیح ہے اور ان کے استعمال میں توسع ہے۔

یہ لغوی بنا تھی جبکہ اصطلاح میں صحیفوں سے مراد وہ اوراقی مجرہ ہیں جن میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے قرآن پاک جمع کیا اور وہ سورتیں تھیں جن میں صرف ان کی آیات مرتب تھیں اور ہر سورت علیحدہ تھی ایک دوسرے کے بعد مرتب نہ تھیں اور ”صحف“ سے اصطلاحی مراد وہ اوراق ہیں جن میں قرآن کو جمع کیا گیا اور ان میں آیات اور سورتوں کی وہی ترتیب تھی جس پر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دور میں امت جمع تھی۔

بعض حضرات نے صحف کا اطلاق حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے صحیفوں پر کیا اور اس کی توجیہ ظاہر ہے۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے پاس صحیفے موجود تھے کہ ان کی وفات کا وقت قریب آ گیا انھوں نے یہ صحیفے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو دے دیئے، اس لیے کہ انہوں نے اس کی وصیت ان ہی کے حق میں کی تھی پھر جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی وفات ہو گئی تو یہ صحیفے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی وصیت سے ان کی بیٹی ام المومنین حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کے پاس منتقل ہو گئے اس کے بعد حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے انھیں طلب کیا اور ان سے مصاحف کو لکھا اور انھیں واپس کر دیا اور وہ صحیفے حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کی وفات تک ان کے پاس رہے۔

حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کے جنازہ میں اس وقت مدینے کا والی مروان موجود تھا اس نے چاہا کہ ان کے بھائی حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ وہ صحیفے اس کے پاس بھیج دیں انھوں نے وہ صحیفے اس کے پاس بھیج دیئے اس سے پہلے بھی مروان نے یہ صحیفے سیدہ حفصہ رضی اللہ عنہا سے مانگے تھے انھوں نے انکار کر دیا تھا۔

ابن ابوداؤد نے ایک روایت میں نقل کیا کہ مروان کے وہ صحیفے جلا دیئے ایک روایت میں نقل کیا کہ انھیں دھو ڈالا اور ایک روایت میں ہے کہ انھیں پھاڑ ڈالا اور ان روایات کو جمع کرنے میں کچھ بھی مانع نہیں کہ اول انھوں نے انھیں دھو ڈالا ہو پھر انھیں پھاڑ دیا ہو اور اس کے بعد آخر میں انھیں جلا دیا ہوتا تا کہ تکبر و کجی میں مبالغہ ہو جائے۔ جیسا کہ مروی ہے کہ اس نے کہا کہ میں نے یہ ان لیے کیا کہ مجھے خوف ہو کہ اگر زمانہ لمبا ہو گیا تو شک کرنے والے ان صحیفوں کے بارے میں شک کریں گے یعنی وہ سمجھیں گے کہ ان



میں جو کچھ ہے وہ مصاحف کے مخالف ہے کیونکہ وہ کبھر سے ہوئے صحیفے تھے مرتب اور جمع کیے ہوئے مصاحف کی شکل میں نہ تھے۔

**مصاحف کی تعداد؟** چنانچہ ابن عاشر نے صحیح یہ قرار دیا کہ وہ چھ تھے ایک مکی، ایک شامی، ایک بصری، ایک کوئی اور

ایک مدنی عام تھا جسے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اس کی کتابت کے محل سے اس کے ٹھکانے تک بھیجا اور ایک مدنی خاص جسے انھوں نے اپنے لیے روک لیا جسے "امام" کے ساتھ موسوم کیا گیا۔ اور "زاد القراء" والے نے یہ بھی اضافہ کیا کہ جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے "الامام" نامی مصحف میں جمع کیا تو اس سے کئی مصاحف لکھے جن میں سے ایک مکہ کو بھیجا، ایک کوفہ کو، ایک بصرہ کو۔ ایک شام اور ایک مصحف مدینہ میں روک لیا یہ قول بھی سابقہ قول کی طرح ہے کہ وہ چھ تھے جبکہ سیوطی اور ابن حجر کا مذہب یہ ہے کہ وہ پانچ تھے ممکن ہے کہ ان دو حضرات کی پانچ سے مراد مصحفِ امام کے علاوہ مصاحف تھے تاکہ یہ اختلاف اس قول اور اس سے پہلے دونوں اقوال کے درمیان اختلاف لفظی ہو جائے۔

بعض نے کہا کہ یہ آٹھ تھے ان میں سے پانچ متفق علیہ تھے یعنی کوئی، بصری، شامی، مدنی عام اور مدنی خاص اور تین اختلافی تھے مصحف مکی، مصحف بحرین اور مصحف یمن اور بعض نے کہا کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے مصر کی طرف بھی ایک مصحف بھیجا تھا۔ شاید یہ قول کہ ان کی تعداد چھ تھی یہی قول قبولیت کے لیے بہتر ہے اور ہر حال میں مفہوم یہ ہے، کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے مصاحف کی ایک ایسی تعداد کو لکھوایا جس سے امت کی ضرورت پوری ہو جائے اور ان کا کلمہ مجتمع ہو جائے اور ان کا تختہ ختم ہو جائے اس میں تعداد کی تعیین کوئی بڑی غرض نہیں تھی اس لیے اس کی تعیین میں اس اختلاف کے دلائل کے بقدر اختلاف ہو گیا اور حقیقت کو اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے مصاحف عثمانیہ کو کیسے بھیجا؟

نقل قرآنی میں اعتماد ہمیشہ لوگوں کے سینوں سے حاصل کرنے پر رہا کہ ایک ثقہ سے دوسرے ثقہ سے اور ایک امام دوسرے امام سے حاصل کرتا، اسی وجہ سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ایسے حفاظ کو منتخب کیا جن پر انھیں بھروسہ تھا اور انھیں بلاد اسلامیہ میں بھیجا اور ان مصاحف کے معاملہ میں مبالغہ کرتے ہوئے اور قرآن پاک کی پختگی اور مسلمانوں کا کلمہ جمع کرنے کی غرض سے ان مصاحف کو دہرا اصول سمجھا گیا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ ہر ملک میں اپنا مصحف اس شخص کے ساتھ بھیجتے جس کی قرأت اکثر داخل اس کے مطابق ہوتی تھی۔ مروی ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کو حکم دیا کہ وہ مصحف مدنی سے پڑھا میں اور حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ بن السائب کو مکی مصحف دے کر بھیجا اور مغیرہ بن شہاب کو شامی دے کر بھیجا اور حضرت عبدالرحمن رضی اللہ عنہ سلمی کو کوئی اور عامر بن عبد قیس کو بصری دے کر بھیجا پھر تابعین رضی اللہ عنہم سے صحابہ رضی اللہ عنہم سے نقل کیا اور مصر والوں نے اپنے مصحف میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے سیکھ کر پڑھا جنھوں نے نبی کریم ﷺ کے وہاں مبارک سے پڑھا اور اس معاملہ میں وہ صحابہ رضی اللہ عنہم کے قائم مقام ہو گئے جنھوں نے نبی کریم ﷺ کے وہاں مبارک سے سیکھا اس کے بعد قوم پڑھنے، سیکھنے اور یاد کرنے کے لیے فارغ ہو گئی تھی کہ اس بات میں وہ لوگ ایسے امام بن گئے کہ ان کی طرف سفر کیا جانے لگا اور اس سے قرآن سیکھا جانے لگا اور ان کے علاقے والے ان کی قرأت سیکھنے اور ان کی روایت پر اعتماد کرنے پر جمع ہو گئے اسی وجہ سے قرأت ان کی طرف منسوب ہونے لگی اور ان مصاحف میں جو کچھ تھا امت

منائل العسرفان فی علوم القرآن: جلد ①

کا اس پر اجماع ہو گیا (اور امت اپنے اجماع میں معصوم ہے) اور اس کے خلاف کسی بھی زیادتی کی یا تبدیلی کو ترک کرنے پر امت نے اجماع کر لیا اس لیے کہ اس کا قرآن ہونا ان کے نزدیک ثبوت متواتر کے ساتھ ثابت نہیں ہے۔

## اس وقت مصاحف عثمانیہ کہاں ہیں؟

ہمارے سامنے کوئی قطعی دلیل نہیں ہے کہ اس وقت مصاحف عثمانیہ کہاں ہیں؟ چہ جائیکہ ہمیں ان کے مقامات کی تعیین معلوم ہو جائے ہمیں ان کے بارے میں جو آخری معلومات ہے وہ یہ ہے کہ ابن جزری نے اپنے زمانے میں اہل شام کا نسخہ دیکھا اور مصر میں بھی مصحف دیکھا۔

البتہ مصر میں مصاحف اثریہ جن پر وہاں کی کتب کی الماریاں اور پرانی یادگاریں مشتمل ہیں ان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ مصاحف عثمانیہ ہیں ان کے بارے میں ہمیں بہت زیادہ شک ہے کہ ان کی نسبت حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی طرف کی جائے اس لیے کہ ان میں نقش و نگار اور وضوح کردہ علامات ہیں جیسے دوسورتوں کے درمیان فصل کی علامات نیز قرآن پاک کے اعشار کو بیان کرنے کی علامات بھی ہیں اور یہ بات مقرر ہے کہ مصاحف عثمانیہ ان سب چیزوں سے خالی تھے نیز نقطوں اور اعراب سے بھی خالی تھے جیسا کہ آپ کو معلوم ہے۔

ہاں البتہ مسجد حسینی کے آثار قدیمہ کی الماری میں جو مصحف محفوظ ہے اور اس کی نسبت حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی طرف کی گئی ہے وہ خط کوفی میں لکھا ہوا ہے اس کے حروف بھی خالی ہیں اور اس کا حجم بہت زیادہ وسیع ہے۔ اور اس کا رسم بھی مصحف مدنی یا شامی کے موافق ہے اس میں کلمہ ﴿مَنْ يَزِدْكَ﴾ (المائدہ: ۵۳) دو دالوں کے ساتھ لکھا ہوا ہے یعنی ادغام کے بغیر اور اس میں بھی یہ کلمہ اسی رسم کے مطابق ہے لہذا غالب گمان یہ ہے کہ یہ مصحف اپنی بعض رسوم کے مطابق مصحف عثمانیہ سے ہی منقول ہے اسی طرح وہ مصحف جو ان الماریوں میں محفوظ ہے اور کہا جاتا ہے کہ حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ انھیں اپنے خط میں لکھا تھا جس میں ملاحظہ کیا جاتا ہے کہ وہ خط کوفی قدیم کے ساتھ لکھا ہوا ہے مگر یہ کہ اس کا حجم چھوٹا ہے اور اس کا خط پہلے سے کم خالی اور اس کا رسم مصاحف عثمانیہ میں سے مدنی اور شامی مصاحف کے علاوہ دیگر کے موافق ہے کیونکہ ان میں گزشتہ بالا کلمہ ﴿مَنْ يَزِدْكَ﴾ ایک دال کے ساتھ یعنی ادغام کے ساتھ لکھا ہوا ہے اور یہ ان دو کے علاوہ دیگر مصاحف میں اسی طرح لکھا ہوا ہے ہو سکتا ہے کہ اسے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ہی لکھا ہو یا کوئی میں اس کی کتابت کا حکم دیا ہو۔

پھر مصاحف عثمانیہ میں سے کسی کا باقی نہ رہنا، ہمیں بالکل معزز نہیں جب تک کہ معتد علیہ نقل اور تلقی ثقہ عن ثقہ اور تلقی امام عن امام نبی کریم ﷺ تک ہو اور یہ قرآن پاک میں اعلیٰ درجہ کا مشہور و متواتر ہے جو اب تک ہے۔

کیونکہ مصاحف عثمانیہ کے طریقے پر ہر زمانے اور ہر شہر میں ہزاروں نسخے لکھے گئے ہیں اور ان میں رسم عثمانی کی محافظت سے بھی کی گئی ہے جیسا کہ عنقریب آ رہا ہے انشاء اللہ تعالیٰ لہذا آپ اسی پر صبر کیجئے:

﴿وَمَا صَدُوكَ اِلَّا بِاَنفِكَ﴾ (الخل: ۱۲۷)

”آپ کا صبر بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے۔“

## تجوید و تحسین کے دور میں مصاحف

مصاحف عثمانیہ آسمان سے نازل ہونے والے اس پانی کے مشابہ ہیں جو کسی اچھی اور زرخیز زمین میں نازل ہوئی لیکن وہ زمین خشک اور پیاسی ہو پھر جیسے ہی اس کو پانی ملا تو وہ تروتازہ ہو کر ابھر آئی اور اس نے ہر طرح کے پُر رونق نباتات اگائے۔ اسی طرح مصاحف شریف ہیں کہ جیسے ہی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے انھیں اسلامی ممالک کی طرف بھیجا تو ان کی طرف امت ہر طرف اور ہر قسم کی زمین سے متوجہ ہوئے حتیٰ کہ مشرق و مغرب میں ان کا کلمہ مجتمع ہو گیا اور اس کے مطابق ہر قوم اور ہر نسل میں ہزاروں مصاحف مقدر لکھے گئے۔

نظریں جن چیزوں کی طرف متوجہ ہوتی ہیں ان میں سے یہ بھی ہے کہ تجوید و تحسین اور آرائشی کے ہاتھ نے مصاحف کو مختلف رنگوں اور مختلف اقسام کے ساتھ لینا شروع کر دیا کہیں مادی تحسینات ہیں اور کہیں صورتی تحسینات ہیں جو نسونوں، طبیعت، حجم، ورق اور تجلید و تہذیب کی طرف لوٹی ہیں اس میں ہم نے اپنے آپ کو زیادہ تھکا یا نہیں اس لیے کہ اس کا معاملہ آسان ہے اگر چہ ان میں کچھ آسان اور قرآن کریم کی طرف شوق دلانا ہے۔

اور پھر اس مقام پر تحسینات معنویہ یا جوہریہ ہیں جن کا مرجع نطق حروف، تمیز کلمات، اور تشابہات کے درمیان فرق کی تحقیق بطریق اعجاز (یعنی نطق لگانے) و شکل (یعنی اعراب لگانے سے) ہوتا ہے۔ انہی کے بارے میں ہم کچھ کلام کریں گے۔

اعجاز الکتاب“ کتاب کو نطق لگانا قاموس میں ہے کہ ”أَعْجَمَهُ فَلَانَ الْكَلَامَ“ (اسے عجی بنا دینا) ”وَالْكِتَابَ“ اعجاز (اسے نطق لگانا) اسی طرح ”عَجَمَةٌ“ اور ”عَجْمَةٌ“ کا معنی بھی یہی ہے۔

اور یہ بات مشہور و معروف ہے کہ مصحف عثمانی پر نطق نہیں تھے جس کی وجہ وہی مقصد ہے جسے ہم نے پیچھے ذکر کیا اور وہ مقصد کلمہ حتملہ کو اس طرح باقی رکھنا ہے کہ اس میں حتیٰ الامکان قراءات کی وجہ پڑھی جا سکیں مگر مورخین نے اختلاف کیا کسی نے کہا کہ نطق لگانا اسلام سے پہلے بھی معروف تھا لیکن مصاحف میں انھوں نے اسی گزشتہ بالا مقصد کی وجہ سے چھوڑ دیا۔ بعض نے کہا کہ نطق بعد میں ابو الاسود دہلی کے ہاتھ سے معروف ہوئے۔

جو بھی ہو، ہر صورت نطق لگانا عبدالملک بن مروان کے زمانے میں مشہور ہوا جب انھوں نے دیکھا کہ اسلام کا رقعہ پھیل چکا اور عرب نقطوں میں بھی اختلاف کرنے لگے قریب تھا کہ یہ اختلاف لغت کی سلامتی کو بھی چھو جاتا اور قراءت مصاحف میں اشکال و التباس واقع ہو جاتا جو لوگوں کے ساتھ اڑا رہتا حتیٰ کہ ان کے غیر منقوہ ہونے کی صورت میں ان کی کسی جماعت کو مصحف کے حروف اور کلمات کے درمیان تمیز کرنا ہی مشکل ہو جاتا اس موقع پر عبدالملک بن مروان نے اس پریشانی سے نجات دلانے کے لیے گہری نظر سے سوچا اور حجاج کو حکم دیا کہ وہ اس جلیل القدر کام کا اہتمام کرے حجاج نے (امیر کی اطاعت کرتے ہوئے) دو آدھیوں کو آمادہ کیا کہ وہ اس مشکل کا ازالہ کریں وہ دو آدھی نصر بن عاصم لثی اور یحییٰ بن یحمر عدوانی تھے اور یہ دونوں ایسے تھے کہ جس کام کے لیے انھیں چنا

گیا وہ اسی کے لائق تھے اس لیے کہ یہ دونوں علم و عمل اور صلاح و ورع کے جامع تھے نیز اصول لغت اور وجہ قرأت کو بھی خوب جانتے تھے اور ابوالاسود دؤلی کی شاگردی اور اس سے علم حاصل کرنے میں بھی مشترک تھے۔

ان دونوں بزرگوں پر اللہ تعالیٰ رحم فرمائے کہ انھوں نے اس کوشش میں کامیابی پائی اور مصحف شریف کو پہلی مرتبہ نقطے لگوائے اور تمام متناہج حروف پر نقطے لگوائے اور انھوں نے اس چیز کا بھی اہتمام کیا کہ کسی بھی حرف میں نقطے تین سے تجاوز نہ کریں اس کے بعد یہ نقطے لوگوں میں پھیل گئے اور مصحف شریف سے اشکال و التباس زائل کرنے میں اس کا بڑا اثر ہے۔

بعض نے کہا کہ مصحف میں سب سے پہلے ابوالاسود دؤلی نے نقطے لگوائے اور ابن سیرین کا مصحف بھی نقطوں والا تھا لیکن صفت فردی کے ساتھ تھا اسے یحییٰ بن یعمر نے نقطے لگائے۔

ان اقوال کے درمیان تطبیق اس طرح ممکن ہے کہ سب سے پہلے مصحف کو نقطے لگانے والا ابوالاسود دؤلی تھا لیکن اس نے یہ نقطے صفت فردی کے ساتھ لگائے اس کے بعد ابن سیرین و یحییٰ ان کے پیچھے چلے اور عبدالملک بن مردان بھی پہلا وہ شخص ہے جس نے مصحف میں نقطے لگائے لیکن صفت رسمہ عامہ کے ساتھ جو لوگوں کے درمیان پھیل گئے تاکہ قرآن پاک پڑھنے میں لوگوں سے التباس و اشکال دور کر دیا جائے۔

**مصاحف کی تشکیل** تشکیل کتاب لغت میں "اعجام" کے ہی ہم معنی ہے اور آپ جان چکے ہیں کہ "انجاء" کا معنی کو نقطے لگائے جیسا کہ "اشکالہ" کا معنی ہے۔ گویا کہ اس نے اس کا اشکال دور کر دیا۔ پھر اشکال کا استعمال حروف کے خصوصی عوارض یعنی حرکت یا سکون میں ہونے لگا۔

ان دونوں معانی کے درمیان مناسبت ظاہر ہے اس لیے کہ ان دونوں میں سے ہر ایک میں حروف کے اشکال کو دور کرنا اور ان سے التباس ختم کرنا ہے۔

مؤرخین کا اتفاق ہے کہ عرب اپنے پہلے زمانے میں حروف کی شکل اور کلمات سے واقف تھے چہ جائیکہ وہ ان پر اعراب لگاتے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کی لغت کی سلاستی، ان کے سلیقوں کا نکھار اور ان کی زبانوں کی فصاحت یہ سب چیزیں ایسی ہیں جو انھیں اعراب سے مستثنیٰ کر دیتی ہیں لیکن جب اسلام ام جدیدہ میں داخل ہو گیا جن میں بعض لوگ عجمی بھی تھے جو عربی نہیں جانتے تھے تو اس اعراب کے نہ ہونے نے لغت قرآن پر ظلم کرنا شروع کر دیا۔ بلکہ کہتے ہیں کہ ابوالاسود دؤلی و یحییٰ نے ایک قاری کو سنا جو اللہ تعالیٰ کا قول ﴿إِنَّ اللَّهَ بَرِيءٌ مِّنَ الْمُشْرِكِينَ﴾ (الہوب: ۳) پڑھ رہا تھا اس نے "ورسولہ" کے لام کو ج کے ساتھ پڑھا۔

اس بدترین غلطی نے ابوالاسود و یحییٰ کو چونکا دیا انھوں نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی ذات اس سے بھرا ہے کہ وہ اپنے رسول اللہ ﷺ سے بری ہو جائے اس کے بعد وہ بصرہ کے دالی زیاد کے پاس گئے اور انھیں فرمایا کہ آپ نے جو سوال کیا میں اس کے جواب کے لیے حاضر ہوا ہوں۔ زیاد نے ان سے سوال کیا تھا کہ وہ لوگوں کے لیے کچھ علامات بنائیں جن کے ذریعے وہ اللہ تعالیٰ کے کلام کو بچائیں چنانچہ انھوں نے جواب میں دیر کر دی حتیٰ کہ اس حادثہ نے انھیں گھبراہٹ میں ڈال دیا یہاں ان کی بزرگی چمک اٹھی اور ان کا اجتہاد یہاں تک پہنچا کہ انھوں نے فتح (زبر) کی علامت حرف کے اد پر نقطہ کو بنا دیا اور کسرہ (زیر) کی علامت حرف کے

نیچے نقطہ اور ضمہ کی علامت حرف کے اجزاء کے درمیان نقطہ کو بنا دیا اور سکون کی علامت دو نقطے کو بنا دیا۔

لوگوں نے ان کے طریقے پر چلنا شروع کر دیا پھر زمانہ گزرتا گیا اور لوگ زیادہ ہونے اور آگے بڑھنے لگے تو انھوں نے مشدد کے لیے قوس کی علامت کو وضع کر لیا اور الف و صل کے لیے ایک چھوٹی سی لکیر جو اس کے اوپر، نیچے یا درمیان میں لگائی جاتی تھی جیسا کہ اس سے پہلے فتح، کسرہ یا ضمہ ہوتا تھا اسی طرح ہوتا رہا کہ عبدالملک بن مروان آیا اس نے اپنی گہری بصیرت سے سوچا کہ وہ حروف کو ایک دوسرے سے ممتاز کرے اور اس کے لیے اعراب اور نقطوں کا راستہ اپنائے جیسا کہ سابقہ عنوان کے تحت گزرا اور اس موقع پر یہ بھی ضرورت پیش آئی کہ پہلے اعراب جو نقطوں کی صورت میں تھے انھیں ایک نئی شکل میں تبدیل کیا جائے جنہیں آج کل ہم فتح کسرہ، ضمہ اور سکون کی علامات کے نام سے جانتے ہیں اس تبدیلی کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ اگر ان علامات کو اپنی پہلی حالت یعنی نقطوں کی صورت میں چھوڑ دیا جائے پھر ان کے بعد دوسرے نقطے بھی آ جائیں تو ان دونوں میں مشابہت ہو جائے اور معاملہ مشتبہ ہو جائے گا اس لیے ان دونوں چیزوں میں اس طریقے سے فرق کیا گیا اور کیا ہی اچھا کام کیا!

**مصحف کے نقطوں اور اعراب کا حکم** پہلی صدی میں علماء کرام مصحف کے اعراب اور نقطوں کو ناپسند سمجھتے تھے یہ ان کی طرف سے مصحف کے رسم کے مطابق ادائے قرآن پر محافظت میں مبالغہ تھا نیز انھیں خوف تھا کہ کہیں اس کے ذریعے اس میں تغیر واقع نہ ہو جائے۔

اس بناء پر حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ انھوں نے فرمایا کہ قرآن پاک کو خالی چھوڑو اور اس کے ساتھ کسی چیز کو خلط ملط نہ کرو۔ نیز حضرت ابن سیرین رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ انھوں نے نقطوں اور ابتداء اور انتہا وغیرہ کے نشانات کو ناپسند کیا۔ لیکن جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ زمانہ بدلتا چلا گیا اور مسلمانوں کو مصحف کے اعراب اور نقطوں کی ضرورت پیش آتی رہی اور اس کا سبب وہی یعنی مصحف کے رسم کے مطابق قرآن کے اداء پر محافظت تھا اور یہ بھی خوف تھا کہ نقطوں اور اعراب سے خالی ہونا اس میں تغیر کا باعث نہ بن جائے۔

اس صورت حال میں قابل اعتماد یہی تھا کہ ان لوگوں کی نقطوں اور اعراب کی کراہت زائل ہو جائے اور اس کی جگہ ان کے وجوب یا استحباب کے قول کو لیا جائے اس لیے کہ یہ بات طے ہے کہ حکم اپنے وجود یا عدم میں علت پر دائر ہوتا ہے نو دی نے اپنی کتاب "الہیجان" میں فرمایا کہ آج اطمینان ہو گیا کہ اس کے بدعت ہونے کی وجہ سے اس سے منع نہیں کیا جائے گا کیونکہ بدعت حسنہ ہے لہذا اس سے منع نہیں کیا جائے گا جیسا کہ اس کی نظیر میں مثلاً علم کا تصنیف ہونا مدارس اور خانقاہوں کا بنانا وغیرہ۔ واللہ اعلم۔

**قرآن پاک کے پارے** مصحف عثمانی جیسے نقطوں اور اعراب سے خالی تھے اسی طرح وہ ان پاروں سے بھی ہو گئے اور انھوں نے مختلف اعتبارات سے اس کے کئی حصے کر لیے ان میں سے بعض نے قرآن پاک کو تیس حصوں میں تقسیم کیا اور ہر حصے پر اس کے جزء کا نام رکھ دیا حتیٰ کہ جب اس کا اطلاق کیا جاتا تھا تو دوسرے کی طرف ذہن منتقل نہیں ہوتا تھا حتیٰ کہ جب کوئی کہتا کہ کیا آپ نے قرآن پاک کا پارہ پڑھا تو ذہن فوراً اسی طرف جاتا تھا کہ اس نے مصحف کے تیس پاروں میں سے کوئی پارہ پڑھا اس طریقے پر "اصحاب الربعات" (پاروں والے) چلے اس لیے کہ انھوں نے اس کے ہر جزء کو ایک مستقل نسخہ میں طبع کر دیا اور نسخوں

کو مجموعہ جو پورے قرآن کو جامع ہوتا ہے اسے سب لوگ ربوہ کہنے لگے اس قبیل سے مستقل پارے طبع شدہ مل جاتے ہیں جو مدارس میں چھوٹے چھوٹے طالب علموں کے ہاتھ میں ہوتے ہیں۔

بعض لوگوں نے پاروں کو دو حصوں میں تقسیم کیا اور بعض نے چار میں اور ان میں ہر ایک کو "ربح" کا نام دیا۔ بعض لوگوں نے سورۃ کی پانچ آیات پوری ہونے پر "خمس" کا کلمہ وضع کیا اور دس آیات کے اختتام پر عشر کا کلمہ وضع کیا جب عشر کے بعد پانچ آیات اور ہو جاتی ہیں تو خمس کا کلمہ دوبارہ لوٹ آتا ہے اور جب یہ پانچ دس ہو جاتی ہیں تو دس کا کلمہ دوبارہ دہراتے ہیں اسی طرح سورت کے آخر تک معاملہ چلتا رہتا ہے۔ بعض لوگ انہاس کی جگہ پر خمس لکھنے کی بجائے خاء کا سرا لکھ دیتے ہیں اور اعشار کی جگہ پر عشر لکھنے کی بجائے عین کا سرا لکھ دیتے ہیں اور بعض لوگ آیت کے اختتام پر بطور اشارہ سورۃ کا آیت نمبر یا اس کے علاوہ کوئی اور نشان لگا دیتے ہیں اور بعض لوگ سورتوں کے شروع کو ایسے عنوان کی طرح لکھتے ہیں جو سورت کے نام اور اس میں آنے والی کئی آیات کی وضاحت کرتے ہیں۔

اس بارے میں علماء کا طویل کلام ہے جو کراہت کے ساتھ جواز اور بلا کراہت کے ساتھ جواز پر مشتمل ہے لیکن ہر حال میں گفتگو آسان ہے کہ جب تک غرض ہو اور وہ تیسرے قسمیں ہیں اور جب تک کہ معاملہ التباس، زیادتی اور غیر لفظ کے اس میں داخل ہونے سے بعید ہو۔

﴿وَعَلَى اللَّهِ قَصْدُ السَّبِيلِ﴾ (نمل: ۹)

"اللہ ہی کے ذمہ ہے سیدھا راستہ۔"

**مصحف کا احترام** ہمارے دیکھنے سننے میں کوئی کتاب ایسی نہیں آئی جو قرآن کریم کی طرح اجلال و تقدیس پر محیط ہو حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ نے اس کا وصف اس طرح بیان کیا کہ وہ ایک پوشیدہ کتاب ہے اور اللہ تعالیٰ نے فیصلہ کیا کہ اسے صرف پاکیزہ لوگ ہی ہاتھ لگا سکتے ہیں اور اس پر قسم کھائی کہ:

﴿فَلَا أُقْسِمُ بِمَوْجِعِ النُّجُومِ ۗ وَإِنَّهُ لَقَسَمٌ لِّوَعْلَمُونَ عَظِيمٌ ۗ إِنَّهُ لَقُرْآنٌ كَرِيمٌ ۗ فِي كِتَابٍ مَّكْنُونٍ ۗ لَا يَمَسُّهُ إِلَّا الْمُطَهَّرُونَ ۗ تَنْزِيلٌ مِّن رَّبِّ الْعَالَمِينَ ۗ﴾ (القدر: ۷۵-۸۰)

"میں ان جگہوں کی قسم کھا کر کہتا ہوں جہاں ستارے گرتے ہیں اگر تم سمجھو تو یہ ایک بڑی قسم ہے بے شک وہ ایک معزز قرآن ہے جو ایک چھپی ہوئی کتاب میں ہے اسے وہی لوگ ہاتھ لگا سکتے ہیں جو پاکیزہ ہیں یہ سب رب العالمین کی طرف سے نازل کیا گیا ہے۔"

حتیٰ کہ رسول اللہ ﷺ نے اسے لے کر دشمن کی زمین کی طرف جانے سے بھی منع فرمایا جب مصحف ان کے ہاتھوں میں جانے کا خوف ہو اور حدیث صحیحین میں مروی ہے۔<sup>①</sup>

اور یہاں تک کہ علماء نے اس شخص کے کفر کا فتویٰ دیا ہے جس نے اسے گندگی میں پھینک دیا ہو اور کافر کے ہاتھ فرودخت



منہاں العرفان فی علوم القسّر آن: جلد ①

کرنے کے حرام ہونے کا بھی فتویٰ دیا ہے اور اس کو چھونے اور اٹھانے کے لیے طہارت کے واجب ہونے کا بھی فتویٰ دیا ہے اسی طرح جو چیز قرآن پاک کے ساتھ متصل ہو یعنی کپڑا، غلاف اور صندوق وغیرہ صحیح قول کے مطابق انھیں بھی چھونے کے لیے بھی طہارت کے واجب کا حکم دیا ہے۔

اور اس کی کتابت خوبصورت اور واضح کرنے اور ان کے حروف کو صاف رکھنے کو مستحب قرار دیا ہے۔ نووی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ مصحف کے لیے کھڑا ہونا مستحب ہے جب وہ سامنے پیش کیا جائے اس لیے کہ علماء اور خواص کے لیے قیام مستحب ہے تو مصحف کے لیے بدرجہ اولیٰ ہونا چاہیے۔

اللہ تعالیٰ ہمیں اپنا اپنی کتاب کا اور اپنے تمام برگزیدہ بندوں کا ادب کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین



## قراءات، قراء اور ان پر ہونے والے شبہات کے بیان میں

”قراءات“ ”قراءة“ کی جمع ہے اور لغت میں یہ ”قراء“ سے مصدر سماعی ہے اور اصطلاح میں ”ائمہ قراء میں سے کسی امام کا مذہب جس کے ذریعے وہ قرآن کریم کے تلفظ میں دوسرے ائمہ کی مخالفت کرتا ہو اور اس امام سے روایات اور طرق میں بھی اتفاق ہو خواہ یہ مخالفت حروف کے بولنے میں ہو یا اس کی بیانات کے بولنے میں ہو۔“

امام سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے سند کے عالی یا نازل ہونے کی تقسیم پر کلام کرتے ہوئے فرمایا کہ ”علماء حدیث کی اس تقسیم کی مشابہت ایسے ہے جسے قراء نے سند کے احوال کو قرات، روایت طریق اور وجہ کی طرف تقسیم کیا ہے چنانچہ اگر اختلاف ائمہ سبعہ یا عشرہ وغیرہ کا ہو اور اس کے بارے میں ان کی طرف سے روایات و طرق میں اتفاق ہو تو وہ قرات ہے اور اگر اس سے روایت کرنے والے کا اختلاف ہو تو وہ ”روایت“ ہے اور اگر بعد والوں میں سے کسی کا اختلاف ہو تو اگر وہ نازل ہو تو ”طریق“ ورنہ اگر وہ ان صفات کے مطابق نہ ہو یعنی وہ اس طرف راجع ہو کہ پڑھنے والے کو اس میں اختیار ہے تو وہ ”وجہ“ ہے۔۔۔۔ الخ۔“

امین جوزی کی ”منجد المقرئین“ میں ہے کہ ”قراءت قرآن پاک کے کلمات کے اواکی کیفیات اور ان کے اختلاف کو جاننا نقل کرنے والوں کے انتساب کے ساتھ اور مقری اس کو جاننے والا جس نے اسے مشابہت روایت کیا ہو اگر اسے یاد ہو تو اس کے لیے جائز نہیں کہ وہ اسے پڑھائے اگر اس نے اس شخص سے مشابہت نہ کیا ہو جس کا وہ مسلسل مشابہت بیان کر رہا ہے اس لیے کہ قراءات میں کچھ اشیاء ہیں جو سماع اور مشافہہ کے بغیر محکم نہیں ہو سکتیں۔ اور قاری مبتدی وہ ہے جو افراد میں شروع کرے اور تین قراءتوں کا افراد کرے اور تہنی وہ شخص ہے جو قراءات میں سے اکثر اور مشہور قراءتوں کو نقل کرے۔“

**علم قراءات کا ارتقاء** ہم نے بارہا کہا کہ قرآن کریم میں مستند علیہ ایک دوسرے سے حاصل کرنا اور لینا ہے کہ ایک ثقہ دوسرے ثقہ سے اور ایک امام دوسرے امام سے حاصل کرے اور یہ سلسلہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچ جائے اور مصحف اس باب میں عمدہ نہ تھے یہ تو صرف ماخذ اور مرجع تھے جو مسلمانوں کو رب کی کتاب پر جمع کرنے والے تھے لیکن اسی حدود میں جس پر یہ دلالت کرتے اور جس کی تعیین کرتے تھے نہ کہ جس پر یہ دلالت نہ کرتے ہوں اور جن کی یہ تعیین نہ کرتے ہوں۔

اور آپ جانتے ہیں کہ مصاحف پر نہ نقطے تھے اور نہ ہی اعراب تھے اور ان میں کلمہ کی صورت میں مختلف قراءات کی ہر ممکن وجوہ کا احتمال تھا اور جب احتمال نہ ہوتا تو مصحف میں کلمہ کو کسی وجہ کے مطابق لکھا جاتا اور پھر دوسرے مصحف میں دوسری وجہ کے مطابق اسی طرح آخر تک۔ اب کوئی تعجب کی بات نہیں کہ اعتماد اور بھروسہ روایت اور طبعی پر ہو جو کہ قراءات اور قرآن میں عمدہ ہیں۔ پھر صحابہ رضی اللہ عنہم کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سیکھنے میں بھی اختلاف ہو جاتا کوئی آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے قرآن ایک حرف پر سیکھتا کوئی دو

حروف پر سیکھتا اور کوئی اس سے بھی زیادہ حروف پر سیکھتا پھر وہ مختلف علاقوں میں اسی حال پر پھیل جاتے اسی وجہ سے ان سے تابعین کے سیکھنے میں بھی اختلاف ہوتا اور پھر تبع تابعین کا تابعین سے سیکھنے میں بھی اسی طرح اختلاف ہوتا اور یہ اختلاف اسی طرح چلتا جاتا حتیٰ کہ معاملہ اسی طریقہ پر ان مشہور قراء تک پہنچ جاتا ہے جو قراءات کے لیے مختص ہوئے وہ انھیں ضبط کرتے اور انھیں مختلف عنوان یا نسبت دے کر ان کی اشاعت کرتے جیسا کہ آ رہا ہے۔

یہ علم قراءات اور اس کے اختلاف کا منشا ہے اگر کثیر اتفاقی مقامات کو دیکھا جائے تو یہ اختلاف اگرچہ درحقیقت تھوڑے سے امور کی طرف لوٹتا ہے لیکن پھر بھی (ہر حال میں) یہ اختلاف ان حروف سبب کے دائرے میں ہی رہتا ہے جن پر قرآن پاک نازل ہوا اور وہ پورا کا پورا اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے نہ رسول اللہ ﷺ کی طرف سے ہے اور نہ ہی کسی قاری وغیرہ کی طرف سے ہے۔

نوری ریشیہ کی ایک کتاب ہے جو مصر کے دارالکتب میں لکھی گئی انھوں نے اسے ”الطیبة فی القراءات العشر“ کی شرح کے طور پر وضع کیا تھا میں پسند کرتا ہوں کہ اس موقع پر اس میں سے مندرجہ ذیل کلمات نقل کر کے آپ کی خدمت میں پیش کروں۔

”نقل قرآن میں اعتماد حفاظ پر ہے اسی وجہ سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ہر مصحف کے ساتھ کوئی ایسا قاری بھی بھیجا جس کی قرأت اکثر طور پر اس کے ساتھ ملتی ہو اور لازم نہ ہو۔ ہر شہر نے انھی الفاظ کے ذریعے پڑھا جو ان کے مصحف میں تھے اور سیکھا وہی کچھ جو انھوں نے صحابہ رضی اللہ عنہم سے سیکھا اور انھوں نے نبی کریم ﷺ سے سیکھا پھر ان لوگوں سے سیکھنے کے لیے ایک ایسی قوم نے اپنے آپ کو ہمہ تن اس میں لگا دیا جو اسے ضبط کرنے کے لیے راتوں کو جاگی اور اسے نقل کرنے کی خاطر اپنی دن رات کی محنت لگا دی حتیٰ کہ وہ اس میں اقتداء کے قابل امام اور ہدایت کے ستارے بن گئے اور ان کے علاقوں والے ان کی قرأت قبول کرنے پر متفق ہو گئے اور ان کی روایت و درایت صحیح ہونے میں کسی دو نہ بھی آپس میں اختلاف نہیں کیا چونکہ انھوں نے قرأت کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لیا تھا اس لیے قراءت ان کی طرف منسوب ہوئی اور اس بارے میں اعتماد انھی لوگوں پر ہونے لگا۔

پھر ان کے بعد قراء بہت زیادہ ہو گئے اور شہروں میں پھیل گئے اور امتوں کے بعد امتیں آئیں اور انھوں نے ان کے طبقات کو جانا اور ان کی صفات مختلف ہو گئیں بعض تو روایت و درایت میں مشہور تلاوت کے ماہر ہو گئے اور بعض کسی ایک وصف کو جمع کرنے والے اور بعض ایک سے زیادہ کو حاصل کرنے والے بن گئے اس وجہ سے ان کے درمیان خوب اختلاف ہو گیا اور اتفاق کم ہو گیا۔

اس وقت امت کے ماہر اور مضبوط لوگ اٹھے اور انھوں نے حتیٰ الامکان بھر پور اجتہاد کیا اور صحیح و باطل کے درمیان تیز کی اور حروف و قراءت کو جمع کیا، وجہ روایات کو مستند کیا، صحیح و شاذ کی اور کثیر و منفرد کی وضاحت کی ایسے اصولوں کے ساتھ جنہیں انھوں نے قاعدہ اور بنیاد قرار دیا اور ایسے ارکان کے ساتھ جنہیں انھوں نے راجح قرار دیا۔



## پہلے حفاظ مقررین کے طبقات

امت کے تمام طبقوں میں ایک جماعت قرآن پاک کی حفاظت اور اسے پڑھانے میں مشہور ہے۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے قرآن پاک پڑھانے میں جو حضرات مشہور تھے وہ حضرت عثمان، حضرت علی، حضرت ابی بن کعب، حضرت زید بن ثابت، حضرت ابن مسعود، حضرت ابو الدرداء، حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہم اور وہ تمام حضرات ہیں جنہیں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے بلاد اسلامیہ کی طرف مصاحف دے کر بھیجا۔

اور تابعین میں سے حضرت سعید بن المسیب، حضرت عروہ، حضرت سالم، حضرت عمر بن عبدالعزیز، حضرت سلیمان بن یسار اور ان کے بھائی حضرت عطاء، حضرت زید بن سالم، حضرت مسلم بن جذب، حضرت ابن شہاب زہری، حضرت عبدالرحمن بن ہریر اور حضرت معاذ بن الحارث جو معاذ قاری کے نام سے مشہور تھے (اور یہ سب حضرات مدینہ میں تھے) (رضی اللہ عنہم) اور حضرت عطاء، حضرت مجاہد، حضرت طاؤس، حضرت عکرمہ، حضرت ابن ابی ملیکہ، حضرت عبید بن عیسر وغیرہ (رضی اللہ عنہم) تھے (اور یہ حضرات مکہ میں تھے)

اور حضرت عامر بن عبدالقیس، ابو العالیہ، حضرت ابورجاء، حضرت نصر بن عامر، حضرت یحییٰ بن یسر، حضرت جابر بن زید، حضرت حسن، حضرت ابن سیرین، حضرت قتادہ وغیرہ تھے (رضی اللہ عنہم) (یہ سب حضرات بصرہ میں تھے)

اور حضرت علقمہ، حضرت اسود، حضرت اسروق، حضرت عبیدہ، حضرت ربیع بن خثیم، حضرت حارث بن قیس، حضرت عمر بن شریک، حضرت عمرو بن مومن، حضرت ابو عبدالرحمن سلکی، حضرت زہر بن حبیش، حضرت عبید بن فضلہ، حضرت ابو زرعہ بن عمرو، حضرت سعید بن جبیر، حضرت فحیحی، حضرت شعبی (رضی اللہ عنہم) تھے (اور یہ سب حضرات بصرہ میں تھے)۔

اور حضرت مغیرہ بن ابوشہاب مخزومی جو مصحف عثمانی والے تھے حضرت حلید بن سعید جو حضرت ابو الدرداء رضی اللہ عنہ کے شاگرد تھے وغیرہ (رضی اللہ عنہم) یہ سب حضرات شام میں تھے۔

اس کے بعد ایک قوم قرأت کو ضبط کرنے اور انھیں عنوان دینے میں مشغول ہو گئی چنانچہ مدینہ میں حضرت یزید بن کھلاع رضی اللہ عنہ تھے پھر حضرت شیبہ بن نصاح رضی اللہ عنہ تھے اس کے بعد حضرت نافع بن ابونعیم رضی اللہ عنہ تھے۔

اور مکہ میں حضرت عبداللہ بن کثیر رضی اللہ عنہ، حضرت حمید بن قیس اعرج اور محمد بن یحییٰ رضی اللہ عنہ تھے اور کوفہ میں حضرت یحییٰ بن وثاب، حضرت عامر بن ابوالجود، حضرت سلیمان بن اعش تھے اس کے بعد حمزہ رضی اللہ عنہ اور پھر کسائی رضی اللہ عنہ تھے۔

اور بصرہ میں حضرت عبداللہ بن ابواسحاق، حضرت عیسیٰ بن عمرو، حضرت ابو عمرو بن العلاء، حضرت عامر جدری تھے ان کے بعد حضرت یعقوب رضی اللہ عنہ تھے۔

اور شام میں حضرت عبداللہ بن عامر، حضرت عطیہ بن قیس کلابی، حضرت اسماعیل بن عبداللہ بن الہبیر تھے پھر یحییٰ بن حارث ذماری اور ان کے بعد شریح بن یزید رضی اللہ عنہ تھے۔

ان قراء کے آسمان میں بہت سے ستارے روشن ہوئے جنہوں نے قرأت اور ضبط میں مہارت حاصل کی حتیٰ کہ وہ اس

باب میں ائمہ بن گئے ان کی طرف سفر ہونے لگے اور ان سے یکساں جانے گا۔

**قراءتوں کی تعداد** نے کہا قراءات الحشر (۱۰) اور کسی نے کہا قراءات الاربع عشرہ (۱۴)۔

اور سب نے قراءات سبع (سات) کو اس کی شہرت اور رفعت شان کی وجہ سے ترجیح دی۔ یہی وہ قراءات ہیں جو معروف ائمہ سبعہ کی طرف منسوب ہیں اور وہ ائمہ سابعہ مندرجہ ذیل ہیں۔

① نافع رضی اللہ عنہ ② عاصم رضی اللہ عنہ ③ حمزہ رضی اللہ عنہ ④ عبد اللہ بن عامر رضی اللہ عنہ

⑤ عبد اللہ بن کثیر رضی اللہ عنہ ⑥ ابو عمر بن العلاء رضی اللہ عنہ ⑦ علی الکسانی رضی اللہ عنہ

اور قراءات عشر میں یہی سات ہیں اور مزید تین یہ ہیں: ① ابو جعفر رضی اللہ عنہ ② یعقوب رضی اللہ عنہ ③ خلف رضی اللہ عنہ

علم قراءت پر ایک زمانہ وہ بھی تھا کہ وہ کوئی ذکر کی جانے والی چیز ہی نہ تھی پھر تدوین کا زمانہ آیا لیکن ان سات کے لیے یہ عنوان نہیں تھا بلکہ قراءات میں سب سے پہلے ابو عبیدہ قاسم بن سلام، ابو حاتم جستانی، ابو جعفر طبری اور اسماعیل قاضی جو سنیہ جیسے حضرات نے کتابیں تصنیف کیں اور قراءات میں بہت کچھ ذکر کیا اور ایسی روایات پیش کیں جو ان سات قراءتوں کے کئی گنا سے بھی بڑھ کر ہیں۔

اس کے بعد دو صدیوں کے آخر میں بلاد اسلامیہ میں یہ سات قراءتیں مشہور ہوئیں لوگ بصرہ میں ابو عمرو اور یعقوب کی قراءت پڑھنے لگے، کوفہ میں حمزہ اور عاصم کی قراءت، شام میں ابن عامر کی قراءت، مکہ میں ابن کثیر کی قراءت اور مدینہ میں نافع کی قراءت پڑھنے لگے۔

یہ سات قراءتیں اسی حال میں رہیں لیکن ان کی جگہ کوئی تدوین نہ پکڑ سکی حتیٰ کہ تیسری صدی ختم ہونے کو بھی کہ بغداد میں ابن مجاہد احمد بن موسیٰ بن عباس رضی اللہ عنہما اور انھوں نے ان ائمہ سبعہ کی قراءات کو جمع کیا لیکن انھوں نے کسائی کا نام ثابت رکھا اور یعقوب کا نام حذف کر دیا۔

ان قراءت سبعہ پر اقتصار اچانک اور اتفاقاً ہو گیا اس میں قصد و عمل کا کوئی دخل نہیں اس لیے کہ ہر شخص نے اپنے اوپر لازم کر لیا کہ وہ کسی سے روایت کرے گا تو صرف اس سے کرے گا جو ضبط و امانت اور قراءت کو لازم پکڑنے میں طول العمر ہوگا اور اس سے سیکھنے اور علم حاصل کرنے میں آراء متفق ہوں اب ان کا ارادہ صرف ان سات قاریوں پر پورا ہوا۔ ورنہ ائمہ قراء کی کثرت آتی ہے کہ انھیں شمار نہیں کیا جاسکتا اور ان میں وہ لوگ بھی ہیں جو اپنی قدرت اور عظمت شان میں ان سے بھی بڑھ کر ہیں۔

لہذا ابن مجاہد کا ان سات قاریوں پر اقتصار کرنا اس لیے نہیں کہ قراء انھی میں منحصر ہیں اور کسی کے لیے یہ بھی لازم نہیں کہ وہ انھی کی قراءت کی حدود پر رک جائے بلکہ جس قراءت میں بھی مشہور ضابطے کے ارکان تلاش پائے جائیں انھیں قبول کرنا واجب ہے۔

اس بناء پر قراءات عشرہ ان سات قراءتوں پر قراءت یعقوب، قراءت ابو جعفر اور قراءت کے اضافے پر مشتمل ہوگی۔ اور قراءت اربعہ عشرہ ان دس قراءتوں پر قراءت حسن بصری، قراءت ابن محیی، قراءت یحییٰ زبیدی اور قراءت شہنودی کے

ساتھ ہوگی۔

اختلاف قراءات کے فوائد یہ نقطہ ہم نے "مبحث نزول القرآن علی سبعة احرف" میں پوری طرح بیان کر دیا ہے۔

اختلاف قراءات کے انواع اس موضوع پر بھی ہم "مبحث نزول القرآن علی سبعة احرف" پر کلام کر دیا ہے۔

"محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ"

تبادل قراءات کا ضابطہ • علماء قراءات کا مشہور ضابطہ ہے جس کے ذریعے وہ قراءات میں وارد ہونے والی روایات کو پرکتے ہیں چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ وہ قرأت جو مصاحف عثمانیہ میں سے کسی ایک کے بھی موافق ہو خواہ تقدیراً ہی کیوں نہ ہو اور کسی بھی وجہ میں عربیت کے بھی موافق ہو اور اس کی سند صحیح ہو اگرچہ قراء عشرہ سے اوپر ہی کیوں نہ ہو تو وہ قرأت صحیحہ ہے اسے رو کر ناجائز نہیں اور اس کا انکار حلال نہیں بلکہ یہ انہی حروف سبعہ میں سے ہے جن پر قرآن نازل ہوا۔

اس ضابطے کو صاحب ”الطیبہ“ نے شعر کی صورت میں بیان کرتے ہوئے کہا کہ:

کل ما وافق وجه النحو وکان للرسم احتمالاً یحوی  
 ”ہر وہ قرأت جو نحو کی کسی بھی وجہ کے موافق ہو۔ اور رسم عثمانی میں بھی کوئی احتمال ہو جو اس پر مشتمل ہو۔“  
 وضع اسنادا هو القرآن فهذه الثلاثة الارکان  
 ”اور اس کی سند صحیح ہو تو وہ قرآن ہے۔ اور یہی تین ارکان ہیں۔“

وحیثما یختل رکن الثبت شنوذة لوانه فی السبعة

”جہاں بھی کوئی رکن کم ہو۔ وہ اس کے شذوذ کو ثابت کرے گا اگرچہ وہ قراءات سبعہ میں ہی کیوں نہ ہو۔“

”مصاحف عثمانیہ میں سے کسی ایک کے موافق ہونے“ سے مراد یہ ہے کہ وہ ثابت ہو اور اگرچہ بعض میں ہو اور بعض میں نہ ہو جیسے ابن عمر کی قرأت ﴿وَقَالُوا اتَّخَذَ اللَّهُ وَكَلِيًّا﴾ (البقرة: ۱۱۷) بغیر واو اور انہی کی قرأت ﴿وَالرُّبُوبُ وَالْكَئِبُ الْمُنِيرُ﴾ (آل عمران: ۱۸۳) میں دونوں اسماء میں ”باء“ کی زیادتی۔ یہ مصحف شامی میں ثابت ہے۔

اسی طرح ابن کثیر کی قرأت میں ﴿جَنَّتْ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ﴾ (التوب: ۸۹) جو سورۃ التوبہ کے آخر میں واقع ہوا ہے اس میں ”من“ کی زیادتی مصحف کی میں ثابت ہے۔

اور ”اگرچہ تقدیری ہی کیوں نہ ہو“ سے مراد یہ ہے کہ روایت میں مصحف کی رسم کے موافق ہونا ہی کافی ہے اگرچہ یہ موافقت صراحتاً نہ ہو جیسے ﴿مَلِكٌ يَوْمَ الدِّينِ﴾ (الفاتحہ: ۳) یہ تمام مصاحف میں ﴿مَلِكٌ﴾ کلمہ میں ”الف“ کے حذف کے ساتھ ہے اب حذف والی قرأت تو اس کے موافق حقیقتاً ہے جیسا کہ (سورۃ الناس آیت ۲ میں) ﴿مَلِكٌ النَّاسِ﴾ لکھا ہوا ہے اور الف والی قرأت تقدیراً اس کا احتمال رکھتی ہے جیسا کہ ﴿مَلِكٌ الْمَلِكِ﴾ (آل عمران: ۶۲) میں لکھا ہوا ہے اس میں الف کو اختصار کی بنا پر حذف کیا گیا ہے جیسا کہ بہت سے حالات حذف کر دیا جاتا ہے جس کی طرف پیچھے تو اعداد رسم عثمانی میں ہم نے اشارہ کر دیا ہے جبکہ صریح موافقت کثرت کے ساتھ ہے جیسے اللہ تعالیٰ کا قول ﴿وَأَنْظُرْ إِلَى الْعِظَامِ كَيْفَ نُنشِئُهَا﴾ (البقرة: ۲۵۹) کو مصحف میں بغیر نقطوں کے لکھا گیا اور یہ ﴿نُنشِئُهَا﴾ یعنی ”زاء کے ساتھ“ اور قرأت ﴿نُنشِئُهَا﴾ ”راء کے ساتھ“ دونوں کے موافق ہے۔

اس کے بعد صحابہ رضی اللہ عنہم نے رسم مصحف میں غور کیا تو جو کلمہ اصل کے موافق بھی مروی ہو اور خلاف اصل بھی مروی ہو تو اسے اسی حرف کے مطابق لکھتے جو اصل کے خلاف ہوتا کہ جو کلمہ دونوں قرأتوں پر صورت واحدہ کی دلالت میں نہیں لکھا گیا وہ اصل کے مساوی ہو جائے اس لیے کہ وہ ایک قرأت پر حرف کے ذریعے دلالت کر رہا ہے اور دوسری قرأت پر اصل کے ذریعے پر دلالت کر رہا ہے جیسے کلمہ ”القطر“ اور ”المصيطرون“ جو صاد کے ساتھ لکھے گئے ہیں اور یہ صادین سے بدل کر آیا ہے انہوں نے اسے ”صاد“



کے ساتھ لکھا اور اس کی اصل یعنی سین سے روگردانی کی تاکہ "سین" والی قرأت اگرچہ رسم کے مخالف ہے لیکن اصل کے مطابق آئی ہے لہذا یہ دونوں مسادی ہو گئے اور اس میں اٹھام والی قرأت کا بھی احتمال ہے اگر اسے اس کی اصل یعنی "سین" کے ساتھ لکھا جاتا تو یہ احتمال فوت ہو جاتا اور "سین" کے علاوہ والی قرأت رسم اور اصل دونوں کے مخالف ہوتی اسی وجہ سے "بسطہ" (جو سورۃ الاعراف میں ہے) میں اختلاف مشہور ہے جبکہ سورۃ البقرۃ کے "بسطہ" میں نہیں اس لیے کہ سورۃ البقرۃ کا حرف "سین" کے ساتھ لکھا گیا ہے اور اعراف کا حرف "صاد" کے ساتھ لکھا گیا ہے۔

علامہ نویری ریڑیہ کا "الطیبہ" پر اس موضوع پر بڑا نفیس جملہ ہے جس کی عمارت مندرجہ ذیل ہے۔

"جاننا چاہیے کہ رسم سے مراد کلمہ کی صورت کو اس کے حروف ہجاء کے ساتھ اس طرح پیش کرنا کہ اس کی ابتداء اور انتہاء کی تعیین بھی ہو جائے۔" اور عثمانی سے مراد وہ رسم ہے جو صحاح عثمانیہ میں مرسوم ہے۔ اس کی تقسیم قیاسی کی طرف ہوتی ہے اور قیاسی وہ رسم ہے جو لفظ کے موافق ہو اور "تحقیقا" کا یہی معنی ہے اور سماعی کی طرف ہوتی ہے یہ وہ رسم ہے جو لفظ کے مخالف ہو اور "تقدیرا" کا بھی یہی معنی ہے اور احتمالی کی طرف جس کا بیان آ رہا ہے۔

رسم کا لفظ کی مخالفت کرنا پانچ اقسام میں منحصر ہے۔ ① بدل پر دلالت جیسے "الْقِرَاطُ"

② زیادتی پر دلالت جیسے: "مَلِكٌ" ③ حذف پر دلالت جیسے: "لِکِنَا هُوَ"

④ فصل پر دلالت جیسے: "فَسَالٌ هُوَ لَاءٌ" ⑤ اصل پر دلالت جیسے: "أَلَا یَسْجُدُوا"

اب صاد، حذف، اثبات، فصل اور وصل والی پانچوں قرأتیں، رسم کے موافق ہے تحقیقا اور ان کے علاوہ کے موافق ہے۔

تقدیرا۔ اس لیے کہ "سین" کو "صاد" سے بدل دیا جاتا ہے۔ چار حروف سے پہلے اور ان میں سے ایک طاء بھی ہے جیسا کہ عنقریب آ رہا ہے اور "مالک" کا الف مثبت کے نزدیک زائد ہے اور "لکنا" کی اصل اثبات ہے اور "فسال" کی اصل فصل ہے اور "أَلَا یَسْجُدُوا" کی اصل وصل ہے اس لیے بدل مبدل منہ کے حکم میں ہوگا اسی طرح باقی کلمات بھی ہیں یہ اس لیے ہے کہ تقدیری موافقت متحقق ہو جائے اس لیے کہ دو قرأتوں کا اختلاف جب متغایر ہو لیکن تضاد و تاقض نہ ہو تو یہ بھی موافق کے حکم میں ہے اور اگر تضاد یا تاقض ہو تو مخالف کے حکم میں ہے جبکہ واضح فقط اول ہے اور وہ یہ ہے دو وجوہ میں سے کسی ایک کے صحیح ہونے سے دوسری کا بطلان لازم نہ آئے۔

اس کی تحقیق یہ ہے کہ کبھی لفظ کی ایک جہت ہوتی ہے تو اس کی رسم بھی اس کے موافق ہوگی اس صورت میں رسم لفظ کی جہت پر منحصر ہوگا اور اس کا مخالف مناقض ہوگا اور کبھی اس کی کئی جہات ہوں گی اس صورت میں اس کی رسم کسی ایک جہت پر ہوگی اور لفظ کی جہت میں منحصر نہیں ہوگی اب اس کو پڑھنے والا تحقیقا اس کے موافق ہے اور تقدیرا کسی اور کے موافق ہے اس لیے کہ بدل مبدل منہ کے حکم میں ہوتا ہے اسی طرح باقی پانچ کو بھی سمجھو۔

اور قسم ثالث وہ ہے جو احتمالاً رسم کے موافق ہو اس میں وہ بھی مندرج ہیں جن میں حرکت یا سکون کا اختلاف ہوا ہو جیسے "الْقُدْسُ" یا تخفیف تندید کا اختلاف ہوا ہو جیسے سورۃ یونس میں "ینشر کھ" ہے یا قطع وصل کا اختلاف ہوا ہو جسے شکل کے ساتھ تعبیر کیا جاتا ہے۔ جیسے سورۃ غافر میں "ادخلوا" ہے یا یقظوں کا اختلاف ہوا ہو جیسے "یعلمون" (سورۃ الحج) یا اعجام و اہمال کا اختلاف

ہوا جو جیسے ﴿نُنشِرُهَا﴾ اسی طرح جن کے الفاظ میں اختلاف ہو جیسے مدعجہ، مسهل، ممال، مر قی اور مدور مصاحف عثمانیہ اسی طرح تمام کے تمام اس لیے کہ یہ اوصاف سے خالی ہیں۔

اب لطم والے (یعنی شاعر) کا قول ”وكان للرم احتمالاً“ (اور رسم میں اس کا احتمال بھی ہو) اس میں وہ قرأت بطریق اولیٰ داخل ہوگی جو رسم کے تحقیقاً موافق ہو خواہ تمام مصاحف کے موافق ہو یا بعض کے جیسے ”قالوا اتخذنا لله ولداً“ اور ”وبالزبور وبالكتاب“ میں ابن عامر کی قرأت یہ مصحف شامی میں ثابت ہے اور جیسے ابن کثیر کی قرأت جو سورۃ التوبہ میں ﴿جَبَلْتُمْ نَجْرِي وَمِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهَارُ﴾ (التوبہ: ۸۹) میں ہے یہ مصحف کوئی میں ثابت ہے۔

شاعر کا قول ”احتمالاً“ میں یہ بھی احتمال ہے کہ وہ ”تحقیقی“ کے مقابل ہو اس صورت میں ان کے نزدیک تقسیم ثنائی ہوگی یعنی تحقیق اور احتمالی اور تقدیری کو احتمالی میں داخل کر دیا جائے گا اور ”النشمر“ والے نے اسی طرح کیا ہے اور یہ بھی احتمال ہے کہ تین قسمیں بنائی جائیں اور پہلی دو اقسام کا حکم اولیت کے ساتھ ثابت ہو اور اگر رسم کی موافقت کی کوئی صورت نہ ہو تو لازم آئے کہ کل کل کے مخالف ہوں جیسے ”السُّنُوَّةُ، الصَّالِحَاتُ اور اللیل۔“

پھر بعض الفاظ میں کسی ایک قرأت کی موافقت حقیقی ہوگی اور دوسری کی تقدیری جیسے ”ملك“ اور بعض میں دو یا دو سے زیادہ قراءت میں موافقت حقیقی ہوگی جیسے: ”انصار الله، ناداته البلائكة، و غیر لکھ اور ہیئت لک۔“

جاننا چاہیے کہ کسی حرف مدغم، مبدل، ثابت یا محذوف وغیرہ میں رسم کے صریح مخالف کے ساتھ قرأت ثابت ہو اور مشہور ہو تو اسے مخالف شمار نہیں کیا جائے گا کیا آپ نہیں دیکھتے کہ آیات زوائد کو ثابت رکھنا اور ”تسألنی“ (سورۃ البکہ) میں یا کو حذف کرنا، اسی طرح ﴿وَ اَكُوْنُ مِنَ الصَّالِحِيْنَ﴾ کی قرأت وغیرہ رسم کے مخالف ہیں لیکن پھر بھی نہیں روئیں کیا جاتا اس لیے کہ یہ ایک معنی کی طرف لوٹتا ہے اور قرأت کی صحت اور شہرت کے ساتھ جاری و ساری ہے۔ بخلاف کلمہ کی زیادتی اور نقصان کے یا تقدیم و تاخیر کے حتیٰ کہ اگر چہ ایک حرف میں ہی کیوں نہ ہو اس لیے کہ یہ بھی کلمہ کے حکم میں ہے اور اس میں بھی رسم کی مخالفت جائز نہیں۔ یہی حذافہ ہے جو رسم کی اتباع یا مخالفت کی حقیقت میں ہے۔

ضابطہ مذکورہ میں ان کا کہنا کہ: ”وافق العربیة ولو بوجه“ (کسی بھی وجہ میں عربیت کے موافق ہو۔)

اس سے مراد لغت کے قواعد کی وجہ سے کوئی بھی وجہ ہو خواہ وہ لغت فصیح ہو یا غیر فصیح ہو اور خواہ اس پر اتفاق ہو یا اختلاف اس کے لیے معزز نہیں ہے بشرطیکہ قرأت شائع ذائع ہو اور اگر نہ صحیح سند کے ساتھ اسے حاصل کیا ہو۔ موافقت عربیہ کے رکن میں مختار یہی ہے۔

یہ حافظ ابو عمر ودانی رحمۃ اللہ علیہ ہیں جو اپنی کتاب ”جامع البیان“ میں جب ذکر کرتے ہیں کہ ابو عمر کی قرأت میں ﴿جَبَلْتُمْ نَجْرًا﴾ اور ”یَأْمُرُكُمْ“ میں اسکان ہے اور اس کے بعد حکایت ذکر کرتے ہیں کہ سیبویہ نے اس کا انکار کیا اس کے بعد فرماتے ہیں کہ ”نقل اور اکثر اداء میں اسکان اصح ہے انھوں نے اسی کو اختیار کیا اور اسی کو لیا ہے.... آگے فرماتے ہیں کہ.... انکہ قرآن کے کسی بھی حرف میں لغت میں پھیلے ہوئے یا لغت کے موافق پر اعتماد نہیں کرتے بلکہ جو اثر میں ثابت ہو اور نقل میں اصح ہو اسی پر اعتماد کرتے ہیں اور جب روایت ان کے نزدیک ثابت ہو تو قیاس عربیہ بھی اس کی تردید نہیں کرتا اور لغت میں پھیلنا بھی اسے رد نہ کرے گا اس لیے کہ

قرأت ایک قابل اتہاع سنت ہے جسے قبول کرنا اور اس کی طرف رخ کرنا لازم ہے۔

میں کہتا ہوں کہ یہ ایک عالی شان کلام ہے کیونکہ علماء نحو نے اپنے قواعد کلام اللہ، کلام رسول اور کلام عرب سے حاصل کیے ہیں جب روایات مقبولہ سے قرآن پاک کی قرآنیث ثابت ہوگئی تو قرآن علماء نحو اور ان کے قواعد پر ثالث ہو گیا اور ان پر واجب ہو گیا کہ اپنے قواعد کے لیے ان کی طرف رجوع کریں یہ نہیں کہ ہم قرآن کے لیے ان کے مخالف قواعد کی طرف رجوع کریں اور اس میں انھیں ثالث بنائیں ورنہ آیت کا عکس لازم آئے گا اور رعایت کے وجوب میں اصل کو مہمل چھوڑنا لازم آئے گا۔

اس ضابطہ میں ان کا قول ”وصح اسنادہ“ (اور اس کی سند صحیح ہو) اس سے مراد یہ ہے کہ اس قرأت کو عادل کامل الضبط اپنے جیسے سے روایت کرے اور یہ سلسلہ اسی طرح رسول اللہ ﷺ تک پہنچے اور اس میں کسی قسم کی علت قادمہ یا شذوذ بھی نہ پایا جائے بلکہ انھوں نے اس سے بڑھ کر شرط رکھی ہے کہ وہ روایت اس طرح کے ائمہ جو انھیں محفوظ بھی کرنے والے ہوں کے ہاں مشہور ہو۔ یہ ان کے ہاں غلط یا شاذ شمار نہیں ہوگی۔

محقق بن جزری تو اتاری شرط بھی لگاتے ہیں اور اس ضابطہ میں اس کی تصریح کرتے ہیں اور یہ بھی اعتبار کرتے ہیں کہ جو روایت مشہور و مستفیض ہو اور رسم و عربیت کے موافق بھی ہو تو وہ بھی قرآنیث کی قطعیت میں متواتر کی قوت میں ہے اگرچہ متواتر نہ ہو۔

**اس ضابطے کا منطوق و مفہوم**؟  
یہ ضابطہ اپنے منطوق کے ساتھ دلالت کرتا ہے کہ ہر قرأت جس میں یہ ارکان ثلاثہ جمع ہو جائیں تو اس کے قبول کا حکم لگایا جائے گا بلکہ اس کے انکار کرنے والے پر کفر کا حکم لگایا جائے گا خواہ وہ قرأت ائمہ سب سے مروی ہو یا عشرہ یا ان کے علاوہ ائمہ مقبولین میں سے کسی سے بھی مروی ہو یہ ضابطہ اپنے مفہوم کے اعتبار سے دلالت کرتا ہے کہ جس قرأت میں یہ ارکان ثلاثہ پورے نہ ہوں تو ان کے عدم قبول کا حکم لگایا جائے گا اور جو اس کا انکار کرے اس کے عدم کفر کا حکم لگائے جائے گا۔ خواہ یہ قرأت ائمہ سب سے مروی ہو یا ان کے علاوہ سے مروی ہو اگرچہ اس کا مقام ان سے بڑا ہو اور اس کی شان ان سے عظیم ہو۔

ائمہ سلف و خلف کے نزدیک یہی صحیح ہے جیسا کہ دانی، مکی، مہدوی، اور ابوشامہ نے اس کی تصریح کی ہے اور آپ کے لیے یہی کافی ہے کہ یہ حضرات قرآن کی قراءات میں علوم اور امام تھے۔

ابوشامہ نے اپنی کتاب ”المرشد الوجیز“ میں فرمایا کہ ”اس سے دھوکہ نہیں کھانا چاہیے کہ ہر وہ قرأت جو ان ائمہ سب سے کسی کی طرف منسوب ہو اور اس پر لفظ صحت کا اطلاق ہو اور یہ کہا جائے کہ یہ اسی طرح نازل ہوئی مگر جبکہ اس میں کوئی ضابطہ داخل ہو اس صورت میں مصنف اسے نقل کرنے میں منفرد نہ ہو اور اسے ان سے نقل کرنے میں یہ مختص نہ ہو بلکہ اگر وہ دوسرے قراء سے منقول ہو تو یہ اسے صحت سے نہیں نکالے گا کیونکہ ان اوصاف کے جمع ہونے پر اعتماد ہوگا ان پر نہیں جن کی طرف یہ منسوب ہو۔ اور جو قراءات قراء سب سے منسوب ہیں ان کی بھی دو قسمیں ہیں ایک جس پر اجماع ہو اور دوسری شاذ۔ البتہ یہ سات قراء اپنی شہرت اور صحیح جمع علیہ قراءات کی وجہ سے ایسے ہیں کہ دل اسی طرف مائل ہوتا ہے کہ جو کچھ ان سے منقول ہو وہ دوسروں سے فائق ہے۔“ لیکن ابوشامہ وغیرہ کی رائے قراءات سب سے درست نہیں جیسا کہ عنقریب آ رہا ہے۔

پھر اس ضابطے کا مفہوم جو حکومت علیہ ہے اپنے تحت بہت سی ایسی صورتوں کو لیے ہوئے ہے جو تفصیلی طور پر ایک دوسرے کے

مخالف ہیں اگرچہ حکم کے اعتبار سے یہ سب ایسی ہیں کہ اجمالاً ان پر حکم عدم قبول کا لگایا جائے گا جیسا کہ آپ دیکھ رہے ہیں۔ وہ یہ ہے کہ ضابطہ مذکورہ کا مفہوم ارکان ثلاثہ کی نئی کے ساتھ صادق آتا ہے اور ان میں سے ایک یا دو کی نئی کے ساتھ بھی صادق آتا ہے اور ہر حالت کے لیے خاص حکم ہے جسے آپ امام سبکی کی عبارت سے جانیں گے جسے ہم بیان کر رہے ہیں ”اگر کوئی سوال کرنے والا سوال کرے کہ اس وقت کون سی قرأت ہے جسے اس وقت قبول کیا جاتا ہے اور پڑھا جاتا ہے؟ اور کوئی قراءت ہے جسے قبول کیا جائے گا اور پڑھا نہیں جائے گا؟ اور کوئی قراءت ہے جسے قبول کیا جائے گا اور نہ پڑھا جائے گا؟“

تو جواب یہ ہے کہ جتنی بھی قرأتیں مروی ہیں اس کی کئی اقسام ہیں ایک وہ قسم ہے جسے آج پڑھا جاتا ہے یہ وہ قرأتیں ہیں جس میں تین چیزیں جمع ہوں ایک یہ کہ وہ ثقہ راویوں کے ذریعے نبی کریم ﷺ سے منقول ہو دوسرے یہ کہ اس کی وجہ اس عربی میں ہو جس کے ساتھ سارا قرآن خوشگوار کی کے ساتھ نازل ہوا ہے تیسرے یہ کہ وہ مصحف کے خط کے موافق ہو۔

جب یہ تین چیزیں جمع ہو جائیں تو اسے پڑھا جائے گا اور اس کے تعین، صحت اور صدق کی قطعیت ہو جائے گی کیونکہ مصحف کے خط کے موافق ہونے کی وجہ سے اجماع سے ماخوذ ہے اور اس کے انکار کرنے والے کو کفار کہا جائے گا فرمایا: اور قسم ثانی: وہ قسم ہے جس کا نقل اخبار آحاد سے صحیح ہو اور عربیت میں اس کی وجہ صحیح نہ ہو اور اس کے الفاظ مصحف کے خط کے مخالف ہوں اسے قبول کیا جائے گا اور پڑھا نہیں جائے گا دو علتوں کی وجہ سے ایک یہ کہ یہ اجماع سے ماخوذ نہیں ہے بلکہ اخبار آحاد سے ماخوذ ہے اور خبر واحد سے وہ قرآن ثابت نہیں ہو سکتا جسے پڑھا جاتا ہے دوسری علت یہ ہے کہ وہ اجماع کے مخالف ہے اس لیے اس کی تعین و صحت قطعی نہ ہوگی اور جس کی صحت قطعی نہ ہو اس کی قرأت جائز نہیں اور اس کا انکار کرنے والے کو کافر نہیں کہا جائے گا۔

... فرمایا: تیسری قسم: ”جسے کوئی غیر ثقہ نقل کرے یا کوئی ثقہ نقل کرے لیکن عربیت میں اس کی وجہ نہ ہو اسے قبول نہیں کیا جائے گا اگرچہ مصحف کے موافق ہو ان اقسام میں سے ہر ایک کی مثالیں ہیں لیکن ہم نے انھیں اختصار کی بناء پر چھوڑ دیا۔“

پھر محقق ابن جزری ان مثالوں کو ذکر کرنے میدان میں اتر آئے جنہیں مکی و مدینہ نے اختصار کی بناء پر چھوڑ دیا تھا چنانچہ فرمایا کہ:

**قسم اول کی مثال** • ”ملک“ اور ”مالک، یخددعون“ اور ”یخادعون، اوصی“ اور ”وصی، یطوع تطوع“ وغیرہ جو قراءات مشہورہ میں سے ہیں۔

**ثانی کی مثال** • اللہ تعالیٰ کے قول: ﴿وَمَا خَلَقَ الذَّكَرَ وَالْأُنثَىٰ﴾ (الزلزال: ۳) میں حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہما اور حضرت ابو الدرداء رضی اللہ عنہما کی قرأت میں ﴿الذَّكَرَ وَالْأُنثَىٰ﴾ یعنی ”ما خلق“ کے حذف کے ساتھ اور ﴿وَكَانَ وِرَاءَهُمْ مَلَاكٌ يَنْخُبُونَ كُنَّ سَفِينَةً عَصَبًا﴾ (الکہف: ۷۹) میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی قرأت جس میں ”وراء“ کی بجائے ”امام“ ہے اور ”صالحۃ“ کے لفظ کا اضافہ ہے اور ﴿وَأَمَّا الْعُلَمَاءُ فَمَا كَانُوا كَافِرًا﴾ (الکہف: ۸۰) میں ”کافرا“ کے اضافے کے ساتھ اور اس جیسی اور بہت سی مثالیں ہیں جن میں ثقہ راویوں کی روایت ثابت ہے۔

**قسم ثالث کی مثال** • جسے غیر ثقہ نقل کرے اس کی مثالیں تو بہت زیادہ ہیں جو کتب شواذ میں پائی جاتی ہیں ران کی سندیں اکثر ضعیف ہوتی ہیں جیسے ابن مسنن اور ابواسمٰل وغیرہ قرأت بوسے ﴿فَنَجِّنِكَ بِسَدِكَ﴾ (یوسف: ۹۳) جیم مجہ کے ساتھ اسی طرح تو لیسن خَلَقَ آيَةَ ”لام کے فتح کے ساتھ۔ اسی طرح امام ابوحنیفہ رضی اللہ عنہما کی طرف منسوب قرأت اور وہ قرأت جسے ابو الفضل محمد بن

خزاعی نے جمع کیا اور ابو القاسم ہذلی وغیرہ نے اسے نقل کیا: "انما ینشی اللہ من عباده العلماء" ہاء کے رفع اور ہمزہ کے نصب کے ساتھ یعنی لفظ جلالہ کے رفع اور العلماء کے نصب کے ساتھ۔

اس نے اسے اکثر مفسرین تک پہنچا دیا اور اس کی نسبت امام صاحب کی طرف کی اور اس کی توجیہ میں متکلف کیا حالانکہ اس کی کوئی اصل نہیں اور امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اس سے بری ہیں۔

جسے ثقہ نے نقل کیا ہو اور عربیت میں اس کی کوئی وجہ نہ ہو اس کی مثال: یہ جب بھی صادر ہوتا ہے یا تو سہو کی وجہ سے صادر ہوتا ہے یا غلطی کی وجہ سے یا عدم ضبط کی بناء پر اسے ائمہ متفقین حفاظ جو کامل النضبط ہوتے ہیں وہی جانتے ہیں یہ بہت ہی کم ہیں بلکہ نہ ہونے کے برابر ہیں۔

بعض حضرات نے اس کی مثال میں "معاذیں" کو ہمزہ کے ساتھ پڑھنے کو پیش کیا ہے جسے خارجہ کی روایت نافع سے بتلایا ہے۔ پھر فرمایا کہ ان دو قسموں میں وہ بھی داخل ہیں جو شاطبیہ کے بعض متاخرین شرح نے حمزہ کے وقف میں ذکر کیا ہے جیسے "اشمَاءُ هُمْ" اور "وَأُولَئِكَ" کو یائے خالص کے ساتھ پڑھنا اسی طرح "شُرَّكَاءُ هُمْ" اور "أَجْبَاءُ هُمْ" کو واؤ خالص کے ساتھ پڑھنا اور "هَذَا أَزْهُمُ" اور "أَخْنَاهُ" کو الف خالص کے ساتھ پڑھنا اور "رَأَى" کو "رَا"، "تَرَانِي" کو "تَرَانِي"، "وَأَشْمَاءُ أَزْهُمُ" کو "وَأَشْمَاءُ أَزْهُمُ" کو "فَمَا أَذْأَزْهُمُ" کو پڑھنا ان سب کو ہمزہ کے حذف کے ساتھ پڑھنا جسے وہ تخفیف رکھی کا نام دیتے ہیں حالانکہ عربیت کی وجہ میں سے کسی بھی وجہ میں یہ جائز نہیں یا تو یہ کسی ثقہ سے منقول ہیں (حالانکہ ایسا نہیں ہو سکتا) تو یہ غیر منقول ہیں اس لیے کہ ان کی کوئی وجہ نہیں یا غیر ثقہ سے منقول ہیں تو اس کا منبع زیادہ مناسب اور اسے رد کرنا زیادہ اولیٰ ہے۔ اور یہ بات بھی ہے کہ میں نے اس کی خوب چھان بین کی لیکن میں نے اسے حمزہ سے مخصوص نہیں پایا نہ کسی صحیح سند سے اور نہ ہی ضعیف سے۔

پھر فرمایا کہ: پھر ایک مردود قسم بھی باقی رہ جاتی ہے وہ یہ کہ عربیت کے بھی موافق ہو اور رسم کے بھی موافق ہو لیکن کہیں بھی منقول نہ ہو اسے رد کرنے کا حق ہے اور اس کی ممانعت میں سختی کی جائے گی اور اس کا ارتکاب کرنے والا عظیم کھار کا ارتکاب کرنے والا ہے۔ محمد بن حسن بن مقسم بغدادی قمری نحوی سے اس کا جواز بھی مذکور ہے اور یہ تین صدیوں بعد آئے۔

امام ابو طاہر بن ابوباسم نے اپنی کتاب "البیان" میں فرمایا کہ ہمارے زمانے میں بھی کسی سر نکالنے والے نے سر نکالا اور اس نے یہ بات بنادی کہ "اس کے نزدیک قرآن پاک کے کسی حرف کی کوئی وجہ عربیت میں صحیح ہو اور صحف کے موافق ہو تو اس کی قرأت نماز وغیرہ میں جائز ہے۔" اس نے یہ ایک نئی بدعت بنا ڈالی اور اس کے ذریعے سیدھے راستے سے بھٹک گیا۔

میں نے کہا اس کی وجہ سے بغداد میں ایک مجلس منعقد ہوئی جس میں فقہاء اور قراء حاضر ہوئے اور انھوں نے اس کے منع پر اجماع کیا وہ آئندہ کے لیے اس سے باز آ گیا اور اس نے رجوع کر لیا اور اس کی موجودگی میں لکھت پڑھت ہو گئی۔ جیسا کہ اسے حافظ ابو بکر خطیب نے تاریخ بغداد میں لکھا اور "الطبقات" میں بھی ہم نے اس کی طرف اشارہ کیا۔

**تنبیہ:** قراء نے قرأت کے مشہور ضابطہ میں صرف صحت اسناد اور اس کے ساتھ دوسرے دور کن پر اکتفاء کیا لیکن تواتر کی شرط نہیں لگائی حالانکہ قرأت آیت کے تحقق میں اس کا ہونا ضروری ہے۔ اس کے تین اسباب ہیں:

① یہ: بطور تعریف نہیں اور تواتر کا لحاظ قرآن کی تعریف میں کیا گیا ہے اس بناء پر وہ رکن ہے یا کم از کم شرط ہے۔ اور ضابطہ میں



مخوف نہیں ہے اس لیے کہ ضابطہ میں وہ چیزیں معاف ہوتی ہیں جو تعریف میں معاف نہیں ہوتیں۔ اور ضابطوں میں ماہیت اور حقیقت کا بیان نہیں ہوتا۔

② طالب علم کے لیے قراءات مقبولہ کی غیر مقبولہ سے تیز میں آسانی صرف اس ضابطے کی رعایت سے ہوتی ہے کیونکہ اگر تواتر بھی مشروط ہو تو یہ تیز مشکل ہو جائے گی اس لیے کہ وہ اس کے حصول میں کسی ایسی جماعت تک پہنچنے پر مجبور ہو جائے گا جس کا روایت کے ہر طبقہ میں جھوٹ پر جمع ہونے سے اطمینان ہو اور اس کا میسر ہونا ناممکن ہے۔

③ یہ ارکان ثلاثہ بھی قراءات مقبولہ کے قطعی علم کا فائدہ دینے میں تقریباً تواتر کے برابر ہیں اس کی وضاحت کچھ یوں ہے کہ مصحف کے دو رنگوں کے درمیان جو کچھ ہے وہ متواتر ہے اور سب سے افضل زمانے یعنی صحابہ رضی اللہ عنہم کے زمانے میں اس پر امت کا اجماع ہو چکا ہے پھر قرأت کی سند صحیح ہو گئی اور لغت کے قواعد کے مطابق بھی ہو گئی پھر اس متواتر مصحف کے خط کی موافقت بھی ہو گئی تو یہ موافقت قرینہ ہے کہ یہ روایت علم قطعی کا فائدہ دے رہی ہے اگرچہ خواہ واحد ہے۔

اور آپ کو بھولنا نہیں چاہیے کہ علم اثر میں ثابت ہے کہ خبر آحاد جب تحت بالقرینہ ہو تو وہ علم قطعی کا فائدہ دیتی ہے۔ گویا کہ مصحف کے متواتر باثوق بننے سے پہلے تواتر کا حصول بھی سند میں مطلوب تھا پھر جب یہ اجماعی مصحف وجود میں آ گیا تو روایت میں اس کا صحیح ہونا اور مشہور ہونا ہی کافی سمجھا جائے گا بشرطیکہ وہ اس مصحف کی رسم اور لسان عرب کے موافق ہو۔

صاحب کوکب الدرر یہ محقق ابن جزری سے نقل کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ: ہمارا قول: "اور اس کی سند صحیح ہو۔" اس سے ہماری مراد یہ ہے کہ اس قرأت کو عادل کامل الضبط اپنے جیسے سے نقل کرے اور اسی طرح سند پوری ہو نیز وہ قرأت اس قسم کے ائمہ کے نزدیک مشہور بھی ہو اور ان کے نزدیک عظمتی میں شانہ ہو اور نہ ہی بعض کے شدوز میں شانہ ہو۔

بعض متاخرین نے اس رکن میں تواتر کی شرط لگائی ہے اور سند کے صحیح ہونے پر اکتفاء نہیں کیا اور انھوں نے دعویٰ کیا کہ قرآن تواتر کے بغیر ثابت نہیں ہو سکتا اور اخبار آحاد کا آنا قرآن کو ثابت نہیں کرتا۔ اس میں جو تذبذب ہے وہ بالکل ظاہر ہے اس لیے کہ جب تواتر ثابت ہو گیا تو اس میں آخری دو رنگوں یعنی موافقت رسم وغیرہ کی ضرورت نہیں جب اختلافی حروف تواتر کے ساتھ نبی کریم ﷺ سے ثابت ہو گئے تو انھیں قبول کرنا واجب ہو گیا اور ان کا قرآن ہونا قطعی ہو گیا خواہ وہ رسم کے موافق ہو یا مخالف۔

اس توجیہ سے جس کے ذریعے ہم نے ضابطہ مذکورہ کی توجیہ کی علامہ نویری کا اعتراض ختم ہو جاتا ہے جو انھوں نے "الطیبیہ" کی شرح میں کیا وہ فرماتے ہیں کہ "وقوله، وضع اسناداً" (اور اس کی سند صحیح ہو) اس کے ظاہر سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن پاک کے ثبوت میں دو گزشتہ شرطوں کے ساتھ صحت سند کافی ہے تواتر کی ضرورت نہیں یہ نیا قول ہے اور محدثین وغیرہ کے اجماع کے خلاف ہے جیسا کہ عنقریب انشاء اللہ تعالیٰ آپ دیکھ لیں گے اس قول کی وجہ سے ایک قوم گمراہ ہو گئی وہ قرآن پاک کے ایسے حروف پڑھتے تھے جس کی سند اصلاً ہی صحیح نہیں تھی اور وہ کہتے تھے کہ تواتر شرط نہیں جہاں سے صحیح سند کا مطالبہ کیا گیا تو وہ نہ دے سکے اس مسئلہ کے لیے کچھ تفصیل ضروری ہے اسی وجہ سے میں نے اس میں قراء مشہور فقہاء اربعہ کے مذاہب اور اصولیین و مفسرین کے ذکر کردہ کا خلاصہ ذکر کر دیا۔ اللہ تعالیٰ ان سب سے راضی ہو اور اس کے بارے میں میں نے اس پر ایک اہم حاشیہ بھی ذکر کر دیا اس لیے کہ اس میں تطویل کا احتمال نہیں ہے۔ چنانچہ میں کہتا ہوں کہ: جمہور یعنی ائمہ اربعہ جن میں سے غزالی، صدر الشریعہ، موفق الدین مقدسی، ابن



مطلع اور طوفی کے نزدیک قرآن "وہ ہے جو مصحف کے دو گتوں میں تو اتر کے ساتھ منقول ہو۔" دیگر حضرات نے کہا کہ یہ کلام ہے جو رسول اللہ ﷺ پر اس سورت کے اعجاز کے لیے نازل ہوا۔ جس نے بھی اس تعریف کا قول کیا اس نے تو اتر کی شرط لگائی جیسا کہ ابن حاجب نے فرمایا اس لیے کہ یہ بات قطعی ہے کہ اس جیسوں کی تفصیل میں عادت تو اتر کا تقاضا کرتی ہے اور پہلے قول کے قائلین عادت کے محتاج نہیں ہیں اس لیے کہ ان کے نزدیک تو اتر تعریف کا جزء ہے لہذا اس کے بغیر قرآن پاک کی ماہیت تصور نہ ہوگی اس صورت میں مذاہب اربعہ کے ائمہ کے نزدیک تو اتر ضروری ہے اور ان میں سے سبکی و بیہقی نے بھی اس سے اختلاف نہیں کیا جیسا کہ آپ کو تھوڑی سی تحقیق کے بعد علم ہو جائے گا اور بے شمار جماعتوں نے اس کی تصریح کی ہے جیسے ابن عبدالبر، ابن عطیہ، ابن تیمیہ، تونسی نے اپنی تیسیر میں، نووی، بسکی، اسنوی، اذری، زرکشی، دیمیری، ابن حاجب، شیخ خلیل اور ابن عمرہ وغیرہ رحمہم۔

جبکہ قراء کا بھی اول زمانہ میں اس پر اجماع تھا اسی طرح آخری زمانہ میں بھی متاخرین میں سے کسی نے بھی اس کی مخالفت نہیں کی سوائے ابو جہ کی کہ اور بعض متاخرین بھی ان کے پیچھے چلے۔ یہ ان کا کلام ہے.... الخ۔ اس کے بعد بہت سی منقولات کو پیش کیا جنہیں ان کی طرف منسوب کیا یہ مقام ان کو پیش کرنے سے قاصر ہے بس جو ہم نے ذکر کر دیا کافی ہے۔

یہ توجیہ جس کے ذریعے ہم نے گزشتہ بلا ضابطہ کی توجیہ کی ہے اس سے اختلاف گویا کہ لفظی بن جاتا ہے اور قراء کی جماعتوں کو قرآن کے تو اتر میں ہموار راستے پر چلا دیتی ہے۔ "جو ہموار راستے پر چلتا ہے ٹھوکر سے بچ جاتا ہے۔"

سند کے اعتبار سے قراءات کی انواع ① سیوطی و بیہقی ابن جزری سے نقل کرتے ہیں کہ قراءات کی انواع چھ ہیں۔

① متواتر ② جسے ایک جماعت دوسری جماعت سے روایت کرے اور ان جیسی جماعتوں کا جھوٹ پر منح ہونا ممکن نہ ہو۔

مثال ③ وہ قراءت جس کے طرق قراء سب سے نقل کرنے میں متفق ہوں اور قراءات میں یہی غالب ہے۔

④ مشہور ⑤ جس کی سند صحیح ہو کہ عادل کامل الفضل لوگ اسے اپنے جیسوں سے روایت کریں اور اسی طرح سند تام ہو اور عربیت کے بھی موافق ہو اور مصاحف عثمانیہ میں سے بھی کسی کے موافق ہو خواہ ائمہ سب سے ہو یا ائمہ عشرہ سے یا ان کے علاوہ ائمہ مقبولین میں سے کسی سے مروی ہو اور قراء کے نزدیک مشہور بھی ہو اور انھوں نے اسے غلط یا شذوذ میں شمار نہ کیا ہو مگر تو اتر کے درجہ کو نہ پہنچی ہو۔

مثال ⑥ وہ قراءت جس کی سندیں قراء سب سے نقل ہونے میں مختلف ہوں اور بعض روای ان سے روایت کریں اور بعض نہ کریں۔ ان دو انواع میں مشہور ترین تصنیفات میں سے "التیسیر لللدانی، شاطبیہ" اور "طیبة النشر فی القراءات العشر"

ہیں یہ دونوں انواع ہیں جنہیں اعتقاد کے وجوب کے ساتھ پڑھا جاتا ہے اور ان میں سے کسی کا انکار بھی جائز نہیں۔

⑦ جس کی سند صحیح ہو اور رسم یا عربیت کے مخالف ہو اور مذکورہ بالا طریقے سے مشہور نہ ہوئی ہو اس نوع کو پڑھا نہیں جاتا اور نہ ہی اس کا اعتقاد واجب ہے۔

اس کی مثال مستدرک للحاکم ص ۲۵۰ پر عاصم محمد بن علی عن ابی بکرہ کی سند سے ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ﴿مُتَكِينٍ عَلٰی رُكُوفٍ خُضِرَ وَ عَنَقَرِي حَسَانٍ﴾ ﴿الرحمن ۷۰﴾ پڑھا اسی قبیل سے ﴿لَقَدْ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مِّنْ أَنفُسِكُمْ﴾ ﴿التوبہ: ۱۲۸﴾ بھی ہے یعنی فاء کے فتح کے ساتھ۔

④ **شاذ** • جس کی سند صحیح نہ ہو جیسے ابن اسمعق کی قرأت ﴿فَالْيَوْمَ نُنْتِجُكَ بِبَنَاتِكَ﴾ (یعنی ماء کے ساتھ) ﴿لَتَكُونَنَّ لِمَنْ خَلَقَكَ آيَةً﴾ (پس: ۹۲) (خلک میں لام کے فتح کے ساتھ)

⑤ **موضوع** • جو اس کے قائل کی طرف بغیر دلیل کے منسوب ہو۔

مثال • وہ قراءات جنہیں محمد بن جعفر خزاعی نے جمع کیا اور اسے امام ابوحنیفہ کی طرف منسوب کیا ضابطہ کی شرح میں اس پر کلام ابھی گزر چکا ہے۔

⑥ جو حدیث کی انواع میں سے مدرج کے مشابہ ہو یہ وہ کلمات ہیں جو قراءات میں علی وجہ التفسیر زیادہ ہو گئے ہوں جیسے حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کی قراءت ﴿وَلَوْ كُنَّا إِذْ دُخِلْنَا فِي سُنَّتِكُمْ﴾ (النساء: ۱۲) میں ﴿وَمِنْ أُمَّةٍ﴾ کی زیادتی کے ساتھ، اور اسی طرح ﴿لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَنْ تَبْتَغُوا فَضْلًا مِنْ رَبِّكُمْ﴾ (البقرہ: ۱۹۸) میں ﴿فِي مَوَاسِمِ الْحَجِّ﴾ کی زیادتی والی قرأت اور قرأت زبیر ﴿وَلَتَكُنَّ مِنْكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ﴾ (آل عمران: ۱۰۳) میں ﴿وَيَسْتَعِينُونَ بِاللَّهِ عَلَىٰ مَا أَصَابَهُمْ﴾ کے الفاظ کی زیادتی۔

یہ محض مشابہت ہے مدرج نہیں ہے، کیونکہ اس میں اختلاف ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ مجھے نہیں معلوم یہ ان کی قرأت ہے (یعنی زبیر رضی اللہ عنہ کی) یا انھوں نے تفسیر کی ہے اسے حضرت سعید بن منصور رضی اللہ عنہ اور ابن الانباری نے نقل فرمایا اور قطعی قرار دیا کہ یہ تفسیر ہے۔ اور حضرت حسن پڑھا کرتے تھے ﴿وَأَنْ مَنكُمُ الْاَوَادِهَا﴾ ﴿الْوُزُودُ﴾ ﴿الْكُحُولُ﴾ (مریم: ۷۱) ابن الانباری نے فرمایا کہ الورد: الدخول حضرت حسن کی طرف سے تفسیر ہے بعض راویوں نے اس میں غلطی کر کے اسے قرآن میں داخل کر دیا۔

ابن جزری رضی اللہ عنہ نے اپنے کلام کے آخر میں فرمایا کہ: "بعض اوقات کلام میں اس کی وضاحت کے لیے تفسیر کو داخل کر دیتے تھے اس لیے کہ انھیں تحقیق تھی کہ انھوں نے رسول اللہ ﷺ سے کونسا قرآن سیکھا ہے اس لیے وہ التباس سے مامون تھے۔" ابن الجزری کا کلام تھوڑے سے تصرف کے ساتھ پورا ہوا اس میں ہم نے صاحب اللکواکب الدرر کی اتباع کی۔

**قرآن پاک کا تواریخ** ؟ اس موضوع میں اتنا کافی ہے کہ میں آپ کی خدمت میں تین نقول اور پیش کروں جو ان سے زائد ہیں جو اس سے پہلے علامہ نویری سے نقل کیے گئے۔

① امام غزالی "المستصفیٰ" میں فرماتے ہیں کہ "حدائق کتاب" (کتاب کی تعریف) "جو ہماری طرف مصحف کے دو گوتوں کے درمیان سات حروف پر تواریخ کے ساتھ منقول ہو۔" کتاب سے ہماری مراد "قرآن منزل" ہے اور ہم نے اسے مصحف کے ساتھ متعین کیا اس لیے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم نے اس کی نقل میں خوب احتیاط سے کام لیا حتیٰ کہ انھوں نے تاثیر (یعنی ہر دس آیات پر علامت لگانا) اور نقلوں کو ناپسند کیا اور انھیں خالی رکھنے کا حکم دیا تا کہ قرآن غیر قرآن کے ساتھ خلط نہ ہو جائے۔ اور ہماری طرف تواریخ کے ساتھ نقل ہوا لہذا ہمیں معلوم ہوا کہ مصحف میں جو لکھا ہوا ہے وہ متفق علیہ ہے اور وہی قرآن ہے اور اس سے خارج قرآن نہیں ہے اس لیے کہ عرف و عادت میں محال ہے کہ اس کی حفاظت کے بھر پور اسباب ہونے کے باوجود اس کا کچھ حصہ چھوٹ جائے اور نقل نہ ہو یا اس کا غیر اس سے خلط ملط ہو جائے۔ پھر فرمایا کہ: "اگر کوئی کہے کہ تم نے تواریخ کی شرط کیوں لگائی؟

ہم جواب دیں گے کہ اس لیے کہ اس کا علم حاصل ہو جائے اس لیے کہ غیر معلوم کا حکم جمل ہوتا ہے اور کسی چیز کا کلام اللہ ہونا

حرف منابل العرفان فی علوم القرآن: جلد ①

ایک حقیقی امر ہے وضعی نہیں کہ اس کا تعلق ہمارے ظن کے ساتھ ہو اور کہا جائے کہ جب تم نے یہ یہ گمان کر لیا تو ہم نے تم پر ایک فعل حرام کر دیا یا اسے تمہارے لیے حلال کر دیا یا اس طرح تحریم ہم سے معلوم ہوگی اور ہمارا ظن علامت ہوگا اس کے ساتھ حرمت کا تعلق ہے... حد کلام سے دو مسئلے وجود میں آتے ہیں۔

کفارہ یحییٰ کے روزوں میں متابع کا مسئلہ ① ایک قول کے مطابق یہ واجب نہیں ہے اگرچہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے ﴿فَصِيَامٌ ثَلَاثَةٌ اَيَّامٍ﴾ (الامہ: ۸۹) متابعات پڑھا ہے اس لیے کہ یہ زیادتی متواتر نہیں ہے اس لیے قرآن کا حصہ نہیں ہے اس لیے اس بات پر محمول کیا جائے کہ انھوں نے اس معرض بیان میں ذکر کیا کہ انھوں نے اپنے مذہب میں کسی چیز کا اعتقاد رکھا، ہو سکتا ہے کہ انھوں نے متابع کا اعتقاد اس مطلق کو ظہار میں متابع کے ساتھ مقید پر محمول کرتے ہوئے رکھا ہو۔

امام ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ متابع واجب ہے اس لیے کہ اس کا قرآن ہونا اگرچہ ثابت نہیں لیکن کم از کم یہ خبر ضرور ہے اور خبر واحد پر عمل کرنا واجب ہے اور یہ ضعیف ہے اس لیے کہ خبر واحد کے کذب پر کوئی دلیل نہیں ہے وہ یہ کہ اسے قرآن قرار دینا قطعی خطا ہے اس لیے کہ یہ رسول اللہ ﷺ پر واجب ہے کہ وہ اسے اپنی امت کی ایک ایسی جماعت تک پہنچائیں جن کا قول حجت ہو اور آپ ﷺ کے لیے جائز نہیں کہ اس کے ذریعے کسی ایک سے سرکشی کریں اور اگر اسے قرآن سے نہ بنا لیں تو یہ بھی احتمال ہے کہ یہ ان کا مذہب ہو کسی ایسی دلیل کی وجہ سے جو اس پر دلالت کرتی ہو اور یہ بھی احتمال ہے کہ یہ خبر ہو اور جو چیز خبر ہونے یا نہ ہونے میں متردد ہو اس پر عمل کرنا جائز نہیں بلکہ عمل اس پر جائز ہوتا ہے جس کے بارے میں راوی تصریح کر دے کہ یہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا۔

① بسملة، قرآن پاک کی آیت ہے لیکن کیا ہر سورۃ کے شروع میں ایک آیت ہے؟ اس میں اختلاف ہے امام شافعی رضی اللہ عنہ کا میلان اس طرف ہے کہ یہ سورۃ الحمد اور باقی تمام سورتوں کی آیت ہے، لیکن یہ ہر سورۃ کے شروع میں مستقل آیت ہے یا یہ تمام سورتوں کی پہلی آیت کے ساتھ مل کر ایک آیت ہے امام شافعی رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ انھوں نے اس میں تردد کیا اور یہی اصح ہے نسبت اس شخص کے قول کے جس نے امام شافعی رضی اللہ عنہ کے قول کے تردد کو اس بات پر محمول کیا کہ کیا یہ ہر سورت کے شروع میں قرآن ہے؟ بلکہ صحیح یہ ہے کہ چونکہ یہ قرآن کے ساتھ قرآن کے خط میں لکھی گئی ہے اس لیے قرآن ہے۔

(یہ ہم نے ان سے نقل کرنے کا ارادہ کیا معمولی تصرف کے ساتھ)

② صاحب مسلم الثبوت اور اس کے شارح فرماتے ہیں کہ جو آحاد منقول ہیں وہ قطعاً قرآن نہیں ہیں اور اس میں کسی بھی مذہب کا اختلاف نہیں جانا گیا اس پر دلیل یہ دی کہ قرآن کے نقل کے بھرپور اسباب ہیں اس لیے کہ الفاظ اور معنی کے اعتبار سے تحدی کو محققین نے اور احکام کی بنیاد ہے یہاں تک کہ اس کے لفظ کے ساتھ بہت زیادہ احکام محققین میں نیز یہ کہ ہر زمانے میں اس کی قرأت اور کتابت کے ساتھ تبرک حاصل کیا جاتا ہے اسی لیے معلوم ہوا کہ صحابہ رضی اللہ عنہم نے اس کی حفاظت میں تواتر قطعی کی کوشش کی اور ہر وہ چیز جس کے نقل کے دوائی بہت ہوں اور عادات وہ متواتر منقول ہو تو اس کا وجود عادات ہر ایک کے نزدیک تواتر کو ملزوم ہوتا ہے جب لازم یعنی تواتر منشی ہو گیا تو ملزوم بھی قطعی طور پر منشی ہو گیا اور منقول آحاد متواتر نہیں ہیں لہذا وہ قرآن نہیں ہیں۔

③ حافظ جلال الدین "الاتقان" میں فرماتے ہیں کہ اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ "قرآن سے کچھ بھی ہو اس کا اصل میں بھی اور اجزاء میں بھی متواتر ہونا ضروری ہے جبکہ نقل، وضع اور ترتیب میں بھی اہل سنت کے نزدیک اسی طرح ہے اس لیے کہ اس طرح کی



چیزوں کی تفصیل میں عادت تو اتر کا تقاضا کرتی ہے اس لیے کہ یہ ایک بہت بڑا معجزہ ہے اور وہ معجزہ ہے جو دین تویم اور سراط مستقیم کی بنیاد ہے جس کے اجمالی اور تفصیلی نقل پر بھرپور اسباب ہیں اب جو چیز آحاد کے ساتھ منقول ہو اور متواتر نہ ہو تو اس کے بارے میں قطعی فیصلہ کیا جائے گا کہ وہ قرآن نہیں ہے اکثر اصولیین کا مذہب یہ ہے کہ تو اتر قرآن کے ثبوت میں اصلاً شرط ہے لیکن اپنے محل، وضع اور ترتیب میں شرط نہیں ہے بلکہ اس میں نقل آحاد اکثر ہے۔ بعض نے کہا کہ یہی وہ چیز ہے جس کا امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ ہم اللہ کا ہر سورت کے شروع میں ثابت کرنے والے طریقہ کار نے تقاضا کیا۔ اس مذہب کی تردید اس طرح ہے دلیل سابق تمام چیزوں میں تو اتر کا تقاضا کرتی ہے نیز یہ کہ اگر وہ شرط نہ ہو تو مکرر قرآن کا بہت کثیر حصہ ساقط ہونا اور بہت سے غیر قرآن کا قرآن ثابت ہونا جائز ہوتا ہے۔ اذل اس لیے کہ اگر ہم محل میں تو اتر کی شرط نہ رکھیں تو قرآن میں واقع ہونے والے کثیر مکررات کا متواتر نہ ہونا جائز ہوتا جیسے ﴿فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبِينَ ﴿۱۳﴾﴾ (الزمن: ۱۳) دوسرا اس لیے کہ جب قرآن کا بعض حصہ اپنے محل کے اعتبار سے متواتر نہ ہو اس بعض کا اثبات اپنے محل میں آحاد کے نقل کے ساتھ بھی جائز ہوتا قاضی ابو بکر رحمۃ اللہ علیہ نے "الاتنصار" میں فرمایا کہ "فقہاء و متکلمین میں سے ایک قوم کا مذہب یہ ہے کہ خبر واحد سے قرآن پاک کا ثبوت حکما ہوگا علمائیں اور خبر مستفیض سے ایسا نہیں۔"

علماء و حق نے اس کا انکار کیا اور اسے ناپسند کیا اور اس کے قائلین کو خطا پر قرار دیا۔

جبکہ مالکیہ وغیرہ میں سے جنہوں نے بسملہ کے انکار کا قول کیا انہوں نے اپنے قول کی بنیاد اسی اصل پر رکھی اور یہ طے کیا کہ یہ سورتوں کے شروع میں متواتر نہیں ہیں اور جو چیز متواتر نہ ہو وہ قرآن نہیں ہوتا۔

ہم سے پہلے اس کا جواب دیا گیا کہ ان کا متواتر نہ ہونا ممنوع ہے کیونکہ بہت سی چیزیں ایسی ہوتی ہیں کہ ایک قوم کے نزدیک متواتر ہوتی ہیں اور دوسری قوم کے نزدیک متواتر نہیں ہوتیں اور ایک وقت میں متواتر ہوتی ہیں دوسرے وقت میں نہیں ہوتیں ان کے تو اتر میں اتنا کافی ہے کہ یہ صحابہ رضی اللہ عنہم اور ان کے بعد والوں کے مصاحف میں خط مصحف کے ساتھ ثابت ہیں حالانکہ انہوں نے مصحف میں غیر قرآن کو لکھنے سے منع کیا تھا جیسا کہ سورتوں کے نام آئین اور اعشار وغیرہ اگر یہ قرآن نہ ہوتا تو یہ حضرات اسے قرآن کے خط میں بغیر کسی تمیز کے اسے ثابت رکھنا جائز نہ سمجھتے اس لیے کہ یہ اس کے قرآن ہونے کے اعتقاد پر محمول کرتا ہے اس صورت میں وہ مسلمانوں کو دھوکہ دینے والے اور انہیں غیر قرآن کے قرآن ہونے کے اعتقاد پر ابھارنے والے بن جائیں گے حالانکہ یہ ایسی چیز ہے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم کے بارے میں اس کا اعتقاد جائز نہیں۔

اگر کہا جائے کہ شاید انہوں نے اسے سورتوں کے درمیان فصل کے لیے ثابت رکھا ہو تو جواب یہ ہوگا کہ اس میں تفسیر ہے اور محض فصل کے لیے اس کا ارتکاب حبان نہیں اگر اس کے لیے جائز ہوتا تو سورۃ الانفال اور برأت کے درمیان بھی لکھی جاتی۔ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ کا کلام ختم ہوا۔

یہ تین نقول اس موضوع میں کافی ہیں جیسا کہ آپ دیکھ رہے ہیں کہ "المستصفی" اور "مسلم الثبوت" کی عبارتیں واضح طور پر دلائل قائم کرتی ہیں کہ قرآن متواتر ہے اگرچہ ان کا طریقہ استدلال مختلف ہے۔

اور سیوطی کی عبارت اصل اور غیر اصل میں اس تو اتر کے عموم میں اختلاف کو ذکر کرتی ہے اور اس عموم کی تائید کرتی ہے اور

جس نے محل وضع اور ترتیب کو چھوڑ کر صرف اصل قرآن پر اقتصار کیا اس کی تردید کرتی ہے۔

قرآءات سبع میں آراء ② اختلافات، اضطراب نقول اور دو اختلاف کرنے والوں کے درمیان بہت زیادہ جبکہ حد سے زیادہ مسافت سے بھرا ہوا ہے۔ آپ کی خدمت میں ایک چھوٹی سی صورت پیش کی جاتی ہے جس میں آراء و افکار کا اختلاف موجود ہے جو کاتبین کے درمیان اس موضوع کی زینت بنا ہوا ہے۔

بعض لوگ قرآءات سبع کی شان بڑھاتے ہوئے مبالغہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ: ”جس نے خیال کیا کہ قرآءات سبع میں تو اترا لازم نہیں تو اس کا یہ قول کفر ہے اس لیے کہ یہ تمام قرآن کے عدم تو اترا کا سبب ہے اور یہ رائے بلا داندلیہ کے مفتی استاد ابو سعید فرج بن لب کی طرف منسوب ہے انھوں نے اپنی اس رائے میں بہت زیادہ سختی کی اور اپنے مذہب کی تائید اور اس کی تردید کرنے والوں کے رد میں ایک بہت بڑا رسالہ تالیف کیا۔

لیکن ان کی یہ دلیل جس کا انھوں نے سہارا لیا مسلم نہیں اس لیے کہ قرآءات سبع کے عدم تو اترا کا قول قرآن کے عدم تو اترا کو مستلزم نہیں۔ کیوں؟ اس لیے کہ قرآءات سبع اور قرآن میں فرق ہے کیونکہ قرآن پاک کا قرآءات سبع کے علاوہ میں بھی تو اترا کے ساتھ ہونا صحیح ہے یا اس مقدار کے اندر جس پر تمام قرآءات متفق ہو یا اس مقدار میں جس پر اتنی تعداد متفق ہو جن کے جھوٹ پر جمع ہونے سے ہر طبقہ میں اسن ہو اگرچہ یہ احتمال ہے واقع جس کی نفی کرتا ہے جیسا کہ آئندہ آنے والی تحقیق اس کی نفی کرتی ہیں۔

② بعض لوگ قرآءات سبع کی توین اور اس کی شان گھٹانے میں مبالغہ کرتے ہوئے دعویٰ کرتے ہیں کہ ان میں اور باقی قرآءات میں کوئی فرق نہیں۔ وہ فیصلہ کرتے ہیں کہ تمام روایات اخبار آحاد ہیں وہ اس پر دلیل یہ دیتے ہیں کہ ان کے تو اترا کا قول ایک منکر امر ہے جو اس میں سے کسی چیز میں بھی طعن کرنے والے کی تکفیر کا باعث ہے حالانکہ بعض علماء اور نمایاں شخصیات نے اس پر طعن کیا ہے۔

اس دلیل کا معارضہ اس طرح ہو گا کہ ہم نہیں تسلیم کرتے کہ قرآءات میں سے کسی کا انکار اس کے تو اترا کے قول کی بناء پر تکفیر کا متقاضی ہے تکفیر کا حکم تو اس کے لیے ہو گا جو اس کے تو اترا کو جانتا ہو پھر اس کا انکار کرے اور ایک چیز بعض اوقات ایک قوم کے نزدیک متواتر ہوتی ہے اور دوسری قوم کے نزدیک نہیں ہوتی اور کبھی ایک وقت میں متواتر ہوتی ہے اور ایک وقت میں نہیں ہوتی چنانچہ اس میں جن لوگوں نے طعن کیا اسے اس بات پر محمول کیا جائے گا کہ انھیں اس کے تو اترا کا علم نہیں تھا یہ ان لوگوں کے تو اترا کی نفی نہیں کرتا جو اسے جانتے ہیں۔

﴿وَدَفَوْقَ كُلِّ ذِي عِلْمٍ عَلِيمٌ ﴿٥٦﴾﴾ (سوف: ۷۶)

”ہر علم والے کے اوپر بھی ایک علم والا ہوتا ہے۔“

اس دلیل کا معارضہ یوں بھی ہو سکتا ہے کہ طاعنین کا طعن صرف ان چیزوں میں ہے جن میں اختلاف ہے اور وہ ادا کی قبیل سے ہیں اور جو متفق علیہ ہیں وہ طعن کا محل نہیں ہیں اور ہم جس تو اترا کے قائل ہیں وہ متفق علیہ ہے وہ تو اترا جو مختلف فیہ ہے ہم اس کے قائل نہیں ہیں۔

منائل العسرفان فی علوم القرآن: جلد ①

④ ابن السکلی ریاض جمع الجوامع میں اور ان کے شارح اور محشی بھی فرماتے ہیں کہ "قرآات سبعہ متواترہ تواتر تام ہیں یعنی انھیں نبی کریم ﷺ سے ایک ایسی جماعت نے نقل کیا جن کا جھوٹ پر جمع ہونا عادتاً مستنع ہے اور اسی طرح سلسلہ چلتا گیا۔

اور قرآء کی اسانید کا آحاد ہونا معتز نہیں اس لیے کہ اس کا کسی جماعت کے ساتھ مختص ہونا دوسروں سے قرآءت کے آنے سے مانع نہیں بلکہ واقع ہے۔ تحقیق اسے ہر شہر والوں سے ان کے امام کی قرآءت کے ساتھ ایک بہت بڑی جماعت نے اپنے جیسوں سے حاصل کیا اور اسی طرح سلسلہ چلتا رہا اور اس کی نسبت ائمہ مذکورین اور مذکورہ راویوں کی طرف ان کی سندوں میں کی گئی اس لیے کہ وہ لوگ ان کے حروف کے ضبط اور اپنے کامل شیوخ کے حفظ کے درپے لگے ہوئے تھے۔

اس کا معارضہ اس طرح کیا جاتا ہے کہ اگر سب کی سب قرآءتیں متواتر ہوں تو قرآء اس میں بالکل بھی اختلاف نہ کرتے حالانکہ انھوں نے اختلاف کیا اس لیے ان تمام کا متواتر ہونا مسلم نہیں۔

اس کا جواب یوں دیا جاتا ہے کہ اختلاف سے تواتر کی بھی نفی نہیں ہوتی بلکہ کل کا کل بھی متواتر ہو تو بھی اس میں اختلاف ہو سکتا ہے اس لیے کہ حروف سبعہ میں سے ہر حرف جس کے ساتھ قرآن نازل ہوا ہے انھیں رسول اللہ ﷺ نے ایک ایسی جماعت کو پہنچا دیا جن کا جھوٹ پر جمع ہونے سے اطمینان ہے تا کہ اس کتاب کی حفاظت ہو جائے اور انھوں نے اسے اپنے جیسوں کی طرف پہنچا دیا اور اس میں کوئی شک نہیں کہ حروف ایک دوسرے کے مخالف ہیں تو یقینی بات ہے کہ جس نے جو حرف لیا اس کے نزدیک ہر حرف کا تواتر یقینی ہے اگرچہ دوسرے نے اسے نہ جانا ہو اور نہ ہی لیا ہو۔ اس موقع پر تواتر اور مخالف جمع ہو جاتے ہیں اور اس مقام پر قرآءت سبعہ بلکہ قرآءت عشرہ کے تواتر کا قول سیدھا ہو جاتا ہے۔ جیسا کہ عنقریب آ رہا ہے۔

⑤ ابن الحاجب ریاض کا مذہب یہ ہے کہ قرآءت سبعہ متواتر ہیں لیکن انھوں نے ان چیزوں کو مستثنیٰ کیا ہے جو ادا کی قبیل سے ہیں جیسے مد، امالہ اور ہزہ کی تخفیف کرنا۔

بنائی ریاض نے "جمع الجوامع" کے حاشیہ پر لکھا کہ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ جو چیزیں ادا کی قبیل سے ہوں بائیں طور کہ وہ لفظ کی ہیئت ہوں اور لفظ ان کے بغیر تحقق ہو جائے جیسے مد کی اپنی اصل پر زیادتی اور اس کے بعد والی مثالیں جو اس قبیل سے ہیں کہ سماع انھیں عادتاً ضبط نہیں کر سکتا اس لیے کہ یہ زیادتی اور نقصان کو قبول کرتے ہیں بلکہ یہ ایک اجتہادی امر ہے اور تواتر میں شرط ہے کہ وہ اصل میں اجتہاد سے نہ ہو۔ اگر یہ کہا جائے کہ یہ ضبط طبقہ اولیٰ میں پایا جاتا تھا اس لیے کہ یہ معلوم ہو کہ انھوں نے نبی کریم ﷺ سے جو کچھ سنا اسے اسی طرح ضبط کر لیا ہو اور اس میں کوئی تفاوت نہ ہو اس وجہ سے کہ انھوں نے آپ ﷺ سے جو سنا ہوا ہے بار بار پیش کیا ہو۔

ہم جواب دیتے ہیں کہ اگر اس کا وقوع مان لیا جائے تو بھی مفید نہیں اس لیے کہ باقی طبقات میں اس کی نظیر نہیں۔ کیونکہ طبقہ اولیٰ عادتاً قطعی طور پر اس پر قادر نہیں کہ دوسرے طبقہ نے جو حاصل کیا وہ بھی اسی طریقے پر جاری ہوں جس کے ساتھ نبی کریم ﷺ نے اسے پڑھا ہو۔ اور گزشتہ بالا تقریر سے معلوم ہو گیا کہ کلام مد اور اس کے مابعد والی مثالوں پر اضافے کے بارے میں ہے اصل کے بارے میں نہیں کیونکہ یہ متواتر ہے۔

خلاصہ یہ ہوا کہ جو چیزیں ادا کی قبیل سے ہیں اگر ان کے تواتر سے مراد ان کی اصل کے اعتبار سے تواتر ہے جیسے مد کا تواتر



اس کی مقدار سے قطع نظر کرتے ہوئے اسی طرح امالہ کا تواتر تو جو یہ ابن حاجب کے قول کے خلاف ہوگی اس لیے کہ اس کے تواتر کا علم ہے اور اگر اصل سے زائد خصوصیات کا تواتر ہو تو جو یہ ابن حاجب کے قول کے مطابق ہوگی۔ یہ ابن قاسم نے فرمایا.... الخ (تھوڑے سے تصرف کے ساتھ)

لیکن جب ہم نے ابن حاجب کی عبارت کی طرف رجوع کیا تو ہمیں اسی طرح ملا جیسے انھوں نے اپنی کتاب "مختصر الاصول" میں فرمایا کہ "قراءات سبع متواتر ہیں ان چیزوں میں جو ادا کی قبیل سے نہ ہوں جیسے ہاء امالہ اور تخفیف ہمزہ وغیرہ اور یہ ان کا مرتبہ دعویٰ ہے کہ ہاء امالہ اور ہمزہ کی تخفیف وغیرہ ادا کی قبیل سے ہیں اور یہ غیر متواتر ہیں اور یہ غیر مرتب ہے جیسا کہ آپ کے پاس ان کی بات آ رہی ہے جو انھوں نے ابن جزری کے ساتھ طویل مناقشہ میں کہی۔

⑤ ابوشامہ کا مذہب یہ ہے کہ قراءات سبعہ متواتر ہیں ان چیزوں میں جن کے قراء سے منقول ہونے پر طرق متفق ہیں اور جن کے منقول ہونے میں طرق مختلف ہیں وہ متواتر نہیں ہیں خواہ اختلاف کلمہ کے ادا میں ہو جیسا کہ ابن حاجب کا مذہب ہے اور خواہ لفظ میں ہو چنانچہ اس موقع پر اشتہاء ابن حاجب کے اشتہاء سے عام ہے ابوشامہ کی عبارت ان کی کتاب "المرشد الوجیز" میں ہے جس کی تصریح مندرجہ ذیل ہے۔

"متاخرین قراء کی جماعت کی زبانوں پر جو چھایا ہوا ہے کہ قراءات سبعہ متواتر ہیں ان کے بارے میں میں کہتا ہوں کہ یہ وہ ہیں جن کے قراء سبعہ سے نقل ہونے پر طرق متفق ہیں مختلف نہیں ہیں مطلب یہ ہے کہ بعض طرق میں ان کی نسبت کی لفظی گئی ہو اور یہ کتب قراءات میں موجود ہے خصوصاً کتب المغاربہ اور مشارقہ میں کہ ان کے درمیان اکثر جگہوں پر تائین ہے۔"

خلاصہ یہ کہ ہم تواتر کا التزام نہیں کرتے ان تمام الفاظ میں جن میں قراء کے مابین اختلاف ہوا بلکہ ان میں سے کچھ متواتر ہیں اور متواتر وہ ہیں جن کے قراء سے منقول ہونے میں تمام طرق متفق ہوں اور کچھ غیر متواتر ہیں اور غیر متواتر وہ ہیں جن میں معنی سابقہ کے اعتبار سے اختلاف ہوا اور بظاہر یہ ان کو بھی شامل ہو جائے گا جو قبیل ادا سے نہ ہوں اور ان کو بھی شامل ہو جائے گا جو قبیل ادا سے ہوں.... الخ" یہ "شرح جمع الجوامع" میں جلال الدین محلی سے اس کے حاشیہ میں منقول ہے۔

ابوشامہ کی اس رائے کے بارے میں میں طبعہ اولیٰ میں کہا کرتا تھا کہ یہ میرے خیال میں سب سے بہتر رائے ہے اور یہ چار امور کی وجہ سے ہے۔

- ① یہ رائے ان توہینوں سے پاک ہے جن کے ذریعے سابقہ آراء کے ساتھ مناقشہ کیا گیا۔
- ② یہ اپنے دعویٰ اور دلیل میں واقع کی طرف منسوب ہے وہ یہ کہ قراءات سبعہ کے بعض حصوں میں کسی جگہ کلمات کے الفاظ کے تلفظ میں حقیقی اختلاف واقع ہوا ہے اور بعض جگہ ان الفاظ کی ادا میں اختلاف واقع ہوا ہے اسی وجہ سے دعویٰ واقع کے مطابق ہے پھر اس کی دلیل بھی واقع پر قائم ہوتی ہے کہ بعض روایات جو اپنی ائمہ قراء کی طرف نسبت میں مضطرب ہیں بعض نے ان کی نفی کی ہے اور بعض نے ان کا اثبات کیا ہے یہی تواتر کے انتفاء کی علامت ہے اس لیے کہ ایسی جماعت کا اتفاق جن کا جھوٹ پر ترجیح ہونے سے اطمینان ہو ہر طبقہ میں ہونا تواتر کے لازماًت میں سے ایک لازم ہے اور یہ اتفاق منطقی ہو گیا لہذا تواتر منطقی ہو گیا اس لیے کہ یہ معلوم ہے کہ جب لازم منطقی ہو جائے تو ملزم بھی منطقی ہو جاتا ہے۔

⑤ یہ رائے علوم القرآن میں خوب ماہر اور متخصص و کامل شخصیت سے صادر ہوئی ہے اور وہ ابوشامہ ہیں اور ”گھر والا ہی اچھی طرح جانتا ہے کہ اس میں کیا ہے۔“

⑥ یہ رائے محققین کے نزدیک مقرر شدہ قاعدے کے ساتھ بھی متفق ہوتی ہے کہ قراءات کے اندر ارکان ثلاثہ مذکورہ پورے ہوتے ہیں جو کہ اس مشہور قاعدہ میں ہے اور یہ ارکان ثلاثہ تمام کے تمام یا بعض منگنی ہیں اس میں قراءات سبعہ یا غیر سبعہ وغیرہ کا کوئی فرق نہیں جیسا کہ گزر چکا۔ اور گزشتہ بالا سند کے اعتبار سے قرأت کی چھ اقسام کی تصریح کی ہے یہ رائے ان کے ساتھ بھی متفق ہو جاتی ہے۔

**استدراک** • لیکن میرے بار بار بحث و نظر کرنے اور اس بارے میں اہل تحقیق کی مکتوبات میں میرے آگاہ ہونے کا دائرہ وسیع ہونے کے بعد مجھے واضح ہوا کہ ابوشامہ بھی درنگی سے غلطی کھا گئے جیسے غلطی کھانے والے کھا جاتے ہیں اور میں نے بھی اس کی اشاعت اور تائید میں غلطی کی۔

میں مجبور ہوں کہ حق کے انصاف کے طور پر ان وجوہ کو لوٹاؤں جن میں نے آپ کے سامنے تائید کی اب میں انہیں ایک ایک وجہ کر کے توڑوں گا ”اور حق کی طرف رجوع فضیلت ہے۔“

① ابوشامہ کی رائے جو کبھی گئی ہے مسلم نہیں کہ یہ ان توہینات میں سے ہے جن کے ذریعے سابقہ آراء کا مناقشہ کیا گیا عنقریب آپ دیکھیں گے کہ ابن جزری کے کلام میں حساب کے ساتھ ان کا شدید مناقشہ ہے۔

② پھر یہ پردہ بھی کھل گیا کہ قراءات سبعہ بلکہ قراءات عشرہ واقع میں سب کی سب متواتر ہیں اور ان میں اختلاف سے تواتر کی نفی نہیں ہوتی بلکہ تواتر اور تخالف جمع ہو جاتے ہیں جیسا کہ ابن سبکی کی رائے کو پیش کرتے ہوئے ہم نے اس کی وضاحت کی۔ اور جیسا کہ آئندہ آنے والی ابن جزری کی تحقیق میں آپ کو بھی واضح ہو جائے گا۔

③ باقی رہی یہ بات کہ ابوشامہ ایک ماہر فن اور متخصص و کامل ہیں تو پاک ہے وہ ذات جو معصوم ہے اور کمال صرف اللہ تعالیٰ کے لیے ہے۔ اس لیے کہ جنھوں نے ان کی تردید کی ہے اور ہم نے ان کی رائے کو اختیار کیا ہے (یعنی ابن الجزری) وہ بھی ماہر فن اور متخصص و کامل ہیں اور اس فن کی مہارت ان پر تام ہوتی ہے حتیٰ کہ جب محقق کا لقب مطلق بولا جائے تو اس کی طرف لوٹنا ہے۔ اور کتنے اڈل ہیں جن کو بعد والوں کی وجہ سے چھوڑ دیا گیا ہے۔“

④ اور محققین نے قراءات کی جو تقسیم کی ہے کہ وہ متواتر ہے اور غیر متواتر۔ یہ ایسی تقسیم ہے کہ ابوشامہ کو اپنی اس رائے میں اس سے کوئی بھی فائدہ نہیں ہوگا اس لیے کہ وہاں ان کا کلام مطلق قراءات کے بارے میں ہے اور جبکہ ہمارا اور ابوشامہ کا کلام خاص قراءات سبعہ کے بارے میں ہے:

﴿بَيْنَهُمَا بَرْخٌ لَّا يَبْغِيَانِ﴾ (المن: ۲۰)

”ان دونوں کے درمیان پردہ ہے وہ آگے نہیں بڑھتے۔“

تین قراءتوں کے بارے میں آراء جو دس کو پورا کرنے والی ہیں۔

گزشتہ بلا میں آپ جان چکے کہ قرأت سبوع کے بارے میں کیا کہا گیا؟ آیا کہ وہ متواتر ہیں یا غیر متواتر؟ جبکہ تین قراءات جو دس کو پورا کرنے والی ہیں بعض نے ان کے بھی تواتر کا قول کیا اور یہ قول ابن سبکی کی طرف منسوب ہے بعض نے فقط ان کے صحیح ہونے کا قول کیا، یہ جلال الدین صلی کی طرف منسوب ہے بعض نے شاذ کہا اور یہ قول ان فقہاء کی طرف منسوب ہے جو قراءات سبوع کے علاوہ تمام قرأتوں کو شاذ شمار کرتے ہیں۔

**قراءات عشر کے تواتر کی تحقیق** جس کی تائید دلیل سے ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ قراءات عشر سب کی سب متواتر ہیں اور یہ رائے محقق اصولیین اور قراء کی ہے جیسے ابن السبکی، ابن الجزری اور اور نویری وغیرہ بلکہ آخری نقل میں ابوشامہ کی بھی رائے یہی ہے ان سے نقل کرنے والوں نے اسے صحیح قرار دیا ہے اور جائز قرار دیا ہے کہ یہ رائے ان پر چھپائی گئی ہو یا انھوں نے پہلے یہ کہا ہوا اور بعد میں اس سے رجوع کر لیا ہو۔

ہو سکتا ہے کہ درستی اور حکمت یہ ہو کہ اس موقع پر میں کلام کو محقق ابن الجزری نے لیے چھوڑ دوں وہی اس میں کودتے اور پھرتے رہیں بولتے اور جھومتے رہیں اپنے نصاب میں حق کو وضع کریں نظا اور ان کے شبہات کو دور کریں۔ اب آپ اسے پڑھیں اور ان کی کثرت کلامی اور تطویل پر صبر کریں اس لیے کہ مقام دقیق و طویل ہے۔ ﴿وَلَا يُؤْتِيكَ مِثْلًا مِّثْلًا﴾ (فاطر: ۱۳) (خبر رکھنے والے کی طرح تمہیں کوئی نہیں بتلا سکتا)

انھوں نے پچھتر واں صفحہ شروع کرتے ہوئے فرمایا یا بڑھو۔

**فصل ثانی** اس بارے میں ہے کہ قراءات عشر اصول و فروع اور اجتماع و افتراق ہر اعتبار سے متواتر ہے۔

**اس مشکل کا حل** جاننا چاہیے کہ علماء نے نئی اور اثبات ہر پہلو سے اس میں مبالغہ کیا ہے اور میں سب کے اقوال ذکر کرنے کے بعد آپ کے سامنے حق کو بیان کروں گا۔

جس نے کہا کہ یہ جزءیات میں متواتر ہے اصول میں نہیں وہ ابن حاجب ہیں۔ انھوں نے اپنی کتاب "مختصر الاصول"

میں فرمایا کہ قراءات سبع ان چیزوں میں متواتر ہیں جو اداء کی قبیل سے نہ ہوں جیسے مد، امالہ اور ہمزہ کی تخفیف وغیرہ... الخ۔

انھوں نے دعویٰ کیا کہ مد اور امالہ اور اس جیسے اصول جیسے ادغام، راءات کی تریق اور لامات کی تخفیم، حرکت کا نقل اور ہمزہ کی تسہیل وغیرہ کی قبیل سے ہیں اور غیر متواتر ہیں یہ قول غیر صحیح ہے جیسا کہ عنقریب ہم اسے بیان کریں گے۔ انھوں نے مد کو مطلق ذکر کیا حالانکہ اس کے تحت بھی ایسی چیزیں ہیں جو آنسو بہاتی ہیں کیونکہ مد، یا تو طبیعی ہوگی یا عرضی طبیعی وہ ہے جس کے بغیر حرف مد قائم ہی نہ ہو سکیں جیسے قال کا الف، "يَقُولُ" کی واو اور قیل کی یاء اس کے عدم تواتر کا قول بھی مسلمان نہیں کر سکتا اس لیے کہ اس کے بغیر قراءت ممکن ہی نہیں۔ جبکہ مد عرضی وہ ہے جو مد طبیعی پر زیادتی کو عارض کرتی ہے اور اس کا کوئی سبب ہوتا ہے یا تو سکون ہوگا یا ہمزہ ہوگا سکون کبھی لازم ہوگا جیسا کہ سورتوں کے شروع میں اور مشدود ہوگا جیسے ﴿الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ﴾ ﴿وَلَا الضَّالِّينَ﴾ وغیرہ یہ بھی طبیعی کے ساتھ ملحق ہے اس میں قصر جائز نہیں اس لیے کہ مد بھی ایک حرف کے قائم مقام ہوگئی لفظ کو ساکن سے ملانے کی غرض سے محقق لوگوں نے اس کی مد پر مقدار کے اعتبار سے اجماع کیا ہے کہ وہ برابر ہوگی جبکہ ہمزہ کی دو اقسام ہیں۔

① یا تو حرف مد ایک کلمہ میں ہوگا اور ہمزہ دوسرے میں، قراءات سے منفصل کا نام دیتے ہیں اور اس کے مد اور قصر میں اختلاف کرتے

ہیں اکثر مد کا قول کرتے ہیں اس کا دعویٰ کہ اس میں عدم تواتر ہے یہ ترجیح بلا مرجح ہے اور اگر اس کے برعکس کہتے تو زیادہ ظاہر ہوتا اس کے شبہ کی وجہ سے اس لیے کہ اکثر قراء مد پر ہیں۔

② مدار و ہمزہ ایک کلمہ میں ہوں اسے متصل کہتے ہیں قراء نے اس کی مد پر اجماع کیا ہے پچھلوں نے بھی اگلوں نے بھی چھوٹوں نے بھی اور بڑوں نے بھی شرفاء نے بھی حقیروں نے بھی اس میں کوئی اختلاف نہیں سوائے اس روایت کے جو بعض سے منقول ہے جس پر ہمدوسہ نہیں کیا جاتا وہ شاذ سند کے ساتھ ہے اس کے ساتھ قرأت بھی جائز نہیں حتیٰ کہ امام الروایت ابو القاسم ہذلی نے جو کہ مشرق و مغرب میں داخل ہوئے اور انھوں نے تین سو پینسٹھ (۳۶۵) اساتذہ سے علم حاصل کیا وہ فرماتے ہیں کہ میں نے مغرب کے آخر سے فرغانہ کی طرف سفر کیا وائیں، بائیں پہاڑ سمندر سب کا سفر کیا اور اپنی کتاب "الکامل" تالیف کی اس میں انھوں نے صحیح، شاذ مشہور اور منکر سب کو جمع کیا۔ مد کے باب میں فرمایا کہ "فی فصل المتصل" اس فصل میں کوئی اختلاف نہیں کہ یہ ایک طریقہ پر مد ہے اس میں قراء کا ایک ہی طریقہ ہے انھوں نے اس کی مقدار تین الف رکھی ہے.... اور عراقی نے ذکر کیا کہ ایک کلمہ کی مد میں اختلاف ایسے ہی ہے جیسے دو کلموں کی مد میں اختلاف ہوتا ہے اور یہ میں نے اس کے علاوہ کے لیے نہیں سنا۔ بڑے عرصہ تک دانشور اور علماء اس میں محنت کرتے رہے لیکن میں نے کوئی شخص ایسا نہیں پایا جو ایک کلمہ کی مد کو دو کلمہ کی مد کی طرح بنا دے سوائے عراقی کے۔

میں کہتا ہوں کہ عراقی منصور بن احمد رضی اللہ عنہ ہیں جو خراسان کے مقری ہیں انھوں نے اس میں خطا کی ان کے اساتذہ جن کے پاس انھوں نے پڑھا ہم انھیں جانتے ہیں امام ابو بکر بن مہران، ابو الفرج شہنوی اور ابراہیم بن احمد مروزی انھوں نے ان سے کیا کسی بھی سند سے کچھ بھی روایت نہیں کیا۔

جب ایسا ہے تو ابن حاجب یا ان سے کوئی بڑا ایسی چیز پر اقدام کرنے کی جسارت کرتا ہے جس پر اجماع ہو چکا۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں کہ "وہ غیر متواتر ہے چنانچہ یہ مد عرضی کی اقسام بھی متواتر ہیں اس میں وہی شخص شک کر سکتا ہے جو جاہل ہے اور مد کی غیر متواتر ہو سکتی ہے حالانکہ اس پر پچھلوں اور اگلوں نے اجماع کر لیا ہے۔

اگر کہا جائے کہ ہم نے بعض کتب جیسے "التیسیر لللدانی" وغیرہ میں قراء کو پایا کہ انھوں نے ہمزہ کی وجہ سے ہونے والی مد کے اشباع و توسط اور اس سے اوپر نیچے کے اعتبار سے مراتب بنائے۔ یہ منضبط نہیں اس لیے کہ مد کی حد نہیں اور جو چیز منضبط ہی نہ ہو وہ متواتر کیونکر بن سکتی ہے؟

میں کہتا ہوں کہ ہم یہ دعویٰ نہیں کرتے کہ اس کے مراتب ہی متواتر ہیں اگرچہ قراء اور اصولیین میں سے ایک جماعت نے اس کا دعویٰ کیا ہے بلکہ ہم کہتے ہیں کہ مد عرضی متواتر ہونے کی حیثیت سے قطعی ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے پڑھا اور اللہ تعالیٰ نے اسے اسی پر نازل کیا اور قدر مشترک پر جنھوں نے اضافہ کیا جیسے عام، حمزہ اور وشد وہ اگرچہ متواتر نہیں ہے پھر بھی صحیح اور مشہور ہے قبولیت کے ساتھ لی جائے گی اور جس نے قدر مشترک پر زائد کے تواتر کا دعویٰ کیا اس کو چاہیے کہ وہ بیان کرے۔

امالہ ۱۰ اس کی دو انواع ہیں یہ اور اس کی ضد لغتیں ہیں جو سبع الحرف میں سے پچھل گئی ہیں سبع الحرف جن کے ساتھ قرآن نازل ہوا یہ مصاحف میں لکھی گئی ہیں اور متواتر ہیں کیا کوئی کسی ایسی لغت میں بات کر سکتا ہے جس کی مصاحف میں کتابت پر صحابہ اور مسلمانوں

نے اجماع کر لیا ہے کہ یہ اداء کی قبل سے ہیں؟

حافظ الحجۃ ابو عمرو دوانی اپنی کتاب "ایجاز البیان" میں لکھتے ہیں کہ "اجماع ہے اس بات پر کہ امالہ عرب قبائل کی ایک لغت ہے خفت کی طلب نے انہیں اس کی طرف بلایا ہے۔"

امام ابو القاسم ہذلی نے اپنی کتاب "الکامل" میں فرمایا کہ امالہ اور تنغیم دو لغتیں ہیں ان میں سے کوئی ایک بھی دوسرے سے مقدم نہیں بلکہ قرآن پاک ان دونوں کے ساتھ نازل ہوا... (آگے فرماتے ہیں کہ) تطویل کے بعد خلاصہ یہ ہے کہ جس نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک کو امالہ کے ساتھ نازل نہیں کیا اس نے غلطی کی اور اللہ تعالیٰ پر بہت بڑا بہتان باندھا۔ اور صحابہ رضی اللہ عنہم کے بارے میں ان کے تقویٰ اور پرہیزگاری کے خلاف گمان کیا۔

گویا کہ وہ اشارہ کرتے ہیں کہ انھوں نے معاصف میں امالہ کو لکھا جیسے: "یحییٰ، موسیٰ، ہدیٰ، یسعی، والہدیٰ، ویغشیہا، وجلیہا، وانی و اتینکمہ" وغیرہ جسے انھوں نے امالہ کی لغت پر لکھا اور اس کے تہہ کی مواضع کو فتح کی لغت کے مطابق الف کے ساتھ لکھا اسی سے اللہ تعالیٰ کا قول سورۃ ابراہیم آیت ۳۶ میں ﴿وَمَنْ عَصَاكَ فَلْيَاكُ عَقُوبٌ رَّجِيمٌ﴾ ہے حتیٰ کہ انھوں نے ﴿تَعْرِفُهُمْ بِسْمِهِمْ﴾ (البقرہ: ۲۷۳) میں یاء کے ساتھ لکھا جبکہ ﴿يَسِينَاهُمْ فِي وُجُوهِهِمْ﴾ (الح: ۳۰) کو الف سے لکھا۔

اس سے بڑھ کر کون سی دلیل ہے؟

ہذلی نے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ سے آج کے دن تک امت کا اجماع ہے کہ قرأت اور قراء میں امالہ اور تخفیف کو لیا جائے گا۔ اور کچھ چیزوں کو ذکر کرنے کے بعد فرمایا کہ "کوئی بھی قاری ایسا نہیں جس سے میں نے امالہ کو روایت نہ کیا ہو خواہ کم ہوں یا زیادہ... آگے فرماتے ہیں... اور یہ یعنی امالہ ہوا زن بکر بن وائل اور سعد بن بکر کی لغت ہے۔"

**ہمزہ کی تخفیف** اسی طرح نقل، ادغام، راءات کی ترقیق، لامات کی تنغیم بھی ہے جو قطعی متواتر ہے اور معلوم ہے کہ یہ سہجہ پڑھ سکتا اور یہ متواتر یا از قبیل اداء کیسے ہو سکتے ہیں حالانکہ قراء نے بہت سی جگہوں میں "مد کو، الثقلت، دعویٰ اللہ و جہما، مالک لتامنا علی یوسف" وغیرہ جیسی مثالوں میں ادغام پر اجماع کیا۔

اسی طرح قراء نے بہت سی جگہوں پر ہمزہ کی تخفیف پر اجماع کیا جیسے "الان، اللہ، الذکرین" جو استفہام میں ہیں اور بہت سی جگہوں پر ہے جیسے "فِزْعُون" اور "مِرْوَبَةٌ" راءات کی ترقیق پر اجماع کیا اور اسم جلالہ (اللہ) جب ضمہ یا فتح کے بعد آئے تو اس جیسی جگہوں پر لام کی تنغیم پر اجماع کیا۔

اور صحابہ رضی اللہ عنہم کا سورۃ آل عمران آیت نمبر ۱۵ میں ﴿أَوْ يَبْتَكُمُ﴾ میں دوسرے ہمزہ کی کتابت پر اجماع ہے ابو عمرو دوانی رضی اللہ عنہم وغیرہ نے فرمایا کہ انھوں نے اسے ہمزہ کی تسہیل بین بین کے ارادے سے لکھا... الخ۔

جس پر قراء نے امت درامت اجماع کر لیا وہ غیر متواتر کیسے ہو سکتا ہے؟ اور جب مد، تخفیف ہمزہ اور ادغام علی الاطلاق غیر متواتر ہوں تو پھر متواتر کیا رہ جائے گا؟ کیا ﴿الْحَمْدُ لِلَّهِ﴾ اور ﴿أُولَئِكَ﴾ میں قصر ہو سکتا ہے جسے کسی نے بھی قصر کے ساتھ نہیں پڑھا؟ کیا "الذکرین اللہ" کے ہمزہ میں تخفیف کرنا جس کے ناجائز ہونے اور غلط ہونے پر اجماع ہے کیا جائز ہے؟ کیا "مد کو" جس کی

## ۳۹۸ منامال العسرفان فی علوم القرآن: جلد ①

ادغام کے ساتھ کتابت اور تلاوت پر اجماع ہے اسے اظہار کے ساتھ پڑھنا جائز ہے؟ ہائے کاش کہ مجھے پتا ہوتا کہ اس سے پہلے کون تھا جس نے اس قوم پر اقدام کیا اس کے نشان مٹا دیے جاتے۔ بظاہر یہ ہے کہ جب اس نے لوگوں کو کہتے سنا کہ ”تواتر ان چیزوں میں سے ہے جو ادا کی قبیل سے نہ ہوں۔“ تو اس سے سمجھا کہ مد، امالہ اور ہمزہ کی تخفیف وغیرہ ادا کی قبیل سے ہیں اور اس میں بغیر سوچے سمجھے بول پڑا۔ در نہ فتح ابو عمر اگر اس میں سوچ فکر کرتا تو کبھی بھی اس پر اقدام نہ کرتا یا اگر وہ امام الاصولین قاضی ابوبکر بن طیب باقلانی کے کلام پر واقف ہوتا جو انھوں نے ”الانتصار“ کتاب میں فرمایا کہ ”جتنے بھی علاقوں کے قاریوں نے جو کچھ بھی ایسا پڑھا جو ان کے ہاں مشہور ہوا اور پھیل گیا اور انھوں نے اسے شد و ذم میں داخل نہیں کیا بلکہ خوشگوار اور جائز سمجھا جیسے ہمزہ، ادغام، مد، تشدید، حذف اور امالہ وغیرہ یا ان سب کو چھوڑ دیا یا ان میں سے بعض کو چھوڑ دیا یا تقدیم و تاخر کر دی تو یہ سب چیزیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل شدہ ہیں اور یہ وہ چیزیں ہیں جن کی صحت پر صحابہ رضی اللہ عنہم واقف تھے اور انھیں ان کے کرنے یا نہ کرنے کا اختیار دیا گیا تھا اور آپ ﷺ نے اس طرح پڑھنے پر سب کو درست قرار دیا اگر ہم کسی قاری کو کوئی ایسا امالہ کرنے پر درست قرار دیں جسے بنی کریم ﷺ نے نہ کیا ہو اور نہ ہی کسی صحابی نے کیا ہو تو ہم نے رسول اللہ ﷺ کی تمام قرأت کے باوجود انھیں درست قرار دیا۔۔۔ اس کے بعد انھوں نے اس تقریر پر کلام طویل کرنے کے بعد یہ جائز قرار دیا کہ ہو سکتا ہے کہ ایک کو قرآن کا ایک حصہ ایک حرف پر پڑھایا ہو اور دوسرا حصہ دوسرے حرف پر پڑھایا ہو یعنی جو بھی آپ ﷺ نے پڑھنے والے کے لیے آسان سمجھا ہوا.... الخ۔“

میں کہتے ہوں کہ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ قراء کا کسی چیز میں اختلاف کرنا حالانکہ ان کا اختلاف کئی جگہوں پر ہے اسے صحابی رضی اللہ عنہم نے رسول اللہ ﷺ سے بھی اسی طرح حاصل کیا ہو اور آپ ﷺ نے اسے اسی طرح پڑھایا ہو اور چلتے چلتے قراء تک پہنچا ہو جیسے حفص رضی اللہ عنہ کا حرف عجب ہا کو امالہ کے ساتھ پڑھنا اور اس کے علاوہ قرآن میں کہیں بھی امالہ نہ کرنا، اسی طرح ابن عامر کا کئی متعدد جگہوں پر ”اَبْرَ اَھَاھ“ پڑھنا اور ابو جعفر کی ”بِحز نہھ“ (سورۃ الانبیاء: ۱۰۱-۱۰۲) لفظ اس جگہ ”یاء“ کے ضمہ اور زاء کے کسرہ کے ساتھ پڑھنا اور باقی قرآن میں ”یاء“ کے فتح اور زاء کے ضمہ کے ساتھ پڑھنا اور نافع کا اس کے برعکس پڑھنا یعنی پورے قرآن میں ”یاء“ کے ضمہ اور زاء کے کسرہ کے ساتھ پڑھنا اور سورۃ الانبیاء میں ”یاء“ کے فتح اور زاء کے ضمہ کے ساتھ اور اس کے مشابہ جن کے قراء قائل ہیں انھوں نے دونوں کو جمع کیا۔

کاش کہ امام ابن حجاج اپنی کتاب کو قراءت اور ان کے تواتر سے خالی کرتے جیسا کہ ان کے علاوہ نے اپنی کتابوں کو ان سے خالی رکھا۔ جب انھوں نے ذکر کر دیا تو کاش وہ ان چیزوں کے پیچھے نہ پڑتے جو ادا کی قبیل سے ہیں اور جب انھوں نے تعرض کر لیا تو کاش وہ مثالوں سے رک جاتے کیونکہ جب ثابت ہو جائے کہ قراءت میں سے کچھ ادا کی قبیل سے ہے متواتر نہیں ہے جیسے ہمزہ اور ہشام کے وقف کی تقسیم اور ان کے تسبیل کی انواع۔ اس لیے کہ وقف میں اگرچہ ہمزہ کی تخفیف رسول اللہ ﷺ سے متواتر ہے لیکن یہ متواتر نہیں کہ آپ ﷺ نے کسی جگہ پر پچاس وجوہ سے وقف کیا ہو اور نہ ہی میں وجوہ سے اور نہ ہی اس طرح کی متعدد وجوہ سے اور اگر ان میں سے کچھ صحیح ثابت ہو بھی جائے تو بھی ایک وجہ ہوگی اور باقی میں شک نہیں ہے کہ وہ از قبیل ادا ہوں۔

جب ابن السکنی نے اپنی کتاب ”جمع الجوامع“ میں یہ کہا کہ ”السیب متواترة.... الخ“ (اور سات قرأتیں متواتر ہیں) بعض

نے کہا کہ وہ ادا کی قبیل سے نہ ہوں جیسے مد، امالہ اور ہمزہ کی تخفیف وغیرہ ان سے سوال کیا گیا کہ آپ نے ابن حجاج پر زیادتی کی؟





کسی نے کہا کہ ان کے اختیار کا متقاضی یہ ہے کہ جو اداء کی قبیل سے ہیں جیسے مد اور امالہ... الخ متواتر ہیں انھوں نے (برٹینڈ) اپنی کتاب ”منع الموانع“ میں جواب دیا کہ: جان لو کہ سات متواتر ہیں اور مد متواتر ہے امالہ متواتر ہے یہ سب واضح ہیں ان میں کوئی شک نہیں اور ابن حاجب کا قول کہ ”جو اداء کی قبیل سے نہ ہوں“ صحیح ہے اگر اس میں یہ نہ ہو ”جیسے مد اور امالہ“ لیکن ان کی تمثیل نے ان کے فساد کو واجب کر دیا جیسا کہ بعد میں عنقریب ہم اس کی وضاحت کریں گے اسی وجہ سے ہم نے ”قبیل“ کہا تا کہ واضح ہو جائے کہ مد، امالہ اور تخفیف کے غیر متواتر ہونے کا قول ہمارے نزدیک ضعیف ہے۔ بلکہ یہ متواتر ہیں اس کے بعد مد و امالہ اور تخفیف کا ذکر کرتے ہوئے یہاں تک پہنچتے ہیں کہ جب آپ نے یہ جان لیا کہ ہمارا کلام سب کے تواتر کا فیصلہ کرتا ہے اور مطلق مد، امالہ اور ہمزہ کی تخفیف بھی بے شک سب سے ہیں۔

اور جنھوں نے کہا کہ قراءات متواتر ہیں یہ قراء کے اجتماع کی صورت میں ہے افتراق کی صورت میں نہیں چنانچہ ابو شامہ نے ”المعتمد الوجیز“ کے پانچوں باب میں فرمایا کہ ”بے شک وہ قراءات جو قراء سب سے ہر قاری کی طرف منسوب ہیں اور ان کے علاوہ کی دو قسمیں ہیں ایک وہ جس پر اجماع ہے اور دوسری شاذ لیکن یہ قراء سب سے اپنی شہرت اور اپنی قرأت میں کثرت صحیح کی بناء پر دل اس طرف مائل ہوتا ہے کہ جو کچھ ان سے منقول ہے وہ دوسروں سے فائق ہے اب جو چیزیں ان کی طرف منسوب ہیں اور ان میں اہل لغت وغیرہ کا انکار ہے وہ بڑی کا تا مات میں دوسرائوں کو جمع کرنا اور ابو عمر کا ادغام ہے نیز ”فما استطاعوا“ میں حمزہ کی قرأت اور کسی کا ”بارئکھ“ کے ہمزہ کو سکون سے پڑھنا اور ”سبأ، یاہنی اور مکر السبع“ بھی اسی طرح اور یوتقی اور یعتقی کے یاء میں اشباع کرنا اس طرح ”بیسر اور افصدۃ من الناس“ میں اشباع کرنا اور ”ملائکۃ“ کو ہمزہ کے فتح کے ساتھ پڑھنا اسی طرح ”والارحام“ جو سورۃ النساء کے شروع میں ہے اسے زیر کے ساتھ پڑھنا اور کن فیکون کے نصب کے ساتھ پڑھنا اور سورۃ الانعام وغیرہ میں دو متضایف کے درمیان فصل کرنا وغیرہ... آگے فرماتے ہیں کہ یہ سب کچھ راویوں کی قلت ضبط پر محمول ہے پھر فرمایا کہ اگر اس میں نقل صحیح ہو تو یہ سب سے احرف کے ان بقایا جات میں ہے جن پر قرأت جائز تھی جیسا کہ یہ عربیت میں جائز ہیں خواہ وہ عربی فصیح ہو، یا غیر فصیح جبکہ مصاحف کی لفظ منزل پر کتابت کے بعد ان الفاظ کی قرأت مناسب نہیں سوائے ان الفاظ کے جو قریش کی لغت میں سے فصیح ترین لغت یا ان کی طرف منسوب لغت کے مطابق ہیں۔ اس لیے کہ انھیں نبی کریم ﷺ اور آپ ﷺ کے بڑے بڑے صحابہ جو اس کے لائق ہیں ان کی قرأت پر محمول کیا جائے گا اس لیے کہ انھوں نے اسے قریش کی لغت میں لکھا اسی طرح ان کا اس قرأت میں پڑھنا۔ فرمایا: متاخرین وغیرہ مقلدین میں سے مقررین کی جماعت کی زبانوں پر شائع ہے کہ قراءت سب سے سب متواتر ہیں یعنی ہر ہر فرد میں جنھوں نے ان سات سے روایت کیا۔ فرمایا کہ: اور قطعی ہے کہ ان کا اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہونا واجب ہے۔ فرمایا کہ: ہم بھی اسی کے قائل ہیں لیکن ان سے نقل کرنے میں جن میں ان سے طرق مجتمع ہیں اور اس پر جماعتیں متفق ہیں کسی کو کوئی انکار نہیں اور وہ شائع اور مشہور و معروف ہیں، کم سے کم یہ شرط ہیں۔ جب کہ ان کے بعض میں تواتر متفق نہ ہو۔

اب اے بھائی! اس گمراہے ہوئے کلام میں غور کر جو بغیر کسی سوچ فکر کے صادر ہو گیا ہے ان تھوڑے سے کلمات میں کتنی جگہ تناقض ہے۔ میں نے اپنے شیخ امام ابو محمد بن محمد بن محمد جمالی کو اس کے بارے میں آگاہ کیا تو انھوں نے فرمایا کہ: ”اس کتاب کے وجود کو ختم کر دینا چاہیے یہ بالکل ظاہر بھی نہ ہو یہ تو دین میں طعن ہے۔“

میں کہتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ شاہد ہے کہ ہمارا مقصود امام ابو شامہ کا مرتبہ گرانا نہیں اس لیے کہ بعض اوقات عمدہ گھوڑا بھی پھسل جاتا ہے اور اس کی قدر مجہول نہیں ہوتی بلکہ حق اس بات کے لائق ہے کہ اس کی اتباع کی جائے۔ بلکہ ہمارا مقصود اس لغزش اور پھسلن پر تضحیہ کرنا ہے تاکہ جو شخص لوگوں کے اقوال نہ جانتا ہو اور اسے ائمہ کے احوال معلوم نہ ہوں وہ ان سے بچے۔

اور یہ قول کہ نہ جوان کی طرف منسوب ہیں اور ان میں اہل لغت کا انکار ہے۔ ان جیسی چیزیں اس لائق نہیں کہ انھوں نے جو ذکر کیا اسے اہل لغت کے نزدیک منکر بنایا جائے اور علماء لغت و اعراب جن پر پہلے بھی اور بعد میں بھی اعتماد تھا وہ ان کی توجیہ کرتے ہیں اور ان سے استدلال کرتے ہیں تو کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ ایک ایسی قرأت کا انکار کریں جو متواتر ہے یا رسول اللہ ﷺ سے عام پہلی آ رہی ہے سوائے چند معمولی سے لوگوں کے جن کا کوئی اعتبار نہیں اور انھیں قراءات و آثار کی کوئی پہچان نہیں وہ صرف ان قیاسات پر اڑے ہوئے ہیں۔ جو انھوں نے جانے اور سمجھے ہیں کہ انھوں نے عرب کی تمام لغتوں کا احاطہ کیا ہوا ہے خواہ وہ فصیح ہوں یا غیر فصیح حتیٰ کہ اگر ان میں سے کسی کو قرآن کی کوئی چیز کہی جائے جو اس طریقے پر نہ ہو جیسے اللہ تعالیٰ نے نازل کیا اس کے نزدیک ظاہری قیاس کے موافق ہو لیکن کسی نے اس طرح پڑھا نہ ہو تو وہ اس کے صحیح ہونے کا قطعی فیصلہ کرتے ہیں اسی طرح اگر قرأت متواترہ کے بارے میں سوال کیا جائے جو قیاس کے موافق نہ ہو تو وہ اس کا انکار کرتے ہیں اور ان کے شذوذ ہونے کا قطعی فیصلہ کرتے ہیں حتیٰ کہ ان میں سے بعض نے تو اللہ تعالیٰ کے قول ﴿مَا كَذَّبْنَاكَ وَلَا تَأْمَنَّاكَ﴾ (یوسف: ۱۱) کے بارے میں قطعی فیصلہ کیا کہ ادغام جس پر صحابہ رضی اللہ عنہم جمع ہیں اور مسلمانوں کا اجماع ہے یہ سن ہے اور عربوں کے نزدیک جائز نہیں اس لیے کہ فعل "لَا تَأْمَنَّا" ہے جو مرفوع ہے اس کے سکون کی کوئی وجہ نہیں کہ اسے دوسرے نون میں مدغم کر دیا جائے۔

اب اے بھائی غور کرو! ان کی اللہ تعالیٰ سے کم حیا کا کہ جو انھیں قیاس سے معلوم ہوتا ہے اسے اصل قرار دیتے ہیں اور قرآن عظیم کو فرغ۔ ائمہ لغت و اعراب علماء جو متقدم ہیں وہ اس سے بالکل بری ہیں بلکہ وہ گزشتہ بالا وغیرہ حروف کی توجیہ اور اس کا انکار کرنے والوں کا انکار کرنے میں اس حد تک مبالغہ کرتے ہیں کہ لغت نحو کے امام ابو عبد اللہ محمد بن مالک نے اپنی نظم "الکافیہ الشافیۃ" میں "الفصل بین المتضایفین" میں فرمایا:

وعمدتی قراءة ابن عامر فكم لها من عاضد و ناصر

"میرے نزدیک قابل اعتماد ابن عامر کی قرأت ہے۔ اس کے کتنے مؤید اور مددگار ہیں۔"

اگر تطویل کا خوف نہ ہوتا اور کتاب کا اپنے مقصد سے نکل جانے کا خوف نہ ہوتا تو میں ان چیزوں کو وارد کرتا جن کا ان کے خیال کے مطابق اہل لغت نے انکار کیا اور اس میں ان کے اقوال ذکر کرتا لیکن اگر زندگی کے ساتھ دیا تو میں اس موضوع پر ایک مستقل کتاب لکھوں گا جو دل کو شفا دے گی اور سینے کو کشادہ کرے گی اس میں ان تمام چیزوں کو ذکر کروں گا جن کا ان لوگوں نے انکار کیا جنہیں قراءت سبعہ یا عشرہ سے کوئی سروکار نہیں۔

اللہ ہی کے لیے ابو ابونصر شیرازی کی خوبی جنھوں نے اپنی تفسیر میں اللہ تعالیٰ کے قول ﴿وَاتَّقُوا اللَّهَ الَّذِي تَسَاءَلُونَ بِهِ وَالْأَرْحَامَ﴾ (النساء: ۱) کی تفسیر میں قرأت حفص کی تضعیف میں زجاجی کا کلام نقل کیا اور پھر فرمایا کہ "اس طرح کا کلام ائمہ دین کے نزدیک مردود ہے اس لیے کہ وہ قرأت جنہیں ائمہ قراء نے پڑھا وہ نبی کریم ﷺ سے ثابت ہیں جس نے ان کی تردید کی اس نے نبی

کریم ﷺ کی تردید کی اور آپ ﷺ کے خواندہ کو براسجھا اور یہ موضوع مقام ہے اس میں امر لغت یا نحو کی تقلید نہیں کی جائے گی۔ ہو سکتا ہے کہ ان کی مراد یہ ہو کہ یہ صحیح اور فصیح ہے اگرچہ اس کے علاوہ فصیح ہو اس لیے کہ ہمارا دعویٰ نہیں کہ قراءات میں جو کچھ ہے وہ فصاحت کے اعلیٰ درجات پر ہے۔

امام حافظ ابو عمرو دانی نے اپنی کتاب "جامع البیان" میں ابو عمرو بن علاء کا "ہار نکھ" اور "ہامر کھ" کو سکون دینے کے ذکر میں فرمایا کہ: "امر قراءت قرآن کے حروف میں لغت میں شائع اور عربیت کے موافق ہونے پر بالکل بھی عمل نہیں کرتے بلکہ اثر میں جو زیادہ ثابت ہو اور نقل میں زیادہ صحیح ہو اس پر عمل کرتے ہیں اور جب روایت ان کے نزدیک ثابت ہو جائے تو قیاس عربیت اور عموم لغت اسے رو نہیں کرتے اس لیے کہ قراءت ایک سنت ہے جس کی استبعا کی جاتی ہے۔ اس لیے اسے قبول کرنا اور اس پر عمل کرنا ضروری ہے۔"

میں کہتا ہوں کہ امام ابوشامہ نے اسی پر بس نہیں کی بلکہ فرمایا کہ "یہ سب (یعنی گزشتہ بالا) ردایوں کے قلت ضبط پر محمول ہیں، نہیں، بلکہ اللہ کی قسم یہ سب اس شخص کی کثرت جہالت پر محمول ہیں جو ان کی وجہ کو نہ جانتا ہو اور ان شواہد صحیحہ کو بھی نہ جانتا ہو ان پر منطبق ہوتی ہیں جیسا کہ عنقریب ہم اسے اس کتاب میں بیان کریں گے جس کا ابھی ہم نے آپ سے وعدہ کیا ہے اس لیے کہ یہ ثابت اور مشہور ہیں اور ان کے راوی امر ثقہ ہیں اور اگر یہ ان کے قلت ضبط پر محمول ہوں تو ہائے کیا ہوگا کیا دین دین والے پر کمزور ہو گیا کہ ایک آدمی اس زمانے میں آتا ہے اپنی قلت ضبط کی وجہ سے قراءت میں وہ چیز داخل کر دیتا ہے جو اس میں نہیں ہے اب یہ چیز سنی جاتی ہے اور اسے لیا جاتا ہے اور اسے نماز وغیرہ میں پڑھا جاتا ہے اور امر اپنی کتب میں اسے ذکر کرتے ہیں اور پڑھتے ہیں اور یہ مشہور ہو جاتی ہے اور چلتے چلتے ہمارے زمانے تک پہنچ جاتی ہے امر دین میں سے کوئی بھی اس قراءت کو منع نہیں کرتا حالانکہ قرآن میں کسی حرف یا حرکت کی کمی بیشی اپنے پاس سے کرنے اور اس پر اصرار کرنے والے کے کفر پر اجماع ہے اور اللہ تعالیٰ نے اس کی حفاظت کا ذمہ لیا ہے۔"

﴿لَا يَأْتِيهِ الْبَاطِلُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهِ﴾ (نعلت: ۳۲)

"باطل نہ اس کے سامنے سے آتا ہے نہ پیچھے سے۔"

اس سے بھی بڑھ کر متزل کرنے ہوئے فرمایا کہ: "ان کے صحیح ہونے اور سبوا حروف میں ہونے کی صورت میں بھی ان کی قراءت مناسب نہیں اس لیے کہ نبی کریم ﷺ اور ان کے صحابہ قاریوں کو ان کے لائق پر محمول کیا جائے گا۔"

جب نبی کریم ﷺ اور آپ ﷺ کے صحابہ رضی اللہ عنہم نے ان کے مطابق نہیں پڑھا حالانکہ ان کی صحت اور ان کا سبوا حروف میں ہونا بھی مسلم ہو تو ان لوگوں تک کسی نے پہنچایا جنہوں نے اس کے مطابق پڑھا۔

پھر کہتے ہیں کہ: "فلا اقل من اشتراط ذلك" (کم از کم یہ شرط ہیں) یعنی شہرت و استفاضہ۔

میں کہتا ہوں کہ کیا تم اس قول کو نہیں دیکھتے؟ پھر کیا دنیا میں کوئی شخص ہے جو کہتا ہو کہ ابن عامر، حمزہ اور ابن عمرو کی قراءت اور اس پر اجماع کرنے والے اہل حرمین و شام یعنی ابو جعفر، تابع، ابن کثیر اور ابن عامر نیز بزی قبیل اور ہشام کی قراءت یہ سب کی سب غیر اور ہیں اگرچہ متواتر نہیں ہیں؟ یہ اس شخص کا کلام ہے جو نہیں جانتا کہ میں کیا کہہ رہا ہوں۔ امام ابوشامہ اس سے بالکل بری ہیں

اور میں کیونکہ ان سے اس بارے میں خوب اعتقاد رکھتا ہوں تو قریب ہے کہ میں یہ قطعی فیصلہ کر دوں کہ یہ ان کا کلام قطعاً نہیں ہے بسا اوقات بعض متعصبین جہلاء ان کی کتاب کے ساتھ اسی طرح کی چیزیں ملا دیتے ہیں یا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ انھوں نے یہ کتاب شروع میں تصنیف کی ہو جیسا کہ اکثر مصنفین سے ایسا ہو جاتا ہے ورنہ وہ اپنی دیگر تصنیفات میں اپنی شرح شاطبیہ کی طرح ہیں کہ انھوں نے ”والارحام“ میں زیر کے ساتھ اور فصل بین العضا یغین میں قراءت حمزہ کی تائید توجیہ میں مبالغہ کیا اور پھر فصل میں فرمایا کہ: ”اس شخص کے قول کی طرف التفات نہیں کیا جائے گا جس نے کہا کہ کلام میں اس طرح کا نہیں آتا اس لیے کہ وہ کلام نافی ہے اور جس نے اس قرأت کی سند بیان کی وہ مثبت ہے اور اثبات نافی سے بالا جماع مرجح ہوتا ہے۔ فرمایا کہ اس خیال والے کی طرف یہ نقل کیا جائے کہ بعض عربوں نے اسے نثر میں بھی استعمال کیا ہے تو وہ اپنے اس قول سے رجوع کرے گا کہ اس کو کیا ہو گیا کہ قرأت کو تابعین کے ذریعے صحابہ رضی اللہ عنہم سے نقل کرنے والوں پر اکتفاء نہیں کرتا پھر اس کی تثبیت کی کوشش کرتا ہے۔

میں کہتا ہوں کہ یہ کلام بھی مباحین ہے گزشتہ بالا کی بناء پر اور ان کا اس کے ساتھ ذرا بھی سروکار نہیں وہ تو اپنے جیسوں سے بھی بڑھ کر لائی ہیں۔

اس کے بعد ابوشامہ نے اس قول کے بعد ”المورشد“ میں فرمایا کہ: ”خلاصہ یہ کہ ہم تمام اختلافی الفاظ میں تواتر کا التزام نہیں کرتے۔“ میں کہتا ہوں کہ ہم بھی اس طرح ہیں لیکن قلیل میں جیسا کہ باب ثانی میں گزر چکا فرمایا: کہ مشہور کے تواتر کا مدعی جو ظاہر کر رہا ہے جیسے ابو عمر و کا ادغام، ورش کا حرکت کو نقل کرنا اور ابن کثیر کا سیم جمع اور ہائے کنایہ کا وصل یہ زیادہ سے زیادہ اس امام سے متواتر ہے جس کی طرف اس قرأت کی نسبت کی گئی ہے۔ طرفین کی برابری اور واسطہ میں اپنے آپ کو کھپانے کے بعد اس کے پاس اس امام سے نبی کریم ﷺ تک ہر ہر فرد میں تواتر رہ جاتا ہے جس کی وجہ سے آنسو بہنے لگتے ہیں کیونکہ انھیں اس بناء پر آحاد ہی نقل کرتے ہیں سوائے ان میں سے کچھ لوگوں کے۔

میں کہتا ہوں کہ یہ بھی گزشتہ بالا کلام کی جنس میں سے ہے میں نے اپنے شیخ امام اپنے زمانہ کے یکتا شمس الدین محمد بن احمد شافعی جو خطیب ہیں ان کی خدمت میں پیش کیا تو انھوں نے فرمایا کہ ابوشامہ معذور ہیں کیونکہ قراءت حدیث کی طرح ہیں ان کا خرج بھی ان کے خرج کی طرح ہے اگر ان کا مدار آحاد پر ہو تو وہ آحادی ہوتی ہیں اور ان پر مخفی ہے ان کی نسبت اس امام کی طرف اصطلاحاً کی گئی ہے ورنہ شہرہ کے تمام لوگ اسے پڑھتے تھے اور امت درامت اسے لیتے تھے اگر ان میں سے کوئی ایک بھی اپنی قرأت میں منفرد ہوتا اور اس کے شہر والے اس کے خلاف ہوتے تو اس پر کوئی بھی اس کے موافق نہ ہوتا بلکہ وہ لوگ اس سے بچتے اور بچنے کا حکم کرتے۔

میں کہتا ہوں کہ انھوں نے سچ کہا اس پر دلیل ابن مجاہد کا قول ہے کہ مجھے قبیل نے کہا کہ سنہ ۲۳۷ھ میں تو اس نے کہا کہ اس آدمی (یعنی بزی) کو ملو اور اسے کہو کہ ”یہ حرف ہماری قرأت میں نہیں ہے یعنی ”وما ہو بعیت“ تحفیف کے ساتھ اسے مخفف وہی کر سکتا ہے جو مر گیا ہو اور جو نہیں مرادہ مشدد پڑھتا ہے۔ میں بزی سے ملا اور انھیں بتلایا انھوں نے فرمایا کہ میں نے رجوع کر لیا۔ اور محمد بن صالح نے کہا کہ میں نے ایک آدمی کو سنا وہ ابو عمرو سے سمجھ رہا تھا کہ آپ ﷺ قَوْمِ مِیْنِ لَا یُعَدُّبُ عَذَابًا أَحَدًا وَلَا یُؤْتِقُ وَ تَأْتَا أَحَدًا ﴿۲۶:۲۵﴾ (العنقر: ۲۶:۲۵) کو کیسے پڑھتے ہو؟ انھوں نے فرمایا کہ ”لا یعذب“ کسرہ کے ساتھ اس آدمی نے کہا کہ کیسے؟

حجی کریم ﷺ سے "لا یعذب" فتح کے ساتھ منقول ہے۔ اس پر ابو عمرو نے کہا کہ اگر میں اس شخص کو بھی سن لوں جو کہے کہ میں نے نبی کریم ﷺ سے سنا تو بھی میں اسے اس سے نہ لوں۔

کیا آپ کو معلوم ہے کہ ایسا کیوں ہے؟ یہ اس لیے کہ میں ایک کوشا از سے متہم کرتا ہوں جبکہ وہ عام لوگوں کے خلاف پر ہو۔ شیخ ابوالحسن سخاوی ریٹیلڈ نے فرمایا کہ فتح والی قرأت بھی تواتر کے ساتھ ثابت ہے میں نے کہا کہ سچ کہا۔ اس لیے کہ یہ امام کسائی کی قرأت ہے سخاوی ریٹیلڈ نے فرمایا کہ بعض اوقات ایک حدیث ایک قوم کے پاس تواتر کے ساتھ پہنچ جاتی ہے اور دوسری قوم کے پاس نہیں پہنچتی ابو عمرو نے اس کا جو انکار کیا وہ اس وجہ سے کہ ان کے پاس یہ روایت تواتر کے ساتھ نہیں پہنچی تھی۔

میں کہتا ہوں کہ ان کی شان کچھ اسی طرح تھی کہ ان قرأت کی تعیین لازم نہیں اگر ان کے علاوہ بھی کوئی متعین ہو جاتا تو بھی جائز تھا اور ان کا متعین ہونا یا تو اس وجہ سے ہے کہ وہ اپنے علاوہ لوگوں کی نسبت قرأت پڑھانے میں زیادہ لگے یا اس وجہ سے کہ یہ معین حضرات کے اساتذہ تھے جیسا کہ گزرا اسی وجہ سے اسلاف میں سے بعض نے کسی کی طرف قرأت کو منسوب کرنے کو ناپسند کیا۔

ابن ابوداؤد نے حضرت ابراہیم نخعی سے روایت کیا کہ وہ لوگ فلاں کی سند اور فلاں کی قرأت کو ناپسند کرتے تھے۔ میں نے کہا کہ یہ اس خوف سے کہ جیسا کہ ابوشامہ نے وہم کیا کہ جب قرأت کسی شخص کی طرف منسوب کی گئی تو انھوں نے اس کو خبر واحد سمجھا اور انھیں یہ نہیں معلوم کہ ہر وہ قرأت جو ان میں سے کسی قاری کی طرف منسوب ہوئی اس قرأت کے قاری بھی اس کے زمانے کے قاری تھے اور اس سے اس زمانے کے قاریوں سے بھی زیادہ تھے بلکہ اس سے کئی گنا تھے اگر قراء کا انفراد متواتر نہ ہوتا تو بعض قرآن غیر متواتر ہو جاتا، اس لیے کہ ہمیں قرآن میں کچھ حروف ملتے ہیں جن میں قراء کا اختلاف ہے اور ہر ایک کی قرأت ایسی ہے جو دوسرے کے موافق نہیں ہے "ارجحہ" وغیرہ۔ لہذا کوئی بھی قرأت متواتر ہوگی نیز "عالمک" اور "مخادعون" والی قرأت بھی متواتر نہ ہوگی بلکہ اکثر قرآن غیر متواتر ہوگا اس لیے کہ تواتر ایک یا دو سے ثابت نہیں ہوتا اور نہ ہی تین سے ثابت ہوتا ہے۔ امام حرمی ریٹیلڈ نے اپنے رسالہ میں فرمایا کہ ان کی قرأت کی وجہ میں سے ہر وہ اسی طرح ہے (یعنی متواتر ہے)، اس لیے کہ یہ اس کی بعض ہے۔ پھر فرمایا: اس سے اس شخص کے قول کا فساد ظاہر ہو گیا جس نے کہا کہ "یہ متواتر ہے وہ نہیں" اس لیے کہ یہ اس کے مجموعہ سے عبارت ہے۔

پھر ابن الجزری نے کہا کہ آپ کو اس بات کی تحقیق کہ ہر شہر والوں کی قرأت ان کی نسبت سے متواتر ہے۔ اس بات سے بھی ہوگی کہ امام شافعی ریٹیلڈ نے "بسملہ" کو قرآن پاک کا جز، قرار دیا حالانکہ شیخ مالک سے ان کی روایت تقاضا کرتی ہے کہ وہ قرآن پاک کا حصہ نہ ہو، اس لیے کہ اہل مکہ "بسم اللہ" کو دو سورتوں کے درمیان ثابت مانتے تھے اور اسے سورۃ فاتحہ کے شروع میں ایک آیت شمار کرتے تھے انھوں نے ابن کثیر کی قرأت اسماعیل قطع ابن کثیر سے پڑھی اور انھوں نے اپنی روایت عن مالک پر عدم بسملہ میں اعتماد نہیں کیا اس لیے کہ یہ آحاد ہیں اور ابن کثیر کی قرأت پر اعتماد کیا اس لیے کہ یہ متواتر ہے یہ ایک لطیف چیز ہے اس میں غور کر لیجئے مجھے اپنے اصحاب کی کتب میں ملتا تھا کہ امام شافعی ریٹیلڈ نے عدم "بسملہ" کی حدیث امام مالک سے روایت کی اور اس پر بھروسہ نہیں کیا لہذا یہ دلیل ہے کہ اس میں انھیں کوئی علت محسوس ہوئی ورنہ وہ اس پر عمل کو نہ چھوڑتے۔ میں کہتا ہوں کہ میں نے اپنے اصحاب میں کسی ایک کو نہیں دیکھا جس نے علت بیان کی ہو۔ ایک مرتبہ میں رات کو سوچ رہا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے گزشتہ بالا بات مجھے کھول دی کہ یہ علت ہے (واللہ تعالیٰ اعلم) حالانکہ میں نے قرآن اپنے امام شافعی عن ابن کثیر کی روایت میں پڑھا جیسے روایت

بڑی اور روایت قنبل اور جب کبار ائمہ شافعیہ میں سے ہمارے اصحاب میں سے کسی کو معلوم ہوا تو اس نے مجھے کہا کہ میں چاہتا ہوں کہ آپ کے پاس اس روایت میں قرآن پڑھوں۔

مزید تحقیق کے لیے ابو حاتم جستانی کا قول ہے انھوں نے فرمایا کہ بصرہ میں سب سے پہلے قراءات کی وجوہ کی پھان بین کرنے والا جس نے ان کی تالیف کی اور ان میں سے شاذ کو تلاش کیا وہ ہارون بن سوئی اعمور ہیں جو قراء میں سے تھے لوگوں نے اسے ناپسند کیا اور جب انھوں نے اس کی تالیف کی تو لوگوں نے کہا کہ انھوں نے برا کیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ قرأت کو قرون وامت صرف امت کے ذہن سے حاصل کرتے ہیں اور اس میں راوی راوی کی لائی ہوئی روایت کی طرف التفات نہیں کرتے۔

حافظ علامہ ابو سعید ظہیل کی تالیف نے اپنی کتاب ”المجموع المذہب“ میں فرمایا کہ ”شیخ شہاب الدین ابوشامہ کا ان کی کتاب ”المرشد الوجیز“ وغیرہ میں قراءت سبوح (میں سے متواترہ) اور شاذہ کے درمیان فرق کے بارے میں اور ان کے علاوہ متقدمین قراء کا کلام ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ قراءت سبوح کی سب متواتر نہیں ہیں، سب سے اعلیٰ وہ قراءت ہے جس میں صحت سند مصحف امام کے خط کے ساتھ موافقت اور لغت عرب کی فصیح لغت کے ساتھ موافقت ہو اور ان میں شہرت کافی نہیں حالانکہ معاملہ ایسا نہیں جیسے انھوں نے ذکر کیا۔ اور انھیں شبہ ہو گیا حالانکہ اس کی سندیں چند معروف لوگوں پر منحصر ہیں اس لیے انھوں نے انھیں آحاد کے اجتہاد کی طرح سمجھ لیا۔

میں نے کہا کہ میں نے اپنے شیخ امام الائمہ ابو المعالی رضی اللہ عنہما سے اس مقام کے بارے میں سوال کیا تو انھوں نے فرمایا کہ ایک جماعت میں سندوں کا منحصر ہونا اس سے مانع نہیں کہ قرآن ان کے علاوہ اور لوگوں سے منقول نہ ہوا ہو بلکہ تحقیق یہ ہے کہ ایک شہر والوں نے جن میں سے ایک بڑی جماعت اسے پڑھ رہی تھی اس بڑی جماعت نے اپنے جیسوں سے (یعنی اپنے جیسی بڑی جماعت سے) حاصل کیا اور اسی طرح سلسلہ چلتا گیا اور انھیں تواتر حاصل ہو گیا لیکن وہ ائمہ جو ان حروف کے ضبط کے پیچھے لگ گئے اور انھوں نے اس میں اپنے شیوخ کو محفوظ کیا اور ان کی طرف سند بھی منقول ہوئی اور یہ احادیث جو حجۃ الوداع کے بارے میں وارد ہوئی ہیں اور ان جیسی احادیث بالکل واضح ہیں اور حجۃ الوداع ہمیشہ سے منقول ہوتا چلا جا رہا ہے۔ لہذا جن لوگوں کے ذریعے ہر زمانے میں ان جیسوں سے تواتر حاصل ہوتا ہے لہذا یہی اسی طرح ہے۔ اور فرمایا کہ یہ ایک جگہ ہے اس پر متنبہ ہونا ضروری ہے۔

یہ وہ باتیں ہیں جو ابن الجزری نے اس مقام پر اپنی کتاب المنجد میں کہیں، ہو سکتا ہے کہ یہ اس موقع پر فصل خطاب ہوں اسی وجہ سے ہم نے انھیں آپ کے سامنے نقل کرنے کو ترجیح دی اور کوشش کی ہے کہ اسے خوب اچھے انداز میں اور ضبط کے ساتھ پیش کیا جائے اور حتی الامکان اس پر مختصر حاشیہ بھی لگایا جائے اور میں چاہتا تھا کہ جس نسخہ سے میں نے اسے نقل کیا اس میں میرے دیکھے ہوئے دوسرے نسخوں سے زیادہ تحریر ہو لیکن کیا ہو سکتا تھا؟ یہ پہلا مطبوع تھا جو از ہر شریف کے مغربی برآمدے میں لکھے گئے نسخے سے لیا گیا تھا اور ابتداء کی شان یہی ہوتی ہے کہ اس میں کچھ نقص ہو اور آخر میں وہ کمال کی طرف بڑھتی چلی جائے۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔

قراء قاری کی جمع ہے اور وہ لغت میں ”قراء“ سے اسم فاعل ہے اور اصطلاح میں اس کا اطلاق ”ان ائمہ معروفین میں سے ایک امام پر ہوتا ہے جن کی طرف قراءات سابقہ منسوب ہیں۔“ اور ہم نے ان کے اسماء آپ کی خدمت میں تسلسل کے ساتھ پیش کر دیا ہے ہم آپ کی خدمت میں بطور تحفہ ایک چھوٹا سا ککرا پیش کرتے ہیں جو انہیں سے جو مشہور ہیں ان میں سے ہر



ایک اور ان سے روایت کرنے والوں میں سے کچھ پر مشتمل ہوگا تاکہ آپ ایک لمحہ ان کی فضیلت پر مطلع ہو جائیں اور اس مکرم جماعت کے ساتھ آپ کا اتصال ہو جائے جن کا ادائے قرآن کریم کی حفاظت میں حیرت انگیز اثر ہے، جو محافظت نہیں طرح سے ہوئی جو تمام اطراف اسلامی میں اتنے طویل عرصے تک گونجتے رہے۔

ہم ان کلمات سے ان کی تاریخ کو شمار کرتا نہیں چاہتے اور نہ ہی ان اور اوکو شمار کرنا چاہتے ہیں جو ان کی قراءت پر گزرے یہ ایک وسیع میدان ہے۔ ایک جماعت نے اس میں تالیفات کرنے کے لیے اپنے آپ کو فارغ کیا جن میں سے ذہبی ہیں اور ابن جزری ہیں جنہوں نے طبقات القراء میں اس موضوع پر کام کیا۔

### قراء سبعہ جزء السنہ

① ابن عامرؒ ان کا نام عبداللہ حکمی تھا جو صحیح کی طرف نسبت ہے جو صحیر کی ایک شاخ ہے۔ ان کی کنیت ابو نعیم اور ابو عمران تھی یہ ایک جلیل تابعی تھے۔ حضرت وائلہ بن اسقعؒ اور نعمان بن بشیرؒ بنینو سے طے اور انہوں نے قرأت مغیرہ بن ابوشبابہ مخزومی سے انہوں نے حضرت عثمان بن عفانؒ بنینو سے اور انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے حاصل کی بعض نے کہا کہ انہوں نے خود حضرت عثمان بنینو سے قرآن پڑھا ۱۱۸ھ کو دمشق میں وفات پائی آپ اپنی قرأت کی روایت میں ہشام اور ابن ذکوان کے ساتھ مشہور ہوئے لیکن اپنے اصحاب کے واسطے سے۔

ہشامؒ انہوں نے قرأت عراق بن خالد مخزومی سے اور انہوں نے یحییٰ بن حارث ذماری سے اور انہوں نے ابن عامر سے حاصل کی۔ ہشام ایک قاضی فقہی محدث ثقہ اور کامل الفہم انسان تھے دمشق میں ۲۴۵ھ کو وفات پائی۔ ابن ذکوانؒ یہ ابو محمد عبداللہ بن احمد بن بشیر بن ذکوان قرشی دمشقی تھے انہوں نے قرأت ابوب بن تمیم سے انہوں نے یحییٰ بن حارث ذماری سے اور انہوں نے ابن عامر سے حاصل کی ابو زرعہ ان کے بارے میں فرماتے ہیں کہ ”یہ حافظ دمشقی تھے ابن ذکوان کے زمانے میں میرے نزدیک ان سب سے بڑا قاری نہ عراق میں تھا نہ حجاز میں، نہ شام میں نہ مصر میں اور نہ ہی خراسان میں۔“ آپ نے ۲۴۲ھ کو وفات پائی۔

ابن عامر اور ان کے دونوں راویوں کے بارے میں صاحب شاطبیہ نے کہا:

وَأَمَّا دِمَشْقِيُّ الشَّاهِدِ دَاؤُدُ بْنُ عَامِرٍ  
فَصَلَّكَ بِعَبْدِ اللَّهِ طَابَتْ مَحَلَّتَا

”شام کا دمشق ابن عامر کی قیام گاہ تھا۔ پھر یہ عبداللہ کی وجہ سے لوگوں کے آنے جانے کی عمدہ جگہ بن گئی۔“

هَشَامٌ وَعَبْدُ اللَّهِ وَهُوَ اَنْتَسَابُهُ  
لِذَلِكَ الْاِسْنَادِ عَنْهُ تَنْقَلَا

”ہشام اور عبداللہ اور ان کا انتساب۔ ذکوان کی طرف صرف ان کی سندیں ہی منقول ہے۔“

② ابن کثیرؒ وہ ابو محمد اور ابو محمد عبداللہ بن کثیر داری تھے جو مکہ میں قراءت کے اعتبار سے لوگوں کے امام تھے انہیں سکینہ نے ڈھانپا ہوا تھا اور وقار ان پر چھایا ہوا تھا وہ صحابہ بنینو میں سے عبداللہ بن زبیر، ابو ایوب انصاری انس بن مالک بنینو سے طے۔

## مسائل العرفان فی علوم القرآن: جلد ۱

انھوں نے مجاہد بن ابی عباس عن ابی بن کعب عن رسول اللہ ﷺ کی سند سے روایت کی اور حضرت عبداللہ بن سائب مخزومی سے پڑھا اور ان عبداللہ بن زبید نے حضرت ابی بن کعب اور حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہما سے پڑھا اور ان دونوں نے رسول اللہ ﷺ سے پڑھا۔ انھوں نے ۱۲۰ھ کو مکہ مکرمہ میں وفات پائی۔

ان کی روایت ان کے اصحاب یعنی بڑی اور قنبل کے واسطے سے مشہور ہوئی۔

**بڑی** • ابوالحسن احمد بن محمد بن عبداللہ بن قاسم بن نافع بن ابو بڑہ تھے، ان کی نسبت بڑی اسی بڑہ کی طرف ہے جو ان کے جد اعلیٰ ہیں وہ امام کامل الفسطاط اور ثقہ تھے مکہ میں پڑھانے کا سہرا انھی کے سر ہے انھوں نے عکرمہ بن سلیمان عن شبل بن عباد واسماعیل بن عبداللہ بن قسطنطین عن ابن کثیر کی سند سے روایت کی۔ وہ مسجد حرام کے امام وہاں مقری مؤذن تھے ۲۵۰ھ میں وفات پائی۔

ابن کثیر اور ان کے دونوں راویوں کے بارے میں صاحب شاطبیہ فرماتے ہیں۔

ومكة عبدالله فيها مقامه هو ابن كثير كاثر القوم معتلا

”مکہ میں عبداللہ کا مقام ہے۔ وہ ابن کثیر ہیں جنھوں نے قوم پر غلبہ حاصل کیا بلند ہو کر۔“

روى أحمد بن حنبل في مسنده عن علي بن عبد الله بن كثير قال قال رسول الله ﷺ

”احمد بڑی نے ان سے روایت کیا اور محمد نے۔ سند کے ساتھ اور ان کا لقب قنبل ہے۔“

**عاصم** • وہ ابو بکر عاصم بن ابی النجود اسدی ہیں (تَجْوِدُ نون کے فتح اور جیم کے ضم کے ساتھ جو نجدت الشیباب سے ماخوذ ہے جس کا معنی ہے کپڑے کے ایک حصے کو دوسرے کے ساتھ سینا)

وہ بڑے ماہر قاری تھے تحریر و اتقان، فصاحت اور قرأت قرآن میں حسن صورت میں قدرت کی ایک نشانی تھے انھوں نے زر بن حبیش بن زینب سے اور انھوں نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے اور انھوں نے رسول اللہ ﷺ سے قرآن پاک پڑھا نیز انھوں نے حضرت حسن و حسین رضی اللہ عنہما کے استاذ ابو عبدالرحمن عبداللہ بن حبیب سلمی رضی اللہ عنہ سے بھی قرآن پاک پڑھا مذکورہ عبدالرحمن نے امام علی رضی اللہ عنہ سے بھی پڑھا اور امام علی رضی اللہ عنہ نے اپنی قرأت رسول اللہ ﷺ سے پڑھی۔ ۱۲۷ھ میں کوفہ یا سامہہ میں وفات پائی۔

ان سے شعبہ اور حفص رضی اللہ عنہما نے روایت کیا اور دونوں نے بغیر واسطہ کے روایت کیا۔

**شعبہ** • یہ ابن عیاش بن سالم اسدی کے نام سے مشہور ہیں بعضوں نے کہا کہ ان کا نام محمد ہے۔ کسی نے کہا کہ مطرق ہے ان کی کنیت ابو بکر تھی اس لیے کہ شعبہ ان کے اور ابوسطاہ شعبہ بن حجاج بصری کے درمیان مشترک تھا وہ امام اور بہت بڑے عالم تھے۔ ۱۹۳ھ میں کوفہ میں وفات پائی۔

**حفص** • ابو عرعرف حفص بن سلیمان بن مغیرہ بزاز، یہ عاصم کے ربیب بھی تھے انھوں نے ان کی گود میں پرورش پائی اور ان کے پاس قرآن پاک پڑھا اور ان سے اس طرح پڑھا جیسے کوئی بچہ اپنے استاذ سے پڑھتا ہے اس لیے یقینی بات ہے کہ وہ شعبہ سے زیادہ قابل اور باریک بین تھے۔

عاصم اور ان کے راوی کے بارے میں صاحب الشاطبیہ فرماتے ہیں:

وبالكوفة الغراء منهم ثلاثة اذا عوفقد ضاعت شذني وقرف نغلا

”محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ“

”روشن کونڈہ میں ان (قرامہ سجدہ میں سے) تین ہیں جنہوں نے۔ پھیلا یا اور پھیل گئی مشک اور لوہنگ۔“

فامام ابو بکر وعاصم اسمہ فشحبة راويه المبرر الفضلا

”ان میں سے ابو بکر اور عاصم کا نام ہے۔ پھر ان کے راوی شعبہ ہیں جو آگے بڑھنے والے اور فضیلت والے ہیں۔“

وذاک ابن عیاش ابو بکر الرضا وحفص وہالاتقان کان مفضلاً

”اور یہ ابن عیاش ابو بکر رضا ہیں۔ اور حفص ہیں جنہوں نے مہارت میں فضیلت حاصل کی۔“

ابو عمرو ❶ ابو عمرو زبان، بن علاء بن عمار بصری ہیں جو قرأت کے سب سے بڑے عالم تھے اور اس کے ساتھ صداقت امانت اور ثقہ فی الدین میں بھی موصوف تھے انہوں نے مجاہد بن جبر، سعید بن جبیر، عن ابن عباس عن ابی بن کعب عن رسول اللہ ﷺ کی سند سے روایت کیا اور ایک جماعت کو پڑھایا جن میں سے ابو جعفر، زید بن کھلاج اور حسن بصری ہیں، اور حسن نے علی حطان اور ابو العالیہ سے پڑھا اور ابو العالیہ نے عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ سے پڑھا۔ ۱۵۴ھ کو وفات پائی۔

ان کے مشہور راوی دوری اور سوسی ہیں لیکن یزیدی ابو محمد یحییٰ بن مبارک عدوی المتوفی ۲۰۲ھ کے واسطے سے انہیں یزیدی خلیفہ مہدی کے ماسوں یزید بن منصور کی نسبت سے کہا جاتا ہے اس لیے کہ وہ اپنے بیچے کو ادب سکھاتے تھے۔

اور دوری ابو عمر حفص بن عمر ہیں جو تینا مقتری ہیں انہیں دوری کی نسبت سے کہا جاتا ہے اور دور بغداد کے بشرقی جانب ایک جگہ کا نام ہے وہ ایک ثقہ اور کامل الضبط آدمی تھے سب سے پہلے قراءات کو انہوں نے جمع کیا انہوں نے یزیدی سے اور انہوں نے ابو عمرو سے روایت کی ۲۴۶ھ میں وفات پائی۔

اور سوسی، ابو شعیب صالح بن زیاد ہیں، انہوں نے یزیدی سے اور انہوں نے ابو عمرو سے روایت کی یہ بھی ایک ثقہ اور کامل الضبط انسان تھے ۲۶۱ھ میں وفات پائی۔

ابو عمرو اور ان کے راویوں کے بارے میں صاحب شاطیہ فرماتے ہیں:

واما الامام المازنی صریحہم ابو عمرو البصری فوالدہ العلاء

”اور جبکہ امام مازنی جو ان میں سے خالص النسب ہیں۔ (یعنی) ابو عمرو بصری اور ان کے والد محترم۔“

افاض علی یحییٰ الیوزیدی سببہ فاصبح بالعلب الفرات معللاً

”انہوں نے اپنی عطا (یعنی علم) کو یحییٰ یزیدی پر بہایا۔ اور وہ بالکل ٹیٹھا (پانی) بن گئے جسے بار بار پیا جاتا ہے۔“

ابو عمرو الدوری وصالحہم ابو شعیبہ هو السوسی عنہ تقبلاً

”ابو عمرو دوری اور ان کے صالح۔ ابو شعیب سوسی ہیں جنہوں نے ان سے علم حاصل کیا۔“

حزبہ ❷ ابو عمارہ بن جبیب زیات کوئی جو کرمہ بن ربیع تیبی کے آزاد کردہ غلام تھے انہوں نے ابو محمد سلیمان بن مہران اعش سے انہوں نے یحییٰ بن وثاب سے انہوں نے زر بن حبیش سے انہوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ، حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے (رضی اللہ عنہ) اور انہوں نے نبی کریم ﷺ سے پڑھا۔ وہ ایک متقی اور کتاب اللہ عالم تھے قرآن کی تجوید کے بھی عالم تھے اور فرانس و عربیت کو جانتے تھے حافظ الحدیث تھے طوان میں ۱۵۶ھ میں وفات پائی۔ ان کے مشہور راوی خلف اور خلاو ہیں، لیکن ابو یحییٰ سلیم



انھیں مجبور کیا جاتا کہ وہ کرسی پر بیٹھیں اور اول سے آخر تک قرآن پاک کی تلاوت کریں اور وہ سنتے رہیں اور ان سے ضبط کریں ۱۸۹ھ میں وفات پائی۔

ان کے مشہور راوی ابوالحارث اور دوری ہیں۔

**ابوالحارث** \* وہ لیث بن خالد مروزی ہیں جو ثقہ اور ضبط میں کسائی بڑھنے کے بڑے شاگردوں میں سے تھے۔ انھوں نے ۲۴۲ھ کو وفات پائی۔

**دوری** \* وہ ابو عمر حفص بن عمرو دوری ہیں جن کے بارے میں روایت عن ابی عمرو میں ہم نے آپ کو روٹھاس کرایا تھا۔ کسائی اور ان کے راویوں کے بارے میں صاحب شاطیہ فرماتے ہیں:

وَأَمَّا عَلِيُّ بْنُ أَبِي إِسْحَاقَ فَإِنَّهُ كَانَ فِي إِلاخْرَاهِ فِينَهُ تَنْبَهًا  
 "اور علی بن کا وصف کسائی ہے۔ اس لیے کہ انھوں نے احرام میں اس کا کرتا پہنا۔"

روی ليشهم عنه ابو الحارث الرضا وحعض هو الدورى وفى الذکر قد خلا

"ان سے لیث ابوالحارث رضانے روایت کیا۔ اور حفص دوری نے جن کا ذکر گزر چکا۔"

**قراۃ عشرہ کا تمہ** \* یہ کچھ کلمات ہیں جو ان تین حضرات کے بارے میں ہیں کہ جب انھیں گزشتہ بلاسات کے ساتھ ملا دیا جاتا ہے تو دس قاریوں کی تعداد مکمل ہو جاتی ہے جو قراءات عشرہ مشہورہ والے ہیں اور قریب ہی ان کا کلام گزر چکا ہے۔

**ابوجعفر** \* یہ یزید بن قحطاع قاری ہیں ان کی نسبت مدینہ کی ایک بستی کی طرف ہے جس کا نام قارہ ہے اور پیچھے گزر گیا کہ انھوں نے عبداللہ بن عباس بنیہن اور ابو ہریرہ بنیہن سے اور انھوں نے ابی بن کعب بنیہن سے اور انھوں نے رسول اللہ ﷺ سے علم حاصل کیا۔ ابوجعفر نے ۱۳۰ھ کو وفات پائی۔

ان کے مشہور راوی ابوموسیٰ عیسیٰ بن وردان ہذا اور ابوالربیع سلیمان بن مسلم بن حجاز ہیں۔

**ابن وردان** \* یہ ابوموسیٰ عیسیٰ بن وردان مدنی ہذا ہیں جو ابوجعفر سے پڑھنے میں نافع کے ساتھیوں میں سے تھے مگر ی کامل الضبط اور ثقہ تھے ۱۶۰ھ میں وفات پائی۔

**ابو ابن الحجاز** \* یہ ابوالربیع سلیمان بن مسلم بن حجاز تھے انھوں نے ابوجعفر شیبہ بن نصاح اور نافع سے پڑھا ۱۷۰ھ میں مدینہ منورہ میں وفات پائی۔

**یعقوب** \* یہ ابو محمد یعقوب بن اسحاق حضرمی ہیں انھوں نے ابوالمنذر سلام بن سلیمان طویل سے پڑھا اور سلام نے عاصم سے اور ابو عمرو سے۔ یعقوب نے ۲۰۵ھ میں وفات پائی۔

آپ کے مشہور راویوں میں سے روح بن عبدالؤمن اور محمد بن متوکل ابولوی الملقب بے ردیس وغیرہ ہیں۔

**روح** \* یہ ابوالحسن روح بن عبدالؤمن بن عبدہ بن مسلم ہذلی نحوی ہیں۔ انھوں نے امام الہصرہ ابو محمد بن یعقوب بن اسحاق بن زید بن عبداللہ بن ابواسحاق حضرمی کے پاس پڑھا اور یہ جلیل القدر امام اور ثقہ تھے ان سے بخاری نے بھی روایت لی ہے ۲۳۴ھ میں

وفات پائی۔

رویس • یہ ابو عبد اللہ محمد بن متوکل اولوی بصری ہیں جو رویس کے لقب سے مشہور ہیں۔ گویا کہ یعقوب کے ماہر ترین شاگردوں میں سے ہیں۔

⑩ **خلف** یہ ابو محمد خلف بن ہشام بن ثعلب بن خلف بن ثعلب ہیں انھوں نے سلیم کے پاس اور انھوں نے حمزہ سے پڑھا نیز یعقوب بن خلیفہ اعشی کے پاس اور ابو یزید سعید بن اوس انصاری کے پاس پڑھا جو "المفضل الصبی" والے ہیں اور ابان کے عطار کے پاس پڑھا اور انھوں نے عاصم سے پڑھا۔ ۲۲۹ھ کو وفات پائی۔ جیسا کہ حمزہ کے حالات میں گزرا۔ ان کے مشہور ترین راوی ابو یعقوب اسحاق بن ابراہیم بن عثمان بن عبد اللہ مروزی ثم البغدادی ہیں جنھیں وراق بھی کہا جاتا ہے۔ ۲۸۶ھ میں وفات پائی۔

ان کے مشہور ترین راوی ابوالحسن ادریس بن عبد الکریم حداد بغدادی بھی ہیں جو ۲۹۲ھ کو وفات پا گئے۔  
**قراء اور محدثین کا تتمہ** • یہ چند مختصر کلمات ہیں جو ان چار حضرات کے بارے میں ہیں کہ اگر انھیں گزشتہ بلا دس کے ساتھ ملا دیا جائے تو ان چودہ کی گنتی مکمل ہو جائے جن کی طرف مشہور و معروف چودہ قراءتیں منسوب ہیں۔

⑪ **حسن بصری** یہ سید امام حسن بن ابوالحسن یسار ابو سعید بصری ہیں جو اپنی شہرت کی وجہ سے تعارف کے محتاج نہیں۔

⑫ **ابن محیصن** یہ محمد بن عبد الرحمن سہمی کی ہیں اہل مکہ کے مقری تھے ابن کثیر بھی ان کے ساتھ تھے ۱۲۳ھ میں وفات پائی۔

⑬ **یحییٰ یزیدی** یہ یحییٰ بن مبارک بن حیرہ امام ابو محمد بصری ہیں یزیدی کے ساتھ معروف ہیں۔ ۲۰۲ھ میں وفات پائی۔

⑭ **شہبوزی** یہ محمد بن احمد بن ابراہیم بن یوسف بن عہاس بن میمون ابو الفرج شہبوزی ہطوی بغدادی ہیں۔ ۳۸۸ھ میں وفات پائی۔

یہ اور ان جیسے ائمہ نے امت اور ملت کی خدمت کی اور کتاب و سنت کی حفاظت کی ان کے بارے میں سیوطی **رہبانیہ** فرماتے ہیں کہ: "جب جھوٹی اور من گھڑت باتیں پھیل گئیں اور قریب تھا کہ باطل حق کے ساتھ خلط ملط ہو جاتا امت کے ماہرین اٹھے اور انھوں نے انتہار جہد کی جدوجہد کی اور حرف و کلمات کو جمع کیا اور وجوہ روایات کو ان وجوہ روایات والوں کی طرف منسوب کیا اور صحیح، مشہور اور شاذ کو اپنے تیار کردہ اصولوں اور اپنی تراشی ہوئی بنیادوں سے الگ الگ کیا۔ چنانچہ قراءت میں سب سے پہلے تصنیف ابو سعید قاسم بن سلام نے کی اس کے بعد احمد بن جبیر کوئی نے پھر اسماعیل بن اسحاق ماکی جو قائلوں کے شاگرد ہیں نے پھر ابو جعفر ابن جریر طبری نے پھر ابو بکر محمد بن احمد بن عمرو جوئی نے پھر ابو بکر مجاہد نے کی اس کے بعد لوگ ان کے اور ان کے بعد کے زمانے میں مختلف قسم کی جامع، مفرد، مختصر اور تفصیلی تالیفات کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے اور ائمہ قراءت بے شمار ہیں۔

ابو عبد اللہ ذہبی نے ان کے طبقات کو تصنیف کیا اس کے بعد حافظ القرآن ابو الخیر جزیری نے ان کے طبقات کو تصنیف کیا۔ اللہ تعالیٰ سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ ان سب کو اپنی وسیع رحمتوں میں ڈھاپے اور انھیں اپنی کتاب کی اس خدمت پر



فصل ترین جزاء عطا فرماتے۔ آمین۔

دس کے علاوہ باقی قرأتوں کا حکم یہ چار قراءات جو دس پر زائد ہیں اور ان سے چودہ کی تعداد پوری ہو رہی ہے ان کے بارے میں بھی اختلاف ہے بعض نے کہا کہ ان میں سے کچھ متواتر ہیں بعض نے صحیح کہا اور بعض نے انھیں شاذ قرار دیا کہ سب کی سب شاذ ہیں بعض نے کہا کہ مسئلہ اشخاص و تعداد کا نہیں بلکہ یہ قواعد مہادی ہیں لہذا جو بھی قرأت ایسی ہو کہ اس میں اس مشہور ضابطہ کے ارکان ملا شاپائے جائیں گے وہ مقبول ہیں ورنہ مردود قراء سبعہ، قراء عشر یا قراء ربو عشر وغیرہ کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے بلکہ ہر ایک کے لیے ترازو ایک ہے اور حق ہی زیادہ لائق ہے کہ اس کی اتباع کی جائے۔

صاحب "الثانی" نے کہا کہ: "قراءت میں سے قراءات سبعہ کو پکڑنا اور باقی کو چھوڑ دینے میں نہ کوئی اثر منقول ہے اور نہ ہی کوئی حدیث بلکہ یہ تو بعض متاخرین نے جمع کیں اور وہ پھیل گئے اور جس نے کہا کہ ان پر زیادتی جائز نہیں اس نے غلطی کی اور اس کا کوئی بھی قائل نہیں ہے۔"

کوشی نے فرمایا کہ: "ہر وہ قرأت جس کی سند صحیح ہو۔ اس کی وجہ عریبت کے مطابق ہو اور مصنف امام کے خط کے موافق ہو وہ سبعہ منصوصہ میں سے ہے۔" (ان کی مراد وہ سبعہ احراف ہیں جو حدیث نبوی میں معروف ہیں) پھر فرمایا کہ اس شان کے ائمہ نے ایسے لوگوں کا سختی کے ساتھ انکار کیا ہے جنہوں نے سمجھا کہ قراءات مشہورہ اس جیسی قرأتوں میں منحصر ہیں جو "التیسیر" اور "شاطبیہ" جیسی کتابوں میں ہیں۔

یہ رائے درستی کے قریب ہے اگر ان کی نظر آج کے دن کی قراءات پر منحصر نہ ہوتی اور حکم کو منطبق نہ کرتے اور اس کی تفصیل بیان نہ کرتے بلکہ کلام کو عمومی طور پر پیش کرتے جیسا کہ آپ دیکھ رہے ہیں۔

تحقیق ابوالخیر بن جزری کا مذہب یہی ہے کہ قراءات عشرہ جو آج ہمارے سامنے ہیں وہ متواتر ہیں ان کے علاوہ نہیں انھوں نے "منجد العرقین" میں ایک مفید بات کہی کہ جس نے ہمارے زمانے میں ان ارکان ملا شاذ کو جمع کیا (یعنی اس مشہور ضابطہ میں اور اس میں سندی صحت کی شرط کی بجائے اس کے تواتر کا لحاظ کیا) وہ ائمہ عشرہ کی قرأت ہے جس کے تعلقاً بالقبول پر لوگوں کا اجماع ہے اسے بعد میں آنے والوں نے پہلے حضرات سے لیا اور چلتے چلتے ہمارے زمانے تک پہنچا۔ اب ان میں سے ایک کی قرأت بھی قطعی ہونے میں باقی ائمہ کی قرأت کی طرح ہے اور جس نے کہا کہ قراءات متواترہ کی حد نہیں۔ اگر اس کی مراد ہمارے زمانے کی مشہور قراءات ہیں تو یہ صحیح نہیں کیونکہ آج قراءات عشرہ کے علاوہ کوئی بھی قرأت متواترہ نہیں پائی جاتی اور اگر اس کی مراد وہ قراءات ہیں جو صدر اول میں تھیں تو اس کا احتمال ہے۔

پھر غیر متواتر قراءات کی دو قسمیں ہیں۔

۱۔ پہلی قسم ۱۰ جس کی سند صحیح و عادل کامل المفہمہ آخر تک اپنے جیسوں سے نقل کریں اور یہ عربیت اور رسم کے بھی موافق ہو۔ اس کی دو قسمیں ہیں۔

① جس کا نقل مشہور اور امت کی تعلقاً بالقبول حاصل ہو جیسا کہ اس میں راوی منفرد ہوں یا بعض کتب معتبرہ منفرد ہوں یا جیسے مدونہ

میں قراء کے مراتب یہ صحیح اور قطعی ہیں اللہ کی طرف سے حضور ﷺ پر نازل شدہ ہیں۔ اور سبعتہ الحرف میں سے ہیں یہ قسم قراءات متواترہ کے ساتھ ملحق ہوگی اگرچہ اس کے برابر نہ ہوگی اس لیے کہ یہ اخبار آحاد کی قبیل سے ہے جنہیں قرآن نے ڈھانپ لیا ہو اور یہ بھی علم قطعی کا فائدہ دیتی ہیں۔

② جسے امت کی تلقینی بالقبول حاصل نہ ہو اور وہ مشہور بھی نہ ہو۔ اس قسم میں علماء کا اختلاف ہے بعض حضرات نے اس کے ساتھ قرأت اور نماز کو جائز قرار دیا اور بعض نے قراءت عشرہ کے علاوہ قراءات کو منع کیا اور منع بھی تحریر کی اور نہ نہیں۔ ابن سبکی رحمہ اللہ نے ”جمع الجوامع“ میں فرمایا کہ: ”قراءت شاذہ کے ساتھ قرأت جائز نہیں اور صحیح یہ ہے کہ قراءت عشرہ کے علاوہ سب شاذ ہیں بغوی اور شیخ الامام نے بھی اسی طرح فرمایا: ”شیخ الامام سے مراد ان کے والد زمانے کے مجتہد علی بن عبدالکافی سبکی ہیں۔“

**دوسری قسم** وہ قراءت صحیحہ جو عربیت کے بھی موافق ہو اور اس کی سند بھی صحیح ہو لیکن رسم کے مخالف ہو جیسے وہ قراءت جو صحیح سند سے مروی ہو لیکن اس میں کچھ اضافہ یا کمی ہو، یا ایک کلمہ دوسرے سے بدل گیا ہو جیسے حضرت ابو الدرداء رضی اللہ عنہ، حضرت عمر رضی اللہ عنہ، اور ابن مسعود رضی اللہ عنہ وغیرہ سے منقول ہیں آج کے دن انہیں شاذ کا نام دیا جاتا ہے اس لیے کہ یہ اجماعی مصحف کے رسم سے علیحدہ ہیں اگرچہ ان کی سند صحیح ہو پھر بھی ان کی قرأت جائز نہیں نماز میں نماز کے باہر۔ امام ابو عمر بن عبدالبر نے کتاب التعمید میں فرمایا کہ: ”مالک رحمہ اللہ نے فرمایا کہ جس نے اپنی نماز میں حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ یا ان کے علاوہ کسی صحابی کی ایسی قرأت پڑھی جو مصحف کے خلاف ہے اس کے پیچھے نماز نہیں پڑھی جائے گی۔ علماء مسلمین کا اس پر اجماع ہے سوائے ایک شاذ قوم کے جن پر دھیان نہیں دیا جائے گا۔ ابن عبدالبر نے بھی اجماع نقل کیا ہے کہ قراءت شاذہ کے ساتھ قرأت کرنا جائز نہیں۔“

ابن الجزری رحمہ اللہ نے فرمایا کہ ہمارے اصحاب یعنی شافعیہ وغیرہ نے فرمایا کہ: ”اگر کسی نے نماز میں قرأت شاذہ پڑھی تو اگر وہ عالم ہے تو اس کی نماز باطل ہے اور اگر جاہل ہے تو نماز باطل نہ ہوگی اس قرأت کو شمار نہیں کیا جائے گا۔ بغداد کے علماء متفق ہیں کہ امام شہبازی کی سرزنش کی جائے اور ان سے تو بہ کرائی جائے کہ انھوں نے قراءت شاذہ پڑھی اور پڑھائی۔ یہ سب باتیں اس قرأت کے بارے میں ہیں جس کی نقل اور عربیت صحیح ہو لیکن رسم کے مخالف ہو۔ اور جس کی نقل صحیح نہ ہو تو وہ اس سے بھی کم درجہ ہے کہ جسے شاذ کا نام دیا جائے اگرچہ وہ عربیت اور رسم کے موافق ہو بلکہ یہ ایک جھوٹی قرأت ہے اس کو جان بوجھ کر کرنے والے کی تکفیر کی جائے گی۔“

محقق ابن الجزری نے ایک استفتاء نقل کیا جو عجم سے دمشق لے جایا گیا جو چھ سو چالیس کے لگ بھگ میں تھا۔ اس کی صورت یہ تھی کہ: ”کیا قراءت شاذہ جائز ہے؟ اور کیا کسی قاری کے لیے جائز ہے کہ وہ دس آیات اس طرح پڑھ کر ہر آیت ایک قرأت اور روایت میں پڑھے؟“

اس کا جواب دو اماموں نے دیا ایک ابو عمرو بن صلاح نے اور دوسرے ابو عمرو بن حاجب نے۔ ابن صلاح نے فرمایا کہ: ”شرط یہ ہے کہ جو قرأت پڑھی جا رہی ہے وہ رسول اللہ ﷺ سے متواتر منقول ہو اور اس کا نقل بھی اسی طرح مشہور و معروف ہو اور اسے امت کی تلقینی بالقبول بھی حاصل ہو جیسے یہ قراءات سبعتہ اس لیے کہ اس میں یقین اور قطعیت معتبر ہے جیسا کہ اصول میں مقررہ اور ہے اب جس میں یہ نہیں پایا جائے گا جیسے قراءت سبعتہ یا قراءت عشرہ کے علاوہ ان کی قرأت ممنوع ہے اور ممانعت تحریری ہے

کراہت والی مسافعت نہیں، نماز میں بھی ممنوع اور خارج نماز بھی ممنوع اور جو مصادر و معانی جانتا ہو اسے بھی منع کیا جائے گا اور جو نہیں جانتا اسے بھی اور جو شخص امر بالمعروف اور نہی عن المنکر پر قادر ہو اس پر واجب ہے کہ اس کے لیے اٹھ کھڑا ہو علماء میں سے جس نے اسے نقل کیا اس نے اس میں پائے جانے والے فوائد کی وجہ سے نقل کیا جن کا تعلق علم عربیت کے ساتھ ہے علم قرأت کے ساتھ نہیں۔ یہ اس شخص کا راستہ ہے جس کا راستہ سیدھا ہے.... اس کے بعد فرمایا کہ: اور قرأت شاذہ ”وہ قرآن ہے جو بغیر تواتر اور شہرت کے منقول ہو اسے امت کی تعلقی بالقبول بھی حاصل ہوئی ہو، جیسا کہ اس پر محاسب رضی اللہ عنہ اور ابن جنی وغیرہ کا بند ہیں۔ اور قرأت بالمعنی جو قرآن کے طور پر منقول نہ ہوئی ہو یہ قرأت شاذہ میں سے نہیں ہے اور اس پر جرأت کرنے والا ایک بہت بڑے کام کی جرأت کرنے والا ہے اور بہت دور کا گمراہ ہے اسے تعزیر لگائی جائے گی اور قید وغیرہ میں ڈالا جائے گا اور گمراہ کو نہیں چھوڑا جاتا اور نہ ہی اس پر قادر کے لیے اس میں مہلت دینا جائز ہے قاری کا شاذ سے رکنا واجب ہے اور اسے آگاہ کر کے اسے گنہگار قرار دینا بھی واجب ہے اگر وہ باز نہ آئے تو اس پر شرائط کے مطابق تعزیر ہے۔

جب قاری قرأت کو شروع کرے تو اسے چاہیے کہ ہمیشہ اسی کے ساتھ پڑھے جب تک کہ کلام کا ابتداء کے ساتھ تعلق ہو اور جو اس کے خلاف ہو اس میں سے بعض جائز ہیں اور بعض متبع۔ مرض کا غدر مانع ہے کہ اس میں اس کو کما حقہ بیان کروں اور علم اللہ تعالیٰ کے پاس ہے۔

جبکہ ابن حاجب رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ قرأت شاذہ کے ساتھ قرأت کرنا جائز نہیں نہ نماز میں اور نہ ہی غیر نماز میں خواہ وہ عربی جانتا ہو یا نہ جانتا ہو، جب اس کے ساتھ قاری پڑھے تو اگر وہ اس کی حرمت سے جاہل ہو تو اسے آگاہ کیا جائے گا اور اسے اس کو چھوڑنے کا حکم دیا جائے گا اور اگر عالم ہو تو اس کی شرائط کے مطابق اس کی سرزنش کی جائے گی اور اگر وہ اس پر اصرار کرے گا تو اسے اس کے اصرار پر تادیب کی جائے گی اور جب تک وہ اس سے باز نہ آجائے اسے قید کیا جائے گا البتہ ”اتنا“ کو ”اعطنا“ سے بدل دینا اور ”سؤلت“ کو ”سئت“ سے بدل دینا وغیرہ یہ شاذ نہیں بلکہ شدید ترین حرام ہیں اور اس پر سرزنش بدرجہ اولیٰ ہوگی اور اس سے منع کرنا بہت زیادہ ضروری ہے۔

**بحث کا خلاصہ** ⑤ اس بحث میں وجوہ اختلاف کی تحقیق کے بعد خلاصہ کے طور پر چند اہم امور وجود میں آتے ہیں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم ان کی طرف التفات کریں اور خصوصی تنبیہ کریں۔

- ① قرأت جب تک متواتر نہ ہو تو وہ قرآن نہیں سمجھتی اس لیے کہ قرآن میں تواتر شرط ہے۔
- ② قراءات عشرہ جو ہمارے زمانے میں شائع ذابح ہے وہ اس وقت کی تحقیق کے مطابق متواتر ہیں اس لیے وہ قرآن ہیں اور ان میں سے ہر ایک پر قرآن کا اطلاق ہوگا۔
- ③ قراءات عشرہ کے علاوہ جن کی روایات آحاد صحیح ہیں اور مشہور نہیں ہیں اور انھیں امت کی تعلقی بالقبول حاصل نہیں وہ شاذ ہیں قرآن نہیں ہیں اگرچہ رسم مصحف اور قواعد عربیہ کے موافق ہوں۔
- ④ قرآن کے مشہور ضابطے میں ذکر کردہ رکن یعنی اسناد کا صحیح ہونا، اس میں صحت سے مراد مطلق صحت نہیں بلکہ وہ صحت مراد ہے جو ممتاز ہو اور قرأت کو استفاضہ اور شہرت کی حد تک پہنچا دے اور اسے امت کی تعلقی بالقبول بھی حاصل ہو جائے حتیٰ کہ یہ رکن بھی



تواتر کی قوت میں دوسرے دور کنوں کے برابر ہو جائے کہ تواتر کے بغیر قرآنیت کا تحقق ممکن نہیں ہے جیسا کہ اس سے پہلے ہم نے اس کی تفصیل بیان کر دی۔

⑤ قرأت کبھی ایک قوم کے نزدیک متواتر ہوتی ہے اور دوسری قوم کے نزدیک متواتر نہیں ہوتی اور حکم یہ ہے کہ مسلمان صرف اس قرأت کو پڑھے جو اس کے نزدیک متواتر ہو اور جو اخباراً حاد مروی ہیں ان پر اکتفاء نہ کرے اگرچہ ان کی روایت کرنے والے کے نزدیک وہ متواتر ہی کیوں نہ ہو جیسا کہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کی روایت کو رد کیا اس لیے کہ یہ روایت اس روایت کے مخالف تھی جو ان کے نزدیک متواتر ہے اور اس بارے میں ابن جزری نے جو ابھی فرمایا وہ بھی آپ کو بھولنا نہیں چاہیے۔

⑥ وہ روایت جو محض طریق آحاد کے ذریعے روایت کی گئی اور استفاضہ اور شہرت کی حد کو نہیں پہنچی اصل مرض یہی ہیں اور کثیر شبہات اور اختلافات کا منبع ہیں۔ شبہات کے نمونے تو آپ کے سامنے گزر چکے اور اختلافات کا آپ نے اس بحث میں مشاہدہ کر لیا اور کچھ کا آپ مشاہدہ کر لو گے میں آپ کی نظر دو امور کی طرف مبذول کرنا چاہتا ہوں۔

⑦ محض طرق آحاد ہی ہیں جنہوں نے قراءات سبعة میں بعض ائمہ کی بعض روایات کے لیے طعن کا دروازہ کھولا جیسے ابن جریر طبری جنہوں نے اپنی تفسیر میں اس طرح کی کچھ چیزیں ذکر کیں اور قراءات اور ان کی علل میں ایک بہت بڑی کتاب تالیف فرمائی جس کے ضمن میں اس طرح کے کچھ مطاعن کو ذکر کیا۔

⑧ ان روایات کے نادر الوقوع ہونے کے باوجود بعض لوگوں نے آگے بڑھتے ہوئے اور حد سے تجاوز کرتے ہوئے ان کا حکم سب پر چسپاں کر دیا اور فرمایا کہ: ”یہ قراءات سبع اور ان کے علاوہ سب قراءتیں آحاد ہیں اور یہ قول انتہائی کم درجہ اور خطرے والا ہے کم درجہ اس وجہ سے کہ یہ بات علی الاطلاق مناسب نہیں کہ قلیل و حقیر کا حکم کثیر و جلیل میں لگا دیا جائے اور خطرناک اس لیے ہے کہ یہ تواتر قرآن کے نقص کا باعث ہے یا یہ اس وقت عدم وجود قرآن کا باعث ہے کہ جب تک قرآن میں تواتر مشروط رہے گا اس وقت تک قرآن کا وجود معدوم ہوگا اور ان کی رائے میں تواتر ہے نہیں۔ اور یہ بات عقل میں نہیں آسکتی جس قرآن میں تواتر مفروض ہو وہ تمام قراءات کے بغیر متواتر ہونے کی صورت میں موجود ہو اس لیے کہ بات بدیہی ہے کہ قرآن کی قراءت کی وجہ کے بغیر تحقق نہیں ہو سکتا۔

یہ باتیں اس موضوع پر نظر ثانی کے بعد ہمیں سمجھ میں آئیں۔ تمام تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لیے ہیں جس نے اس طرف ہماری رہنمائی کی۔

﴿وَمَا كُنَّا لِنَهْتَدِيَ لَوْلَا أَنْ هَدَانَا اللَّهُ﴾ (الاعراف: ۴۳)

”اگر اللہ تعالیٰ ہمیں ہدایت نہ دیتے تو ہمیں ہدایت نہ ملتی۔“





چنانچہ ابن مسعود رضی اللہ عنہما کا ان سورتوں کی قرآنیۃ کے انکار پر برقرار رہنے کا قول محض افتراء ہے اور سب معاملہ اسی طرح ہے کہ انھوں نے اپنے مصحف میں سورۃ فاتحہ اس بھروسہ پر نہیں لکھی کہ اس کی شہرت ہے اور اس پر بھولنے کا خوف نہیں ہے اسی طرح معوذتین میں بھی قول ہے۔ بعض نے کہا کہ انھیں پہلے علم نہیں تھا کہ معوذتین قرآن پاک کا حصہ ہے بلکہ وہ سمجھتے تھے کہ یہ ایک دم ہے جس کے ذریعے آپ ﷺ حسن و حسین کو اللہ کی پناہ میں دیتے تھے۔ اسی وجہ سے ان کے انکار والی روایات نقل ہو گئیں پھر اس کے بعد انھیں ان کی قرآنیۃ کا علم ہو گیا جس کی وجہ سے ان کے قرآن ہونے والی روایات بھی نقل ہو گئیں جیسا کہ ہم نے آپ کے سامنے قراء سبعہ میں سے چارقاری بیان کر دیئے جن کی سندیں اصح الاسانید ہیں اور تائید کرتی ہیں کہ یہ متواتر و مستفیض ہیں اور امت کا اس پر اجماع ہے کہ فاتحہ اور معوذتین قرآن کا حصہ ہیں جو خلافت راشدہ سے آج تک چلا آ رہا ہے۔

بہر حال اس تمام بحث کے بعد پہلے شبہ پر ہونے والے اس کلام کو ہم معتبر مانتیں جو اس موضوع پر یہاں لکھا گیا ہے۔  
**دوسرا شبہ** ذکر کیا وہ قرآن کے تمام اجزاء میں پورے نہیں ہوتے اس کی دلیل یہ ہے کہ جو لوگ بسملاہ قرآن پاک کا حصہ مانتے ہیں ان کی رائے کے مطابق اس میں تحدی جاری نہیں ہوتی اور یہ بھی متحقق نہیں ہوتا کہ یہ احکام کی بنیاد ہے چہ جائیکہ یہ اس کے نقل اور تواتر کے کامل اسباب بن جائیں۔

**جواب** ① اس میں تحدی اس اعتبار سے جاری ہوتی ہے کہ اسے دوسری دو آیتوں سے ملایا جائے گا تاکہ سب مل کر تین آیات ہو جائیں جن کے ذریعے اعجاز قائم ہو جائے اور یہ بات ان میں اہتمام اور ان کے متواتر نقل ہونے میں کافی ہے۔  
 ② اس کے لقم کے ساتھ یہ احکام معروفہ متعلق ہیں کہ اسے پڑھنے والے کو اجر عظیم ملے گا اگر وہ پاکیزہ (یعنی با وضو ہو) اور اگر وہ جنبی ہو اور اس نے اسے قرآن کے ارادے سے پڑھا یا یا چھپوایا ہو تو اس کے لیے سخت وعید ہے وغیرہ وغیرہ اور یہ بھی اس کے نقل اور تواتر کے کامل اسباب میں سے ہے۔

وہ کہتے ہیں کہ اگر قرآن متواتر ہے تو ”بسملاہ“ میں بھی تکفیر واقع ہوگی مطلب یہ ہے کہ جو اس کی قرآنیۃ کا قائل ہوگا وہ اس کا انکار کرنے والے پر کفر کا حکم لگائے گا اور جو اس کی قرآنیۃ کا قائل نہیں وہ اس کے مثبت پر کفر کا حکم لگائے گا اس بنا پر مسلمان ایک دوسرے کی تکفیر کریں گے۔

**جواب** سورتوں کے شروع میں ”بسملاہ“ کی قرآنیۃ اجتہادی اور اختلافی ہے اور جو چیز اس قبیل سے ہو اس کے منکر یا مثبت کو کافر نہیں کہا جاسکتا۔ ہر اجتہادی معاملے کی شان اسی طرح ہوتی ہے۔ کافر صرف اسے کہا جائے گا جو کسی ایسے متواتر انکار کرے جس کا دین سے ہونا ضروری طور پر معلوم ہو جبکہ سورتوں کے شروع میں ”بسملاہ“ کی قرآنیۃ متواتر نہیں ہے اور نہ ہی اس کا دین میں سے ہونا بالضرورت معلوم ہے۔

بہر حال سورۃ النحل میں حضرت سلیمان علیہ السلام کے قصہ ”بسملاہ“ آئی ہے اس کا منکر قطعی کافر ہے اس لیے کہ اس کی قرآنیۃ متواتر ہے اور اس کا دین سے ہونا بالضرورت معلوم ہے اس کی قرآنیۃ میں کسی کا اختلاف نہیں ہے کہ ایک دوسرے کو کافر کہا جائے جیسا کہ یہ معترضین خیال کرتے ہیں۔



چوتھا شبہ ۷ وہ کہتے ہیں کہ تمہارا تو قرآن پر استدلال کرنا اس بات سے کہ اس کے نقل پر بھرپور اسباب موجود ہیں آپ کا یہ استدلال سنت نبویہ سے ٹوٹ جاتا ہے کیونکہ یہ غیر متواتر ہیں حالانکہ ان کے نقل پر بھی بھرپور اسباب موجود ہیں کیونکہ یہ احکام کی اصل ہیں جیسا کہ قرآن احکام کی اصل ہے۔

**جواب اول** ۵ نقل قرآن کے تو اترا پر بھرپور اسباب کا ہونا صرف اس حیثیت سے نہیں کہ یہ احکام کی اصل ہیں بلکہ اس حیثیت سے بھی اور اعجاز، تجدی، اس کی تلاوت بطور عبادت کرنا، ہر زمانے میں اس سے برکت حاصل کرنا اور نماز وغیرہ میں اس کی تلاوت کرنا وغیرہ کی حیثیت سے بھی ہے۔

جبکہ سنت نبویہ میں سب چیزیں جمع نہیں ہیں بلکہ ان میں صرف کچھ پائی جاتی ہیں اور صرف اتنی چیزیں ان کے متواتر منقول ہونے کے بھرپور اسباب ہونے میں کافی نہیں ہیں۔

**دوسرا جواب** ۵ احکام کی اصالت سے مراد فرد کامل ہے جو صرف قرآن پاک میں ہی پایا جاتا ہے۔ اس لیے کہ قرآن میں احکام کی اصالت الفاظ اور معنی دونوں کی طرف لوتی ہے معنی کی طرف لوتنا تو واضح ہے اور الفاظ کی طرف لوتنا اس اعتبار سے ہے کہ حکم کا تعلق اس کے اعجاز کے ساتھ بھی ہے اور اس کے پڑھنے والے کے ثواب کے ساتھ بھی ہے اور اسے حفظ کرنے والے کے لیے عمدہ وعدے اور عظیم انعامات اور اس کو حفظ کرنے کے بعد بھلا دینے والے اور اسے جنابت کی حالت میں چھونے یا پڑھنے والے کے لیے شدید وعیدیں وغیرہ کے ساتھ بھی ہے جبکہ سنت نبویہ کے الفاظ کے ساتھ کسی بھی حکم کا تعلق نہیں ہے اسی وجہ سے اس کی روایت بالمعنی جائز ہے جبکہ اس کے معانی کے نقل کرنے پر اگر بھرپور اسباب مہیا ہوں تو اس کا تو اترا واجب ہے ورنہ نہیں۔ اسی وجہ سے روافض کی نقل کردہ اس روایت کے جھوٹ ہونے کا قطعی حکم لگایا جائے گا جسے انھوں نے نبی کریم ﷺ کی طرف منسوب کیا کہ آپ ﷺ نے اپنے بعد امامت عظمیٰ کے بارے میں تصریح کی کہ وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور ان کی اولاد رضی اللہ عنہم میں محصور رہے گی اس کا بیان یہ ہے کہ اگر ان کا یہ دعویٰ صحیح ہوتا تو یہ متواتر منقول ہوتا اس لیے کہ اس کے نقل پر بھرپور اسباب ہیں اس لیے کہ اس کا تعلق ایک ایسے امر کے ساتھ ہے جو مستقبل کے ایک اعلیٰ حکم اور تمام اسلامی ممالک کے لیے اسلام میں ولایت عظمیٰ کے ساتھ ہے۔

پانچواں شبہ ۷ وہ کہتے ہیں کہ تو اترا اس بات سے بھی ٹوٹ جاتا ہے کہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ جو جلیل القدر صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے ہیں وہ مصحف عثمان کے موافق نہ تھے اس کی دلیل مندرجہ ذیل روایت ہے۔

① حضرت شقیق بن سلمہ فرماتے ہیں کہ ہمیں عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے مہر پر خطبہ دیا اور فرمایا کہ: ﴿وَمَنْ يَغْلِبْ يَأْتِ بِمَا عَنَّا يَوْمَ الْقِيَامَةِ﴾ (آل عمران: ۱۱۲) ”جو مال غنیمت میں خیانت کرے گا وہ اپنی خیانت کرے گا وہ اپنی خیانت کی ہوئی چیز کو بروز قیامت لائے گا“ اپنے مصاحف چھپا دو۔ (یعنی انھیں چھپا دو تا کہ جلائے نہ جائیں) اور تم لوگ کیسے حکم دیتے ہو کہ میں حضرت

زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کی قرأت پر پڑھوں حالانکہ میں نے رسول اللہ ﷺ کے دہن مبارک سے اس طرح سنا ہے۔“ ②

② خیر بن مالک فرماتے ہیں کہ: ”جب مصاحف میں تبدیلی کا حکم ہوا تو یہ بات حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کو بڑی لگی انھوں نے فرمایا کہ جو اپنے مصحف کو چھپا سکے چھپالے (یعنی چھپالے تاکہ جلے نہیں) آخر میں فرمایا کہ کیا میں اس قرأت کو چھوڑ دوں جسے

میں نے رسول اللہ ﷺ کی زبان مبارک سے سنا۔

③ حاکم نے ابومیرہ کی سند سے روایت کیا کہ: ”میں چلا اور ابوسوی اشعریؒ، حذیفہؒ، ابن مسعودؒ، اور ابن مسعودؒ کے پاس تھا ابن مسعودؒ نے فرمایا: ”اللہ کی قسم! میں یہ مصحف نہیں دوں گا مجھے رسول اللہ ﷺ نے پڑھایا۔“

**جواب ①** یہ روایات کبھی بھی قراءات کے عدم تواتر پر دلالت نہیں کرتیں اور نہ ہی اس چیز کے عدم تواتر پر دلالت کرتی ہیں۔ جو حضرت عثمانؓ کا مصحف میں آئی ہے زیادہ سے زیادہ اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ شروع میں حضرت ابن مسعودؒ اپنے مصحف کو جلانے پر متفق نہیں تھے اس سے حضرت عثمانؓ کے مصحف میں موجود قرآن کا تواتر نہیں ٹوٹا۔ اس لیے کہ حضرت عثمانؓ کے مصحف میں موجود قرآن کے تواتر کی یہ شرط نہیں کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؒ اپنا مصحف جلائیں یا کوئی بھی اپنا مصحف جلائے بلکہ تواتر کے تحقق ہونے کے لیے ضروری ہے کہ اسے ہر طبقہ میں ایک ایسی جماعت روایت کرے جس کے جھوٹ پر جمع ہونے سے اسن ہو اور یہ مصحف عثمانؓ میں موجود ہے اس لیے کہ انھوں نے اس میں جو روایت کیا اس پر صحابہؓ کی ایک بہت بڑی جماعت متفق ہو گئی اس میں جھوٹ محال ہے اور آپ کو حضرت عثمانؓ اور ان کا قرآن پاک میں دستور کافی ہے اگر آپ چاہیں تو ان کی طرف رجوع کر سکتے ہیں۔

② اگر حضرت ابن مسعودؒ کا حضرت عثمانؓ کے مصحف کی مخالفت فرض کر لی جائے تو بھی یہ مخالفت قرآن کے تواتر کو ختم نہیں کرتی اس لیے اس مفروضہ مخالفت کے ہوتے ہوئے بھی مصحف عثمانی میں متواتر کے ارکان تحقق ہیں اور دنیا میں کوئی شخص اس کا قائل نہیں کہ: ”تواتر کی شرط یہ ہے کہ اس کا کوئی مخالف نہ ہو۔“ اس لیے کہ حضرت ابن مسعودؒ کا مصحف عثمانی کی مخالفت قرآن کے تواتر کو توڑنے والی نہیں ہے۔

③ یہ روایات جو انھوں نے قرآن کے تواتر میں طعن کے طور پر پیش کی ہیں اس پر دلالت نہیں کرتیں کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؒ قراءت میں بھی مصحف عثمانی کے مخالف تھے بلکہ وہ اسے بھی پڑھتے تھے اور اس روایت کو بھی پڑھتے تھے جو انھوں نے انفرادی طور پر اکیسے نبی کریم ﷺ کے زبان مبارک سے سنی تھی کیا آپ نہیں دیکھتے کہ انھوں نے فرمایا: ”رسول اللہ ﷺ نے اپنی مبارک زبان سے اس کی طرح پڑھا۔“ چنانچہ کلمہ ”مثله“ (اس کی طرح) اعتراف ہے کہ حضرت زید بن ثابتؓ نے بھی اس کی مثل رسول اللہ ﷺ سے پڑھا اسی وجہ سے صحابہؓ نے حضرت ابن مسعودؒ کے انفرادی ساتھ موافقت نہیں کی بخلاف حضرت عثمانؓ کے مصحف کے کہ اس کی موافقت ایک بہت بڑی جماعت نے کی اور اجماع امت بھی ہو گیا اور اس میں صرف وہی لکھا گیا جو آخری زمانے میں ثابت تھا اور اس کی تلاوت منسوخ بھی نہیں ہوئی جیسا کہ بحث صحیح القرآن میں اس کا بیان گزر چکا ہے۔

④ حضرت ابن مسعودؒ کا مصحف نہ دینا شروع میں تھا پھر بعد میں جب انھیں خبر ملی کہ اصحاب رسول ﷺ نے ان کے مقالہ میں اسے ناپسند کیا تو مصحف کو جلا دیا تھا۔ جیسا کہ حضرت شفیقؒ کی حدیث میں ہے جسے ابن ابوداؤد نے زہری کے طریق سے روایت کیا۔ اسی وجہ سے ان کی صفیں متحد ہو گئیں اور ان کا کلمہ ایک ہو گیا اور اجماع امت کی وجہ سے مصاحف عثمانیہ ہر طرح سے کامیاب ہو گئے حتیٰ کہ ابن مسعودؒ نے بھی اجماع کر لیا۔ تمام تعریفیں اللہ کے لیے ہیں اس کرم اور سخاوت پر وہ تعریفیں جو اس کی نعمتیں پوری کرتی ہیں اور مزید بڑھاتی ہیں اور اس کی رضا کو اتارتی ہیں۔ آمین

## تفسیر، مفسرین اور ان کے متعلقات

تفسیر کا لغوی معنی وضاحت اور بیان ہے اسی سے متعلق اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَلَا يَأْتُونَكَ بِمَثَلٍ إِلَّا جِئْنَاكَ بِالْحَقِّ وَأَحْسَنَ تَفْسِيرًا﴾ (الفرقان: ۳۴)

”اور وہ آپ کے پاس نہیں لائیں گے کوئی بات مگر ہم آپ کے پاس حق اور بہترین تفسیر لائیں گے۔“

تفسیر کا اصلاحی معنی؟ ایسا علم جس میں بقدر طاقت بشریہ قرآن کریم کے احوال سے بحث کی جائے اللہ تعالیٰ کو مراد پر دلالت کرنے کی حیثیت سے۔

علم سے مراد معارف تصور یہ ہیں۔ عبدالحکیم نے کلام کرتے ہوئے فرمایا کہ: ”تفسیر کا علم تصورات کی قبیل سے ہے اس لیے کہ اس سے مقصود اس کے الفاظ کے معانی کا تصور ہے اور یہ تعاریف کی قبیل سے ہے لیکن ان میں سے اکثر بلکہ کل تعاریف لفظیہ کی قبیل سے ہیں۔“

سید کا مذہب یہ ہے کہ تفسیر تصدیقات کی قبیل سے ہے اس لیے کہ یہ الفاظ پر حکم کو متضمن ہیں بایں طور کہ یہ ان معانی کو متضمن ہیں جو تفسیر میں ان کے اطراف میں ذکر کیے جاتے ہیں۔

ہمارا قول: ”اس میں قرآن کے احوال سے بحث کی جائے۔“ اس سے وہ علوم خارج ہو جائیں گے جن میں قرآن کے علاوہ کسی اور کے احوال سے بحث کی جائے۔

ہمارا قول: ”اللہ تعالیٰ کی مراد پر بحث کرنے کی حیثیت سے“ اس سے وہ علوم نکل جائیں گے جن میں قرآن کے احوال سے بحث کی جائے مگر اس کی دلالت کی حیثیت سے جیسے علم قرأت، اس میں قرآن پاک کے احوال سے بحث کی جاتی ہے مگر ان کے الفاظ کے ضبط اور ان کے ادا کی کیفیت سے اور جیسے علم رسم عثمانی اس میں بھی قرآن کریم کے احوال سے بحث کی جاتی ہے مگر اس کے الفاظ کی کتابت کی کیفیت کی حیثیت سے۔

اس حیثیت سے وہ معارف بھی نکل جاتے ہیں جن میں قرآن پاک کے احوال سے بحث کی جاتی ہے مگر مخلوق یا غیر مخلوق ہونے کی حیثیت سے کیونکہ ان کا تعلق علم کلام کے ساتھ ہے اسی طرح وہ معارف بھی نکل جائیں گے جن میں قرآن کے احوال سے بحث کی جاتی ہے لیکن جنہی وغیرہ ہونے کی حالت میں قرآن پاک کی تلاوت کرنے کی حیثیت سے کہ یہ علم فقہ سے سابق ہے۔

بقدر طاقت بشریہ کی قید اس وضاحت کے لیے ہے کہ علم تفسیر میں تشابہات کے معانی کا علم نہ ہونا عیب نہیں ہے اور نہ ہی واقع اور نفس الامری میں اللہ تعالیٰ کی مراد کا علم نہ ہونا عیب ہے۔

علم تفسیر کی تعریف یوں بھی کی گئی ہے کہ: ”ایسا علم جس میں کتاب عزیز کے احوال سے بحث کی جائے اس کے نزول، سند،

اداء، الفاظ، الفاظ سے متعلقہ معانی اور احکام سے متعلقہ معانی کی جہت سے۔“

نزول سے مراد سبب نزول اور اس کا مکان و زمان ہے۔

سند سے مراد جو اس کے متواتر، آحاد یا شاذ ہونے کو شامل ہو۔

اداء سے مراد جو اس کے ادا کے تمام طرق کو شامل ہو جیسے مذکورہ اور ادغام۔

الفاظ سے مراد جس کا تعلق اس کے الفاظ کے ساتھ ہو اس حیثیت سے کہ وہ حقیقت ہیں یا مجاز، مشترک ہیں یا مرادف، صحیح

ہیں یا معتل اور معرب ہیں یا جنی۔

الفاظ سے متعلقہ معانی سے مراد جو فصل و صل کے مشابہ ہوں۔

احکام سے متعلقہ معانی سے مراد جو عموم و خصوص اور احکام و نسخ کی قبیل سے ہوں۔

یہ تعریف جیسا کہ آپ دیکھ رہے ہیں کہ یہ علم قرأت، علم اصول، علم قواعدت جیسے نوح، صرف، معانی، بیان اور بدیع وغیرہ

کے قواعد کے تحت مندرج ہونے والی کثیر جزیات کو شامل ہے۔

علم تفسیر کی ایک تیسری تعریف کی گئی ہے کہ ”یہ ایک ایسا علم ہے جس میں الفاظ قرآن کے نطق کی کیفیت، اس کے مدلولات،

اس کے احکام افراد یہ اور ترکیب اور اس کے معانی جن پر ترکیب کی حالت میں انھیں محمول کیا جائے گا اور اس کے علاوہ جیسے نسخ، سبب

نزول اور جس سے مقام کی وضاحت ہوتی ہے جیسے قصہ اور مثل وغیرہ کی کیفیت سے بحث کی جائے۔“

یہ تعریف دونوں تعریفوں کے درمیان درمیان ہے اور اس کا پہلی تعریف کی طرف لوٹنا سہل ہے اس لیے کہ یہاں جو تفصیلاً

ذکر کیا گیا اسے بقدر طاعت بشریہ اللہ تعالیٰ کے کلام سے اس کی مراد کا کچھ تفصیل کے ساتھ بیان سمجھا جائے گا۔

**تاویل** • تاویل بھی اپنے مشہور ترین لغوی معنی میں تفسیر کے مرادف ہے۔

صاحب تائوس نے فرمایا کہ: ”أَوَّلُ الْكَلَامِ تَأْوِيلًا وَتَأْوِيلُهُ ذَبْرٌ كَأَوْقَدَهُ وَفَسَّرَهُ“۔

اسی سے متعلق اللہ تعالیٰ کا قول ہے:

﴿فَأَمَّا الَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ ذَيْعٌ فَيَتَّبِعُونَ مَا نَشَاءُ مِنْهُ ابْتِغَاءَ الْفِتْنَةِ وَابْتِغَاءَ تَأْوِيلِهِ ۗ وَمَا يَعْلَمُ تَأْوِيلَهُ إِلَّا اللَّهُ ۗ﴾ (آل عمران: ۷)

”اور جن کے دلوں میں کھوٹ ہے وہ اس کے تشابہات کے پیچھے لگتے ہیں فتنہ کی تلاش میں اور اس کی تاویل تلاش کرتے

ہوئے اس کی تاویل اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔“

اسی طرح بہت سی آیات آئی ہیں جن میں تاویل کا لفظ استعمال ہوا ہے اور ان تمام آیات میں اس کا معنی بیان، کشف اور

ایضاح ہے۔

جبکہ مفسرین کی اصطلاح میں تاویل کے معنی میں اختلاف ہے۔ بعض حضرات کی رائے یہ ہے کہ یہ تفسیر کے مرادف ہے

اس بناء پر ان کے درمیان تساوٰی کی نسبت ہے۔ یہ معنی متقدمین کے ہاں بہت رائج ہے انہی میں سے ایک قول مجاہد کا بھی ہے کہ

## مناب العسرفان فی علوم القرآن: جلد ①

بے شک علماء اس کی تاویل جانتے ہیں (یعنی قرآن کی) اور ایک قول ابن جریر کا بھی ہے جو انھوں نے اپنی تفسیر میں فرمایا ہے کہ: "اللہ تعالیٰ کے قول کی تاویل میں ایک قول یہ بھی ہے... نیز فرماتے ہیں کہ: "اس آیت میں اہل تاویل کا اختلاف ہے۔"

بعض حضرات کی رائے یہ ہے کہ تفسیر فقط عموم خصوص میں تاویل کے مخالف ہے اور وہ تفسیر کو عام مطلق قرار دیتے ہیں شاید ان حضرات کے نزدیک تاویل سے مراد صرف لفظ کے مدلول کا بیان ہے دلیل کی طرف سبقت کے بغیر اور تفسیر سے مراد لفظ کا مدلول مطلقاً ہے خواہ دلیل کی طرف سبقت ہو یا نہ ہو۔

بعض حضرات کی رائے یہ ہے کہ تفسیر تاویل کے متباین ہے تفسیر کہتے ہیں کہ: "قطعاً طور پر کہنا کہ اللہ تعالیٰ کی مراد یہی ہے۔" اور تاویل "کسی احتمال کو بغیر قطعیت کے ترجیح دینا" ہے یہ قول ماتریدی کا ہے۔

یافتگی کا معنی "لفظ کی وضاحت بطریق روایت" ہے اور تاویل کا معنی "لفظ کی وضاحت بطریق درایت" ہے۔ "یافتگی کا معنی" ان معانی کا بیان جو عبارت کی وضع سے مستفاد ہوتے ہیں اور تاویل "ان معانی کا بیان ہے جو اشارہ کے طریقے سے مستفاد ہوتے ہیں۔" متاخرین کے نزدیک یہی معنی مشہور ہے جیسا کہ علامہ آلوسی نے اس پر تنبیہ کی ہے انھوں نے اس موضوع کی آراء کو پیش کرنے کے بعد فرمایا کہ: "ہمارے ذکر کردہ یا ذکر نہ کردہ میں جو کچھ بھی کچھ کہا گیا ہے وہ آج کے عرف کے مخالف ہے اس لیے کہ مؤلفین کے نزدیک بغیر کسی انکار کے متعارف ہے کہ تاویل ان معانی قدسیہ اور معارف ربانیہ کو کہتے ہیں جو غیب کے بادلوں سے عارفین کے قلوب پر اترتے ہیں جبکہ تفسیر کچھ اور ہے۔" آپ جانتے ہیں کہ انھوں نے تاویل کو ان چیزوں کے ساتھ خاص کیا جو اشارہ سے ماخوذ ہوتے ہیں جبکہ تفسیر کو تعبیر کے مفہوم کے ساتھ خاص کیا ہے۔

**تفسیر کی دو اقسام** • تفسیر کی اجمالی دو قسمیں ہیں:

① خشک تفسیر جو الفاظ کے حل، جملوں کے اعراب اور ان نکات بلاغیہ اور اشارات خفیہ کے بیان سے جنھیں لظہم قرآن شامل ہے تجاوز نہیں کرتی۔

② وہ تفسیر جو ان حدود سے تجاوز کرتی ہے اس کا سب سے بڑا ہدف قرآن پاک کی ہدایات، قرآن پاک کی تعلیمات اور اس قرآن میں اللہ تعالیٰ نے لوگوں کے لیے جو کچھ شروع کیا ہے اس میں پائی جانے والی حکمتیں ہیں اس طور پر کہ وہ ارواح کو جذب کریں اور دلوں کو کھول دیں اور نفوس کو اللہ تعالیٰ کی ہدایت کی طرف متوجہ کریں اور یہی تفسیر کے نام کے لائق ہے اور اسی کے بارے میں گفتگو کی جائے گی جب کہ ہم اس کی فضیلت اور ضرورت کے بارے میں بات کریں گے۔

تفسیر کی فضیلت اور ضرورت

قرآن پاک کی تعلیمات اور اس کی پر حکمت لظہم سے جس میں نوع بشری کے لیے سعادت کے تمام عناصر ودیعت رکھے ہوئے ہیں اس سے رہنمائی حاصل کرنے کے طریقے سے ہی ممکن ہے اس لیے کہ اسے نوع بشری کے حکیم خالق کا علم محیط ہے اور یہ بات بدیہی ہے کہ ان تعلیمات پر عمل کرنا قرآن کے فہم و تدبر اور اس میں پائی جانے والی نصاب و رشد پر موقوف اور اس کا معجز اور باکمال اسلوب جن زبردست قوتوں کا حامل ہے ان قوتوں کے ذریعے ان کے مبادیات کو جانے بغیر نہیں ہو سکتا اور یہ چیز قرآن پاک کے الفاظ کے

مدلولات کے بیان اور وضاحت سے ہی متحقق ہو سکتی ہے ”اور اسی کا نام علم تفسیر ہے۔“ خصوصاً اس زمانے میں جس میں عربی بیان کی مہارت ختم ہو گئی اور اس کی خصوصیات و اوصاف ضائع ہو گئے حتیٰ کہ خالص النسب عربوں سے خود بھی ضائع ہو گئے۔

چنانچہ تفسیر ان خزانوں اور ذخائر کی چابی ہے جن پر یہ کتاب مجید مشتمل ہے جو بشر کی اصلاح، لوگوں کی نجات اور عالم کے اعزاز کے لیے نازل ہوئی۔

اور تفسیر کے بغیر ان خزانوں اور ذخائر تک پہنچنا ناممکن ہے جب تک کہ لوگ قرآن پاک کے الفاظ دوہرانے میں مبالغہ کرتے رہیں گے اور ہر روز ہزاروں مرتبہ ان تمام وجوہ کے ساتھ جن پر قرآن نازل ہوا بھر پور قرأت کرتے رہیں گے۔

اس زمانے میں مسلمانوں کے پیچھے رہنے میں... حالانکہ مصحف بڑی تعداد میں ان کے ہاتھ میں ہیں کروڑوں حفاظ ان کے سامنے موجود ہیں ان کی تعداد بھی کثیر ہے اور ان کے علاقے بھی وسیع ہیں حالانکہ ہمارے اسلاف نے اسی قرآن کے ذریعے حیرت انگیز کامیابیاں حاصل کیں وہ تاریخ اور مؤرخین کے لیے تعجب کا مرکز تھے اور ہیں۔ حالانکہ ہمارے اسلاف تعداد میں بھی کم تھے ان کی زمین بھی تنگ تھی زندگی بھی کھردری تھی اور ان کے پاس قرآن کے نسخے اور مصحف بھی آسانی سے میسر نہ تھے۔ اور ان کے حفاظ بھی اتنی زیادہ کثرت کے ساتھ نہیں تھے۔

ہاں البتہ اس میں راز یہ ہے کہ انھوں نے قرآن پاک پڑھنے اور اس کی ہدایات کے موتی نکالنے میں بھر پور محنت کی۔ وہ اس بلند ثقافت پر اپنی فطری صلاحیتوں، عربی مہارات سلیمہ نے ذریعے مدد طلب کرتے نیز ان چیزوں سے بھی مدد طلب کرتے جنھیں رسول اللہ ﷺ نے اپنے اقوال، اعمال، اخلاق اور احوال کے ذریعے کھولا جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ:

﴿وَ أَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُونَ﴾ (آئل: ۴۴)

”اور ہم نے آپ کے پاس ذکر کو نازل کیا تاکہ آپ لوگوں کو واضح کریں کہ ان کی طرف کیا آیت اور شاید وہ غور و فکر کریں۔“ اس وجہ سے ان کا سب سے بڑا غم اور فکر قرآن کریم تھا وہ اسے حفظ کرتے اور حفظ سے پہلے اسے سمجھتے اور اس کی تعلیمات پر باریکی سے عمل کرتے اور جاتے ہوئے اس کی ہدایت سے ہدایت حاصل کرتے تھے۔

صرف اسی وجہ سے ان کی ارواح صاف ہو گئیں ان کے نفوس پاکیزہ ہو گئے اور ان کے آثار بلند ہو گئے اس لیے کہ اس وجود میں روح انسانی قوی ترین چیز ہے جب وہ صاف اور مہذب ہو گئی اس کی توجیہ اچھی ہو گئی اور وہ متادب ہو گئی تو وہ انتہائی حیرت انگیز چیزیں وجود میں لاتی ہے:

﴿وَ اللَّهُ عِنْدَهُ حُسْنُ الثَّوَابِ﴾ (آئل عمران: ۱۹۵)

”اور اللہ تعالیٰ کے پاس عمدہ ثواب ہے۔“

اسی طرح امت محمدیہ بھی ہدایت و ارشاد، عالم کی نجات اور اصلاح بشر کے لیے انتہائی حیرت انگیز چیزیں وجود میں لائی اور اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے نصرت، تائید، غلبہ اور کامیابی لکھ دی حتیٰ کہ اس زمانے میں دعوت حق اور اصلاح کے ساتھ دشمنی رکھنے والی دو قوی ترین حکومتوں یعنی مشرق میں فارس اور مغرب میں روم پر بھی۔ اُس کو تو اسی کی سرکشی توڑ کر اور اس کے قبیلوں کو مسلمان کر کے لوح



## مسائل العسرفان فی علوم القرآن: جلد ①

وجود سے ہی مناد یا اور اس کے قبضہ میں جتنے مشرقی ممالک اور بہت سے قبیلے تھے سب چھین لیے پھر دنیا ان کی مطیع بن گئی اور انھوں نے بعض یورپی ممالک پر قبضہ کر لیا اور ان میں انھوں نے مضبوط بنیاد والی عربی حکومت قائم کر لی جو دنیا کی رونق اور زندگی کی زینت بن گئی اور اسی سے یورپی قبیلوں پر نور پھیلا۔

جبکہ آج کے اکثر مسلمان؟ انھوں نے اپنی سوگ کی محفلوں، قبرستانوں اور گھروں میں قرآن پاک کے الفاظ دہرانے اور اس کے سروں کو گانے کے طرز پر اکتفاء کر لیا وہ برکت کے طور پر گھروں میں اٹھا کر مصاحف لے جاتے ہیں یا گھروں میں رکھ دیتے ہیں اور اس بات کو بھول بیٹھے کہ برکت عظمیٰ اس میں تدبر اور غور کرنے اس کی طرف دھیان دینے اور اس کی ہدایت اور آداب سے استفادہ کرنے اور پھر اس کے اوامر و منیات پر کاربند رہنے اور اس کے اسباب ناراضگی اور نواہی سے دور رہنے میں مضر ہے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ:

﴿ كَيْتَبُ أَنْزَلْنَاهُ إِلَيْكَ مُبَارَكًا لَيْلًا نُبْرُؤًا آيَاتِهِ وَ لِيَتَذَكَّرَ أُولُو الْأَلْبَابِ ﴾ (م: ۲۹۰)

”یہ ایک بابرکت کتاب ہے جسے ہم نے آپ کی طرف نازل کیا تاکہ لوگ اس کے آیات میں تدبر کریں اور سمجھ والے اس سے نصیحت حاصل کریں۔“

نیز فرمایا کہ:

﴿ أَفَلَا يَتَذَكَّرُونَ الْقُرْآنَ لَعَلَّ عَلَى قُلُوبٍ أَقْفَالُهَا ﴾ (عم: ۲۳)

”کیا یہ قرآن پاک میں غور نہیں کرتے یا ان کے دلوں پر تالے لگے ہوئے ہیں۔“

نیز اللہ جل ذکر فرماتا ہے کہ:

﴿ وَ لَقَدْ يَسْتَسِرُّنَا الْقُرْآنَ لِلَّذِي كُوفِهَلْ مِنْ قَدْرِكَ ﴾ (امر: ۱۷۷)

”تحقیق ہم نے قرآن کو آسان کیا نصیحت کے لیے تو کوئی سے نصیحت حاصل کرنے والا۔“

آج کے مسلمان اس پیاسے کی طرح ہیں جو پیاس کی وجہ سے مر رہا ہے حالانکہ پانی اس کے سامنے موجود ہے اس حیوان کی طرح ہیں جو اندھے پن کی وجہ سے مر رہا ہے اور روشنی اس کے سامنے ہے جو اسے راستہ دکھلا رہی ہے۔ بشرطیکہ کہ وہ آنکھ کھولے۔

﴿ ذَٰلِكَ هُوَ الْخُسْرَانُ الْمُبِينُ ﴾ (الح: ۱۱)

”یہ کھلم کھلا خسارہ ہے۔“

خبردار اس امت کی اصلاح اسی طریقے سے ہوگی جس سے ان کے پہلوں کی اصلاح ہوئی اور وہ یہ کہ یہ کتاب اللہ کی طرف لوٹ آئیں اس سے سیدھے راستے کی رہنمائی طلب کریں اور ہدایت طلب کریں اور اسے اپنے نفوس میں مستحکم کریں اور اپنے سے متعلقہ ہر چیز میں مستحکم کریں جیسے ہمارے پہلے آباء اس کی تلاوت کا حق ادا کرتے تھے کہ اپنی مجالس، مساجد، محافل اور گھروں میں اس میں غور و فکر کرتے نیز اپنی نقلی فرضی نمازوں میں بھی اس کی تلاوت کرتے نیز جب لوگ سو رہے ہوتے تو وہ لوگ اپنی تہجد میں اس کا

اہتمام کرتے یہاں تک کہ اس کے حیران کن اثرات جلد ہی ان میں ظاہر ہو گئے جس نے ان کے نفوس کو بلند کیا اور انہیں بت پرستی کے گڑھے سے نکال لیا اور ان کی ہمتوں کو بلند کیا، ان کے اخلاق کو مہذب کیا اور عالم وجود کی قوت اور اس کے منافع سے انتفاع کی طرف ان کی رہنمائی کی اور اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ انہوں نے علوم و فنون اور صنعتوں میں مہارت حاصل کر لی اسی طرح اخلاق آداب اصلاح اور ارشاد میں بھی وہ لوگ ماہر ہو گئے اور اس انتہاء کو پہنچ گئے کہ انھوں نے اس میں دنیا کی تمام قوموں کو اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ حتیٰ کہ کسی مغربی فلسفی نے اپنی کتاب "تطور الامم" میں کہا کہ: "بے شک فنون کی مہارت کا کسی بھی امت میں مستحکم ہونا تین مرحلوں کے بغیر ممکن نہیں۔ ① تقلید کا مرحلہ ② درمیانی مرحلہ ③ استقلال کا مرحلہ اور صرف عرب اس سے مستثنیٰ ہیں کہ ان میں فنون کی مہارت صرف ایک طبقہ ہی میں مستحکم ہوئی۔"

سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے تفسیر کی حاجت کے بیان میں فرمایا جس کا خلاصہ یہ ہے کہ: "قرآن صرف عربی زبان میں نازل ہوا اور عربوں کے فصیح ترین زمانے میں نازل ہوا اس لیے وہ لوگ اس کے ظاہر کو بھی جانتے تھے اور اس کے احکام کو بھی جانتے تھے۔ جبکہ اس کے باطنی دقائق بحث و نظر اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھے بغیر ان پر ظاہر نہیں ہوئے جیسے انھوں نے کہا کہ:

﴿اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَّ لَمْ یَلِیْسُوْا اِیْمَانُھُمْ بِظُلْمٍ﴾ (الانعام: ۸۲)

"جنھوں نے ایمان قبول کیا اور اپنے ایمان کو ظلم کے ساتھ ملتیس نہیں کیا۔"

اس آیت کے نزول کے وقت سوال کیا کہ: "ہم میں سے کس نے اپنے اوپر ظلم نہیں کیا؟" آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے شرک بتلا کر اس کی تفسیر کر دی اور اس کی دلیل میں آیت ﴿اِنَّ الشِّرْکَ لَظُلْمٌ عَظِیْمٌ﴾ (العنق: ۱۳) (بے شک شرک بہت بڑا ظلم ہے) پڑھی۔ اسی طرح جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:

((من نوقش الحساب عذب))،

"جس سے حساب لیا گیا وہ عذاب میں گرفتار ہو گیا۔"

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اس کے بارے میں سوال کیا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ:

﴿فَسَوْفَ یُحَاسَبُ حِسَابًا یَسِیْرًا ۗ وَ یُنْقَلَبُ اِلٰی اٰہْلِہٖ مَسْرُوْرًا ۗ﴾ (الانشاق: ۹، ۸)

"عنقریب اس سے آسان حساب لیا جائے گا اور وہ اپنے گھر والوں کی طرف خوش و خرم لوٹے گا۔"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ وہ عرض ہوگا۔ اسی طرح حیطہ الامنیض اور حیطہ الاسود کے بارے میں حضرت عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ کا قصہ ہے اور ہم ان چیزوں کے ان سے بھی بڑھ کر محتاج ہیں بلکہ تفسیر کے سب سے زیادہ محتاج ہیں اس لیے کہ ہم لغت کے مدارک اور اس کے اسرار کو سمجھنے بغیر قاصر ہیں۔

گزشتہ بالا تحریر سے واضح ہوتا ہے کہ تفسیر کا فائدہ نصیحت اور عبرت حاصل کرنا اور عقائد، عبادات، معاملات، اور اخلاق، میں اللہ تعالیٰ کی ہدایت کو پہچاننا ہے تاکہ افراد اور جماعتیں دنیا و آخرت کی بھلائی پاسکیں۔ (آئین) اور یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ یہ علم علوم دینیہ اور علوم عربیہ میں سب سے زیادہ اشرف ہے۔

یہ اس کے بلند موضوع اور عظیم فائدہ کی بناء پر ہے۔

اس کا نام علم تفسیر رکھا گیا اس لیے کہ اس میں وضاحت اور بیان ہے اور اس نام کے ساتھ صرف یہی خاص ہے باقی علوم کو یہ نام نہیں دیا گیا حالانکہ وہ تمام علوم وضاحت و بیان پر مشتمل ہیں۔ اس لیے کہ یہ جلیل القدر ہے اور اس میں زیادہ صلاحیت کی ضرورت ہے اور اس میں مقصود اللہ تعالیٰ کے کلام سے اس کی مراد کی وضاحت ہے گویا کہ تفسیر صرف یہی ایک ہے باقی نہیں۔

**تفسیر کی اقسام ۵** حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے وارد ہے کہ تفسیر کی چار اقسام ہیں:

① حلال و حرام جس کی جہالت کا عذر کسی کی طرف سے قبول نہیں۔

② وہ تفسیر جسے عرب لوگ اپنی زبان سے بیان کریں۔

③ وہ تفسیر جسے علماء بیان کریں۔

④ وہ تفسیر جسے اللہ تعالیٰ کے علاوہ کوئی نہیں جانتا۔

زرکشی ریشید نے "البرہان" میں فرمایا جس کا خلاصہ یہ ہے کہ "یہ تقسیم صحیح ہے" وہ تفسیر جسے عرب اپنی زبان سے بیان کرتے ہیں اس کا تعلق ان کی زبان یعنی لغت اور اعراب کے ساتھ ہے اور لغت سے مراد اس کے معانی کو جاننا اور اس کے اسماء کے سمیات کو جاننا۔ مفسر پر لازم ہیں قاری پر نہیں پھر اس کے الفاظ جن معانی کو مضمّن ہیں اگر وہ عمل کو واجب کرتے ہیں علم کو نہیں تو اس میں ایک یا دو کی خبر بھی کافی ہے اور ایک یا دو شعروں سے استشہاد بھی کافی ہے اور اگر وہ علم (یعنی اعتقاد) کو واجب کرتے ہیں تو اس میں یہ کافی نہیں بلکہ ان الفاظ کا مستفیض ہونا اور اس کے شواہد کے طور پر اشعار کا کثرت سے ہونا ضروری ہے۔ اور اعراب کی بات یہ ہے کہ اگر

اعراب کا اختلاف معنی کو بدل دے تو مفسر اور قاری دونوں کے لیے اس کا سیکھنا ضروری ہے تاکہ مفسر اس کے ذریعے حکم کی معرفت تک پہنچ جائے اور قاری غلطی سے بچ جائے اور اگر وہ معنی کو بدلے تو قاری کے لیے اس کا جاننا ضروری ہے تاکہ وہ غلطی سے نہ جائے اور مفسر کے لیے اس کا جاننا ضروری نہیں اس لیے کہ اس کے بغیر بھی وہ مقصود تک پہنچ سکتا ہے۔ اور تفسیر کی وہ قسم جس کی جہالت کا عذر کسی سے قبول نہ ہوگا اس کے معانی کی وہ معرفت ہے جو ان نصوص سے فوراً مفہوم ہوتی ہے جو نصوص احکام کی شریعت اور توجید کے دلائل کو مضمّن ہیں۔ جو لفظ ایک واضح اور جلی معنی پر دلالت کرتا ہے اور اس کے بارے میں واضح معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی مراد یہی ہے اس قسم کے ساتھ تاویل ملتبس نہیں ہوتی اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کے قول: ﴿فَاعْلَمُ أَنكَا لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ﴾ (محمد: ۱۹) "تو جان کہ اللہ تعالیٰ کے علاوہ کوئی عبادت کے لائق نہیں۔" سے ہر شخص توحید کے معنی کا ادراک کرتا ہے کہ الوہیت میں اس کا کوئی شریک نہیں ہے اگرچہ اسے معلوم نہ ہو کہ "لا" لغت میں نفی کے لیے موضوع ہے اور "اللا" اثبات کے لیے وضع کیا گیا ہے اور اس کلام کا مقضیٰ محصر ہے۔ اسی طرح ہر شخص بدیہی طور پر جانتا ہے کہ ﴿وَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ﴾ (البقرہ: ۴۳) وغیرہ کا مقضیٰ مامور بہ ہے۔ ایجاب کا مطلب کرتا ہے اگرچہ وہ نہ جانتا ہو کہ "افعل" وجوب کے لیے ہوتا ہے۔

اور وہ تفسیر جسے اللہ تعالیٰ کے علاوہ کوئی نہیں جانتا وہ چیزیں ہیں جو غیب کے قائم مقام ہیں جیسے وہ آیات جن میں قیامت یا روح کا ذکر ہے یا حروف مقطعات وغیرہ۔ اور اہل حق کے نزدیک قرآن پاک کے تمام تشابہات ان کی تفسیر میں اجتہاد کی کوئی گنجائش نہیں اور ان تک رسائی کا طریقہ توفیق کے علاوہ کوئی نہیں وہ توفیق قرآن پاک کی نص ہو یا حدیث کی عبارت یا اس کی تاویل پر

اجماع اُمت ہو۔

اور تفسیر جسے علماء جانتے ہیں اور وہ ان کے اجتہاد کی طرف لوٹتی ہے یہ وہ تفسیر ہے جس پر اکثر تاویل کا اطلاق ہوتا ہے اور یہ احکام کا استنباط، عموم کی تخصیص اور ہر اس لفظ کی تخصیص جو دو یا دو سے زیادہ معانی کا احتمال رکھتا ہے تفسیر کی اس قسم میں اجتہاد کرنا غیر علماء کے لیے جائز نہیں اس لیے کہ اس میں صرف دلائل و شواہد پر اعتماد کیا جائے گا محض رائے پر نہیں... الخ ہو۔ لیکن انھوں نے اس میں اقسام کی اس ترتیب کا التزام نہیں کیا جو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔ لیکن اس میں کوئی نقصان والی بات نہیں کیونکہ انھوں نے چار اقسام کی تعداد کو پورا کر دیا ہے۔

بعض حضرات نے تفسیر کو ایک اور اعتبار سے تین اقسام میں منقسم کیا۔

① تفسیر بالروایۃ اسے تفسیر بالماثور بھی کہتے ہیں۔

② تفسیر بالدرایۃ اسے تفسیر بالرأے بھی کہتے ہیں۔

③ تفسیر بلا اشارہ اسے تفسیر اشاری بھی کہتے ہیں۔

ہم ان سب کے بارے میں بات کرنا چاہتے ہیں انشاء اللہ تعالیٰ۔

**تفسیر ماثور** کتاب اللہ میں اللہ تعالیٰ کی مرا کو بیان کرنے کے لیے وہ تفسیر جو قرآن، سنت یا صحابہ کے کلام میں آئی ہے۔ جیسے:

① قرآن پاک میں آئی ہوئی تفسیر کی مثال

﴿وَدَّ كَلُواً اُشْرَبُوا حَتَّىٰ يَبْتَيِّنَ لَكُمْ الْحَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْحَيْطِ الْاَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ﴾ (البقرہ: ۱۸۷)

”کھاؤ اور بہو حتیٰ کہ تمہارے لیے فجر کا سیاہ دھاگا سفید دھاگے سے ظاہر ہو جائے۔“

اس آیت میں ﴿مِنَ الْفَجْرِ﴾ کا لفظ اسے قبل آنے والے لفظ ﴿الْحَيْطُ الْاَبْيَضُ﴾ (سفید دھاگا) کی مراد کے لیے بیان

اور شرح ہے۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ کا قول:

﴿قَالَ رَبَّنَا ظَلَمْنَا اَنْفُسَنَا وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ﴾ (الاعراف: ۲۳)

”ان دونوں نے کہا کہ اے ہمارے رب ہم نے اپنی جانوں پر ظلم کیا اگر آپ نے ہمیں معاف نہ کیا اور آپ نے ہم پر رحم

نہ کیا تو یقیناً ہم فساد پانے والوں میں سے ہو جائیں گے۔“

تفسیر کی بعض وجوہ کے مطابق یہ الفاظ اس سے پہلے آنے والے لفظ ”کلمات“ کے لیے بیان ہیں جو اللہ تعالیٰ نے مندرجہ

ذیل قول میں آئے ہیں۔

﴿فَتَنَّاآدَمَ مِنْ رَبِّهِ كَلِمٰتٍ فَتَابَ عَلَيْهِ﴾ (البقرہ: ۳۷)

”حضرت آدم علیہ السلام نے اپنے رب سے کچھ کلمات سیکھ لیے جس پر اس نے ان کی توبہ قبول فرمائی۔“

اسی طرح اللہ تعالیٰ کے قول:

﴿حُزِمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ وَالدَّمُ وَلَحْمُ الْخِنْزِيرِ﴾ (المائدہ: ۳)

”اور تمہارے اور پر مراد، خون اور خنزیر کا گوشت حرام کر دیا گیا۔“

یہ اللہ تعالیٰ کے قول:

﴿أُحِلَّتْ لَكُم بَهِيمَةُ الْأَنْعَامِ إِلَّا مَا يُشْلَىٰ عَلَيْكُمْ﴾ (المائدہ: ۱۱)

”تمہارے لیے جو پاؤں کو حلال کر دیا گیا سوائے ان کے جن کی تمہارے سامنے تلاوت کی گئی۔“

میں ﴿إِلَّا مَا يُشْلَىٰ عَلَيْكُمْ﴾ کا بیان ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کا قول:

﴿لَيْسَ عَلَيْكُمُ الصَّلَاةُ وَالزَّكَاةُ وَأَمْنٌكُمْ بِرُسُلِي وَعَزَّرْتُمُوهُمْ وَأَقْرَضْتُمُ اللَّهُ قَرْضًا حَسَنًا لَّا يَظْفِرَنَّ عَنْكُمْ سَيِّئَاتِكُمْ﴾ (المائدہ: ۱۳)

”اگر تم نماز قائم کرو گے زکوٰۃ ادا کرو گے اور میرے رسولوں پر ایمان لاؤ گے اور ان کی نصرت کرو گے اور اللہ تعالیٰ کو قرضہ حسنہ دو گے تو میں ضرور تمہاری برائیوں کو دور کروں گا۔“

یہ اللہ تعالیٰ کے قول:

﴿وَأَوْفُوا بِعَهْدِي أُوفِ بِعَهْدِكُمْ﴾ (البقرہ: ۳۰)

”تم میرا معاہدہ پورا کرو اور میں تمہارا معاہدہ پورا کروں گا۔“

میں پائے جانے والے دو معاہدوں کا بیان ہے۔ اول اول کے لیے اور ثانی ثانی کے لیے۔

اور اللہ تعالیٰ کا قول:

﴿وَمَا أَدْرَاكَ مَا الطَّارِقُ ۗ النَّجْمُ النَّاقِبُ﴾ (الطارق: ۳، ۲)

”آپ کو کیا معلوم کہ رات کو آنے والا کیا ہے؟ چمکتا ہوا ستارہ ہے۔“

اس میں ﴿النَّجْمُ النَّاقِبُ﴾ اس سے پہلے آنے والے ”الطارق“ کا بیان ہے اور اس کے علاوہ بہت سی مثالیں ہیں جو

قرآن پاک میں تدبر کرنے سے معلوم ہوتی ہیں۔

① سنت رسول میں قرآن پاک کی شرح آنے والی مثالیں • آپ ﷺ نے:

﴿الَّذِينَ آمَنُوا لَمْ يَلْبِسُوا إِيمَانَهُمْ بِظُلْمٍ أُولَٰئِكَ لَهُمُ الْأَمْنُ وَهُمْ مُهْتَدُونَ﴾ (الانعام: ۸۲)

”جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے اپنے ایمان کو ظلم کے ساتھ غلط نہیں کیا یہی لوگ ہیں جن کا ایمان ہے اور یہ لوگ ہدایت یافتہ ہیں۔“

میں آنے والے لفظ ظلم کی تفسیر شرک کے ساتھ کی اور اپنی اس تفسیر کی تائید اللہ تعالیٰ کے قول:

﴿إِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيمٌ﴾ (التحان: ۱۳)

”بے شک شرک بہت بڑا ظلم ہے۔“

سے کی اور جب آپ ﷺ نے فرمایا کہ:

﴿فَأَمَّا مَنْ أَدْبَىٰ كَيْفَ بِيَدَيْهِ ۖ فَسَوْفَ يَحْسَبُ حِسَابًا ۖ يَسِيرًا ۗ وَيَقْلِبُ إِلَىٰ أَهْلِهِ مَسْرُورًا ۗ﴾ (الانشقاق: ۷، ۹)

”جس شخص کا اعمال نامہ دائیں ہاتھ میں دے دیا گیا تو عقرب اس سے آسان حساب لیا جائے گا اور وہ اپنے گھر والوں کی طرف خوشی و خرم ہو کر واپس ہوگا۔“

اس پر آپ ﷺ نے فرمایا کہ وہ عرض حساب ہوگا۔ اس میں آپ ﷺ نے ”حساب یسیور“ کی تفسیر کی۔ اسی طرح

رسول اللہ ﷺ نے اللہ تعالیٰ کے قول:

﴿وَأَعِدُّوا لَهُمْ مَا اسْتَطَعْتُمْ مِنْ قُوَّةٍ﴾ (الانفال: ۶۰)

”اور ان کے لیے تیار کرو جہاں تک تم سے ہو سکے قوت سے۔“

میں ”قوة“ کی تفسیر ”رحمی“ (تیرا اندازی) سے کی۔ اور صحیح کتب السنۃ میں اس طرح کی بہت سی چیزیں ہیں۔

اور ان دونوں قسموں کے قبول ہونے میں کوئی شک نہیں۔ پہلی قسم تو اس لیے کہ اللہ تعالیٰ خود اپنی مراد کو دوسری کی نسبت

زیادہ جانتا ہے اور سب سے زیادہ سچی ترین بات اللہ تعالیٰ کی کتاب ہے اور دوسری قسم اس لیے کہ سب سے بہترین ہدایت سیدنا محمد ﷺ کی ہدایت ہے اور آپ ﷺ کا فرض منصبی بیان و شرح ہے۔ نیز ہم آپ ﷺ کی عصمت کا بھی قطعی فیصلہ کرتے ہیں نیز اس باب کا بھی کہ آپ ﷺ کو الہام خداوندی بھی میسر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ:

﴿وَأَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ﴾ (احمل: ۴۴)

”اور ہم نے آپ کی طرف ذکر نازل کیا تاکہ آپ لوگوں کو کھول کھول کر بیان کر دیں کہ ان کی طرف کیا نازل ہوا ہے۔“

⑤ اب تیسری قسم باقی رہ گئی وہ یہ کہ جس تفسیر کا صحابہ رضی اللہ عنہم سے وارد ہونا ثابت ہے مستدرک حاکم میں ہے کہ:

”بے شک صحابی کی تفسیر جس نے وحی کا مشاہدہ کیا قرآن کا مشاہدہ کیا اس کا حکم بھی مرفوع ہے۔“

حاکم نے اسی طرح مطلق فرمایا ہے جبکہ بعض حضرات نے اس میں قید لگائی ہے کہ: جو نزول وغیرہ کے بیان میں ہو اور اس

میں رائے کی گنجائش نہ ہو (تو اس کا حکم مرفوع ہوگا) اور نہ وہ موقوف ہوگا۔

اور حاکم اور ان کے موافقین کا نظریہ یہ ہے کہ: ”صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے وحی کا مشاہدہ کیا اور اسباب نزول کا جانا اور ان کا معائنہ کیا

جو ان کے لیے کتاب اللہ کے معانی سے نقاب کو ہٹا دیتے ہیں اور ان کی فطرت سلیمہ، نفوس کی پاکیزگی، فصاحت و بلاغت میں ان کے

مرتبہ کا بلند ہونا یہ ایسی چیزیں ہیں جو انھیں کلام اللہ کے صحیح فہم پر قادر بنا دیتی ہیں اور انھیں اللہ تعالیٰ کے کلام سے اس کی مراد اور اس کی

ہدایت پر یقین کرنے والا بنا دیتی ہیں۔

اور جو تفسیر تابعین سے منقول ہے اس میں علماء کا اختلاف ہے بعض نے اسے بھی تفسیر بالماثور میں شمار کیا ہے اس لیے کہ

نائب یہ ہے کہ انھوں نے اسے صحابہ رضی اللہ عنہم سے ہی حاصل کیا اور بعض حضرات نے اسے تفسیر بالرأے میں شمار کیا۔ تفسیر ابن جریر میں



قرآن کریم کے بیان میں صحابہ و تابعین کی نقلیں کثرت کے ساتھ پائی جاتی ہیں۔

لیکن حافظ ابن کثیر ریضیہ فرماتے ہیں کہ: "تفسیر بالمأثور راویوں تک اکثر یہود زنادقہ، فارس اور اہل کتاب مسلمانوں کے ذریعے پہنچی ہے۔" کسی نے کہا کہ اس کا بیشتر حصہ انبیاء کرام علیہم السلام کے اپنی قوم کے ساتھ قصے ہیں اور وہ چیزیں ہیں جن کا تعلق ان کی کتابوں اور معجزات کے ساتھ ہے نیز ان کے علاوہ لوگوں کی تاریخ جیسے اصحاب کہف، "ازمہ ذات العماد" والوں کا شہر، بابل کا جادو، عروج بن عتق وغیرہ اور قیامت کی نشانیوں اور علامات میں اور اس میں اور اس کے بعد پیش آنے والے امور یہ اکثر خرافات اور جھوٹی گھڑی ہوئی باتیں ہیں ان میں راویوں نے ان کی تصدیق کی حتیٰ کہ بعض صحابہ نبویہ نے بھی ان کی تصدیق کی۔ اسی وجہ سے امام احمد نے فرمایا کہ: "تمن چیزوں کی کوئی دلیل نہیں ہے۔" ① تفسیر ② جنگیں ③ مغازی۔

اور ضروری ہے کہ روایات منیدہ کو ایک مستقل کتابوں میں جمع کیا جائے جیسے حدیث کی بعض کتابیں ہیں اور ان کی سندوں کی قیمت کو بھی۔ پھر تفسیر میں جو صحیح ہیں انہیں بغیر سند کے ذکر کیا جائے جیسا کہ حدیث کو فقہ کی کتابوں میں ذکر کیا جاتا ہے لیکن وہ اپنے ماخذ کی طرف منسوب ہوتی ہیں.... الخ۔

### مفسرین صحابہ رضی اللہ عنہم

امام سیوطی ریضیہ نے "الاتقان" میں فرمایا کہ: "صحابہ نبویہ میں سے تفسیر میں دس صحابہ مشہور ہوئے چار خلفاء اربعہ، ابن مسعود، ابن عباس، ابی بن کعب، زید بن ثابت، ابو موسیٰ اشعری اور عبد اللہ بن زید (رضی اللہ عنہم) خلفاء اربعہ میں سے سب سے زیادہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے تفسیر مروی ہے اور باقی خلفاء ثلاثہ سے بہت ہی کم روایتیں ہیں۔ اس کا سبب ان کی وفات کا تقدم ہے۔

تین حضرات یعنی ابو بکر، عمر اور عثمان رضی اللہ عنہم سے تفسیر کی روایات کم ہونے میں اس سبب کا مطلب یہ ہے کہ یہ حضرات اس ماحول میں تھے کہ اس ماحول والے اکثر کتاب اللہ کے عالم تھے، قرآن پاک کے اسرار کو جانتے تھے اس کے معانی اور احکام کو سمجھتے تھے اور ان میں عربیت کے خصائص کامل تھے جبکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ ان کے بعد زندہ رہے حتیٰ کہ ان کے زمانے میں لوگوں کو کثرت کے ساتھ ضرورت پیش آتی کہ کوئی ان کے لیے قرآن پاک کی تفسیر کرے یہ اسلام کے دائرہ سلطنت کے وسیع ہونے کی وجہ سے ہوا نیز یہ کہ غمی لوگ اس نئے دین میں داخل ہو گئے قریب تھا کہ ان سے عربیت کے خصائص یکجہل جاتے نیز صحابہ کی اولاد میں سے ایک نسل بھی وجود میں آئی جنہیں صحابہ نبویہ کے علم کی ضرورت تھی یقیناً جو کچھ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے منقول ہے وہ دوسروں سے زیادہ ہے مزید یہ کہ وہ فکری شادابی، وسعت علم اور اشراق قلب میں بھی ممتاز تھے۔ مزید یہ بھی کہ ان کے ذمہ مسائل خلافت کے اہم امور اور ان کے تحت حکومت کو چلانا بھی تھا۔

حضرت معمر وہب بن عبد اللہ بن ابوالطفیل سے روایت کرتے ہیں کہ: "میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس حاضر ہوا وہ خطبہ دے رہے تھے اور فرما رہے تھے کہ مجھ سے پوچھو اللہ کی قسم! تم مجھ سے جو کچھ بھی پوچھو گے میں تمہیں ضرور بتاؤں گا اور مجھ سے کتاب اللہ

منائل العسرفان فی علوم القرآن: جلد ۱

کے بارے میں پوچھو اللہ کی قسم! کوئی بھی آیت ہو میں اسے جانتا ہوں کہ وہ رات کو نازل ہوئی یا دن میں اور پھر نرم زمین میں نازل ہوئی یا پہاڑ میں؟

انہی کی ایک روایت میں ہے کہ فرمایا: ”اللہ کی قسم! کوئی بھی آیت نازل نہیں ہوئی مگر میں جانتا ہوں کہ وہ کسی کے بارے میں نازل ہوئی، اور کہاں نازل ہوئی میرے رب نے مجھے عقلمند دل اور سوال کرنے والی زبان عطا کی۔“

اسی طرح حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے بھی کثرت کے ساتھ روایات مروی ہیں آپ کو ان کا مرتبہ اور ان کی جلالت قدر پہچاننے کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ ابونعیم نے ابوالبحتری سے روایت کیا کہ لوگوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے کہا کہ ہمیں ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے بارے میں بتلائیے انھوں نے فرمایا کہ اس نے قرآن و سنت کا علم حاصل کیا پھر اس میں کمال حاصل کر لیا اور یہ شخص علم کے اعتبار سے کافی ہے۔

جبکہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ قرآن پاک کے ترجمان ہیں جس کی شہادت رسول اللہ ﷺ نے دی چنانچہ حضرت مجاہد رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے مجھے فرمایا کہ: ”قرآن کے بہترین ترجمان تم ہو۔“ نیز تیسری نے ”الدلائل“ میں حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کیا کہ: ”قرآن پاک کا سب سے اچھا ترجمان عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ ہیں۔“ اور نبی کریم ﷺ نے اپنے اس قول کے ذریعے انھیں دعا دی۔

((اللَّهُمَّ فَقِّهْ فِي الدِّينِ وَعَلِّمَهُ الشَّأْوِيلَ)).

”اے اللہ! اسے دین میں تفقہ اور تاویل کا علم سکھا۔“

اور روایت ہے کہ ایک آدمی حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کے پاس آیا اور وہ آسمان و زمین کے بارے میں سوال کرنے لگا کہ وہ پہلے بند تھے پھر ہم نے انھیں کھول دیا یعنی وہ اللہ تعالیٰ کے قول:

﴿أَوْ كَلِمَةَ يَوْمَئِذٍ لِّكُلِّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ مِنْ ذُرِّيَّتِهَا وَمَا كَانَتْ تُفْعَلُ فِيهَا مِنْ أَمْرٍ غَيْرِهَا﴾ (الانبیاء: ۳۰)

”کیا انھوں نے نہیں دیکھ کر زمین و آسمان بند تھے پھر ہم نے انھیں کھول دیا۔“

کے بارے میں سوال کیا تو انھوں نے فرمایا کہ ابن عباس رضی اللہ عنہما کے پاس چلے جاؤ پھر آ کر مجھے بتلاؤ! وہ گیا اور ان سے پوچھا تو انھوں نے فرمایا کہ: ”ان بند تھے بارش نہیں برساتے تھے اور زمین بند تھی یعنی اگاتی نہیں تھی یہ بارش کے ساتھ پھینا اور یہ اگانے کے ساتھ پھینتی۔“ وہ شخص واپس حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی طرف لوٹا اور انھیں بتلایا تو انھوں نے فرمایا کہ میں کہا کرتا تھا کہ مجھے ابن عباس رضی اللہ عنہما کی قرآن کی تفسیر پر جرأت اچھی نہیں لگتی تھی لیکن مجھے اب پتہ چلا کہ وہ علم دیے گئے ہیں۔

لیکن ابن عباس رضی اللہ عنہما کی طرف جو تفسیر منسوب ہو اس کا احاطہ بہت ضروری ہے اس لیے کہ اس میں بہت سی ملاوٹ ہو چکی ہے اور بہت سی من گھڑت چیزیں اس میں لگ گئی ہیں۔

اسی طرح حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ، بن قیس انصاری ہیں جو کاتبین وحی میں سے ایک ہیں یہ کثرت سے تفسیر بیان کرتے اور ثوب نمایاں اور ممتاز تھے جیسا کہ قرأت میں مشہور و ممتاز تھے تفسیر میں ابوجعفر رازی نے ربیع بن انس سے اور انھوں نے ابوالعالیہ

سے دور انھوں نے حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے روایت کیا اور اس کی سند بھی صحیح ہے۔

اور دس میں سے باقی حضرات، زید بن ثابت رضی اللہ عنہ، ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ اور عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ ہیں لیکن یہ حضرات تفسیر میں مشہور ہونے کے باوجود پہلے چار سے کم تھے۔

ان دس کے علاوہ بھی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی جماعت سے کچھ تفسیر منقول ہے لیکن وہ کم ہے ان میں سے حضرت انس رضی اللہ عنہ، حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ، حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما، حضرت جابر رضی اللہ عنہ، حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ، اور ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ہیں۔

## ⑤ تفسیر ابن عباس رضی اللہ عنہما

ان سے روایت لینا اور اس میں راویوں کا اختلاف • تفسیر کے اعتبار سے سب سے زیادہ ابن عباس رضی اللہ عنہما ہیں اس لیے کہ آپ جان چکے کہ وہ ترجمان القرآن ہیں نیز ان کا زمانہ بھی موخر تھے یہاں تک کہ جب اسلام پھیل گیا لوگوں کو ان سے تفسیر حاصل کرنے کی شدید ضرورت پیش آئی نیز یہ وجہ بھی تھی کہ وہ شروا شاعت دعوت اور تبلیغ کے لیے فارغ اور الگ تھلگ تھے۔ انھیں خلافت کا مسئلہ درپیش نہ تھا اور نہ ہی سیاسی تصرف اور رعایا کے احوال کی تدبیر کی مشغولیت تھی لیکن ان کی روایت کے مختلف درجات ہیں۔

سیوطی رضی اللہ عنہ نے ”الاتقان“ میں فرمایا کہ: ”حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اتنی تفسیریں منقول ہیں جنھیں شارح نہیں کیا جاسکتا اس لیے کہ ان کی روایات کثرت کے ساتھ ہیں اور ان کی سندیں مختلف ہیں، سب سے عمدہ سند علی بن ابی طلحہ ہاشمی کی سند ہے۔ امام احمد بن حنبل رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ: ”مصر میں ایک صحیفہ تھا جس کا تعلق تفسیر کے ساتھ تھا اسے علی بن ابی طلحہ نے روایت کیا کہ اگر کوئی شخص اس کا قصد کرے مصر کا سفر کرتا تو کوئی بڑی بات نہیں تھی۔“ اسے ابو جعفر نخاس نے سند کے ساتھ بیان کیا۔

ابن حجر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ یہ نسخہ لٹ کے کاتب ابوصالح کے پاس تھا جسے انھوں نے معاد بن ابی طلحہ سے روایت کیا انھوں نے علی بن ابی طلحہ رضی اللہ عنہ سے اور انھوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے۔ امام بخاری نے بھی اپنی صحیح میں اس پر کثرت کے ساتھ اعتماد کیا جبکہ وہ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کر کے تشریح کرتے ہیں۔ ایک قوم نے کہا کہ ابن ابی طلحہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے تفسیر نہیں سنی بلکہ انھوں نے مجاہد رضی اللہ عنہ سے یا حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ سے حاصل کی۔ اس کے بعد ابن جعفر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ جب واسطہ معلوم ہو گیا اور وہ ثقہ ہیں تو اس میں کوئی نقصان نہیں۔

ابن جریر طبری، ابن ابی حاتم اور ابن المنذر نے بھی اس سے بہت کچھ نقل کیا ہے لیکن ان کے اور ابوصالح کے درمیان کئی واسطے ہیں۔

ابن عباس رضی اللہ عنہما کی عمدہ ترین سندوں میں سے قیس بن عطاء، بن السائب، سعید بن جبیر، ابن عباس کی سند بھی ہے اور یہ سند شیخین کی شرائط کے مطابق صحیح ہے اسی طرح ابن اسحاق، ابن محمد، ابن ابی محمد، مولیٰ آل زید بن ثابت، عن مکرمہ اور سعید بن جبیر، ابن عباس سے بھی ہے اسی طرح ابن اس کی سند حسن ہے اور اس میں ابن جریر اور ابن ابی حاتم نے بہت کچھ نقل کیا ہے۔

سب سے ضعیف ترین سند کلبی عن ابی صالح عن ابن عباس ہے اسی طرح مقاتل بن سلیمان کی سند ہے اور ضحاک بن مزاحم

کی سند بھی ہے جو کہ متوقع ہے کیونکہ ضحاک کی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ملاقات نہیں ہے بالجملہ امام شافعی رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ انھوں نے فرمایا کہ تفسیر میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے تقریباً سوا حدیث کے علاوہ کچھ بھی ثابت نہیں ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے علاوہ دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم کی روایت ❶ ہم آپ کو تفسیر کے بارے میں تین بڑے بڑے علماء کے بارے میں بتلاتے ہیں جو ابن عباس رضی اللہ عنہما کے علاوہ ہیں۔

① حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ ❶ یہ روئے زمین پر ہونے والے اپنے علاوہ چھ مسلمانوں میں سے چھٹے تھے اور آپ رضی اللہ عنہ کے خادم تھے آپ رضی اللہ عنہ کو جو تھے پہناتے تھے آپ رضی اللہ عنہ کے ساتھ اور آگے آگے چلتے تھے۔

اسی وجہ سے انھیں صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے ان علماء میں شمار کیا گیا جو کتاب اللہ، اس کے حکم، متشابہ، حلال و حرام کو سب سے زیادہ جاننے والے ہیں۔

”الاتقان“ میں فرمایا کہ: ”ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے تفسیر میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بھی زیادہ روایات مروی ہیں۔“

ابن جریر وغیرہ نے نقل کیا کہ انھوں نے فرمایا: ”اس ذات کی قسم جس کے علاوہ کوئی عبادت کے لائق نہیں اللہ تعالیٰ کی کوئی بھی آیت نازل نہیں ہوئی جسے میں نہ جانتا ہوں کہ وہ کس کے بارے میں اور کہاں نازل ہوئی؟ اگر مجھے پتا چل جاتا کہ کوئی شخص کتاب اللہ مجھ سے زیادہ جانتا ہے اور اس تک سفر کر کے جایا جاسکتا ہے تو میں اس کے مکان پر پہنچ جاتا۔ ان سے بہت لوگوں نے روایت کیا لیکن علماء نے نقد و جرح کر کے ان کی چھان بین کی ہے۔“

② حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ ❷ رسول اللہ رضی اللہ عنہ کے چچا کے بیٹے ہیں اور آپ رضی اللہ عنہ کی بیٹی حضرت فاطمہ الزہراء رضی اللہ عنہا کے واسطے سے آپ رضی اللہ عنہ کے داماد بھی ہیں اور آپ رضی اللہ عنہ کے بعد چوتھے خلیفہ بھی ہیں۔ آپ رضی اللہ عنہ پیدا ہوئے کچھ بڑے ہوئے اور اسلام میں داخل ہو گئے کبھی بھی کسی بت کے سامنے سجدہ ریز نہیں ہوئے۔ آپ رضی اللہ عنہ کا رسول اللہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ گہرے تعلق کا آپ رضی اللہ عنہ کی روشن دماغی، دست مہادہ اور دست علی میں گہرا اثر تھا اور اس فطرت صافیہ، ذکاوت نادرہ اور عقل موہوبہ کے کیا کہنے حتیٰ کہ حل مشکلات میں وہ ضرب المثل تھے ”کسی نے کہا کہ کوئی قضیہ ہو اور اس کے لیے کوئی ابوحسن نہ ہو؟“ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ: ”میں نے قرآن کی تفسیر جو بھی حاصل کی وہ علی بن طالب سے حاصل کی۔“ آپ کے لیے ترجمان القرآن کی یہ شہادت کافی ہے۔

لیکن حضرت علی رضی اللہ عنہ کا شیعوں کی وجہ سے اہتواء ہوا انھوں نے ان کی محبت میں اسراف اور اس کی تعین میں حد سے تجاوز کر گئے اور انھوں نے ان کی طرف ایسی ایسی باتیں منسوب کر دیں جن سے وہ بری تھے اور ان کی طرف ایسی باتیں منسوب کیں جو انھوں نے نہیں کہیں اسی وجہ سے یہ لحاظ کیا جاتا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی مرویات میں بہت سی ملائیں ہیں روایات کی چانچ پڑتال کرنے والے ماہرین نے ان کا تعاقب کیا اور صحیح اور غیر صحیح کو علیحدہ علیحدہ کر دیا۔

﴿وَلَا يُنَبِّئُكَ مِثْلُ خَبِيرٍ﴾ (الفاطر: ۱۳)

”خبر رکھنے والے کی طرح آپ کو کوئی بھی نہیں بتلائے گا۔“

③ حضرت ابی بن کعب انصاری رضی اللہ عنہ ❸ یہ بڑے بڑے قراء اور کاتبین وحی میں سے تھے اور ان لوگوں میں سے تھے جو بدر

میں حاضر ہوئے ان کے بارے میں وارد ہوا کہ کتاب اللہ کے سب سے بڑے قاری حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ تھے۔ ابو جعفر رازی نے ربیع بن انس سے انھوں نے ابو العالیہ سے اور انھوں نے ابی بن کعب سے تفسیر کا ایک بہت بڑا نسخہ روایت کیا۔ ابن جریر اور ابن حاتم رضی اللہ عنہما نے اس میں سے بہت کچھ نقل کیا اسی طرح حاکم نے مستدرک میں اور امام احمد نے مسند میں بھی بہت کچھ نقل کیا ہے۔

## ۷) تابعین میں سے مفسرین کے طبقات اور ان کی روایات پر نقد و جرح

ہم تابعین کو تین طبقات پر تقسیم کر سکتے ہیں۔ ① طبقہ اہل مکہ ② طبقہ اہل مدینہ ③ طبقہ اہل عراق۔

① طبقہ اہل مکہ: تابعین میں سے اہل مکہ کا طبقہ تفسیر کو سب سے زیادہ جاننے والا تھا سیوطی رضی اللہ عنہ نے ابن تیمیہ سے نقل کیا کہ:

”سب سے زیادہ تفسیر جاننے والے اہل مکہ تھے اس لیے کہ وہ ابن عباس رضی اللہ عنہما کے شاگرد تھے جیسے مجاہد، عطاء ابن رباح، عکرمہ مولیٰ ابن عباس، سعید بن جبیر اور طاؤس رضی اللہ عنہم۔“

یہ ابن عباس رضی اللہ عنہما کے راویوں میں سے سب سے زیادہ ثقہ تھے اسی وجہ سے ان کی تفسیر پر امام شافعی اور بخاری وغیرہ مجاہد رضی اللہ عنہ جیسے اقطاب العلم اور احمد دین نے ان کی تفسیر پر اعتماد کیا۔ نووی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ: ”جب آپ کے پاس مجاہد سے تفسیر آ جائے تو آپ کو یہی کافی ہے۔“ فضیل بن میمون نے فرمایا کہ میں نے مجاہد کو فرماتے سنا کہ میں نے ابن عباس رضی اللہ عنہما کے سامنے قرآن کو تیس مرتبہ پیش کیا۔ اور انھی سے روایت ہے کہ میں نے صحیفہ کو ابن عباس رضی اللہ عنہما کے سامنے تین مرتبہ پیش کیا اس کی ہر آیت پر توقف کرتا اور اس کے بارے میں سوال کرتا کہ کس کے بارے میں نازل ہوئی اور کیسے تھی۔

ان دونوں روایتوں میں تعارض نہیں ہے کیونکہ قلیل کی خبر کثیر کی خبر کے منافی نہیں ہے یہ بھی احتمال ہے کہ تیس مرتبہ پیش کرنا اس کے ضبط، تجوید اور حسن اداء کے لیے ہوا اور تین مرتبہ اس کی تفسیر معرفت اسرار و حکم اور اس کے احکام طلب کرنے کے لیے پیش کیا ہو۔ جیسا کہ اس پر ان کا قول: ”اس کی ہر آیت پر توقف کرتا اور اس کے بارے میں سوال کرتا کہ کسی کے بارے میں اور کیسے نازل ہوئی۔“ دلالت کرتا ہے۔

عطاء رضی اللہ عنہ اور سعید رضی اللہ عنہما ان میں سے ہر ایک حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کرنے میں ثقہ اور ثبت تھا سفیان ثوری رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ: ”تفسیر چار اشخاص سے حاصل کرو! سعید بن جبیر، مجاہد، عکرمہ، اور شاک۔“ قتادہ نے فرمایا کہ: ”تابعین میں سب سے زیادہ علم والا چار لوگ تھے عطاء بن ابی رباح سب سے زیادہ مناسک کو جانتے تھے، سعید بن جبیر سب سے زیادہ تفسیر جانتے تھے۔ امام ابو حنیفہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں نے عطاء سے افضل کسی آدمی سے ملاقات نہیں کی۔

ابن عباس رضی اللہ عنہما کے مولیٰ عکرمہ رضی اللہ عنہ ان کے بارے میں امام شافعی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ: ”عکرمہ سے بڑھ کر کتاب اللہ کو جاننے والا کوئی بھی نہیں بچا۔ اور عکرمہ نے فرمایا کہ ابن عباس رضی اللہ عنہما میرے پاؤں میں بیڑیاں ڈال دیتے اور مجھے قرآن دست کھاتے تھے اور فرماتے تھے میں نے دو گتوں کے درمیان جو کچھ ہے سب کی تفسیر کی۔ (شاید ان کی مراد صحف کے دو گتوں کے درمیان تھا) اور میں



تمہیں قرآن کے بارے میں کچھ بھی کہوں وہ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ہی مروی ہوگا۔  
**طاؤوس بن کیسان میمانی** • یہ علم و عمل والے افراد میں سے ہیں اور انھوں نے نبی کریم ﷺ کے تقریباً بیچاس صحابہ رضی اللہ عنہم کو پایا۔  
 اور وارد ہوا ہے کہ انھوں نے بیت اللہ شریف کا حج چالیس مرتبہ کیا۔ آپ مستجاب الدعوات تھے۔

ان کے بارے میں ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ: "میں طاؤس کو جنتی سمجھتا ہوں۔ رضی اللہ عنہما اجمعین۔  
 ان میں سے ایک زید بن اسلم رضی اللہ عنہ ہیں ان سے ان کے بیٹے عبدالرحمن اور دارالمحرت کا امام مالک  
 ۲) **طبقہ اہل مدینہ** • ابن انس رضی اللہ عنہ نے علم حاصل کیا۔

نیز ان میں سے ایک ابو العالیہ رضی اللہ عنہ بھی ہیں ان سے ربیع بن انس رضی اللہ عنہ نے علم حاصل کیا۔ اور ان میں سے ایک محمد بن کعب  
 قرظی رضی اللہ عنہ بھی ہیں جن کے بارے میں ابن عون نے فرمایا کہ میں نے قرظی سے بڑھ کر قرآن پاک کی تادیل جاننے والا عالم کوئی  
 نہیں دیکھا۔

مسروق بن اجدع یہ بہت پرہیزگار اور زاہد تھے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے صحبت یافتہ تھے ان  
 ۳) **طبقہ اہل عراق** • کے بارے میں ابن مین رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ: "یہ ثقہ ہیں ان کے بارے میں سوال نہیں کیا جائے گا۔"  
 قاضی شریح مشکل مسائل میں ان سے مشورہ کرتے تھے۔

ان کی صدق روایت اور امانت کی وجہ سے شعبی اور ابو داؤد وغیرہ ان سے روایت کرتے تھے۔  
**قنادہ بن دعامہ** • یہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے راویوں میں سے ہیں ان کے ضبط اور حفظ کی شہادت ابن سیرین رضی اللہ عنہ نے دی۔  
 ابن السیبی رضی اللہ عنہ نے ان کے بارے میں فرمایا میں نے حضرت قنادہ رضی اللہ عنہ سے بڑھ کر کوئی بھی عراقی حافظے والا نہیں پایا۔ لیکن وہ قضاء  
 و قدر میں بحث کرتے تھے اس لیے بعض لوگ ان سے روایت لینے میں تنگی محسوس کرتے تھے۔ کتب صحیحہ والے حضرات نے انھیں  
 حجت مانا ہے۔

**ابو سعید حسن بصری** • ابن سعد نے ان کے بارے میں فرمایا کہ یہ ثقہ تھے ماسون تھے عالم تھے اور طویل القدر تھے نیز فصیح و جلیل،  
 متقی و پرہیزگار تھے حتیٰ کہ ان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ سید التابیین تھے۔  
**عطاء بن ابوسلم خراسانی** • ان کی اصل بصرہ سے ہے لیکن انھوں نے خراسان میں داخل ہونے کے بعد وہیں قیام کر لیا اسی وجہ  
 سے اس کی طرف منسوب ہوئے طویل القدر علماء میں سے تھے لیکن انھیں حافظہ کی کمزوری کی شکایت تھی۔ اس لیے ان کی توثیق میں  
 اختلاف ہے۔

**مرہ ہمدانی کوئی** • ان کی کثرت عبادت کی وجہ سے انھیں "مرۃ الطیب" اور "مرۃ الخیر" کہا جاتا تھا انھوں نے حضرت ابی بن  
 کعب اور حضرت عمر بن الخطاب وغیرہ صحابہ سے علم حاصل کیا اور ان سے شعبی نے روایت کی۔  
 یہ تابعین میں سے بڑے بڑے مفسرین ہیں ان کی آراء اور علوم سے قوت حاصل کی گئی ہے اس لیے کہ انھوں نے صحابہ  
 کرام رضی اللہ عنہم سے علم حاصل کیا۔

اور ان سے تبع تابعین نے علم حاصل کیا اور اسی طرح سلسلہ چلتے چلتے اللہ تعالیٰ کا دین، اس کی کتاب، اس کے علوم،



معارف سلیمہ کاملہ بطریق ملتقی و تلقین نسل در نسل ہم تک پہنچے جو اللہ تعالیٰ کے قول:

﴿إِنَّا نَحْنُ نُحَفَظُوكُمْ وَإِنَّا لَكُمْ كَافٍ حَفِظُونَ﴾ (المجم: ۹)

”بے شک ہم نے بھی قرآن پاک کو نازل کیا اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں۔“

نیز آپ ﷺ نے فرمایا کہ اس علم کو بعد میں آنے والے تمام لوگوں میں سے ان کے عادل لوگ نقل کریں گے۔ وہ غلو کرنے والوں کی تحریف اہل باطل کے طریقے اور جاہلین کی تاویل اس سے دور کریں گے۔

**تابعین کی مرویات کی چھان بین** • تابعین سے مرویات ہیں چند اہم اعتبارات ملحوظ ہوتی ہیں جو اس میں طعن کو بھڑکاتی ہیں ان کی چھان بین کا تقاضا کرتی ہیں۔

① انھوں نے نبوت کا دور نہیں دیکھا اور نہ ہی رسول اللہ ﷺ کے انوار سے متشرف ہوئے ہیں لہذا ظن غالب یہ ہے کہ ان سے قرآن کی جو تفسیر مروی ہے وہ ان کی اپنی رائے سے ہی ہوگی اس لیے ان میں مرفوع کی قوت نہیں ہوگی۔

② ان میں صحیح اسناد نادر ہیں۔

③ ان کا اسراخیلیات اور ایسی خرافات پر مشتمل ہونا بعض اوقات ایرانی زنادقہ کی طرف سے شامل ہو جاتی ہیں یا بعض اہل کتاب میں سے ہونے والے مسلمانوں کی طرف سے آ جاتی ہیں خواہ ان میں حسن نیت ہو یا سوء نیت ہو۔

## روایت بالمأثور کا ضعف اور اس کے اسباب

ہم جان چکے کہ روایت بالمأثور تفسیر قرآن بالقرآن، تفسیر قرآن بالسنۃ اور تفسیر قرآن بالموقوف علی الصحابہ اور ایک روایت کے مطابق تفسیر قرآن بالموقوف علی التابعین پر مشتمل ہوتی ہے۔

تفسیر (یعنی قرآن کے ایک حصہ کی دوسرے حصے سے تفسیر کرنا) بعض القرآن، بعض اور تفسیر القرآن (قرآن پاک کی تفسیر سنت صحیحہ کے ساتھ جو نبی کریم ﷺ تک مرفوع ہو) بالسنۃ الصحیحہ المرفوۃ الی النبی ﷺ کی وجاہت اور قبول ہونے میں کسی کا اختلاف نہیں ہے اور قرآن پاک کی تفسیر ایسی چیز سے کرنا جو صحابہ اور تابعین کی طرف منسوب ہوں اگر ان میں ضعف پیدا ہو جائے تو اس کی کئی اقسام ہیں۔

① اعدائے اسلام جیسے یہود اور ایرانیوں میں زندیقیوں کی (اس میں) ملاوٹ ہے۔ اس لیے کہ وہ چاہتے ہیں کہ ملاوٹ اور خود ساختگی کے ذریعے اس دین متین کو گرا دیں کیونکہ لڑائی اور طاقات کے ذریعے انتقام لینے کے چیلے کر کے تھک چکے تھے نیز ذلیل و جت سے بھی تنگ آ چکے تھے۔

② حد سے تجاوز کرنے والوں نے اپنے تجاوز کی ترویج کے لیے اس میں جو چیزیں ملا دی ہیں جیسے شیعان علی جو حد سے تجاوز کرنے والے ہیں انھوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف ایسی چیزیں منسوب کر دی ہیں کہ وہ ان سے بری ہیں اسی طرح وہ طفلی جنھوں نے عباسیوں کی رسی میں آگ لگائی اور ابن عباس رضی اللہ عنہما کی طرف ایسی باتیں منسوب کر دیں جن کی نسبت ان کی طرف صحیح نہیں

اس کی وجہ ان کی چابکدستی اور دنیا کی خواہش تھی۔

④ صحیح کا غیر صحیح کے ساتھ خلط ہو جانا: بہت سے اقوال ہیں جو صحابہ یا تابعین کی طرف بغیر سند اور بغیر تخریج کے منسوب ہوئی ہیں۔ جو حق کے باطل کے ساتھ التباس کا باعث ہو سکتی ہیں۔ مزید یہ کہ جو رائے رکھتا ہو وہ ان پر سند کے ذکر کے بغیر ہی اعتماد کر لیتے تھے پھر ان کے بعد والے انھیں اس اعتبار پر نقل کر دیتے کہ اس کی کوئی دلیل ہے اور وہ اصل روایت کی تلاش میں اپنے آپ کو تکلیف نہیں دیتے تھے اور نہ ہی اس شخص کی بحث کرتے تھے جن کی طرف یہ قول منسوب ہے۔

⑤ یہ روایات اسرائیلیات سے بھری پڑی ہیں اور اکثر وہ خرافات ہیں جن کے بطلان پر دلیل قائم ہے اور ان میں سے بعض چیزیں ایسی بھی ہیں جن کا تعلق عقائد کے ساتھ ہے جن میں ظن سے کچھ لینا جائز نہیں اور نہ ہی ان میں اخباراً حاد کی روایت سے کچھ لینا جائز ہے۔ بلکہ ان میں قطعی دلیل کا ہونا ضروری ہے جیسا کہ وہ روایات جو قیامت کی علامات، اس کی ہولناکی اور آخرت کے احوال کے بارے میں روئنا ہوئی ہیں جو یہ بتلاتی ہیں کہ یہ اسلام کے عقائد ہیں۔

⑥ وہ امور جو اہل کتاب کے پاس موجود کتب سابقہ سے صحیح طور پر منقول ہوئی ہیں جیسے توراہ اور انجیل۔ رسول اللہ ﷺ نے ان میں توقف کا حکم دیا کہ ہم ان کی تصدیق نہ کریں کیونکہ ہو سکتا ہے کہ انھوں نے ان کتابوں میں تحریف کر دی ہو اور ان کی تکذیب بھی نہ کریں۔ اس لیے کہ ہو سکتا ہے کہ انھوں نے اسے محفوظ رکھا ہو۔ ان کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ: ﴿وَأُولَٰئِكَ نَبِئْنَا﴾

﴿الکتاب﴾ (آل عمران: ۲۳) ”جنہیں کتاب کا کچھ حصہ دیا گیا“

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ: ”تفسیر میں اختلاف کی دو اقسام ہیں ایک وہ ہے جن کی بنیاد محض نقل ہے اور دوسری وہ قسم ہے جو اس کے علاوہ کسی اور ذریعے سے معلوم ہو اور منقول یا تو معصوم سے منقول ہوگا یا غیر معصوم سے نیز بعض وہ ہیں جن کے صحیح اور غیر صحیح کی معرفت ناممکن ہوگی اور بعض وہ ہیں جن کے صحیح یا غیر صحیح کی معرفت ناممکن ہوگی اور یہ قسم (یعنی جس کے صحیح اور ضعیف کو پہچاننا ناممکن ہو) اس میں عمومی طور پر کوئی فائدہ نہیں ہوتا اور ان کی معرفت کی بھی ہمیں ضرورت نہیں اس کی مثال جیسے اصحاب کہف کے کتے کے رنگ میں اختلاف اور اس کے نام میں اختلاف، گائے کے اس حصے میں اختلاف جس پر مقتول کو مارا گیا اور حضرت نوح علیہ السلام کی کشتی کی مقدار اور اس کی لکڑی میں اختلاف، اس لڑکے کے نام میں اختلاف جسے حضرت خضر علیہ السلام نے قتل کیا تھا وغیرہ وغیرہ ان امور کے علم کا طریقہ صرف نقل ہے اب ان میں سے جو چیزیں نبی کریم ﷺ ہم سے نقل صحیح کے ساتھ منقول ہوں انھیں قبول کیا جائے گا اور جو ایسی نہ ہوں بلکہ اہل کتاب جیسے کعب اور وہب وغیرہ ان میں توقف کیا جائے گا نہ تصدیق کی جائے گی نہ تکذیب۔ اس لیے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ: ”جب تمہیں اہل کتاب کوئی حدیث بیان کریں تو ان کی تصدیق کرو اور نہ ہی تکذیب“ اسی طرح جو بعض تابعین سے جو منقول ہے اگرچہ وہ ذکر نہ کریں کہ انھوں نے اسے اہل کتاب سے لیا ہے۔ اور جب تابعین میں اختلاف ہو جائے تو ان کے اقوال ایک دوسرے پر حجت نہیں ہو سکتے۔ اور جو چیزیں صحابہ رضی اللہ عنہم سے صحیح طور پر منقول ہیں ان کی طرف دل بنسبت ان کے جو تابعین سے منقول ہیں مطمئن ہوتا ہے اس لیے کہ ان کے بارے میں احتمال ہے کہ انھوں نے اسے نبی کریم ﷺ سے یا کسی ایسی شخص سے سنا ہوگا جس نے نبی کریم ﷺ سے سنا ہو۔ نیز اس لیے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم کا اہل کتاب سے نقل کرنا بنسبت تابعین کے کم ہے اور جب صحابی اسے قطعی طور پر کہہ رہا ہو تو کیسے کہا جاسکتا ہے کہ انھوں نے اہل کتاب سے لیا حالانکہ ان کی تصدیق

## مسائل العرفان فی علوم القرآن: جلد ①

سے نہیں منع کیا گیا۔ اور وہ قسم جس کے صحیح کی معرفت ممکن ہو وہ بہت زیادہ ہیں واللہ الحمد۔ اگرچہ امام احمد رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ: ”تین چیزوں کی کوئی اصل نہیں“ تفسیر، جنگیں اور غزوات“ اس لیے کہ ان میں اکثر مرسل روایتیں ہوتی ہیں۔“ اور وہ قسم جس کو استدلال سے معلوم کیا جاسکتا ہے نقل سے نہیں اس میں خطا اکثر دوجہ سے ہوتی ہے اور یہ دو ذمہیں صحابہ، تابعین اور تبع تابعین کی تفسیر کے بعد پیدا ہوتی ہیں... اس کے بعد علامہ ابن تیمیہ رضی اللہ عنہ نے ان جہتوں کو ذکر کیا جو خطا کا باعث بنتی ہیں۔

① قرآن پاک کے الفاظ کو ایسے معانی پر محمول کرنا جن کا وہ اعتقاد رکھتے ہیں تاکہ اس کے ذریعے وہ ان کی تائید کریں۔

② محض لغت عربیہ کی دلالت کے ساتھ تفسیر کرنا اور اس میں قرآن کے مستطعم یعنی اللہ تعالیٰ کی رعایت نہ کرنا اور نہ ہی جس پر نازل ہوا ہے اس کی اور نہ ہی اس کے مخاطبین کی رعایت کرنا۔

بعض حضرات نے فرمایا کہ: ”ابن تیمیہ رضی اللہ عنہ کا کلام امام احمد کے قول کو نہیں توڑتا اس لیے کہ ان کی مراد یہ نہیں تھی کہ ان تین چیزوں میں صحیح روایت بالکل بھی نہیں ہوتی بلکہ ان کی مراد یہ ہے کہ ان میں اکثر ایسا ہوتا ہے کہ صحیح متصل سند ثابت نہیں ہوتی اور جن کی سند صحیحی تک ثابت ہوتی ہے تو بھی مرفوع سند بہت ہی کم ہوتی کہ اس سے استدلال کیا جاسکے۔“

آگے فرماتے ہیں کہ: ”پھر تفسیر مآثور میں اکثر روایات قرآن کے لیے رکاوٹ ہیں اور مشغول کرنے والی ہیں تاکہ یہ اس کے بلند مقاصد جو نفوس کا تزکیہ کرنے والے اور دونوں کو سوز کرنے والے ہیں سے غافل کر کے دوسری طرف مشغول کر دیں کیونکہ تفسیر مآثور دالوں کو کثرت روایات جن کی سند یا موضوع کے اعتبار سے کوئی قیمت نہیں ہوتی مقاصد قرآن سے مشغول کر دیتی ہیں... الخ اس موضوع میں انصاف کے کلمات یہ ہیں کہ تفسیر مآثور کی دو اقسام ہیں:

① جس کی صحت اور مقبولیت پر بھر پور دلائل ہیں اسے رد کرنا کسی کے لیے مناسب نہیں اور اس کی طرف توجہی اور اس سے غفلت کرنا بھی جائز نہیں اور یہ اچھا نہیں لگتا کہ ہم اسے قرآن کی ہدایت سے ہٹانے والی چیزوں میں شمار کریں بلکہ اس کے برعکس یہ قرآن سے ہدایت پانے میں قوی ترین عامل ہے۔

② جو صحیح نہ ہو گزشتہ بالا اسباب وغیرہ کی وجہ سے اسے رد کرنا واجب ہے اور اسے قبول کرنا اور اس میں مشغول ہونا جائز نہیں۔ سوائے اس کے کہ اس کی جانچ پڑتال ہو جائے اور اس کی بے راہ روی اور غلطی کی وضاحت کر دی جائے تاکہ اس سے کوئی دھوکہ نہ کھا سکے ہوشیار مفسرین کا ہمیشہ سے طریقہ اسی طرح چلا آ رہا ہے کہ وہ جو کچھ نقل کرتے ہیں اس کی صحت کی جانچ پڑتال کرتے ہیں اور اس میں سے باطل یا ضعیف کی وضاحت کرتے ہیں اور اس میں کسی قسم کا کوئی خوف یا ڈر نہیں کرتے۔ ہو سکتا ہے کہ انھوں نے تفسیر مآثور کے رد میں اپنے قول کو مطلق اس لیے ذکر کیا ہو کہ اس سے ان کا ارادہ مباہلہ ہو جیسا کہ آپ نے امام احمد بن حنبل کے الفاظ کی توجیہ میں جان لیا۔ اور ان لوگوں کا یہ عذر بھی جان لیا کہ اس میں سے صحیح بہت ہی قلیل نادر اور بہت ہی تھوڑا ہے یہاں تک کہ امام شافعی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ: ”حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے تفسیر میں تقریباً سو آیات کے علاوہ کچھ بھی ثابت نہیں۔“ حالانکہ ان سے روایات کثرت کے ساتھ ہیں۔

اور ابن خلدون نے اشارہ کیا کہ عرب کتاب و علم والے نہیں تھے بلکہ ان پر بدویت غالب تھی جب انھیں اسباب مکونہ، مخلوق کی آفرینش اور موجودات کے اسرار میں کسی ایسی چیز کی معرفت کی رغبت ہوتی جس کی نفوس بشریہ رغبت کرتے ہیں تو وہ اس کے

بارے میں اپنے سے پہلے والے اہل کتاب سے جا کر پوچھتے اور ان سے استفادہ کرتے تھے... آگے فرماتے ہیں ان کی مثال کعب الاحبار، وہب بن منبہ اور عبد اللہ بن سلام ہیں ان کی منقولات سے تفسیریں بھری پڑی ہیں اور انھیں تعلقی بالقبول بھی حاصل ہے اس لیے کہ ان کا ایک اعلیٰ مقام ہے لیکن راسخین فی العلم نے صحت کی چھان بین کی اور جن کی صحت کے دلائل پورے نہیں ہوئے ان کی نشاندہی کی۔

**تنبیہ:** ابن خلدون اور ابن تیمیہ وغیرہ کی عبارت سے کوئی ایسی چیز نہ سمجھ بیٹھنا جس سے آپ ان تین بڑے بڑے علماء کے بارے میں چہی گوئیاں کرنے لگ جائیں بہت سے علاقوں والے اور اس زمانے کے بڑے بڑے لکھاری اس گمان کی وجہ سے پھسل گئے تھے کہ حضرت عبد اللہ بن سلام رضی اللہ عنہما جو ایک جلیل القدر صحابی ہیں کو عبد اللہ بن سبا یہودی خبیث کی لڑی میں پرودیا جس نے اسلام کا اظہار کیا اور پھر اسلام کے خلاف بدترین کمزور فریب اور سازش کی اور حضرت علی رضی اللہ عنہما کے گردہ میں شامل ہو گیا اور دعویٰ کیا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت علی رضی اللہ عنہما میں حلول کر لیا اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہما کو برا کہا۔ اور حقیقت یہ ہے کہ ہمارے یہ تینوں حضرات عادل اور ثقہ تھے۔ ابن سلام رضی اللہ عنہما کے بارے میں تو آپ کو اتنی بات کافی ہے کہ وہ صحابی ہیں بلکہ بہترین صحابہ میں سے ہیں اور ان صحابہ میں سے ہیں جنہیں جنت کی خوشخبری دی گئی۔

ترمذی میں روایت ہے کہ حضرت معاذ رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے سنا کہ وہ جنت میں داخل ہونے والوں میں سے دسویں ہوں گے۔ اور انہی کے بارے میں آیت

﴿وَسَيُهَيِّجُ شَاهِدٌ مِّنْ بَنِي إِسْرَائِيلَ عَلَىٰ مَثَلِهِ﴾ (الاحقاف: ۱۰)

”اور بنی اسرائیل میں سے ایک گواہ نے ساری طرح کی کتاب کے بارے میں گواہی دی۔“  
انہی کے بارے میں نازل ہوئی نیز آیت:

﴿وَمَنْ عِنْدَهُ عِلْمٌ الْكِتَابِ﴾ (الرعد: ۴۳)

”اور جس کے پاس کتاب کا علم ہے۔“  
جیسا کہ بعض روایات میں آیا ہے۔

جبکہ حضرت وہب بن منبہ رضی اللہ عنہما ایک ثقہ تابعی اور وسیع العلم تھے انھوں نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہما سے بہت زیادہ روایتیں نقل کی ہیں وہ اپنی عبادت گزار اور نیکی میں اس درجہ تک تھے کہ انھوں نے بیس سال تک عشاء کے وضو سے فجر کی نماز پڑھی۔ اللہ تعالیٰ ان سے راضی ہو۔

اور حضرت کعب رضی اللہ عنہما ایک جلیل القدر تابعی تھے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہما کی خلافت میں مسلمان ہوئے آپ کے لیے اتنا کافی ہے کہ صحابہ رضی اللہ عنہما نے ان سے علم حاصل کیا اور اسی طرح انھوں نے بھی صحابہ رضی اللہ عنہما سے علم حاصل کیا تا بعین کی ایک جماعت نے بھی ان سے مرسل روایتیں لی ہیں۔ بخاری میں بھی ان کی کچھ روایات ہیں۔

لیکن اس مقام پر انتہائی ضروری ہے کہ ہم فرق کریں کہ ان کے بارے میں کیا کہا صحیح ہے اور ان سے نقل ہونے والی کون

کی روایات صحیح ہیں ان کے بارے میں جو کہنا صحیح ہے وہ "ثقف" ہے اور اس کا پیمانہ وہی ہے جو ہم نے بیان کر دیا اور ان سے نقل ہونے والی روایات بعض صحیح ہیں اور بعض غیر صحیح ہیں لیکن جو صحیح نہیں ہیں ان کی عدم صحت کی علت یہ نہ بیان کی جائے کہ وہ متہم ہیں یا مجرد ہیں کیونکہ آپ جان چکے ہیں کہ وہ کون ہیں؟ علت دو امور میں سے ایک ہوگی۔

① ان سے نقل کرنے والے راویوں کی سند میں کچھ راوی ایسے ہوتے ہیں جن کی عدالت یا ضبط میں کوئی خرابی ہوتی ہے اس لیے ان سے نقل کرنے والے راویوں کے سلسلے کے ایک ایک شخص کے بارے میں غور و فکر کرنا ضروری ہے اور ہماری بھی جرح و تعدیل میں ایک کتاب ہے جو اس مقصود کو پورا کر سکتی ہے صرف اتنا اعتماد کافی نہیں ہوگا کہ اس کا ذکر بڑی کتاب میں آ گیا ہے جیسے تفسیر ابن جریر وغیرہ کیونکہ ابن جریر وغیرہ بھی غیر صحیح چیزیں ذکر کر دیتے ہیں اور ان کی سندیں بیان کر دیتے ہیں پھر سند کے راویوں میں سے مجرد یا عادل راویوں کی نشاندہی نہیں کرتے اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ اس زمانے کے لوگوں کو راویوں کے احوال معلوم ہوتے تھے وہ اس معرفت کی روشنی میں فیصلہ کر سکتے تھے کہ خبر کو رد کیا جائے گا یا نہیں جبکہ اس زمانے میں ہم نے اس ترازو کو چھوڑ دیا اور ہم اسناد اور رجال کے احوال جاننے کا اہتمام نہیں کرتے۔

لہذا ملامت ہمیں ہونی چاہیے انھیں نہیں جو بڑے بڑے علماء ہیں ہمیں یہ گنجائش نہیں کہ اس مقام پر جرح و تعدیل والی کتابوں سے رہنمائی نہ لیں۔

② یہ بھی ہو سکتا ہے کہ انھوں نے کوئی چیز روایت کی ہو اس بناء پر کہ یہ اسرائیلیات میں سے ہیں اور ان کے شاگردوں نے اسے اسلامیات میں سے سمجھ کر قبول کر لیا ہو اس لیے ان روایات میں غور و فکر کرنا ضروری ہے اگر یہ اسلام ان کی تائید کرتا ہو تو ہم انھیں قبول کریں گے اور اگر اسلام ان کی تردید کرتا ہو تو ہم بھی ان کی تردید کریں گے اور اگر اسلام ان پر سکوت کرتا ہو تو ہم بھی ان پر سکوت کریں گے اس لیے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ:

"جب تمہیں اہل کتاب کوئی حدیث بیان کریں تو نہ ان کی تصدیق کرو نہ تکذیب۔"

بخاری میں اس طرح ہے اور مسند اور بزار میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے کہ اہل کتاب سے کوئی چیز نہ پوچھو کیونکہ وہ تمہاری رہنمائی ہرگز نہ کریں گے تحقیق وہ گمراہ ہو چکے ہیں اور تم یا تو حق کی تکذیب کرو گے یا باطل کی تصدیق۔ اللہ کی قسم! "مگر موسیٰ علیہ السلام تمہارے درمیان ہوتے تو بھی ان کے لیے میری اتباع کے علاوہ کچھ بھی جائز نہ ہوتا۔"

اس حدیث کا سبب یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ کو معلوم ہوا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہود سے توارۃ کی کوئی چیز لکھی اس پر آپ ﷺ ناراض ہوئے اور یہ بات ارشاد فرمائی۔

## تفسیر ماثور کی تدوین اور اس میں تالیف کی گئی کتابوں کی خصوصیات

تبع تابعین کا دور آیا اور اس میں کئی تفاسیر لکھی گئیں صحابہ اور تابعین کے اقوال جمع کیے گئے جیسے تفسیر سفیان بن عیینہ، وکیع بن الجراح، شعبہ بن الحجاج، یزید بن ہارون، عبدالرزاق، آدم بن ابی ایاس، اسحاق بن راہویہ، روح بن عبادہ، عبد بن حمید، ابو بکر بن

ابن شیبہ، علی بن ابی طلحہ بخاری اور دیگر حضرات۔

ان کے بعد ابن جریر طبری نے اپنی مشہور کتاب تالیف کی جو تفاسیر میں سب سے زیادہ طویل القدر ہے اس کے بعد ابن ابی حاتم، ابن ماجہ، حاکم، ابن مردودہ اور ابن حبان وغیرہ نے تفسیریں لکھیں۔

ان حضرات کی تفاسیر میں صرف وہی کچھ تھا جو صحابہ، تابعین اور تبع تابعین کی طرف مستند تھا سوائے ابن جریر کے کہ انھوں نے اقوال کی اور توجیہ اور ترجیح یعنی ایک کو دوسرے پر ترجیح وغیرہ دیے اور اعراب کا ذکر اور استنباط کرنے میں سرگرم ہو گئے۔

تفسیر ابن جریر • ابن جریر، ابو جعفر محمد بن جریر بن یزید طبری ہیں جو ۲۲۴ھ کو پیدا ہوئے اور انھوں نے ۳۱۰ھ کو وفات پائی وہ علم و عمل میں اپنے زمانے کے یکتا اپنے وقت کے منفرد علم و عمل، کتاب اللہ کا حفظ، اس کے معانی کی حقیقت تک رسائی، ناخ و منسوخ آیات، روایت کی صحیح اور کمزور سندوں اور صحابہ و تابعین کے احوال کا احاطہ کرنے میں اپنے زمانے میں منفرد اور اپنے وقت میں یکتا تھے۔

اسی وجہ سے ان کی تفسیر تفاسیر بالماثور میں سب سے زیادہ طویل القدر سب سے صحیح اور سب سے جامع تفسیر تھی اس لیے کہ اس میں صحابہ اور تابعین کے اقوال وارد ہوئے ہیں۔ نیز اس میں انھوں نے اقوال کی ترجیح بیان کی اور ایک دوسرے کو ترجیح دی اور اس میں بہت زیادہ اعراب اور بہت زیادہ احکام کا استنباط ذکر کیا۔ عارفین اس کے شاہد ہیں کہ تفاسیر میں اس کی مثال کوئی بھی نہیں ہے۔

نودی و رشیدی نے اپنی کتاب ”التہذیب“ میں فرمایا کہ: ”تفسیر میں ابن جریر کی طرح کسی نے بھی کوئی کتاب تصنیف نہیں کی ابو حامد اسرافکنی جو امام شافعی کے استاد ہیں فرماتے ہیں کہ: ”اگر کوئی آدی تفسیر ابن جریر کو حاصل کرنے کے لیے چین کا سفر بھی کرے تو کوئی بڑی بات نہیں۔ ان کی فوقیت یہ ہے کہ انھوں نے سندوں کو واضح کیا، بعید کو قریب کیا اور ایسی چیزیں جمع کی ہیں جو کسی اور نے نہیں کیں لیکن بعض اوقات وہ غیر صحیح سندوں کے ساتھ احادیث بیان کرتے ہیں ان کی عدم صحت پر تنبیہ نہیں کرتے ہیں اور ہم نے کہا کہ اس میں ان کا عذر یہ تھا کہ انھوں نے ان سندوں کو ایک ایسے زمانے میں ذکر کیا جس میں لوگ تمہیہ کیے بغیر ہی سند کا حال بخوبی جانتے تھے اور یہ تفسیر آج بھی موجود ہے اور مطبوع و منشور ہے اور اکثر مفسرین کی بنیاد یہی تفسیر ہے۔“

تفسیر ابوللیث سمرقندی؟ یہ بھی تفسیر بالماثور ہے اس میں انھوں نے صحابہ اور تابعین کے بہت زیادہ اقوال ذکر کیے ہیں لیکن سندوں کو ذکر نہیں کیا یہ دو جلدوں میں لکھی ہوئی ہے اور مکتبہ الازہر میں موجود ہے۔

الدر المنثور فی التفسیر بالماثور؟ یہ امام جلال الدین سیوطی رشیدی کی تفسیر ہے وہ اس کے مقدمہ میں فرماتے ہیں کہ انھوں نے اسے کتاب ”ترجمان القرآن“ سے شخص کیا ہے اور اس تفسیر کی سند رسول اللہ ﷺ تک ہے اور یہ مصر میں مطبوع ہے انھوں نے اپنی کتاب ”الاتقان“ میں ذکر کیا کہ انھوں نے ایک ایسی تفسیر کو شروع کیا جو ان تمام چیزوں کو جامع ہو جن کی ضرورت ہوتی ہے یعنی تفاسیر منقولہ، اقوال معقولہ، استنباط، اشارات، اعراب، لغات، بلاغت کے نکات اور بدلے کے محاسن کو جامع ہو۔

اور اس کا نام ”مجمع البحرین و مطلع البدرین“ رکھا اور ذکر کیا کہ انھوں نے ”الاتقان“ کو اس کے مقدمہ کے طور پر ذکر کیا اور کتاب ”الاتقان“ کے آخر میں تفسیر ماثور کا ایک اچھا سا حصہ ذکر کیا جو سورۃ الفاتحہ کے شروع سے سورۃ الناس کے آخر تک نبی کریم ﷺ



تک مرفوع ہے۔

**تفسیر ابن کثیر** ابن کثیر عماد الدین ابو الفداء اسماعیل بن الخطیب ابو الحنفیہ قرشی دمشقی ہیں جو ۵۰۷ھ میں پیدا ہوئے اور ۵۷۳ھ کو وفات پائی۔ ان کی یہ تفسیر تفسیر البالمآثور میں صحیح ترین تفسیر ہے اگرچہ سب سے زیادہ صحیح نہیں ہے اس میں انھوں نے نبی کریم ﷺ کبار صحابہ اور تابعین سے نقل کیا اور مطبوعہ المنار (مصر) نے اسے نوحوں میں نقل کیا۔ اس کے ساتھ ذیل کے صفحات میں تفسیر بنوی ہے جس کا ذکر آ رہا ہے اور آخر میں کتاب فضائل القرآن ہے جسے اس کا تہہ سمجھا جاتا ہے۔

**تفسیر بقی بن مخلد** امام سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے مفسرین کے طبقات میں ذکر کیا کہ بقی بن مخلد بن یزید بن عبدالرحمن اندلسی قرطبی طرف سفر کیا اور حجاز میں، مصر اور بغداد میں بڑے بڑے اکابرین سے ملے اور امام احمد بن حنبل سے بھی سماع کیا اور کوفہ میں ابو بکر بن ابی شیبہ سے بھی سماع کیا اور مصر میں یحییٰ بن کبیر سے اور حجاز میں ابو مصعب زہری سے اور دمشق میں وشمام بن عمار سے سماع کیا آپ کے ۲۸۴ شاگرد تھے۔ آپ امام، زاہد، روزے رکھنے والے، سچے، مستجاب الدعوات، قلیل الملش اور علم کے سمندر تھے ان جیسی سند کسی کی بھی نہیں تھی نہ حدیث میں اور نہ ہی تفسیر میں۔

ابن حزم نے فرمایا کہ یہ بات قطعی ہے کہ اسلام میں ان جیسی تفسیر نہیں لکھی گئی نہ ابن جریر نے نہ کسی اور نے۔ آپ رحمۃ اللہ علیہ ۲۰۲ھ کو پیدا ہوئے ان کی تفسیر کے بارے میں بڑا افسوس ہے کہ جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ یہ لکھی ہوئی باقی نہ رہی اور جیسے تفسیر ابن جریر نے دیکھی کامیابی حاصل کی یہ کامیابی حاصل نہ کر سکی۔

و کف فی الخلد ابھی من عروس ولكن للعروس الدهر ساعد

”کتنی ہیں جو پردہ میں ہیں اور دلہن سے بھی زیادہ خوبصورت ہیں۔ لیکن دلہن کی زمانہ تائید کرتا ہے۔“

**⑥ اسباب النزول للواحدی** یہ ابو الحسن علی بن احمد واحدی نینسا پوری ہیں انھوں نے اپنی تفسیر میں تفسیر مآثور کے اسباب نزول پر اکتفاء کیا اور تفسیر کی یہ نوع ایسی ہے کہ اس میں تاویل کی گنجائش نہیں اور یہ اس موضوع میں سب سے بڑی تفسیر ہے اگرچہ اس کا حجم متوسط ہے۔

**⑧ النسخ والمنسوخ لابن جعفر الخاس** یہ ایک نفیس کتاب ہے اس میں اس کے مؤلف نے ناخ و منسوخ کے ساتھ ذکر کیے اور نسخ میں جو بھی کہا گیا سب کو پوری طرح ذکر کیا اگرچہ وہ ان کے نزدیک صحیح نہ بھی ہوں اور اس نوع میں بھی رائے کی گنجائش نہیں بلکہ اس کا ایک ہی راستہ ہے اور وہ روایت ہے اور اسے اس موقع پر تفسیر مآثور میں شمار کیا جس میں کئی طرح کا توسع ہے جیسا کہ مخفی نہیں ہے۔

**قرن اول کے بعد مفسرین کی سندیں** تفسیر البالمآثور کی کتابوں کا ایک بہت بڑا مجموعہ تھا جن کا احاطہ کرنا ہمارے بس میں نہیں اور نہ ہی ہم ان تمام تالیفات کے ناموں کا

احاطہ کر سکتے ہیں اور نہ ہی اس میں لکھی گئی تالیفات کے طریقے کا احاطہ کر سکتے ہیں صرف اتنا کر سکتے ہیں کہ قرن اولیٰ کے بعد مفسرین کی سندوں کے بارے میں اجمالی قول کو ذکر کر سکتے ہیں۔

پہلی صدی میں جن لوگوں نے تفسیر بالمآثور میں کتابیں تالیف کیں اور تمام سندوں کو پورا ذکر کرنے کا التزام کیا ان لوگوں کے زمانے کے بعد ایک قوم آئی اور انھوں نے تفسیر میں تصنیف کی اور سندوں کو مختصر کیا اور اقوال کو ان کے قائلین کی طرف منسوب نہیں کیا جس کی وجہ سے صحیح اور غیر صحیح میں التباس واقع ہو گیا ان کتب میں نظر ڈالنے والا یہ سمجھتا تھا کہ یہ سب کی سب صحیح ہیں اس وقت یہ اسرائیلیات اور قصص سے اتنی بھری ہوئی تھیں کہ ان میں تیز نہیں ہو سکتی تھی گویا کہ ان سب کو حق سمجھا جاتا تھا اسی وجہ سے ان کی روایات جرح و تعدیل کا نشانہ نہیں اگر ہر زمانے میں محققین حق کے احقاق اور باطل کے کمر توڑنے کے لیے کمر بستہ نہ ہوتے تو نشانات مٹ جاتے اور جاہل قائل ایک ہو جاتے۔ اور یہ اسلام اور مسلمانوں پر ظن کا بے حساب سبب بن جاتے انھوں نے قصص الانبیاء، مخلوق کی آفرینش، زلزوں، یا جوج ماجوج، کنوؤں میں گرمیوں میں پانی ٹھنڈا اور سردیوں میں گرم ہونے کے بارے میں ایسی باتیں ذکر کیں کہ شرم کی وجہ سے پیشانی شرباب ہو جائے۔ اور ایسی چیزیں کہ جن کے ساتھ علمی حقائق کبھی بھی متفق نہیں ہو سکتے کاش کہ یہ حضرات ان کی من گھڑت چیزوں پر متبہ کر دیتے اگر وہ کر دیتے تو معاملہ آسان ہو جاتا لیکن انھوں نے سند کو ذکر نہیں کیا جیسا کہ پہلے لوگوں نے ذکر کیا کہ اس پر مطلع ہونے والا جرح و تعدیل کی کتب کی طرف رجوع کر کے ان کی جانچ پڑتال کر سکتے پھر انھوں نے اپنے آپ کو سند پر حکم لگانے کا مکلف ہی نہیں بنایا اس لیے کہ ان کا محاکمہ کتب جرح و تعدیل میں ہو چکا۔

بعض محققین نے مختلف اقوال کا سلسلہ جاری رکھنے کا اہتمام کیا حتیٰ کہ انھوں نے ﴿عَنِ الْمَعْشُورِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّالِّينَ﴾ آیتوں ﴿الفتح: ۷﴾ کے بارے میں تقریباً دس اقوال ذکر کیے ہیں لیکن کثرت نقول کے شوق نے انھیں تفسیر مقبول پر اقتصار کرنے سے دور کر دیا۔

اسی وجہ سے ہم ملاحظہ کرتے ہیں کہ ہر وہ شخص جو کسی فن میں ماہر ہوتا ہے وہ اکثر اپنی تفسیر میں اسی فن پر اکتفاء کرتا ہے جس میں وہ ماہر ہوتا ہے چنانچہ علوم عقلیہ کے ماہر جیسے فخر رازی نے اپنی تفسیر میں حکماء اور فلاسفہ کے اقوال پر بحث مباحثہ کرنے اور ان کے شبہات اور ان کی تردید کو اپنے ذمے لیا اور فقہ کے ماہر جیسے قرطبی ریڑھانے فروع فقہیہ کے دلائل کی پختگی اور مخالفین کے رد کا شوق ظاہر کیا اور نحو کے ماہر جیسے زجاج اور واحدی نے "البسیط" میں اور ابو حیان نے "المحجر" میں اعراب اور ان کی وجوہ کا بہت بڑا اہتمام کیا اور نحو اور اس کی فروع کے قواعد نقل کیے۔

اور باغی مذاہب والے اور گمراہ مسالک والے آیات کی تاویل کا ایسا قصد کرتے ہیں جو گمراہی اور بغاوت میں ان کے مذاہب کی ترویج کرتے ہیں۔

اور اخباری اس بات کا اہتمام کرتے ہیں کہ وہ سلف سے قصے اور خبروں کو شمار کریں خواہ وہ صحیح ہوں یا باطل۔ اور علم الاشارة والے اور ارباب تصوف کو ترغیب و ترہیب، زہد و قناعت اور رضا والے شبے کا ہی غم سوار ہوتا ہے۔ وہ قرآن پاک کی تفسیر ایسی چیزوں سے کرتے ہیں جو ان کے مشارب اور اذواق کے موافق ہوتی ہیں۔

خلاصہ یہ کہ ہم کسی بھی فن کے ماہر کو دیکھتے ہیں یا کسی مذاہب یا نظریہ کے داعی کو دیکھتے ہیں تو وہ آیات کی تفسیر میں اس چیز کی

خوب محنت کرتا ہے جو اس کے فن کے موافق ہو اور اس کے مسلک و شرب کے بھی موافق ہو اور اس کے مذہب کی نصرت بھی کر رہا ہو اگرچہ وہ اس مقصد سے بعید ہو جس کے لیے قرآن نازل ہوا بعض نے مزید غلو کیا اور قرآن کو علوم کو نیہ جیسے طبیعات، کیمیا، حساب، الجبر وغیرہ پر مشتمل بنا دیا اور پیچھے گزر چکا کہ پہلی بحث میں ہم نے اس کی پوری تحقیق بیان کر دی اگر آپ چاہیں تو وہاں رجوع کر سکتے ہیں۔ خلاصہ یہ ہوا کہ مفسر پر واجب ہے کہ وہ اس بات کا لحاظ کرے کہ قرآن پاک کتاب ہدایت و اعجاز ہے اور اس کا ہدف اعلیٰ اور مقصد علیٰ اللہ تعالیٰ کے کلام سے اس کی ہدایت کا اظہار اور اس کی کتاب میں اس کے اعجاز کی وجہ کا بیان ہے۔

﴿لَيْسَ لَكَ مِنَ هَٰذَا بَلَدٌ مِّنْ حَيْثُ عَنَّا بِغَيْبٍ وَ يَتَّبِعُ ۚ وَإِنَّ اللَّهَ لَسَمِيعٌ عَلِيمٌ ﴿۳۲﴾﴾ (الأنفال: ۳۲)

”تا کہ دلیل کی وجہ سے جس نے مرنا ہو وہ مر جائے اور جس نے دلیل کی وجہ سے زندہ رہنا ہو وہ زندہ رہے بے شک اللہ تعالیٰ سننے والا جاننے والا ہے۔“

**تفسیر محمود اور تفسیر مذموم** صحابہ اور تابعین کی تفسیر اور صحابہ و تابعین کے اقوال پر اعتماد کرنے والوں کی تفسیر جو صحیح سند سے مندرجہ ذیل کے ساتھ ہو اور ان اہل رائے کی تفسیر جنہیں توفیق دی گئی اور انہوں نے مآثور صحیح کو ان کی سندیں حذف کر کے اپنی علمی اور متعادل آراء کے ساتھ جمع کیا یہ تینوں قسم کی تفسیریں تفسیر محمود ہیں۔ اور ہمارے زمانے میں اکثر یہی تیسری نوع ہے اس لیے کہ جو تفسیر ہمارے ہاں ہیں وہ معانی مآثورہ اور ان معانی کے درمیان تطبیق کرتے ہیں جن کے ذکر میں رائے کے طریق اور علم و اعتماد پر اعتماد کرنے والے اجتہاد میں توسع ہے۔

ایک چوتھی قسم بھی ہے: یہ اہل ہوا اور بدعتیوں کی تفسیر ہے اس کا حکم یہ ہے کہ یہ مذموم ہے۔ کہتے ہیں کہ اس گمراہی میں غرق ہونے والے سب سے مشہور رمانی، جبائی اور قاضی عبدالجبار ہیں۔ پھر زنجشیری کے بارے میں اختلاف ہے بعض حضرات نے ان کی تفسیر کو اسی قسم میں شمار کیا ہے اس لیے کہ اس میں اعتراض کی طرف پھسلانے والی چیزیں ہیں۔ کسی نے کہا کہ: ”بے شک اس میں اہم ترین فوائد ہیں۔“ اس بات سے اس کا مقصود ان کا عذر تلاش کرنا اور اس میں پائے جانے والے فوائد کی جانب کو اس میں پائی جانے والی جانب اعتراض پر ترجیح دینا ہے لیکن احکام کی عدالت کا تقاضا یہ ہے کہ ہم تمام تفسیر کو ایک برابر رکھیں اور ان کا فیصلہ ایک جگہ پر کریں جو درستی کے موافق ہو اور بدعات اور خواہشات سے دور ہو وہ محمود اور جو خطا میں پڑ رہی ہو اور بدعت و خواہش میں ہاتھ مار رہی ہو وہ مذموم ہے نہ اس میں زنجشیری یا غیر زنجشیری کا فرق ہے اور نہ ہی معتزلی اور غیر معتزلی کا فرق ہے۔

**مدح و ذم کا پیمانہ** پھر اس موقع پر ایک میزان ہے جس کے ذریعے تفسیر کو مذموم یا محمود کہا جاسکتا ہے اور یہی ایک فیصلہ ہے جسے فیصلہ بنانا ضروری ہے اور اس کے ذریعے ہم ہر تفسیر کا وزن کر سکتے ہیں اس ترازو میں جو راجح ہوگی اسے ہم قبول کریں گے اور اس کی تعریف کریں گے اور جو غلط ہوگی اسے ہم پھوڑ دیں گے اور براسمجھیں گے اور مدح و ذم کے درجات ہیں جو تفسیر کے مدح و ذم کی وجہ یا تھوڑی زیادہ کمی کے استیفاء کی بنا پر ایک دوسرے کے اوپر نیچے ہیں۔ اب ہم آپ کے سامنے اس میدان کو ”منہج المفسرین بالرائی“ (تفسیر بالرائے والوں کا طور طریقے) کے عنوان کے تحت رکھیں گے آپ تھوڑی دیر اس کا انتظار فرمائیں

مگر اس موقع پر ہم آپ کی توجہ اہل بدعت و ہوا کے کلمات کی طرف مبذول کرانا چاہتے ہیں اور ہم چاہتے ہیں کہ آپ کسی

بھی جماعت یا شخص کے بارے میں بدعت یا ہوا کا فیصلہ کرنے میں درست توفیق دیے گئے ہو ورنہ آپ پر اندیشہ ہے کہ آپ بھی اپنا فیصلہ کرنے میں بدعت یا ہوا والے نہ بن جائیں۔

﴿وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوَى فَيُضِلَّكَ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ إِنَّ الزَّيْنِ يَضُوتُونَ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيدٌ بِمَا نَسُوا يَوْمَ الْحِسَابِ﴾ (ص: ۳۶)

”اور خواہش کی پیروی مت کیجئے ورنہ اللہ کے راستے سے بہک جاؤ گے بے شک جو لوگ اللہ تعالیٰ کے راستے سے بہک جاتے ہیں ان کے لیے سخت عذاب ہے اس لیے کہ انھوں نے حساب کے دن کو بھلا دیا۔“

## رائے کی طرف داری والی غلطی

جاننا چاہیے کہ اس موقع پر کچھ افراد ایسے ہیں جو اپنی رائے اور مذاہب کی طرف داری کرتے ہیں اور ان کا خیال یہ ہے کہ جو شخص بھی ان مذاہب آراء کی مخالفت کرتا ہے وہ بدعتی اور خواہش کے پیچھے چلنے والا ہے اگر وہ کوئی اچھی تاویل کر لیتا ہے تو اس کے لیے دلیل و برہان کی گنجائش ہے ان کی رائے اور مذہب ہی ایک میزان اور کسوٹی ہے یا یوں کہیے کہ کتاب و سنت یا اسلام یہی ہے ان لوگوں کو شیطان نے اسی طرح پھسلا یا اور غرور نے انھیں اندھا کر دیا۔

اس بدترین غلطی سے یہ ہوا کہ مسلمان بہت سے گروہوں اور جماعتوں میں بٹ گئے اور ایک دوسرے کے دشمن بن گئے اور ان سے یہ بات غائب ہو گئی کہ کتاب و سنت اور اسلام ان کے مذاہب اور آراء سے زیادہ وسیع ہیں اور ان کے مذاہب اور آراء، قرآن و سنت اور اسلام سے تنگ ہیں اور نرمی اور سہولت والا دین حنیف افکار کی حریت اور انظار کے اختلاف کے لیے متع ہے جب تک کہ اللہ تعالیٰ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑے رہیں پھر ان سے یہ بات غائب ہو گئی کہ اللہ تعالیٰ فرمایا ہے کہ:

﴿وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ جَمِيعًا وَلَا تَفَرَّقُوا وَاذْكُرُوا نِعْمَتَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ إِذْ كُنْتُمْ أَعْدَاءً فَأَلَّفَ بَيْنَ قُلُوبِكُمْ فَأَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهِ إِخْوَانًا﴾ (آل عمران: ۱۰۳)

”اور اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑ لو اور آپس میں تفرقہ نہ ڈالو اور اپنے اوپر ہونے والی اللہ کی نعمتوں کو یاد کرو کہ جب تم دشمن تھے اللہ تعالیٰ نے تمہارے دلوں میں محبت ڈالی اور تم لوگ اس کے فضل سے بھائی بھائی ہو گئے۔“

اور اللہ تعالیٰ عز و جل فرماتا ہے:

﴿إِنَّ الزَّيْنِ يَضُوتُونَ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيدٌ بِمَا نَسُوا يَوْمَ الْحِسَابِ﴾ (الانعام: ۱۵۹)

”بے شک جن لوگوں نے اپنے دل میں تفرقہ ڈال دیا اور گروہ گروہ ہو گئے آپ کا ان سے کوئی تعلق نہیں۔“

اور اللہ تعالیٰ تفرقہ ساء فرماتا ہے کہ:

﴿وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ تَفَرَّقُوا وَاخْتَلَفُوا مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْبَيِّنَاتُ وَأُولَئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ﴾ (آل عمران: ۱۰۵)

”اور ان لوگوں کی طرح نہ ہو جاؤ جنھوں نے تفرقہ ڈالا اور اختلاف کیا بعد اس کے کہ ان کے پاس واضح نشانیاں آگئیں ان کے لیے بڑا عذاب ہے۔ جس دن چہرے سفید ہوں گے اور سیاہ ہوں گے۔“

ابھی وجوہ کی بناء پر میں اپنے آپ کو بھی اور آپ کو بھی دور کرتا ہوں کہ کسی مسلمان پر کفر، بدعت یا خواہش کی تہمت لگائیں صرف اس وجہ سے کہ اس نے اسلامی نظریاتی رائے میں ہماری مخالفت کی کیونکہ کسی پر کفر یا بدعت کی تہمت لگانا بدترین امور میں سے ہے اور علماء نے ثابت کیا ہے کہ جب کسی کلمہ میں ننانوے احتمالات کفر کے ہوں اور ایک احتمال ایمان کا ہو تو اسے احسن الجامل یعنی ایمان پر محمول کریں گے یہ موضوع مکمل ہوا اور اس کی دلیل بھی پوری ہو چکی۔ لیکن ہمارے مسلمان بھائیوں کی اس اسلامی ادب سے غفلت ہماری طاقت کا شیرازہ بکھیرتی ہے یہ اسلامی ادب وحدت کی حفاظت کرتا ہے اور بھائی چارگی کا بچاؤ کرتا ہے اور اسلام کو اس کی خوبصورت شکل اور خوب روچرے کے ساتھ نرمی اور لطافت کے ساتھ ہر قسم کے فکری اختلافات مذہبی جھگڑوں کی وسعت اور مصالحوں بشریہ کے ساتھ ظاہر کرتا ہے جب تک کہ کتاب وسنت کو پکڑے رہیں گے اس طریقے پر لہجوں اور وجوہ صحیحہ میں سے ہے جن کی درست سوچ اور سیدھی راہ والی تاویل احتمال رکھتے ہیں اس طرح کا اختلاف رسول اللہ ﷺ کے دور میں بھی آپ ﷺ کے صحابہ کے مابین ظاہر ہوا لیکن وہ اس اختلاف کی وجہ سے آپس میں تھم گھٹانیں ہوئے بلکہ ایک نے اپنی رائے کو لیا اور دوسرا اس کی رائے کا احترام کرتا رہا اور رسول اللہ ﷺ نے انھیں اس پر برقرار رکھا اور کسی کو بھی عیب والا نہیں بتلایا حالانکہ اس طرح کے اختلافات پیش آتے رہے کہ بعض حضرات نے اپنے اجتہاد سے نماز کو اپنے وقت سے چھوڑ دیا جب کسی دن رسول اللہ ﷺ نے اپنے صحابہ شیخینہ میں سے ایک جماعت کو فرمایا کہ:

”تم میں سے کوئی بھی بنی قریظہ میں پہنچے بغیر نماز نہ پڑھے۔“

انھوں نے سفر کیا اور خوب کوشش کی لیکن سورج غروب ہونے کو تھا وہ زمین پر مسلسل چلتے رہے لیکن ابھی تک نہیں پہنچے اب انھوں نے اجتہاد کیا کسی نے ظاہری دلیل پر عمل کیا اور بنو قریظہ پہنچنے تک عصر کی نماز چھوڑ دیا۔ حتیٰ کہ اس کا وقت نکل گیا اور بعض نے نص میں تاویل کی اور اسے جلدی چلنے کے کنایہ پر محمول کیا اور جب بنو قریظہ پہنچنے سے پہلے وقت کا خوف ہوا تو نماز پڑھی۔ ہم کہتے ہیں کہ اس طرح کے اختلافات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں بھی رونما ہوئے اور آپ ﷺ نے انھیں برقرار رکھا تاکہ مسلمانوں پر آسانی ہو جائے اور یہ معلوم ہو جائے کہ اسلام کامل دین ہے جو ہر زمانے میں اور ہر حال میں تمام مسلمانوں کے لیے وسعت رکھتا ہے اور اس کے بعد والے مبارک زمانے اس پر شاہد ہیں کہ ان میں ائمہ دین میں کثیر اختلاف ہوا لیکن پھر بھی وہ ایک دوسرے کا خوب اکرام کرتے، ایک دوسرے کے ساتھ خوب تعاون کرتے اور ایک دوسرے پر بہت زیادہ رحم کرتے۔

اگر آپ کو شک ہے تو تاریخ سے پوچھئے کہ امام مالک رضی اللہ عنہ نے امام شافعی رضی اللہ عنہ کا کیسے اکرام کیا اور امام شافعی رضی اللہ عنہ نے امام احمد بن حنبل رضی اللہ عنہ کا کیسے اکرام کیا یہاں تک کہ ان کی قمیض کے دھوون سے برکت حاصل کرتے یعنی استاذ امام اپنے ایسے شاگرد کی قمیض سے برکت حاصل کرتے ہیں جو رائے اور اجتہاد میں ان کے مخالف ہے۔ اور پھر تاریخ سے سوال کیجئے کہ ایک امام ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ نے امام شافعی رضی اللہ عنہ کے ساتھ کیسے تعاون کیا اور انھیں کرم حسن ضیافت اور صدق محبت میں اپنی کتابیں دے دیں۔

اور آپ کو امام مالک رضی اللہ عنہ کا رشید کو انکار کرنا بھی نہ بھولنا چاہیے کہ وہ بلاد اسلامیہ کے تمام لوگوں کو ان کی موطا اور ان کے



مذہب پر ابھار رہا تھا اور امام مالک ان سے عذر کر رہے تھے کہ اسلام ان کے مذہب اور ان کی موطا سے زیادہ وسیع ہے اور رسول اللہ ﷺ کے صحابہ رضی اللہ عنہم کئی علاقوں میں پھیل گئے اور ہر ایک کی اپنی توجیہ ہے۔

کیا آپ نے یہ سمجھداری اور پاکیزگی دیکھی؟ ہاں! لیکن آپ کو بہت افسوس ہوگا جب آپ ایک طرف مسلمانوں کی جماعتوں کو دیکھیں گے کہ وہ ایک دوسرے پر کفر کے تیر بارسا رہے ہوتے ہیں اور شرک کا بہتان لگا رہے ہوتے ہیں اور ایک دوسرے پر بدعت اور ہوائے نفس کے پتھر پھینک رہے ہوتے ہیں اس کی وجہ صرف تاویل ہوتی ہے جسے نظر و فکر خوشگوار سمجھ رہی ہوتی ہے۔

حالانکہ صدر استدلال میں اس کی وسعت ہوتی ہے پھر بعض حالات میں یہ بوند لگانے والے پر پھنسن مزید بڑھتی ہے حتیٰ کہ صفوں کے درمیان شدید قسم کی لڑائیاں دائر ہو جاتی ہیں اور وہ سب مسلمان ہوتے ہیں اور پاکیزہ خون بہہ پڑتے ہیں اور وہ خون بھی سب کے سب اسلامی ہوتے ہیں اور ہمیشہ ہم اس قسم کی لڑائیاں دیکھتے چلے آ رہے ہیں جو بانی کلامی لڑائیوں پر قائم ہوتی ہیں جن کی ہمیں کوئی ضرورت نہیں تھی اور ان سے بچ کر رہنا ہی ہمارے لیے مناسب تھا خصوصاً جب ہم نے آیات کو سن لیا اور رسول اللہ ﷺ نے اس قسم کے اختلافات کو باقی رکھا اور ایک حدیث میں آپ ﷺ نے تین مرتبہ فرمایا کہ:

((هلک المتنتعون))۔

”بہت زیادہ بولنے والے اور سوال و جواب میں غلو کرنے والے ہلاک ہو گئے۔“

یہ ایک چھوٹا سا کلمہ ہے۔ لیکن بہت بڑا ہے جو مختلف صورتوں سے لوگوں کی جانوں، عزتوں اور اموال کے بارے میں بہت زیادہ غلو اور تکلف کرنے والوں کی ہلاکت کے تصور سے ڈراتے اور بچاتے ہیں۔ اس میں جماعت اور افراد برابر ہیں۔

میں اس موضوع پر بات لمبی کرنا نہیں چاہتا بلکہ پختہ اور کچی کرنا چاہتا ہوں کہ کسی بھی جماعت پر بدعت یا ہوائے نفس کا حکم لگانا جائز نہیں ہے اگر وہ بدعت اور ہوائے نفس پر نہ ہوں۔

اور اس قسم کا تعصب اور خواہش پرستی دیکھتے ہیں کہ کسی غالی معتزلی نے اپنے اہل سنت بھائیوں پر یہ بات ماردی کہ وہ اپنی جہالت میں گدھے ہیں اور اپنے عقیدے میں خواہش پرست ہیں۔

بلکہ وہ صرف نثر میں اسے کہنے پر نہیں رکا بلکہ اس نے ان پر شعر بھی کہے (اللہ تعالیٰ انھیں معاف کرے) چنانچہ وہ شعر میں کہتا ہے:

لجماعة سموا هواهم سنة وجماعة حمر لعبری موكفة

ایک جماعت ہے جس نے اپنی خواہشات کا نام سنت رکھ دیا اور ایک ایسی جماعت ہے۔ جو گدھے ہیں میری زندگی کی قسم۔ ان پر پالان ڈالا گیا ہے۔ اس طرح کے تعصب اور خواہش پرستی کی ایک مثال ہم دیکھتے ہیں کہ ایک غالی اہل سنت اپنے معتزلی بھائی پر شرک اور ذمیت کا الزام لگاتا ہے اس لیے کہ ان کا اعتقاد ہے کہ بندہ اپنے افعال اختیاری کا خالق ہے۔

ہمارا اعتقاد یہ ہے کہ دونوں جماعتیں اگر اطمینان و انصاف کے ساتھ اپنے مقابل کے نقطہ نظر پر سکوت کرتے تو اسی انسانیت پر مجتمع ہو جاتے جو سب کو جمع کرتی ہے اور اسلام پر جمع ہو جاتے جو سب کے درمیان محبت پیدا کرتا ہے۔ اور اس احترام پر جمع ہو جاتے جس کا سب پر چھایا ہوا ہونا ضروری ہے۔ اس لیے کہ اسلام کی حدود میں ہر ایک کا طریقہ اور ڈھنگ ہے۔

ہمیں اس مثال کے ایک پہلو پر بھی آگاہ ہونا چاہیے وہ افعال کے خلق کی مثال ہے تاکہ حال واضح ہو جائے اور جب



اختلاف و اشتباہ ہو تو ہم اس پر اس کی نظر اور اشاہہ کو قیاس کر لیں ہمیں جاننا چاہیے کہ اس میں مخالفین اپنے اختلاف کے باوجود ہمیشہ سے مسلمانوں کے بھائی رہے ہیں انھیں قرآن کے جھنڈے نے سایہ دیا ہوا ہے اور اسلام کا جھنڈا ابھی ان کے ساتھ ملا ہوا ہے۔  
قرآن پاک اور سنت نبویہ ﷺ میں بہت سی نصوص ہیں جو دلالت کرتی ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز کا خالق ہے اور ہر چیز میں رجوع صرف اس کی طرف ہے اور مخلوق کی ہدایت اور گمراہی اسی اللہ سبحانہ و تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے جیسے اللہ تعالیٰ کا قول:

﴿اللَّهُ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ﴾ (الرعد: ۱۶)

”اللہ تعالیٰ ہر چیز کا خالق ہے۔“

﴿هَلْ مِنْ خَالِقٍ غَيْرُ اللَّهِ يَرْزُقُكُمْ مِنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ﴾ (فاطر: ۳)

”کیا اللہ تعالیٰ کے علاوہ بھی کوئی خالق ہے جو تمہیں آسمان و زمین سے رزق دے۔“

﴿وَاللَّهُ خَلَقَكُمْ وَمَا تَعْمَلُونَ﴾ (الصافات: ۹۶)

”اللہ تعالیٰ نے ہی تمہیں بھی پیدا کیا اور تمہارے اعمال کو بھی۔“

﴿وَالْيَوْمَ يَرْجِعُ الْأَمْرَ كُلَّهُ﴾ (ہود: ۱۳۳)

”اور تمہارا امور اسی کی طرف لوٹے ہیں۔“

﴿مَنْ يَشَأِ اللَّهُ يُضِلَّهُ ۗ وَمَنْ يَشَأِ يُجْعَلْهُ عَلَىٰ صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ﴾ (الانعام: ۳۹، ۴۸)

”وہ جسے چاہتا ہے گمراہ کرتا ہے اور جسے چاہتا ہے سیدھے راستے پر چلاتا ہے۔“

﴿وَلَوْ شَاءَ رَبُّكَ مَا فَعَلُوهُ﴾ (الانعام: ۱۱۲)

”اگر تیرا رب چاہے تو وہ اسے نہ کر سکتیں۔“

﴿وَلَوْ شَاءَ رَبُّكَ لَجَعَلَ النَّاسَ أُمَّةً وَاحِدَةً﴾ (ہود: ۱۱۸)

”اگر اللہ چاہے تو لوگوں کا ایک جماعت بنا دے۔“

﴿وَلَوْ شَاءَ رَبُّكَ لَأَمَنَّ مِنَ فِي الْأَرْضِ كُلَّهُمْ جَعِيحًا﴾ (يونس: ۹۹)

”اگر تیرا رب چاہے تو تمام زمین والے ایمان لے آئیں۔“

﴿وَلَوْ أَنَّا نَزَّلْنَا إِلَيْهِمُ الْمَائِدَةَ وَكَلَّمَهُمُ الْبُوقِي وَحَشَرْنَا عَلَيْهِمْ كُلَّ شَيْءٍ قُبُلًا مَا كَانُوا لِيَوْمَئِذٍ إِلَّا أَنْ

يَشَاءَ اللَّهُ﴾ (الانعام: ۱۱۱)

”اگر ہم چاہیں تو ان کے اوپر فرشتے نازل کر دیں اور ان سے مردے باتیں کرنے لگیں اور ان کے سامنے ہر چیز جمع کر

دے تو بھی وہ لوگ ایمان نہیں لائیں گے ان کے جنھیں اللہ چاہ لے۔“

﴿ إِنَّا جَعَلْنَا عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ أَكِنَّةً أَنْ يَفْقَهُوهُ وَفِي آذَانِهِمْ وَقْرًا ۖ ﴿٥٥﴾ (کہف: ۵۵)

”بے شک ہم نے ان کے دلوں پر پردے ڈال دیے کہ وہ اسے سمجھ نہ سکیں اور ان کے کانوں میں ڈاٹ ڈال دیے۔“

﴿ وَجَعَلْنَا مِنْ بَيْنِ أَيْدِيهِمْ سَدًّا وَمِنْ خَلْفِهِمْ سَدًّا فَأَغْشَيْنَاهُمْ فَهُمْ لَا يُبْصِرُونَ ۖ ﴿٩٠﴾ (نہ: ۹۰)

”اور ہم نے ان کے سامنے اور پیچھے دیوار بنا کر انہیں اندھا کر دیا اور وہ دیکھ نہیں سکتے۔“

﴿ وَسَاءَ عَلَيْهِمْ ءَأَنذَرْتَهُمْ أَمْ لَمْ تُنذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ ۖ ﴿١٠﴾ (نہ: ۱۰)

”اور آپ انہیں ڈرائیں یا نہ ڈرائیں ان کے لیے برابر ہے وہ ایمان نہیں لائیں گے۔“

﴿ كَذٰلِكَ ذَرٰنَا لِكُلِّ اُمَّةٍ عَمَلَهُمْ ۖ ﴿١٠٨﴾ (الانعام: ۱۰۸)

”اسی طرح ہم نے ہر امت کے لیے ان کے اعمال مزین کر دیے۔“

﴿ فَمَنْ يُرِدِ اللهُ أَنْ يَهْدِيَهُ يَشْرَحْ صَدْرَهُ لِلْإِسْلَامِ ۗ وَمَنْ يُرِدْ أَنْ يُضِلَّهُ يَجْعَلْ صَدْرَهُ ضَيِّقًا حَرَجًا كَانِمًا

يَضَعُ فِي السَّمَاءِ ۖ ﴿١٢٥﴾ (الانعام: ۱۲۵)

”اللہ تعالیٰ جس کا سینہ اسلام کے لیے کھولنا چاہے کھول دیتا ہے اور جس کا چاہے سینہ تنگ اور گھٹا ہوا کر دیتا ہے گویا کہ وہ آسمان کی طرف چڑھ رہا ہے۔“

﴿ لَيْسَ لَكَ مِنَ الْأَمْرِ شَيْءٌ ۗ ﴿١٢٨﴾ (آل عمران: ۱۲۸)

”آپ کو اس میں کوئی اختیار نہیں۔“

﴿ وَمَا دَمَيْتَ إِذْ دَمَيْتَ وَلَكِنَّ اللَّهَ رَمَىٰ ۖ ﴿١٤﴾ (الانفال: ۱۴)

”جب آپ نے پھینکا آپ نے نہیں پھینکا بلکہ اللہ تعالیٰ نے پھینکا۔“

اسی طرح نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں کہ: ”اگر تمہیں کچھ پہنچے تو یوں نہ کہو اگر میں ایسے کر لیتا تو ایسے ہو جاتا بلکہ یوں کہو کہ

اللہ تعالیٰ نے مقدر میں لکھ دیا تھا اس نے جو چاہا وہی ہوا۔“ ①

اور آپ ﷺ نے فرمایا کہ: ”ایمان یہ ہے کہ تم اللہ تعالیٰ پر ایمان لاؤ اس کے فرشتوں پر ایمان لاؤ اس کی کتابوں پر ایمان

لاؤ۔ آخرت کے دن پر اور اچھی اور بری تقدیر پر ایمان لاؤ۔“ ②

اور فرماتے ہیں کہ: ((بأقلب القلوب و الألبصار ثبت قلبي على دينك)). ③

”اے دلوں اور آنکھوں کو پلٹنے والے میرے دل کو دین پر ثابت قدم رکھ۔“

①: مسلم کتاب القدر حدیث ۱۱۳۳، ابن ماجہ مقدمہ باب ۱۰ حدیث ۷۹، الامام احمد ۲/۳۶۶

②: مسلم کتاب الایمان ۷۰ السنۃ لابن ماجہ ۱۶۹، ترمذی کتاب القدر ۱۰، الایمان ۴، نسائی کتاب الایمان ۱۰۶۰۵، ابن ماجہ مقدمہ ۱۰۹، مسند احمد ۱/۳۸۲، ۲

③: ترمذی کتاب الدعاء باب ۲، مسند احمد ۳/۱۸۴

اور اس جیسی نصوص میں جب بندہ غور کرتا ہے تو اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں کہ بندہ تمام امور کو اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹائے اس لیے کہ اس کا عقیدہ ہے کہ وہ اکیلا اور واحد ہے نہ اس کے ملک میں کوئی شریک ہے اور نہ ہی اس کے ملک کے کسی گوشہ میں اور تکلیف کے افعال اس کے بندوں کی طرف سے ہیں یعنی افعال کی نسبت بندوں کی طرف یہ ایک دوسری چیز ہے جو محض اللہ تعالیٰ کے فضل سے ہے جیسا کہ ابن عطاء اللہ نے فرمایا کہ:

”تجھ پر اس کا فضل اور کرم ہے کہ عمل کا خلق اس نے کیا اور منسوب تیری طرف کر دیا۔“

یہ نقل دلائل کچھ اور عقلی دلائل کا اظہار بھی کر رہے ہیں جو بول رہے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت ہر چیز میں ہے اور بندہ اپنے افعال اختیار یہ کا خالق ہو عقل میں نہیں آسکتا اس لیے کہ اگر وہ ان کا خالق ہوتا تو ان کی تفصیل کو بھی جانتا ہوتا جبکہ وہ خود شعور رکھتا ہے کہ اس سے بہت سی اشیاء صادر ہوتی ہیں جن کا تعلق ان کے افعال اختیار یہ کے ساتھ ہوتا ہے۔ لیکن وہ ان کی تفصیل کو نہیں جانتا جیسے چلنے میں قدم، کھانے میں چبانے کی حرکات وغیرہ اگر ایسا ہے تو وہ اپنے افعال کا خالق نہ ہو۔

﴿أَلَا يَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ﴾ (الک: ۱۴)

”کیا وہ نہیں جانتا جس نے پیدا کیا؟“

اس بارے میں بھی کتاب و سنت سے بہت سی نصوص ملتی ہیں جن میں بندوں کے اعمال کی نسبت ان کی طرف کی جاتی ہے اور یہ نصوص دلالت کرتی ہیں کہ ان اعمال میں اچھائی کرنے والوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی خوشنودی اور اس کی محبت ہے اسی طرح یہ بھی دلالت کرتی ہیں کہ اس کا غضب بعض بڑے اعمال کرنے والوں کے ساتھ ہے۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ:

﴿مَنْ عَمِلَ صَالِحًا قَلْبُهُ وَهَنْ أَسَاءَ فَعَلَيْهَا﴾ (نعلت: ۴۶)

”جس نے اچھائی کیا اپنے لیے کیا اور جس نے برا کیا وہ اس پر (وبال) ہوگا۔“

﴿إِنْ أَحْسَنْتُمْ أَحْسَنْتُمْ لِأَنْفُسِكُمْ وَإِنْ أَسَأْتُمْ فَلَهَا﴾ (الاسراء: ۷)

”اگر تم اچھائی کرو گے تو اچھائی اپنے لیے کرو گے اور اگر برائی کرو گے تو بھی اپنے لیے۔“

﴿أَمْ حَسِبَ الَّذِينَ يَعْمَلُونَ السَّيِّئَاتِ أَنْ يَسْفُتُوا﴾ (العنکبوت: ۳)

”کیا بڑے اعمال کرنے والے سمجھتے ہیں کہ وہ ہم سے نکل جائیں گے؟“

﴿أَمْ حَسِبَ الَّذِينَ اجْتَرَحُوا السَّيِّئَاتِ أَنْ نَجْعَلَهُمْ كَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ سَوَاءً مَحْيَاهُمْ وَصَوْنُهُمْ سَاءَ مَا يَحْكُمُونَ﴾ (الطائ: ۲۱)

”کیا جن لوگوں نے بڑے کام کیے کیا انھوں نے سمجھ لیا ہے کہ ہم انہیں ایسے کر دیں گے جیسے ایمان اور اچھے اعمال والے ہیں ان کا جینا اور مرنا برابر ہے؟ وہ بہت برا فیصلہ کر رہے ہیں۔“

﴿إِنْ تَكْفُرُوا فَإِنَّ اللَّهَ غَنِيٌّ عَنْكُمْ ۖ وَلَا يَرْضَىٰ لِعِبَادِهِ الْكُفْرَ ۗ وَإِنْ تَشْكُرُوا يَرْضَهُ لَكُمْ ۗ﴾ (الزمر: ۷)

”اگر تم کفر کرو تو اللہ تعالیٰ تم سے غنی ہے اور وہ اپنے بندوں سے کفر کو پسند نہیں کرتا اور تم شکر کرو تم سے راضی ہوگا۔“

﴿وَإِنْ كَذَّبُوكَ فَقُلْ إِنِّي عَمِلٌ وَلَا كُمْ عَمَلِكُمْ ۗ أَنْتُمْ بَرِيئُونَ مِنِّي أَعْمَلُ وَآنَا بَرِيءٌ مِّمَّا تَعْمَلُونَ ۗ﴾ (یونس: ۳۱)

”اگر وہ آپ کو جھٹلائیں تو آپ فرما دیجئے کہ میرے لیے میرا عمل اور تمہارے لیے تمہارا عمل تم میرے عمل سے بری اور میں تمہارے عملوں سے بری ہوں۔“

﴿قُلْ لَا سَأَلُونَ عَمَّا أَجْرُ مَنَا وَلَا سَأَلُ عَمَّا تَعْمَلُونَ ۗ﴾ (المائد: ۱۰)

”آپ فرما دیجئے کہ جو ہم نے جرم کیا اس کے بارے میں تم سے نہیں پوچھا جائے گا اور جو تم نے اعمال کیے اس کے بارے میں ہم سے سوال نہیں ہوگا۔“

﴿كُلُّ يَفْعُولٍ أَعْمَلُوا عَلَىٰ مَكَانَتِكُمْ إِنِّي عَامِلٌ ۗ فَسَوْفَ تَعْلَمُونَ ۗ مَنْ تَكُونُ لَهُ عَاقِبَةُ الدَّارِ ۗ إِنَّهُ لَا يُفْلِحُ الظَّالِمُونَ ۗ﴾ (الانعام: ۱۳۵)

”آپ فرما دیجئے کہ تم لوگ اپنی جگہ عمل کرتے رہو میں بھی عمل کرتا ہوں عقرب معلوم ہو جائے گا کہ آخرت کا گھر کس کے لیے ہے بے شک ظالم لوگ کامیاب نہیں ہوں گے۔“

﴿وَمَا كَانَ رَبُّكَ لِيُهِدِكَ الْقُرَىٰ وَيُظْلِمَهُ ۗ وَأَهْلُهَا مُصَلِحُونَ ۗ﴾ (حمود: ۱۱۷)

”اور تیرا رب ایسا نہیں کرے گا کہ کسی بستی کو ظلم سے ہلاک کر دے اور اس کے باشندے نیک ہوں۔“

﴿وَقُلْ أَعْمَلُوا فَسَيَرَىٰ اللَّهُ عَمَلَكُمْ ۗ وَرَسُولُهُ ۗ وَالْمُؤْمِنُونَ ۗ وَسَتُرَدُّونَ إِلَىٰ عِلِّيِّهِ الْعَلِيِّ وَالشَّهَادَةِ فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ ۗ﴾ (التوبہ: ۱۰۵)

”اور آپ فرما دیجئے کہ آپ عمل کرو عقرب اللہ تعالیٰ اور اس کا رسول ﷺ تمہارے عمل کو دیکھیں گے اور عقرب تم اس ذات کی طرف لوٹائے جاؤ گے جو ظاہر اور پوشیدہ سب جاننے والا ہے پھر وہ تمہیں تمہارے اعمال کے بارے میں بتلا دے گا۔“

﴿وَتِلْكَ الْجَنَّةُ الَّتِي أُورِثْتُمُوهَا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ ۗ﴾ (الزخرف: ۲۷)

”اور یہ جنت ہے جس کا تمہیں وارث بنایا گیا ان اعمال کی وجہ سے جو تم کرتے تھے۔“

اسی طرح ہم سنت نبویہ میں پڑھتے ہیں کہ: ”عمل کرتے رہو ہر شخص کے لیے وہ اعمال آسان کر دیے گئے جن کے لیے

اسے پیدا کیا گیا۔“ ①

”اعمال میں جلدی کرو ان فتنوں سے پہلے جو اندھیری رات کے حصے کی طرح آئیں گے۔“ ①

”مجھداروہ ہے جو اپنے آپ کا محاسبہ کرے اور مرنے کے بعد (کی زندگی) کے لیے اعمال کرے۔“ ②

”اے عباس بن عبدالمطلب! عمل کیجئے میں آپ کو اللہ تعالیٰ کے مقابلے میں کوئی فائدہ نہیں دے سکتا اور اے فاطمہ بنت محمد عمل کر کیونکہ میں اللہ کے مقابلے میں میں تمہیں کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتا۔“ وغیرہ وغیرہ۔

ان نصوص میں جب بندہ غور کرتا ہے تو اسے گنجائش نہیں رہتی کہ وہ بندوں کے اعمال اختیار یہ کو ان کی طرف لوٹائے۔ اس عقیدہ کی بناء پر کہ اگر وہ اچھے اعمال کریں گے تو ثواب کے مستحق ہوں گے اور اگر برے اعمال کریں گے تو عقاب کے مستحق ہوں گے۔

اور یہ نقلی دلائل کچھ عقلی دلائل بھی ظاہر کرتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کی عدالت اور حکمت پر شاہد ہیں اس لیے کہ بندہ اگر موجود نہ ہوتا تو اپنے اعمال کو اختیار نہ کرتا اس لیے کہ اس موقع پر اس کے ثواب یا عقاب کی وجہ سے اور ثواب یا عقاب ان اعمال پر کیسے ہو سکتا ہے جو اس کے نہ ہوں اور اس سے صادر نہ ہوئے ہوں۔

غَيْرِي حَتَّىٰ وَأَنَا الْمُعَذَّبُ فِيكُمْ فَكَأَنِّي سَبَّابَةٌ الْمُتَنَبِّئَةُ

”مناہ کسی اور نے کیا اور تمہارے سامنے عذاب مجھے دیا جا رہا ہے۔ گویا کہ میں بچھتانے والے کی شہادت کی انگلی ہوں۔“

اہل سنت کو پہلی نصوص نے حیران پریشان کر دیا پھر ان کے ساتھ عقلی دلائل نے بھی تھکا دیا چنانچہ انھوں نے انھیں ترجیح دی اور فرمایا کہ: ”بندہ اپنے افعال اختیار یہ کا خالق نہیں ہے بلکہ خالق صرف اللہ تعالیٰ ہے اور جب انھیں کہا گیا کہ آدی کو ان اعمال پر ثواب یا عقاب کیوں دیا جاتا ہے جن کو اس نے ایجاد نہیں کیا؟ یہ اور اللہ تعالیٰ کی عدالت اور اس کی حکمت مخلوق کو مکلف بنانے میں کیسے جمع ہو سکتی ہیں؟ تو انھوں نے کہا کہ بندے (اگرچہ اپنے اعمال کے خالق نہیں پھر بھی) کا سبب ہیں اور کسب ہی تکلیف کی علت اور ثواب و عقاب کا مدار ہے اور اسی سے اللہ تعالیٰ کا عدل اور حکمت متحقق ہوتی ہے اس شریعت میں جسے اللہ تعالیٰ نے مکلفین کے لیے مقرر کیا ہے۔“

اسی طرح انھوں نے پہلی نصوص کو خلق پر محمول کیا اور دوسری نصوص کو کسب پر تاکہ دونوں قسم کے اول کو جمع کیا جائے پھر جب انھیں کہا گیا کہ یہ کسب کیا ہے کہ اس کی تحدید میں اشعری اور ماتریدی کا اختلاف ہے؟ کیا یہ قدرت قدیمہ للحداث کے مقارن یا عزم مصمم ہے ہر توجیہ پر نظر ہے اس کی شرح اور توجیہ لمی ہے۔

جبکہ معتزلہ کو دوسری قسم کی نصوص اور ان کا اظہار کرنے والے دلائل نقلیہ نے تھکا کر رکھ دیا انھوں نے انھیں ترجیح دی اور کہا کہ بندہ اپنے افعال اختیار یہ کا خالق ہوتا ہے۔ جب انھیں کہا گیا کہ کیا اللہ تعالیٰ ہر چیز کا خالق نہیں ہے اور بندوں کے اعمال اسی کی طرف سے نہیں ہیں؟ تو انھوں نے کہا کہ کیوں نہیں وہ ہر چیز کا خالق ہے حتیٰ کہ بندوں کے افعال اختیار یہ کا بھی وہ خالق ہے لیکن اس نے بعض اشیاء کا بغیر واسطہ کے خلق کیا اور بعض کا واسطہ کے ساتھ بندوں کے اعمال از قبیل ثانی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں ایسے واسطے

① مسلم کتاب الامارین حدیث ۱۸۶، ابوداؤد کتاب الجن باب ۲، ترمذی کتاب الجن باب ۱۳۰، ابن ماجہ کتاب الجن باب ۱۰، مسند احمد ۱/۱۸۹

② ترمذی کتاب القیامۃ باب ۱۰، ابن ماجہ کتاب الزہد باب ۱۳۱، مسند احمد ۳/۱۳۳

ت پیدا کیا جن کے آلات انھی میں ہیں اور ان کے آلات تقدیر کی اور ارادہ کلی ہیں۔ جو طر فین میں سے ہر ایک کے ساتھ تعلق کی صلاحیت رکھتے ہیں اور ہمیں کوئی قوت اور طاقت نہیں ہے سوائے اس کے کہ ہم نے انھیں دو جوہ میں سے ایک وجہ پر استعمال کیا یا تو حسن اختیار پر یا سوء اختیار پر پھر ہمارے نزدیک کوئی قول مانع نہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے افعال کا خالق ہے لیکن علی سبیل الحجاز اس اعتبار سے کہ وہ ان کے اسباب اور وسائل کا خالق ہے۔

جب انھیں کہا گیا کہ تمہارے مذہب سے لازم آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے فعل میں اس کے بہت سے شرکاء ہوں اور وہ اس کے مکلف بندے ہیں اور یہ عقیدہ توحید اور برہان وحدانیت کے منافی ہے انھوں نے کہا کہ ہم اسے تسلیم نہیں کرتے اور نہ ہی اس کے قائل ہیں کیونکہ وحدانیت کا معنی یہ نہیں ہے کہ اللہ کے علاوہ کی ذات، صفات یا افعال کی کنفی کی جائے بلکہ اس کا معنی یہ ہے اللہ کے غیر کی ذات، صفات یا افعال میں اس کے مشابہ ہونے کی کنفی کی جائے اور اے اہلسنت تم ایسی ذوات کے وجود کو منع نہیں کرتے جو اس کی ذات کے مشابہ نہ ہوں اور نہ ایسی صفات کے وجود کو منع کرتے جو اس کی صفات کے مشابہ ہوں تو پھر ایسے افعال کے وجود کو منع کیوں کرتے ہو جو اس کے مشابہ نہ ہوں؟ اور یہ ہی ہمارا قول ہے کہ بندے اپنے افعال کے خالق ہیں کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ کے افعال کے مشابہ نہیں ہیں۔

اسی طرح دونوں جماعتوں کے لیے قوی دلائل اور عمدہ تاویل ہیں جن کے ذریعے وہ ان نصوص کی تاویل کرتے ہیں جو ان نصوص کے مقابلے میں ہیں جنہوں نے انھیں تھکا دیا اور انھوں نے انھیں ترجیح دی اور ہمیں یہ بھی ملتا ہے کہ یہ دونوں جماعتیں کسی ایسی ممنوع چیز کا التزام نہیں کرتیں کہ دوسری جماعت اسے اس کے ساتھ لازم کر کے اسے باہمی نزاع و اختلاف کے مقابلے میں لا کھڑا کرے بلکہ وہ اپنی رائے کی ایسی توجیہ کرتی ہے جس کے ذریعے وہ ممنوع کار نکاب کرنے سے دور ہو جائے۔ پھر ہمیں یہ بات بھی ملتی ہے کہ دونوں جماعتیں لبا گھوم گھما کر آخر میں اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور اس کی حکمت کے درست اعتقاد کے نقطے پر جمع ہو جاتی ہیں لیکن اس توجیہ کی بناء پر جو اس کے سامنے واضح ہوئی اور اس کے ہاں رائج ہوئی۔

پھر منصف کیسے راضی ہو سکتا ہے کہ ایک پر جرح کرے اور اس پر بدترین تہمت یعنی کفر اور شرک یا ہوائے نفس کی تہمت لگائے؟ اور ہم پر کونسا پہاڑ گر جائے گا کہ ہم دوسرے کو رسوا کیے بغیر جس کو چاہیں ترجیح دیں بلکہ اگر ہم خاموشی کی آڑ میں محفوظ ہو جائیں اور سکوت کی پناہ لیں اور اس طرح کی باریک اور دشوار چیزوں اور پرتج بعید مسالک میں نہ پڑیں تو ہم پر کونسا پہاڑ گر جائے گا خاص کر کہ رمضانِ دیر میں نے ہمیں اس کا مکلف بنایا ہی نہیں اور نہ ہی اسے ہم پر فرض کیا ہے۔

ہمارے سلف صالحین اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور اس کے عدل پر ایمان رکھتے تھے اس کی تقدیر اور حکم پر ایمان رکھتے تھے اور ان نصوص پر بھی ایمان رکھتے تھے اور اس بات پر بھی ایمان رکھتے تھے کہ بندہ اپنے اعمال کو کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ ہر چیز کا خالق ہے اور اس بات پر بھی ایمان رکھتے تھے کہ اللہ تعالیٰ اپنی قدرت میں مغلوب یا عاجز آنے سے پاک ہے اور اس بات سے بھی پاک ہے کہ وہ ظالم ہو یا عیث کرنے والا ہو پھر اس کے بعد وہ خاموش ہو جاتے تھے اور اس میں نہیں پڑتے تھے کہ انسان کے اعمال اختیار یہ میں کتنا حصہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کا ہے اور کتنا حصہ بندے کی قدرت کا ہے اور وہ کسی ایسے بیان کے پیچھے نہیں پڑتے تھے کہ جس سے اللہ تعالیٰ کی قدرت میں اس کی مسافت کی حد بندی ہو جائے اور نہ ہی کسی ایسے بیان کے پیچھے پڑتے جس میں ایسی مسافت کی وضاحت



ہو جائے کہ جو بندے کو اس کے حکم کی فرماں برداری تک پہنچا دے یہ ایسی چیز ہے جسے نہ وہ جانتے تھے اور نہ ہی اس کی کوشش کرتے تھے اس لیے کہ وہ اس کے مکلف ہی نہیں بنے تھے اور اللہ تعالیٰ نے اپنے بندے پر اس سے بڑھ کر رحم کرنے والا ہے کہ انہیں اس کا مکلف بنائے اس لیے کہ یہ اس کی تقدیر کے اسرار ہیں یا اس کے قریب ہیں اور انسانی عقل کی سوچ بھی محدود ہے اور استعداد بھی ضعیف ہے۔ اور عقول کی حرص ہوتی ہے کہ وہ ایسی چیز کو طلب کرتی ہیں جس کی طرف ان کو کوئی راہ نہیں ہوتی۔

﴿وَمَا أُوتِيتُمْ مِنَ الْعِلْمِ إِلَّا قَلِيلًا﴾ (الاسراء: ۸۵)

”اور تمہیں بہت ہی کم علم دیا گیا۔“

ہمیں ایسا نہیں آزماتا کہ جس سے عقلیں تھک جائیں ہم پر حرص کرتے ہوئے نہ ہم نے کوئی شک کیا نہ ہم۔ ان اختلافات کے ہوتے ہوئے ہم پر کیا واجب ہے:

میرا یہ کام نہیں کہ میں اس مسئلہ میں یا اس جیسے مسئلہ میں قول کی تفصیل کروں اس لیے کہ اس کی تفصیل کے لیے ایک اور علم ہے یہ تو ایک مثال ہے جس میں قلیل پر اکتفاء کرتے ہیں اور ایک اہم نصیحت کے ساتھ اس سے باہر نکلتے ہیں۔ وہ یہ کہ مسلمانوں کے لیے جائز نہیں کہ وہ مختلف فرقوں اور گروہوں میں بٹ جائیں اور ایسے امر کی وجہ سے جو دین میں سے نہیں چڑ جائیکہ وہ دین کے اصول سے ہو اور جب ہم نے اس میں گھسنے والوں کے لیے عذر تلاش کر لیا کہ وہ مشتبہین کے شبہات سے یا گمراہ کرنے والوں کی گمراہی میں دوڑ کرنے کے لیے اس میں گھسے جبکہ ہم کبھی بھی کسی ایک شخص کے لیے بھی کوئی عذر تلاش نہیں کر سکتے جس نے ان کے اور ان کے دینی بھائیوں کے درمیان پھسلنے والی لڑائی کو بھڑکایا اور ان کے لیے مناسب نہیں تھا کہ وہ اپنے بھائیوں کے دشمن بن کر اور انہیں بے یار و مددگار چھوڑ کر اس بحث سے نکلنے حالانکہ کل تک وہ آپس میں بھائی بھائی تھے ایک دوسرے کی بات سمجھتے تھے اور ایک دوسرے سے تعاون کرتے تھے۔

اس صورت میں ہمیں مضبوط کرا پکڑ لینا چاہیے اور اپنے اختلافات کے لیے سینوں کو کشادہ کرنا چاہیے اس لیے کہ صدر اسلام اس کی وسعت رکھتا ہے اور جانا چاہیے کہ اسلام تمام مذاہب اور آراء سے وسیع تر ہے اگر آج آپ کا ظرف اپنے بھائی کے لیے تنگ ہے تو کل آپ کو بھی صرف اسی کی رائے نظر آئے گی۔ جب آپ اس کے نقطہ نظر پر اکتفاء کریں گے تحقیق بڑے بڑے علماء نے اپنی رائے سے رجوع کیا بلکہ اپنے مذاہب سے رجوع کیا۔ اور شاید آپ جانتے ہو گے کہ امام شافعی رضی اللہ عنہ کا ایک مذہب قدیم تھا اور ایک مذہب جدید ہے اور عقائد و اصول میں اختلاف کے بارے میں شبہات زیادہ ہیں نسبت احکام و فروع کے اختلاف کے۔ ان تمام وجوہات کی بنا پر آپ مجھے دیکھ رہے کہ اہل سنت و جماعت کو جاہل قرار دینے اور ان کی تحقیر میں اور ان پر جہالت، جمود اور ہوائے نفس کا الزام لگانے میں جیسے لوگ چل رہے ہیں میں ان کے ساتھ نہیں چلتا۔

﴿وَلَا إِذْ سَبَعْتُمْوهٗ قُلْتُمْ مَا يَكُوْنُ لَنَا اَنْ نَّتَكَلَّمَ بِهَذَا سُبْحٰنَكَ هٰذَا اٰمُهٖتَانِ عَظِيْمٌ﴾ (يٰٓعٰظِمُكَ اللهُ اَنْ

تَعُوْدُوْا لِلشُّبْهَةِ اَبَدًا) اِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِيْنَ ﴿ وَ يَبِيْنُ اللهُ لَكُمْ الْاٰيٰتِ - وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿ (النور: ۱۶-۱۸)

”اور جب تم نے اسے سنا تو کیوں نہ کہہ دیا کہ ہمیں شایان نہیں کہ ایسی بات زبان پر لائیں (پروردگار) تو پاک ہے یہ تو



(بہت) بڑا بہتان ہے۔ خدا تمہیں نصیحت کرتا ہے کہ اگر مومن ہو تو پھر کبھی ایسا (کام) نہ کرنا۔ اور خدا تمہارے (سمجھانے کے لئے) اپنی آیتیں کھول کھول کر بیان فرماتا ہے اور خدا جاننے والا اور حکمت والا ہے۔“

**تنبیہ** میں چاہتا ہوں کہ قاری یہ نہ سمجھے کہ میں قرآن میں تاویل کرنے والے، اس کی نصوص سے کھیل کود کرنے والے دین کی تعلیمات سے کھیلنے والے ہر شخص کے بارے میں بے ضابطگی چاہتا ہوں بلکہ اس سے میری مراد اور امید یہ ہے کہ ہم مختلف تاویل کرنے والے لوگوں میں فرق کریں اور پھر غور کریں کہ کیا یہ تاویل درست ہے یا نہیں۔ یعنی لغت عربیہ کے قوانین اور اسلام میں طے شدہ قطعی باتیں جن کا دین سے ہونا ضروری ہے اور عقلی نقلی دلائل اس کی تائید کرتے ہیں یا نہیں؟

جو درست ہو اسے ہم قبول کریں گے اور مرجحاً کہیں گے اگرچہ وہ ہماری رائے کے خلاف ہی کیوں نہ ہو اور جو درست نہ ہو اس کو بغیر کسی تردد کے رد کر دیں گے اور بغیر کسی نرمی کے اس سے جنگ کریں گے اس لیے کہ تاریخ اسلامی کسی بھی ایسے دشمن کی گواہی نہیں دیتی جو ان بے کار لوگوں سے بڑھ کر اسلام کے لیے خطرناک ہوں جنہوں نے اس کی نصوص کے ساتھ کھیل کیا اور اس کی طے شدہ باتوں سے کو بے کار سمجھا۔ خواہ ماضی نے انہیں ختم کر دیا ہو جیسے باطنیہ یا حالانے انہیں مضبوط کیا ہو جیسے بہائیہ اس میں سب برابر ہیں۔ اور عقرب آپ ان کی کچھ مثالیں سنیں گے۔

**اسلام کی فراخ دلی اور اس کی تعلیمات کی آسانی** جیسا کہ ہم نے آپ کے سامنے ذکر کر دیا کہ مخلوق میں سے کسی کو مکلف بنایا ہے تو صرف ان تعلیمات کا مکلف بنایا ہے جنہیں اس کی کتاب لے کر آئی ہے اور ان کی شرح اس کے نبی کریم ﷺ نے ہی کی ہے اُس واضح اور آسان طریقے پر جو فلسفی بار کیوں اور فنی گروہوں سے بعید ہے۔

شاید اس اہم موضوع پر بطور اتمام فائدہ آپ کے سامنے کچھ کلمات کا خلاصہ پیش کریں جنہیں حجۃ الاسلام امام غزالی نے ”الاحیاء“ میں کہا جب لوگوں نے علوم کے الفاظ کو تبدیل کر دیا تو انہوں نے بیان کرتے ہوئے کہا (اللہ تعالیٰ انہیں اپنی رحمت سے ڈھانپے) کہ:

**لفظِ ثالث** یعنی وہ اسماءِ محمودہ جو اغراضِ فاسدہ کے لیے نقل کیے گئے ہیں اور ان سے ایسے معانی مراد لیے گئے ہیں جو سلفِ صالحین اور قرنِ اولیٰ نے مراد نہیں لیے۔

**توحید** اس وقت اسے صنعتِ کام، جھگڑے کے طریقے جاننا، جھگڑوں کے اعتراضاتِ فسادات کے طرق کا احاطہ کرنا، زیادہ سوالات کر کے اس میں زور شور پر قدرت، شہادت پیدا کرنا، الزامات کو اکٹھا کرنا وغیرہ کے معانی میں استعمال کیا جاتا ہے حتیٰ کہ ایک جماعت نے اپنا لقب ہی اہل العدل والتوحید رکھ لیا ہے اور متکلمین نے اپنا نام علماء توحید رکھ لیا ہے حالانکہ اس فن کی جتنی بھی خاصیت ہیں وہ پہلے زمانے میں معروف بھی نہیں تھیں بلکہ جو شخص جدل اور لڑائی کا روزانہ کھولتا اس پر شدید انکار ہوا کرتا تھا البتہ قرآن کی وہ اولیٰ ظاہرہ جن کی طرف اول سماع میں ذہن قبولیت کی طرف سبقت کرتا ہے وہ ہر ایک کو معلوم ہیں اور قرآن پاک کا علم ہی مکمل ہے اور توحید علماء کے نزدیک ایک اور امر کا نام ہے جسے اکثر متکلمین سمجھتے ہی نہیں اور اگر سمجھتے بھی ہیں تو اس سے متصف نہیں ہوتے اور وہ معنی یہ ہے کہ: ”تمام امور کے بارے میں یقین کرے کہ وہ سب اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہیں اور اس طرح یقین

کہے کہ اسباب اور وسائل سے توجہ بالکل ختم ہو جائے اور کسی بھی خیر یا شر کو اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی کی طرف سے نہ سمجھے۔ “... آگے فرماتے ہیں کہ:

توحید ایک جوہر نفیس ہے اس کے دو پھلکے ہیں ایک چھلکا دوسرے کی بنسبت گودے سے دور ہے اور لوگوں نے پھلکے کے نام کو خاص کر لیا اور صنعت حراست کو دوسرے پھلکے کے لیے خاص کر لیا اور گودے کو بالکل چھوڑ دیا پہلا چھلکا “لا الہ الا اللہ” کہنا ہے اسے توحید کا نام بھی دیا جاتا ہے جو نصاریٰ کی تخلیق کے منافی ہے مگر بعض اوقات اس سے بھی صادر ہو جاتا ہے جو اپنے باطن کو ظاہر کے خلاف رکھتا ہے اور دوسرا چھلکا یہ ہے کہ دل میں اس قول کے مفہوم کا انکار نہ آئے بلکہ ان کا ظاہر اس کے اعتقاد اور تصدیق پر مشتمل رہے یہ عام لوگوں کی توحید ہے جبکہ متکلمین جیسا کہ پیچھے گزرا کہ اس پھلکے کے محافظ ہیں جو بدعتیوں کی گزبڑ سے اس کی حفاظت کرتے ہیں۔ تیسرا گودا ہے گودا یہ ہے کہ یقین رکھے کہ تمام امور اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہیں اور ایسا یقین کہ وہ وسائل سے بالکل کاٹ دے، اور اسی کی عبادت کرے اور عبادت میں اسی کیلئے کو معبود بنائے اس کے علاوہ کسی کی عبادت نہ کرے اس توحید سے اتباع ہوئی نکل جاتا ہے اور جس نے بھی خواہش کی اتباع کی اس نے اپنا معبود خواہش کو بنا لیا اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ:

﴿أَرَأَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ إِلَهًا هَوَاهُ﴾ (الفرقان: ۲۳)

”کیا آپ نے دیکھا اس شخص کو جس نے اپنا معبود اپنی خواہش کو بنا لیا۔“

اور فرمایا کہ: ”زمین میں جتنے بھی معبود ہیں ان میں سب سے زیادہ ناپسند اللہ تعالیٰ کے نزدیک ہوئی ہے۔“

اور حقیقت میں جو بھی شخص غور کرے گا کہ تو اسے معلوم ہو جائے گا کہ بتوں کا بپاری حقیقت میں بتوں کا بپاری نہیں بلکہ اپنی ہوئی کا بپاری ہے اس لیے کہ اس کا دل اس کے آباء کے دین کی طرف مائل اور وہ اس میلان کی اتباع کر رہا ہے اور دل کا کسی ایسی چیز کی طرف مائل ہونا یہ بھی ان معانی میں سے ہے جنہیں ہوئی کے ساتھ تعبیر کیا جاتا ہے اس توحید سے مخلوق پر غصہ کرنا کہ اور ان کی طرف التفات کرنا بھی نکل جاتا ہے اس لیے کہ جس شخص کو یقین ہو کہ تمام امور اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہیں تو وہ غیر اللہ پر کیونکر غصے ہوگا؟ چنانچہ توحید کا معنی یہ مقام ہوگا اور یہ مقام صدیقین کا مقام ہے۔ اب آپ دیکھیں کہ کونسا چھلکا ہے جس سے اس کو ہٹا کر مطمئن کیا گیا اور کیسے اپنی مدح اور تفاخر میں اس ذات کی پناہ لیتے ہوئے اسے پکڑے ہوئے ہے جس کا نام محمود ہے حالانکہ وہ شخص اس معنی سے خالی ہے جس کی وجہ سے وہ حمد حقیقی کا مستحق ہے یہ اس شخص کے انلاں کی طرح ہے جو صبح کو اٹھ کر قبلہ کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور کہتا ہے کہ:

﴿إِنِّي وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِي فَطَرَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ حَنِيفًا﴾ (الانعام: ۷۹)

”میں نے یکسو ہو کر اپنا چہرہ اس ذات کی طرف پھیرا جس نے آسمان و زمین کو پیدا کیا۔“

یہ پہلا جھوٹ ہے۔ جس کے ذریعے وہ روز اللہ تعالیٰ سے بات کرتا ہے اس نے اہتدال خاص کر کے اللہ تعالیٰ کی طرف نہیں پھیرا کیونکہ اگر اس کے چہرے سے مراد ظاہری چہرہ ہے تو اس کا چہرہ کعبہ کی طرف ہی ہو سکتا ہے اور اس کا پھرنا باقی جہات سے پھیرنا ہی ہو سکتا ہے اور کعبہ اس کی جہت نہیں ہے جس نے آسمان و زمین کو پیدا کیا کہ اس کی طرف منہ پھیرنا اللہ کی طرف پھیرنا ہو جائے

﴿مَنَاطِلُ الْعِشْرَانِ فِي علومِ الْقُرْآنِ: جلد ۱﴾

کیونکہ اس سے اُس کے لیے جہت اور سمت کی حد بندی ہو جائے گی اور اگر اس سے مراد دل کا رخ ہے تو اس کی عبادت یہی مطلوب ہے پھر اس کے قول میں یہ کیسے صادق آ سکتا ہے حالانکہ اس کا قول اپنی ضروریات اور حاجات میں لگا ہوا ہے اور مال جاہ اور اسباب کی کثرت کو جمع کرنے میں مصروف ہوتا ہے اور پوری طرح ان کی طرف متوجہ ہوتا ہے تو پھر کیسے اس نے اپنا چہرہ اس ذات کی طرف متوجہ کر لیا ہے جس نے آسمان وزمین کو پیدا کیا اور یہ کلمہ توحید کی حقیقت کی خبر ہے چنانچہ موصودہ ہے جو واحد کے علاوہ کسی کو نہیں دیکھتا اور اس کے علاوہ کسی کی طرف رخ نہیں کرتا اور یہ اللہ تعالیٰ کے قول:

﴿قُلِ اللَّهُ شَهِدَ ذَنبَهُمْ فِي حَوْضِهِمْ يَلْعَبُونَ﴾ (الانعام: ۹۱)

”آپ فرمادیجئے کہ وہ اللہ ہے، اور پھر انہیں ان کی بیہودہ باتوں میں چھوڑ دو تاکہ وہ ان میں کھیلتے پھیریں۔“  
اس سے مراد زبان کا قول نہیں بلکہ زبان ترجمان ہے جو ایک مرتبہ بولتی اور دوسری مرتبہ جھوٹ بولتی ہے اللہ تعالیٰ کا مقصد وہ ہے جس سے ترجمانی کی جاتی ہے۔ یعنی دل یہی توحید کا سرچشمہ اور بنیاد ہے۔

اس سے آپ نے توحید کے علم سے چشم پوشی نہ سمجھ لینا خصوصاً جب آپ کے سامنے اس مقام پر تصریح ہو گئی کہ یہ بدعتیں کی گڑ بڑ سے توحید کے عقیدے کے چھلکے کی حفاظت کرتی ہے لیکن اس کی تنقید چھلکوں میں اسراف اور گودے کو چھوڑ دینے پر ہوتی ہے۔ جیسا کہ آپ نے سن لیا۔

استاد امام کی تحقیق: استاد ابام شیخ عبدہ نے بھی اس مسئلہ میں ”العقائد العضدیه“ کتاب کے حاشیہ پر کلام کیا ہے انھوں نے اس میں فرق مخالفہ کے ساتھ بہت زیادہ وسعت کی ہے۔ چنانچہ جب ان کے سامنے ترمذی کی حدیث پڑھی گئی کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ: ”میری امت کے تہتر فرقتے ہوں گے اور وہ سب کے سب آگ میں جائیں گے سوائے ایک کے کسی نے پوچھا کہ وہ کون لوگ ہوں گے؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ جو لوگ اس دین پر ہوں گے جس پر میں اور میرے صحابہ رضی اللہ عنہم ہوں گے۔“ پھر شیخ نے اپنی بحث کو ختم کرتے ہوئے فرمایا کہ: ”حق جس کی طرف عقل اور شریعت رہنمائی کرتے ہیں وہ یہ ہے کہ ناظر متدین جو صنایع واجبہ الوجود کے اثبات کے دلائل صحیحہ قائم کرنے کو اختیار کرے اس کے بعد نبوات کے اثبات کو اختیار کر لے پھر نبوت کو چھو بھی لے کر آئی اسے تصدیق و تسلیم کے ساتھ لے اور اس میں الفاظ کی گہرائی کی تحقیق تفتیش نہ کرے بلکہ اپنی طاقت کے بقدر ان چیزوں کا تحقیق کرے جن کا تعلق اعمال کے ساتھ ہے۔ پھر اپنے تمام عقائد کی بنیاد میں دلائل صحیحہ کے ساتھ تحقیق کا راستہ اپنانے تو جہاں تک بھی پہنچ پائے لیکن انتہائی تحری اور اجتهاد کے ساتھ۔“

پھر اس کی فکر جب اس بات کی طرف پہنچ جائے جو اس کے رب کی طرف سے آئی ہے اور ظاہر طور پر وہ اسے اپنی تحقیق کے موافق بھی پائے تو اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرے ورنہ تاویل سے روگردانی کرے اور کہے کہ:

((أما بناه كل من عندنا)).

”ہم اس پر ایمان لائے سب ہمارے رب کی طرف سے ہے۔“

کیونکہ اللہ تعالیٰ اور اس کے نبی ﷺ کی مراد اللہ اور اس کا رسول ﷺ ہی جانتے ہیں اسی طریقہ پر وہ چلے گا تو وہ اللہ تعالیٰ

کی طرف سے اس کی رضائے کر لوئے گا۔ کیونکہ اس نے اپنے عقائد کی بنیاد درست دلائل پر رکھی اور اخبار البیہ کو قبول و تسلیم کے ساتھ لیا اور انہیں قلب سلیم کے ساتھ لیا۔

اور اگر وہ کسی غرض کی وجہ سے تادل کرنا چاہے جیسے مخالف کا رد یا انکار کرنے والے کو مطمئن کرنا تو اس پر کوئی حرج نہیں جب کہ وہ اس کے دلائل کو تقلید و تشویش سے ہٹ کر تسلیم کرے اور یہی طریقہ ہمارے مشائخ کا ہے جیسے شیخ اشعریؒ، رشیدیہ اور شیخ ابو منصور رشیدیہ وغیرہ۔ کوئی بھی قول اس وقت تک نہیں لیتے تھے جب تک کہ اپنی طاقت کے بقدر اس کی براہین تو یہ کے ساتھ درنگی نہیں کر لیتے تھے اور ابن السنی، صوفی اور حکیم نے بھی اس کو ترجیح دی ہے اور جو بھی تفرقہ باز اور جھگڑالو ہے وہ ضد کا طالب ہے اور کلمہ کو بکھیرنا چاہتا ہے وہ آگ میں جائے گا اور جو شخص بھی کسی کرے گا اسی پر عار اور رسوائی ہوگی۔ اس لیے سیدھے راستے پر چلے اور ذریعے کیونکہ ان کے بعد بھی بہت سے لوگ آئے۔

کمال نجات اور سعادت ابدیہ حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم اس کے ساتھ رذائل سے پاکی اور اخلاق کاملہ اور اعمال فاضلہ سے آراستہ ہونے کو بھی ملائیں ان اخلاق اور اعمال میں سے قوت نظر یہ کی تکمیل اور ہر چیز میں عدل والے راستے کو اختیار کرنا بھی ہیں اس لیے کہ اس میں کوئی شک نہیں کہ جو بھی ان چیزوں کی مخالفت کرے گا جن پر نبی کریم ﷺ اور آپ ﷺ کے صحابہ رضی اللہ عنہم ہیں "ہمت، سداد، عدل اور انصاف اور تمام اخلاق و اعمال میں استقامت کے طریقے پر چلنا اور لینے دینے میں نور بعصرت" وہ دوزخ کی آگ میں ہوگا اور جو شخص اس طریقے پر ہوگا جن پر یہ حضرات (یعنی آپ ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم) ہیں تو وہ جنت کے اعلیٰ درجوں پر ہوگا۔

اس طریقے پر چلنے والا یا تو اس کا چلنا قرآن و سنت کے مفہوم اور نئے پرانے اولو الفضل راشدین کے کلام میں غور کرنے کی وجہ سے ہوگا تو یہ اعلیٰ درجے کا حکیم اور متوسط مؤمن ہے یا وہ اس کے ساتھ اپنے آپ کو مدارج انوار پر چلائے گا اور اس میں پائے جانے والے اسرار کی باریکیوں پر آگاہ ہوگا حتیٰ کہ وہ اسی زندگی میں اعلیٰ مرتبہ پائے گا۔ تو یہ صوفی ہے اور اونچے مقصد اور اعلیٰ مطلوب والا ہے اور ان مراتب کو گناہ نہیں جاسکتا اور ان ترقیوں کو پہنچنا نہیں جاسکتا۔ یہ اور اس کے قابل دونوں کو "مومن صادق" کا نام شامل ہے لہذا جس میں یہ نور متحقق ہوگا اس کے لیے نجات اور سرور ہے خواہ وہ کوئی بھی ہو اس لیے کہ اس میں وہ چیز پائی جاتی ہیں جن پر نبی کریم ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ہیں۔ اب ہمیں قلم روک دینا چاہیے کیونکہ مقصود اختصار ہے و اللہ اعلم بالصواب والیہ المرجع والمآب فأسئلك لفسک طریق السداد وانظر فیما یکون لك بعین الرشاد۔

اب میں اس موقع پر قلم کو روکتا ہوں یہ امید کرتے ہوئے کہ میں نے اس اہم مقام کا حق ادا کر دیا اور میں نے مبادی اسلامیہ رشیدیہ کے اصول میں کامیابی حاصل کر لی جبکہ نظر ثانی و جوہ میں اختلاف اور افکار کے نزاعات میں تباہی تھا اللہ تعالیٰ ہمیں عناد، غرور اور فتنہ کے شر سے بچائے۔ اور ساری امت کو کتاب و سنت کے حقائق پر جمع کرے۔ آمین



## تفسیر بالرائے میں سے کونسی جائز اور کونسی ناجائز ہے

اس مقام پر دوائے سے مراد اجتہاد ہے اگر اجتہاد موثق ہو یعنی مستند ہو ایسی چیز کی طرف جو جہالت اور ضلالت سے بعید ہو اس کے ساتھ تفسیر محمود ہے۔ ورنہ مذموم ہے اور وہ امور جن کی طرف تفسیر میں رائے کا استناد واجب ہے انہیں علامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے "الافتان" میں زرکشی رحمۃ اللہ علیہ سے نقل کیا جس کا خلاصہ یہ ہے کہ:

قرآن میں غور کرنے والے کے لیے تفسیر کی طلب میں بہت سے مآخذ ہیں جن کی بنیاد چار چیزیں ہیں۔

- ① رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل اور اس میں ضعیف اور موضوع سے احتراز کیا جائے۔
- ② صحابی کا قول لیا جائے لیکن بعض نے کہا کہ یہ بھی مطلقاً مرفوع کے حکم میں ہے اور بعض حضرات نے اسے اسباب نزول وغیرہ کے ساتھ خاص کیا ہے جن میں رائے کی گنجائش نہیں۔
- ③ لغت کو مطلقاً لیتا اور اس میں آیات کو پھیرنے سے احتراز ہو سوائے اس کے کہ اس پر کلام عرب کثرت کے ساتھ دلالت کرتا ہو۔
- ④ کلام جس کا تقاضا کرتا ہو اور قانون شرعی اس پر دلالت کرتا ہو۔ اور یہ چوتھی نوع ہی ہے جس کی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کو دعویٰ کہ:

((اللھم فقھہ فی الدین وعلیہ التأویل))

"اے اللہ اسے دین میں تفقہ اور تاویل کا علم عطا فرما۔"

چنانچہ جس نے اپنی رائے سے قرآن پاک کی تفسیر کی یعنی اپنے اجتہاد پر جو ان مآخذ معتمدہ پر آگاہی کو لازم ہوں جنہیں وہ کتاب اللہ کے معانی سمجھتا ہے تو اس کی تفسیر درست اور جائز ہوگی اور اس لائق ہوگی کہ اسے تفسیر جائز یا تفسیر محمود کہا جائے اور جو شخص ان اصول سے ہٹ کر قرآن پاک کی تفسیر کرے گا اس پر اعتماد نہیں کیا جائے گا اس کی تفسیر ساقط اور نچیلے درجہ کی ہوگی اور اس قابل ہوگی کہ اسے تفسیر غیر جائز یا تفسیر مذموم کہا جائے۔

چنانچہ تفسیر بالرائے جائز میں ضروری ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ رضی اللہ عنہم سے منقولہ پر اعتماد کا لحاظ کیا جائے یہی وہ چیز ہے جو مفسر بالرائے کے لیے راستہ منور کرتی ہے۔ اور اسے تو انہیں لغت کو جاننے والا اور ان کے اسلوب کو پہچاننے والا ہونا چاہیے اور قانون شریعت کی بصیرت رکھنے والا حتیٰ کہ وہ کلام اللہ کو اس شریعت پر رکھے جو معروف ہے۔

اور وہ امور جن سے تفسیر بالرائے میں بچنا چاہیے ان میں سب سے اہم یہ ہے کہ لغت اور شریعت کے قوانین سے جا ملتے ہوئے اللہ تعالیٰ کے کلام سے اس کی مراد پر جھڑپ پڑنا اور ایک یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے کلام کو مذاہب فاسدہ پر محمول کرنا اور ایک یہ کہ جن چیزوں کو اللہ تعالیٰ نے اپنے علم کے ساتھ خاص کر لیا ان میں گھسنا اور ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ بغیر دلیل کے قطعی فیصلہ کرنا کہ اللہ تعالیٰ کی مراد یہی ہے اور ایک یہ بھی ہے کہ خواہش اور استحسان کے ساتھ چلنا۔

ان پانچ امور کا خلاصہ و کلمات میں ہو سکتا ہے: ① جہالت ② ضلالت



جاننا چاہیے کہ قرآن کے علوم کی تین اقسام ہیں۔

- ① ایک وہ علم ہے جسے اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق میں سے کسی کو مطلع نہیں فرمایا بلکہ صرف اپنے لیے مخصوص کر رکھا ہے جیسے اس کی ذات صفات کی حقیقت کا علم، اور وہ غیوبات، جنہیں اللہ تعالیٰ کے علاوہ کوئی نہیں جانتا اور اس پر اجماع ہے کہ اس نوع کے بارے میں کلام کرنا کسی کے لیے جائز نہیں۔
- ② وہ علوم جن پر اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی ﷺ کو مطلع کیا اور وہ آپ ﷺ کے ساتھ خاص ہیں اس کے بارے میں کلام کرنا بھی آپ ﷺ کے علاوہ کسی کے لیے جائز نہیں۔ بعض نے کہا کہ سورتوں کے ادا رکھنے کی اسی نوع میں سے ہیں۔
- ③ وہ علم جس کے بارے میں کلام کرنا بطریق سماع ہی جائز ہے جیسے ناخ، منسوخ، قراءات، امم ماضیہ کے قصے، اسباب نزول اور حشر، نشر اور معاد کی خبریں۔
- ④ وہ علوم جو بطریق نظر و استدلال معلوم ہو جاتے ہیں ان میں سے بعض کے جواز میں اختلاف ہے اور وہ آیات متشابہات سے متعلقہ علم ہے اور بعض وہ ہیں جس کے جواز پر اتفاق ہے یہ وہ علم ہے جس کا تعلق احکام، مواعظ، امثال اور حکم وغیرہ والی آیات کے ساتھ ہے۔ اور یہ اس کے لیے جائز ہے جس میں اجتہاد کی اہلیت ہو۔

## وہ علوم جن کی مفسر کو ضرورت ہوتی ہے

علماء کرام نے علوم کی ان انواع کو بیان کر دیا ہے جن کا مفسر میں ہونا ضروری ہے چنانچہ انھوں نے فرمایا کہ وہ لغت، نحو، صرف، علوم البلاغ، علم اصول فقہ، علم توحید، اسباب نزول کی معرفت، قصص، ناخ، منسوخ، مجمل اور مبہم کی وضاحت کرنے والی احادیث، علم دینی اور یہ علم اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو عطا کرتا ہے جو اپنے علم پر عمل کرتے ہیں اور جس کے دل میں بدعت، تکبر، دنیا کی محبت، یا گناہوں کی طرف میلان ہوتا ہے اللہ تعالیٰ یہ علم انھیں عطا نہیں فرماتا۔

﴿سَاَصْرِفُ عَنْ آيَاتِ الَّذِينَ يَتَكَبَّرُونَ فِي الْأَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ﴾ (الاعراف: ۱۳۶)

”میں عنقریب اپنی آیات سے ان لوگوں کو پھیر دوں گا جو زمین میں ناحق تکبر کرتے ہیں۔“

امام شافعی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ:

شکوت الی وکیع سوء حفظی فارشد فی الی ترک المعاصی

”میں نے وکیع سے اپنے کمزور حافظہ کی شکایت کی۔ انھوں نے میری گناہ چھوڑنے کی طرف رہنمائی کی۔“

واخبرنی بان العلم نور ونور الله لا يعطى لعاصی

”اور مجھے بتلایا کہ علم ایک نور ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کا نور گناہگار کو نہیں دیا جاتا۔“

**تنبیہ** • یہ شرائط جنہیں ہم نے ذکر کیا یہ تمام علوم تفسیر کے اعلیٰ مراتب کی تحقیق کے لیے ہیں۔ اور ان میں ان اہم اعتبارات کا بھی اضافہ ہوگا جو آنے والے قیمتی کلمات میں لکھے گئے ہیں۔ بہر حال وہ معانی جن کے ذریعے آدمی اپنے مولد کی عظمت کو سمجھتا ہے اور وہ

”محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ“

معانی جنہیں انسان لفظ کریم کے اطلاق کے وقت سمجھتا ہے وہ مقدار ہے جو عام لوگوں کے درمیان مشترک ہے اور یہ وہ ہے جس کا تدبیر

تذکر کے لیے حکم دیا گیا ہے اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے آسان اور سہل بنا دیا ہے اور یہ تفسیر کا ادنیٰ مرتبہ ہے۔

علامہ روح مجد عہدہ نے فرمایا جس کا خلاصہ یہ ہے کہ:

تفسیر کے کئی مراتب ہیں سب سے ادنیٰ یہ ہے کہ اجمالی طور پر واضح ہو جائے جو دل کو اللہ تعالیٰ کی عظمت اور اس کی پاکی سے سیراب کر دے اور نفس کو شر سے پھیر کر کہ خیر کی طرف کھینچ لے جائے۔ یہی وہ تفسیر ہے جس کے بارے میں ہم نے کہا کہ یہ ہر ایک کے لیے آسان ہے۔

﴿وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْآنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُدَكِّرٍ﴾ (القر: ۱۷)

”اور تحقیق ہم نے قرآن پاک کو آسان کیا نصیحت حاصل کرنے کے لیے تو کوئی ہے جو نصیحت قبول کرنے والا ہو۔“

اور سب سے اونچا مرتبہ جو مندرجہ ذیل امور کے بغیر تام نہیں ہو سکتا۔

① قرآن کے الفاظ منفردہ کے حقائق کا فہم وہ اس طرح کہ مفسر اہل لغت کے استعمالات کی تحقیق کرے گا صرف اس پر اکتفا نہیں کرے گا کہ فلاں نے کہا اور فلاں نے سمجھا کیونکہ بہت سے الفاظ قرآن کے نزول کے وقت ایک معنی میں استعمال ہوتے تھے پھر زمانہ قریب یا بعید میں اس کا استعمال دوسرے معانی میں ہونے لگ گیا۔ اسی سے تاویل کا لفظ ہے کہ یہ مطلقاً تفسیر یا خاص تفسیر کے معنی میں مشہور ہو گیا جبکہ قرآن پاک میں اس کا استعمال دوسرے معنی کے لیے ہے جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿هَلْ يَنْظُرُونَ إِلَّا تَأْوِيلَهُ يَوْمَ يَأْتِي تَأْوِيلَهُ الَّذِينَ يَقُولُ الَّذِينَ نَسُوهُ مِنْ قَبْلُ قَدْ جَاءَتْ رُسُلٌ رَبِّنَا بِالْحَقِّ﴾ (الاعراف: ۵۳)

”کیا وہ لوگ کسی انجام کا انتظار کر رہے ہیں جس دن ان کا انجام آ جائے گا تو جو لوگ پہلے سے اس انجام کو بھلا چکے تھے وہ کہیں گے کہ ہمارے اب کے رسول واقعی حق لے کر آئے تھے۔“

اس سے مراد انجام ہے اور وہ مراد ہے جو قرآن پاک میں ثواب یا عقاب میں شمار ہوتا ہے یعنی وہ چیز جو اس کے وعدے اور وعید کا سبب بنتی ہے چنانچہ محقق مدقن یہ ہے کہ قرآن پاک کی تفسیر ان معانی کے مطابق کرنی چاہیے جو اس کے نزول کے وقت مستعمل تھے سب سے بہتر یہ ہے کہ قرآن پاک کے الفاظ خود مفہوم ہو جائیں وہ اس طرح کہ اس کے جو الفاظ کئی جگہ بار بار آئے ہیں ان کو جمع کر کے ان میں غور کرے بعض اوقات وہ مختلف معانی کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔ جیسے لفظ ”ہدایت“ وغیرہ اور تحقیق کرے کہ اس کا معنی آیت کے جملہ میں کیسے متفق ہوتا ہے پھر اس کے معانی کے بیچ سے معنی مطلوب کو پہچانے۔ علماء نے فرمایا کہ قرآن کا ایک حصہ دوسرے کی تفسیر کرتا ہے سب سے افضل قرینہ جو لفظ کے معنی کی حقیقت کے ساتھ قائم ہوتا ہے وہ اس کا گزشتہ قول کے موافق ہونا اور اس کا جملہ معنی کے ساتھ متفق ہونا اور اس مقصد کے موافق ہونا ہے جس کے ساتھ قرآن اس کا جملہ لے کر آیا ہے۔

② اسالیب: اس کے پاس ایسا علم ہونا چاہیے جس کے ذریعے وہ ان اعلیٰ اسالیب کو پہچان سکے۔ اور یہ کلام بلخج کی خوب مشق کرنے اور اس میں لگے رہنے سے حاصل ہوتا ہے اور اس کے علاوہ اس کے نکات اور محاسن کو سمجھنا اور منکلم کی مراد سے آگاہ ہونا بھی



ضروری ہے۔ ہاں البتہ ہم اللہ تعالیٰ کی مراد علی و وجہ الکمال والتمام سمجھنے کا دعویٰ نہیں کرتے لیکن ہمارے لیے ممکن ہے کہ اس سے بقدر طاقت ہدایت حاصل کریں۔ اس میں ہمیں علم اعراب کی ضرورت ہوگی اور علم الاسالیب (یعنی علم المعانی) لیکن ان فنون کا محض علم، ان کے مسائل کو سمجھنا اور ان کے احکام کو یاد کرنا مطلوب کے لیے مفید نہیں ہے۔ آپ کتب عربیہ میں دیکھتے ہیں کہ عرب بڑا عمدہ کلام کرتے تھے اور بات اس طرح کرتے تھے کہ ان کی بات قواعد وضع ہونے سے پہلے ہی قواعد کے موافق ہوتی تھی آپ کیا سمجھتے ہیں کہ یہ ان کے لیے طبعی تھا؟ نہیں بلکہ یہ ایک ملکہ تھا جو سماج اور ایک دوسرے کی نقل اتارنے سے حاصل ہوتا ہے اسی وجہ سے عربوں کی اولاد جب عجمیوں کے ساتھ خلط ملط ہو گئی تو وہ ان سے بھی بڑھ کر عجی ہو گئی اگر یہ چیز طبعی اور ان کی ذاتی ہوتی تو ہجرت کے بعد کے پچاس سالوں میں یہ مفقود نہ ہوتی۔

⑤ انسانوں کے احوال کا علم: اللہ تعالیٰ نے اس کتاب کو نازل کیا اور اسے آخری کتاب قرار دیا اور اس میں وہ چیزیں بیان کیں جو کسی اور میں نہیں کیں اور اس میں مخلوق کے بہت سے احوال طبعیتیں اور انسانوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا طرز عمل بیان کیا اور ہمارے سامنے اہم ماضیہ کے عمدہ عمدہ قصے اور ان کی سیرت جو ان میں اللہ تعالیٰ کی سنت کے موافق تھی بیان کی اس لیے اس کتاب میں غور کرنے والے کے لیے ضروری ہے کہ وہ انسانوں کے احوال میں غور کرے یعنی ان کے طور طریقے، ان کے ادوار ان کے احوال یعنی قوت عزت و ذلت، علم جنہل اور ایمان اور کفر میں ان کے مشتائے اختلاف میں غور کرے اور عالم کبیر کے احوال یعنی اس کے علو و سفل کو بھی جاننا ضروری ہے اس میں کئی فنون کی ضرورت ہے سب سے اہم تاریخ اس کی انواع سمیت ہے۔

قرآن پاک نے سابقہ اقوام، سنن الہیہ اور آسمان و زمین میں اور سارے جہان اور نفوس میں اللہ تعالیٰ کی نشانیوں کے بارے میں اجمالاً کلام کیا یہ ایک اجمال ہے جو اس ذات سے صادر ہوا ہے جس کا علم ہر چیز پر محیط ہے اور اس نے ہمیں حکم دیا کہ ہم غور و فکر کریں اور زمین میں سیر کریں تاکہ اس کے اجمال کو تفصیل کے ساتھ جانیں جس کی وجہ سے ہماری ترقی اور کمال بڑھے گا اور اگر ہم نے بظہر ظاہر علم کائنات پر اکتفاء کر لیا تو ہم اس شخص کی طرح ہو جائیں گے جس نے کتاب کی جلد کے رنگ کو کتاب سمجھ لیا اس علم و حکمت کو نہیں جسے کتاب گھیرے ہوئے ہے۔

⑥ قرآن کے ذریعے تمام انسانوں کی ہدایت کے طریقے کو جاننا: اس فرض کفایہ پر کربستہ مفسر کے لیے جانا بھی ضروری ہے کہ دور نبوت میں لوگ یعنی عرب و عجم کس طریقے پر تھے اس لیے کہ قرآن آواز دیتا ہے کہ لوگ سب کے سب بدبختی اور گمراہی میں تھے اور نبی کریم ﷺ ان کی ہدایت اور سعادت مندری کے لیے مبعوث ہوئے۔

اور مفسر جب تک ان کے احوال و اطوار کو نہ جانتا ہو تو ان کی ان عادات کو علی وجہ الحقیقت یا حقیقت کے قریب کیسے سمجھ سکتا ہے؟

حضرت عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ انھوں نے فرمایا کہ:

”جاہلیت کے احوال کا سب سے بڑا جاہل وہ شخص ہے جو اس بات سے ڈرتا ہو کہ اسلام کا کڑا ایک ایک کر کے ٹوٹ جائے گا۔“

مطلب یہ ہے کہ جو شخص اسلام میں پلا اور اپنے سے پہلے لوگوں کا حال نہ جانتا ہو تو وہ انسانوں کے احوال کو بدلنے والی اور انہیں ظلمات سے نور کی طرف نکالنے والی اللہ تعالیٰ کی عنایت اور ہدایت کی تاثیر سے بھی جاہل ہوگا۔

منائل العسرفان فی علوم القرآن: جلد ①

اور جو شخص اس سے جاہل ہوگا وہ سمجھے گا کہ اسلام ایک امر عادی ہے جیسا کہ آپ دیکھتے ہیں کہ جو لوگ نعمتوں اور نزاہتوں میں پلتے ہیں وہ وظائف اور مسواک میں شدت کو از قبیل لغوشار کرتے ہیں اس لیے کہ یہ ان کے نزدیک زندگی کی ضروریات میں سے ہیں اگر وہ اپنے علاوہ لوگوں کے طبقات کو جائیں تو وہ ان ادا میں اللہ تعالیٰ کی حکمتوں کو ضرور جان لیں گے اور یہ بھی جان لیں گے کہ یہ آداب کہاں سے آئے۔

④ نبی کریم ﷺ اور ان کے صحابہ رضی اللہ عنہم کی سیرت کا علم اور اس علم و عمل اور ان کی دنیوی و اخروی حالات میں تصرف کا علم جس پر وہ تھے۔ (تفسیر المنار تبصرہ قلیل)

## تفسیر بالرائے کے جواز میں اختلاف

تفسیر بالرائے میں علماء کرام کا اختلاف ہے کچھ لوگ جائز قرار دیتے ہیں اور کچھ منع کرتے ہیں جبکہ تحقیق وہی ہے جو ہم نے پہلے ذکر کر دی کہ یہ اپنی شرائط کے ساتھ جائز ہے اور جب شرائط نہ پائی جائیں تو ممنوع ہے اور یہ تفسیر کے ادنیٰ مرتبہ کے علاوہ کا حکم ہے اور یہ ادنیٰ مرتبہ اس میں ان شرائط کا اعتبار نہ بھی کریں تو جائز ہے اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے آسان کیا حتیٰ کہ عام لوگوں کے لیے بھی آسان کیا جیسا کہ ہم نے ذکر کر دیا۔ اور ہم آپ کی خدمت میں منع کرنے والوں اور اجازت دینے والوں میں سے ہر ایک کے دلائل پیش کرتے ہیں تاکہ اس موضوع میں آپ کی بصیرت اور نور اور زیادہ بڑھ جائے۔

**دلیل اول** • تفسیر بالرائے بغیر دلیل کے اللہ تعالیٰ پر ایک قول ہے اور بغیر علم کے اللہ تعالیٰ پر قول مانعین کے دلائل • کرنا ممنوع ہے لہذا تفسیر بالرائے ممنوع ہے۔

صغریٰ کی دلیل یہ ہے کہ رائے سے تفسیر کرنے والے کے بارے میں یقین نہیں کہ وہ مصیب ہے، زیادہ سے زیادہ اس کا ظن ہے اور ظن سے بولنے والا اللہ تعالیٰ پر بغیر علم کے بولنے والا ہوا۔ اور کبریٰ کی دلیل اللہ تعالیٰ کا قول:

﴿وَأَنْ تَقُولُوا عَلَى اللَّهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ﴾ (البقرہ: ۱۶۹)

”اور یہ کہ تم اللہ تعالیٰ پر بغیر علم کے بات کہو۔“

اس کا عطف ماقبل آیت میں بیان کردہ محرمات پر ہے:

﴿قُلْ إِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّيَ الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَّنَ وَالْإِثْمَ وَالْبَغْيَ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَأَنْ تُشْرِكُوا بِاللَّهِ مَا كَفَرُ يُعْزِلُ بِهِ سُلْطَانًا أَنْ تَقُولُوا عَلَى اللَّهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ﴾ (الاعراف: ۳۳)

”کہہ دو کہ میرے پروردگار نے تو بے حیائی کی باتوں کو ظاہر یا پوشیدہ اور گناہ کو اور ناذق زیادتی کرنے کو حرام کیا ہے اور اس کو بھی کہ تم کسی کو خدا کا شریک بناؤ جس کی اس نے کوئی سند نازل نہیں کی۔ اور اس کو بھی کہ خدا کے بارے میں ایسی باتیں



اور مرتبہ ہے اس لیے کہ عربیت کے صرف ظاہر کو لینا کافی اور درست نہیں ہے آپ اللہ تعالیٰ کے قول:

﴿وَإِنَّمَا تَشْمُذُوهُ النَّاقَةَ مُبْصِرًا فَظَلَمُوا بِهَا﴾ (الاسراء: ۵۹)

”اور ہم نے شمود کو اونٹنی دی بصیرت کے طور پر بس انہوں نے اس پر ظلم کیا۔“

اس کا معنی یہ ہے کہ ہم نے قوم شمود کو وضوح معجزہ کے طور پر اونٹنی دی جو ان کے لیے مبینہ طور پر ظاہر اور نمایاں تھی اور حضرت

صالح علیہ السلام اور ان کے دین کی صداقت پر دلیل تھی انہوں نے اس کی کوٹھیں کاٹ کر اپنے اوپر ظلم کیا۔

لغت عربیہ کو ظاہر طور پر جاننے والا سمجھتا ہے کہ ابصار سے مراد آنکھ کا دیکھنا ہے اور یہ نہیں جانتا کہ انہوں نے کیا ظلم کیا؟ کس

نے ظلم کیا؟ اپنے اوپر ظلم کیا یا کسی اور پر ظلم کیا؟

دونوں حدیثوں میں یہ احتمالات ہیں اور جب کسی دلیل میں احتمال آ جائے تو اس سے استدلال ساقط ہو جاتا ہے۔ نیز

حدیث جناب کا مزید جواب یہ بھی ہے کہ اس حدیث کی صحت بھی ثابت نہیں اور اگر صحیح مان لیا جائے تو بھی احتمال ہے کہ اس کا معنی یہ

ہو کہ: ”اس نے معنی تلاش کرنے کے طریقے میں خطا کی۔“ اس لیے کہ قرآن پاک کے الفاظ کی معرفت کا راستہ صرف لغت اور اس

کے نام ہیں اور اس کے نزول کے اسباب اور اس کے ناخ و منسوخ وغیرہ کی تیز کار راستہ صرف نفل صحیح ہے اور اللہ تعالیٰ کی قطعی مراد کا

راستہ صرف وہ ہے جو نبی کریم ﷺ سے وارد ہوا ہے اور اگر وارد ہونے والے راستے پر کامیابی نہ ہو تو قیاس و اجتہاد کرنے اور وارد

کے ساتھ غیر وارد پر استدلال کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

**تیسری دلیل** صحابہ رضی اللہ عنہم اور تابعین رضی اللہ عنہم سے وارد ہے کہ وہ حضرات قرآن پاک میں اپنی رائے سے بات کرنے سے بچتے تھے

چنانچہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ: ”کونسا آسمان مجھ پر سایہ کرے گا اور کونسی زمین مجھے ٹھکانہ دے گی

جب میں قرآن میں اپنی رائے سے بات کروں گا یا بغیر علم کے بات کروں گا؟“

نیز حضرت سعید بن المسیب رضی اللہ عنہ سے وارد ہے کہ جب ان سے قرآن پاک کی کسی آیت کی تفسیر کے بارے میں پوچھا گیا

تو انہوں نے فرمایا کہ: ”میں قرآن پاک کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔“

اور شعبی سے منقول ہے کہ: ”تمن چیزوں کے بارے میں میں مرنے تک بھی کچھ نہیں کہہ سکتا: ① قرآن ② روح ③ خواب۔

اس کے علاوہ اور بہت سی احادیث ہیں جو دلالت کرتی ہیں کہ وہ حضرات قرآن پاک میں اپنی آراء سے بات کرنے سے رکے رہے۔

**جواب ①** ان کا قرآن میں نہ یوں بطور تقویٰ تھا کہ کہیں عین یقین تک نہ پہنچیں اور تقویٰ کا معنی ہے: ”جائز چیزوں کو اس

خوف سے چھوڑ دینا کہ کہیں ناجائز چیزوں میں نہ پڑ جائیں۔“

② ان کے رکنے میں یہ بھی احتمال ہے کہ یہ ان چیزوں کے ساتھ مقید ہو جن میں وہ وجہ صواب کو نہ جانتے ہوں اور جن میں وہ وجہ

صواب کو جانتے ہوں ان میں وہ نہ رکتے ہوں اگرچہ وجہ صواب ظنی ہو قطعی نہ ہو۔ اور ابو بکر رضی اللہ عنہ ہی کو دیکھ لیں کہ جب ان سے

”کلالہ“ کے بارے میں پوچھا گیا جو اس آیت کریمہ میں ہے:

﴿يَسْتَفْتُونَكَ - فِي الْكَلَّةِ - قُلِ اللَّهُ يُفْتِيكُمْ فِي الْكَلَّةِ﴾ (الاسراء: ۱۷۲)

”اور وہ آپ سے سوال کرتے ہیں کلالہ کے بارے میں آپ فرمادیجئے کہ اللہ تعالیٰ کلالہ کے بارے میں فتویٰ دیتا ہے کہ۔“



حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ:

”اس میں اپنی رائے سے تلا تا ہوں اگر درست ہو تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اور اگر غلط ہو تو میری طرف سے یا شیطان کی طرف سے۔ ﴿الْحِكْمَةُ﴾ فلاں فلاں چیز کو کہتے ہیں۔ اسی طرح کی گفتگو حضرت علی، ابن عباس وغیرہ جیسے صحابہ رضی اللہ عنہم اور تابعین رضی اللہ عنہم کی طرف سے وارد ہوئی ہے۔

③ ان کے رکنے میں یہ بھی احتمال ہے کہ جن چیزوں کے بارے میں قطعی دلیل قائم نہیں ہوئی ان میں قطعیت کے طور پر بولنا۔

④ یہ بھی احتمال ہے کہ یہ اس صورت کے ساتھ مفید ہو جب ان کی طرف سے کوئی اور لوگ قرآن پاک کی تفسیر اور بیان کے واجب درجہ کو انجام دینے کے لیے قائم ہوں اور جب سوال انھی پر منحصر ہو تو معقول ہے کہ اس صورت میں وہ نہ رکے ہوں ورنہ علم کو چھپانے والے گنہگار ہوں گے جب کہ یہ حضرات اس سے بالکل بری ہیں اللہ تعالیٰ ان پر رحم فرمائے اور ان کو بہتر جزاء عطا فرمائے اور ان کا ٹھکانہ عمدہ کرے۔

تفسیر بالرائے کو جائز قرار دینے والوں کے دلائل ﴿تفسیر بالرائے کو جائز قرار دینے والوں کے کئی دلائل ہیں۔

① اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ:

﴿أَفَلَا يَتَذَكَّرُونَ الْقُرْآنَ أَمْ عَلَىٰ قُلُوبٍ أَقْفَالُهَا﴾ ﴿عم: ۲۴﴾

”کیا وہ قرآن پاک میں غور نہیں کرتے یا ان کے دلوں پر تالے لگے ہوئے ہیں۔“

نیز اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ:

﴿كِتَابٌ أَنْزَلْنَاهُ لِيُذَكِّرَ الَّذِينَ لَيْدُوا آيَاتِهِ وَ لِيَتَذَكَّرَ أُولُو الْأَلْبَابِ﴾ ﴿ص: ۲۹﴾

”یہ کتاب ہے جسے ہم نے آپ کی طرف نازل کیا تاکہ وہ لوگ اس کی آیات میں تدبر کریں اور سمجھ دار لوگ نصیحت حاصل کریں۔“

اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ:

﴿وَلَوْ رَدُّوهُ إِلَى الرَّسُولِ وَإِلَىٰ أُولِي الْأَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِينَ يَسْتَنبِطُونَهُ مِنْهُمْ﴾ ﴿النساء: ۸۳﴾

”اگر وہ لوگ اسے رسول اللہ ﷺ یا اولوالام کی طرف لوٹاتے تو تحقیق کرنے والے ضرور اس کی تہ کو پہنچ جاتے۔“

وجہ استدلال ﴿اللہ تعالیٰ نے تدبر قرآن اور اس کی آیات میں غور و فکر کرنے اور اس کی نصیحتوں سے نصیحت حاصل کرنے پر ابھارا ہے لہذا یہ دلیل ہے کہ عقل مندوں کو جو عقل سلیم اور پاکیزہ دماغ دیا گیا ہے ان کی ذمہ داری

ہے کہ وہ ان چیزوں کی تاویل کریں جنہیں اللہ تعالیٰ نے اپنے علم کے ساتھ خاص نہیں کیا اس لیے کہ تدبر اور نصیحت حاصل کرنا کتاب اللہ میں تفقہ اور فہم کی فرع ہے اور آیت کریمہ دلالت کرتی ہے کہ قرآن پاک میں وہ چیزیں بھی ہیں جنہیں اولوالالباب اور فہم ثاقب والے مستنبط کرتے یعنی ان کا استخراج کرتے ہیں۔

”محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ“

② رسول اللہ ﷺ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے لیے اپنی دعائیں فرمایا کہ:

”اے اللہ! اسے دین کا تقاضہ اور تاویل کا علم عطا فرما۔“ اگر تاویل قرآن پاک کے الفاظ کے سماع اور نقل پر موقوف ہوتی تو اس کی تخصیص کا فائدہ نہ ہوتا لہذا یہ دلیل ہے کہ تاویل نقل کے خلاف ہے اور اس صورت میں یہ اجتہاد اور رائے کے ساتھ تفسیر ہوگی۔“

③ اگر تفسیر بالرائے ناجائز ہوتی تو بہت سے احکام معطل ہو جاتے اور لازم باطل ہے اس لیے کہ نبی کریم ﷺ نے ہر آیت کی تفسیر نہیں کی اور مجتہد اگر خطا بھی کرے تو بھی اسے اجر ملے گا جب تک کہ وہ اپنی کوشش پوری کرے اور اجتہاد میں واجب وسائل کو نہ چھوڑے اور اس کی غرض حق اور صواب تک پہنچنا ہو۔

اور یہ بھی ممکن ہے کہ اختلاف لفظی ہو کہ مجوزین کے کلام کو اس تفسیر بالرائے پر محمول کیا جائے جس میں اس کی گزشتہ بالا شرائط پوری ہوں کیونکہ اس صورت میں وہ کتاب اللہ، سنت رسول اللہ اور کلام عرب کے موافق ہوگی اور یہ جائز ہے نہ اس میں کوئی برائی اور نہ ہی اس سے ممانعت ہے۔

اور مانعین کے کلام کو اس تفسیر بالرائے پر محمول کیا جائے جس میں گزشتہ بالا شرائط مفقود ہوں کیونکہ اس صورت میں وہ اولہ شرعیہ اور لغت عربیہ کے مخالف ہوگا اور یہ جائز نہیں بلکہ منہی عنہ اور مذموم ہوگی۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہما کا کلام بھی اس پر محمول ہوگا کہ انھوں نے فرمایا کہ: ”مغزیرب کچھ تو میں ایسی آئیں گی جو تمھیں کتاب اللہ کی طرف دعوت دیں گی حالانکہ انھوں نے اسے اپنی پیٹھ پیچھے بھینک دیا ہوگا اس لیے تم علم کو لازم پکڑو اور بدعت اور تمسح (بہت زیادہ غلو اور بار بار گہرائی سے سوال جواب کرنا) سے بچو! حضرت عمر رضی اللہ عنہما کا قول بھی اسی طرح محمول کیا جائے گا کہ مجھے تم پر دو قسم کے لوگوں کا خوف ہے ایک وہ شخص جو بغیر تاویل کے قرآن کی تاویل کرے اور دوسرا وہ شخص جو اپنے بھائی کے مقابلے میں حکومت حاصل کرنے کی کوشش کرے۔“

اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کا قول یہ بھی ہے کہ مجھے اس امت پر کسی مومن کا خوف نہیں ہے کہ جس کا ایمان اسے روک دے اور نہ ہی کسی ایسے فاسق کا خوف ہے جس کا فسق واضح ہو بلکہ مجھے ایسے آدمی کا خوف ہے جس نے قرآن پاک پڑھا ہو اور اس میں اس کی زبان خوب چلے (یعنی روانگی سے پڑھے) لیکن وہ اس کی غلط تاویل کرے۔

یہ سب چیزیں اس تفسیر پر محمول ہیں جو اولہ شرعیہ اور لغت عربیہ کے موافق نہ ہو اور جو یہ بات بالکل واضح ہے کہ قرآن میں اپنی رائے سے بات کرنا اس کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام سے یہ مراد لیا ہے اور یہ معاملہ بہت زیادہ خطرناک ہے اور اس کی بہت بڑی ذمہ داری ہے اللہ تعالیٰ سے ہم سلامتی کا سوال کرتے ہیں۔

## مفسرین بالرائے کا طریقہ کار

گزشتہ بالا کا خلاصہ یہ ہوا کہ جو شخص تفسیر کے اعلیٰ مراتب کی کوشش کرے تو اس پر ضروری ہے کہ وہ تقویٰ کو اختیار کر لے اور ان تمام علوم کو ذریعہ بنائے جنہیں ہم نے آپ کے سامنے واضح کیا تاکہ مراد کو درست یا درستی کے قریب پالے اور اس پر ضروری

## مسائل العرفان فی علوم القرآن: جلد ①

ہے کہ وہ درست اور صواب کے طریقے پر چلے اور مندرجہ ذیل امور کی اتباع کرے۔

- ① قرآن پاک سے معنی کو طلب کرے اگر قرآن پاک سے نہ ملے تو سنت سے تلاش کرے اس لیے کہ یہ قرآن پاک کی شارح ہے اور اگر اس سے تھک جائے تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اقوال کی طرف رجوع کرے کیونکہ وہ قرآن پاک اس کے حالات اور اس کے سبب نزول کو زیادہ جانتے ہیں جب وہ نازل ہوا انھوں نے اس کا مشاہدہ کیا یہ چیزیں ان کے امتیازات یعنی علم و عمل سے بھی بڑھ کر ہیں اور سب سے بہترین تفسیر وہ ہے جو بائنا نقل ہوں۔ اگر وہ کتاب و سنت اور ماثرات صحابہ سے بھی معنی نہ پائے تو اس پر ضروری ہے کہ وہ اپنی طاقت کے بقدر اجتہاد کرے اور مندرجہ ذیل امور کی اتباع کرے۔
- ① الفاظ مفرد سے تعلق رکھنے والی چیزوں یعنی لغت، صرف اور اشتقاق سے ابتداء کرے اور ان معانی کا لحاظ رکھے جو قرآن کریم کے نزول کے وقت مستعمل تھے۔

② اس کے بعد کلام کو اعراب و بلاغت کی جہت سے تراکیب کے پیچھے لگائے تاکہ اس کے حاسہ بیانہ میں اس کا ذائقہ محسوس ہو۔

③ معنی حقیقی کو معنی مجازی پر مقدم کرے یاں طور کہ جب تک معنی حقیقی معجز نہ ہو تو معنی مجازی کی طرف نہ جائے۔

④ اسباب نزول کا لحاظ رکھے کیونکہ سبب نزول کا معنی مراد کی بیان میں بڑا دخل ہوتا ہے جیسا کہ اس کی تحقیق ”مبحث اسباب النزول“ میں گزر چکی ہے۔

⑤ ایک آیت کے جملوں اور کئی آیات میں سابق و لاحق کی رعایت رکھنا۔

⑥ سیاق کلام سے مقصود کی رعایت رکھنا۔

⑦ تفسیر کی مفسر کے ساتھ مطابقت، نہ کی ہو نہ زیادتی۔

⑧ تفسیر کا ان معروف چیزوں کے موافق ہونا یعنی علوم کونیہ، سنن، اجتماع، بشرعام کی تاریخ اور نزول قرآن کے وقت خاص عربوں کی تاریخ۔

⑨ نبی کریم ﷺ اپنی سنت اور سیرت میں جن اعمال پر تھے تفسیر کا ان کے بھی موافق ہونا اس لیے کہ آپ ﷺ اپنی سنت کے ذریعے جو آپ ﷺ کے اقوال، افعال، شمائل اور تقریرات کو جامع تھی قرآن کی تفسیر کرنے میں مضموم تھے۔

⑩ بات کو معنی مراد اور اس سے لغت شریعت اور قوانین کو ان کی حدود میں مستنبط ہونے والے احکام اور معنی مراد کے بیان پر ختم کرے۔

⑪ احتمال کے وقت ترجیح کے مندرجہ ذیل قانون کی رعایت کرے:

## احتمال کے وقت ترجیح کا قانون

امام سیوطی رضی اللہ عنہ نے اپنی ”الاتقان“ میں فرمایا کہ ہر وہ لفظ جس میں کئی معانی کا احتمال ہو تو غیر علماء کو اس میں اجتہاد کرنا جائز نہیں اور ان کی ذمہ داری ہے کہ وہ دلائل پر اعتماد کریں مخلص رائے پر نہیں۔

”محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ“

اگر ان معانی میں سے کوئی ایک معنی زیادہ واضح ہو تو اس پر محمول کرنا واجب ہے سوائے اس کے کہ دلیل اس کے علاوہ کسی اور کو مراد لینے پر قائم ہو جائے۔

اور جب دونوں برابر ہوں اور دونوں میں استعمال بطور حقیقت ہو لیکن ایک میں لغوی ہو یا عربی ہو اور دوسرے میں شرعی تو شرعی پر محمول کرنا اولیٰ ہوگا سوائے اس کے کہ کوئی دلیل لغوی معنی کے مراد ہونے پر دلالت کرے جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ:

﴿وَصَلِّ عَلَيْهِمْ : إِنَّ صَلَاتَكَ سَكَنٌ لَهُمْ﴾ (انبیاء: ۱۰۳)

”ان کے حق میں دعا کرو! اس لیے کہ تمہاری دعا کرنا ان کے لیے تسکین کا باعث ہوگی۔“

اور اگر ایک میں عربی اور دوسرے میں لغوی تو عربی پر محمول کرنا بہتر ہوگا۔

اور اگر اس میں بھی دونوں برابر ہوں تو اگر ان دونوں کا اجتماع ایک دوسرے کے منافی ہو اور ایک لفظ سے دونوں کو مراد لینا ممکن نہ ہو جیسے حیض اور طہر۔ ان دونوں کی مراد میں ان پر دلالت کرنے والے دلائل کے ذریعے خوب اجتہاد کرے پھر جو اس کا گمان ہوگا وہی اللہ تعالیٰ کی حقیقی مراد ہوگی۔

اور اگر اس کا کسی پر بھی شرح صدر نہ ہو تو پھر کیا اسے اختیار ہوگا کہ وہ سخت یا نرم کو اختیار کرے؟ اس میں کئی اقوال ہیں محققین کے نزدیک اگر وہ ایک دوسرے کے منافی نہ ہوں تو ان دونوں پر محمول کرنا واجب ہوگا اور یہ اجازت فصاحت میں سب سے بڑھ کر ہے۔ سوائے اس کے کہ کوئی دلیل ان دونوں میں سے کسی ایک کو مراد لینے پر دلالت کرے۔

## سنت کا قرآن کے لیے بیان ہونے کی وجوہ

بیچھے کئی مرتبہ گزر چکا کہ سنت قرآن پاک کی شارح ہے اس لیے کہ رسول اللہ ﷺ کا مشغلہ تبلیغ و بیان تھا جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ:

﴿وَأَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ﴾ (نمل: ۴۳)

”اور ہم نے آپ پر ذکر یعنی قرآن پاک کو نازل کیا تاکہ آپ لوگوں کے سامنے واضح کر دیں جو ان کی طرف نازل کیا گیا۔“

اسی طرح آپ نے فرمایا کہ:

”خبردار مجھے کتاب دی گئی اور اس کے ساتھ اس کی طرح کا بھی۔ سن لو کہ عترتِ بیک ایک پیٹ بھرا ہوا آدی آئے گا جو اپنی چار پائی پر پریک لگائے ہوئے بیٹھا ہوگا کہ گاہ کہ اس قرآن کو پکڑا اس میں جو حلال ہے اس کو حلال سمجھو اور اس میں جو حلال پاؤ اسے حلال سمجھو... الخ۔“<sup>①</sup>

آپ ﷺ کے قول: ”مجھے کتاب بھی دی گئی اور اس کے ساتھ اس جیسا“ اس کا معنی یہ ہے کہ مجھے وحی متلو اور وحی غیر متلو دونوں

دیے گئے تاکہ اسے اچھی طرح واضح کیا جائے اور کھول دیا جائے اور یہ سب اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہیں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ:

﴿وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ ۗ إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ﴾ (النجم: ۴۳)

”آپ ﷺ اپنی خواہش سے نہیں بولتے بلکہ یہ تو ایک وحی ہے جو آپ کی طرف کی گئی۔“

اور اس حدیث میں آپ ﷺ کا فرمان کہ عنقریب ایک آدمی آئے گا... الخ۔ یہ دلالت کرتا ہے کہ عنقریب ایک قوم آئے گی جو قرآن کے ظاہر کو پکڑے گی جیسے رؤف اور خوارج اور وہ قرآن کی وضاحت کرنے والی سنت کو چھوڑ دیں گے وہ خود بھی گمراہ ہوں گے اور دوسروں کو گمراہ کریں گے۔

چار پائی پر ہونے سے مراد یہ ہے کہ وہ نعمتوں کی وجہ سے سرکش ہو چکے ہوں گے اور علم کی طلب اور رسول اللہ ﷺ کی احادیث کی تعقیب سے غافل ہو چکے ہوں گے۔

یہ حدیث دلالت کرتی ہے کہ جس چیز کا ثبوت نبی کریم ﷺ سے صحیح ثابت ہو خواہ وہ قول ہو یا فعل قرآن کی طرح وہ بھی حجت ہے۔

پھر سنت کا بیان کنی وجوہ پر ہے۔

① قرآن میں مجمل کا بیان جیسے پانچ نمازوں کے اوقات کا بیان، ان کی تعداد کا بیان، ان کے رکوع و سجود وغیرہ کی کیفیت کا بیان اور زکوٰۃ کی مقدار، اس کے اوقات اور انواع کا بیان اور اسی طرح حج کے مناسک کا بیان وغیرہ جو قرآن میں مجمل بیان ہوئے اور انھیں سنت نے واضح کیا۔ اسی وجہ سے فرمایا کہ: ”مجھ سے مناسک حاصل کرو۔“ اور فرمایا کہ: ”ایسے نماز پڑھو جیسے تم مجھے نماز پڑھتا دیکھتے ہو۔“<sup>۱</sup>

امام احمد رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ: ”سنت کتاب کی تفسیر اور بیان کرتی ہے۔“

② قرآن پاک کے احکام پر مزید احکام کا بیان جیسے عورت کا اس کی پھوپھی یا خال کے ہوتے ہوئے نکاح کی حرمت اور گھر یلو گدھے کی حرمت اور ہر پہلی والے درندے کا حرام ہونا اور قسم اور شاہد کے ذریعے فیصلہ کرنا وغیرہ جو اصول فقہ اور فقہ میں موجود ہیں۔

③ لفظ یا اس کے متعلق کے معنی کا بیان جیسے ”مغضوب علیہم“ کی تفسیر یہود کے ساتھ اور ”الضالین“ کی تفسیر نصاریٰ کے ساتھ کرنا اسی طرح اللہ تعالیٰ کے قول: ﴿وَلَهُمْ فِيهَا أَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ﴾ (البقرہ: ۲۵) کی تفسیر یہ کرنا کہ وہ جنس، پانخانہ، ریشہ اور تھوک سے پاک ہوں۔ اور

﴿قَبِيلَ الَّذِينَ ظَلَمُوا فَلَوْلَا غَيْرَ الَّذِي قِيلَ لَهُمْ﴾ (البقرہ: ۵۹)

”ظلم کرنے والوں نے اس بات کو دوسرے لفظ سے بدل دیا جو ان سے نہیں کہا گیا۔“

کی تفسیر کہ: ”وہ اپنی سرینوں کے بل رنگ رہے تھے اور کہہ رہے تھے کہ ”حَبْتَةٌ فِي شَعْبِ عَيْنَةٍ“ (غلہ میں جو) جبکہ انھیں

① بخاری کتاب الاذان باب ۱۸، کتاب الادب ۲۷، کتاب الاحادیث دارمی کتاب الصلوٰۃ باب ۳۲، مسند احمد ۵/۵۳

﴿سُبْحَانَكَ اللَّهُمَّ وَبِحَمْدِكَ﴾ (البقرہ: ۵۸) اور دروازے میں سجدہ کرتے ہوئے داخل ہو۔ اور ”حِطَّة“ (ہمارے گناہ معاف کر دے) کہتے ہوئے داخل ہو۔

## ② تفسیر بالرائے اور تفسیر بالمأثور میں تعارض اور ان میں ترجیح کے لیے قابل اتباع طریقہ

جاننا چاہیے کہ تفسیر بالرائے مذسوم یہاں مراد نہیں، اس لیے کہ یہ شروع میں ہی ساقط ہے لہذا اس میں تفسیر بالمأثور کا معارض بننے کی طاقت ہی نہ رہے گی۔

پھر یہ بھی جاننا چاہیے کہ تفسیر بالمأثور اور تفسیر بالرائے محمود کے درمیان تعارض کا مطلب یہ ہے کہ ان دونوں کے درمیان تناقض ہو یا اس طور کہ ایک اثبات پر دلالت کرے اور دوسری نفی پر گویا کہ ان متنافیوں میں سے ہر ایک راستے میں کھڑا ہو گیا اور اس نے دوسرے کو اس میں چلنے سے منع کر دیا۔

اور جب وہ آپس میں ایک دوسرے کے منافی نہ ہوں تو کوئی تعارض نہیں، اگرچہ تغایر ہو۔ جیسے ﴿الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ﴾ کی تفسیر قرآن، سنت طریق عبودیت یا اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول اللہ ﷺ کی اطاعت کے ساتھ کرنا یہ معانی اگرچہ متغایر ہیں لیکن منافی نہیں ہیں۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کے اس قول میں جو کہا گیا کہ:

﴿فَإِنَّهُمْ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهِمْ وَأَنفُسِهِمْ مُّقْتَصِدٌ وَمِنْهُمْ سَابِقٌ بِالْخَيْرَاتِ إِذْ بَدَأَ اللَّهُ﴾ (ناظر: ۳۲)

”ان میں سے بعض اپنے اوپر ظلم کرنے والے ہیں اور بعض میانہ رو ہیں اور بعض اللہ تعالیٰ کے حکم سے نیکیوں پر سبقت کرنے والے ہیں۔“

جو کچھ بھی کتب تفسیر میں کہا گیا وہ متنافی نہیں ہے لہذا متعارض نہ ہوگا اور نہ ہی متناقض ہوگا۔

اس آیت کی تفسیر میں ایک قول یہ ہے کہ ظالم وہ ہے جسے اللہ تعالیٰ کے حکم پر موقوف کروایا گیا ہو۔ اور مقتصد وہ ہے جو نیک اور برے اعمال کو خلط ملط کرنے والا ہو اور خیرات میں سبقت کرنے والا وہ شخص ہے جو خیر کو خالص کرنے والا ہے۔ بعض نے کہا کہ ”السابق، مخلص، المقتصد“ ریا کار اور ”ظالم“ نعمتوں کو چھپانے والا انکار کرنے والا نہیں۔ بعض نے کہا کہ سابق جس کی نیکیاں راجح ہوں ”مقتصد“ جس کی نیکیاں اور برائیاں برابر ہوں اور ظالم جس کی برائیاں راجح ہوں۔ بعض نے کہا کہ ”سابق، عالم مقتصد“ ”معلم اور ظالم جاہل۔“ بعض نے کہا کہ ظالم وہ ہے جو غفلت اور عادت کے طور پر اس کی عبادت کرتا ہو اور مقتصد وہ ہے جو کوشش کرتا ہو کہ صرف حلال حاصل کرے اور سابق جو دنیا سے منہ پھیرنے والا ہو۔ بعض نے کہا کہ ظالم دنیا کا طالب، مقتصد آخرت کا طالب اور سابق مولیٰ کا طالب اور اس کی علاوہ بھی بہت سے اقوال ہیں۔

اور ”دارالکتب مصر“ میں ایک جلد ہے جو علی بن محمد بن عمرو نسکی کی لکھی ہوئی ہے اس کا نام ”تحفة الاحیاب“ فی تفسیر



”ثم اور ثنا الكتاب“ ہے۔

جب یہ قرار پایا گیا پھر تفسیر بالماثور جو نص قطعی سے ثابت ہو اس کا تعارض تفسیر بالرأے سے ممکن نہیں اس لیے کہ رائے یا تو ظنی ہوگی یا قطعی ہوگی جو کسی عقلی یا فطری دلیل قطعی پر مستند ہوگی اگر قطعی ہو تو دو قطعی چیزوں کے درمیان تعارض نہیں ہو سکتا بلکہ ماثور میں تاویل کی جائے گی تاکہ قطعی پر مستند رائے کی طرف رجوع کیا جاسکے بشرطیکہ اس میں تاویل ممکن ہو، تاکہ دونوں ذیلیوں کو جمع کیا جاسکے اور اگر تاویل ممکن نہ ہو تو لفظ کریم کو اس معنی پر محمول کیا جائے گا جس کا رائے اور اجتہاد تقاضا کرتے ہیں تاکہ ارجح مرجوح پر مقدم ہو جائے۔

اور اگر رائے ظنی ہو یعنی دلیل قطعی سے خالی اور صرف علامات اور ظاہری قرآن کی طرف مستند ہو تو ماثور قطعی کو رائے پر مقدم کیا جائے گا اس لیے کہ یہ بدیہی ہے کہ ضرورت یقین سے اتویٰ ہوتی ہے۔

یہ سب باتیں اس صورت میں ہیں جب ماثور قطعی ہو اور اگر ماثور اپنی دلالت میں قطعی نہ ہو بوجہ نص نہ ہونے کے یا متن میں قطعی نہ ہو بوجہ خبر آحاد ہونے کے پھر وہ تفسیر بالرأے کے معارض آجائے تو بھی یا تو جس میں تعارض ہوا ہے اس میں رائے کی گنجائش نہ ہوگی اس صورت میں قابل اعتماد صرف ماثور ہوگا اور رائے کو قبول نہیں کیا جائے گا۔

اور اگر اس میں رائے کی گنجائش ہو تو اگر انھیں جمع کرنا ممکن ہو تو فیہا در نہ جو نبی کریم ﷺ یا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے ماثور ہے اسے مقدم کیا جائے گا اس لیے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم ہی وہی کا مشاہدہ کیا تو ان پر بعید ہے کہ وہ قرآن میں محض خواہش کی بناء پر بات کریں۔

اور جو تابعین سے ماثور ہے اگر وہ اہل کتاب سے منقول ہو تو تفسیر بالرأے کو اس پر مقدم کیا جائے گا اور اگر ان سے منقول نہ ہو تو سماع کی طرف رجوع کریں گے جس کی سماع تائید کرنے تو لظہم قرآنی کو اس پر محمول کیا جائے گا اور اگر سماع وغیرہ سے کوئی ایک بھی راجح نہ ہو تو تو ہم کسی کے بارے میں قطعی فیصلہ نہیں کریں گے کہ یہی مراد ہے بلکہ لظہم قرآنی کو مجمل قبل التفصیل کے مقام پر چھوڑ دیں گے یا مشتبه یا مبہم کے مقام پر چھوڑ دیں گے جس کا بیان ابھی نہ آیا ہو۔

**تفسیر بالرأے کی اہم کتابیں** ﴿﴾ اس سے قبل آپ جان چکے کہ تفسیر بالرأے میں سے ایک ممدوح اور جائز ہوتی تالیفات اور ان کے مؤلفین کا بیان کیا جاتا ہے۔

① دوحیل القدر امام جلال الدین محمد بن حنفیہؒ اور جلال الدین عبدالرحمن سیوطیؒ وینڈیہ۔

ان دونوں نے مشہور و معروف تفسیر جلالین تالیف کی۔

② امام بیضاوی: ”ناصر الدین بن سعید جو انوار التزیل و اسرار التاویل“ کے مؤلف ہیں۔

③ فخر الدین رازی: محمد بن علامہ ضیاء الدین عمر، جو خطیب الراہی کے نام سے مشہور ہیں ان کی تفسیر کا نام ”مفتاح الغیب“ ہے۔

④ ابوالسعود دمجہ بن محمد مصطفیٰ طحاوی، ان کی تفسیر کا نام ”ارشاد العقل السلیح الی مزایا القرآن الکریم“

⑤ علامہ شہاب الدین آلوسی ان کی تفسیر کا نام ”روح المعانی“ ہے۔

⑥ نظام الدین الحسن محمد نیساپوری ان کی تفسیر کا نام ”غرائب القرآن و رغائب الفرقان“ ہے۔

④ علامہ شیخ محمد شریفی خطیب، ان کی تفسیر کا نام "السرراج المنیر فی الاعانة علی معرفة کلام ربنا الخبیر" ہے۔

⑤ ابوالبرکات عبداللہ بن احمد بن محمود سنی، ان کی تفسیر کا نام "مدارک التنزیل وحقائق التاویل" ہے۔

⑥ علاء الدین علی بن محمد بن ابراہیم بغدادی، ان کی تفسیر کا نام "تفسیر خازن" ہے۔

تفسیر جلالین ✽ تفسیر جلالین ایک قیمتی تفسیر ہے، کسی حد تک سہل المأخذ ہے اور اس کی عبارت بہت زیادہ مختصر ہے لیکن مفید اور شائع و ذائع ہونے کے اعتبار سے تقریباً سب سے بڑی تفسیر ہے، اگرچہ شرح اور حتم کے اعتبار سے چھوٹی ہے۔ اسے اہل علم میں سے مختلف طبقات ہاتھوں ہاتھ لیتے ہیں، اس کی طباعت کئی طریقے سے ہو چکی ہے ایک مرتبہ خالی طبع ہوئی پھر "مصنف شریف" کے حاشیے کے ساتھ اور تیسری مرتبہ حاشیہ صاوی کے ساتھ اور چوتھی مرتبہ حاشیہ الجمل کے ساتھ۔ اس کا سب سے وسیع حاشیہ حاشیہ الجمل ہے اور عجیب بات یہ ہے کہ بڑے بڑے علماء اسے تفسیر میں معروف اعلیٰ تعلیم کے لیے استعمال کرتے ہیں اور اساسی مادہ کی طرح اس کے گرد گھومتے ہیں حتیٰ کہ تفسیر کے مشہور اسباق جو علامہ مرحوم شیخ عبدہ کی طرف منسوب ہیں ان کا ان دووں میں مضمون تفسیر جلالین تھا جیسا کہ آپ نے سن لیا۔

تفسیر البیضاوی ✽ یہ ایک جلیل القدر اور دقیق کتاب ہے، اس میں انھوں نے لغت عربیہ کے قوانین کے مطابق تفسیر اور تاویل کو جمع کر دیا اور اہل سنت کے اصول کے مطابق دلائل کو پختہ کیا اور اس کا التزام کیا کہ ہر سورت کو اس کی فضیلت میں روایت ہونے والی احادیث پر ختم کیا، لیکن انھوں نے ان میں صحیح کی چھان بین نہیں کی، اس کے متداول حواشی میں سے سب سے اچھا حاشیہ شہاب خفاجی رحمۃ اللہ علیہ کا حاشیہ ہے اور اس کے اور بھی کئی حواشی ہیں جن میں سے حاشیہ سعدی آفندی ہے حاشیہ روشنی ہے حاشیہ شستری ہے حاشیہ شیروانی حاشیہ سمرقندی جو سورۃ فاتحہ کی تفسیر میں ہے اور حاشیہ اسفراکنی ہے جو پارہ عم پر ہے اور حاشیہ ابن امیرخان ہے جو سورۃ الملک پر ہے۔

تفسیر فخر الدین رازی ✽ اس پر "تفسیر اہل الکلام" کے عنوان کے تحت کلام آئے گا۔

تفسیر ابوالسہم ✽ یہ ایک خوشگوار اور ممتاز تفسیر ہے اس کا حسن تعبیر آپ کو سرگشتہ و حیران بنا دے گی اس کی پاکیزہ فکر آپ کو بھائے گی اور یہ حشو و زوائد سے خالی اور مایانہ روی والی تفسیر ہے اس میں دو امور کے التزام کا اہتمام کیا گیا ہے ایک یہ کہ تفسیر کے مراحل میں سے ہر مرحلہ کے شروع میں قرأتوں اور وقف پر کلام کیا گیا ہے اور دوسرا یہ کہ ان مراحل میں سے آخری مرحلہ میں تاویل اشاری پر کلام کیا گیا ہے اور اس کی مشہور طباعت تفسیر ابن جریر کے حاشیہ پر ہے اور یہ فخر الدین رحمۃ اللہ علیہ کی تفسیر کا اختصار اور اس کے ساتھ ایک بہت بڑی تہذیب بھی ہے۔

تفسیر آلوسی ✽ تفسیر اشاری کے موقع پر کلام آئے گا۔

تفسیر لسنی ✽ یہ ایک بہت بڑی کتاب ہے جو مشہور و متداول ہے، بہت آسان اور دقیق ہے۔ صاحب کشف الظنون نے اس کے بارے میں فرمایا کہ: یہ کتاب تاویلات میں مرکز و وسطی ہے، اعراب اور قراءات کی وجہ کو جامع ہے، علم بدیع اور اشارات کے دقائق کو مستظہم ہے۔ اہل سنت و الجماعت کے عقائد کو نمایاں کرتی ہے اہل بدعت اور اہل ضلالت کے باطلوں سے خالی ہے نہ تو اتنی لمبی ہے جو کتابت میں ڈال دے اور نہ ہی اتنی چھوٹی ہے کہ سمجھنے میں مغل ہو۔

مناب العرفان فی علوم القرآن: جلد ①

**تفسیر خطیب** • یہ ایک عظیم کتاب ہے جو تین اشیاء پر مشتمل ہے اولہ کی تقریر و توجیہ، سورتوں اور آیتوں کے درمیان مناسبت پر کلام اور بہت زیادہ قصوں اور روایات کا تسلسل۔

**تفسیر خازن** • یہ بھی ایک مشہور تفسیر ہے یعنی تفسیر بالماثور ہے لیکن اس میں سندیں مذکور نہیں، انھیں روایات اور قصص میں توسع کا بہت زیادہ شوق تھا۔ اس کے امتیازات میں سے یہ ہے کہ یہ قصہ کے بعد اس کی وضاحت کرتے اور اس میں کسی قسم کی کوئی باطل آمیزی نہیں ہوتی کہ کسی کو دھوکہ نہ لگ جائے اور جاہل اس سے فتنہ میں نہ پڑ جائے۔

## فرق مختلفہ کی تفاسیر

جیسے تفسیر اشاری اور تفاسیر اہل کلام، اس میں مشہور ترین کتابیں۔

امت کے مقدر میں لکھا جا چکا کہ یہ ستر سے بھی زیادہ فرقوں میں بے گئی اور اللہ تعالیٰ انھیں گردہ در گردہ کر دے گا اور ایک دوسرے کو لڑائی کا مزہ چکھائے گا اگرچہ اس امت کی ایک جماعت حق پر قائم رہے گی مخالفین سے انھیں کوئی نقصان نہیں پہنچے گا یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کا فیصلہ آ جائے گا۔

ہر فرقہ نے اللہ تعالیٰ کی کتاب کو لیا اور اپنی مرضی سے اس کی تفسیر کرنے لگے خواہ اعتدال سے ہو یا حد سے زیادہ تجاوز سے چنانچہ تفاسیر کا مجموعہ صاف ستھرے آیتوں کی طرح ظاہر ہو گیا جن میں مفسرین کی صورتیں منقش ہوتی ہیں حالانکہ ان کے مشارب میں اختلاف تھا ان کی سنازعت بالکل واضح تھی اور اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں کیونکہ ہر برتن وہی بچکا تا ہے جو اس میں ہوتا ہے اور ہر شخص اپنی پسندیدہ چیز پر لگتا ہے۔

اسی بناء پر آپ کو اہل سنت کی تفسیریں ملیں گی تو ان میں اہل سنت کا عقیدہ ظاہر ہوگا اور معتزلہ کی تفسیر ملیں گی تو ان میں اعتزال کا عقیدہ ظاہر ہوگا اور شیعہ اپنی تفاسیر میں تشیع کا عقیدہ ظاہر کر رہے ہوں گے وغیرہ وغیرہ۔

ہم سابقہ عنوان کے تحت اہل سنت کی تفاسیر کے نمونوں پر بات کر آئے ہیں اب ہمیں مختلف فرقوں کی تفاسیر کے نمونوں پر بات کرنی چاہیے۔

**تفاسیر معتزلہ** • ہم زنجشیری کی کتاب "الکشاف" سے ابتداء کرتے ہیں اس کے بعد قاضی عبدالباری کی کتاب "تذویہ القرآن عن المطاعن" ذکر کریں گے یہ دونوں معتزلہ میں سے اہل کلام کی تفاسیر کے نمونے ہیں۔

**تفسیر الکشاف** • تفسیر کشاف کے مؤلف محمود بن عمر بن محمد بن عمرو لغوی معتزلی ہیں جن کا لقب جار اللہ ہے ۳۶۷ھ میں پیدا ہوئے اور ۵۳۸ھ میں وفات ہوئی انھوں نے لغت، ادب، نحو اور معرفت انساب العرب وغیرہ میں باکمال مہارت حاصل کی اور اپنے ہم عصروں پر فائق ہو گئے۔ اور اس کے بعد اعتزال کا اظہار کیا اور اس کی طرف دعوت دی۔ ان کی یہ کتاب سب سے اچھی کتاب ہے یا ان بہترین کتابوں میں سے ہے جن کی طرف بلاغت کے اعتبار سے تفسیر میں رجوع کیا جاتا ہے البتہ یہ خرابی ہے کہ وہ اس میں اعتزال کی جانب مائل ہیں ان کے بعد کی اکثر تفاسیر اسی سے لی گئی ہیں۔ اور ان کا دار و مدار اسی پر ہے۔

”الکشاف“ مندرجہ ذیل امور میں ممتاز حیثیت کی حامل ہے۔

✳️ حشو و زوائد سے خالی ہے۔

✳️ نقص اور اسراہیلیات سے محفوظ ہے۔

✳️ اس میں معانی کو واضح کرنے میں لغت عرب اور ان کے اسالیب پر اعتماد کیا گیا ہے۔

✳️ جن چیزوں کو واضح کرنا ہو ان میں اکثر سوال و جواب کا طریقہ اختیار کیا گیا اور سوال کو کلمہ ”ان قلت“ (اگر آپ کہیں) کے عنوان کے ساتھ اور جواب کو ”قلت“ (میں کہوں گا) کے عنوان کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے۔

”الکشاف“ کے بہت سے حواشی لکھے گئے ہیں جن میں سے ابن کمال پاشا زاد کا حاشیہ، علاء الدین جو پہلوان کے نام سے مشہور تھے ان کا حاشیہ، شیخ حیدر کا حاشیہ اور راہوی کا حاشیہ مشہور ہیں۔

آپ کی خدمت میں ان کی کتاب کے کچھ مقامات پیش خدمت ہیں جن میں وہ اعتراض کی طرف رخ کرتے ہیں اور المنزلة بین المنزلتین والا قول اور یہ کہ بندوں کے افعال انھی کی مخلوق ہے اور یہ کہ اللہ تعالیٰ کی رویت آخرت میں محال ہے۔

① ﴿الَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِالْغَيْبِ﴾ (البقرة: ۲) ”جو لوگ غیب پر ایمان رکھتے ہیں۔“ اگر آپ کہیں کہ ایمان صحیح کیا ہے؟ تو میں کہوں گا کہ: ”حق کا اعتقاد رکھے اور زبان سے اس کا اظہار کرے اور عمل سے اس کی تصدیق کرے اگر وہ اعتقاد میں کی کرے تو چاہے (زبان سے) گواہی بھی دے اور عمل بھی کرے وہ منافق ہے۔ اور جو گواہی دینے میں کمی و کوتاہی کرے وہ کافر ہے اور جو عمل میں کوتاہی کرے وہ فاسق ہے۔“

آپ دیکھ رہے ہیں کہ وہ ایمان کی تفسیر اس طرح کر رہے ہیں جس سے منزلة بین المنزلتین ثابت ہوتا ہے اور وہ منزلة فاسق ہے جو مومن اور کافر کے درمیان ہے۔ یعنی جو سلیم العقیدہ ہو وہ جب تک واجب عمل میں کوتاہی ہی کرتا رہے گا اس سے ایمان منقہ رہے گا۔ اور یہ اہل سنت کی طرف سے مردود ہے کہ یہ تفسیر لغت اور شریعت کے موافق نہیں ہے لغت کے اعتبار سے تو اس طرح کہ ایمان کا معنی تصدیق کے علاوہ کچھ نہیں اور شرعاً اس لیے نہیں کہ عمل کا اس پر عطف کیا گیا ہے اور عطف تغایر کا تقاضا کرتا ہے۔

② ﴿وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنفِقُونَ﴾ (البقرة: ۳) ”اور ہم نے انھیں جو زیادہ اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔“ کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ: ”اللہ تعالیٰ نے رزق کی اسناد اپنی طرف کی یہ بتلانے کے لیے کہ وہ حلال مطلق کو خرچ کرتے ہیں جو اس لائق ہے کہ اس کی اضافت اللہ تعالیٰ کی طرف کی جائے... الخ۔“

یہ ان کی طرف سے اشارہ اور رہنمائی ہے کہ رزق حلال اللہ کی طرف سے اور رزق حرام بندہ کی طرف سے ہے۔ اہل سنت والجماعت اس کی تردید میں یہ آیت پیش کرتے ہیں کہ: ﴿هَلْ مِنْ خَلْقٍ عَدُوٍّ لِلَّهِ يُؤْذِقُهُم مِّنَ السَّمَاءِ وَ الْأَرْضِ﴾ (ناظر: ۳) ”کیا کوئی خالق ہے اللہ کے علاوہ جو تمہیں آسمان و زمین سے رزق دے۔“ اللہ ہی خالق ہے اللہ ہی رازق ہے اس کے علاوہ کوئی نہیں خواہ رزق حرام ہو یا حلال۔

③ وہ اللہ تعالیٰ کے قول: ﴿حَتَّمَ اللَّهُ عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ﴾ (البقرة: ۷) ”اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں پر مہر لگا دی۔“ کے بارے میں فرماتے ہیں کہ: ”اگر آپ کہیں کہ ختم کی اسناد اللہ کی طرف کیوں کی گئی؟ حالانکہ اس کی اسناد حق کو قبول کرنے سے مانع ہونے اور کسی بھی

طرح اس تک پہنچنے سے رکنے پر دلالت کرتی ہے اور یہ قبیح ہے اور اللہ تعالیٰ نعل قبیح سے منزہ ہے جس کی دلیل: ﴿وَمَا آتَا بِطَلَاكِهِمْ لِيَعْلَمُونَهُ﴾ (ق: ۲۹) اور میں بندوں پر ظلم کرنے والا نہیں ہوں۔ اور ﴿وَمَا ظَلَمْنَاهُمْ وَلَكِنْ كَانُوا هُمُ الظَّالِمِينَ﴾ (زفر: ۷۶) اور ہم نے ان پر ظلم نہیں کیا بلکہ وہی ظالم تھے۔ اور ﴿إِنَّ اللَّهَ لَا يَأْمُرُ بِالْفَحْشَاءِ﴾ (الاعراف: ۲۸) اللہ تعالیٰ بے حیائی کا حکم نہیں دیتا۔

پھر اللہ تعالیٰ کی طرف ختم کی اسناد کی تاویل یہ کی کہ کلام میں استعارہ یا مجاز ہے مطلب یہ ہے کہ خاتم یا توشیطان ہے یا کافر ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف اسناد اس لیے کی گئی کہ اسی نے ان کو قدرت دی۔ اس مذہب میں اہلسنت کے نزدیک چند امور لازم آتے ہیں جو سب کے سب باطل ہیں۔

① اللہ تعالیٰ کی وحدانیت پر قائم دلیل عقلی کی مخالفت کہ کائنات میں کوئی بھی چیز ایسی نہیں جس میں قدرت کے آثار میں سے کوئی اثر نہ ہو۔

② دلیل نقلی کی مخالفت ﴿اللَّهُ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ﴾ (الرعد: ۱۶) اللہ ہر چیز کا خالق ہے۔

③ یہ قول کرنا کہ ان چیزوں میں اللہ تعالیٰ کی مراد کے خلاف شیطان یا کافر کی مراد بھی نافذ ہوتی ہے اور یہ بدترین قول ہے۔

④ غائب کو شاہد پر قیاس کرنا اس لیے کہ انھوں نے قبول حق سے رک جانے کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھی قبیح بنا دیا ہے اور اسے ہماری طرف سے قبیح ہونے پر قیاس کیا ہے۔

⑤ ظلم کی حقیقت سے جہالت: ظلم کی حقیقت یہ ہے کہ غیر کی ملکیت میں اس کی اجازت کے بغیر تصرف کرنا۔ اور ملکیت صرف اللہ تعالیٰ کی ہی ہے۔ ﴿لَهُ مُلْكُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ﴾ (البقرہ: ۱۰۷) آسمان و زمین کی بادشاہت صرف اللہ تعالیٰ کی ہے۔ اور ﴿إِنَّ كُلَّ مَنْ فِي السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ إِلَّا آتِيَ الرَّحْمَنِ عَبْدًا﴾ (مریم: ۹۳) آسمان و زمین میں جتنے بھی لوگ ہیں وہ خدا کے رحمن کے سامنے بندے بن کر حاضر ہوں گے۔ لہذا کسی بھی صورت میں اللہ تعالیٰ کے فعل میں ظلم لازم نہیں آتا۔

⑥ اگر یہ اعتقاد کریں کہ بندوں کے افعال اگر اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہیں تو وہ اس کی وجہ سے ان کی عیب گیری نہ کرنا اور ان کو سزا نہ دینا اور آپس کے لیے ان پر کوئی حجت قائم نہ ہوتی۔

یہ سب چیزیں ان کے فاسد قاعدہ پر مبنی ہیں یعنی تحسین و تہجیح عقلی پر مبنی ہیں نیز ان کے غائب کو شاہد پر قیاس کرنے پر بھی مبنی ہیں جیسا کہ گزرا۔ اور یہ دونوں چیزیں انھیں بھی مسلم نہیں۔ پھر ان کی تردید کی مثل کے ساتھ کی جاتی ہے چنانچہ انھیں کہا جاتا ہے کہ جیسے شاہد نے قبیح ہے کہ وہ اپنے غیر کو کسی کام کرنے پر قدرت دے اور پھر اس پر اس کی گرفت کرے تو اسی طرح غائب کے لیے بھی ہے جبکہ تم کہتے ہو کہ جس قدرت کے فعل کا خلق تمہارے خیال کے مطابق بندہ کی طرف سے یہ بھی اللہ تعالیٰ کا خلق ہے حالانکہ وہ جانتا ہے کہ عقرب بندہ یہ کہے گا اور یہ بات ظاہر ہے کہ اسی طرح ہے کہ کوئی آدمی کسی ایسے شخص کو تلوار دے جو اس کے ذریعے لوگوں پر ظلم کرے۔ تو یہ شاید میں بھی قبیح ہے اور غائب میں بھی قبیح ہے اب اس کا جو جواب تم دو گے وہی ہمارا جواب بھی ہوگا۔

⑦ ﴿فَمَنْ ذُوْجِحْ عَنِ النَّارِ وَأُذْجِلْ الْجَنَّةَ فَقَدْ قَاتَى﴾ (آل عمران: ۱۸۵) جو دوزخ کی آگ سے بچا لیا گیا اور جنت میں داخل کر دیا گیا وہ کامیاب ہے۔ اس کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ: اس سے بڑھ کر کامیابی کیا ہوگی کہ وہ اللہ تعالیٰ کے غضب اور دائمی



عذاب سے بچ گیا اور اس نے اللہ تعالیٰ کی رضا اور دائمی نعمتوں حاصل کر لیں۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ اس میں اللہ تعالیٰ کی رویت کے انکار کی تعریض ہے کہ وہ تصریح کر رہے ہیں کہ نجات، رضوان اور نعمتوں سے بڑھ کر کوئی کامیابی نہیں ہے اور انھوں نے رویت کو ذکر نہیں کیا۔ اور سورۃ الانعام میں انھوں نے اس کے انکار کی صراحت کی ہے چنانچہ وہ اللہ تعالیٰ کے قول: ﴿تَذَرِكُهُ الْاَبْصَارُ وَهُوَ يُبْذِرُكَ الْاَبْصَارُ﴾ (الانعام: ۱۰۳) "اے آنکھیں پائیں سکتیں اور وہ آنکھوں کو پاسکتا ہے۔" کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ "البصر" یہ ایک جوہر لطیف ہے جسے اللہ تعالیٰ نے نظر کے حاسہ میں رکھا ہے اسی کے ذریعے وہ دیکھتا ہے چنانچہ معنی یہ ہوں گے کہ البصار کا اس کے ساتھ تعلق نہیں ہے اور نہ ہی وہ اسے پاسکتی ہیں اس لیے کہ اپنی ذات میں دکھائی دیا جانے سے بلندو بالا ہے اس لیے کہ البصار کا تعلق صرف ان چیزوں کے ساتھ ہوتا ہے جو اپنی اصل کے اعتبار سے یا متعنا کسی جہت میں ہوتے ہیں جیسے اجسام اور پھات۔

اہل سنت اس کی تردید کرتے ہیں۔

① جس اوراد کی نفی کی گئی ہے وہ احاطہ سے عبارت ہے، اسی سے اللہ تعالیٰ کا قول: ﴿حَتَّىٰ اِذَا اَدْرَكَهُ الْعَرْقُ﴾ (بقرہ: ۹۰) "یہاں تک کہ جب اسے غرق نہ آ پکڑا۔" یعنی اس کا احاطہ کر لیا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم کا واقعہ سناتے ہوئے فرمایا کہ: ﴿اِنَّا كُنْمُذْرُكُونَ﴾ (اشعراء: ۶۱) "ہم پکڑے گئے۔"

اس صورت میں جس البصار سے نفی کی گئی ہے وہ البصار کا اللہ تعالیٰ کا احاطہ کرنے کی نفی ہے۔ مجرد رویت کی نفی نہیں اور یہ بات معلوم ہے کہ افہام اللہ تعالیٰ کا احاطہ نہیں کر سکتے اور آپ جانتے ہیں کہ یہ منع نہیں ہے اور احاطہ جو عقل کے لیے منفی ہے تو وہ بصر کے بھی منفی ہے اور جو احاطہ سے نیچے ہیں یعنی عقل سے اس کی معرفت اور بصر سے رویت یہ ثابت ہیں ان کی نفی نہیں ہے۔

② زنجشتری رحمہ اللہ نے رویت کے احاطہ پر نہ کوئی عقلی دلیل دی اور نہ ہی شہد دلیل دی صرف اتنی دلیل دی کہ مرئی کا جہت میں نہ ہونا مستبعد ہے، اس کا معارضہ ہم اس کی مثل سے کریں گے چنانچہ ہم کہتے ہیں کہ تمہیں لازم آتا ہے کہ موجود بغیر جہت کے مستبعد ہوتا ہے اس لیے کہ وہم کے پیچھے چلنا ان دونوں کو بعید کر دیتا ہے اور عقل کے پیچھے چلنا اس وہم کو باطل کر دیتا ہے اور ان دونوں کو جائز قرار دیتا ہے۔

ہمارے لیے اتنا ہی کافی ہے باقی اہل سنت اور معتزلہ کے درمیان بحث و تکرار کی رسی طویل ہے اور ان کے درمیان اخذ و رد کا میدان علم الکلام ہے اگر آپ کو مزید جاہت ہو تو وہاں رجوع کریں۔

اللہ تعالیٰ مجھے اور آپ کو پھسلنے سے بچائے اور ہمیں اعتقاد و عمل میں سیدھا چلنے کی توفیق عطا فرماتے۔

”تنزیہ القرآن عن البطاعن“ اس کے مولف عبد الجبار احمد بن ظلیل ہیں اس کی کنیت ابو الحسن بغدادی ہے، علم بنیل القدر کتاب لٹھوی، معتزلہ کی ریاست اور سرداری تھی پر ختم ہوتی ہے لوگ ان کی رائے لینے لگے اور ان کی کت ابوں پر اعتماد کرنے لگے حتیٰ کہ ۳۱۵ھ کو وفات پا گئے ان کی بہت زیادہ تصنیفات ہیں سب سے اہم ”تنزیہ القرآن عن البطاعن“ ہے۔

یہ کتاب کئی مسائل پر مرتب ہے اور ہر مسئلہ سوال و جواب کو مستظہن ہے ان کو قرآن کی تفسیر کی فکر نہیں تھی بلکہ ان کی ساری فکر



اپنے مذہب کی تائید کی طرف متوجہ تھی اسی وجہ سے آپ دیکھیں گے کہ انھوں نے پورے قرآن کی تفسیر نہیں کی بلکہ وہ سورۃ کی ایک ایسی آیت کو ذکر کرتے جس کو وہ اپنے عقیدے کے مطابق ڈھال سکتے تھے اور اس کے ذریعے معتزلہ کے مذہب کی تائید کر سکتے تھے جیسا کہ بخشری نے کیا جس کی مثالیں آپ کے سامنے ہیں۔ یہ کتاب بہت سے فوائد پر مشتمل ہے لیکن خرابی یہ ہے کہ وہ اس میں اپنے مذہب کا تعصب رکھتے تھے اور تفسیر کی طرف توجہ کم دیتے تھے جیسا کہ ہونی چاہیے۔

①۸ تفاسیر باطنیہ ﴿﴾ باطنیہ ایک قوم ہے جس نے ظاہری قرآن کو پس پشت ڈال دیا اور کہا کہ قرآن پاک کا ظاہر بھی ہے اور باطن بھی، مقصود باطن ہے ظاہر مقصود نہیں ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کے قول:

﴿ فَضْرَبَّ بَيْنَهُمْ بِسُورَةٍ لَّهُ بَابٌ - بَاطِنُهُ فِيهِ الرَّحْمَةُ وَظَاهِرُهُ مِنْ قِبَلِهِ الْعَذَابُ ﴾ (المذہب: ۱۳)

”ان کے درمیان دیوار حائل کر دی جائے گی جس کے اندر کی جانب رحمت اور باہر کی جانب عذاب ہوگا۔“

سے استدلال کرتے ہیں۔

ان کے کئی فرقے ہیں جو مندرجہ ذیل ہیں۔

① قرامطہ ﴿﴾ یہ حمان قرامطہ کی طرف نسبت ہے جو واسطہ کی بہتوں میں سے ایک بہتی ہے، یہی وہ شخص ہے جس نے ان کے مذہب کو روشناس کرایا۔

② اسماعیلیہ ﴿﴾ یہ اسماعیل کی طرف نسبت ہے جو جعفر صادق رضی اللہ عنہ کا بڑا بیٹا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ لوگ ان میں امامت کا عقیدہ رکھتے تھے۔

بعض نے کہا کہ انھیں اسماعیلیہ اس لیے کہتے ہیں کہ یہ لوگ ”محمد بن اسماعیل“ کی طرف منسوب تھے۔

③ سمعیہ ﴿﴾ یہ سات کے عدد کی طرف نسبت ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ان لوگوں کا عقیدہ تھا کہ ہر سات میں ایک امام ہوتا ہے جس کی اقتداء کی جاتی ہے۔

④ حرمیہ ﴿﴾ یہ حرم کی طرف نسبت ہے اس لیے کہ یہ لوگ حرام کو جائز سمجھتے تھے۔

⑤ بابکیہ ﴿﴾ یہ ان کے سردار بابک خرمی کی طرف نسبت ہے جو آذربایجان میں نکلا۔

⑥ مغمرہ ﴿﴾ یہ چونکہ سرخ لباس پہنتے تھے اس لیے ان کا یہ نام پڑ گیا۔

باطنیہ کا مذہب عمومی طور پر ایک وہا ہے جو مجوس سے تعدی کر کے ان کی طرف منتقل ہوئی ان کی قرآن میں تاویلات فاسدہ میں سے یہ بھی ہے کہ وہ لوگ وورث سلیمان (حضرت سلیمان علیہ السلام) حضرت داؤد علیہ السلام کے وارث ہے) (سورۃ النحل) کی تفسیر میں کہتے کہ حضرت علی بن ہشیر اپنے علم میں نبی کریم ﷺ کے وارث بنے۔

اور کہتے ہیں کہ: جناب کا معنی یہ ہے کہ: ”مستحب استحقاق کا رتبہ پانے سے پہلے ہی جلدی سے اپنا راز فاش کر دے۔ اور غسل کا معنی ہے کہ: ”جو ایسا کرے اس سے تجدید عہد کرایا جائے۔“ اور طہارت کا معنی ہر مذہب کے اعتقاد سے برأت کرنا سوائے امام کی متابعت کے اور تیمم کا معنی ”داعی امام کا مشاہدہ کرنے تک جائز چیز کو لینا۔“ اور روزے کا معنی ”راز فاش کرنے سے رکتنا۔“

وہ کہتے ہیں کہ کعبہ نبی ﷺ "باب" علی "صفا" نبی اور "مرود" علی ہے اور "نار ابراہیم" نمرود کا ان پر غصہ کرنا ہے اور "عصا موسیٰ" ان کے دلائل ہیں۔

اس کے علاوہ اور بھی بہت سی خرافات ہیں جو اس سے بھی بڑھ کر ہیں جو اسلام اور مسلمانوں کو ملنے والی تکالیف سے بھی بڑھ کر سخت اور زخمی کرنے والے ہیں۔ اس لیے کہ یہ شریعت کی عمارت کے ایک ایک پتھر کو توڑنے کا سبب ہیں اور اسلام کے پھندے سے نکلنے اور اس کے کڑے سے ایک ایک کڑے کر کے نکلنے کا سبب ہے۔

نیز اس لیے کہ یہ قرآن و سنت کو بے ضابطہ بنا دیتا ہے کہ قرآن و سنت میں جو بھی چاہے جو بھی کہہ دے گویا کہ قرآن و سنت کلام میں سے لفظ ہے یا پاک ایسا لگھا س ہے جو جو پائیوں اور جانوروں کے لیے حلال ہے اور آخر میں اسلام کی گرہ ہی ختم ہو جاتی ہے اور اٹھی بے کار قسم کے بڑے بڑے دینی ضابطوں اور بڑے بڑے ادبی اصولوں کے جاری ہونے کی وجہ سے ان کے مابین جنگیں ہوتی ہیں جب تک کوئی بھی شخص قرآن کو اپنی خواہش اور چاہت سے سمجھتا رہے گا اور شریعت کا دامن نہیں تھامے گا اور نہ ہی لغت کے قواعد کا التزام کرے گا تو وہ قرآن کو قرآن نہیں سمجھے گا بلکہ خواہش ہی سمجھے گا بس۔

اسی وجہ سے ہم نے تفسیر میں تفسیر کی شرائط مقرر کی ہیں اور ان شرائط کے شروع میں شرعی ضوابط اور لغت عربیہ کے قواعد کو مقرر کیا ہے شرعی قوانین کا التزام تو اس لیے کہ نصوص متناقض نہ ہوں اور تعلیمات میں تناقض نہ ہو۔ اور لغت کے قواعد کا التزام اس لیے کہ قرآن ایسی عربی زبان میں نازل ہوا ہے جو واضح کرنے والی ہے اللہ تعالیٰ جل شانہ فرماتا ہے:

﴿إِنَّا أَنْزَلْنَاهُ قُرْآنًا عَرَبِيًّا لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ﴾ (یوسف: ۲)

"بے شک ہم نے قرآن پاک کو عربی میں نازل کیا تاکہ تم سمجھ سکو۔"

اس کے عربیت کا تفسیر یہ ہے کہ اسے لغت عرب کے قوانین کے مطابق سمجھا جائے وہ اس کے سمجھنے کی امید نہ رکھی جائے اور نہ ہی ان علوم کی جو اس میں ہیں اور نہ ہی ان علوم کی جن پر یہ مشتمل ہے۔ ﴿لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ﴾ کا یہی معنی ہے۔

①۹ شیعہ کی تفاسیر اور مبالغہ اور اسراف اس حد تک کیا کہ ان کے فضائل میں مبالغہ کرتے ہوئے انہیں رذائل بنا کر رکھ دیا۔

اسی وجہ سے علماء اخلاق کہتے ہیں کہ فضیلت دور رذائل (بری عادتوں) کے درمیان واسطہ ہوتی ہے اور علماء فرماتے ہیں کہ جب کوئی چیز اپنی حد سے نکل جائے تو وہ اپنی ضد کی طرف لوٹ آتی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی ﷺ کو فرمایا کہ:

﴿قُلْ لَا أَمْلِكُ لِنَفْسِي نَفْعًا وَلَا ضَرًّا إِلَّا مَا شَاءَ اللَّهُ ۗ وَ لَوْ كُنْتُ أَعْلَمُ الْغَيْبُ لَا سْتَلْتَنِي مِنَ الْخَيْرِ ۗ وَمَا مَسَّنِيَ السُّوءُ ۗ إِنْ أَنَا إِلَّا نَذِيرٌ وَبَشِيرٌ لِّقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ﴾ (الاعراف: ۱۸۸)

"کہہ دو کہ میں اپنے فائدے اور نقصان کا کچھ بھی اختیار نہیں رکھتا مگر جو خدا چاہے۔ اور اگر میں غیب کی باتیں جانتا ہوتا تو بہت سے فائدے جمع کر لیتا۔ اور مجھ کو کوئی تکلیف نہ پہنچتی۔ میں تو مومنوں کو ذرا خوشخبری سنانے والا ہوں۔"

"محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ"

اور نبی کریم ﷺ اپنی امت کو فرماتے ہیں کہ:

”تم میری محبت میں آگے نہ بڑھ جانا جیسا کہ نصاریٰ ابن مریم علیہ السلام کی محبت میں آگے بڑھ گئے بلکہ یوں کہو کہ اللہ تعالیٰ کا بندہ اور اس کا رسول ﷺ۔“

لیکن شیعوں نے حضرت امام زین العابدین کی محبت اور احترام میں مبالغہ کیا۔

ان کے کئی فرقے ہیں بعض تو شیعہ میں اتنے غرق ہوئے کہ کفر کر بیٹھے اور ان کی بنیاد عبد اللہ بن سبا یہودی ہے جو اللہ کا دشمن تھا اس نے اسلام کا اظہار صرف مکہ و مدینہ اور اسلام میں فساد کی خاطر کیا اسی وجہ سے یہ فرقہ مسلمانوں کے ساتھ جنگ اور لڑائی کے مقام پر کھڑا ہے یہاں تک وارد ہوا ہے کہ انہم علی بن ابی طالب نے خود ان پر حملہ کیا اور ان سے لڑائی کی اور ان کا تعاقب کیا۔

ان میں سے ایک قوم ایسی ہے جو معتدل ہے اور کفر سے گڑھے میں نہیں گری اگرچہ ابو بکر، عمر اور عثمان رضی اللہ عنہم کو فضیلت دینے میں اور انھیں خلافت میں امام علی رضی اللہ عنہ سے مقدم مانتے ہیں اہلسنت والجماعت کی مخالفت کی۔ ان لوگوں کے مذاہب بھی ہیں اور معلومات بھی ہیں۔ ان کی کتابیں اور تفسیریں بھی ہیں اور دلائل و تاویلات بھی ہیں۔

شیعوں کی تفسیر میں سے ایک کتاب کا نام ”مرآة الانوار ومشکوٰۃ الاسرار“ ہے۔

اس کے مؤلف کومولیٰ عبداللطف کا زلانی کہا جاتا ہے جو نجف سے ہے یہ تفسیر ایسی تاویلات پر مشتمل ہے جو گزشتہ بالا تاویلات باطنیہ کے شاہد ہیں چنانچہ وہ ”الارض“ کی تفسیر دین کے ساتھ ائمہ علیہم السلام کے ساتھ، شیعہ کے ساتھ اور ان قلوب کے ساتھ کرتا ہے جو علم کا کل اور قرآں گاہ ہیں اور گزشتہ امتوں کی خبروں کے ساتھ.... الخ کرتا ہے چنانچہ اللہ تعالیٰ کا قول:

﴿اَلَمْ تَكُنْ اَرْضُ اللّٰهِ وَاِسْعٰۗةً فَتَهٰۗا جِرُوْا فِيْهَا﴾ (النساء: ۹۷)

”کیا اللہ تعالیٰ کی زمین وسیع نہیں کہ تم اس میں ہجرت کر لو؟“

کی تفسیر میں کہتا ہے کہ اس سے مراد اللہ تعالیٰ کا دین اور اس کی کتاب ہے اور اللہ تعالیٰ کے قول:

﴿اَفَلَمْ يَسْبُرُوْا فِي الْاَرْضِ﴾ (یوسف: ۱۰۹)

”کیا وہ زمین میں نہیں پھرے؟“

کے بارے میں کہتا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ:

((اولم ينظروا في القرآن)).

”کیا انھوں نے قرآن میں غور نہیں کیا؟“

اب آپ دیکھ رہے ہیں کہ اس نے قرآن کے ان الفاظ کو جن سے کوئی بھی جاہل نہیں بغیر دلیل کے معانی غریبہ پر محمول کیا اسے اس پر محمول کرنے والی چیز صرف ہوا پرستی، تعصب اور اپنے مذہب میں اندھا پن ہے۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ ایک گمراہی ہے جو باطنیہ اور بہائیہ کی گمراہی سے کم نہیں ہے۔

﴿وَمَنْ يُضِلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهُ مِنْ هَادٍۭٓ ﴿۳۳﴾﴾ (المد: ۳۳)

”اور اللہ تعالیٰ جسے گمراہ کرے اسے کوئی بھی ہدایت دینے والا نہیں۔“

یہ قرآن پاک کی تاویل ہے جو اس کے ظاہر کے علاوہ ہے جو کئی مخفی اشارہ کی وجہ سے اصحاب سلوک تفسیر اشاری کے تصوف کو ظاہر ہوتی ہے اور اس کے اور ظاہری تفسیر کی مراد کے درمیان جمع کرنا بھی ممکن ہوتا ہے۔

تفسیر مذکور کے بارے میں علماء کا اختلاف ہے بعض نے اجازت دی ہے اور بعض نے منع کیا ہے آپ کی خدمت میں علماء کے کچھ اقوال پیش خدمت ہیں تاکہ آپ اس میں وجہ حق کو جان سکیں۔

زرکشی رحمۃ اللہ علیہ نے ”البرہان“ میں فرمایا کہ: ”قرآن کی تفسیر میں صوفیا کا کلام: بعض نے کہا کہ یہ تفسیر نہیں ہے بلکہ یہ کچھ معانی اور وجدان ہیں۔ جنہیں وہ تلاوت کے وقت محسوس کرتے ہیں جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے قول:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا قَاتِلُوا الَّذِينَ يَلُونَكُمْ مِنَ الْكُفَّارِ﴾ (التوبہ: ۱۲۳)

”اے ایمان والو! ان کفار سے لڑو جو تمہارے قریب ہیں۔“

کے بارے میں بعض فرماتے ہیں کہ اس سے مراد نفس ہے۔ وہ مراد لیتے ہیں کہ امر (حکم کرنے والے) کی ہمارے قریب والے کے ساتھ قتال کی علت ”قرب“ ہے اور انسان کے لیے سب سے قریبی چیز اس کا نفس ہے۔

ابن الصلاح نے اپنے فتاویٰ میں فرمایا کہ میں نے امام ابوالحسن واحدی مفسر کی ایک روایت پائی جس میں انھوں نے فرمایا کہ: ”ابو عبد الرحمن سلمیٰ نے تفسیر میں کچھ حقائق تصنیف کیے۔ اگر وہ ان کے تفسیر ہونے کا اعتقاد رکھتا ہے تو تحقیق اس نے کفر کیا۔ ابن الصلاح نے فرمایا کہ ان میں سے جن پر اہتمام کیا جاتا ہے جب وہ اس قسم کی کوئی چیز کہیں تو ان کے بارے میں کہا جائے گا کہ انھوں نے اسے بطور تفسیر نہیں کہا اور نہ ہی لکھ کر تشریح کی کیونکہ اگر ایسا ہو تو وہ باطنیہ کے مسلک پر چلیں گے۔ یہ تو صرف قرآن میں وارد ہونے والی چیز کی نظیر ہوتی ہے اور نظیر نظیر کے ساتھ ذکر کی جاسکتی ہے لیکن اس کے باوجود کاش وہ لوگ اس قسم کا تباہی نہ کرتے اس لیے کہ اس میں ابہام والتباس ہے۔“

”النسفی رحمۃ اللہ علیہ“ نے اپنی کتاب ”العتقاد“ میں لکھا کہ ”نصوص اپنے ظاہر پر ہوں گی ان سے ایسے معانی کی طرف عدول کرنا جن کا اہل باطل دعویٰ کرتے ہیں الحاد ہے۔“ اس کی شرح میں تفتازانی فرماتے ہیں کہ ملاحظہ کو باطنیہ کہتے ہیں اس لیے کہ انھوں نے دعویٰ کیا کہ نصوص اپنے ظاہر پر نہیں ہیں بلکہ ان کے کچھ معانی ہیں انھیں صرف معلم ہی جان سکتا ہے اس سے ان کا مقصد شریعت کی بالکل نفی کرنا ہے۔ فرمایا کہ بعض محققین کا مذہب یہ ہے کہ نصوص اپنے ظاہر پر ہیں لیکن اس کے باوجود اس میں کچھ مخفی اشارات ہیں جو اس کی باریکیوں کی طرف مشیر ہیں، یہ ارباب سلوک پر مشکشف ہوتے ہیں ان کے اور ان کی ظاہری مراد کے درمیان تطبیق ممکن ہوتی ہے یہ کمال ایمان اور محض عرفان ہیں۔“

اس مقام پر تفسیر صوفیہ جسے تفسیر اشاری کا نام دیا جاتا ہے اس کے درمیان اور تفسیر باطنیہ ملاحظہ کے درمیان فرق بھی معلوم ہوا جاتا ہے صوفیاء ظاہری مراد کو منحصر نہیں کرتے بلکہ اس پر ابھارتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اولاً یہ ضروری ہے اس لیے کہ جو شخص قرآن کے اسرار کا دعویٰ کرتا ہو اور اس کے ظاہر کو نہ پہچانتا ہو وہ ایسے ہے جیسے کسی نے گھر کی چھت پر چڑھنے کا دعویٰ کیا ہو اور دروازہ پار نہ کیا ہو۔

جبکہ باطنیہ کہتے ہیں کہ ظاہر بالکل بھی مراد نہیں مراد صرف باطن ہے اور اس سے ان کا مقصود شریعت کی نفی ہے۔ امام سیوطی رضی اللہ عنہ نے ”الاتقان“ میں ابن عطاء اللہ سے نقل کیا کہ انھوں نے ”لطائف المہین“ میں فرمایا کہ ”جاننا چاہیے کہ اس جماعت کی کلام اللہ اور کلام رسول کی تفسیر معانی غریبہ سے کرنا ظاہر کو اس کے ظاہر سے پھیرنا نہیں ہے۔ بلکہ ظاہری آیت سے وہ چیز سمجھی جاتی ہے جس کے لیے آیت آئی ہے، اور عرف لسان بھی اس پر دلالت کرتا ہے۔ اور اس کے باطنی مفہوم بھی ہیں جو آیت اور حدیث سے ان لوگوں کو سمجھ میں آتے ہیں جن کا سینہ اللہ تعالیٰ نے کھول رکھا ہو۔ اور حدیث پاک میں ہے کہ ”ہر آیت کا ظاہر بھی ہے اور باطن بھی“ ان سے یہ معانی لینے میں آپ کو جھگڑالو اور معارض کا یہ کہنا نہ روکے کہ یہ اللہ تعالیٰ کے کلام اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام کو بدلنا ہے۔ یہ حالہ نہیں ہے بلکہ حالہ تو یہ ہوتا ہے کہ وہ کہیں کہ اس آیت کا یہی معنی ہے اس کے علاوہ کوئی معنی نہیں حالانکہ وہ ایسا نہیں کہتے بلکہ وہ ظاہر کو اپنے ظاہر پر قائم رکھتے ہیں کہ ان سے مراد ان کے موضوعات ہی ہیں اور اللہ تعالیٰ سے وہ سمجھتے ہیں اللہ تعالیٰ انھیں الہام کرتا ہے۔

**تنبیہ** شاید مناسب ہے کہ میں آپ کی خدمت میں امام سیوطی رضی اللہ عنہ کی عبارت پیش کروں جو آیت کے ظاہری باطنی معنی، حرف کی حد اور ہر حد کی بنیاد کے بیان میں ہے۔

فرمایا: ”اللہ تعالیٰ ان کی قبر کو سنور فرمائے۔“ اگر آپ کہیں کہ فریابی نے اپنی سند کے ساتھ حضرت حسن بن علیؑ سے روایت کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: ”ہر آیت کا ظاہر بھی ہے اور باطن بھی اور ہر حرف کی حد اور ہر حد کی کوئی بنیاد ہوتی ہے۔“ میں کہتا ہوں کہ اس کے ظاہر اور باطنی معنی کی کئی وجوہ ہیں۔

① جب آپ اس کے باطن کی کرید کریں اور اس کے ظاہر پر قیاس کریں تو اس کا معنی آپ کو معلوم ہو جائے گا۔

② کوئی بھی آیت ہو اس پر کسی نہ کسی قوم نے ضرور عمل کیا ہے اور ایک قوم ایسی بھی ہے جو غنم پر اس پر عمل کرے گی جیسا کہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا۔

③ اس کا ظاہر اس کے الفاظ اور باطن ان کی تاویلات ہیں۔

④ ابو عبیدہ نے فرمایا کہ (اور یہی درستی کے زیادہ قریب ہے) وہ قصے جن میں اللہ تعالیٰ نے امم ماضیہ کے واقعات اور ان پر ہونے والے عقاب کو بیان کیا ان کا ظہر ”پہلے لوگوں کی ہلاکت کی خبر“ ہے۔ اور ایک قوم کے بارے میں ہونے والی ایک بات ہے اور باطن یہ ہے کہ بعد والوں کو نصیحت کرنا اور ان کے فعل کی طرح کرنے سے ڈرانا ہے کہ جیسے ان کے ساتھ ہو ان کے ساتھ بھی ایسے ہی ہوگا۔

⑤ اس کا ظہر وہ معانی ہیں جو اہل علم کو ان کے ظاہری معنی سے ظاہر ہوتے ہیں اور باطن وہ اسرار ہیں جنہیں یہ مصلحت من ہیں جن پر ارباب تحقیق مطلع ہوتے ہیں۔

”ولکل حرف حد“ کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس سے جو معنی مراد لیا ہے اس کی انتہا ہے اور بعض نے کہا کہ ہر حکم کے لیے ثواب یا عقاب کی ایک مقدار ہے۔

”ولکل حد مطلع“ یعنی معانی اور احکام میں سے ہر ایک کا کوئی مطلع ہوتا ہے جس کے ذریعے اس کی معرفت تک پہنچنا

”محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ“

جاتا ہے اور اس کی مراد پر آگاہی حاصل ہوتی ہے۔ بعض نے کہا کہ: جو بھی ثواب و عقاب ہے جس کا وہ مستحق ہے آخرت میں بونت جزاء اس پر مطلع ہو جائے گا۔

بعض نے کہا کہ ”ظاہر“ تلاوت اور باطن فہم اور حد طلال و حرام کے احکام اور مطلع وعدوں اور وعیدوں پر آگاہ ہونا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ اس کی تائید ابن ابی حاتم کی روایت کرتی ہے جو انھوں نے شاک کی سند سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ذکر کی کہ قرآن گھائیوں والا ہے، فنون والا ہے، ظہور و بطن والا ہے اس کے عجائب ختم نہیں ہوتے اس کی غایت کو پہنچا نہیں جاسکتا اب جوزی کے ساتھ اس میں گھس گیا اس نے نجات پائی اور جو اس میں سختی کے ساتھ داخل ہوا وہ اوپر سے نیچے جاگرا، یہ اخبار و امثال ہے، حلال و حرام ہے، ناخ و منسوخ ہے، محکم و متشابہ ہے۔“

اور ظہر و بطن؟ اس کا ظاہر تو تلاوت ہے اور باطن تاویل ہے، لہذا اس کے لیے علماء کے پاس بیٹھو! اور سلماء سے دور رہو۔ لیکن وجہ اول جو سیوطی ریٹیلنے ظہر و بطن کے معنی میں ذکر کی ہے وہ واضح نہیں ہے جب ہم نے اس کے کچھ احتمالات کو تلاش کیا تو وہ بعد والے اقوال کے مشابہ ہوا یا ان کے ساتھ متحد ہوا اسی طرح پانچواں قول بھی تیسرے قول کے ساتھ متحد ہے یا اس کے قریب ہے۔ لہذا غور فرمائیں۔

تفسیر اشاری کو قبول کرنے کی شرائط

① نظم قرآنی کے ظاہری معانی کے منافی نہ ہو۔

② یہ دعویٰ نہ کیا جائے کہ مراد صرف یہی ہے ظاہر نہیں ہے۔

③ تاویل بعید اور نامعقول نہ ہو جسے کسی نے اس آیت کی تاویل:

﴿وَإِنَّ اللَّهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِينَ﴾ (المکبوت: ۶۹)

”بے شک اللہ تعالیٰ محسنین کے ساتھ ہے۔“

یوں کی کہ ﴿لَمَعَ﴾ کو فعل ماضی بنا دیا اور محسنین کو اس کا مفعول بنا دیا۔

④ اس کا کوئی شرعی یا عقلی معارض نہ ہو۔

⑤ اس کی تائید کرنے والا کوئی شاہد شرعی بھی ہو۔

علماء نے اسی طرح شرائط کو مقرر کیا لیکن یہ شرائط ایک دوسرے میں داخل ہیں اس لیے اول کے ذریعے ثالث سے اور خاص کے ذریعے رابع سے استثناء ممکن ہے اور ان دونوں کے بدلے دو اور شرائط ہوں تو اچھا ہے۔

① الفاظ قرآنی جس معنی کے لیے وضع کیے گئے ہیں اس معنی کی وضاحت۔

② اس تفسیر اشاری کے بعد مفسر، میں تشویش نہ ہو۔

عقرب میری نصیحتوں اور امام غزالی ریٹیلنے کے کلام میں ان دونوں شرطوں کی تائید ہوگی۔ پھر ان کے مقبول ہونے کی یہ شرائط صرف اس معنی میں ہیں کہ انھیں چھوڑا نہیں جائے گا بس۔ یہ نہیں کہ ان شرائط کے پائے جانے کی صورت میں یہ واجب الاتباع



ہو جائف اور انفس لفا جائے (افسا نفس) اس كى وء فف ہے كہ فف قرآن كے ظاہر كے منانى نفس ہے پھر فف بھف ہے كہ اس كے شرعى شافہ ہوں ءوان كى تافء كرتے ہوں اب ءو بھف افسى ہوں كى انفس ءھوڑ انفس جائے گا۔ ان كو لفنا وءب اس لفے نفس كے قرآن كر فم كا لظم اس ٱر ءالات كرنے كے لفے وءع نفس كفا كفا بلكف فف از نفبل البامات ہے ءو انفس ظاہر ہوتے ہف ان مفں زلفف منضبط ہوتف ہے اور نہ فف ءوامن كے ساآھ مقفء ہوتف ہف۔

## تفسفر اشارف كى اہم ترفن كٹاففں

۱ تفسفر نسا پورف ۲ اس ٱر كلام كز ٱكا بائف فف باء رھ گئف كہ ہم آپ كو فف باء بتلا تے ہفں كہ ءب وہ كلام كو آفء فف آفء كے ظاہرف معانى ٱر كلفے ہفں ءو فرماتے ہفں كہ: "قال اهل الاشارة" (اہل اشارف نے كہا) فف فرماتے ہفں كہ "التا وبل" پھر اس عنوان كے آفء فف ان آفء كا معنى اشارف بفان كرتے ہفں۔

مثال ۱ ﴿وَإِذْ قَالَ مُوسَىٰ لِقَوْمِهِ إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تَذْبُحُوا بَقَرَةً﴾ (البقره: ۶۷)

"اور ءب موسف ءلففم نے افنى ءوم كو كہا كہ بے شك اللہ ءعالى ءمہفں حكم ءفءا ہے كہ ءم گائے ذب كرو!"

اس كى ظاہرف تفسفر كرنے كے بعء فرمافا كہ: "اس كى تا وبل فف ہے كہ گائے كا ذب كرنا فف نفس بسففء كو ذب كرنے كى طرف

اشارف ہے كفونكہ اس ذب كفں ءب رءوانف كى زنگى اور فف ءبءا كبر ہے (مرنے سے ٱفلف مر ءا)"

اقتلوانف فف ثقافف ان فف قفلى حفافف

اے مءھ ٱر اعءاء كرنے والوا مءھ قءل كرو۔ مفرے قءل مفں فف مفرى زنگف ہے۔"

وحفافف فف مباحف ومباحف فف حفافف

مفرى زنگف مفرے مرنے مفں ہے۔ اور مفر امرنا مفرے زنده ربنے مفں ہے۔

اراءف مفر ءاطفءف سے زنده ہو جائے گا كسى نے كہا كہ: طفءفء كے ساآھ مر ءا حققء مفں زنده ہو جائے گا" وہ كفا ہے؟

وہ افك گائے فف ءو ہے؟" نفس بھف صدق كى ءوار سے ذب ہونے كى صلاءف ركھتا ہے "لَفَأَرَضَ" (بوزمى نہ ہو) بفعنى بڑھاپے كى عمر

مفں نہ ہو ك ءوائے ءبنفء كے ضعف كى وء سے طرفقء كے سلوك كے وظائف سے عاجز آ جائے ءفسا كہ كہا كفا ك صوفى ٱالفس سال

كى عمر كے بعء ءھنءا ہو ءاتا ہے "ولا بكر" (ءوان نہ ہو) ءوانف كے آغاز مفں نہ ہو ك اس كا ءشارا ٱر ءھا جائے "ءوان بفن ذلك

"(ان ءونوں كے بآء ہو) اس لفے كہ اللہ ءعالى نے فرمافا كہ:

﴿حَتَّىٰ إِذَا بَلَغَ أَشُدَّهُ وَبَلَغَ أَرْبَعِينَ سَنَةً﴾ (الاحاف: ۱۵)

"فہاں نكہ كہ ءب وہ اپنى پورى ءوانف كو بآء جائے اور ٱالفس سال كو بآء جائے۔"

"بقره صفراء" (زرد رنگ كى گائے) فف اصحاب رفاضاء كے ٱفلف ءروں كى طرف اشارف ہے "فأفء لونها" (اس كا

رنگ كرا ہو) اس سے مراف فف ہے كہ ٱفلى ءوبصورء ہو ءدصورء ٱفلى نہ ہو كفونكہ فف صافئفن كى ءشانف ہے "لاذلول ءءففر الارض"



(عزت کرنے والی نہ ہو زمین کو گناہی نہ ہو) طمع کی زلت نہ اٹھائے اور نہ ہی زمین کی سجاوٹ اور چابتوں کی طلب کے لیے حرص کے آلہ کے ساتھ دنیا کی زمین میں مل چلائے۔ ”ولا تسقی المحوت“ (اور نہ ہی زمین کو سیراب کرتی ہو) اور نہ ہی اپنے آپ کو مخلوق کے سامنے ذلیل کر کے اور خالق کے سامنے اکر کر دینا کو سیراب کرے کہ اس کا پانی (یعنی اس کی عزت، حیثیت، مرتبہ) خالق کے ہاں بھی ختم ہو جائے اور مخلوق کے ہاں بھی۔ ”مُسْتَلَمَةٌ“ اس کی صفات آفات سے سالم ہوں اس میں غیر اللہ کی طلب نہ ہو ”وما کادوا يفعلون“ (اور وہ کرنے والے نہیں تھے) یعنی اپنی طبیعت کے منتہی سے اگر اللہ تعالیٰ کا فضل اور اس کی توفیق نہ ہوتی۔ ”وادقتلتم نفسا“ (اور جب تم نے ایک جان کو قتل کر دیا) یعنی دل کو فادار اُتھ۔ (پھر تم آپس میں جھگڑنے لگے) پھر تم اختلاف کرنے لگے کہ یہ شیطان کی طرف سے تھا یا دنیا کی طرف سے تھا یا نفس امارہ کی طرف سے تھا۔ ”فقلنا اضربوه ببعضها“ (ہم نے کہا کہ اس کے ٹکڑے کو اسے مارو) ذبح شدہ گائے کی زبان کی طرح صدق کی چھری دل کے قاتل کو مارو ذکر کی مداوت کرتے ہوئے اسی طرح وہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے زندہ ہو جائے گا۔ اور فرمایا کہ: ”ان النفس لامارة بالسوء“ (بے شک نفس برائی ہی کھلانے والا ہے۔)

﴿وَإِنَّ مِنَ الْجَبَّارِ لَمَآ يَغْتَبِخُونَ مِنْهُ الْآلِهَةُ﴾ (بخترہ: ۷۴)

”اور بہت سے پتھر ہیں کہ جن سے نہریں پھوٹ پڑتی ہیں۔“

دل کے سختی کے اعتبار سے کئی مرتبے ہیں۔ ایک وہ ہیں جن سے نہریں بہتی ہیں یہ وہ دل ہے جس پر لذات اور شہوات کے ترک کی وجہ سے روح کے انوار جوش مارتے ہیں جس کی وجہ سے کچھ ایسی چیزیں ظاہر ہونے لگتی ہیں جو فخر عادت کے مشابہ ہیں جیسا کہ بعض راہبین اور ہنود کے ساتھ ہوتا ہے اور جو پھٹ جاتی ہیں اور ان سے پانی نکلتا ہے وہ ہیں کہ بعض اوقات بشری پردے پھٹ جانے کے وقت ان پر روح کے انوارات ظاہر ہو جاتے ہیں اور وہ اسے بعض آیات اور معانی معقولہ دکھلا دیتے ہیں جیسا کہ بعض حکماء کے لیے ہوتا ہے اور جو اللہ کے ڈر سے گر جاتے ہیں یہ وہ ہیں جو بعض ادیان و ملل والوں کے لیے ہوتے ہیں کہ پردے کے پیچھے سے روح کے انوار کا کس قبول کرتے ہیں جس سے ان میں خوف اور خشیت پیدا ہو جاتی ہے۔

یہ مراتب مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان مشترک ہیں فرق صرف یہ ہے کہ مسلمانوں کی نور ایمان کے ساتھ تائید کی گئی ہے جس سے وہ قرب، قلوب اور درجات میں بڑھتے چلے جاتے ہیں اور غیر مسلموں کی ایمان سے تائید نہیں ہے جس کی وجہ سے وہ اپنے غرور، عجب، بعد اور استدراج میں بڑھے چلے جاتے ہیں اور مسلمان کرامات اور فراسات کے ساتھ مختص ہیں جو ان کے لیے انوار حق کی تجلی اور برہان کو دیکھنے سے ظاہر ہوتے ہیں۔

چنانچہ اراءت (یعنی نشانیاں دکھلانا) آیات خواص کے لیے ہوتا ہے۔

﴿سَتَرْنَاهُمْ آيَاتِنَا فِي الْأَفَاقِ وَفِي أَنْفُسِهِمْ﴾ (نمل: ۵۳)

”عقرب ہم انھیں اپنی نشانیاں اطراف عالم میں بھی دکھا دیں گے اور خود ان کے اپنے اندر بھی۔“

لیکن اراءت برہان صرف ان خواص کے لیے ہوتا ہے جیسا کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے حق میں آیا ہے کہ:

﴿لَوْ لَا أَنْ رَأَاهُكَانَ رَبِّي﴾ (یوسف: ۲۴)

”اگر وہ اپنے رب کے برہان کو نہ دیکھ چکے ہوتے۔“

حضرت حسن بن منصور سے برہان کے بارے میں سوال کیا گیا تو فرمایا کہ:  
؟ دل پر وارد ہونے والی چیزیں جو اسے اس کی تکذیب سے عاجز کر دے۔ ”واللہ اعلم۔“

دوسری مثال • نیا پوری ریٹینے:

﴿وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنْ مَنَعَ مَسْجِدَ اللَّهِ أَنْ يُذَاكِرَ فِيهَا اسْمُهُ﴾ (البقرہ: ۱۱۳)

”اور اس سے بڑھ کر ظالم کون ہوگا جو اللہ کی مسجد میں اس کے نام کے ذکر کو روکے۔“

کی تفسیر کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ ”الذاکر“ اللہ کی مسجد جن میں اس کے نام کا ذکر ہوتا ہے وہ اہل نظر کے نزدیک، نفس، قلب، روح، سر اور خفی ہیں اور خفی سر کا بھی سر ہوتا ہے، اور ان میں سے ہر مسجد کا ذکر اس مسجد کے مناسب ہے۔ چنانچہ نفس کی مسجد کا ذکر طاعات و عبادات ہیں اور اس میں ذکر کا منیع ہونا ترک حسانت اور ملازم سینات ہے اور مسجد قلب کا ذکر توحید اور معرفت ہے اور اس میں ذکر سے منع کرنا تمسک بالمشہبات اور تعلق بالمشہوات ہے، کیونکہ جو قلوب مشہوات کے ساتھ معلق ہوتے ہیں ان کی عقلیں مجھ سے ستور ہیں۔

اور روح کی مسجد کا ذکر شوق اور محبت ہے اور اس میں ذکر کا منیع کرنا خواہشات اور سکون دینے والی چیزوں سے منع ہے اور سر کی مسجد کا ذکر مراقبہ اور حضور ہے اور اس میں ذکر سے منع کرنا کرامات پر بھروسہ کرنا ہے اور خفی جو کہ سر کا بھی سر ہے اس کی مسجد کا ذکر وجود کو برہان کرنا اور موجودات کو ترک کرنا ہے اس میں ذکر سے روکنا مشاہدات و مکاشفات کی طرف التفات کرنا ہے۔

② تفسیر آلوسی • اس کا نام ”روح المعانی“ ہے اس کے مولف شہاب الدین سید محمد آلوسی بغدادی ہیں جو بغداد کے مفتی تھے ۱۲۷۰ھ میں وفات پائی۔ یہ تفسیر سب سے زیادہ حلیل القدر سب سے زیادہ وسیع اور جامع ترین تفسیر ہے اس میں انھوں نے سلف کی روایات کے ساتھ ساتھ خلف کی روایات کو بھی پرویا ہے اور اس میں انھوں نے وہ چیزیں بھی تالیف کی ہیں جو بطریق عبارت مفہوم ہوتی ہیں اور وہ چیزیں بھی لکھی ہیں جو بطریق اشارہ مفہوم ہوتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان پر رحم کرے اور درگزر فرمائے۔

اس میں انھوں نے جو تفسیر اشاری کے طور پر کہا ان میں سے ایک مثال یہ بھی ہے کہ انھوں نے اللہ تعالیٰ کے قول:

﴿وَإِذْ قُلْتُمْ يَا مُوسَىٰ لَنْ نُؤْمِنَ بِكَ حَتَّىٰ تُرَىٰ اللَّهُ جَهْدَةً فَأَخَذَتْكُمُ الضُّعْفَةُ ۗ وَ أَنْتُمْ تَنْظُرُونَ﴾ (البقرہ: ۵۵)

”اور جب تم نے (موسیٰ سے) کہا کہ موسیٰ جب تک ہم خدا کو سانس نہ دیکھ لیں گے تم پر ایمان نہیں لائیں گے تو تم کو بجلی نے آگھیرا اور تم دیکھ رہے تھے۔“

کے بارے میں فرمایا کہ۔

ان آیات میں اشارہ کے مقامات یہ ہیں کہ ﴿وَإِذْ قُلْتُمْ﴾ اور جب تم نے کہا کہ اے دل کے موسیٰ ﴿لَنْ نُؤْمِنَ﴾ بھی بھی ایمان نہیں لائیں گے یعنی ایمان حقیقی یہاں تک مشاہد اور عیان کے مقام پر پہنچ جائیں ﴿فَأَخَذَتْكُمُ الضُّعْفَةُ﴾ پھر تمہیں بت کی بجلی نے آ پکڑا جو کہ بجلی ذاتی میں فنا ہے ﴿وَأَنْتُمْ تَنْظُرُونَ﴾ اور تم لوگ مراقبہ کر رہے تھے یا مشاہدہ کر رہے تھے ﴿ثُمَّ﴾



بَعُدْنَكُمْ ﴿۱﴾ پھر ہم نے تمہیں زندہ کیا یعنی حقیقی زندگی کے ساتھ اور فنا کے بعد بقا دے کر ﴿لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ﴾ ﴿۲﴾ تاکہ تم توحید کی نعمت اور اللہ تعالیٰ کی بارہ گاہ میں سلوک کے ذریعے وصول کی نعمت پر شکر کر دو ﴿وَظَلَلْنَا عَيْنَكُمُ الْغَمَامَ﴾ اور ہم نے صفات کی تجلی کے بدل کا سایہ کیا اس لیے کہ اسے ذات کے سورج نے چھپایا ہوا تھا۔۔۔ الخ

دوسری مثال ﴿اللہ تعالیٰ کے قول:

﴿وَ إِذْ أَخَذْنَا مِيثَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّورَ خُذُوا مَا آتَيْنَاكُمْ بِقُوَّةٍ اذْكُرُوا مَا فِيهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ﴾ ﴿البقرہ: ۱۲۳﴾

”اور جب ہم نے تم سے عہد (کر) لیا اور کوہ طور کو تم پر اٹھا کھڑا کیا (اور حکم دیا) کہ جو کتاب ہم نے تم کو دی ہے اس کو زور سے پکڑے رہو اور جو اس میں (لکھا ہے) اسے یاد رکھو تاکہ (عذاب سے) محفوظ رہو۔“  
کی تفسیر میں فرمایا کہ:

”اور جب ہم نے تم سے وعدہ لیا جو انعام و صفات کی توحید کے بارے میں دلائل عقلیہ سے ماخوذ تھا اور ہم نے تمہارے اوپر دماغ کا طور بلند کر دیا تاکہ تم معانی کے فہم اور انہیں قبول کرنے پر قادر ہو جاؤ یا اللہ تعالیٰ نے طور کے ذریعے قلب کے موسیقی کی طرف اشارہ کیا اور اس کو بلند کرنے سے اشارہ کیا اس کے علو پر اور ارشاد و شریع کی ہوا میں بلند ہونے پر تاکہ تم شرک، جہالت اور فسق سے بچ جاؤ پھر تم نے جنت سفلیہ کی طرف متوجہ ہو کر اس سے اعراض کیا اگر اللہ تعالیٰ اپنی حکمت سے انہیں مہلت نہ دیتا اور انہیں چھوڑ دینے کا فیصلہ نہ کرتا تو تمہیں جلدی سزا مل جاتی اور تم پر بڑی مصیبت آ پڑتی۔“

الی اللہ یدعی بالبراہین من ابی فان لم یحب بآداتہ بیض الصور ام

”اللہ کی طرف بلایا جاتا ہے براہین کے ساتھ اس شخص کو جس نے انکار کیا۔ پھر بھی وہ نہ مانے تو سفید چمکدار تلوار اس کا مقابلہ کرتی ہیں۔“

ان اشارات کو وجدان و مشاہدہ والے ہی پہچان سکتے ہیں اور ان حضرات کے لیے یہ چیزیں کپے ہوئے تیار باغوں کی طرح اور روشن انوارات کی طرح ہیں۔

۵) تفسیر تسمی ﴿یہ ابوجہر اسل بن عبدستری ہیں جو ۳۷۳ھ میں فوت ہوئے۔ ان کی یہ تفسیر تمام آیات پر مشتمل نہیں ہے اگرچہ تمام سورتوں پر مشتمل ہے اس میں وہ صوفیاء کے طریقے پر چلے ہیں لیکن اس کے ساتھ اہل ظاہر کی موافقت بھی کی ہے آپ کی خدمت میں اس کا تھوڑا سا نمونہ پیش کیا جاتا ہے۔ وہ ”بسملہ“ کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ:

”الباء + بہاء اللہ عزوجل“ (اللہ تعالیٰ کا جمال، خوبصورتی اور رونق) ”سین + سناء اللہ عزوجل“ (اللہ تعالیٰ کی رفعت) ”میم + مجد اللہ عزوجل“ (اللہ تعالیٰ کی بزرگی) اللہ + وہ اسم اعظم ہے جس نے تمام آسمانوں کو گھیرے ہوئے ہے اور اس کے الف اور لام کے درمیان ایک پوشیدہ حرف ہے جو ایک غیب سے دوسرے غیب تک ہے اور ایک راز ہے جو ایک راز سے دوسرے راز تک ہے اور ایک حقیقت سے دوسری حقیقت تک ہے اسے صرف وہ انہام پا سکتے ہیں جو گندگیوں سے پاک ہوتے ہیں صرف حلال حاصل کرتے ہیں اور ایمان کی ضرورت کو قائم رکھنے والے ہیں۔

”محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ“

الرحمن • یہ ایک نام ہے اس میں الف اور لام کے درمیان پوشیدہ حرف کا خاصہ ہے۔  
الرحیم • وہ مہربان ہے اپنے بندوں پر کہ فرغ میں رزق دیا اور اصل میں ابتداء کی ایسی رحمت کرتے ہوئے جو اس کے علم قدیم پر سابق ہے۔

ابو بکر نے کہا کہ: یعنی اللہ تعالیٰ اپنی روح کی ہوا سے اپنی ملکیت میں سے جو رحمت چاہتا ہے بنا لیتا ہے۔ اس لیے کہ وہ رحیم ہے۔  
حضرت علیؓ بن ابی طالب نے فرمایا کہ: "الرحمن الرحیم" دو نام ہیں جن میں رقت پائی جاتی ہے ان میں سے ایک رقت زیادہ پائی جاتی ہے ان دونوں اسماء کے ذریعے اللہ تعالیٰ اپنے مومن بندوں سے مایوسی کو دور کر دیتا ہے۔  
ان کی تفسیر میں سے جو ظاہری معنی کے قریب ہے۔

"واذا قال ابرہیم رب انی کیف تعبی الموتی" کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ: "کیا وہ اپنے ایمان میں شک کرنے والے تھے؟ کہ انھوں نے اپنے رب سے سوال کیا کہ وہ انھیں معجزہ کے طور پر کوئی آیت (نشانی) دکھلائے۔ تاکہ اس کے ساتھ ان کا ایمان صحیح ہو جائے۔"

سبل نے کہا کہ: "ان کا یہ سوال شک کی بناء پر نہیں تھا بلکہ وہ یقین پر اضافہ چاہتے تھے کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت اور وہ اپنی خلق کو کیسے قدرت دیتا ہے کیا آپ نہیں دیکھ رہے کہ اللہ تعالیٰ نے کیا فرمایا کہ "اولہ تو من" کیا آپ ایمان نہیں رکھتے؟ اس کے جواب میں انھوں نے فرمایا کہ "ہلی" (کیوں نہیں) اگر ان کو شک ہوتا تو "ہلی" کے ساتھ جواب نہ دیتے اور اگر اللہ تعالیٰ ان کی طرف سے شک کو جانتے ہوتے اور حضرت ابراہیمؑ "ہلی" کے ساتھ خبر دیتے اور شک کو چھپاتے تو اللہ تعالیٰ اسے ضرور ظاہر کر دیتا اس لیے کہ اس طرح کی چیزیں مخفی نہیں رہتیں۔"

اس کتاب کا حجم چھوٹا ہے لیکن اپنے موضوع میں اس میں مادہ بہت زیادہ ہے یہ شہادت کے کثیر علاجات اور دفع شہادت پر مشتمل ہے تقریباً ۳۱۲ھ میں مصر میں طبع ہوئی۔  
تفسیر ابن عربی • یہ عبد اللہ محمد بن علی بن محمد بن احمد بن عبد اللہ محمدی الدین ابن عربی حاکمی، صوفی، فقیہ اور محدث ہیں ۵۶۰ھ کو مریہ میں پیدا ہوئے ۶۳۸ھ کو دمشق میں وفات پائی۔

ان کی تصنیفات میں سے کتاب "الجمع والتفصیل فی اہداء معانی التنزیل" ہے۔ نیز "انجاز البیان فی التوجہ عن القرآن" بھی ہے، ان کی تفسیر ۱۲۸۷ھ میں مطبعہ امیرہ سے دو جلدوں میں طبع ہوئی اس کے خطبہ میں انھوں نے فرمایا کہ:  
مجھے ایک خبر یاد ہے جو میرے پاس پہنچی اور مجھے بڑی اچھی لگی جو مقاصد اور امیدوں سے بھی بڑھ کر ہے وہ نبی امی صادق علیہ افضل الصلوٰت کا ہر بولنے والے اور خاموش کو فرمانا کہ: "قرآن کی کوئی بھی آیت ہے اس کا ظاہر بھی ہے اور باطن بھی اور ہر حرف کی حد اور ہر حد کا مطلع ہے۔" اس سے میں سمجھا ہوں کہ ظاہر تفسیر ہے باطن تاویل ہے حد کلام کا وہ معنی جس تک مفہوم پہنچتا ہے اور مطلع وہ ہے کہ اس سے بلند ہو کر جس کی طرف وہ چڑھتا ہے اور ملک العلام کے شہود پر مطلع ہوتا ہے۔"

امام محقق سابق جعفر بن محمد صادقؑ سے نقل کیا گیا ہے کہ وہ فرماتے ہیں کہ: "اللہ تعالیٰ اپنے کلام میں اپنے بندوں کے لیے ظاہر ہوتا ہے لیکن وہ دیکھ نہیں سکتے۔ روایت ہے کہ آپؑ نماز میں غشی کھا کر گر گئے جب ان سے پوچھا گیا تو فرمایا کہ "میں

اس آیت کو بار بار لوٹنا تا رہا حتی کہ میں نے اس کے منکلم سے سنا۔“

فرمایا کہ میں نے سوچا کہ مجھے بعض اوقات باطنی حقائق کے جو اسرار اور شوقِ قانات کے جو انوارات ظاہر ہوئے ہیں ان کی وضاحت کروں، ان کی نہیں جن کا تعلق ظاہر اور حدود کے ساتھ ہوتا ہے کیونکہ ان کی حدود متعین ہیں اور تحقیق کہا گیا کہ جس نے ”قرآن میں اپنی رائے سے کچھ کہا اس نے کفر کیا۔“ جبکہ تاویل کو نہ باقی رکھا جاتا ہے اور نہ چھوڑا جاتا ہے کیونکہ یہ سننے والے کے سلوک کے مراتب اور درجات کے تفاوت کے احوال اور اوقات کے اختلاف کی وجہ سے مختلف ہوتی ہے وہ جتنا بھی اپنے مقام میں ترقی کرتا ہے اس کے لیے ہم کا ایک نیا دروازہ کھلتا ہے اور اس کے ذریعے وہ ایک لطیف و پیچیدہ معنی پر مطلع ہوتا ہے... آگے فرماتے ہیں کہ: ”جو بھی شخص میری تاویل کو قبول نہ کرے یا اسے ضرورت نہ ہو تو میں بالکل اسے پیش نہیں کرتا۔“

ان کی تفسیر اشاری میں سے ایک یہ ہے کہ: ﴿انفوس نے اللہ تعالیٰ کی قول: ﴿إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تَتَّخِذُوا بَقَرَةً﴾ (البقرہ: ۶۷) کی تفسیر میں فرمایا کہ (اللہ تعالیٰ حکم دیتا ہے کہ تم گائے ذبح کرو) یہ گائے نفسِ حیوانیہ ہے اور اسے ذبح کرنا یہ ہے کہ اس کی خواہشات جو کہ اس (نفسِ حیوانیہ) کی زندگی ہیں انھیں دور کرنا اور اس کے سرچشمہ یعنی اس کے افعال خاصہ کو ریاضت کی پھری سے ذبح کر دینا ہے۔ اور

﴿وَلِسُلَيْمَانَ الرِّيحَ عَاصِفَةً ..... وَذِكْرَى لِلْعَبِيدِينَ﴾ (الانبیاء: ۸۱، ۸۲)

کی تفسیر میں فرماتے ہیں ﴿وَلِسُلَيْمَانَ الرِّيحَ﴾ ”سلیمان علیہ السلام کے لئے ہوا“ یعنی ہم نے سلیمان علیہ السلام کے لیے عقلی عملی اور خواہشات کی اس ہوا کو مخر کر دیا جو سینے میں نفس کے تخت پر قابو ہو کر بیضا ہے۔ ﴿عَاصِفَةً﴾ ”تیز چلنے والی“ جو بہت زیادہ تیز چلنے والی ہے۔ ﴿تَجْرِي بِمَضْرِبٍ﴾ ”چلتی ہے اس کے حکم سے“ یعنی اس کے تابع ہے۔ ﴿إِلَى الْأَرْضِ﴾ ”اس زمین کی طرف“ طاعت اور ادب کی مشق کرنے والے بدن کی زمین ﴿الَّتِي بَرَكْنَا فِيهَا﴾ ”جس میں ہم نے برکت رکھی“ یعنی اخلاق، ملکات فاضلہ اور اعمال صالحہ کی تیز رفتاری کے ساتھ ﴿وَكُنَّا لِبَيْتِئِنَّ﴾ ”اور ہم ہر چیز کو“ کمال کے اسباب میں سے۔ ﴿عَلِيمِينَ﴾ ”جانتے تھے“ ﴿وَمِنَ الشَّيْطَانِ﴾ ”اور شیطانوں میں سے“ یعنی وہم و تحیل کے شیطانوں میں سے۔ ﴿مَنْ يَعْوِضُونَ لَهٗ﴾ ”جو غوطہ لگاتے ہیں“ جسمانی ہیولت میں اور معانی جزئیہ نکالتے ہیں ﴿وَيَعْمَلُونَ عَمَلًا ذَوْنًا ذٰلِكَ﴾ ”اور وہ کرتے تھے اس کے علاوہ کام“ یعنی ترکیب (جوڑنا)، تفصیل (تورنا) اور مصنوعات (بنانا) اور کمسوبات کے اسباب تیار کرنا۔ ﴿وَكُنَّا لَهُمْ حَفِظِينَ﴾ ”اور ہم ان کے محافظ تھے“ یعنی بھینکنے سے، خطا سے اور جھوٹ سچ کو مزین کرنے سے ﴿وَأَيُّوبَ﴾ ”یعنی نفسِ مطمئنہ جس کا امتحان لیا جاتا ہے ریاضت کی کئی طرح کی آزمائشوں سے جو عبادہ میں کمال تک پہنچی ہیں۔ ﴿إِذْ نَادَى رَبَّهُ﴾ ”جب اپنے رب کو پکارا“ کوشش کرنے طاقت خرچ کرنے اور ان تک محنت کرنے میں آنے والی پریشانی کی شدت کے وقت ﴿إِنِّي مَسْتَبِي الضُّرِّ﴾ ”مجھے پہنچی تکلیف“ یعنی ضعف، انکساری اور عاجزی کی۔ ﴿وَأَنْتَ أَرْحَمُ الرَّحِيمِينَ﴾ ”اور تو ارحم الراحمین ہے“ کشادگی اور بھلائی کرنے سے۔ ﴿فَاسْتَجَبْنَا لَهُ﴾ ”ہم نے اس کی دعا قبول کر لی“ اعمال کی جفاشی سے احوال کو راحت دے کر ﴿فَكَشَفْنَا مَا بِهِ مِنْ ضُرِّهِ﴾ ”اور ہم نے اس تکلیف کو دور کر دیا جو انھیں تھی“ اور ہم نے ریاضت کی تکلیف کو ہدایت کے نور سے۔ اور اس سے بے چین کی ظلمت دور کر دی نزولِ قلب کی روشنی سے۔ ﴿وَأَتَيْنَاهُ



أَهْلَهُ ﴿۱﴾ اور ہم نے انہیں ان کے گھر والے بھی دے دیئے توئی نفسیہ جنہیں ہم نے حاوی کر دیا تھا اور ریاضت سے مار دیا تھا وہ اس طرح کہ انہیں حیات حقیقیہ کے ساتھ زندہ کر دیا۔ ﴿وَمِثْلَهُمْ مَعَهُمْ﴾ اور ان کے ساتھ ان جیسے یعنی توئے روحانیہ اور صفات قلبیہ کے انوارات کو بڑھا کر اور ہم نے ان پر فضائل خلقیہ کے اسباب اور علوم نافعہ جزئیہ کے احوال کو زیادہ کر دیا۔ ﴿رَحْمَةً مِنَّ عِنْدِنَا وَذِكْرَىٰ لِّلْعَالَمِينَ﴾ ﴿۱﴾ اپنی طرف سے بطور رحمت اور عبادت کرنے والوں کے لیے بطور نصیحت۔

## مخلصانہ نصیحت

لیکن یہ نصیحت جیسا کہ آپ دیکھ رہے ہیں کہ ساری کی ساری اسی طرز پر ہے اس میں نصوص قرآنیہ کے معانی وضعیہ کی طرف توجہ نہیں دی گئی اور یہ سراسر خطرہ ہے کیونکہ اس کا مطالعہ کرنے والے کے بارے میں خوف ہے کہ کہیں وہ ان معانی اشاریہ کو یہ نہ سمجھ بیٹھے کہ خالق کی اپنی مخلوق کو اسلام کی تعلیمات کی ہدایت اور ان کے لیے پسند کیے ہوئے دین کے خالق کی طرف رہنمائی کرنے میں اس کی مراد یہی ہے۔

ہو سکتا ہے کہ آپ بھی میری طرح ملاحظہ کرتے ہوں گے کہ کچھ لوگ ان اشارات اور خیالات کے پڑھنے سے فتنہ میں مبتلا ہو گئے اور ان کی عقل میں یہ بات داخل ہو گئی کہ کتاب و سنت بلکہ پورا اسلام اس طرح کی تاویلات اور توجیہات پر وارد ہونے والی اور ان سے حاصل ہونے والی چیزوں کے علاوہ کچھ نہیں ہے اور وہ سمجھتے ہیں کہ حقیقت امر کیا ہے؟ صرف تخیلات ہیں اس کے علاوہ کچھ نہیں اور ان سے مطلب صرف خیال کے ساتھ اقوال ہیں جہاں بھی اس طرح کے خیالی اقوال آتے ہیں وہ تکالیف شرعیہ کے ساتھ عقیدہ نہیں ہوتے اور نہ ہی تبلیغ ترین عربی نصوص یعنی کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ ﷺ کے سمجھنے میں تو ان میں عربیہ کا احترام کرتے ہیں۔ اس سے بھی بڑھ کر مصیبت یہ ہے کہ یہ لوگ سمجھتے ہیں اور لوگوں کو سمجھاتے ہیں کہ ہم اہل حقیقت ہیں جنہوں نے مقصود کو پا لیا اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ ایسا تعلق بنالیا کہ اس نے ہم سے تکلیف کو ساقط کر دیا اور ہمیں اسباب اختیار کرنے کی پست زمین سے بلند کر دیا جب تک ہم رب الارباب کے ساتھ اپنا یہ خیال قائم رکھیں گے۔

اور یہ اللہ کی قسم بہت بڑی مصیبت ہے جسے باطنیہ اور ان جیسے اعداء اسلام نے تیار کیا تاکہ وہ شریعت کو اس کے اصولوں سے اکھڑ پھینکیں اور اس کی نئے سرے سے عمارت کھڑی کریں۔

﴿يُرِيدُونَ أَن يُطْفِئُوا نُورَ اللَّهِ بِأَفْوَاهِهِمْ وَيَأْبَى اللَّهُ إِلَّا أَن يَزِيدَهُ نُورًا وَكُلُّ كَافِرٍ لَّا يَكْفُرُونَ﴾ (التوبہ: ۳۲)

”یہ چاہتے ہیں کہ خدا کے نور کو اپنے منہ سے (پھونک مار کر) بجھا دیں اور خدا اپنے نور کو پورا کے بغیر رہنے کا نہیں اگرچہ کافروں کو برا ہی لگے۔“

اس لیے اپنے مسلمان بھائیوں کو نصیحت کرنا واجب ہے جو ہم سے تقاضا کرتی ہے کہ ہم انہیں اس جال میں پڑنے سے ڈرائیں اور انہیں اشارہ کریں کہ وہ اپنے ہاتھوں کو اس طرح کی ہل دار تقاسیر اشاریہ سے جھاڑ لیں اور اس طرح کی چیزوں پر بھروسہ نہ کریں جو صوفیاء کی کتابوں میں کسی قوم کے کلام میں وارد ہوئی ہیں، اس لیے کہ یہ ذوق و مواجد ہیں جو ضبط و تقیید کی حدود سے خارج

ہیں۔ اس میں اکثر یہ ہوتا ہے کہ خیال حقیقت کے ساتھ خلط ہو جاتا ہے اور حق باطل کے ساتھ۔ اور جب یہ بھی نہ ہو تو بھی بہت کم ہوتا ہے کہ اس سے قائل کی مراد ظاہر ہو اور جب ظاہر ہوتی ہے تو کھلے کفریات میں سے ہوتی ہے جنہیں علماء، صوفیاء بلکہ عام سچے مسلمان سے صادر ہونے کو بھی ہم بعید سمجھتے ہیں اور جن میں ہم کمزور فریب اور گھڑیلینے کا طعن کرتے ہیں وہ ان سے اقرب و محفوظ ہیں جن میں کفر و فسق کی نسبت کی گئی ہے۔

لہذا سمجھ دار اور عقل مند کو چاہیے کہ وہ اپنے آپ کو اس طرح کی پھسلانے والی چیزوں سے دور رکھے اور اپنے دین کو اس طرح کے شبہات سے دور رکھے حالانکہ اس کے سامنے کتاب و سنت اور ان کی شروعات میں شریعت اور لغت کے قوانین کے مطابق باغات اور چمنستان ہیں۔

﴿اَسْتَبْدِلُوْنَ الَّذِي هُوَ اَدْنٰى بِالَّذِي هُوَ خَيْرٌ﴾ (البقرہ: ۶۱)

”کیا تم ادنیٰ چیز کو لینا چاہتے ہو اس چیز کے بدلے جو بہتر ہے؟“

آپ ﷺ نے فرمایا کہ: ”جو شبہات سے بچ گیا اس نے اپنا دین کو محفوظ کر لیا۔“<sup>①</sup>

اور آپ ﷺ نے فرمایا کہ جو چیز تمہیں شک میں ڈال دے اسے چھوڑ کر وہ چیز اختیار کرو جس میں شک شبہ نہ ہو۔“<sup>②</sup>

اللہ تعالیٰ ہی سے اپنی توفیق مانگتا ہوں اور آپ کی بھی اور ہم اس ذات عزوجل سے سوال کرتے ہیں کہ وہ ہمیں ادہام کی اندھیروں سے نکالے اور ہمیں دین کے حقائق اور اسلام کی تعلیمات میں سچنگی نصیب فرمائے۔ آمین۔

## حجۃ الاسلام امام غزالیؒ کے کلمات

میں اپنی یہ نصیحت کچھ قیمتی کلمات پر ختم کرتا ہوں جو ہمارے موضوع کے ساتھ پوری طرح تعلق رکھتی ہیں اور وہ امام غزالیؒ کی کمال فوقیت کے ساتھ مزین ہیں جب انھوں نے اپنی کتاب ”الاحیاء“ میں ذکر و تذکیر کا تذکرہ کیا اور ان دونوں میں لوگوں نے جو کچھ داخل کر دیا ان کو ذکر کیا تو فرمایا ”اللہ تعالیٰ ان کی مٹی کو تر فرمائے۔“

سطح سے ہماری مراد کلام کی دو صفتیں ہیں جنہیں بعض صوفیاء نے گھڑا ہے۔

**سطح کی پہلی قسم** • اللہ تعالیٰ کے ساتھ عشق کے لیے چوڑے دعوے اور ایسا وصال جو انھیں اعمال ظاہرہ سے مستغنی کر دیتا ہے حتیٰ کہ ایک قوم تو یہاں تک پہنچ گئی کہ انھوں نے اتحاد، (متحد ہونا یعنی وہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ متحد ہو گئے) ارتقا عجاب، (یعنی اللہ تعالیٰ کے پردے ان سے مرتفع ہو گئے) مشاہدہ باروہیہ (یعنی انھوں نے اللہ تعالیٰ کو آنکھوں سے دیکھ لیا) اور مشافہہ (آنسنے سامنے بات کرنا) باکلام کا دعویٰ کر دیا اور وہ کہتے ہیں کہ ہمیں یہ کہا گیا اور ہم نے یہ کہا اور وہ اس میں حسین بن منصور کی مشابہت اختیار کرتے ہیں جسے سولی چڑھا دیا گیا صرف اس وجہ سے کہ اس نے اس طرح کے کلمات کا اطلاق کیا تھا اور وہ لوگ اس کے بارے میں گواہی دیتے ہیں۔

① بخاری کتاب الایمان باب ۳۹، مسلم کتاب المساقاة حدیث ۱۰۷، ابوداؤد کتاب البیوع باب ۱۰، ابن ماجہ کتاب القنن باب ۱۳، دارمی کتاب البیوع باب

② نسائی کتاب الاثر باب اعمد علی ترک الشبہات، ابوداؤد وصفت القیامہ باب ۶۰ حدیث ۲۵۱۸، مسند امام احمد ۳/ ۱۵۳

کہ اس نے "انا الحق" (میں حق ہوں) کہا تھا اور اسی طرح ابو یزید بسطامی کے ساتھ مشابہت کرتے ہیں جس کے بارے میں منقول ہے کہ اس نے "سبحانی، سبحانی" کہا تھا یہ کلام کا ایک بہت بڑا فن ہے جس کا نقصان عوام کو پہنچتا ہے یہاں تک کہ کاشکاروں کی ایک جماعت نے اپنی کاشکاری کو چھوڑ دیا اور اس طرح کے دعوے ظاہر کر دیے اس لیے کہ اس کلام سے طبیعت کو لذت محسوس ہوتی ہے اس لیے کہ اس میں اعمال سے بے کار ہونا اور احوال و مقامات حاصل کر کے نفس کا تزکیہ ہوتا ہے اور غیبی قسم کے لوگ بھی اپنے لیے اس طرح کے دعوے کرنے سے عاجز نہیں آتے اور نہ ہی اس طرح کے ملع سازی کیے ہوئے نیزھے میڑھے دعویٰ کرنے سے بھی نہیں ہچکچاتے اور جب ان کی ان باتوں کا انکار کیا جاتا ہے تو یہ کہنے سے بھی نہیں ہچکچاتے کہ: "یہ انکار ہے اس کا ماخذ علم اور جدل ہے اور علم پر وہ ہے اور جدل نفس کا عمل اور یہ بات حق کے نور کے مکاشفہ کی وجہ سے باطن سے ہی ظاہر ہوتی ہے۔"

یہ اور اس جیسی چیزیں ایسی ہیں کہ جن کی چند گاریاں علاقوں میں بچھلی ہوئی ہیں اور عوام میں ان کا ضرر بہت زیادہ بڑھ گیا ہے یہاں تک کہ جب کوئی ایسی بات کہے تو اس کو قتل کر دینا اللہ کے دین میں دس آدمیوں کو زندہ کرنے سے افضل ہے۔

باقی رہی ابو یزید بسطامی رضی اللہ عنہ کی بات اس سے نقل کردہ بات صحیح نہیں مگر کسی نے ان سے سنا بھی ہو تو ہو سکتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی کلام نقل کر رہے ہوں اور اسے اپنے جی میں دہرا رہے ہوں جیسا کہ کوئی شخص کسی کو ﴿إِنِّي أَنَا اللَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا أَنَا تَعْبُدُنِي﴾ (طہ: ۱۳۰) "تو تک میں اللہ ہوں میرے علاوہ کوئی بھی عبادت کے لائق نہیں میری عبادت کر۔" پڑھتے ہوئے سنے۔ اس سے صرف یہی سمجھنا چاہیے کہ اس نے یہ علی سبیل الحکایت پڑھا ہے۔

**شطح کی دوسری قسم** ● کلمات غیر مفہومہ ہیں جن کا ظاہر بڑا عمدہ ہوتا ہے اور ان میں ہولناک عبارتیں ہوتی ہیں جن کے پیچھے کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ یہ یا تو کہنے والے کے نزدیک ہی غیر مفہومہ ہوتے ہیں بلکہ اس کی عقل میں فتور کی وجہ سے صادر ہوتے ہیں یا اس کے خیالات میں گڑبڑ کی وجہ سے صادر ہوتے ہیں اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ اس نے اپنے سنے ہوئے کلام کے معانی کا احاطہ کم کیا ہوتا ہے اکثر یہی صورت پیش آتی ہے اور بعض اوقات اسے خود کوجھ آ رہی ہوتی ہے لیکن وہ سمجھانے پر قادر نہیں ہوتا اور نہ ہی ایسی عبارات پیش کر سکتا ہے جو اس کے مافی الضمیر کو واضح کر سکیں اس لیے کہ اس نے علم کی محنت کم کی ہوتی ہے اور خوش و مضح الفاظ کے ذریعے معانی کو تعبیر کرنے کا طریقہ سیکھا نہیں ہوتا کلام کی اس صفت کا بھی کوئی فائدہ نہیں ہوتا سوائے اس کے کہ یہ قلوب میں تشویش پیدا کرتے ہیں اور عقل کو سرگرداں اور عقل کو حیران کر دیتے ہیں۔ یا اس سے معنی مراد مفہوم ہورہے ہوتے ہیں لیکن ایک کا فہم اس کی خواہش اور طبیعت کے مقتضی کے مطابق ہوتا ہے آپ ﷺ نے فرمایا کہ: "تم میں سے کوئی بھی شخص کسی ایسے آدمی کے سامنے کوئی ایسی بات نہ کرے جسے وہ سمجھتے نہ ہوں ورنہ ان پر فتنہ بن جائے گی۔" ①

اور آپ ﷺ نے فرمایا کہ: "لوگوں سے ایسی بات کر دے وہ سمجھتے ہوں اور جسے وہ اوپر ہی سمجھتے ہوں اسے چھوڑ دو۔" کیا تم چاہتے ہو کہ اللہ اور اس کے رسول کی تکذیب ہو؟" ②

یہ حدیث ان کلمات کے بارے میں ہے جن کو ان کا بولنے والا تو سمجھتا ہے لیکن سننے والے کی عقل اس تک نہیں پہنچ سکتی تو

① صحیح مسلمہ فی مقدمہ موقوفاً علی ابن مسعود، للعتیقی الضعفاء

② بخاری موقوفاً علی علی، مسند فردوس للذہبی مرفوعاً عن طریق الی نعیم

جس کو اس کا بولنے والا ہی نہ سمجھتا ہو اس کا کیا حال ہوگا؟ پس اگر بولنے والا سمجھتا ہو اور سننے والا نہ سمجھتا ہو تو اس کا ذکر جائز نہیں حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ: ”حکمت کو ان کے اہل کے علاوہ کے سامنے نہ رکھو ورنہ تم اس (یعنی حکمت) پر ظلم کرو گے اور نہ ہی اس کے اہل سے چھپاؤ ورنہ تم ان پر ظلم کرو گے ایک مہربان طبیب کی طرح ہو جاؤ جو دواء بیماری کی جگہ رکھتا ہے۔“ بالفاظ دیگر ”جس نے حکمت کو اس کے اہل کے علاوہ کے پاس رکھا اس نے جہالت کی اور جس نے اس کے اہل سے منع کیا تو اس نے ظلم کیا اس لیے کہ حکمت کا بھی حق ہے اور اس کے اہل بھی ہوتے ہیں لہذا ہر حق والے کو اس کا حق دو!“

**طامات** ❁ ان میں وہ چیزیں بھی داخل ہیں جنہیں ہم نے ”شطح“ میں ذکر کیا اور ایک امر اور بھی ہے جو اس کے ساتھ خاص ہے وہ یہ کہ الفاظ شریعہ کو ان کے ظاہر مفہوم سے امور باطنہ کی طرف پھیرنا جن کی طرف فہم سبقت بھی نہ کرتا ہو جیسا کہ باطنیہ کا تاویلات کرنے میں طریقہ کار ہوتا ہے یہ بھی حرام ہوتا ہے اور اس کا ضرر بھی عظیم ہوتا ہے، کیونکہ الفاظ جب اپنے ظاہر کے متقاضی سے پھیر دیے جاتے ہیں اور ان میں شارع سے نقل کی حفاظت نہیں کی جاتی اور کوئی ایسی ضرورت یعنی کوئی عقلی دلیل بھی نہ ہو جو اس کا تقاضا کرتی ہو تو یہ الفاظ پر اعتماد کے بطلان کا تقاضا کرتے ہیں اور اس سے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے کلام کی منفعت ساقط ہو جاتی ہے اس لیے کہ ان سے جو چیز مفہوم ہو رہی ہوتی ہے اس پر بھروسہ نہیں اور باطن کا ضبط نہیں ہوتا بلکہ وہ دلوں میں متعارض ہوتے ہیں اور انہیں کئی وجوہ پر اتارا جاسکتا ہے اور یہ بھی بدعت شائعہ میں سے ہے جس کا ضرر بہت بڑا ہوتا ہے، ایسا کرنے والے کا مقصود کلام میں انوکھا پن پیدا کرنا ہوتا ہے اس لیے کہ نفوس انوکھی چیز کی طرف مائل ہوتے ہیں اور اس سے متلذذ ہوتے ہیں اور اس طریقے سے باطنیہ پوری شریعت کو اس کے ظاہر کی تاویل کر کے گرانے تک پہنچ جاتے ہیں اور اسے اپنی رائے کی جگہ پر اتارنے کا اقدام کرتے ہیں۔ جیسا کہ ہم نے ان کے مذاہب کو کتاب ”المستظہری المصنف فی الرد علی الباطنیہ“ میں نقل کیا ہے۔

اہل طامات کی تاویل کی مثال:

﴿إِذْ هَبْنَا إِلَىٰ فِرْعَوْنَ إِذْ ظَلَعْنَا ﴿۳۳﴾﴾ (طہ: ۳۳)

”تم دونوں فرعون کے پاس جاؤ کیونکہ وہ سرکش ہو گیا ہے۔“

کسی نے اس کی تاویل میں کہا کہ یہ اس کے دل کی طرف اشارہ ہے اور کہا کہ فرعون سے بھی یہی مراد ہے اس لیے کہ یہ ہر انسان پر سرکشی کرتا ہے۔ اور

﴿أَنْ أَلْبِقَ عَصَاكَ ﴿۱۱﴾﴾ (الاعراف: ۱۱)

”اپنا عصا ڈالے۔“

اس کی تاویل میں کہا کہ: ”یعنی اللہ تعالیٰ کے علاوہ ہر وہ چیز جس پر وہ اعتماد اور بھروسہ کرتا ہے اسے پھینک دینا چاہیے۔“ اور آپ ﷺ کا فرمان: ”سحری کھاؤ کیونکہ سحری میں برکت ہے۔“ ① کے بارے میں کہتے ہیں کہ اس سے مراد یہ ہے کہ سحری کے وقت استغفار کرو! اس طرح کی تاویلات کیں حتیٰ کہ انھوں نے قرآن پاک کو ادا سے آخر تک اس کے ظاہر سے پھیر دیا

اور اس کی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور دیگر علماء سے منقول تفسیر سے بھی پھیر دیا ان تاویلات میں سے بعض ایسی ہیں کہ ان کا بطلان ہر ایک کو قطعاً طور پر معلوم ہوتا ہے، جیسے فرعون کی تاویل قلب کے ساتھ۔ کیونکہ فرعون ایک شخص محسوس ہے جس کے وجود کا منقول ہونا ہم تک تو اتر کے ساتھ پہنچا ہے۔ نیز حضرت موسیٰ علیہ السلام کا اسے دعوت دینا ہم تک تو اتر کے ساتھ پہنچا ہے جیسے ابو جہل اور ابولہب وغیرہ جیسے کفار کا ہونا ہم تک تو اتر کے ساتھ پہنچا ہے اور جنات اور فرشتوں کی جنس میں سے کوئی بھی ایسی نہیں ہے کہ جن کا حس سے ادراک نہ کیا جاسکتا ہو یہاں تک کہ ان کے الفاظ کی تاویل کی ضرورت پیش آ جائے اسی طرح سحری کو استغفار پر محمول کرنا بھی ہے، کیونکہ آپ ﷺ کھانا کھاتے تھے اور فرماتے تھے ”تسحروا“ ”سحری کھاؤ۔“ ①

اور فرماتے تھے کہ: ”چلے آؤ غذا مبارک کی طرف۔“ ②

یہ امور ایسے ہیں کہ تو اتر اور جس سے ان کا بطلان معلوم ہو جاتا ہے اور بعض ظن غالب سے معلوم ہو جاتے ہیں اور یہ امور ایسے ہیں کہ احساس کا ان کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ یہ سب حرام گمراہی اور مخلوق کے لیے دین کو فاسد کرتا ہے اور ایسی کوئی بھی چیز صحابہ رضی اللہ عنہم یا تابعین رضی اللہ عنہم سے منقول ہوئی اور نہ حسن بصری رضی اللہ عنہ سے منقول ہوئی۔ حالانکہ وہ لوگوں کو دعوت دینے اور انھیں وعظ و نصیحت کرنے میں منہبک تھے لہذا آپ ﷺ کا ارشاد:

”جس نے اپنی رائے سے قرآن پاک کی تفسیر کی اسے چاہیے کہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنا لے۔“ ③

بعض نے کہا کہ متواتر ہے اس کا معنی اسی طریقے پر ظاہر ہوگا اور وہ یہ کہ اس کی غرض اور رائے کسی امر کی تحقیق اور پہنچائی پر ہو اور وہ قرآن کی شہادت کو سمجھ کر اس طرف کو لے جائے اور اسے اس پر محمول کرے حالانکہ قرآن پاک کی اس پر نہ دلالت لفظیہ لغویہ کے ذریعے کوئی شہادت دے اور نہ ہی نقلیہ کے ذریعے۔

اس سے یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ قرآن کی تفسیر استنباط اور نگر کے ساتھ نہ کرنا واجب ہے اس لیے کہ بعض آیات ایسی ہیں کہ جن کے بارے میں صحابہ اور مفسرین سے پانچ، چھ یا سات معنی منقول ہوتے ہیں اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ان میں سے کوئی بھی نبی کریم ﷺ سے سنا ہوا نہیں ہے۔ اور بعض اوقات یہ ایک دوسرے کے منافی ہوتے ہیں جو جمع نہیں ہو سکتے لہذا یہ حسن فہم اور طول نگر سے ہی یہ مستنبط ہوں گے اسی وجہ سے آپ ﷺ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے لیے فرمایا کہ: ”اے اللہ! اے دین کا تقہ عطا فرما اور تاویل کا علم عطا فرما۔“

اہل طامات میں سے جو شخص اس طرح کی تاویلات کو جائز سمجھتا ہے حالانکہ وہ جانتا ہے کہ الفاظ سے یہ مراد نہیں ہے اور وہ سمجھتا ہے کہ وہ اس سے مخلوق کو خالق کی طرف دعوت دینے کا ارادہ کرتا ہے وہ اس شخص کی طرح ہے جو رسول اللہ ﷺ کی حدیثیں گھڑنے اور بنانے کو جائز سمجھتا ہو اس لیے کہ وہ اپنی جان میں حق ہے لیکن اسے شریعت نے نہیں بتلایا جیسا کہ کوئی شخص ہر ایسے مسئلے میں جسے وہ حق سمجھتا جو نبی کریم ﷺ کی طرف سے کوئی حدیث گھڑے یہ ظلم اور گمراہی ہے اور آپ ﷺ کے مندرجہ ذیل قول سے منہبوم ہونے والی دعوت میں داخل ہے۔

① بخاری ② ابوداؤد، نسائی، ابن حبان

③ بخاری، مسلم

(من کذب علی متعمداً فلیتبوا مقعده من النار).

”جس نے مجھ پر جان بوجھ کر جھوٹ بولا اس کو چاہیے کہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنا لے۔“

بلکہ ان الفاظ کی تاویل میں شربہت زیادہ بڑا اور سنگین ہو جاتا ہے اس لیے کہ یہ الفاظ کے اعتماد کو باطل کر دیتا ہے اور قرآن

سے فہم اور استفادہ کے راستے کو بالکل یہ طور پر ختم کر دیتا ہے۔

اب آپ کو معلوم ہو چکا کہ شیطان نے مخلوق کے داعیوں کو تو انہیں محمودہ سے مذمومہ کی طرف کیسے پھردیا؟ یہ سب کچھ علماء

سوء کی تلبیس ہے کہ انھوں نے نام بدل دیے ہیں اگر آپ مشہور نام پر اعتماد کرتے ہوئے ان کی اتباع کرو گے اور اس طرف التفات

نہیں کرو گے کہ عصر اوّل میں کیا معروف تھا تو آپ ایسے ہو جائیں گے کہ جیسے کوئی شخص حکمت کا شرف طلب کرتا ہے اور ایسے شخص کی

اتباع کرتا ہے جس کو حکیم کا نام دیا گیا ہے کیونکہ حکیم کا اطلاق اس زمانے میں طیبیہ پر بھی کیا جانے لگا ہے اور شاعر پر بھی اور نجوی پر

بھی اور یہ الفاظ کی تبدیلی کے بارے میں غفلت کی وجہ سے ہوا۔

پھر فرمایا کہ: ”اللفظ الخامس“ (پانچویں قسم کے الفاظ) یعنی وہ الفاظ جن میں تلبیس واقع ہوتی ہے (ان میں سے پانچواں

لفظ) لفظ حکیم ہے کیونکہ حکیم کے نام کا اطلاق طیبیہ، شاعر اور نجوی پر کیا جاتا ہے حتیٰ کہ راستے میں عام لوگوں کی ہتھیلیوں پر کرو

لڑھکانے والے کو بھی حکیم کہا جاتا ہے۔ جبکہ حکمت وہ ہے جس کی خوبی اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں بیان فرمائی کہ:

﴿يُؤْتِي الْحِكْمَةَ مَنْ يَشَاءُ ۚ وَمَنْ يُؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا ۗ﴾ (البقرہ: ۲۶۹)

”اور جسے چاہتا ہے حکمت عطا فرماتا ہے اور جسے حکمت دی گئی اسے خیر کثیر دے دی گئی۔“

نیز آپ ﷺ نے فرمایا کہ:

”حکمت کا ایک کلمہ جسے کوئی شخص سکھ لیتا ہے وہ دنیا اور جو کچھ اس کے اندر ہے سب سے بہتر ہے۔“

اب آپ دیکھیں کہ حکمت کا معنی کیا ہے؟ اور کس طرف منتقل ہو گیا؟ اور باقی الفاظ کو بھی اس پر قیاس کیجئے اور علماء سوء کی

تلبیسات کے دھوکے سے احتراز کیجئے کیونکہ ان کا شروریں میں شیاطین کے شر سے بھی بڑھ کر ہے اس لیے کہ شیطان ان کے واسطے سے

آہستہ آہستہ دین کو مخلوق کے قلب سے نکال دیتا ہے اسی وجہ سے رسول اللہ ﷺ نے مخلوق کے شرک بارے میں سوال کیا گیا تو

آپ ﷺ نے انکار کیا اور فرمایا کہ ”اے اللہ معاف فرما“ حتیٰ کہ جب بار بار پوچھا گیا تو فرمایا کہ ”علماء سوء“<sup>①</sup>

اب آپ نے علم محمود اور علم مذموم کو جان لیا اور ان کے التباس کا محور بھی جان لیا اب آپ کو اختیار ہے کہ اپنے لیے غور کریں

اور اسلاف کی اقتداء کریں یا غرور کے پہاڑ پر لٹک کر بعد والوں کی مشابہت اختیار کریں اب اسلاف نے جس علم کو پسند کیا وہ ختم ہو

چکا اور جس کی طرف لوگ اوندھے پڑے ہوئے ہیں اس میں سے اکثر نیا نیاں اور سن گھڑت ہے۔

رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہے کہ:

”اسلام کی ابتدا بھی غربت کے ساتھ ہوئی اور غنقریب غربت کی طرف واپس لوٹنے گا اس لیے مبارک باد ہی سے غرباء کے



لیے کسی نے پوچھا کہ غرباء کون ہیں آپ ﷺ نے فرمایا کہ: ”جو لوگ میری اس سنت کی اصلاح کرتے ہیں جس کو لوگوں نے برباد کر دیا اور وہ لوگ ہیں جو میری مردہ سنتوں کو زندہ کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔“<sup>①</sup>

ایک اور حدیث میں ہے کہ:

”وہ لوگ اس طریقے کو پکڑے ہوئے ہوں گے جس پر آج تم لوگ ہیں۔“<sup>②</sup>

ایک اور حدیث میں ہے کہ:

”غرباء بہت کم لوگ ہیں لیکن بہت زیادہ لوگوں کے درمیان نیک و صالح ہیں مخلوق میں ان سے بغض رکھنے والے ان لوگوں سے زیادہ ہیں جو ان سے محبت رکھنے والے ہیں۔“

اور یہ علوم غریب ہو گئے ہیں اس لیے کہ انھیں یاد کرنے کو بخوش سمجھا جاتا ہے۔ اسی وجہ سے ثوری رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ جب آپ دیکھو کہ ایک عالم کے دوست بہت زیادہ ہیں تو سمجھ لو کہ یہ ضلالت ملط ہو گیا ہے اس لیے کہ اس نے حق کو اس سے بغض رکھنے والوں کے سامنے بولا۔

غزالی رضی اللہ عنہ کا کلام ختم ہو گیا اللہ تعالیٰ ان کو کئی گنا اجر عطا فرمائے اور اچھا ذخیرہ کرے اور ہمیں اپنے نفس و کرم سے سلامتی اور عائیت عطا فرمائے۔ آمین

## اہل کلام کی تفاسیر

جو بھی انسان کوئی کتاب کرتا ہے تو اس کی کتابت میں اس کا جذبہ اور میلان غالب ہوتا ہے اور اس کی تالیف اور گفتگو میں اس کا عقیدہ ظاہر ہوتا ہے جیسا کہ ہم نے کہا۔

علاء کرامی جب کتاب اللہ کی تفسیر کرنے لگتے ہیں تو ان کا حال بھی اسی طرح ہوتا ہے چنانچہ کسی کی تفسیر میں اہل سنت کے انوارات چمکتے ہیں اور معتزلی کے بیان سے اعتزال کی بو بھڑکتی ہے اور شیعوں کی تادیل میں تشیع کی بو اچلتی ہے۔ اسی طرح باقی لوگوں کا بھی حال ہے لیکن ان کے درمیان بہت بڑا فرق ہے کہ کوئی تعصب کرتا ہے اور کوئی غیر جانبدارانہ اور منصفانہ طریقہ اختیار کرتا ہے اسی طرح کوئی مختصر کرتا ہے اور کوئی طویل کرتا ہے۔

بیچھے آپ نے معتزلیوں اور شیعوں کی تفاسیر میں مکالمہ دیکھ لیا اور آپ نے دیکھ لیا کہ زنجشیری رضی اللہ عنہ کس طرح مخفی طور پر اپنے اعتزال کی سخن گوئی کرتا ہے اور قاضی عبد الجبار کو دیکھ لیا کہ وہ کیسے متعصب اور واضح ہوتا ہے اور مولیٰ عبداللطیف کیسے حد سے تجاوز کر کے تشیع کرتا ہے۔

اسی طرح آپ اہلسنت کو بھی پائیں گے کہ ان میں سے کوئی تو اپنی تفسیر کے ذریعے ایسے عقیدے کی تائید کا قصد کرتا ہے۔

① مسلم شریف، مختصر، ترمذی

② قال المناظر العرانی لم ارأه مسلماً

## مسائل العرفان فی علوم القرآن: جلد ①

جیسا کہ وہ لوگ جن کی سوانح اور ان کی تفسیروں کے سوانح ہم نے اس سے پہلے ذکر کر دیے جب ہم نے رائے محمودہ کے ساتھ تفسیر کی مشہور ترین کتابوں پر کلام کرتے ہوئے ہم نے ان کی سوانح وغیرہ کو ذکر کیا۔

اہل سنت میں سے بعض لوگ ایسے ہیں جو اپنی تفسیر میں اپنے عقیدے کے دفاع میں مرنے کئے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں ان لوگوں کا رئیس امام فخر الدین رازی ہے جس نے ہر موقع پر عقیدہ میں گمراہ اور مخرف لوگوں کے خلاف ایک لمبی جوڑی لڑائی چھیڑ دی اور اپنی تفسیر "مفاتیح الغیب" جو کہ تفسیر فخر رازی کے نام سے مشہور ہے اس میں وہ حکماء کے طریقے پر چلے اور انھوں نے مباحث الہیات میں اپنے دلائل کو انھی کے استدلالات عقلیہ پر ڈھالا لیکن وہ اہلسنت کے اصول کے موافق ہونے کی وجہ سے مہذب ہونے کے باوجود اکثر جگہوں پر ان کے شہادت کو توڑنے اور کمزور کرنے کے پیچھے لگے ہیں۔

اسی طرح وہ کونیاں میں طبیعات والوں کے طریقے پر چلے اور انھوں نے افلاک اور ستاروں پر بات کی اور آسمان وزمین کے بارے میں اور حیوان و نباتات کے بارے میں اور انسان کے اجزاء کے بارے میں۔

## علوم ادبیہ اور کونیہ وغیرہ کا تفسیر کے ساتھ امتزاج اور اس کا سبب و اثر

قرآن پاک ہدایت اور اعجاز کی کتاب ہے اور مفسر اپنی تفسیر میں اپنی استعداد اور قدرت کے بقدر اس کی ہدایت اور اعجاز کا تصور اور شرح کرتا ہے اور اس قدر کرتا ہے جتنا کہ لوگوں کے ہاں علوم، معارف اور افکار ہیں۔

اور قرآن کریم کے نازل ہونے سے اب تک اس پر بہت سے عصور اور قرون، امتیں اور نسلیں گزری ہیں پھر بھی قرآن ایک کتاب ہے جو ہدایت کا نور پھیلاتی ہے اور اعجاز کا جھنڈا بلند کرتی ہے (جیسا کہ تھی اور ہے گی) اور جو لوگ پہلی مرتبہ اس کے بالمشافہہ مخاطب بنے وہ عرب تھے جن میں عربیت کے خصائص کامل تھے اس کے باوجود اگرچہ وہ اتنی تھے لکھنے پڑھنے کے ساتھ متصف نہیں تھے اور نہ ہی انھیں درسی علوم کے ساتھ کوئی سروکار تھا اور نہ پڑھی جانے والی کتابوں کے ساتھ انھیں کوئی واسطہ تھا انھیں وجوہات کی بنا پر اس کتاب کی ہدایت اور اعجاز کے لیے اور ان کا تفسیر و بیان کے ذریعے اس کی صورت پیش کرنا آسان ترین امور میں سے تھا جو فطرت اور بساطت پر جاری ہیں جن میں وہ کسی فنی اصطلاحات کے محتاج تھے اور نہ ہی علمی نظریات کے محتاج تھے۔

اس کا اعجاز تو انھیں محض سلیقہ عربیہ اور بلاغت کے دقیق ذوق ہی معروف تھا اور اس کی ہدایت کو بھی وہ اپنی صاف عقول تیز فہمی اور صاف ستھری لغت عربیہ جس میں قرآن نازل ہوا اس کے ذریعے سے سمجھ لیتے تھے۔

اور جب انھیں ضرورت پیش آئی تو انھوں نے کائنات میں اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں اور ان میں اللہ تعالیٰ کی پیدا کردہ چیزوں اور ان کے ارد گرد آسمان وزمین کے عجائبات میں غور کیا اور پھر رسول اللہ ﷺ کے بیان کو سنا۔

اسی طرح ایک عرصہ تک معاملہ چلتا رہا پھر اللہ تعالیٰ کی مدد اور فتح آئی اور زمین نے اپنے اطراف مسلمانوں کے لیے روند دیے اور اسلام کا جھنڈا ایسی قوموں اور قبیلوں پر سایہ کرنے لگا جو عربیت تو نہیں جانتے تھے لیکن علوم، فنون اور فلسفہ میں مضبوط تھے اب یہ امتیں جو فتح ہوئیں ان امتوں کے ساتھ خلط ملط ہو گئی جو فاتح تھیں زمانہ گزرنے کے ساتھ اس اتصال کے دو طرح کے نتائج

رودنا ہوئے۔

- ① لغت عربیہ فاسد ہو گئی اور پوزی کی پوزی ایسے ضابطوں کی محتاج ہو گئی جو اسے ضبط کریں اور اس کی سلامتی کو مطمئن ہوں اور لوگوں کو کتاب و سنت کے فہم میں خطا سے محفوظ رکھتے ہوں اس سبب کی بنا پر علوم ادبیہ یا علوم عربیہ وجود میں آئے۔
- ② یہ آئیں جو اسلام میں داخل ہوئیں ان کے علوم کا ترجمہ کیا گیا اور ان کی تہذیب و تنقیح کی گئی اور ان کی ثقافت مسلمانوں کے درمیان پھیل گئی اگرچہ ان کی اقوام مختلف تھیں۔ لہذا حکمت کا تقاضا یہ ہوا کہ ایک اعتبار سے ان کے اور قرآن کے درمیان توفیق بنائی جائے اور دوسرے اعتبار سے ان کی روشنی میں قرآن کو سمجھا جائے اور یہ حکمت کے مقتضیات میں سے تھی اس لیے کہ اسلام علم کا دشمن نہیں ہے جیسا کہ بعض بہتان تراشوں نے اس کا دعویٰ کیا ہے بلکہ یہ (یعنی اسلام) علم کا دوست اور ساتھی ہے۔

ان اسباب کی بنا پر یہ علوم ادبیہ اور علوم کونینہ قرآن پاک کی تفسیر میں داخل ہونے اور اس کے ساتھ گٹھ بند ہونے لگے اس اعتبار سے کہ اس کی ہدایت اور اعجاز کو کامل طور پر اور فہم صحیح کے ساتھ ان علوم و معارف کے بغیر سمجھ میں نہیں آتے تھے۔ علوم لغت و ادب تو اس لیے کہ انھی علوم کے ذریعے کلمات کی بناء، پیمانے اور ان کے اواخر کا ضبط اور ان کے الفاظ کی انواع کے اختلاف کے مطابق ان کے مدلولات، تراکیب کا احاطہ اور اسلوب عالی یا نازل کی تیز ہو پچانا جا سکتا ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ قرآن کے معانی کا ادارک، اس کی بلاغت اور اعجاز کا ذوق خاص عربی کے علاوہ کو صرف اسی طریقے آ سکتا ہے۔ جبکہ علوم کونینہ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو اس بات کی طرف بہت زیادہ بلایا ہے کہ وہ اس کائنات میں غور کریں اور انہیں بڑی قوت کے ساتھ اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ اس وجود کا صحیفہ پڑھیں تاکہ کون سے اس کے ”کون“ تک پہنچیں اور وجود سے اس کے موجد پر استدلال کریں اور ان قوائے عظیمہ کے ذریعے بھر پور انتفاع حاصل کریں جنہیں اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے پیدا کیا اور انہیں ان کے نفع کے لیے مسخر کیا۔

اللہ تعالیٰ نے سورۃ الجاثیہ میں فرمایا کہ:

﴿ اِنَّهُ الَّذِي سَخَّرَ لَكُمْ الْبَحْرَ لِيَجْرِيَ فِيْهِ فَاْمْرُهُ وَاَلَيْسَ لَكُمْ فَضْلُهُ وَاَلَيْسَ لَكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝۱۲ وَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِى السَّمٰوٰتِ وَاَمَّا فِى الْاَرْضِ جَمِيْعًا مِّنْهُ ۗ اِنَّ فِىْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّعُوْمَرِ يَتَفَكَّرُوْنَ ۝۱۳﴾ (الجاثیہ: ۱۲-۱۳)

”اللہ ہی ہے جس نے تمہارے لیے سمندر کو مسخر کیا تاکہ اس کے حکم سے اس میں کشتی چلے اور تم اس کا فضل تلاش کرو اور شکر کرو اور تمہارے لیے آسمانوں اور زمین کی تمام چیزوں کو مسخر کیا ہے شک اس میں یقیناً نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لئے جو سوچ و فکر کرتے ہیں۔“

اب کوئی تعجب کی بات نہیں کہ وہ لوگ قرآن کے ان الفاظ کونینہ کو اس طریقہ پر سمجھیں جس کی طرف ان کی رہنمائی کی علم نے اور اس ثقافت نے جس کے وہ لوگ علوم کونینہ میں ماہر ہوتے ہیں۔ اور یہ بات بدیہی ہے کہ مفسر اپنے لیے تفسیر نہیں کرتا بلکہ وہ لوگوں کے لیے تفسیر کرتا ہے اس لیے ضروری ہے کہ وہ اپنی افکار کے ہم آہنگ ہو اور قرآن پاک کی تشریح طبعی و علمی ظواہر، اللہ تعالیٰ کی سنن کونینہ، قوانین اجتماع، سیاسیہ، قواعد اقتصاد، اور اخلاق اور تمام تفریعات شخیصہ، مدنیہ، جنائیہ (جن کا تعلق جنایات کے ساتھ ہو) اور حربیہ کی روشنی میں کریں۔

یہی وہ اسباب ہیں جنہوں نے تفسیر کو علوم ادبیہ اور کونیہ وغیرہ کے ساتھ ملا دیا ہے اور علوم ادبیہ اور کونیہ کو تفسیر کی کتابوں میں اپنا مقام بنانے والا بنا دیا اگرچہ یہ امتزاج قوت وضعف، قلت و کثرت اور توفیق و خذلان (مدد سے ہاتھ کھینچ لینا، بے یار و مددگار چھوڑ دینا) کے اعتبار سے مفسرین کے مواہب اور جمہور کے استعداد اور ان علوم میں تقدم و تاخر زمانی کے ساتھ اختلاف کے ساتھ مختلف ہوتا ہے۔ چنانچہ زجاج، ابو حیان وغیرہ کی تفسیریں مباحث نحویہ کے ساتھ بھری ہوئی ہیں اور زحشری اور ابوالسعود وغیرہ کی تفسیریں مباحث بلاغیہ کے ساتھ بھری ہوئی ہیں اور تفسیر خازن اور ان کے متعلقین کی تفسیریں اخبار و قصص کے ساتھ بھری ہوئی ہیں اور علامہ مرحوم شیخ طنطاوی جو برہ کی تفسیر الجواہر علوم کونیہ سے بھری ہوئی ہے (اس تفسیر والے کے کہنے کے مطابق) یہ تفسیر مکونات کی انوکھی اور عجیب چیزوں اور فائق و برتر آیات کے غرائب پر مشتمل ہے یہ بیچیس جلدوں میں مطبوع ہے اور ۱۳۵۲ھ کو مصر میں اس کی طباعت مکمل ہوئی اللہ تعالیٰ اس کے مولف پر رحم فرمائے اور اسے بہتر جزاء عطا فرمائے۔

اس امتزاج کے آثار

① علوم ادبیہ کا تفسیر کے ساتھ امتزاج کا اثر کیا ہے؟ اس کا خلاصہ اس طرح ممکن ہے کہ:

② قرآن پاک کی فصاحت اور اس کی بلاغت کا اظہار۔

③ اعجاز قرآن کی قسم پر اسلوب و بیان کے اعتبار سے دلالت۔

علوم کونیہ کا تفسیر کے ساتھ امتزاج کے اثرات کیا ہیں؟ ان کا خلاصہ مندرجہ ذیل طریقہ سے ممکن ہے۔

① لوگوں کی افکار و معارف کا ایک دوسرے کے ساتھ چلنا۔ اور ان کا قرآن پاک کی اس طرح تفسیر کرنا کہ وہ ان کی ثقافت کونیہ کی حاجت کو پورا کر دے۔

② قرآن پاک کے اعجاز کی جدید اقسام کا ادراک اس اعتبار سے کہ وہ ان پر بھی مشتمل ہے یا اس کی طرف علوم کونیہ و اجتماعیہ اشارہ کر رہے ہیں۔

③ جو لوگ کہتے ہیں کہ علم اور دین میں عداوت ہے ان کے خیالات کو دور کرنا۔

④ اس علمی راستے سے غیر مسلموں کا اسلام کی طرف مائل ہونا کہ ان ایام میں یہ لوگ انہی کے سامنے جھکتے ہیں ان کے علاوہ کسی کی طرف نہیں جھکتے۔

⑤ علم کونیہ کی قوی اور اس کے مواہب سے انتفاع حاصل کرنے پر ابھارنا۔

⑥ جب آدمی اللہ تعالیٰ کے کلام کی تفسیر میں علوم کونیہ کے تصور کے مطابق اشیاء کے خواص اور مخلوقات کے حقائق پر مطلع ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ کی عظمت اور قدرت پر ایمان کے اعتبار سے اس کا جی بھر جاتا ہے۔

اسے یاد رکھیں! اور علوم ادبیہ اور علوم کونیہ دونوں کا تفسیر کے ساتھ مل جانے کے کچھ اور آثار بھی ہیں جو ان دونوں کے درمیان مشترک ہیں ان کو اجمالی طور پر بیان کیا جاتا ہے۔

① قرآن، اس کی عربیت (یعنی فصاحت اور عربی الاصل ہونا) اس کے معارف اور اعجاز پر اعتماد میں اضافہ ہو جاتا ہے۔

② اس بات پر ایمان کہ یہ کتاب لبریز ہے سعادت کی ان تمام اقسام سے جن کا انسان محتاج ہوتا ہے۔

”محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ“

⑥ اور یہ ایمان کہ یہ کتاب قیامت کی کتاب ہے اور قیامت کے دن تک لوگوں کے لیے دستور ہے ہر زمانے اور مکان کے لیے بہتر ہے اور اس کے خزانوں اور ذخیروں سے کوئی بھی انسان مستغنی نہیں ہو سکتا۔

### شراکظ ضروریہ

یہ آثار جلیلہ جو ہم نے آپ کے گوش گزار کیے ان کی جلالت صرف اس وقت ہی متحقق ہو سکتی ہے جب ان میں مندرجہ ذیل امور کی رعایت کی جائے۔

① یہ مباحث ایسے مقصود اصلی یعنی قرآن کی ہدایت و اعجاز سے باہر نہ نکلیں۔ اور اگر مفسر آگے بڑھ کر علوم ادبیہ کی تفریعات اور فنون کوئیہ کے نظریات میں مشغول ہو جائے تو آیت کا اصل مفہوم بدل جائے گا اور تفسیر تفسیر نہیں رہے گی بلکہ کتب تفسیر کی بجائے کتب علوم و فنون کے مشابہ ہو جائے گی جیسا کہ کسی عقل مند عالم نے ایک تفسیر جو استطراد، تطویل اور متعدد قسم کے علوم کی اقسام میں مشہور تھی اس کی صفت بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ تفسیر ہر چیز کو جامع ہے سوائے تفسیر کے۔

② تفسیر کو ان علوم کے ساتھ خلط کرنے میں ایسی بات کا لحاظ رکھے جو زمانے کے بھی موافق ہو اور اعتدال کے بھی موافق ہو اس لیے کہ یہ اباحت کوئیہ اور ادبیہ کبھی ضروری اور مفید ہوتی ہیں خواہ کوئی بھی فائدہ ہو جب اس کے ساتھ قرآن پاک کی شرح کی جائے گی ثقافت کے کسی زمانے میں یا مادہ اور علوم کوئیہ کے فریضہ نگار کے لیے یا ادباء کی کسی ایسی جماعت کے لیے جو کسی قول میں بلاغت کے فنون میں شغف رکھتے ہوں۔

لیکن پھر بھی یہ اباحت خود مصیبت اور فتنہ ہیں، جب ان کے ساتھ قرآن کی شرح کی جائے جہالت کے کسی زمانے میں یا لوگوں کی دیگر جماعتوں کے لیے۔

”کوئی بھی شخص کسی قوم سے کوئی ایسی بات کرے جس کے سمجھنے کی ان کے اندر عقل نہ ہو تو وہ ان پر فتنہ ہوگی۔“

③ ان اباحت کو ایسے طریقے پر ذکر کرے کہ یہ مسلمانوں کو کمر بستگی پر آمادہ کرے اور انھیں قرآن پاک کی جلالت کی طرف متوجہ کرے اور انھیں ہمارے لیے اللہ تعالیٰ کی مسخر کردہ اس عظیم کائنات کے توہنی سے انتفاع حاصل کرنے کی طرف متحرک کرے ایسا انتفاع جو امت اسلامیہ کے اندر اس کی کمر بستگی و بزرگی کو لوٹا دے۔

آپ کی خدمت میں مثال کے طور پر ایک نمونہ پیش کیا جاتا ہے اگرچہ وہ اس راستے میں اتنا حد سے نکل چکا ہے کہ نفس تفسیر و تاویل کو ہی بھلا بیٹھا ہے۔

علامہ مرحوم شیخ طنطاوی جوہری نے اپنی کتاب ”القرآن والعلوم العصریہ“ میں لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ:

﴿اللَّهُ الَّذِي خَلَقَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ وَانزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَأَخْرَجَ بِهِ مِنَ الثَّمَرَاتِ رِزْقًا لَكُمْ ۗ وَسَخَّرَ لَكُمْ الْفَلَكَ لِتَجْرِيَ فِي الْبَحْرِ بِأَمْرِهِ ۗ وَسَخَّرَ لَكُمْ الْأَنْهَارَ ۗ وَسَخَّرَ لَكُمْ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ دَائِبَيْنِ ۗ وَسَخَّرَ لَكُمْ الْيَلَّ وَالنَّهَارَ ۗ﴾ (ابراہیم: ۲۲-۲۳)

”اللہ تعالیٰ ہی ہے جس نے آسمانوں اور زمینوں کو پیدا کیا اور آسمان سے پانی برسایا اور اس کے ذریعے تمہارے رزق کے

”محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ“

طور پر پھیلوں کو نکالا اور تمہارے لیے کشتی کو مسخر کیا اپنے حکم سے اور تمہارے لیے اور دریاؤں کو مسخر کیا اور تمہارے لئے سورج اور چاند کو مسخر کیا جو ایک دستور پر عمل پیرا ہیں۔ اور تمہارے لیے دن اور رات کو مسخر کیا۔  
اللہ تعالیٰ نے چھ مرتبہ کاف خطاب کے ساتھ تعبیر کیا اور پانی ہمارے لیے بنایا سورج اور چاند کو ہمارے لیے مسخر کیا دن اور رات کو ہمارے لیے مسخر کیا اور ہم نے اپنے جی میں جو کچھ بھی اس سے مانگا اور جس کی بھی ہمارے نفوس نے تمنا کی اس نے ہمیں عطا کیا۔

اب کیا مسلمان اس خطاب سے متشبی ہو گئے؟ کیا اللہ تعالیٰ نے زمین میں جو پھل پیدا کئے وہ غیر مسلموں کے ساتھ خاص ہیں؟ یا خطاب عام ہے؟ اور کیا کشتیاں جو ایشیاء، افریقہ اور یورپ کے درمیان بحر ہند، بحر الکاہل، بحر احمر، بحر ظلمات میں یورپ اور امریکہ کے درمیان پھرتی ہیں کیا یہ کشتیاں انگریزوں کے ساتھ خاص ہیں؟ کیسے مسلمان علوم تجارتیہ سے ٹھنڈے پڑ گئے ہیں کہ یہ ان کے غیروں یعنی فرنگیوں اور اہل امریکہ کے ہاتھوں میں چلے گئے ہیں اور یہ لوگ دونوں ہاتھ خالی کر بیٹھے ہیں؟ وہ کشتیاں جو ہمارے کرہ ارضیہ کے اطراف میں دریاؤں اور سمندر کی موجوں کو چیرتی چلی جاتی ہیں وہ فرنگیوں کے ہاتھ میں ہیں یہی وہ لوگ ہیں جو علم معادن، الیکٹریکل علوم، اسٹیم پاور کے علوم اور ٹیلی گرافی اور تار والی بجلی اور بغیر تار بجلی کے علوم پڑھتے ہیں تو کیا اسے مسلمانو! تم پر کوئی عار ہے کہ تم ۵۰۳ ملین ہو کر بھی سمندروں میں تمہاری کشتیاں نہیں چلتیں جیسے تمہارے غیروں کی چلتی ہیں حالانکہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے ساتھ خطاب کیا اور فرمایا:

﴿سَخَّرَ لَكُمْ الْفُلْكَ لِتَجْرِيَ فِي الْبَحْرِ بِأَمْرِهِ﴾

”اور اس نے تمہارے لیے کشتی کو مسخر کیا تاکہ وہ اس کے حکم سے سمندر میں چلے۔“

یعنی مسخر کیا علمی قواعد پر جو اس کی بنیاد میں لوہاری کی صنعت کو پہچاننے، اس کی تکمیل میں لکڑی کی صنعت، اس کے چلانے میں بھاپ کی صنعت، اس میں پائی جانے والی باتوں کو جاننے کے لیے مقناطیس کی صنعت کو پہچاننے کے بعد حاصل ہوتے ہیں اور فلک کو اکب و سیارہ کے علم کو پڑھنے کے بعد حاصل ہوتے ہیں جن کے ذریعے سمندروں کے راستوں کی رہنمائی حاصل ہوتی ہے۔ اور سمندروں، ان کے راستوں اور خطوں اور ان میں پائی جانے والی نالیوں کے علوم پڑھنے کے بعد حاصل ہوتی ہیں تاکہ کشتیاں سیدھے راستے سے نہ بھٹکیں اور غرق نہ ہو جائیں اور ان میں جو لوگ یا سامان ہے وہ غرق نہ ہو جائے۔ نیز یہ قواعد علمیہ بادلوں، ہواؤں اور طوفانوں کے علوم پڑھنے کے بعد حاصل ہوتے ہیں حتیٰ کہ ہر حال میں وہ جہاز کے کپتانوں والا لباس پہنیں اور اس طریقے پر چلیں جو کشتی کو نجات دے دے۔

اس کے بعد فرمایا کہ ﴿وَسَخَّرَ لَكُمْ الْاَنْهَارَ﴾ یعنی بات ہے کہ نہریں کھیتوں کو سیراب کرتی ہیں اور ان کے جاری ہونے میں بھی ایک قوت اور توانائی ہے جس سے بجلی پیدا ہوتی ہے جس کی وجہ سے پٹرول اور کولے کی ضرورت نہیں رہتی۔ جبکہ مسلمان زمین کے گوشوں میں انہی نہروں سے غافل ہیں اور مغرب یہ یہ غیروں کے ہاتھ میں چلی جائیں گی۔

﴿وَسَخَّرَ لَكُمْ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ دَائِبَيْنِ﴾ وَسَخَّرَ لَكُمْ الْاَيْلَ وَالنَّهَارَ﴾

رات، سورج اور چاند ان کا بار یک حساب ہے جن تک علم حساب، ہندسہ، الجبر اور علم فلک کے بغیر رہنمائی نہیں ہو سکتی۔



## منابل العسرفان فی علوم القرآن: جلد ۱

سورج طلوع ہوتا ہے نہ غروب نہ ہی کوئی ستارہ چمکتا نہ غروب ہوتا اور نہ ہی کوئی سیارہ طلوع ہوتا ہے اور غروب ہوتا ہے مگر طے شدہ اوقات کے مطابق جو دوبارہ کم نہیں ہوتے بلکہ یہ سب اپنی مقدار کے مطابق چلتے ہیں اگر انسان کسی ایک دن بھی ان چیزوں سے غافل ہو جائے تو اس کی زندگی خلل پذیر ہو جائے گی۔ اب دیکھو کہ یہ سمندروں کی کشتیاں اور خشک قطرے ہیں یہ سب سورج اور ستاروں کے حساب سے چلتے ہیں اگر لوگ ان میں سے کسی چیز سے بھی غافل ہو جائیں تو ان کے مقررہ اوقات سب خلل پذیر ہو جائیں اور ان قطرات میں تصادم ہو جائیں اور ان میں سے اکثر مر جائیں یہ سب چیزیں وہ جانتا ہے جو اس زمانے میں کچھ نہ کچھ علم فلکیات کو جانتا ہو۔ اتنی



## آخری کلمات

یہ نہ سمجھنا کہ اس بحث میں ہم نے جو باتیں بیان کی ہیں انھوں نے قرآن پاک کی تفاسیر میں لکھی گئی تمام کتابوں کا احاطہ کر لیا ہے اور یہ بھی نہ سمجھ بیٹھنا کہ تفسیر میں لکھی ہوئی جتنی بھی کتابیں ہیں انھوں نے ان تمام چیزوں کا احاطہ کیے ہوئے ہے جنھیں اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں ودیعت رکھا ہوا ہے یعنی احکام، حکمتیں اور معارف و اسرار، بلکہ ہم نے یہاں جتنی بھی تفاسیر کا ذکر کیا ہے وہ زیادہ میں سے تھوڑا ہے۔ پھر یہ تفسیری مجموعے اپنی کثرت کے باوجود قرآن کی کوئی بھی حاصل نہیں کرتے سوائے اس کے کہ دھاگے کو سمندر میں ڈبویا جائے تو وہ کتنا پانی حاصل کرے گا۔ کسی بڑے عالم کا ایک قول مجھے بڑا اچھا لگتا ہے جب ان سے پوچھا گیا کہ قرآن کی سب سے اچھی تفسیر کون سی ہے؟ انھوں نے فرمایا کہ زمانہ۔ یعنی علوم و معارف افکار و حوادث اور تجربات وغیرہ جو زمانے میں نئے پیش آتے ہیں یہ قرآن کی شرح میں اہم ترین عوامل ہیں ان لمبے زمانوں کے سلسلے کا کوئی بھی عرصہ آتا ہے تو وہ اس کے کچھ چھپے ہوئے اسرار کو ظاہر کرتا ہے جو اس سے پہلے معروف نہیں تھے۔

اگر آپ کو شک ہے تو دیکھو کتابوں اور عالم کے مکتبوں کو دیکھو وہ جتنے بھی ضائع ہو گئے ہوں یا مٹ گئے ہوں پھر بھی ان میں تفاسیر کے پہاڑوں کی طرح کی اسواج کے ذخیرے ہیں جن کا احاطہ علم ذخیر کے علاوہ کوئی بھی نہیں کر سکتا بلکہ ان کے ناموں کو شمار کرنا ہی آپ کو تھکا دے گا چہ جائیکہ ان کے سمیات کا استقراء ہو اور آپ ان میں فنون و انواع اور احوال دیکھیں گے جنھیں اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب کے بیان میں علماء پر کھولا ہوگا۔ جن میں سے کچھ تفاسیر بالماثور ہیں، اور کچھ تفاسیر بالارائے، بعض ظاہری عبارتوں کی تفسیریں ہیں اور بعض چھپے ہوئے اشاروں کی تفسیریں ہیں بعض میں صنعت کلام غائب ہے اور بعض میں صنعت بلاغت غائب ہے کسی پر نحو اور اعراب غالب ہیں، اور کسی پر احکام کی تفریحات غالب ہیں، کسی پر علوم لونیہ غالب ہیں وغیرہ وغیرہ اسی طرح بعض تفاسیر پورے قرآن کی تفاسیر ہیں اور بعض قرآن کے کسی حصے یا سورت یا آیت کی۔

میں کم مایہ اور ناقص العلم ہونے کے باوجود تفاسیر کی فہرستوں پر مطلع ہوا ہوں جو مندرجہ ذیل کے ساتھ خاص ہیں اور کبھی اس کے ساتھ تالیف کا نوع ہوتا ہے یا ایک چیز میں مؤلفین کا تعدد ہوتا ہے۔

ان میں سے بعض عم پارے کی تفاسیر، بعض تبارک کی، بعض سورۃ فاتحہ کی، بعض سورۃ یوسف کی، بعض سورۃ المردکی، بعض سورۃ الکہف کی، بعض سورۃ النور کی، بعض سورۃ یسین کی، بعض سورۃ الحجرات کی، بعض سورۃ الحدید کی، بعض سورۃ القدر کی، بعض سورۃ الفیل کی، بعض سورۃ الشکاشکی، بعض سورۃ الکوثر کی، بعض اکیلی سورۃ الاغلاص کی اور بعض سورۃ الاغلاص اور اس کے ساتھ معوذتین کی بھی تفسیر ہیں۔ بعض بسملہ کی، بعض آیت الکرسی کی، بعض سورۃ الانبیاء کے شروع کی، بعض سورۃ الفتح کے شروع کی، بعض سورتوں کے شروع میں حروف مجسم کی، بعض آیت ﴿إِنَّا عَرَضْنَا الْأَمَانَةَ﴾ (الاحزاب: ۷۲) کی، بعض ﴿وَإِنَّ الْإِنْسَانَ لَكَفُورًا سِوَاءَ عِبَادِهِ﴾ (البقرہ: ۶) کی، بعض ﴿إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُورٍ﴾ (التران: ۱۸) کی، کوئی ﴿إِنَّمَا يَعْمُرُ مَسَاجِدَ اللَّهِ مِنْ أَمْنٍ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ﴾ (البقرہ: ۱۷۶) کی، کوئی ﴿وَإِنِ اعْتَزَلْتُمْ كُنْتُمْ﴾

يَقَاتِلُوكُمْ ﴿ (النساء: ۹۰) کی، کوئی ﴿ قُلْ هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْأَخْسَرِينَ أَعْمَالًا ﴿ ﴿ (سج: ۱۰۳) کی، کوئی ﴿ نَبِّئِينَ فِيهَا أَحْقَابًا ﴿ (النبا: ۲۳) کی، کوئی ﴿ لَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنَاتِ ﴿ (المدہ: ۲۵) کی، کوئی ﴿ لَقَدْ جَاءَكُمْ رَسُولٌ ﴿ ﴿ (التوبہ: ۱۲۸) کی، کوئی ﴿ وَ آيَةٌ لَهُمُ الْيَوْمُ الَّذِي آتَيْنَاهُمْ إِثْنَا عَشَرَ شَهْرًا ﴿ ﴿ (التوبہ: ۳۹) کی، کوئی ﴿ وَإِنْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِينَ مَرَّةً فَلَنْ يَغْفِرَ اللَّهُ لَهُمْ ﴿ ﴿ (التوبہ: ۸۰) کی، کوئی ﴿ إِنَّ عِدَّةَ الشُّهُورِ عِنْدَ اللَّهِ اثْنَا عَشَرَ شَهْرًا ﴿ ﴿ (التوبہ: ۳۹) کی، کوئی ﴿ وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَلَا لِمُؤْمِنَةٍ ﴿ ﴿ (الاحزاب: ۳۶) کی، کوئی ﴿ مَا كَانَ عَلَى النَّبِيِّ مِنْ حَرَجٍ فِيمَا فَرَضَ اللَّهُ لَهُ ﴿ ﴿ (الاحزاب: ۳۸) کی، کوئی ﴿ لَا يُسْأَلُ عَنَّا يَفْعَلُ ﴿ ﴿ (الانبياء: ۲۳) کی تفسیر ہے۔ یہ تفسیریں پہلے مفسرین کے اقوال کے علاوہ ہیں اور یہ تفسیریں علامہ جلیل شیخ یوسف دجوی کی ہیں۔

اگر آپ کو تعجب ہے تو اس مقام پر ایک رسالہ ہے جو اللہ تعالیٰ کے قول:

﴿ وَفَتَحَتْ أَبْوَابُهَا ﴾ (الزمر: ۷۳)

میں حرف واؤ کے معنی یا اس کے وجہ ثبوت کے بارے میں ہے کیا آپ نے دیکھا بلکہ اس سے بھی کئی گنا، یہ قرآن کے نور کا ایک شعلہ ہے اور حقیقی اعتبار سے بہت بڑے سورج کی ایک شعاع ہے اور اللہ تعالیٰ کی اپنے کچھ لوگوں کو ہدایت دینے کی تجلیات میں سے ایک چمک ہے جبکہ پورا نور اور پوری ہدایت اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کے اسرار میں سے ایک بجز ہے اور اس کی الوہیت کے خزانوں میں سے ایک خزانہ ہے اور خالق اور مخلوق کے علم میں بڑا فرق ہے اور کہاں ایک مالک کا باکمال ہونا اور غلام کا ناقص و کم تر ہونا!۔



## آخری بات

آخری بات یہ ہے کہ یہ قرآن کے اعجاز میں سے ایک نیا فن بھی ہے اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب کو اس کے معانی اور معارف میں آیات بینات بنا کر قائم کر دیا اسی طرح اس کے الفاظ اور مہانی کو بھی ان کے لیے آیات بینات بنا دیا۔

﴿قُلْ فَلْيَبْئُرِ الْحُجَّةَ الْبَالِغَةَ﴾ (الانعام: ۱۳۹)

”آپ فرما دیجئے کہ پوری حجت تو اللہ تعالیٰ ہی کی ہے۔“

﴿وَلَمَّا كَلِمَاتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَعَدْلًا - لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمَاتِهِ ۗ وَهُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ﴾ (الانعام: ۱۱۵)

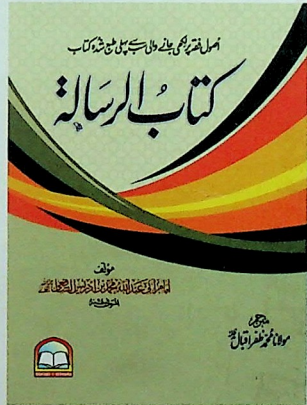
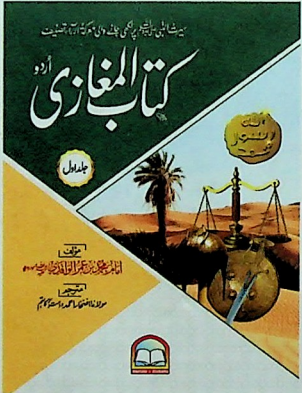
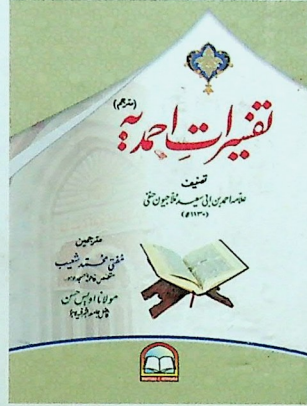
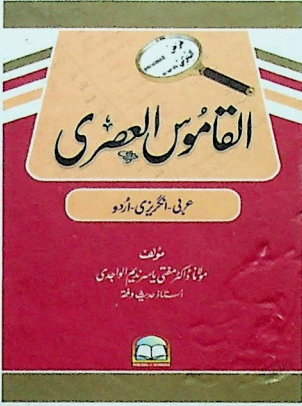
”اور تمہارے رب کا کلام سچائی اور انصاف میں کامل ہے اس کے کلمات کو کوئی بدل نہیں سکتا اور وہ سننے والا اور جاننے والا ہے۔“

اے اللہ ہم پر اپنی نعمت کو پورا کر اور ہمیں اپنی ہدایت سے محروم نہ کر اور ہمیں قرآن کے ساتھ پروردے ہدایت دینے والے اور ہدایت یافتگان کی لڑی میں۔ اور اس کے ساتھ ہمیں اعلیٰ علیین تک بلند کر دے۔ آمین آمین

﴿الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي هَدَانَا لِهَذَا ۖ وَمَا كُنَّا لِنَهْتَدِيَ لَوْلَا أَنْ هَدَانَا اللَّهُ﴾ (الاعراف: ۴۳)

”تمام تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لیے ہیں جس نے ہمیں اس کی طرف ہدایت دی اگر اللہ ہمیں ہدایت نہ دیتا تو ہم ہدایت نہ پا سکتے۔“





مکتبہ رحمانیہ (رجسٹرڈ)

اقرآن سنٹر عرفی سنٹر، اردو بازار، لاہور  
 فون: 042-37224228-37355743